

# پیرت سرورِ عالم

صَلَّى اللهُ عَلَيْكَ وَسَلَّمَ

جلد اول

○

— نالیف —

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

— مرتبین —

نعیم صدیقی • عبدالوکیل علوی

[www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

إِنَّا نُرِيدُ لَكُمْ الْخَيْرَ وَالنَّجَاتَ

وَالسَّلَامَ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ  
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی اربنہ  
معدت البریری

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

## معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

### تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے  
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی  
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے  
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ [KitaboSunnat@gmail.com](mailto:KitaboSunnat@gmail.com)

🌐 [www.KitaboSunnat.com](http://www.KitaboSunnat.com)

ناشر۔۔۔ ادارہ ترجمان القرآن (پبلیکیشنز) بمبئی، ناہور  
مطبع۔۔۔ ایچ۔ وائی۔ پرنٹرز، ناہور۔

## اشاعت

۶۰۰۰۔۔۔	۵۱۳۹۸	ذیقعد	۵	اول
۴۰۰۰۔۔۔	۵۱۳۹۹	رمضان المبارک	۶	دوم
۵۰۰۰۔۔۔	۵۱۳۸۰	محرم الحرام	۱۰	سوم
۶۰۰۰۔۔۔	۵۱۳۸۳	ربیع الثانی	۳	چهارم
۶۰۰۰۔۔۔	۵۱۳۸۹	رمضان المبارک	۹	پنجم

قیمت : 15 روپے

— ہستام —

چودھری بشیر احمد خاں

# اِفْتِتاح

وَإِنَّ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ ۝

کوئی قوم ایسی نہیں گزری ہے جس میں کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ (فاطر: ۱۳۲)



وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ

وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ۝

”اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا جس نے پیغام دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے پرہیز کرو۔“  
(التخل: ۳۶)



هَذَا نَذِيرٌ ۝ وَمِنَ التَّنذِيرِ الْأُولَى ۝

”یہ ایک ڈرانے والا ہے اگلے ڈرانے والوں میں سے۔“  
(التخم: ۵۶)



إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

”اے محمد، (صلی اللہ علیہ وسلم) یقیناً تم پیغمبروں میں سے ہو۔“  
(یس: ۳)



قُلْ مَا كُنْتُ بِدَعَاةِ الْمُشْرِكِينَ ۝

”اے محمد، (صلی اللہ علیہ وسلم) کہو میں کوئی نبرالارسل نہیں ہوں۔“ (تھات: ۹)



وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ

”محمد صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نہیں ہیں مگر ایک رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں“  
(آل عمران: ۱۴۴)



قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ  
وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ  
وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ  
وَتَحْنُ لَهُ الْمُسْلِمُونَ ○ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدْ اهْتَدَوْا

”کہو، ہم ایمان لاتے اللہ پر اور اس تعظیم پر جو ہماری طرف آتاری گئی ہے اور اس تعظیم پر جو ابراہیم، اسمعیل، اسحاق، یعقوب، اور ان کی اولاد پر آتاری گئی تھی اور جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے منقطع فرمان ہیں پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم لاتے ہو تو وہ سیدھے راستے پر ہیں“ (بقرہ: ۱۳۶-۱۳۷)



لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ  
أَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
وَإِنْ كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ○

”اور حقیقت ایمان لانے والوں پر اللہ کا بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کے

درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا رسول اٹھایا جو انہیں اُس کی آیات سُناتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو وہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے :-  
(آل عمران ۱۷۳)



الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا  
”آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کے طریقے کو پسند کیا :-  
(المائدہ ۳)



تَا لَّهِ لَقَدْ أَرْسَلْنَا إِلَىٰ أُمَمٍ مِّن قَبْلِكَ فَزَيَّنَّ لَهُمُ الشَّيْطَانُ  
أَعْمَالَهُمْ فَهُمْ قَلْبُومٌ وَلِيَهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ  
الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ  
يُؤْمِنُونَ ○

”بمخدا ہم نے (اے محمد) تم سے پہلے مختلف امتوں کی طرف ہدایت بھیجی مگر اس کے بعد شیطان نے اُن کے غلط اعمال کو اُن کے لیے توشہ بنا دیا چنانچہ آج وہی ان کا سر پرست بنا ہوا ہے اور وہ دردناک عذاب کے مستحق ہو گئے ہیں۔ اور ہم نے تم پر یہ کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ تم اُس حقیقت کو اُن کے سامنے واضح کرو جس میں اُن کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے، اور اس لیے کہ یہ کتاب ہدایت اور رحمت ہو اُن لوگوں کے لیے جو اس کی پیروی قبول کر لیں :-“

راخل - ۱۶۳-۱۶۴



يَا هَلْ الْكُتَيْبُ قَدْ جَاءَ كَثْرَ رَسُولِنَا يَبِينُ كَثْرَ كَثِيرًا امْتًا كُنْتُمْ  
 تُعْتَمُونَ مِنَ الْكُتَيْبِ وَيَعْتَمُونَ كَثِيرًا قَدْ جَاءَ كَثْرًا مِنَ اللَّهِ نُورًا وَكُتَيْبٌ  
 مُبِينٌ وَيَهْدِي بِهِ اللَّهُ مِنَ الشَّعْرِ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِنَ الظُّلُمَاتِ  
 إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ○

”اے اہل کتاب، تمہارے پاس ہمارا رسول آ گیا ہے جو تمہارے سامنے بہت سی  
 اُن چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جنہیں تم کتاب میں سے پھلتے ہو اور بہت سی  
 باتوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور ایک واضح  
 کتاب آگئی ہے جس کے ذریعہ وہ اُن لوگوں کو جو اس کی پسند کے مطابق چلتے ہیں اُن  
 سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور اپنے اذن سے انہیں تاریکیوں سے روشنی میں نکال  
 لاتا ہے اور سیدھی راہ کی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے“ ○  
 والمائدہ - ۱۵-۱۶



يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ○ وَدَاعِيًا

إِلَى النَّوِيذِيهِمْ وَيَسْرَجًا مَنِيرًا ○

”اے نبی، ہم نے تم کو گواہ اور خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کے  
 حکم سے اللہ کی طرف دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔“ ○



يَا مَرْهُمُ بِالْعُرُوفِ وَيَسْتَهْمُ عَنِ السُّنُكِيِّ وَيَجِدُ لَهُمُ الطَّبِيبِ

وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبِيثَاتِ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ

عَلَيْهِمْ قَالِيزِينَ اٰمَنُوۡا بِهِۦٓ وَعٰذَرُوۡهُ وَنَصَرُوۡهُ وَاتَّبَعُوا النُّوۡرَ  
الَّذِيۡ اُنۡزِلَ مَعَهُۥٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفۡلِحُونَ ﴿١٥٤﴾

» وہ ان کو نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزوں کو  
حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے، اور ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے  
اور ان بندشوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ دلبے اور جکڑے ہوئے تھے پس جو لوگ  
اس پر ایمان لائیں اور اس کی تائید و حمایت کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو  
اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (اعراف- ۱۵۴)



اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَۢ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اٰمَرَكَ اللّٰهُ  
وَلَا تَكُنۡ مِنَ الْخٰشِعِيۡنَ ﴿١٥٥﴾

» اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم پر حق کے ساتھ یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ  
تم اللہ کے بتاتے ہوئے طریقہ پر لوگوں کے درمیان فیصلے کرو اور خیانت کرنے  
والوں کے وکیل نہ بنو۔ (النساء- ۱۵۵)



هُوَ الَّذِيۡ اَرْسَلَ رَسُوۡلَهُۥٓ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الْحَقِّ لِيُظۡهِرَ لَهَا عَلٰى  
الدِّيۡنِ مُجۡبَہٗ ط

» وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ  
اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے۔ (الفتح- ۲۸)





قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَوَاتِ  
وَالْأَرْضِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَأَسْمِعُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ الْبَشَرِ  
الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○

”اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کہہ دو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اُس خدا کا  
رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کا مالک ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں  
جو بارنے اور جلائے والا ہے، پس ایمان لاؤ خدا پر اور اُس کے رسول نبی اُمی پر جو  
خدا اور اُس کے فریض پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی پیروی کرو تاکہ تم راہِ راست  
پالو“

(اعراف: ۱۵۸)



وَأَوْحِي بآلِي هَذَا الْقُرْآنِ لِيُذَكَّرُوا بِهِ وَمَنْ يَبْلُغْ

”اور کہو میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے تم کو اُو  
ہر اُس شخص کو خبردار کروں جسے یہ پہنچے“

(انعام: ۱۱۶)



مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ

النَّبِيِّينَ ○

”محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ  
اللہ کے رسول اور نبیوں کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں“

(احزاب: ۴۰)

# دیباچہ

خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ایک کارِ عظیم جس کو انھیں لیا گیا تھا، وہ بڑی حد تک تکمیل کو پہنچا اور توقع ہے کہ اسی کی مدد سے بقیہ کام بھی سرانجام پا جائے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے جو جماعتی تعلق مجھے رہا ہے اُس سے بالکل ہٹ کر بھی اگر دیانتداری سے اُن کی خدمات پر نظر ڈالی جائے تو بغیر کسی اندھی عقیدت کے یہ احساس ابھرتا ہے کہ اس دور میں جس نوعیت کے تبدل کے ساتھ نئی زبان میں، اور جس بڑے پیمانے پر موصوفیہ اسلام کی بنیادی صداقتوں اور اس کے مکمل نظام تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا ہے، اس کی مثال دُور دور تک نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں مغرب کی ٹھکانہ اور مادہ پرستانہ فکر کے اُٹھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کرنے میں جو جوش مولانا موصوف نے لیا ہے اُس نے صد ہا افراد کی زندگیوں کا نقشہ بدل ڈالا ہے اور یہ چیز مولانا کے لیے ایک گراں بہا سرمایہ آخرت ہے۔

مجھے مولانا موصوف سے شہادت ہونے کے وقت سے لے کر اب تک جس طرح کا تخلص و تعلق رہا ہے اُس کے ہوتے ہوئے جہاں میری یہ تمنا رہی ہے کہ مولانا کے علم و دستِ سر کو فروغ دینے کے لیے مختلف اسالیب اختیار کیے جاتیں، وہاں مجھے اس بات سے بھی سخت اجتناب رہا ہے کہ کبھی مولانا کی ذات، اُن کے اسیم گرامی، یا اُن کے کیے ہوئے کام کو حصولِ مفاد کا ذریعہ بنا یا جائے۔

اب سے کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے کمرے میں چند قریبی اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوتے برسبیلِ تذکرہ میں نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اگر مولانا پسند فرمائیں تو موصوف کی اپنی تحریروں سے سیرتِ نبویؐ مرتب کی جاسکتی ہے۔ اس پر میرے ایک نہایت ہی تخلص اور فاضل رفیق نے یہ خواہش ظاہر کی کہ یہ کام میں اُن کے لیے چھوڑ دوں۔ چنانچہ میں نے اُن کی اس خواہش کو قبول کر لیا۔ لیکن جب کئی سال گزرنے کے بعد بھی وہ رفیق اس کام کی انجام دہی کا موقع نہ پائے

قرآن کی اجازت سے میں نے ایک بار پھر مولانا کے سامنے اس تجویز کا ذکر کیا تو انہوں نے اس تجویز کے علاوہ بعض اور موضوعات پر بھی کام کرنے کے لیے مجھ کو چند ہدایات دیں۔

بالآخر کام شروع کر دیا گیا تو اندازہ ہوا کہ نسبت ایک ٹھوس اور تحقیقی کتاب اپنی طرف سے مرتب کرنے کے مولانا کے پورے لٹریچر میں سے عبارات نکال کر ایک کتاب مرتب کرنے کا کام بڑا بھاری اور محنت طلب ہے، کیونکہ تفہیم القرآن کی چھ جلدوں کے علاوہ ان کے وسیع لٹریچر کو پڑھنا، اس میں موضوع کے مطابق ضروری اور مفید مطالب عبارات کو نشان زد کرنا، پھر ان کی نقول تیار کرنا، اور پھر سب سے آخر میں ان کو ابواب اور فصول میں مرتب کرنا اور ان کی عنوان بندی کرنا، یہ سارا کام اتنا کٹھن تھا کہ بار بار دامنِ جہت تار جھریا تاکہ اس بھاری منصب کے کوئی بدلہ لانا شاید اپنے بس میں نہ ہی ہو۔

خوش قسمتی سے مجھے اس کام میں متعدد رفقاء کا تعاون حاصل ہو گیا اور خصوصیت سے مولانا عبدالکریم علوی ایم اے نے تقریباً ڈیڑھ سال میرے ساتھ اس طرح کام کیا کہ اگر میں یہ کہوں کہ اس خدمت میں سب سے زیادہ حصہ انہی کا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

غامرشی سے ڈیڑھ دو سال کے عرصہ میں انجام پانے والے اس کام کو سب تکمیل مرحلے پر پہنچنے کے بعد مولانا محترم کی خدمت میں لے جا کر پیش کیا گیا، تو ایک حد تک ان کو بھی اس پر حیرت ہوئی کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور نبوت کے متعلق اتنا وسیع مواد اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے، اور پھر یہ چیز بھی ان کے لیے کسی نہ کسی حد تک نسبت کا باعث ہوئی کہ چار سے ناچیز باتوں سے تقریباً تین جلدوں کی ابتدائی ترتیب مکمل ہو چکی ہے۔ ان میں سے پہلی جلد کا تعلق بنیادی مباحث، منصبِ نبوت اور نظامِ وحی پر بحث، آنحضرتؐ اور سابقِ نبوت کے احوال، اور دعوت کی مخاطب قوم اور عرب کے مختلف گروہوں کے احوال سے ہے۔ دوسری جلد حضورؐ کی پیدائش سے لے کر ہجرت مدینہ تک کے احوال و واقعات پر مشتمل ہے، تیسری جلد میں اس انتہائی سرگرم تحریکی زندگی کا مرقع سامنے آتا ہے جو کوہِ وصال تک حضورؐ نے دینے میں گزارا جو قومی جلدِ جاہلی بانی ہے اس میں حضورؐ کی اصلاحات، اہلیات، اور نظامِ زندگی مختلف شعبوں میں لائے جانے والے تغیرات کا نقشہ پیش کرنا مطلوب ہے۔ خدا کرے کہ ہم اسے بھی جلد مکمل کر سکیں۔

اس کتاب کو اس طرز پر مرتب کیا گیا ہے کہ جناب موضوعات کے مقالات اور مختلف عبارت

کو مختلف عنوانات کے تحت ایسی شکل سے ترتیب دیا جائے کہ مضمون پوری طرح مربوط ہو اور ضروری معلومات مناسب ترتیب کے ساتھ سامنے آتی جائیں۔ تھوڑے سے مقالات ایسے بھی ہیں جہاں مترجمین کو اپنی طرف سے یا کسی کتاب سے اقتد کر کے کوئی زیادہ عبارت شامل کرنی پڑی ہو گی۔ حوالہ بھی دے دیا گیا ہے۔ حواشی دو قسم کے ہیں: ایک وہ جو محترم مؤلف کی اپنی ہی تحریروں پر مشتمل ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو مترجمین کی طرف سے لکھے گئے ہیں۔ ان دونوں صورتوں کو الگ الگ واضح کر دیا گیا ہے۔ ابواب اور فصول میں جو مختلف اعتبارات مؤلف کی تحریروں سے لے کر استعمال کیے گئے ہیں ان کے حوالے کتاب کے آخر میں کیا دیئے جا رہے ہیں۔

یہ امر ہمارے لیے نہایت مسرت و اطمینان کا موجب ہے کہ خود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی علامات اور عظیم العزمتی کے باوجود ہمارے کیے ہوئے کام کو پڑھ ڈالا۔ اور مختلف مقالات پر تراجم بھی کیں۔ اور اپنی بعض عبارات کو شامل کرنے کے لیے نشانہ بھی بھی کی۔ اس کے باوجود اس کتاب کی ترتیب میں جہاں کہیں کوئی غلطی یا کوتاہی پائی جاتی ہے اس کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

اب یہ خدمت جو کچھ بھی ہے اور جیسی بھی ہے، اسے پیش کرتے ہوئے ہم دعا کرتے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ قبول ہو اور پڑھنے والوں کے لیے باعثِ رشد و ہدایت ہو۔ آخر میں ہم کتاب کے قارئین سے یہ درخواست بھی کریں گے کہ وہ ہمارے لیے دہلے خیر کرنے کے ساتھ ساتھ اس کام میں جہاں کہیں بھی غلطیاں اور کوتاہیاں پائیں، یا کسی مفید حذوت و اضافہ کی نشاندہی کر سکیں تو وہ ہمارے ساتھ ضرور تعاون کریں۔ ہم انشاء اللہ ان کے مشوروں کی روشنی میں اگلے ایڈیشن سے پہلے مسورے کی نظر ثانی کر کے اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

نعیم صدیقی

# عرض مرتبین

۔۔۔ بسلسلہ ترتیب جلد اول ۔۔۔

جلد اول کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس میں بنیادی مباحث کے زیر عنوان مولانا محمد مہتمم کی ان تمام تحریروں اور تقریروں اور ضروری اقتباسات کو جمع کیا گیا ہے جو یا تو منصب نبوت، نظام وحی، تصور دین اور دوسرے متعلقہ موضوعات پر روشنی بہم پہنچاتے ہیں اور دوسری طرف پشت کے دور اور اس سے پہلے کے تہذیبی، تاریخی، مذہبی اور سیاسی ماحول کو نمایاں کرتے ہیں۔ یہ مباحث اگرچہ براہ راست سیرت پاک کے سلسلہ واقعات کو پیش نہیں کرتے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت، آپ کے منصب اور آپ کی جدوجہد کو سمجھنے میں ان سے بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے ضروری سمجھا کہ واقعات سیرت کا مطالعہ کرنے سے پہلے قارئین ان رہنما مباحث سے گزر جائیں۔

مُرتَبین

در اصل اس تحریک کا نام ہے جو خدا سے واحد کی حاکمیت کے نظریہ پر انسانی زندگی کی  
**اسلام** پوری عمارت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ یہ تحریک قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی بنیاد اور  
ایک ہی ڈھنگ پر چلی آرہی ہے۔ اس کے رہنما وہ لوگ تھے جن کو رسول اللہ (خدا کے فرستادے) کہا  
جاتا ہے۔ ہمیں اگر اس تحریک کو چلانا ہے تو لامحالہ انہی رہنماؤں کے طرز عمل کی پیروی کرنی ہوگی کیونکہ  
اس کے سوا کوئی اور طرز عمل اس خاص نوعیت کی تحریک کے لیے نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلہ  
میں جب ہم انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم کا سراغ لگانے کے لیے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک بڑی ہمت  
کا سامنا ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں جو انبیاء گزرے ہیں ان کے کام کے متعلق ہمیں کچھ زیادہ معلومات  
نہیں ملتی۔ قرآن میں کچھ مختصر اشارات ملتے ہیں مگر ان سے مکمل اسکیم نہیں بن سکتی۔ بائبل کے عہدِ  
(New Testament) میں سینتالیس علیہ السلام کے کچھ غیر مستند اقوال بھی ملتے ہیں جن سے  
کسی حد تک اس پہلو پر روشنی پڑتی ہے کہ اسلامی تحریک اپنے بالکل ابتدائی مرحلے میں کس طرح چلائی  
جاتی ہے اور کن مسائل سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ لیکن بعد کے مراحل حضرت مسیح کو پیش ہی نہیں آتے  
کہ ان کے متعلق کوئی اشارہ وہاں سے مل سکے۔ اس معاملہ میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ سے صاف لؤ  
مکمل پہنچائی ملتی ہے اور وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس طرف ہمارے رجوع کرنے کی  
وجہ زری عقیدت مندی ہی نہیں ہے بلکہ دراصل اس راہ کے نشیب و فراز معلوم کرنے کے لیے  
اسی طرف رجوع کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ اسلامی تحریک کے تمام رہنماؤں میں سے صرف ایک محمد صلی اللہ  
علیہ وسلم ہی وہ تہنہا رہنما ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ  
کے قیام تک اور پھر قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل، دستور، داخلی و خارجی پالیسی اور نظم مملکت کے بیج  
تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات  
ملتی ہیں۔



# فہرست

۱۳	عرضِ مرتبین	۹	۳	دیباچہ	انتہاج
۲۵	مقدمہ (از مولف)	۳۳	۱۷	فہرست تصاویر و نقشہ جات	فہرست

## بلداقل - حصہ ۱

### سلسلہ ثبوت سے متعلق اصولی حقیقتیں

- باب ۱ - حقیقتِ ثبوت ۲۹ تا ۸۱
- فصل (۱) انسانیت کے لیے خدائی سلسلہ ہدایت ۳۱
- عظیم بن کر رہنے کی ہدایت ۳۱ - انجمن ۳۲ - ہجرت اور آئی سی شاق ۳۳ -
- فصل (۲) ثبوت کے متعلق عقل کا فیصلہ ۳۶
- جاننا بھانت کی بولیاں ۳۷ - ایک جداگانہ آواز ۳۷ - معاملہ عقل کی عدالت میں ۳۸ -
- تکذیب میں کی پوزیشن ۳۹ - تدریجوں کی پوزیشن ۳۹ - عقل کی عدالت کا فیصلہ ۵۰ -
- فصل (۳) ثبوت کی ضرورت و حقیقت ۵۳
- انسان کی سب سے بڑی ضرورت ۵۳ - جبری ہدایت کے بجائے الہامی ہدایت ۵۳ -
- مادی اور اخلاقی زندگی میں نشاناتِ ہدایت کی ضرورت ۵۳ - انسان کے لیے شعری نفاذ کی اہمیت ۵۵ -

### فصل (۴) پیغمبری کیا ہے ؟ ۵۷

- انسانی زندگی کی اہم ترین ضرورت ۵۸ - رسولوں کا منصب ۵۹ - پیغمبری کی پہچان ۵۹ -
- پیغمبری کا ماحول ۶۰ - پیغمبروں پر ایمان لانے کی ضرورت ۶۱ - تاریخ سلسلہ ثبوت ایک نظر

۶۲۔ پیغمبروں کا کام ۶۳۔ پیغمبروں کے انتخاب کا معاملہ کیا گیا؟ ۶۵۔

## فصل (۵) انبیاء کی مشترک دعوت اور ان کا منصب ۶۶

ازالہ فساد، انبیاء کا کام ۶۹۔ رسول بھیجنے کی غرض و غایت ۷۰۔ فیصلے کے وقت رسولوں کی بیعت ۷۱۔ جملہ انبیاء ایک ہی دین کے علمبردار تھے ۷۲۔ بعثت سے پہلے انبیاء کا شکر ۷۳۔ علم غیبی رسول ۷۴۔ انبیاء کی کڑی نگرانی ۷۵۔ براہ راست علم و مشاہدہ ۷۵۔ غیر معمولی قوتیں ۷۵۔ بشریت انبیاء ۷۶۔ عصمت انبیاء کا مفہوم ۷۶۔ اوصاف انبیاء کے متعلق چند آیات ۷۷۔

## باب ۲۔ وحی ۸۳ تا ۱۰۰

### فصل (۱) وحی کا مفہوم، اس کی صورتیں اور اس کی اقسام ۸۵

نفسی اور اصطلاحی معنی ۸۵۔ اقسام وحی ۸۵۔ غلط فہمی ۸۶۔ اقسام وحی کی مزید توضیح ۸۶۔ وحی بہ صورت خواب ۸۸۔ شہد کی گتھی پر وحی ۸۸۔ اتم نمونہ پر وحی ۸۹۔ شیاطین کا اپنے ساتھیوں پر وحی کرنا ۸۹۔ حضور پر وحی آنا انوکھا واقعہ نہیں ۸۹۔ حضور پر قرآن کا وحی کیا جانے ۹۰۔ حضور پر وحی آنے کے مختلف طریقے ۹۱۔ مزید توضیح ۹۲۔ قرآن کا پہلا کلام وحی الہی ہے ۹۲۔ وحی کی تشبیہ بادشہ سے ۹۳۔ وحی رسالت خدا کی رحمت ہے ۹۴۔ وحی رسالت کے لیے لفظ رُوح کا استعمال ۹۴۔ وحی کردہ کلام کے شواہد و دلائل ۱۰۰۔

## باب ۳۔ نبوتِ محمدی کی ضرورت اور اس کے دلائل ۱۰۱ تا ۱۵۳

### فصل (۱) پچھلے انبیاء کے بعد آپ کے مبعوث کیے جانے کی وجہ ۱۰۳

اہل عرب پہلے سے خود ایک نبی مانگ رہے تھے ۱۰۳۔ ایک روشن دلیل کے ظہور کی ضرورت ۱۰۴۔ تقابلی بعثت کا انتخاب ۱۰۶۔ جہالت زدہ قوم کے لیے بہترین رہنما ۱۰۷۔

### فصل (۲) نبوتِ محمدی کا عقلی ثبوت ۱۰۸

۱۳ صدیوں پہلے کی دنیا ۱۰۸۔ سرزمین عرب کے احوال ۱۰۹۔ ایک شخصیت ماننے آتی ہے ۱۱۰۔ اس کا کردار ۱۱۱۔ ذہنی و روحانی تغیر ۱۱۲۔ پیغام انقلاب ۱۱۳۔ قوم کا رد عمل ۱۱۳۔ تمثیل شدائد کیوں؟ ۱۱۳۔ انقلابِ حال کا دوسرا پہلو ۱۱۴۔



ما فوق ہستی ۱۱۸ — تاریخ ساز شخصیت ۱۱۹ — اس کی کمال درجہ استبازی ۱۲۰ —

### فصل (۳) نبوت محمدی پر قرآن میں استدلال ۱۲۲

— (چند اہم نکات) —

آتی ہونے سے نبوت پر استدلال ۱۲۲ — نبوت سے پہلے کی زندگی سے استشہاد ۱۲۶ —  
قرآن ایک معجزانہ کلام اور نبوت کی دلیل ہے ۱۳۲ —

### فصل (۴) ہیئت سرورِ عالم کے متعلق قرابت و انجیل کی پیشین گوئیاں ۱۳۳

حضرت عیسیٰ کا ایک اہم قول ۱۳۳ — تورات کی صریح پیشین گوئی ۱۳۴ —

— انجیل میں نبوت محمدی کی بشارت ۱۳۶ —

(۱) محمدؐ اور احمدؑ ۱۳۷ — حضرت مسیحؑ، حضرت الیاسؑ اور زوہنبیؑ ۱۳۸ — انجیل یوحنا کی

عبارات ۱۳۸ — متذکرہ عبارات کے مفہوم کا تعین ۱۳۹ — وہ دنیا کا سردار ہوگا ۱۴۰ —

مؤمنان ۱۴۱ — نجاشی کی شہادت ۱۴۲ — انجیل برناباس ۱۴۳ — انجیل برناباس کا تعارف ۱۴۴ —

عیسائی انجیل برناباس کے کیوں مخالف ہیں؟ ۱۴۶ — انجیل برناباس کی منفصل پیشین گوئیاں ۱۴۸ —

روشہات کا جواب ۱۵۱ —

### باب ۴ — سرورِ عالم ۱۵۵ تا ۱۶۴

فصل (۱) سرورِ عالم، پوری دنیا کی مشترک میراث ۱۵۷

فصل (۲) سرورِ عالم کا اصلی کارنامہ ۱۶۱

ایمان عمل انگیز قوت ہے ۱۶۱ — پوری زندگی کے لیے خدا پرستانہ اخلاق ۱۶۲ —

حضورؐ کی تعلیم کے چند اسباق ۱۶۲ —

### باب ۵ — ختم نبوت ۱۶۹ تا ۲۲۷

فصل (۱) ختم نبوت کی حقیقت اور اس کے دلائل ۱۷۱

ختم نبوت کی صریح توجیہ ۱۷۱ — حضورؐ سے پہلے کے دور کے مخصوص احوال ۱۷۱ — تکمیل

دین اور ختم نبوت ۱۷۲ — ختم نبوت پر دلائل ۱۷۳ — تمام نوع انسانی کے لیے ذریعہ ہدایت ۱۷۳ —

ساری انسانیت کے لیے بشیر و نذیر ۱۷۵۔ آپ نوح انسانی کے لیے خدا کی رحمت ہیں ۱۷۶۔  
 آپ تمام انسانوں کے لیے رسول بنا کر بھیجے گئے ۱۷۶۔ آپ ہی خدا کے آخری نبی ہیں ۱۷۸۔  
 آپ پر نبوت کے ختم ہونے کے متعلق ایک اہم اشارہ ۱۷۸۔ منکرین ختم نبوت کے خلاف چند  
 آیات سے استدلال ۱۸۰۔ خاتم النبیین کے بعد دوسرے نبوت ۱۸۲۔ ختم نبوت کے خلاف  
 قادیانیوں کی ایک اور دلیل ۱۸۸۔ آیت ختم نبوت میں تین دلائل ۱۹۱۔

فصل (۲) عقیدہ ختم نبوت پر جامع تحقیقی بحث ۱۹۳

خاتم النبیین کے لغوی معنی ۱۹۵۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ۱۹۶۔ صحابہ کرام  
 کا اجماع ۲۰۱۔ علمائے امت کا اجماع ۲۰۳۔ ایک اہم سوال ۲۰۹۔ اب نئے نبی  
 کی آخر ضرورت کیا ہے ۲۱۰۔ نئی نبوت اب امت کے لیے رحمت نہیں ۲۱۱۔

فصل (۳) مسیح موعود کی حقیقت احادیث کی روشنی میں ۲۱۳

احادیث درباب مسیح موعود ۲۱۳۔ ابن احادیث سے کیا ثابت ہوتا ہے ۲۲۲۔

فصل (۴) قادیانیوں کی فریاد و طرارت باطلہ ۲۳۱

مرحہ نصوص سے گریز ۲۳۱۔ زبردستی کا استدلال ۲۳۲۔ سورۃ اعراف کی آیت کا  
 صحیح مفہوم ۲۳۲۔ سورۃ مومنون کی آیت کا مفہوم ۲۳۳۔ احادیث سے قادیانیوں کا  
 غلط استدلال ۲۳۴۔ خاتمہ کلام ۲۳۵۔

باب ۶۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت شخصی اور حیثیت عمومی ۲۳۸ تا ۲۳۹

فصل (۱) اختیار و اطاعت رسول ۱۴۱

تعلیم، ترقی اور نمونہ ۲۴۱۔ صرف پیغام بری نہیں ۲۴۱۔ ہوائے نفس سے محفوظ ۲۴۲۔  
 برحالت میں واجب اطاعت نمونہ ۲۴۳۔ آپ خدا کے مانور کردہ امیر تھے ۲۴۳۔  
 رسول کی اطاعت پر حیثیت امیر ۲۴۴۔ ایک عجیب طرز استدلال ۲۴۵۔ حضور  
 کی امارت کی امتیازی شان ۲۴۵۔ اطاعت کے تین مراتب ۲۴۵۔ مذہبی اور  
 تمدنی امور کی غلط تفریق ۲۴۶۔

فصل (۲) نبی کی اطاعت اور آزادی رسلے کا اسلامی تصور ۲۴۸

حاکم صرف اللہ سے ۲۴۸۔ انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی ۲۴۹۔ نبی کی اطاعت  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کس حیثیت سے ۲۴۹ — بے چون و چرا اطاعت ۲۵۰ — نبی لوگوں کو اپنا بندہ نہیں بنا سکتا۔  
 نبی پر حیثیت نبی کی اطاعت ۲۵۱ — نبی کی اطاعت خدا کے حکم کے تحت ۲۵۲ — حضور کے  
 مشن کے مدد سے ۲۵۳ — آزادی راستے کو نشوونما دینے کی چند مثالیں ۲۵۴ — حضرت زینہ کے  
 واقعہ کی حقیقت ۲۵۵ — حضور کی تعلیم کردہ حریت نکر ۲۵۶ — حریت فکر خلافت راشدہ کے  
 بعد ۲۵۷ — ائمہ فقہاء کی حریت منکر ۲۵۸ — اسلامی حریت منکر و نظر کی تباہی کا  
 دور ۲۵۸۔

### فصل (۳) رسالت اور اس کے احکام ۲۶۰

ایک گروہ کا نقطہ نظر ۲۶۰ — دوسرے گروہ کا نقطہ نظر ۲۶۱ — تیسرے گروہ کا  
 نقطہ نظر ۲۶۱ — چوتھے گروہ کا نقطہ نظر ۲۶۱ — پچھپے سے انبیاء کی تربیت کا خصوصی اہم  
 ۲۶۲ — غیر معمولی قابلیتیں اور خصوصی صلاحیتیں ۲۶۳ — خدا کی طرف سے نگرانی اور حماقت  
 کا انتظام ۲۶۴ — حاکم ۲۶۹ — نبی کامل و اکمل بشریت سے آراستہ ہوتا ہے۔ ۲۷۰ —  
 بحث سے متعلق چند آیات ۲۷۱ — نبی اور عام انسانوں کا فرق ۲۷۲ — اطاعت نبی کا  
 حکم مطلق ہے ۲۷۲ — نبی کی اطاعت معمولی انسانوں کی اطاعت نہیں ۲۷۳ — نبی کی نثرانی  
 کے لیے وحی غیر مشکوٰۃ ۲۷۳ — حضور پر وحی غیر متلو ہونے کی چند مثالیں ۲۷۴ — تذکرہ آیات  
 کا حاصل ۲۷۵ — نبی کی راست روی مکمل طور پر قابل اعتماد ہے ۲۷۶ — نبی کی پوری زندگی  
 اسوۂ حسنہ ہے ۲۷۷ — دائرۃ استنباط ۲۷۷ — رسول ہمہ وقت رسول ہے ۲۷۸ —  
 اصل مقصد رسالت پر حضور کی توجہ ۲۷۹ — انبیاء کی زندگی کے دو شعبے ۲۸۰ — نبی کی امارت  
 اور غیر نبی کی امارت کا فرق ۲۸۰۔

### فصل (۴) رسول کی حیثیت شخصی و حیثیت نبوی کا جائزہ ۲۸۲

بحث کا نظریہ پہلو ۲۸۳ — بحث کا عملی پہلو ۲۸۵ — چند قابل غور مثالیں ۲۸۶ — ذرا  
 مابعد میں حیثیت نبویہ کے تعین کی صورت ۲۸۷۔

### فصل (۵) منصب نبوت اور اس کے فرائض از رُشے قرآن ۲۸۹

رسول کے چار شعبہ ہائے کار ۲۸۹ — رسول پر حیثیت شارح کتاب اللہ ۲۹۰ — رسول  
 پر حیثیت پیشوا اور نمونہ تقلید ۲۹۱ — رسول پر حیثیت شارح ۲۹۳ — رسول پر حیثیت قاضی  
 ۲۹۳ — رسول پر حیثیت حاکم و فرماں روا ۲۹۵ — عدلیہ کا طریق کار حضور کے عہد مبارک میں ۲۹۶ —  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اسلامی نظام کی دستوری بنیادیں اور ان میں رسول کی حیثیت ۲۹۶۔

### فصل (۶) حضور پر قرآن کے علاوہ وحی کا نزول ۳۰۱

قبلہ کا تعزیر ۳۰۳۔ فتح مکہ کی بشارت ۳۰۴۔ راز کی بات ۳۰۵۔ نکاح زینب ۳۰۵۔ رحمت  
کاشنے کی اجازت ۳۰۶۔ جنگ بدر سے پہلے کا وعدہ ۳۰۶۔ مسلمانوں کی فریاد کا جواب ۳۰۷۔  
اذان اور نماز جمعہ ۳۰۷۔ نماز پڑھنے کا طریقہ ۳۰۸۔

## باب ۷۔ بشریتِ رسول ۳۰۹ تا ۳۲۵

### فصل (۱) نبوت و بشریت ۳۱۱

نظریہ جاہلیت کہ پیغمبر بشر نہیں ہو سکتا ۳۱۱۔ مشرکین مکہ کا نقطہ نظر ۳۱۱۔ نبوت اور  
خدا رسیدگی کے متعلق جاہلانہ تصورات ۳۱۲۔ نبی کا بشر ہونا کیوں ضروری ہے ۳۱۲۔  
انسان کی رہنمائی کے لیے انسان ہی نبی ہو سکتا ہے ۳۱۳۔

### فصل (۲) بشریتِ انبیاء ۳۱۴ تا ۳۱۸

آدم علیہ السلام بشر تھے ۳۱۴۔ نوح علیہ السلام کی بشریت ۳۱۵۔ حضرت ہود کی بشریت  
۳۱۶۔ حضرت صالح و شعیب کی بشریت ۳۱۸۔ حضرت موسیٰ و ہارون کی بشریت ۳۱۸۔  
تمام انبیاء کی بشریت ۳۱۸۔

### فصل (۳) نبی اکرم بھی انسان تھے ۳۱۹

قدیم جاہلانہ خیال ۳۱۹۔ ہدایت پانے میں رکاوٹ ۳۲۰۔ ہمیشہ انسانوں ہی کو رسول  
بنایا گیا ۳۲۱۔ بنی اور نابینا کا فرق ۳۲۲۔ نبی کو فرشتہ ہرنا چاہیے تھا ۳۲۳۔ نبی ہوتا تو  
کرتی بڑا آدمی ہوتا ۳۲۳۔ حضور پر سنی معاشل کا اعتراض ۳۲۴۔

## باب ۸۔ دین حق ۳۲۶ تا ۳۴۸

### فصل (۱) مذہب کا جاہلی تصور اور اسلامی تصور ۳۲۹

ہمد گیر اور جامع تصور دین ۳۳۰۔ ایک خاص طریق فکر اور نقطہ نظر ۳۳۱۔ فیصلہ کن  
معیار آقا ۳۳۲۔ مسجد سے میدان کارزار تک ۳۳۲۔ انقلابی تصور ۳۳۳۔

### فصل (۲) دین حق کیا ہے ؟ ۳۳۳

الذین کا مفہوم ۳۲۵ — اسلام کا مفہوم ۳۲۶ — قرآن کا دعویٰ کیا ہے ۳۲۷ — طریق زندگی کی ضرورت ۳۲۸ — زندگی کا اقسام پذیر ہونا ۳۲۸ — زندگی کی جغرافی اور نسلی تقسیم ۳۲۹ — زندگی کی زمانی تقسیم ۳۳۰ — انسان کیسے طریق زندگی کا حاجت مند ہے ۳۳۱ — کیا یہاں نظام انسان خود بنا سکتا ہے ۳۳۲ — الذین کی نوعیت ۳۳۲ — انسانی ذرائع کا جاننا ۳۳۳ — خواہش ۳۳۴ — عقل ۳۳۵ — سائنس ۳۳۶ — تاریخ ۳۳۶ — بائوس کون نتیجہ ۳۳۷ — امید کی ایک ہی کرن ۳۳۸ — قرآن کے دلائل ۳۳۸ — خدائی ہدایت کے پرکھنے کا معیار ۳۵۰ — ایمان کے تقاضے ۳۵۱ —

### فصل (۳) اسلام اور جاہلیت کی کشمکش ۳۵۲

— زندگی کے پار نظر تھے ۳۵۲ —

(۱) جاہلیت خالصہ ۳۵۲ — (۲) جاہلیت مشرکانہ ۳۵۴ — (۳) جاہلیت راہبانہ

۳۶۰ — (۴) اسلام ۳۶۲ — انبیاء کا مشن ۳۶۵ —

### فصل (۴) دین کا شہ آنی تصور ۳۶۷

نسفی تحقیق ۳۶۷ — جامع اصطلاح ۳۶۹ — ایک مغالطہ ۳۷۰ — قانون ملکی اور دین

۳۷۲ — دین اپنا اقدار چاہتا ہے ۳۷۲ — حضور کے کارنامے سے استشاد ۳۷۵ —

دین ایک جامع اصطلاح ۳۷۵ —

## باب ۹ — معجزات ۳۷۹ تا ۴۰۶

### فصل (۱) مسئلہ معجزات ۳۸۱

منکرین معجزات کی الجھن ۳۸۱ — اصل سوال ۳۸۱ — دو نقطہ ہوتے نظر ۳۸۲ —

— معجزات کے برحق ہونے کے دلائل ۳۸۲ —

قانون فطرت اور خدا کا بالاتر اختیار ۳۸۳ — کائنات میں غیر معمولی عجائبات ۳۸۳ —

### فصل (۲) انبیاء سے سابق کے معجزات پر ایک نظر ۳۸۳

حضرت صالح کی اڈنی کا معجزہ ۳۸۳ — اسیا سے موسیٰ کا معجزہ ۳۸۵ — حضرت ابراہیم

کے لیے چشمہ شفا ۳۸۶ —

### — معجزات حضرت ابراہیم ۳۸۶ —

چار پرندوں کو زندہ کرنے کا واقعہ ۲۸۶ — حضرت ابراہیمؑ کے ہاں بڑھاپے میں اولاد کی پیدائش ۲۸۷ — حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے بچایا جانا ۲۸۷ —  
 — معجزات حضرت موسیٰؑ ۲۸۷ —  
 عصائے موسیٰ ۲۸۸ — آل فرعون پر متعدد تیشی عذاب ۲۸۸ — نشانیاں ۲۸۹  
 عسائے بکر کا پھٹنا ۲۹۰ — من و سلویٰ کا نزول ۲۹۱ —  
 — معجزات حضرت سلیمانؑ ۲۹۲ —  
 پرندوں کی بولیوں کا علم ۲۹۲ — ان کے لیے جنوں کا مٹھنا ۲۹۲ — ملک سبنا کے تخت کا آنا فنا لایا جانا ۲۹۲ —

— دوسرے انبیاء کے چند اور عجبات ۲۹۳ —  
 قصہ یونسؑ کے معجزاتی پہلو ۲۹۳ — حضرت زکریاؑ کے لیے سن رسیدہ بیوی سے اولاد ۲۹۳ —  
 — معجزات حضرت عیسیٰؑ ۲۹۳ —  
 حضرت عیسیٰؑ کا بے باپ پیدا کیا جانا ۲۹۳ — نوزائیدہ بچے کا گہوارے میں کلام کرنا ۲۹۵ — قرآن کے ذکر کو دوسرے معجزات ۲۹۷ —  
 — حضور اور معجزات ۲۹۷ —  
 قرآن ہی کو دلیلِ نبوت بنایا گیا ۲۹۷ — بطور خود معجزات دکھانے پر حضورؐ قادر نہیں تھے ۲۹۸ — حضورؐ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ۲۹۹ — حضورؐ کو حسی معجزہ کے بجائے عقلی معجزہ دینے کی وجہ ۳۰۰ —

### فصل (۳) ایک عظیم حسی معجزہ ۲۰۳

شق الثمر سے متعلق روایات ۲۰۲ — روایات کا ماہی حاصل ۲۰۳ — واقعہ حقیقی نوعیت ۲۰۴ — اعتراضات اور جواب ۲۰۵ —

## باب ۱۰ — مسئلہ شفاعت ۲۰۹

### فصل (۱) مسئلہ شفاعت کے مختلف پہلو ۲۰۹ تا ۲۲۴

خدا کے ہاں کسی کا زور نہیں چلتا ۲۱۰ — مستحق عذاب لوگوں کے لیے کوئی سفارش نہیں ہے۔  
 سفارش کے لیے روانہ اذن ضروری ہے ۲۱۲ — شفاعت پر پابندی کی وجہ ۲۱۳ —  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

مشرکین کے فرعونہ سفارشی ۴۱۶۔ بیٹے کے لیے حضرت نوح کی دعا کی مثال ۴۱۸۔ دنیوی زندگی میں سفارش کا مشرکاً نہ تصور ۴۱۹۔ اللہ کے فیصلے کو کوئی نہیں مائل سکتا ۴۲۲۔ شہادت کے روزاڑے کی بندش ۴۲۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر حشیت شایع روزِ محشر ۴۲۳۔

## باب ۱۱۔ حضور کی چند اہم پیشینگوئیاں ۴۲۵ تا ۴۲۸

### فصل (۱) قرآن کی پیشین گوئیاں ۴۲۴

روشن مستقبل ۴۲۴۔ غلبہ دین کی پیشین گوئی ۴۲۴۔ بہتر دور کی یقین دہانی ۴۲۸۔  
 بوجہ آثار نے کا مفہوم ۴۲۹۔ نفع ذکر ۴۲۹۔ شرح صدر ۴۳۲۔ بشارت کوثر ۴۳۲۔  
 بشارت کوثر کا آخری پہلو ۴۳۴۔ ابولہب کا انجام بد ۴۳۰۔ اہل مکہ کے لیے نبی کو نکالنے کی سزا ۴۳۱۔ جمعیت قریش کی ہزیمت ۴۳۱۔ مکہ مفتوح ہو گا ۴۳۲۔ قرآنی دعوت چھانچا کے سبب کی ۴۳۲۔ انصحر کے لیے تہ تیغ ۴۳۲۔ انصحر کے لیے مقامِ حمزہ ۴۳۵۔ شکستِ خورہ روم کے لیے فتح کی خبر ۴۳۵۔ نعش فرعون کا استحفاظ ۴۳۹۔ یا جوج ماجوج کی لگبگ یورش ۴۵۰۔ یہود کی ذلت و منکنت ۴۵۱۔

### فصل (۲) احادیث میں پیشین گوئیاں ۴۵۲

کامل امن کا دور ۴۵۲۔ عرب و عجم پر غلبہ کی شرط ۴۵۲۔ قریش کا سیاسی اقتدار ۴۵۳۔  
 جہاد جاری رہے گا ۴۵۳۔ مسلمانوں کا بگاڑ یہود و نصاریٰ کی طرح کا ہو گا ۴۵۳۔ قت کی تاریخ باند کا خاکہ ۴۵۳۔ اُمراء و حکام کا بگاڑ ۴۵۵۔ سلسلہ تجدید دین ۴۵۵۔ مسلمانوں میں افتخار کا ظہور ۴۵۶۔

### ظہور ہندی کے متعلق پیشین گوئیاں ۴۵۶

روایات میں مسیح اور وضعی عنصر ۴۵۴۔ حضور کی پیشین گوئیوں کا اندازہ ۴۵۴۔ متعلقہ روایات کی تولیدگی ۴۵۴۔ مجددِ کامل کا مقام ۴۵۸۔ ہندی کے متعلق مزوجہ تصور ۴۵۸۔ ہندی کے متعلق نزولت کا اندازہ ۴۵۹۔ مہدویت دعویٰ کرنے کی چیز نہیں ۴۵۹۔ ہندی کے کام کی نوعیت ۴۵۹۔

### مسیح علیہ السلام کی آذربائی کے متعلق حضور کی پیشینگوئیاں ۴۶۰

متعلقہ احادیث ۴۶۰۔ شیل مسیح کا تصور باطل ہے ۴۶۹۔

— دجال اور شمس کا ظہور ۴۶۹ —

ظہور دجال کے زمانہ کا عہدِ تعین ۴۶۹ — حضور کے مختلف قیاسات ۴۶۹ — حضور کے ایشادات کے دو اجزاء ۴۷۰ — مجرور دم کی جدا گانہ حیثیت ۴۷۰ — حضور کی اپنی تعین سے رہنمائی ۴۷۱ —

حضرت عمار بن یاسر کے قتل کی پیشین گوئی ۴۷۱ — قرب قیامت کی دس نشانیاں ۴۷۲ —

باب ۱۲۔ قرآن اور حضور کے متعلق مستشرقین کی علمی خیانتیں ۴۷۳ تا ۴۸۸

فصل (۱) مستشرقین کا نامقول طریق کار ۴۷۳

فصل (۲) نجیب راجہ کا افسانہ ۴۷۴

حضور کی قوم نے اعتراض کیوں نہ اٹھایا؟ ۴۷۵ — کفار مکہ کا اعتراض کیا تھا؟ ۴۷۹ —

پہلی تیغ ۴۸۰ — دوسری تیغ ۴۸۰ — تیسری تیغ ۴۸۰ — چوتھی تیغ ۴۸۱ —

فصل (۳) قرآن کے تین قصص کی بحث ۴۸۲

— (۱) حضرت موسیٰ کا سفر مع البحرین ۴۸۲ —

قصہ کی تفصیلات ۴۸۲ — تلمذ کا بیان ۴۸۳ — مستشرقین پر جرح کے لیے ۳ سوال ۴۸۴ —

— (۲) فرعون کا ارادہ قبل موتی ۴۸۵ —

دعوت حق کے نقطہ نظر سے قصہ کی اہمیت ۴۸۶ — درعیان تختی کی شبراہگیری ۴۸۷ —

— (۳) قصہ اصحابِ کہف ۴۸۷ —

غار میں مدت قیام پر اعتراض ۴۸۷ — گبن کی جہارت ۴۸۷ — عیسائی نوشتوں سے

شہادت ۴۸۷ — دو طرفہ روایات میں یکسانی ۴۸۸ —



بلداقل — حصہ ۲

بعثت سے پہلے کا ماحول

(۱۔) اقوامِ ماضیہ

باب ۱۳۔ سابق امتوں کی تباہی اور ان کے آثار ۴۸۹ تا ۵۶۶

فصل (۱)، ابتدائیہ ۴۹۱

فصل (۲)، قوم نوح ۴۹۳

ایک بڑے طوفان کا تاریخی ریکارڈ ۴۹۳ — قوم نوح کا بگاڑ ۴۹۵ — حضرت نوح کی  
مسیحی اصلاح ۴۹۵ — عذاب ۴۹۶ — کیا طوفان عالمگیر تھا، ۴۹۷ — کشتی نوح ایک  
نشانِ عبرت بن گئی ۴۹۷۔

فصل (۳)، قوم عاد ۴۹۹

وجہ تسمیہ ۴۹۹ — قوم عاد کا مسکن ۴۹۹ — مسکن عاد کی موجودہ حالت ۵۰۰ —  
تباہی سے پہلے کی خوش حالی ۵۰۱ — قرآن میں ان کے عروج و اشکبار کا ذکر ۵۰۱ — ان پر  
نزولِ عذاب کی وجہ ۵۰۲ — عذاب کے بارے میں قرآنی تصریحات ۵۰۲۔

فصل (۴)، قوم ثمود ۵۰۳

تعارف ۵۰۳ — قوم ثمود کا مسکن ۵۰۳ — قوم ثمود ۵۰۳ — آثار ثمود ۵۰۳ — مادی ترقی اور اخلاقی بگاڑ ۵۰۳۔  
سرکشی کے تین وجوہ ۵۰۴ — خیر و شر کی کشمکش ۵۰۴ — منجھڑ کا مطالبہ ۵۰۴ — فیصلگی  
نشانی ۵۰۴ — اوشنی کا قتل ۵۰۸ — حضرت صالح کے خلاف اشرار کی سازشیں ۵۰۹  
عذاب کی تفصیل ۵۰۹ — اہل ایمان کو بچایا گیا ۵۱۰ — ثمود کا تمدنی عروج اور اس کے آثار ۵۱۰۔

فصل (۵)، قوم ابراہیم ۵۱۲

ابراہیم علیہ السلام ۵۱۲ — مولدِ ابراہیم ۵۱۲ — شہر ابرہہ کے متعلق تاریخی و تمدنی معلومات  
۵۱۲ — تہنیتات، معابد اور مذہبی مراسم ۵۱۳ — ناردیوتا کا مقام ۵۱۳ — ثمودی  
سلطنت کا آغاز، عروج اور خاتمہ ۵۱۳ — تعلیمِ ابراہیمی کے اثرات بعد کے اوقات میں ۵۱۳۔  
مکمل مشرکانہ نظامِ تمدن ۵۱۵ — ثمودی نظامِ مشرک کا جائزہ ۵۱۵ — حضرت ابراہیم کی  
محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

دعوتِ توحید کی سیاسی زو ۵۱۶۔ حضرت ابراہیم کا اتمامِ نجات ۵۱۶۔ تارِ نمود اور گلزارِ غیبی ۵۱۶۔ نمود کا بیان ۵۱۸۔

### فصل (۷) قومِ لوط ۵۲۱

قومِ لوط کا علاقہ ۵۲۱۔ قومِ لوط کا بگاڑ ۵۲۲۔ نمود کا بیان ۵۲۵۔ قرآن کا اعجاز بیان ۵۲۶۔ نبی کی دعوت پر ردِ عمل ۵۲۶۔ فرشتوں کی آمد ۵۲۷۔ حضرت لوط کی پریشانی ۵۲۸۔ نذولِ عذاب ۵۲۸۔ بائبل میں اس عذاب کی تفصیلات ۵۲۱۔ حالیہ انکشافات ۵۲۲۔

### فصل (۸) قومِ سبا ۵۳۲

قومِ سبا کا علاقہ ۵۳۲۔ مشہورِ عظیم قوم ۵۳۲۔ سبا کی مذہبی تاریخ ۵۳۵۔ ۶۵۰ ق م سے پہلے کا دور ۵۳۶۔ ۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک کا دور ۵۳۶۔ ۱۱۵ ق م سے ۶۰ ق م تک کا دور ۵۳۷۔ ۶۰ ق م کے بعد سے آغازِ اسلام تک کا دور ۵۳۷۔ قومِ سبا کا مادی عروج ۵۳۸۔ تجارتی زوال کا آغاز ۵۳۹۔ عذابِ پہلے کا سفرِ فائز تثنیٰ ۵۴۰۔

### فصل (۸) اہلِ مدین و اصحابِ الانبیاء ۵۴۱

تاریخی تحقیق ۵۴۱۔ دو قبیلوں کے لیے مشترک نبی کیوں ۵۴۲۔ اہلِ مدین کے تعلق مزید تفصیلات ۵۴۲۔ دعوتِ اصلاح کا ردِ عمل ۵۴۲۔ اہلِ مدین پر عذاب ۵۴۳۔ اصحابِ الانبیاء پر عذاب ۵۴۳۔

### فصل (۹) قومِ یونس ۵۴۱

حضرت یونس کے حالاتِ زندگی ۵۴۶۔ قرآن اور بائبل میں مذکورہ یونس علیہ السلام ۵۴۷۔ قومِ یونس کی آخری تباہی ۵۴۷۔

### فصل (۱۰) بنی اسرائیل ۵۴۸

نسلِ ابراہیمی کی روشنائیں ۵۴۸۔ فلسطین میں بدترین شک کا دور ۵۴۹۔ بنی اسرائیل میں جگڑ کا سبب ۵۴۹۔ نتائجِ بد ۵۵۰۔ دورِ خمیر و فلاح ۵۵۰۔ دورِ فساد و شجران ۵۵۱۔ بابل کی اسیری کے زمانے میں بنی اسرائیل کا کردار ۵۵۲۔ دورِ تجدید و احیاء ۵۵۴۔ یونانی تسلط اور اس کے غلامت کشمکش ۵۵۵۔ دوسرا دورِ فساد ۵۵۶۔ تازیانہِ مشیت ۵۵۸۔ آخری اتمامِ نجات ۵۵۸۔ حضرت یحییٰ اور ان سے بنی اسرائیل کا سلوک ۵۵۹۔ حضرت عیسیٰ اور ان سے بنی اسرائیل کا سلوک ۵۶۰۔

### فصل (۱۱) اصحابِ الرضیٰ ۵۶۶

جلد اول — حصہ ۳  
بعثت سے پہلے کا ماحول  
(ب) مرقہ جذباب

باب ۱۳ — مُشْرِکِیْن ۵۶۷ تا ۵۹۳

- فصل (۱) پوری انسانی دنیا پر ایک حسبِ حالی نظر ۵۶۹  
 روم، یونان اور ہند ۵۶۹ — شرک کا عالمگیر روگ ۵۷۰ — انسانیت کی پہلے تقسیم کا وقت ۵۷۱ —  
 فصل (۲) مُشْرِکِیْن عرب کا مذہب اور معاشرتی رسوم و اطوار ۵۷۲  
 مُشْرِکِیْن عرب کا معاشرہ ایک نظر میں ۵۷۲ — حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمعیلؑ کی پیروی کا رسوم ۵۷۳ —  
 — مُشْرِکِیْن عرب کے چند مشہور بُت ۵۷۴ —  
 لات ۵۷۴ — عزیٰ ۵۷۴ — منات ۵۷۵ —  
 — قوم قریظ کے آسمان ۵۷۵ —  
 (۱) دَدَد ۵۷۵ — (۲) سَوَاع ۵۷۶ — (۳) نِیْفُوْث ۵۷۶ — (۴) نِیْفُوْک ۵۷۶ —  
 (۵) نَسْر ۵۷۶ — مشہور بُت بعل ۵۷۶ — بُت پرستی کے ساتھ خدا کا برتر تصور ۵۷۷ —  
 احوال میں خدا کے ساتھ بُتوں کا حصہ ۵۷۸ — خدا پر بُتوں کو ترجیح ۵۷۹ — مُشْرِکِیْن کی اصل  
 گمراہی کیا تھی؟ ۵۷۹ — اپنے معبودوں کے متعلق اہل عرب کے تصورات ۵۸۰ — سلف  
 صالحین کے بُت ۵۸۲ — اصحابِ قبور کی پرستش ۵۸۲ — فرشتوں کے زمانہ معیتوں کی  
 پرستش ۵۸۳ — تقدیر کا بہانہ ۵۸۳ — باپ دادا کی اندھی تقلید ۵۸۳ — عیسائیوں کی  
 گمراہی سے بُت پرست اہل عرب کا استدلال ۵۸۳ — مُشْرِکِیْن کے خداؤں کی اقسام ۵۸۳ —  
 عرب میں تمبہ گری کی ضرورتیں ۵۸۵ — بُتوں کے استعاروں پر فال گیری ۵۸۵ — نذر و نیاز کے  
 طریقے ۵۸۶ — جانوروں کو شکر کے پھوڑنا ۵۸۶ — زمانہ جاہلیت میں عربوں کا حج ۵۸۶ —  
 مظاہر قدرت سے شگون لینا ۵۸۷ — جنات کے بارے میں توہم پرستی ۵۸۸ — کثرت ازواج  
 ۵۸۸ — مائضہ سے سلوک ۵۸۸ — طلاق در طلاق کا رواج ۵۸۸ — یتامیٰ پر زیادتیاں ۵۸۸ —  
 یتامیٰ کے ساتھ عرب میں کیا سلوک ہوتا تھا؟ ۵۸۹ — قتلِ اولاد کی ضرورتیں ۵۹۰ — عورتوں اور بچوں

کی میراث سے محرومی ۵۹۰۔ وراثت کا ایک رواج ۵۹۰۔ لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا ۵۹۰۔  
قتل کا انتقام ۵۹۳۔ تصدیق پاس و برنگی ۵۹۳۔ عربوں میں پہلی ہوتی عام بد امنی اور طوائف الملک کی ۵۹۳۔

## باب ۱۵۔ عربوں کے چند دیگر مذاہب ۵۹۵ تا ۶۱۹

فصل (۱) حُفّاء ۵۹۷

فصل (۲) صابین ۵۹۹

فصل (۳) نجس ۶۰۱

فصل (۴) دہریت ۶۰۳

دہریت کی حقیقت ۶۰۴۔ شرک کے ساتھ دہریت کا ابطال ۶۰۶۔ نظم و توافق اتفاقی

حادثہ نہیں ۶۰۷۔ حیات اور اس کا اعادہ ۶۰۸۔ حقیقت کائنات کے دو پہلو ۶۰۹۔

## باب ۱۶۔ یہود اور یہودیت ۶۱۱ تا ۶۳۹

فصل (۱) حضرت موسیٰ سے قبل کا دور ۶۱۳

بنی اسرائیل کا وسیع و بعض ماضی ۶۱۳۔ یہودیت کی ابتدا اور وجہ تسمیہ ۶۱۳۔ یہود

حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں ۶۱۴۔ مصر میں قوم پرستانہ انقلاب ۶۱۶۔

فصل (۲) بعثت موسیٰ علیہ السلام ۶۱۷

حضرت موسیٰ کی دعوت ۶۱۷۔ بنی اسرائیل کی ثعلب تہمت ۶۱۷۔ مصر سے بنی اسرائیل کی

ہجرت ۶۱۸۔ قوم موسیٰ کا دور صحرائی ۶۱۹۔ فلسطین پر پڑھانی کا حکم ۶۱۹۔ دوسرا دور

صحرائی پہلو ستر ۶۱۹۔

فصل (۳) فلسطین کی فتح اور دورِ مابعد ۶۲۰

فلسطین کی فتح ۶۲۰۔ بنی اسرائیل کو بگاڑنے کے لیے حضرت موسیٰ کا انتہا ۶۲۰۔

حضرت یوشع کی دعوت اصلاح ۶۲۱۔ فتح فلسطین کے بعد ۶۲۲۔ بنی اسرائیل کا پہلا بڑا

دور فساد ۶۲۳۔ خدا کی طرف سے ایک اور موقع دیا گیا ۶۲۳۔ یونانی تسلط اور کابلی تحریک ۶۲۴۔

دوسرا دور فساد اور اس کا فیمازہ ۶۲۵۔ قرأت میں تحریک ۶۲۷۔

فصل (۴) بعثت خاتم النبیین کے وقت ہنود کے مذہبی و معاشرتی حالات ۶۲۱

عرب کے یہودیوں کی مستند تاریخ موجود نہیں ۶۳۱۔ آنحضرت کی ہجرت کے وقت یہودی پوزیشن  
 ۶۳۳۔ ان کی معاشی پوزیشن ۶۳۳۔ مذہبیت کا نمائشی ڈھانچہ ۶۳۳۔ برہمنی اہلسنی  
 مصیبت ۶۳۵۔ اشراروں سے انحراف، جزئیات میں انہماک ۶۳۶۔ اکابر کے لیے شریعت  
 میں تحریف ۶۳۶۔ جلت و حرمت کے شرعی احکام میں رد و بدل ۶۳۷۔ آنحضرت کے متعلق یہودی  
 کا نامستول رویہ ۶۳۷۔ یہودی معاندانہ فتنہ پروازیاں ۶۳۸۔

## باب ۱۷۔ نصاریٰ اور عیسائیت ۶۴۱ تا ۷۰۹

### فصل (۱) عیسائیت کا ظہور اور نشوونما ۶۴۳

فصل نصاریٰ کی تشریح ۶۴۳۔ عیسائیوں کی مائتہ بنی اسرائیل سے علیحدگی ۶۴۳۔ ان کا نام  
 مسیحی کیسے پڑا ۶۴۳۔ عیسائیت کا زمانہ ظہور ۶۴۵۔ عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ کو خدا قرار  
 دینا ۶۴۵۔ حضرت عیسیٰ کے کلمہ اللہ ہونے کا مفہوم ۶۴۶۔ عقیدہ تثلیث ۶۴۶۔ شرک  
 اور اولیاء پرستی ۶۴۷۔ موجودہ عیسائیت اور سینٹ پال ۶۴۷۔ پرلوسی عقائد چھانگئے ۶۴۸۔  
 — زہبائیت کا ظہور اور اس کے اسباب ۶۴۹۔

تین اسباب — زہبائیت کے آغاز اور اس کے قانین ۶۵۰۔ پہلا راسب اور پہلی  
 خانقاہ ۶۵۱۔ جاہلانقاہوں کا قیام ۶۵۱۔ سلسلہ زہبائیت کی خصوصیات ۶۵۱۔

### فصل (۲) انجیلی صحافت کی تاریخی حیثیت ۶۵۵

ماخذ کی تحقیق ۶۵۵۔ متی سے فسوب نمبر ۶۵۵۔ مرقس سے فسوب نمبر ۶۵۶۔ لوقا سے  
 فسوب نمبر ۶۵۶۔ یوحنا سے فسوب نمبر ۶۵۶۔ اناجیل کے غیر مستند ہونے کے چھ ڈبچے ۶۵۷۔

### فصل (۳) حضرت عیسیٰ کی حقیقی تعلیمات ۶۵۹

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کا بہترین ریکارڈ ۶۵۹۔ انجیل برناباس کی امتیازی خصوصیات ۶۶۱۔  
 حضرت عیسیٰ کی صحیح تعلیمات اور مؤثر پیرائے بیان ۶۶۱۔ تمام انبیاء کی تعلیمات سے ہم آہنگی ۶۶۲۔  
 مصنف کا متعصب تصنیف ۶۶۶۔

— مروجہ چار انجیلوں میں تعلیمات عیسوی ۶۶۳ —

دعوت توحید ۶۶۳۔ حکومت الہی ۶۶۳۔ حق و باطل کی کشمکش کا پیغام ۶۶۳۔ راجحی  
 میں آزمائش ضروری ہے ۶۶۳۔ ایک انقلابی تحریک ۶۶۵۔ مسلک صبر کی تلقین ۶۶۶۔ حُب دینا  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سے اہتمام اور فکر آخرت کی دعوت ۶۶۶۔ تحمل شدائد کی تعلیم کا مقصد ۶۶۶۔ حکومت البیس کا جامع مینی فیسٹو ۶۶۷۔ حکومت خدمت ہے ۶۶۷۔ بیہودی غلام و مشائخ پر تنقید ۶۶۷۔ حضرت عیسیٰ کے خلاف مذہبی اکابر کی سازشیں ۶۶۸۔ حضرت عیسیٰ کے خلاف اکابر یہود کا مقدمہ ۶۶۹۔ حضورؐ کے مکی وفد دعوت سے مخالفت ۶۶۹۔

### فصل (۴) عیسائیوں کی گراہی کے حتمی اسباب ۶۷۰

عیسائیوں میں فکر اور عقیدہ افیاری کی بیماری ۶۷۰۔ ایک عیسائی عالم کا ناقذانہ جائزہ ۶۷۰۔ ایک دوسرے عیسائی مفسر کا تجزیہ ۶۷۳۔ تاریخ کلیسا سے ایک شہادت ۶۷۳۔ قابل بحث ۶۷۳۔ انسان کے پیدائشی گنہگار ہونے کا عقیدہ ۶۷۵۔ حضرت مریم کو ماورقہ قرار دینا ۶۷۵۔

### فصل (۵) تراات و نخیل میں نبی آخر الزماں کی پیشین گوئیاں ۶۷۷

ایک نبی برپا کروں گا ۶۷۷۔ تراات کی صریح پیش گوئی ۶۷۸۔ سورہ صافات کی مستفاد آیت ۶۷۸۔ تفصیلی بحث ۶۷۹۔ ذہبی ۶۸۰۔ انجیل یوحنا کی پیشین گوئیاں ۶۸۱۔ آنے والا سرور عالم ہوگا ۶۸۱۔ پیر کلیس بجائے میں عیسائیوں کی لہجہ ۶۸۲۔ ایک نئی تہذیب کا امکان ۶۸۲۔ شمرانی انقلاب ۶۸۳۔ شاہنشاہی کی تصدیق ۶۸۳۔ نیک ناس کی تہذیب ۶۸۳۔

### فصل (۶) عیسائیت عرب میں ۶۸۸

مترجمین کی طرف سے اضافہ ۶۸۸ تا ۶۹۰۔

— قصہ اصحاب اُخدود ۶۹۰ —

حضرت صہیب رضی کی روایت ۶۹۰۔ حضرت علی سے مروی واقعہ ۶۹۱۔ اسرائیلی روایات ۶۹۱۔ واقعہ نجران ۶۹۱۔ عیسائی شہزادی یمن میں ۶۹۲۔ واقعہ اصحاب اُخدود کے عینی شاہد ۶۹۲۔ کعبہ کی شکل پر ایک عمارت کی تعمیر ۶۹۳۔ یمن پر عیسائیت کا تسلط ۶۹۳۔ انبرہ یمن کا فرمانروا کیسے بنا ۶۹۳۔

— اہل عرب پر سیاسی، تجارتی اور مذہبی تسلط کی ٹیم ۶۹۵ —

مکہ پر انبرہ کی لشکر کشی ۶۹۶۔ اہل مکہ کا جوابی طرز عمل ۶۹۷۔ مخالفت کعبہ کے لیے خلیفہ مخزومہ ۶۹۹۔ عربی ارب میں اس واقعہ کی شہادتیں ۷۰۰۔ اس کے متعلق چند اہم روایتیں ۷۰۱۔ حضورؐ کی ولادت مبارکہ ۷۰۲۔ قرآن میں اس واقعہ کا اجمالی تذکرہ کیوں کیا گیا؟ ۷۰۲۔

### فصل (۷) عیسائیت بہشتِ قائم النبیین کے بعد ۷۰۳

وزید بن زہل کی تصدیق نبوت ۷۰۳۔ عیسائی سلطنت میں مسلمانوں کی ہجرتِ اولیٰ ۷۰۵۔

جدشہ کے عیسائی بادشاہ کی حق پسندی ۷۰۶۔ بخش کے لیے مسلمانوں کا خاص رویہ ۷۰۷۔  
مشرق میں مصر کا رویہ ۷۰۷۔ آنکھنورا اور نجران کے عیسائی ۷۰۸۔ خاتمہ فصل بہ الفاظ مرتبین ۷۰۹۔

جلد اول — حصہ ۳

بعثت سے پہلے کا ماحول

ج۔ جزیرۃ العرب کی جغرافی و تمدنی اہمیت

باب ۱۸۔ مختلف ممالک سے عربوں کے وسیع رابطے ۱۱ تا ۱۶

وسیع علاقوں کا تجارتی مرکز ۱۱۔ سیاسی اور ثقافتی رابطے ۱۲۔ مخصوص معاشی  
ضرورت حال ۱۵۔ سیاسی نقشہ احوال ۱۵۔

باب ۱۹۔ سیرت کا پیغام ۱۷ تا ۲۷

خدا کی ہدایت کی ضرورت ۱۹۔ انبیاء کی پیروی کی ضرورت ۲۰۔ محمد صلی اللہ علیہ  
وسلم کے سوا دوسرے انبیاء سے ہدایت نہ ملنے کی وجہ ۲۱۔ دین یہود کی کتابوں اور انبیاء  
کا حال ۲۲۔ حضرت عیسیٰ اور دین نصاریٰ کی کتابوں کا حال ۲۳۔ زردشت کی  
سیرت اور تعلیمات کا حال ۲۴۔ بودھ مذہب کی کیفیت ۲۴۔ حضرت محمد صلی  
اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تعلیمات محفوظ ہیں ۲۵۔ قرآن کا محفوظ ترین کتاب الہی  
ہونا ۲۵۔ سیرت و سنت رسول کا پایہ استعلاء ۲۶۔ حضور کی زندگی کا بے پلج  
معروف و معلوم ہونا ۲۶۔ حضور کا پیغام تمام انسانوں کے لیے ہے ۳۰۔ ننگ  
نسل کے تشبہات کا بہترین علاج ۳۰۔ اللہ کی وحدانیت کا وسیع ترین تصور ۳۱۔  
بندگی رب کی دعوت ۳۲۔ اطاعت رسول کی دعوت ۳۳۔ اللہ کے بعد اطاعت  
کا مستحق اللہ کا رسول ہے ۳۳۔ آزادی کا حقیقی پاپا ۳۳۔ خدا کے حضور چاہیے  
کا تصور ۳۴۔ رہبانیت کے بجائے دنیا داری میں اخلاق کا استعمال ۳۵۔ حضور  
کی ہدایت کا فیصلہ ۳۵۔

# مقدمہ

(از مؤلف)

اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دوسری ذرائع سے پہنچی ہے۔ ایک اللہ کا کلام، دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں، جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ اور تعلیم اور تعلیم کا واسطہ بنایا، بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا، تاکہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشا پورا کرنے کے لیے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیرِ صالح کر دکھائیں۔

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم و ملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہو سکا اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکا۔ کتاب کو نبی سے الگ کر دیکھے تو وہ ایک کشتی جتنے خدا کے بغیر جیسے لے کر انٹری مسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں، منزل مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور نبی کو کتاب اللہ سے الگ کر دیکھے تو خدا کا راستہ پانے کے بجائے آدمی ناخدا ہو گیا، خدا بنا بیٹھنے۔ کسی نہیں بچ سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پھل چھلے ہیں۔ ہندوؤں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو دم لیا اور صرف کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انجام یہ ہوا کہ کتابیں ان کے لیے لفظی گو رکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں حتیٰ کہ آخر کار خود کتابوں کو بھی وہ گم کر بیٹھے جیسا انہوں نے کتاب کو نظر انداز کر کے نبی کا دامن پکڑا اور اس کی شخصیت کے گرد گھومتا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی چیز انہیں نبی اللہ کو اپن اللہ بلکہ عین اللہ بنانے سے باز نہ رکھ سکی۔

پرانے ادوار کی طرح اب اس نئے دور میں بھی انسان کو نعمتِ اسلام میسر آنے کے مدد ہی ذرائع ہیں جو انہیں سے چلے آ رہے ہیں۔ ایک خدا کا کلام، جو اب صرف قرآن پاک کی صورت ہی میں مل سکتا ہے۔ دوسرے اُسوۂ نبوت جو اب صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے سکے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا اس نے اسلام کو سمجھا، ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجہ ہدایت سے بھی۔

پھر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں چونکہ ایک ٹٹن رکھتے ہیں، ایک مقصد و مآثر کا لیے ہوئے آتے ہیں،



اس لیے ان کو سمجھنے کا اہتمام اس پہلے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد و تہما کو کس حد تک سمجھتے ہیں۔ اس چیز کو نظر انداز کر کے دیکھیں تو قرآن عباراتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرت پاک، واقعات و حوادث کا ایک مجموعہ ہے۔ آپ لغت و روایات؛ علمی تحقیق و کاوشوں کی مدد سے تفسیروں کے انبار نکال سکتے ہیں۔ اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے عہد کے متعلق صحیح ترین اور وسیع ترین معلومات کے ذخیرہ نکال سکتے ہیں مگر رُوحِ دین تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ یہ عبارات اور واقعات سے نہیں بلکہ اُس مقصد سے وابستہ ہے جس کے لیے قرآن اتارا گیا اور جس کی مدد داری کے لیے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کیا گیا۔ اس مقصد کا تصور تیسرا صحیح ہوگا اٹا سہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح، اور بتانا ناقص ہوگا اتنا ہی ان دونوں کا فہم ناقص رہے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم والصلوة والسلام دونوں ہی بحرِ ناپیدا کنار ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کر لے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ سے زیادہ فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے رُوحِ دین تک رسائی پائے۔

میں اللہ تعالیٰ کے اس فضل و احسان کا بے حد شکر گزار ہوں کہ قرآن پاک کو سمجھانے کے لیے جو کوشش میرے بس میں تھی اُسے انجام دینے کے لیے اُس نے مجھے "تفہیم القرآن" مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمادی۔ اس کے بعد میری دلی تمنا تھی کہ سیرت رسول پاک پر بھی ایک کتاب لکھوں۔ لیکن پہلے کام ہی میں غم کے ۳۰ سال صرف ہو گئے اور اب میں اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتا کہ وہ سرِ کام شروع کر سکوں۔ میرے دل میں اس کی حسرت ایک مستقل غم بنی ہوئی تھی کہ یکایک جناب نعیم صدیقی اور جناب عبدالوکیل علوی نے میری ہی مختلف کتابوں اور مضامین سے مُرتب کیا ہوا "غالاتِ سیرت" کا یہ مجموعہ میرے سامنے لا کر رکھ دیا جسے دیکھ کر میں خود بھی حیران رہ گیا کہ اس عظیم الشان موضوع پر میری تحریریں ہیں آنا کچھ ہوا موجود تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان دونوں حضرات کی اس محنت و جانفشانی پر بے انتہا دل سے داد بھی نکلی اور زمانے خیر بھی کہ انہوں نے جگہ جگہ بکھرے ہوئے اس مواد کا نہایت باریک بینی اور تجسس کے ساتھ جائزہ لیا اور اس کو بہترین طریقے سے مُرتب کر دیا۔ اگرچہ یہ مجموعہ سیرت پر ایک مستقل کتاب کی ضرورت کو تو پورا نہیں کرتا۔ لیکن اس میں جو مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں وہ انشاء اللہ لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور آپ کے کارنامہ عظیم کو سمجھنے میں کافی مدد دیں گے۔

اس میں شک نہیں کہ جو کچھ اس کتاب میں درج کیا گیا ہے، میری کتابوں اور تحریروں کے ناظرین کی نگاہ سے وہ یا اس کا کم و بیش اچھا خاصا حصہ پہلے ہی گزر چکا ہے، اور پڑھی ہوئی چیزوں کو دوبارہ پڑھنا ایک حد تک آدمی کو نالاز کرتا ہے۔ مگر پڑھنے والے جب اس کتاب کو پڑھیں گے تو خود محسوس کریں گے کہ سیرت پاک کے متعلق جو مضامین مختلف متن

پر کچھ بڑے بڑے تھے، اور ان میں چالیس سال کے دوران میں مختلف مواقع پر لکھے گئے تھے، وہ یہاں ان کے سامنے لکھا  
ایک مرتبہ ضرورت نہیں آگئے ہیں، اور اس کی کوئی ضرورت نہیں ان کا مطالعہ اس مطالعہ کی بنیاد پر نسبتاً ایک نیا لگانا  
فائدہ رکھتا ہے، جو تاریخی صورت میں حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

یہیں دیکھا کرتا ہے کہ ان کے بارے میں کتاب کو بھی اپنے بندوں کی ہدایت اور میرے لیے اجر آخرت کا  
کا ازیں ہے۔

ابوالاعلیٰ

الاجمیر - ۱۹۴۱ء  
۲۵ مارچ ۱۹۶۲ء

جلد اول - حصہ ۱  
سلسلہ نبوت سے متعلق چند اصولی تحقیقاتیں

باب (۱)

حقیقت نبوت

# انسانیت کے لیے خدائی سلسلہ ہدایت

خداوندِ عالم نے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرمانروا ہے۔ اپنی بے پایاں مہکت کے اس نکتے میں ہے ہم زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا۔ اُسے جانتے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں بھلائی اور برائی کی تیسری۔ انتخاب اور ادارے کی آزادی عطا کی۔ تصرف کے اختیارات بخشے اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوندِ عالم نے اچھی طرح اُس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو، نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں دنیا دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لیے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس آنا ہوگا اور میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام تھا اسے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرو، جو ہدایات میں بھجوں اُس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمہارے لیے ہر وہ رویہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمہیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا، اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمہیں ابدی راحت و مسرت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنت ہے۔ اور اگر دوسرے کسی رویہ پر چلو گے (جس پر پلٹنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گزر کر عالمِ آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج و مصیبت کے اُس گڑھے میں پھینک دیئے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

”مسلم“ بن کر رہنے کی ہدایت

یہ فہمائش کر کے مالک کائنات نے نوعِ انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے آدمین افراد آدم و حوا،

کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق انہیں اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اولین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انہیں اُن کا قانون حیات بتایا گیا تھا۔ اُن کا طریق زندگی خدا کی اطاعت و یعنی اسلام تھا اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ بطبع خدا رُسل بن کر رہیں۔

## انحراف

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریق زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط طریقوں کی طرف پھل پڑے۔ انہوں نے غفلت سے اُس کو گم بھی کیا اور شرارت سے اس کو نسخ بھی کر ڈالا۔ انہوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی خیالی اور مادی بستیدوں کو خدائی میں شریک ٹھہرایا۔ انہوں نے خدا کے دیتے ہوئے علم حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اوہام اور نظریوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے اپنی خواہشات نفس اور اپنے تعصبات کے مطابق ایسے قوانین زندگی ٹھہرایے جن سے خدا کی زمین علم سے بھر گئی۔

خدا نے جو محدود و خود اختیاری انسانوں کو دی تھی اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بڑے سے ہوتے انسانوں کو زبردستی صحیح رویہ کی طرف موڑ دیتا۔ اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لیے جو مہلت اس نوع کے لیے اور اس کی مختلف قوموں کے لیے مقرر کی تھی اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اس بناوت کے رونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا پھر جو کام ابتدا سے آفرینش سے اُس نے اپنے ذمہ لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے، اُس کی مہلتِ عمل کے دوران میں، اُس کی رہنمائی کا انتظام وہ کرنا ہے گا۔ چنانچہ اپنی اس خود عائد کردہ فوجداری کو ادا کرنے کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اُس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اُس نے اُن کو اپنا نمائندہ بنا دیا۔ اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ اُن کو علم حقیقت بخشا۔ انہیں صحیح قانون حیات عطا کیا۔ اور انہیں اس کام پر مامور کیا کہ بنی آدم کو اسی زاوہ راست کی طرف پھٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

یہ پندرہ مختلف قوموں اور ملکوں میں اٹھتے رہے۔ ہزار ہا برس تک اُن کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزار ہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوتے۔ اُن سب کا ایک ہی دین تھا، یعنی وہ صحیح برہنہ جو اول روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے، یعنی اخلاق و تمدن کے وہ اُزلی و اُبدی اصول جو آغاز ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیئے گئے تھے۔ اور اُن سب کا ایک ہی مشن تھا، یعنی یہ کہ اس دین اور اس ہدایت کی طرف اپنے اپنا سب نوع کو دعوت دیں، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں ان کو منظم کر کے ایک ایسی امت بنا لیں جو خود اللہ کے قانون

کی پابند ہوا اور دنیا میں قانون الہی کی اطاعت قائم کرے اور اس قانون کی خلاف ورزی نہ کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے دور میں اپنے اس مشن کو پوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ ہی ہتھیار ہاتھ میں رکھے اور کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوتی، اور جنہوں نے اسے قبول کر کے امت مسلمہ کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے، حتیٰ کہ ان میں سے بعض امتیں ہدایت الہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تخریجات اور آمیزشوں سے مستح کر دیا۔

آخر کار خداوند عالم نے سرزمین عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کام کے لیے مبعوث کیا، جس کے لیے پہلے انبیاء آتے رہے تھے۔ ان کے مخالف عام انسان ہیں تھے اور پہلے انبیاء کے بگڑے ہوئے پیرو بھی سب کی صحیح ہدایت کی طرف دعوت دینا، سب کو از سر نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا، اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں نہیں ایک ایسی امت بنا دینا، ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے۔

## نبوت اور انبیاء

اور اسے نبی، لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارا  
رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا  
تھا اور انہیں خدا ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے بھیجا  
تھا، کیا تم تمہارا رب نہیں جانتے؟ انہوں نے کہا  
”ہم تو آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی  
دیتے ہیں۔“ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ ہمیں تم قیامت  
کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ”ہم تو اس بات سے بے خبر تھے۔“  
یا یہ نہ کہتے مگر کہ ”شکر کی ابتدا تو ہمارے باپ دادا  
نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد ان کی نسل سے پیدا

وَرَادَ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ  
مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ  
عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَتُّ بِرَبِّكُمْ قَالُوا  
بَلَىٰ شَهِدْنَا إِنَّ قَوْلَ الْفِتْيَةِ  
إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ ۚ أَوْ قَوْلَ  
إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَ  
كُنَّا ذُرِّيَّةً مِمَّنْ كَفَرُوا فَكَيْفَ  
يُتَابَعُونَ ۚ

(الاعراف: ۱۷۳)

ہوئے پھر کیا آپ ہیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا۔

اس آیت میں وہ غرض بیان کی گئی ہے جس کے لیے انہوں نے پوری نسل آدم سے اقرار لیا گیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت اختیار کریں وہ اپنے اس جرم کے پوری طرح ذمہ دار قرار پائیں۔ انہیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا مدد چاہیے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہو سکیں گویا باغیوں کی طرح اللہ تعالیٰ اس انہی عہد و پیمانہ کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے

کہ تو بے انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہ واحد اور ربیب واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے، یا ایک گمراہ ماحول میں پریشانی کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بائگتیبہ بری ہو سکتا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ انہی مشاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعور اور حافظہ میں محفوظ ہے؟ کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغاز آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے آئسٹریٹنگ کا سوال ہوا تھا اور اس نے ہاں کہا تھا؟ اگر نہیں تو پھر اس اقرار کو جس کی یاد ہمارے شعور و حافظہ سے محو ہو چکی ہے ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس مشاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرت سے فضول ہو جاتا کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمائش و امتحان کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہ جاتا۔ لہذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تازہ نہیں رکھا گیا، لیکن وہ تحت الشعور Sub-

Conscious mind اور وجدان (Intuition) میں یقیناً محفوظ ہے۔ اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری اور وجدانی علوم کا حال ہے تہذیب و تمدن اور اسباق و معاملات کے تمام شعبوں میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا ہے وہ سب و حقیقت انسان کے اندر بالقوہ موجود تھا۔ (Potentially) خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مل جل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوہ تھا اسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر اور کوئی داخل تحریک انسان کے اندر کوئی چیز بھی، جو اس کے اندر بالقوہ موجود نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کر سکتی۔ اور اسی طرح یہ سب مؤثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ان چیزوں میں سے، جو انسان کے اندر بالقوہ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اسے اصل فطرت سے منحرف (Pervert) کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریکات و تمسکات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اسباب سے دیکھنے کے لیے مستعد رہے گی۔ یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے؛ وہ سب ہمارے اندر بالقوہ موجود ہیں اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت ان چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کے ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر زیادہ دہانی، تعلیم، تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گریا و حقیقت خارجی اسباب کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوہ موجودات

کی طرف سے ثابت ہے۔

ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات و باکرہ پر وہ ڈال کر بھرت اور سچ کر کے کاغذ کر سکتی ہیں مگر باہر کے معدوم نہیں کر سکتیں۔ اور اسی لیے اندر مٹی (حساس اور بیرونی سعی و عملوں سے اسٹون اور تبدیل و Conversion) ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک سیاق ہی کیفیت اس و بعد اتنی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت اور تاقی کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے۔

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے سرور میں، زمین کے ہر خطہ میں، بیرونی بھرت اور ہر نسل میں ابھرتا رہا ہے اور کبھی دنیا کی کوئی طاقت اسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے مطابق حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب بھی وہ ابھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کار فرما ہوا ہے اس نے صانع اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو ابھرنے اور ظہور میں آنے اور عمل ضرورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی بات کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیان حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔ اسی لیے ان لوگوں میں مذکور زیاد و ناسے والے، نوکر زیاد و تذکرہ زیاد و داشت اور ان کے کام کو تذکرہ زیاد و بانی کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انبیاء اور داعیان حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اسی چیز کو ابھارتے اور تازہ کرتے ہیں جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔



## نبوت کے متعلق عقل کا فیصلہ

بڑے بڑے شہروں میں ہم دیکھتے ہیں کہ سیکڑوں کارخانے بجلی کی قوت سے چل رہے ہیں، یہیں اور ٹرام گاڑیاں  
 دوں دوں ہیں، شام کے وقت وقفہ ہزاروں گھنٹے روشن ہو جاتے ہیں، اگر ہی کے زمانے میں گھر گھر ٹکے چلتے ہیں۔  
 مگر ان واقعات سے نہ تو ہمارے اندر حیرت و استحباب کی کوئی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ان چیزوں کے روشن یا  
 متحرک ہونے کی علت میں کسی قسم کا اختلاف ہمارے ذہن میں واقع ہوتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ان قوتوں کا تعلق  
 جن تاروں سے ہے ان کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان تاروں کا تعلق جن بجلی گھر سے ہے اس کا حال بھی ہم کو  
 معلوم ہے۔ اس بجلی گھر میں جو لوگ کام کرتے ہیں ان کے وجود کا بھی ہم کو علم ہے۔ ان کام کرنے والوں پر جو انجنیئر لگائی  
 کر رہا ہے اس کو بھی ہم جانتے ہیں ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ وہ انجنیئر بجلی کے کام سے واقف ہے، اس کے پاس بہت  
 سی کلیں ہیں اور ان گلوں کی حرکت دیکھ کر وہ اس قوت کو پیدا کر رہا ہے جس کے جلوسے ہم کو قوتوں کی روشنی پہنچا  
 کی گردش، بریلوں اور ٹرام گاڑیوں کی سیر، چکیوں اور کارخانوں میں نظر آتے ہیں۔ بس بجلی کے آثار کو دیکھ کر اس کے  
 اسباب کے متعلق ہمارے ذہن میں اختلافات اسے واقع نہ ہونے کی وجہ حیرت یہ ہے کہ ان اسباب کا تو برا سلسلہ بہت  
 محسوسات میں داخل ہے اور ہم اس کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ فرض کیجیے کہ یہی قوتیں روشن ہوتے، اسی طرح چمکے گردش  
 کرتے، یونہی بریلوں اور ٹرام گاڑیاں چلتیں، چکیاں اور مشینیں حرکت کرتیں، مگر وہ تار جن سے بجلی ان میں نکلتی ہے جاری  
 نظروں سے پوشیدہ ہوتے، بجلی گھر بھی ہمارے محسوسات کے دائرے سے خارج ہوتا، بجلی گھر میں کام کرنے والوں  
 کا بھی ہم کو کچھ علم نہ ہوتا، اور یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کارخانہ کا کوئی انجنیئر ہے جو اپنے علم اور اپنی قدرت سے  
 اس کو چلا رہا ہے۔ کیا اس وقت بھی بجلی کے ان آثار کو دیکھ کر ہمارے دل ایسے ہی مطمئن ہوتے؟ کیا اس وقت بھی  
 ہم اسی طرح ان مظاہر کی علتوں میں اختلاف نہ کرتے؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کا جواب نفی میں دیں گے۔ کیوں؟  
 اس لیے کہ جب آثار کے اسباب پوشیدہ ہوں اور مظاہر کی علتیں غیر معلوم ہوں تو ذہن میں حیرت کے ساتھ  
 بے اطمینانی کا پیدا ہونا، دماغی کا اس راز پر سب سے کی جستجو میں لگ جانا، اور اس راز کے متعلق قیامات و آراء  
 کا مختلف ہونا ایک فطری بات ہے۔

اب ذرا اسی مفروضہ پر سلسلہ کلام کو آگے بڑھائیے۔ ان یوحیہ کہ یہ بر کچھ فرض کیا گیا ہے و حقیقت علم و فہم میں موجود ہے۔ ہزاروں لاکھوں تھکنے روشن ہیں، لاکھوں ٹکٹے چل رہے ہیں، گاڑیاں دوڑ رہی ہیں، کارخانے حرکت کر رہے ہیں اور ہمارے پاس یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان میں کونسی قوت کام کر رہی ہے اور وہ کہاں سے آتی ہے۔ لوگ ان مظاہر کو دیکھ کر حیران و ششدر ہیں۔

## بھانت بھانت کی بولیاں

ہر شخص ان کے اسباب کی جستجو میں عقل کے گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں آپ سے آپ روشن اور متحرک ہیں، ان کے اپنے وجود سے خارج کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انہیں روشنی یا حرکت بخشنے والی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ چیزیں جن مادوں سے بنی ہوئی ہیں انہی کی ترکیب نے ان کے اندر روشنی اور حرکت کی کیفیتیں پیدا کر دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ اس عالم مادہ سے ماورا چند دیوتا ہیں جن میں سے کوئی تھکنے روشن کرتا ہے، کوئی ٹرام او ریٹس چلاتا ہے، کوئی پنکھوں کو گردش دیتا ہے اور کوئی کارخانوں اور چکیوں کا متحرک ہے بعض لوگ ایسے ہیں جو سوچتے سوچتے ٹھک گئے ہیں اور آخر میں عاجز ہو کر کہنے لگے ہیں کہ ہماری عقل اس طلسم کی گند تک نہیں پہنچ سکتی ہم صرت اتنا ہی جانتے ہیں جتنا دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، اس سے زیادہ کچھ ہماری سمجھ میں نہیں آتا اور جو کچھ ہماری سمجھ میں نہ آئے اُس کی نہ ہم تصدیق کر سکتے ہیں اور نہ تکذیب۔

یہ سب گروہ ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ مگر اپنے خیال کی تائید اور دوسرے خیالات کی تکذیب کے لیے ان میں سے کسی کے پاس بھی قیاس اور ظن و تخمین کے سوا کوئی ذریعہ علم نہیں ہے۔

## ایک جہداگانہ آواز

اس دوران میں کہ یہ اختلافات برپا ہیں، ایک شخص آتا ہے اور کہتا ہے کہ بھائیو! میرے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے۔ اُس ذریعے سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان سب تھکنوں، پنکھوں، گاڑیوں، کارخانوں اور چکیوں کا تعلق چند مخفی تاروں سے ہے جن کو تم محسوس نہیں کرتے۔ ان تاروں میں ایک بہت بڑے بجلی گھر سے وہ قوت آتی ہے جس کا ظہور روشنی اور حرکت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس بجلی گھر میں بڑی بڑی عظیم انسان کلیں ہیں جنہیں بے شمار شخص چلا رہے ہیں۔ یہ سب اشخاص ایک بڑے انجنیئر کے تابع ہیں، اور وہی انجنیئر ہے جس کے علم اور قدرت نے اس پورے نظام کو قائم کیا ہے۔ اسی کی ہدایت اور نگرانی میں یہ کام ہو رہا ہے۔

یہ شخص پوری قوت سے اپنے اس دعوے کو پیش کرتا ہے۔ لوگ اس کو ٹھیلاتے ہیں، سب گروہ مل کر اس کی مخالفت کرتے ہیں، اسے دیوانہ قرار دیتے ہیں، اس کو مارتے ہیں، تکلیف دیتے ہیں، گھر سے نکال دیتے ہیں مگر وہ ان سب روحانی اور جسمانی مٹیبنتوں کے باوجود اپنے دعوے پر قائم رہتا ہے کسی خوف یا لاپرواہی سے اپنے قول

میں ذمہ برابر تو ہم نہیں کرنا کسی نسبت سے اس کے دعوے میں کمزوری نہیں آتی اس کی ہر بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو اپنے قول کی صداقت پر کامل یقین ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا شخص آتا ہے اور وہ بھی بجنسہ یہی قول اسی دعوے کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ پھر تیسرا چوتھا، پانچواں آتا ہے اور وہی بات کہتا ہے جو اس کے پیشرووں نے کہی تھی۔ اس کے بعد آگے والوں کا ایک تاننا بندھ جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی تعداد سینکڑوں اور ہزاروں سے تجاوز کر جاتی ہے، اور یہ سب اسی ایک قول کو اسی ایک دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ زمان و مکان اور حالات کے اختلاف کے باوجود ان کے قول میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ سب کہتے ہیں کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ سب کو دیوانہ قرار دیا جاتا ہے، ہر طرح کے علم و حکم کا نشانہ بنایا جاتا ہے، ہر طریقہ سے ان کو مجبور کیا جاتا ہے کہ اپنے قول سے باز آجائیں، مگر سب کے سب اپنی بات پر قائم رہتے ہیں اور دنیا کی کوئی قوت ان کو اپنے مقام سے ایک انچ نہیں ہٹا سکتی۔ اس عزم و استقامت کے ساتھ ان لوگوں کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ ان میں سے کوئی جھوٹا، چور، خائن، بدکار، ظالم اور برا م خود نہیں ہے۔ ان کے دشمنوں اور مخالفوں کو بھی اس کا اعتراف ہے۔ ان سب کے اخلاق پاکیزہ ہیں، سیرتیں انتہا درجہ کی نیک ہیں، اور جس خلق میں یہ اپنے دوسرے ایسے نوع سے ممتاز ہیں پھر ان کے اندر جنون کا بھی کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس وہ نیک اخلاق، تزکیہ نفس، اور ذہنی و معاشی معاملات کی اصلاح کے لیے ایسی ایسی تعلیمات پیش کرتے اور ایسے ایسے قوانین بناتے ہیں جن کے مثل بنانا تو درکنار ٹہرے بڑے مٹلاؤ و عقائد کو ان کی باریکیاں سمجھنے میں پوری پوری عمریں صرف کر دینی چلتی ہیں۔

### معاملہ عقل کی عدالت میں

ایک طرف وہ مختلف انجیال نگتہ ہیں، اور دوسری طرف یہ متحد انجیال مدعی۔ دونوں کا معاملہ عقل سلیم کی عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ حج کی صحت سے عقل کا فرض ہے کہ پہلے اپنی پوزیشن کو خوب سمجھ لے، پھر پوزیشن کی پوزیشن کو سمجھے، اور دونوں کا موازنہ کرنے کے بعد فیصلہ کرے کہ کس کی بات قابل ترییح ہے۔ حج کی اپنی پوزیشن یہ ہے کہ خود اس کے پاس امر واقعی کو معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ وہ خود حقیقت کا علم نہیں رکھتا۔ اس کے سامنے صرف فریقین کے بیانات، ان کے دلائل، ان کے ذاتی حالات اور خارجی آثار و نشان ہیں۔ انہی پر تحقیق کی نظر ڈال کر اسے فیصلہ کرنا ہے کہ کس کا برحق ہونا اعلیٰ ہے مگر اعلیٰ سے بڑھ کر بھی وہ کوئی معجزہ نہ سکتا۔ کیونکہ مسل پر جو کچھ مراد ہے اس کی بنا پر یہ کہنا اس کے لیے مشکل ہے کہ امر واقعی کیا ہے۔ وہ فریقین میں سے ایک کو ترییح دے سکتا ہے لیکن قطعاً اور یقین سے ساتھ کسی کی تصدیق یا تکذیب نہیں کر سکتا۔

# مکذبین کی پوزیشن

مکذبین کی پوزیشن یہ ہے:

۱- حقیقت کے متعلق ان کے نظریے مختلف ہیں۔ اور کسی ایک مکذب میں بھی ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے، حتیٰ کہ ایک ہی گروہ کے افراد میں بسا اوقات اختلاف پایا گیا ہے۔

۲- وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کے پاس علم کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو دوسروں کے پاس نہ ہو۔ ان میں سے کوئی گروہ اس سے زیادہ کسی چیز کا مدعی نہیں ہے کہ ہمارے قیاسات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ وزنی ہیں۔ مگر اپنے قیاسات کا قیاسات ہونا سب کو تسلیم ہے۔

۳- اپنے قیاسات پر ان کا اعتقاد، ایمان و یقین اور غیر متزلزل وثوق کی حد تک نہیں پہنچا ہے۔ ان میں تبدیلی راستے کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ بار بار دیکھا گیا ہے کہ ان میں کا ایک شخص کل تک جس نظریے کو پورے زور کے ساتھ پیش کر رہا تھا، آج خود اسی نے اپنے پچھلے نظریے کی ترویج کر دی اور ایک دوسرا نظریہ پیش کر دیا، عقل و علم اور تجربے کی ترقی کے ساتھ ساتھ اکثر ان کے نظریے بدلتے رہتے ہیں۔

۴- تدعیوں کی مکذیب کے لیے ان کے پاس بجز اس کے اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ انہوں نے اپنی صداقت کا کوئی یقینی ثبوت نہیں پیش کیا، انہوں نے وہ معنی نام کر نہیں دکھائے جن کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ مقبول اور نیکھوں وغیرہ کا تعلق انہی سے ہے، نہ انہوں نے بجلی کا وجود تحریر اور مشاہدہ سے ثابت کیا، نہ بجلی گھر کی ہمیں سیر کرائی، نہ اس کی کلوں اور مشینوں کا معائنہ کرایا، نہ اس کے کارندوں میں سے کسی سے ہماری ملاقات کرائی، نہ کبھی انجنیئر سے ہم کو ملایا، پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ یہ سب کچھ حقائق ہیں؟

## تدعیوں کی پوزیشن

تدعیوں کی پوزیشن یہ ہے:

۱- وہ سب آپس میں متفق القول ہیں۔ دعوے کے جتنے بیاری نکات ہیں ان سب میں ان کے درمیان کامل اتفاق ہے۔

۲- ان سب کا متفقہ دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے پاس علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام لوگوں کے پاس نہیں ہے۔  
۳- ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم اپنے قیاس یا گمان کی بنا پر ایسا کہتے ہیں بلکہ سب نے بالاتفاق کہا ہے کہ انجنیئر سے ہمارے خاص تعلقات ہیں، اس کے کارندوں سے ہمارے پاس آتے ہیں، اس نے اپنے کارخانے کی سیر بھی ہم کو کرائی ہے اور ہم جو کچھ کہتے ہیں علم و یقین کی بنا پر کہتے ہیں، ظن و تخمین کی بنا پر نہیں کہتے۔

۴- ان میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی نے اپنے بیان میں ذرہ برابر بھی کوئی تغیر و تبدل کیا ہو ایک

ہی بات ہے براں میں کا ہر شخص دعوے کے آغاز سے زندگی کے آخری سانس تک کہتا رہا ہے۔  
 ۵۔ ان کی سیر میں اتنا درستی پا کر یہ ہیں جھوٹ، فریب، مکاری، دغا بازی کا کہیں شائبہ تک نہیں ہے۔  
 اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ جو لوگ زندگی کے تمام معاملات میں سچے اور کھرے ہوں اور وہ خاص اسی معاملے میں  
 بالائے فوق جھوٹ برائیں

۶۔ اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ دعویٰ پیش کرنے سے ان کے پیش نظر کوئی ذاتی فائدہ تھا۔ برعکس  
 اس کے یہ ثابت ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر نے اس دعوے کی خاطر انتہائی درجے کے مصائب برداشت  
 کیے ہیں جسمانی تکلیفیں سہیں، قید کیے گئے، مارے اور پٹے گئے، جلا وطن کیے گئے۔ بعض قتل کر دیے گئے یعنی کہ  
 بعض کو آڑے سے چیر ڈالا گیا۔ اور خند کے سوا کسی کو بھی خوش حالی و فارغ البالی کی زندگی عیش و ہوا کی اتنی  
 غرض کا الزام ان پر نہیں لگایا جاسکتا۔ بلکہ ان کا ایسے حالات میں اپنے دعوے پر قائم رہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کو  
 اپنی صداقت پر اتنا درجہ کا یقین تھا، ایسا یقین کہ اپنی جان بچانے کے لیے بھی ان میں سے کوئی اپنے دعوے  
 سے باز نہ آیا۔

۷۔ ان کے متعلق مجھوں اور فاروق العطل ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ یہ زندگی کے تمام معاملات میں وہ  
 سب کے سب غایت درجہ کے دانشمند اور در سلیم العقل پائے گئے ہیں۔ ان کے مخالفین نے بھی اکثر ان کی دہشتداری  
 کا لوہا مانا ہے۔ پھر یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ ان سب کو خاص اسی معاملے میں جنون لاحق ہو گیا ہو اور وہ معاملہ  
 بھی کیسا ہو جو ان کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گیا ہو جس کے لیے انہوں نے دنیا بھر کا مقابلہ کیا ہو۔ جس کی خاطر  
 وہ ساہا سال دنیا سے لڑتے رہے ہوں جو ان کی ساری عاقلانہ تعلیمات کا دین کے عاقلانہ ہونے کا بہت  
 سے کٹھن میں کو بھی اعتماد ہے، اصل الاصول ہو۔

۸۔ انہوں نے خود بھی یہ نہیں کہا کہ ہم انجینیر یا اس کے کارندوں سے تمہاری ملاقات کر سکتے ہیں یا اس کا  
 مخفی کارخانہ تمہیں دکھا سکتے ہیں یا تجربہ اور مشاہدہ سے اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں وہ خود ان تمام امور کو  
 ”غیب سے تعبیر کرنے میں اور کہتے ہیں کہ ہم پر اعتماد کرو اور جو کچھ ہم بتاتے ہیں اسے مان لو۔“  
**عقل کی عدالت کا فیصلہ**

فریقین کی پوزیشن اور ان کے بیانات پر غور کرنے کے بعد اب عقل کی عدالت کا فیصلہ صادر کرتی ہے۔  
 وہ کہتی ہے کہ چند ظاہر و آثار کو دیکھ کر ان کے باطنی اسباب و عقل کی بحثوں دونوں فریقوں نے کی ہے اور  
 ہر ایک نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے ہیں باطنی اظہار میں سب کے نظریات اس لحاظ سے یکساں ہیں کہ اولاً  
 ان میں سے کسی میں استحالہ عقلی نہیں ہے یعنی قوانین عقل کے لحاظ سے کسی نظریے کے متعلق نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا

صحیح ہونا غیر ممکن ہے۔ ثانیاً ان میں سے کسی کی صحت تجربے یا مشاہدے سے ثابت نہیں کی جاسکتی۔ نہ فرقی اول میں سے کوئی گروہ اپنے نظریات کا ایسا سائنٹفک ثبوت دے سکتا ہے جو ہر شخص کو یقین کرنے پر مجبور کر دے اور نہ فرقی ثانی اس پر قادر یا اس کا مدعی ہے لیکن مزید غور و تحقیق کے بعد چند امور ایسے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر تمام نظریات میں سے فرقی ثانی کا نظریہ قابل ترجیح قرار پاتا ہے :

اولاً، کسی دوسرے نظریے کی تائید اتنے کثیر التعداد لوگوں کا مختلف زمانوں اور مختلف مقامات میں ایسا دعوے پر متفق ہوجانا کہ ان سب کے پاس ایک غیر معمولی ذریعہ علم ہے، اور ان سب نے اس ذریعے سے خارجی مظاہر کے باطنی اسباب کو معلوم کر لیا ہے، ہم کو اس دعوے کی تصدیق پر مائل کر دیتا ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ اپنی معلومات کے متعلق ان کے بیانات میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ جو معلومات انہوں نے بیان کی ہیں ان میں کوئی استحالہ عقلی بھی نہیں ہے، اور نہ یہ بات تو ایمن عقلی کی بنا پر محال قرار دی جاسکتی ہے کہ بعض انسانوں میں کچھ ایسی غیر معمولی قوتیں ہوں جو عام طور پر دوسرے انسانوں میں نہ پائی جاتی ہوں۔

ثانیاً، خارجی مظاہر کی حالت پر غور کرنے سے اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ فرقی ثانی کا نظریہ صحیح ہو اس لیے کہ متھے، پکھے، گاڑیاں، کارخانے وغیرہ نہ تو آپ سے آپ روشن اور متحرک ہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ان کا روشن اور متحرک ہونا ان کے اپنے اختیار میں ہوتا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ نہ ان کی روشنی و حرکت ان کے مادہ جسمی کی ترکیب کا نتیجہ ہے، کیونکہ جب وہ متحرک اور روشن نہیں ہوتے اس وقت بھی یہی ترکیب جسمی موجود رہتی ہے نہ ان کا الگ الگ قوتوں کے زیر اثر ہونا صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بسا اوقات جب تقفوں میں روشنی نہیں ہوتی تو نیکے بھی بند ہوتے ہیں، مگر کاریں بھی متوقف ہو جاتی ہیں اور کارخانے بھی نہیں چلتے۔ لہذا خارجی مظاہر کی توجیہ میں فرقی اول کی طرف سے جتنے نظریات پیش کیے گئے ہیں وہ سب بعد از غفل و قیاس ہیں۔ زیادہ صحیح یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ان تمام مظاہر میں کوئی ایک قوت کارفرما ہو اور اس کا سرشتہ کسی ایسے حکیم و توانا کے ہاتھ میں ہو جو ایک مقررہ نظام کے تحت اس قوت کو مختلف مظاہر میں صرف کر رہا ہو۔

باقی رہا شکسکیں کا یہ قول کہ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اور جو بات ہماری سمجھ میں نہ آتے اس کی تصدیق یا تکذیب ہم نہیں کر سکتے، تو حکم عقل اس کو بھی درست نہیں سمجھتا، کیونکہ کسی واقعہ کا واقعہ ہونا اس کا محتاج نہیں ہے کہ وہ سننے والوں کی سمجھ میں بھی آجائے۔ اس کے وقوع کو تسلیم کرنے کے لیے معتبر اور شہادت شہادت کافی ہے۔ اگر ہم نے چند معتبر آدمی اگر کہیں کہہ رہے ہیں کہ زمین مغرب میں آدمیوں کو دیکھنے کی کارٹیوں میں بیٹھ کر ہمارا پر اڑنے دیکھا ہے۔ اور ہم اپنے کانوں سے لندن میں بیٹھ کر امریکہ کا گانا سن آتے ہیں، تو ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ یہ لوگ جھوٹے اور مسخرفے تو نہیں ہیں ایسا بیان کرنے میں ان کی کوئی ذاتی غرض تو نہیں ہے، ان کے دماغ میں کوئی عقور تو نہیں ہے، اگر ثابت ہو گیا کہ وہ

ترجمہ میں ہیں نہ ترجمہ سے، نہ روایوں سے، نہ ان کا کوئی فرق اور اس سے مواہبت سے، اور اگر حکم نے دکھایا کہ اس کو بنا اختلاف بہت سے چھے اور عقائد اگر پوری بنیاد کی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں تو ہم یقیناً اس کو تسلیم کر لیں گے۔ خواہ اسے کی گارڈیوں کا ہوا یا مرنا اور کسی مادی واسطہ کے بغیر ایک جگہ کا گناہ کی نیز ارسال کے مفصلہ پر نشان آ رہا کسی طرح ہمارا سمجھ میں نہ آتا ہو۔

یہ اس معادلہ میں مشتمل کا فیصلہ ہے۔ مگر تصدیق و تہنیک کی کیفیت میں کا نام اٹان ہے اس سے یہاں نہیں ملتا۔ اس کے لیے وہاں کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اندر سے ایک آواز آئے جو غریب، شک اور تہذیب کی تمام کیفیتوں کا خاکہ کرے اور عبادت کثرت سے کہ اگر ان کی قیاس آرائیاں باطل ہیں، یہ وہی ہے جو سچے لوگوں نے قیاس سے نہیں بلکہ علم و بصیرت کی روش سے بیان کیا ہے۔

# نبوت کی ضرورت و حقیقت

انسان کی سب سے بڑی ضرورت

وَعَلَى اللَّهِ تَعْلَمُ السَّبِيلَ وَ  
مِنْهَا جَاؤُكُمُ (النمل آیت: ۹۰)

اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ بتانا، جبکہ  
پیر سے بھی موجود ہیں۔  
توجید اور رحمت و برکتیت کے دلائل پیش کرتے ہوئے یہاں اشارۃً نبوت کی بھی دلیل پیش کر دی گئی ہے۔  
اس دلیل کا مختصر بیان یہ ہے۔

دنیا میں انسان کے لیے فکر و عمل کے بہت سے مختلف راستے ممکن ہیں اور عملاً موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے  
راستے بیک وقت توفیق نہیں ہو سکتے۔ سچائی تو ایک ہی ہے اور صحیح طریقہ حیات صرف وہی ہو سکتا ہے جو صحیح نظر نہایت  
پر مبنی ہو۔

ان صحیح نظریے اور صحیح راہ سے واقف ہونا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بلکہ اصل بنیادی ضرورت  
یہی ہے۔ دوسری تمام چیزیں تو انسان کی صرف اُن ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں جو ایک اُوپچے درجے کا جانور ہونے کی  
حیثیت سے اس کو لاحق ہونا کرتی ہیں۔ مگر یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو انسان ہونے کی حیثیت سے اس کو لاحق ہے۔  
یہ اگر پوری نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی ساری زندگی ہی ناکام ہو گئی۔

اب غور کیجئے کہ جس خدا نے آپ کو وجود میں لانے سے پہلے آپ کے لیے یہ کچھ سرور سامان کر رکھا اور جس نے  
وجود میں لانے کے بعد آپ کی حیوانی زندگی کی ایک ایک ضرورت کو پورا کرنے کا اتنی دقیقہ سنجی گئے ساتھ (تیسے پڑے  
پہلے پر انتظام کیا، کیا اس سے آپ توقع رکھتے ہیں کہ اُس نے آپ کی انسانی زندگی کی اس سب سے بڑی اور اصل  
ضرورت کو پورا کرنے کا بندوبست نہ کیا ہوگا۔

یہی بندوبست تو ہے جو نبوت کے ذریعے کیا گیا ہے۔ اگر آپ نبوت کو نہیں مانتے تو بتائیے کہ آپ کے خیال  
میں خدا نے انسان کی ہدایت کے لیے اور کو ایسا انتظام کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ نزدیک کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ہمیں



راستہ تلاش کرنے کے لیے عقلی و فکری دے رکھی ہے۔ کیونکہ انسانی عقل و فکر پہلے ہی بے شمار راستے ایجاد کر بیٹھی ہے جو راہ راستہ کی صحیح دریافت میں اس کی ناکامی کا کھڈا ثبوت ہے۔ اور نہ آپ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔ کیونکہ خدا کے ساتھ اس سے بڑھ کر دیگر کوئی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ جانور ہونے کی حیثیت سے تو آپ کی پرورش اور نشوونما کا اتنا مفصل اور مکمل انتظام کرے، مگر انسان ہونے کی حیثیت سے آپ کو یوں ہی تیار کیوں میں جھکنے اور ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دے؟

جبری ہدایت کے بجائے الہامی ہدایت

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَهَدَىٰ لَكُمْ سُبُلَ الْاٰمِنِيْنَ (المحل آیت ۹) اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا۔

یعنی اگرچہ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی اس ذمہ داری کو درجہ تواریخ انسانی کی رہنمائی کے لیے اس نے خود اپنے آپ پر غامضی کی ہے، اس طرح اور اتنا کہ سارے انسانوں کو پیدائشی طور پر دوسری تمام بے اختیار مخلوقات کی طرح برسر ہدایت بنا دیتا، لیکن یہ اس کی مشیت کا تقاضا نہ تھا۔ اس کی مشیت ایک ایسی ذی اختیار مخلوق کو وجود میں لانے کی متقاضی تھی جو اپنی پسند اور اپنے انتخاب سے صحیح اور غلط، ہر طرح کے راستوں پر جانے کی آزادی رکھتی ہو۔ اسی آزادی کے استعمال کے لیے اس کو علم کے ذرائع دیئے گئے۔ عقل و فکر کی صلاحیتیں دی گئیں، خواہش اور ارادے کی طاقتیں بخشی گئیں۔ اپنے اندر اور باہر کی بے شمار چیزوں پر تصرف کے اختیارات عطا کیے گئے۔ اور باطن و ظاہر میں ہر طرف بے شمار ایسے اسباب رکھ دیئے گئے جو اس کے لیے ہدایت اور ضلالت دونوں کے موجب بن سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ بے معنی ہو جاتا اگر وہ پیدائشی طور پر راست رو بنا دیا جاتا۔ اور ترقی کے اُن بلند ترین مہلج تک بھی انسان کا پہنچنا ممکن نہ رہتا جو صورت آزادی کے صحیح استعمال ہی میں اس کو مل سکتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے جبری ہدایت کا طریقہ چھوڑ کر رسالت کا طریقہ اختیار فرمایا، تاکہ انسان کی آزادی بھی برقرار رہے، اور اس کے امتحان کا منشا بھی پورا ہو، اور راہ راست بھی معقول طریقے سے اس کے سامنے پیش کر دی جائے۔

مادمی اور اخلاقی زندگی میں نشاناتِ ہدایت کی ضرورت

وَقَلَّمْتِ طَوْرًا بِاللَّيْلِ هُمْ يَهْتَدُونَ اس نے زمین میں راستہ بتانے والی علامتیں رکھ

دیں اور تاروں سے بھی لوگ ہدایت پاتے ہیں۔ (المحل ۱۴)

یعنی خدا نے ساری زمین بالکل کیسا بنا کر نہیں رکھ دی بلکہ ہر خطے کو مختلف امتیازی علامات

(Land marks) سے ممتاز کیا۔ اس کے بہت سے فوائد کے ساتھ ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی

اپنے راستے اور منزل مقصود کو الگ پہچان دیتا ہے۔ اس نصرت کی قدر آدمی کو اُس وقت معلوم ہوتی ہے، جبکہ

انہیں کبھی ایسے رگبتانی علاقوں میں جانے کا اتفاق ہوا جو جہاں اس طرح کے امتیازی نشانات تقریباً مفقود ہوتے ہیں اور آدمی بروقت بھٹک جانے کا خطرہ محسوس کرتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر، بحری سفر میں آدمی کو اس عظیم نعمت کا احساس ہوتا ہے، کیونکہ وہاں نشاناتِ راہ بالکل ہی مفقود ہوتے ہیں لیکن صحراؤں اور سمندروں میں بھی اس نے انسان کی رہنمائی کا ایک فطری انتظام کر رکھا ہے اور وہ ہیں تارے جنہیں دیکھ دیکھ کر انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک اپنا راستہ معلوم کرتا رہا ہے۔

یہاں پھر فرجید اور رحمت و رُبوبیت کی دلیلوں کے درمیان ایک لطیف اشارہ و پہلِ رسالت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اس مقام کو پڑھتے وقت ذہن خود بخود اس مضمون کی طرف منتقل ہو جاتا ہے کہ جس خدا نے تمہاری مادی زندگی میں تمہاری رہنمائی کے لیے یہ کچھ انتظامات کیے ہیں، کیا وہ تمہاری اخلاقی زندگی سے اتنا بے پروا ہو سکتا ہے کہ یہاں تمہاری ہدایت کا کچھ بھی انتظام نہ کرے، ظاہر ہے کہ مادی زندگی میں بھٹک جانے کا بڑے سے بڑا نقصان بھی اخلاقی زندگی میں بھٹکنے کے نقصانات سے بدرجہا کم ہے پھر جس ربِ حکیم کو ہماری فلاح کی اتنی فکر ہے کہ پہاڑوں میں ہمارے لیے راستے بناتا ہے، میدانوں میں نشاناتِ راہ کھڑے کرتا ہے، صحراؤں اور سمندروں میں ہم کو صحیح سمت سفر تیار کرنے کے لیے آسمانوں پر فزنیہ میں روشن کرتا ہے، اُس سے یہ بدگمانی کیسے کی جاسکتی ہے کہ اُس نے ہماری اخلاقی فلاح کے لیے کوئی راستہ نہ بنایا ہوگا، اُس راستے کو نمایاں کرنے کے لیے کوئی نشان نہ کھڑا کیا ہوگا، اور اُسے صاف صاف دکھانے کے لیے کوئی سراجِ شہیر روشن نہ کیا ہوگا۔

انسان کے لیے شعوری رہنمائی کی اہمیت

قَالَ رَبِّنا الَّذِي اعطى كُلَّ شَيْءٍ حَلَقَهُ

سَمَّهٗ هَدٰى - (زلزال - آیت ۵)

موسیٰ نے فرعون کو جواب دیا ہمارا رب وہ ہے

جس نے ہر چیز کو اُس کی ساخت، بخشی بخشی پھر اُس کو رستہ بنایا۔

یعنی دنیا کی ہر شے جسے کچھ بھی بنی ہوئی ہے، اُسی کے بنانے سے بنی ہے۔ ہر چیز کو جو بناوٹ، جو شکل و صورت، جو قوت و صلاحیت، اور جو صفت و خاصیت حاصل ہے، اُسی کے عطیے اور بخشش کی بدولت حاصل ہے۔ ہاتھ کو تو بنایا میں اپنا کام کرنے کے لیے جس ساخت کی ضرورت تھی وہ اُس کو دے دی، اور پاؤں کو جو مناسب ترین ساخت رکھتا تھی وہ اُس کو بخشی۔ انسان، حیوان، نباتات، جمادات، ہوا، پانی، روشنی، ہر ایک چیز کو اُس نے وہ صورتِ خاص عطا کی ہے جو اُسے کائنات میں اپنے حصے کا کام ٹھیک طور پر انجام دینے کے لیے مطلوب تھی۔

پھر اُس نے صرف یہی نہیں کیا کہ ہر چیز کو اُس کی مخصوص بناوٹ دے کر لوینہی چھوڑ دیا ہو، بلکہ اُس کے بعد وہی آن سب چیزوں کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے اپنی ساخت سے کام لینے اور تصدیقِ مخلوق کو پورا کرنے کا طریقہ اُس نے نہ سکھایا ہو۔ کان کو سننا اور آنکھ کو دیکھنا اُس نے سکھایا ہے۔ مچھلی کو تیرنا اور چڑیا کو اڑنا

آسی کی اہمیت سے آگاہ ہے۔ ذہنت کو کھل چھو ل دینے اور زمین کو زبانتات کو کھانے کی بہا بریت، اسی نے ہی جسے بغارتوں و ساری کائنات اور اُس کی ہر چیز کا صورت خالق ہی نہیں باوری اللہ تعالیٰ محکم ہی ہے۔

مزید برآں اسی زمانے سے تقریباً پندرہ سو برس پہلے کی واپسی کے لئے ایشیا، آفریقہ و رسالت کی دلیل بھی پیشی کر دی جس کے باعث سے ضرورت کو آگاہ رکھا۔ ان کی دلیل میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ خدا جو تمام کائنات کا باری ہے، اور جو ہر چیز کو اُس کی حالت اور ضرورت کے مطابق ہی بہا بریت دے رہا ہے، اُس کے مخالف تر تعریف بہا بریت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کی شعوری زندگی کے لیے رہتا ہی کن وہ ٹھیکوں موزوں نہیں ہو سکتی جو کھلی اور خوشی کی رہتا ہی کے لیے موزوں ہے۔ اُس کی موزوں ترین تعریفیں شکل یہ ہے کہ ایک ذمی شعور انسان اُس کی طاقت سے انسانوں کی بہا بریت پر مامور ہو اور وہ ان کی عقل و شعور کو اہل کے انہیں سیدھا راستہ بتائے ہے

## پیغمبری کیا ہے؟

دنیا میں انسان کو جن جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اللہ نے اُن سب کا انتظام خود ہی کر دیا ہے۔ پیغمبر پیدا ہوتا ہے تو کتنا سامان اس کو دے کر دنیا میں بھیجا جاتا ہے، دیکھنے کے لیے آنکھیں، سُننے کے لیے کان، کھانے اور سانس لینے کے لیے ناک۔ محسوس کرنے کے لیے سارے جسم کی کھال میں قوتِ لامسہ۔ چلنے کے لیے پاؤں۔ کام کرنے کے لیے ہاتھ۔ سوچنے کے لیے دماغ۔ اور ایسی ہی بے شمار دوسری چیزیں جو پہلے سے اس کی سب ضرورتوں کا بخانا کر کے اس کے چھوٹے سے جسم میں لپیٹ کر رکھ دی گئی ہیں۔ پھر جب وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے تو زندگی بسر کرنے کے لیے اتنا سامان اس کو ملتا ہے جس کا شمار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہوا ہے، روشنی ہے، حرارت ہے، پانی ہے، زمین ہے، ماں کے سینے میں پھلے سے دودھ موجود ہے، ماں اور باپ اور عزیزوں حتیٰ کہ غیروں کے دلوں میں اس کے لیے محبت اور شفقت پیدا کر دی گئی ہے جس سے اس کو پالا پوسا جاتا ہے۔ پھر تینا چنانا دہڑھتا جاتا ہے اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہر قسم کا سامان اس کو ملتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا زمین و آسمان کی ساری قوتیں اس کی پرورش اور خدمت کے لیے کام کر رہی ہیں۔

دنیا میں کام کرنے کے لیے جنہی قابلیتوں کی ضرورت ہے وہ سب انسانوں کو دی گئی ہیں۔ جہاں قوتِ عقل، سمجھ بوجھ، گریائی اور ایسی ہی بہت سی قابلیتیں تھوڑی یا بہت ہر انسان میں موجود ہیں لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے عجیب انتظام کیا ہے۔ ساری قابلیتیں سب انسانوں کو عیاں نہیں دیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کوئی کسی کا محتاج نہ ہوتا۔ نہ کوئی کسی کی پرہیز کرتا۔ اس لیے اللہ نے تمام انسانوں کی مجموعی ضرورتوں کے لحاظ سے سب قابلیتیں پیدا کر کے انسانوں ہی میں کیں، مگر اس طرح کہ کسی کو ایک قابلیت زیادہ دے دی اور کسی دوسرے کو کوئی دوسری قابلیت بعض لوگ جہاں محنت کی قوتیں دوسروں سے زیادہ لے کر آتے ہیں بعض لوگوں میں کسی خاص مہنر یا پیشہ کی پیدائشی قابلیت ہوتی ہے جس سے دوسرے محروم ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگوں میں ذہانت اور عقل کی قوت اور عمل سے زیادہ ہوتی ہے۔ بعض پیدائشی سپہ سالار ہوتے ہیں بعض میں حکمرانی کی خاص قابلیت ہوتی ہے۔ بعض تقریر کی

غیر معمولی قوت سے کر پیدا ہوتے ہیں۔ بعض میں انشا پر وازی کا قسطری ملکہ ہوتا ہے۔ کوئی ایسا شخص پیدا ہوتا ہے کہ اس کا دماغ ریاضی میں خوب لڑتا ہے حتیٰ کہ اس فن کے بڑے بڑے پیچیدہ سوالات اس طرح حل کر دیتا ہے کہ دوسروں کے ذہن و باطن تک نہیں پہنچتے۔ ایک شخص ایسا ہوتا ہے جو عجیب عجیب چیزیں ایجاد کرتا ہے اور اس کی ایجادوں کو دیکھ کر دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ ایک اور شخص ایسا بے نظیر قانونی دماغ لے کر آتا ہے کہ قانون کے جو کچھ برسوں غور کرنے کے بعد بھی دوسروں کی سمجھ میں نہیں آتے اُس کی نظر خود بخود اُن تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ خدا کی دین ہے۔ کوئی شخص اپنے اندر خود یہ قابلیتیں پیدا نہیں کر سکتا۔ تعلیم و تربیت سے یہ چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسلئے یہ پیدائشی قابلیتیں ہیں اور خدا اپنی حکمت سے جس کو یہ چیزیں چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔

انسانی تمدن کے لیے جن قابلیتوں کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، وہ زیادہ انسانوں میں پیدا کی جاتی ہیں۔ اور جن کی ضرورت جس قدر کم ہوتی ہے وہ اسی قدر کم آدمیوں میں پیدا کی جاتی ہیں۔ سپاہی بہت پیدا ہوتے ہیں۔ کسان اور ڈریسٹی اور لوہار اور ایسے ہی دوسرے کاموں کے آدمی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر علمی و دماغی قوتیں رکھنے والے اور سیاست اور سپہ سالاری کی قابلیتیں رکھنے والے کم پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ لوگ اور بھی زیادہ کم باب ہوتے ہیں جو کسی خاص فن میں غیر معمولی قابلیت کے مالک ہوں۔ کیونکہ ان کے کارنامے صدیوں کے لیے انسانوں کو اپنے جیسے ماہر فن کی ضرورت سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

### انسانی زندگی کی اہم ترین ضرورت

اب سوچنا چاہیے کہ دنیا میں انسانی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے صرف یہی ایک ضرورت تو نہیں ہے کہ انسانوں میں انجینئر، ریاضی دان، سائنسدان، قانون دان، سیاست کے ماہر، معاشیات کے باکال اور مختلف پیشوں کی قابلیت رکھنے والے لوگ ہی پیدا ہوں۔ ان سب سے بڑھ کر ایک اور ضرورت بھی تو ہے اور وہ یہ کہ کوئی ایسا ہو جو انسان کو خدا کا راستہ بتائے۔ دوسرے لوگ تو صرف یہ بتانے والے ہیں کہ اس دنیا میں انسان کے لیے کیا ہے اور اس کو کس کس طرح برتنا جاسکتا ہے۔ مگر کوئی یہ بتانے والا بھی تو ہونا چاہیے کہ انسان خود کس کے لیے ہے؟ اور انسان کو دنیا میں یہ سب سامان کس نے دیا ہے؟ اور اس دینے والے کی مرضی کیا ہے تاکہ انسان اسی کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کر سکے یعنی اور دائمی کامیابی حاصل کرے؟ یہ انسان کی اصلی اور سب سے بڑی

لئے مراد میں غیر معمولی درجے کی قابلیتیں۔ معمولی درجے کی قابلیتیں تعلیم و تربیت یا شوق و تہن سے نشوونما پا سکتی ہیں غیر معمولی قابلیتیں بسا اوقات بغیر کسی تربیت کے، اور کبھی معمولی درجے کی تربیت سے ابھرتی ہیں۔ اسلئے اگر اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت سے ان کی آبیاری ہو تو وہ بہت جلد معیار تک پہنچ جاتی ہیں۔ (دوستیوں)

ضرورت ہے اور عقل یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ جس خدا نے ہماری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ اس نے ایسی اہم ضرورت کو پورا کرنے سے غفلت برتی ہوگی۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔

### رشو لوں کا منصب

خدا نے جس طرح ایک ایک بٹر اور ایک ایک علم و فن کی خاص قابلیت رکھنے والے انسان پیدا کیے ہیں، اسی طرح ایسے انسان بھی پیدا کیے ہیں جن میں خود خدا کو پہچاننے کی اعلیٰ قابلیت تھی۔ اس نے ان کو دین اور اخلاق اور شریعت کا علم اپنے پاس سے عطا کیا۔ اور ان کو اس خدمت پر مقرر کیا کہ دوسرے لوگوں کو ان چیزوں کی تعلیم دیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہماری زبان میں نبی یا رسول یا پیغمبر کہا جاتا ہے۔

### پیغمبر کی پہچان

جس طرح دوسرے علوم و فنون کے ہر کمال لوگ ایک خاص قسم کا ذہن اور ایک خاص قسم کی طبیعت کے کر پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح پیغمبر بھی ایک خاص قسم کی طبیعت کے کراتے ہیں۔

ایک پیدائشی شاعر کا کام سننے ہی ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شاعری کی خاص قابلیت سے کر پیدا ہوا ہے کیونکہ دوسرے لوگ خواہ کتنی ہی کوشش کریں ویسا شعر نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح ایک پیدائشی مقرر، ایک پیدائشی اٹھارہ روز، ایک پیدائشی موجد، ایک پیدائشی لیڈر بھی اپنے کارناموں سے صاف پہچان لیا جاتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے کام میں غیر معمولی قابلیت کا اظہار کرتا ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتی۔ ایسا ہی حال پیغمبر کا بھی ہے۔ اس کے ذہن میں وہ باتیں آتی ہیں جو دوسرے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ وہ ایسے مضامین بیان کرتا ہے جو اس کے سوا کوئی دوسرا انسان بیان نہیں کر سکتا۔ اس کی نظر ایسی باریک باتوں تک خود بخود پونج پونج جاتی ہے جن تک دوسروں کی نظر رسوں کے غور و فکر کے بعد بھی نہیں پہنچتی۔ وہ جو کچھ کہتا ہے ہماری عقل اس کو قبول کرتی ہے جہاں اس کی گواہی دیتا ہے کہ ضرور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ دنیا کے تجربات اور کائنات کے مشاہدوں سے اس کی ایک ایک بات پختی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم خود ویسی بات کہنا چاہیں تو نہیں کہہ سکتے۔ پھر اس کی طبیعت ایسی پاکیزہ ہوتی ہے کہ وہ ہر معاملہ میں سچا اور شریفانہ طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ کبھی کوئی غلط بات نہیں کہتا۔ کوئی بڑا کام نہیں کرتا ہمیشہ سچی اور صداقت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور جو کچھ دوسروں سے کہتا ہے اس پر خود عمل کر کے دکھاتا ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ وہ جو کچھ کہے اس کے خلاف عمل کرے۔ اس کے قول یا عمل میں کوئی ذاتی غرض نہیں ہوتی۔ وہ خود کو بھلے کی خاطر خود نقصان اٹھاتا ہے اور اپنے بھلے کے لیے دوسروں کا نقصان نہیں کرتا۔ اس کی ساری زندگی سچائی، شرافت، پاک طینتی، بلند خیالی اور اعلیٰ درجہ کی انسانیت کا نمونہ ہوتی ہے جس میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی عجیب نظر نہیں آتا۔ انہی چیزوں کو دیکھ کر صاف پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ شخص خدا کا سچا پیغمبر ہے۔

## پیغمبر کی اطاعت

جب یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص خدا کا سچا پیغمبر ہے تو اس کی بات ماننا، اس کی اطاعت کرنا اور اس کے طریقہ کی پیروی کرنا ضروری ہے۔ یہ بات بالکل خلاف عقل ہے کہ ایک شخص کو پیغمبر بھی تسلیم کیا جائے اور پھر اس کی بات بھی نہ مانی جائے۔ اس لیے کہ پیغمبر تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے مان لیا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے خدا کی طرف سے کہہ رہا ہے اور جو کچھ کر رہا ہے خدا کی مرضی کے مطابق کر رہا ہے۔ اب ہم جو کچھ اس کے خلاف کہیں گے یا کریں گے وہ خدا کے خلاف ہوگا۔ اور جو بات خدا کے خلاف ہو وہ کبھی حق نہیں ہو سکتی۔ لہذا کسی پیغمبر تسلیم کرنے سے یہ بات خود بخود لازم ہو جاتی ہے کہ اس کی بات کہہ کر بے چون و چرا مان لیا جائے۔ اور اس کے حکم کے آگے سر جھکا دیا جائے خواہ اس کی حکمت اور اس کا فائدہ ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جو بات پیغمبر کی طرف سے ہے اس کا پیغمبر کی طرف سے ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سچی ہے اور تمام مصلحتیں اور حکمتیں اس میں موجود ہیں۔ اگر ہماری سمجھ میں کسی بات کی مصلحت نہیں آتی تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس بات میں کوئی خرابی ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خود ہماری سمجھ میں کوئی خرابی ہے۔

جو شخص کسی فن کا ماہر نہیں ہے، ظاہر ہے وہ کسی فن کی باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتا لیکن وہ کتنا بے وقوف ہوگا اگر وہ ماہر فن کی بات کو محض اس وجہ سے نہ مانے کہ اس کی سمجھ میں وہ بات نہیں آتی۔ دیکھو دنیا کے ہر کام میں اس کے ماہر کی ضرورت ہوتی ہے، اور ماہر کی طرف رجوع کرنے کے بعد اس پر پورا بھروسہ کیا جاتا ہے اور اس کے کام میں دخل نہیں دیا جاتا، کیوں کہ سب لوگ سب کاموں کے ماہر نہیں ہو سکتے اور نہ دنیا بھر کی تمام چیزوں کو سمجھ سکتے ہیں ہمیں اپنی تمام عقل اور ہوشیاری صرف یہ اطمینان حاصل کرنے میں صرف کرنی چاہیے کہ ایک شخص ماہر فن ہے یا نہیں۔ پھر جب کسی کے متعلق ہمیں معلوم ہو جائے کہ وہ ایک بہترین ماہر فن ہے تو اس پر ہم کو کامل بھروسہ کرنا چاہیے، پھر اس کے کاموں میں دخل دینا اور ایک ایک بات کے متعلق یہ کہنا کہ پہلے ہمیں سمجھا دو ورنہ ہم نہ مانیں گے، عقل مندی نہیں بلکہ سراسر بے وقوفی ہے۔ کسی وکیل کو مقدمہ سپرد کرنے کے بعد آپ ایسی تختیں کریں گے تو وہ آپ کو اپنے دفتر سے نکال دے گا کسی ڈاکٹر سے اس کی ایک ایک ہدایت پر دلیل پر بھی جانے لگے تو وہ مریض کا علاج چھوڑ دے گا ایسا ہی معاملہ مذہب کا بھی ہے ہمیں خدا کا علم حاصل کرنے کی ضرورت ہے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ کیا ہے ہمارے پاس خدا ان چیزوں کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ خدا کے سچے پیغمبر کی تلاش کریں۔ اس تلاش میں ہم کو بلاشبہ نہایت ہوشیاری اور سمجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔ کیونکہ اگر کسی غلط آدمی کو ہم نے پیغمبر سمجھ لیا تو وہ ہمیں غلط راستہ پر لگا دے گا۔ مگر جب ہمیں خوب جانچ پڑتال کرنے کے بعد یہ یقین ہو جائے کہ فلاں شخص خدا کا سچا پیغمبر ہے تو اس پر ہمیں پورا اطمینان کرنا چاہیے اور اس کے ہر حکم

کی اطاعت کرنی چاہیے۔

## پیغمبروں پر ایمان لانے کی ضرورت

جب یہ معلوم ہو گیا کہ سچا اور سیدھا راستہ وہی ہے جو خدا کی طرف سے خدا کا پیغمبر نبیائے تو یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ پیغمبر پر ایمان لانا اور اس کی اطاعت اور پیروی کرنا تمام انسانوں کے لیے ضروری ہے اور جو شخص پیغمبر کے طریقے کو چھوڑ کر خود اپنی عقل سے کوئی طریقہ نکالتا ہے وہ یقیناً گمراہ ہے۔

اس معاملہ میں لوگ عجیب عجیب غلطیاں کرتے ہیں بعض لوگ ایسے ہیں جو پیغمبر کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں مگر نہ اس پر ایمان لاتے ہیں نہ اس کی پیروی قبول کرتے ہیں۔ یہ سرف کافر ہی نہیں احمق بھی ہیں کہ آدمی جان بوجھ کر جھوٹ کی پیروی کرے غلطی سے اس سے بڑھ کر کوئی حماقت نہیں ہو سکتی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں پیغمبر کی پیروی کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہم خود اپنی عقل سے حق کا راستہ معلوم کر لیں گے۔ یہ بھی سخت غلطی ہے جس کسی نے ریاضی پڑھی ہے وہ یہ جانتا ہے کہ ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک سیدھا خط صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنے بھی خط کھینچے باتیں گے وہ سب یا تو ٹیڑھے ہوں گے یا اس دوسرے نقطہ تک نہ پہنچیں گے۔ ایسی ہی کیفیت حق کے راستے کی بھی ہے جس کو اسلام کی زبان میں صراطِ مستقیم یعنی سیدھا راستہ کہا جاتا ہے۔ یہ راستہ انسان سے شروع ہو کر خدا تک جاتا ہے۔ اور ریاضی کے اسی قاعدہ کے مطابق یہ بھی ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنے راستے ہوں گے یا تو سب ٹیڑھے ہوں گے یا خدا تک نہ پہنچیں گے۔ اب ذرا اس بات پر غور کریں کہ جو سیدھا راستہ ہے وہ تو پیغمبر نے بتا دیا اور اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ صراطِ مستقیم ہے ہی نہیں اس راستہ کو چھوڑ کر جو شخص خود کوئی راستہ تلاش کرے گا، اس کو وہ صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ضرور پیش آئے گی۔ یا تو اس کو خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ ملے گا ہی نہیں یا اگر ملے گا تو بہت پھیر کا راستہ ہو گا خطِ مستقیم نہ ہو گا بلکہ خطِ منحنی ہو گا پہلی صورت میں تو اس کی بنا ہی ظاہر ہے۔ دوسری صورت تو اس کے بھی حماقت ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جاسکتا۔ ایک بے عقل جانور بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے لیے خطِ منحنی کو چھوڑ کر خطِ مستقیم ہی اختیار کرتا ہے پھر اس انسان کو کیا کہا جائے جس کو خدا کا ایک نیک بندہ سیدھا راستہ بتائے اور وہ کہے کہ نہیں میں تیرے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چلوں گا بلکہ خود ٹیڑھے راستوں پر بھٹک بھٹک کر منزلِ مقصود تلاش کروں گا۔

یہ تو وہ بات ہے جو سرسری نظر میں ہر شخص سمجھ سکتا ہے لیکن اگر زیادہ غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ جو شخص پیغمبر پر ایمان لانے سے انکار کرتا ہے اس کو خدا تک پہنچنے کا کوئی راستہ بھی نہیں مل سکتا، نہ ٹیڑھا نہ سیدھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص سچے آدمی کی بات ماننے سے انکار کرتا ہے اس کے دماغ میں ضرور کوئی ایسی خرابی ہوگی



جس سے سبب بنت وہ چھائی اسے نمنہ مرڑتا ہے یا تو اس کی سمجھ بوجھ ناقص ہوگی، یا اس کے دل میں تکبر ہوگا یا اس کی طبیعت اسے تیزی برسی ہوگی کہ نہ نیکی اور صلہ وقتہ کی باتوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوگی، یا وہ باپ و دادا کی اندھی تقلید میں گرفتار ہوگا اور جو غلط باتیں رسم کے طور پر پیٹھے سے پئی آتی ہیں ان کے خلاف کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا، یا وہ اپنی خواہشات کا بندہ ہوگا پیغمبر کی تعلیم کو ماننے سے اس لیے انکار کرے گا کہ اس کے مان لینے کے بعد گناہوں اور ناجائز باتوں کی آزادی باقی نہیں رہتی۔ یہ تمام اسباب ایسے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی سبب ہی کسی شخص میں موجود ہو تو اس کو خدا کا راستہ ماننا غیر ممکن ہے۔ اور اگر کوئی سبب موجود نہ ہو تو یہ ناممکن ہے کہ ایک پیغمبر مقصوب اور نیک آدمی ایک پیغمبر کی تعلیم قبول کرنے سے انکار کر دے۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیغمبر خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوتا ہے اور خدا ہی کا یہ حکم ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کی اطاعت کرو۔ اب جو کوئی پیغمبر پر ایمان نہیں لانا وہ خدا کے خلاف بغاوت کرتا ہے۔ ہم انسان ہی سلطنت کی عیبتہ ہوں اس کی طرف سے جو حاکم ہی مقرر ہوگا میں اس کی اطاعت کرتی پڑیگی۔ اگر ہم اس کو حاکم تسلیم کرے سے انکار کر گئے تو اس کے بھی یہ ہوں گے کہ ہم نے خود سلطنت کے خلاف بغاوت کی ہے۔ سلطنت کو ماننا اور اس کے مقرر کیے ہوئے حاکم کو نہ ماننا دونوں بالکل متضاد باتیں ہیں ایسی ہی مثال خدا اور اس کے پیغمبر کے بھی ہے۔ خدا تمام انسانوں کا خالق و بادشاہ ہے جس شخص کو اس نے انسان کی ہدایت کے لیے بھیجا ہو اور اس کی اطاعت کا حکم دیا ہو، ہر انسان کا فرض ہے کہ اس کو پیغمبر تسلیم کرے اور ہر دوسری چیز کی پیروی چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی اختیار کرے۔ اس سے نمنہ مرڑتے والے بہر حال کافر ہے خواہ وہ خدا کو ماننا ہو یا نہ ماننا ہو۔

### تاریخ سلسلہ نبوت ایک نظر میں

اب دیکھیے کہ نوبہ انسانی میں پیغمبری کا سلسلہ کس طرح شروع ہوا اور کس طرح ترقی کرتے کرتے ایک آخری اور سب سے بڑے پیغمبر پر ختم ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ایک انسان کو پیدا کیا پھر اسی انسان سے اس کا جڑا پیدا کیا اور اس جڑے کی نسل چلتی، جو بے شمار صدیوں میں پھیلتے پھیلتے تمام روئے زمین پر چھا گئی۔ دنیا میں جتنے انسان بھی پیدا ہوئے ہیں وہ سب اسی ایک جڑے کی اولاد ہیں۔ تمام قوموں کی مذہبی اور تاریخی روایات متفق ہیں کہ نوبہ انسانی کی ابتدا ایک ہی انسان سے ہوئی ہے۔ سائنس کی تحقیقات سے بھی ثابت نہیں ہوا کہ زمین کے مختلف حصوں میں الگ الگ انسان بنائے گئے تھے۔ بلکہ سائنس کے اکثر علماء بھی یہی قیاس کرتے ہیں کہ پہلے ایک ہی انسان پیدا ہوا ہوگا اور انسان کی موجودہ نسل دنیا میں جہاں کہیں بھی پائی جاتی ہے اسی ایک شخص کی اولاد ہے۔

ہماری زبان میں اُس پہلے انسان کو آدم کہتے ہیں۔ اسی سے لفظ آدمی نکلا ہے جو انسان کا ہم معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلا پیغمبر حضرت آدم ہی کو بنایا۔ اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنی اولاد کو اسلام کی تعلیم دین یعنی ان کو یہ بتائیں کہ تمہارا اور تمام دنیا کا خدا ایک ہے، اسی کی تم عبادت کرو، اسی کے آگے سر جھکاؤ، اسی سے مدد مانگو اور اسی کی مرضی کے مطابق دنیا میں نیکی اور انصاف کی زندگی بسر کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تم کو اچھا انعام ملے گا۔ اور اگر اس کی اطاعت سے منہ موڑو گے تو بڑی سزا پاؤ گے۔

حضرت آدم کی اولاد میں جو لوگ اچھے تھے وہ اپنے باپ کے بنائے ہوئے میدان سے راستے پر چلتے رہے مگر جو لوگ بُرے تھے انہوں نے اُسے تھوڑا دیا۔ رفتہ رفتہ ہر قسم کی بُرائیاں پیدا ہو گئیں۔ کسی نے شروع اور چاند اور تاروں کو پوجنا شروع کر دیا۔ کسی نے درختوں اور جانوروں اور دریاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ کسی نے خیالی کیا کہ ہوا اور پانی اور آگ، اور بیماری و تندرستی اور قدرت کی مدد ساری نعمتوں اور مخلوق کے خدا الگ الگ ہیں ہر ایک کی پرستش کرنی چاہیے تاکہ سب خوش ہو کر ہم پر مہربان ہوں۔ اسی طرح جہالت کی وجہ سے شرک اور بت پرستی کی بہت سی صورتیں پیدا ہو گئیں جن سے عیسویوں مذہب نکل آئے۔ بدوہ زمانہ تھا جبکہ حضرت آدم کی نسل دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل چکی تھی مختلف قرین بن گئی تھیں۔ ہر قوم نے اپنا ایک نیا مذہب بنا لیا تھا۔ اور ہر ایک کی رسمیں الگ تھیں خدا کو بھولنے کے ساتھ لوگ اس قانون کو بھی قبول کئے تھے جو حضرت آدم نے اپنی اولاد کو سکھایا تھا۔ لوگوں نے خود اپنی خواہشات کی پیروی شروع کر دی۔ ہر قسم کی بُری رسمیں پیدا ہوئیں ہر قسم کے جاہلانہ خیالات پھیلے۔ اچھے اور بُرے کی تمیز میں غلطیاں کی گئیں۔ بہت سی بُری چیزیں اچھی سمجھ لی گئیں اور بہت سی اچھی چیزیں کو بُرا سمجھ لیا گیا۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کی یہ آیت حقیقتِ تہرت پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے:

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً قَلْبَتْ	ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے پھر یہ
اُمَمٌ السَّبِيحِينَ مُبْتَلِيْنَ وَمُنذِرِينَ	حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے تب
وَآتَاكَ مَا نَعَلَهُمْ لِكِتَابٍ بِالْحَقِّ يَأْمُرُكَ	اللہ نے ہی بھیجے جو راست روی پر، بشارت
بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا	دینہ والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے
اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوا مِنْ	تھے اور ان کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی تاکہ تم کو
بَعْدَ مَا جَاءَتْهُمْ الْبَيِّنَاتُ بَعِيًّا	بارے میں لوگوں کے درمیان ہوا اختلافات رونما
بَيْنَهُمْ - (بقرہ - ۲۱۳)	ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے اور ان اختلافات سے

رونما ہونے کی وجہ تھی کہ ابتدا میں ان لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا انہیں اختلافات ان لوگوں نے کیا تھیں

خفی کا علم دیا جا چکا تھا، انہوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض اس لیے خفی کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر مذہب کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتدا شرمک کی تاریخوں سے کی، پھر تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ تاریخی مصلحتی اور روشنی بڑھتی گئی پہلا نمک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا اس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور تیرے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسل آدم راہ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی ربی پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کر لیے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ خفی کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز خفی سے بڑھ کر امتیازات فرمائے اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم، سرکشی اور زیادتی کرنے لگے خواہشمند تھے اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو مبعوث کرنا شروع کیا۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور اپنی ایک نئی امت بنا لے۔ بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہ خفی کو واضح کر کے انہیں پھر سے ایک امت بنا دیں۔

## پیغمبروں کا کام

پیغمبروں نے اپنی اپنی قوموں کو بھولا ہٹا سبق یاد دلایا۔ انہیں ایک خدا کی پرستش سکھائی۔ شرک اور بت پرستی سے روکا۔ جاہلانہ رسموں کو توڑا۔ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتایا اور صحیح قوانین بنا کر ان کی پیروی کی ہدایت کی ہندوستان، چین، عراق، ایران، مصر، افریقہ، یورپ، غرض دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں خدا کی طرف سے اس کے پیچھے پیغمبر نہ آئے ہوں ان سب کا مذہب ایک ہی تھا اور وہ یہی مذہب تھا جس کو ہم اپنی زبان میں اسلام کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے طریقے اور زندگی کے قوانین ذرا مختلف تھے۔ ہر قوم میں جس قسم کی جہالت پھیلی ہوئی

لے کان الناس امتہ واحدۃ کے بعد اختلاف کے ظہور کا ذکر مذکور ہے۔ اسے آیت کے آخر میں واضح کر دیا گیا ہے۔ (ترجمہ)

عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام کی ابتدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی ہے یہاں تک کہ آنحضرت کو بانی اسلام تک کہہ دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے جسے ذہن سے قطعی طور پر نکال دینا چاہیے ہر طالب علم کو یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ اسلام ہمیشہ سے نوع انسانی کا ایک ہی حقیقی مذہب ہے اور دنیا میں جب اور جہاں بھی کوئی پیغمبر خدا کی طرف سے آیا ہے وہ یہی مذہب لے کر آیا ہے۔ (مترجم)

تھی اسی کو دور کرنے پر زور دیا گیا جس قسم کے غلط خیالات رائج تھے انہی کی اصلاح پر زیادہ توجہ صرف کی گئی۔ تہذیب و تمدن اور علم و عقل کے لحاظ سے جب قومیں ابتدائی درجہ میں تھیں تو ان کو سادہ تعلیم اور سادہ شریعت دی گئی جیسی جیسی ترقی ہوتی گئی تعلیم اور شریعت کو بھی وسیع کیا جاتا رہا، مگر یہ اختلاف صرف ظاہری شکلوں میں تھا۔ دین سب کی ایک تھی، یعنی اعتقاد میں توحید، اعمال میں نیکی و سلامت روی، اور آخرت کی خرابی مبرا پر یقین پیغمبروں کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟

پیغمبروں کے ساتھ بھی انسان نے عجیب معاملہ کیا پہلے تو ان کو تکلیفیں دی گئیں۔ ان کی ہدایت کو ملتے سے انکار کیا گیا کسی کو وطن سے نکالا گیا کسی کو قتل کیا گیا کسی کو عمر بھر کی تعلیم و تلقین کے بعد مشکل سے پانچ دن سپرد میسر آسکے۔ مگر خدا کے برگزیدہ بندے سے برابر کام کیے چلے گئے، یہاں تک کہ ان کی تعلیمات نے اثر کیا اور بڑی بڑی قومیں ان کی پیروی کیں۔ اس کے بعد گمراہی نے دوسری صورت اختیار کی۔ پیغمبروں کی وفات کے بعد ان کی امتوں نے ان کی تعلیمات کو بدل ڈالا۔ ان کی لائی ہوئی کتابوں میں اپنی طرف سے ہر قسم کے خیالات ملا دیئے۔ عبادتوں کے نئے نئے طریقے اختیار کیے۔ بعضوں نے خود پیغمبروں کی پرستش شروع کر دی کسی نے اپنے پیغمبر کو خدا کا اوتار قرار دیا یعنی یہ کہ خدا خود انسان کی شکل میں آتا یا تھا، کسی نے اپنے پیغمبر کو خدا کا بیٹا کہا کسی نے اپنے پیغمبر کو خدائی میں شریک ٹھہرایا۔ غرض انسان نے عجیب منہم نظر فی کی کہ جن لوگوں نے بتوں کو توڑا تھا انسان نے خود ان ہی کو بت بنا لیا۔ پھر جو شریعتیں یہ پیغمبر اپنی امتوں کو دے گئے تھے ان کو بھی طرح طرح سے بگاڑا گیا۔ ان میں ہر قسم کی جاہلانہ رسمیں ملا دی گئیں۔ افسانوں اور جھوٹی روایتوں کی آمیزش کر دی گئی۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو ان کے ساتھ غلط نقطہ کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ چند صدیوں کے بعد یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہا کہ پیغمبر کی اصل تعلیم اور اصل شریعت کیا تھی۔ اور بعد والوں نے اس میں کیا کیا ملا دیا۔ خود پیغمبروں کی زندگی کے حالات

# انبیاء کی مشرک دعوت اور ان کا منصب

قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی پر نبی آتا ہے اور ایک ہی بات کی طرف اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے :  
 يَتَوَخَّأُ غَيْبًا مَا لَكُمْ تِينٌ ۝ اے میری قوم کے لوگو، اللہ کی بندگی کرو، اس کے  
 اللہ غَيْرًا - سوا تمہارا کرتی خدا نہیں ہے۔

بابل کی سرزمین ہر، یا ارض سدوم، یا ملک مدین، یا حجر کا علاقہ، یا نیل کی وادی۔ چالیسویں صدی قبل مسیح ہر  
 یا بیسویں یا سوویں۔ غلام قوم ہو یا آزاد، ہنستہ دور مانڈہ ہو یا تمدنی و سیاسی حیثیت سے باہم عروت پر۔ غرض ہر جگہ،  
 ہر دور میں، ہر قوم میں اللہ کی طرف سے آنے والے ریسروں نے انسان کے سامنے ایک ہی دعوت پیش کی اور وہ یہ  
 تھی کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ مجبور و جفتی یا خدا نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم نے اپنی قوم سے صاف  
 کہہ دیا کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعاون، کوئی اشتراک عمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تم اس اصل الاصول  
 کو تسلیم نہیں کرتے۔ کَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا اَحْتَمٰ نُوْمِنُ بِاللّٰهِ  
 وَحَدَّثَنَا - حضرت موسیٰ نے فرعون کے پاس جا کر اَرْسِلْ مَعِيَ سَبْحَةَ اِسْمَ اَيْتِيكَ كَمَا سَطَلْتَهُ لِيْ مِنْ قَبْلُ  
 رَسُوْلًا مِّنْ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کا اعلان کیا، اور هَلْ لَكَ اِلٰه اِلَّا اَنْ تَذَكَّرَ اَلَيْسَ اِلٰهًا اِلَّا رَبُّكَ فَتَضَلُّوْا  
 دے، اور اسے آگاہ کیا کہ تو رب نہیں ہے بلکہ رب وہ ہے جس کے ہر چیز کو پیدا کیا اور جیسے کا طریقہ بتایا رَبَّنَا  
 اَلَّذِيْ اَعْطٰنَا كُلَّ شَيْءٍ فَخَلِّصْنَا مِنْ هٰذَا لِيْ نَعْبُدَكَ ثُمَّ هَدَيْتَنَا لِيْ نَسْجُدَ لَكَ اَلَيْسَ اِلٰهًا اِلَّا اَنْ تَذَكَّرَ  
 اس پاس کی قوموں کو رومی امپیر طرز کے خلاف جنگ آزادی کے جھنڈے کی طرف دعوت نہ دی بلکہ اس چیز کی

طرف دی کہ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ فَاعْبُدُوْا هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں کسی اور دنیا کے نہیں، اسی دنیا کے ہیں جس میں ہم رہتے ہیں، اور ایسے ہی انسانوں سے تعلق رکھتے ہیں جیسے ہم انسان ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جن ملکوں اور قوموں میں انبیاء علیہم السلام آتے ان میں سرے سے کوئی سیاسی معاشی، تمدنی مسئلہ حل طلب تھا ہی نہیں جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہوتی پس جب یہ واقعہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر رہنمائے ہر ملک اور ہر زمانہ میں تمام وقتی اور مقامی مسائل کو نظر انداز کر کے اسی ایک مسئلہ کو آگے رکھا اور اسی پر اپنا سارا زور صرف کیا تو اس سے صرٹ یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ مسئلہ اتم المسائل تھا اور وہ اسی کے حل پر زندگی کے تمام مسائل کا حل موقوف سمجھتے تھے صلیہ

حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے ان کو بتایا کہ ان کی بعثت کی غرض کیا ہے:

اور میں اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے بعض ان	وَ لِأَهْلِ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ
چیزوں کو حلال کروں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں	عَلَيْكُمْ وَ حَيْثُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ
دیکھو میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے	فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ أَطِيعُوا - اِنَّ اللّٰهَ
پاس نشانی لے کر آیا ہوں، لہذا اللہ سے ڈرو اور	رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ فَاعْبُدُوْا، هٰذَا صِرَاطٌ
میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا	مُسْتَقِيْمٌ۔ (آل عمران ۵۰-۵۱)

رب بھی۔ لہذا تم اسی کی بندگی اختیار کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے بھی بنیادی نکتہ یہی نہیں تھے:

ایک یہ کہ اقتدار اعلیٰ، جس کے مقابلے میں بندگی کا رویہ اختیار کیا جاتا ہے، اور جس کی اطاعت پر اطلاق و تقدیر کا پورا نظام قائم ہوتا ہے، صرف اللہ کے لیے مختص تسلیم کیا جاتے۔  
دوسرے یہ کہ اقتدار اعلیٰ کے نامہ اندے کی حیثیت سے نبی کے حکم کی اطاعت کی جائے۔  
تیسرے یہ کہ انسانی زندگی کو حلت و حرمت اور جواز و عدم جواز کی پابندیوں سے جکڑنے والا قانون و ضابطہ صرٹ اللہ کا ہو۔ دوسروں کے عام کردہ قوانین منسوخ کر دیئے جائیں۔

۱۰ عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت پر خصوصی توجہ اس لیے ضروری ہے کہ حضور سے پہلے کے انبیاء میں سے وہی آخری نبی تھے اور ان کے پیغام کو منسوخ کر دیا گیا۔ (درتبین،

۱۱۔۔ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ فَاعْبُدُوْا وَ لَا هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۔

پس در حقیقت حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے مشن میں ایک سر مُرُوق نہیں ہے جن لوگوں نے مختلف پیغمبروں کے مختلف مشن قرار دیتے ہیں، اور ان کے درمیان مقصد و نوعیت کے اعتبار سے فرق کیا ہے، انہوں نے سخت غلطی کی ہے۔ مالک الملک کی طرف سے اُس کی رعیت کی طرف جو شخص بھی مامور ہو کر آئے گا، اس کے آنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہے نہیں کہ وہ رعایا کو نافرمانی اور خود مختاری سے روکے اور سرک سے (یعنی اس بات سے کہ وہ اقتدارِ اعلیٰ میں کسی حیثیت سے دوسروں کو مالک الملک کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور اپنی وفاداریوں اور عبادت گزاروں کو ان میں منقسم کریں) منع کرے اور اصل مالک کی خاص بندگی و اطاعت اور پرستاری و وفاداری کی طرف دعوت دے۔

قرآن میں انبیاء کے مقصدِ بعثت کو ایک اور انداز سے بھی بیان کیا گیا ہے:

رَسُولًا مِّنْكُمْ لِيُنذِرَ الَّذِينَ كَفَرُوا  
لِيَأْتِيَ عَلَى اللَّهِ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ  
يَسْمَعُ رِيسَ خَشْمِثِي رَيْثِ دَابِئِ وَأُرْثِ الْوَالِ  
بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو مبعوث کر دینے  
کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حجت نہ رہے۔

یعنی ان تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی، اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوحِ انسانی پر اتمامِ حجت کرنا چاہتا تھا تاکہ آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم اس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور آپ نے ہیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اسی غرض کے لیے خدا نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ یا تو اُس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا، یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہِ راست معلوم تھی اور انہوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انہیں آگاہ نہ کیا۔

انبیاء و رُسل داعی حق ہونے کے ساتھ مُطاع بھی ہوتے ہیں جیسا کہ قرآن نے واضح کیا ہے کہ:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا  
لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ - (النساء: ۶۴)  
ہم نے جو رُسل بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ  
ان کو خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے

یعنی خدا کی طرف سے رُسل اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو۔ بلکہ رسول کے آنے کی غرض یہی ہوتی ہے کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اُسی کی پیروی کی جائے، اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر

عمل کیا جائے۔ اگر کسی نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کو رسول مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

غلبہ دین کی جدوجہد کرنا بھی انبیاء کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ملاحظہ ہو آیت:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ  
وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ  
وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ۔ (التوبہ: ۱۱۰)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت  
اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اُسے پوری  
جس دین پر غالب کر دے۔

تم میں آئین کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے جس دین کیا ہے۔ دین کا لفظ عربی زبان میں اس نظام زندگی یا طریقی زندگی کے لیے استعمال ہوتا ہے جس کے قائم کرنے والے کو سنہ اور شطاح تسلیم کر کے اس کا اتباع کیا جائے پس بعثت رسول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ جس ہدایت اور دین حق کو وہ خدا کی طرف سے لایا ہے اسے دین کی نوعیت رکھنے والے تمام طریقوں اور نظاموں پر غالب کر دے۔ دوسرے الفاظ میں رسول کی بعثت کبھی اس غرض کے لیے نہیں ہوتی کہ جو نظام زندگی لے کر وہ آیا ہے وہ کسی دوسرے نظام زندگی کا تابع اور اس سے مغلوب بن کر اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں میں سمٹ کر رہے۔ بلکہ وہ باوقار اور سماج کا نمائندہ بن کر آتا ہے اور اپنے بادشاہ کے نظام حق کو غالب دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی دوسرا نظام زندگی دنیا میں رہے بھی تو اسے خدائی نظام کی بخشی ہوئی گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا چاہیے جیسا کہ جزیرہ ادا کرنے کی صورت میں ذمیوں کا نظام زندگی رہتا ہے۔

### ازالہ فساد و استیلاء کا کام

انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس کی یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق و معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں، یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار صورتیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو بردکنا قرآن کا مقصود ہے۔ پھر اس کے ساتھ قرآن اس حقیقت پر بھی متنبہ کرنا ہے کہ زمین کے انتظام میں اصل چیز فساد نہیں ہے جس پر صلاح عارض ہوتی ہو بلکہ اصل چیز صلاح ہے جس پر فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی سے عارض ہوتا رہا ہے۔ بالفاظ دیگر بیان انسان کی زندگی کی ابتدا بہالت و وحشت اور شرک و بناوٹ اور اخلاقی بد نظمی سے نہیں ہوتی ہے جس کو دور کرنے کے لیے بعد میں تدریج اصلاحات کی گئی ہوں، بلکہ فی الحقیقت انسان کی زندگی کا آغاز صلاح سے ہوا ہے اور بعد میں اس درست نظام کو فساد کا انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے خراب کرتے رہے ہیں۔ اسی فساد کو مٹانے اور نظام حیات کو از سر نو درست کر دینے کے لیے اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے پیغمبر بھیجتا رہا ہے اور انہوں نے ہر زمانے میں انسان کو یہی دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس صلاح پر قائم



کیا گیا تھا اس میں فساد برپا کرنے سے باز آؤ۔

دعوائے نبوت اپنے اندر خود ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دراصل پورے نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں لامحالہ سک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی مطلق اطاعت کا مطالبہ کرے۔ کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی طمع اور رعیت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ مطلق اور راجعی بننے ہی کے لیے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔

### رسولوں کے بھیجنے کی غایت

اور یہ ہم نے اس لیے کیا کہ ہمیں ایسا نہ ہو کہ ان کے اپنے کیے کر توڑوں کی بدولت کوئی مصیبت آجائے ان پر آئے تو وہ کہیں اسے پروردگار توڑنے کیوں ہماری طرف کوئی رسول بھیجا کہ ہم تیری آیات کی پیروی کرتے اور اہل ایمان میں سے ہوتے۔

وَلَوْلَا اَنْ نُّصَيِّرِيْكُمْ فِى الْاَرْضِ مَتَّ اَيْدِيْهِمْ فَيَقْتُلُوْا رَسُوْلَنَا لَوْلَا اَرْسَلْنَا اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا فَتَتَّبِعُوْنَ اٰيٰتِيْكَ وَتَكُوْنُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ -

راقصص: ۴۷

اسی چیز کو قرآن مجید متعدد مقامات پر رسولوں کے بھیجے جانے کی وجہ کے طور پر پیش کرتا ہے مگر اس سے توجہ کا نصاب صحیح نہیں ہے کہ اس غرض کے لیے ہر وقت ہر جگہ ایک رسول آنا چاہیے جب تک دنیا میں ایک رسول کا پیغام اپنی صحیح صورت میں موجود ہے اور لوگوں تک اس کے پہنچنے کے ذرائع موجود ہیں کسی نئے رسول کی حاجت نہیں رہتی، الّا یہ کہ پچھلے پیغام میں کسی انسانے کی اور کوئی نیا پیغام دینے کی ضرورت ہو۔ البتہ جب انبیاء کی تعلیمات محو ہو جائیں، یا اگر انہوں میں خلط ملط ہو کر وسیلۂ ہدایت بننے کے قابل نہ رہیں تب لوگوں کے لیے یہ عذر پیش کرنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ہمیں حق و باطل کے فرق سے آگاہ کرتے اور صحیح راہ تہانے کا کوئی انتظام مرے سے موجود ہی نہیں تھا، پھر بھلا ہم کیسے ہدایت پاسکتے تھے۔ اسی عذر کا

۱۔ اس معاد میں قرآن کا نقطہ نظر ان لوگوں کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے جنہوں نے ارتقا کا ایک نقطہ تصور کر کے یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑنے سے شروع ہو کر زخمہ زخمی اور لٹی جا رہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر پیدا کیا تھا اور ایک صالح نفا سے اس کی زندگی کی ابتداء کی تھی پھر انسان خود شیطان کی سازش قبول کرنے کے بعد بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑا رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبروں کو اس غرض کے لیے بھیجا رہا کہ اسے تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دے۔

قطع کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ایسے حالات میں نبی مبعوث فرماتا ہے تاکہ اس کے بعد جو شخص بھی غلط راہ پر چلے وہ اپنی کجروی کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔

خدا کی طرف سے رسول اس لیے نہیں آتا ہے کہ بس اس کی رسالت پر ایمان لے آؤ اور پھر اطاعت جس کی چاہو کرتے رہو بلکہ رسول کے آنے کی غرض ہی یہ ہوتی ہے جیسا کہ ہم صفحہ ۶ پر بیان کر چکے ہیں، کہ زندگی کا جو قانون وہ لے کر آیا ہے، تمام قوانین کو چھوڑ کر صرف اسی کی پیروی کی جائے، اور خدا کی طرف سے جو احکام وہ دیتا ہے، تمام احکام کو چھوڑ کر صرف انہی پر عمل کیا جائے۔ اگر کسی شخص نے یہی نہ کیا تو پھر اس کا محض رسول کر رسول مان لینا کرنی معنی نہیں رکھتا۔

### فیصلے کے وقت رسولوں کی لغت

رسولوں کو ہم اس کام کے سوا اور کوئی غرض کے لیے نہیں بھیجتے کہ وہ ایثارت اور شہید کی خدمت انجام دے دیں۔ مگر کافروں کا حال یہ ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہوں نے میری آیات کو اور ان

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ  
وَمُنذِرِينَ وَمُجَادِلِ الَّذِينَ  
كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ  
وَاتَّخَذُوا آيَاتِنَا وَمَا نُنزِّلُهَا  
هُدًى - (الحج: ۵۶)

تنبیہات کو جو انہیں کی گئیں مذاق بنایا۔

رسولوں کو ہم اس لیے بھیجتے ہیں کہ فیصلے کا وقت آنے سے پہلے لوگوں کو فرماں برداری کے اچھے اور

نافرمانی کے بُرے انجام سے خبردار کر دیں۔

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، اس دین سے بہت کچھ مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کیے جنہیں کتاب دی گئی تھی، ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ  
وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ  
إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ  
بِقِيَامِ بَيْتِهِمْ - (آل عمران: ۱۹)

کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لیے ایسا کیا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو غیر بھی دنیا کے کسی گوشے اور کسی زمانہ میں آیا ہے، اس کا دین اسلام ہی تھا اور جو کتاب بھی دنیا کی کسی زبان اور کسی قوم میں نازل ہوئی ہے، اُس نے اسلام ہی کی تعلیم دی ہے اس اصل دین کو مسخ کر کے اداس میں کمی و بیشی کر کے جو بہت سے مذاہب لوریع انسانی میں رائج کئے گئے، ان کی پیدائش کا سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ لوگوں نے اپنی جائز حدود سے بڑھ کر حقوق، فائدے اور امتیازات

حاصل کرنے یا ہے اور اپنی خرابیوں کے مطابق اصل دین کے عقائد، اصول اور احکام میں رد و بدل کر ڈالا۔  
جملہ انبیاء ایک ہی دین کے علمبردار تھے۔

وَقَطَّعُوا أَمْوَالَهُمْ بَيْنَهُمْ كَغُلٍّ  
إِنِّبَاءً مِّنْ جَعُونَ۔ والانبیاء: ۱۹۳  
مگر یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ انہوں نے اس  
میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ سب کو  
بماری طرف پھینا ہے۔

دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے، اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف ایک اللہ  
ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ ہی کی بندگی و پرستش کی جانی چاہیے۔ بعد میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے وہ  
اسی دین کو بگاڑ کر بنائے گئے۔ اُس کی کوئی چیز کسی نے لی، اور کوئی دوسری چیز کسی اور نے، اور پھر ہر ایک نے  
ایک جزا اس کا لے کر بہت سی چیزیں اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا ڈالیں۔ اس طرح یہ بے شمار فرقے وجود  
میں آئیں۔ اب یہ خیال کرنا کہ فلاں نبی فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلاں نبی نے فلاں مذہب کی بنا ڈالی، اور انسانیت  
میں یہ فرقے اور مذہبوں کا تفرقہ انبیاء کا ڈالا ہوا ہے، محض ایک غلط خیال ہے، محض یہ بات کہ یہ مختلف فرقے اپنے  
آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاء کی طرف منسوب کر رہی ہیں، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ عقول  
اور مذہبوں کا اختلاف انبیاء کا ڈالا ہوا ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاء دس مختلف مذہب نہیں بنا سکتے تھے  
اور نہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی بندگی سکا سکتے تھے۔

### بعثت سے پہلے انبیاء کا تفکر

قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی آنے سے پہلے جو علم رکھتے تھے اُس کی نوعیت عام انسانی  
علوم سے کچھ بھی مختلف نہ ہوتی تھی۔ ان کے پاس نزولِ وحی سے پہلے کوئی ایسا ذریعہ علم نہ ہوتا تھا جو دوسرے  
لوگوں کو حاصل نہ ہو۔ چنانچہ فرمایا: مَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ مَا الْكَلِمَاتُ وَلَا الْإِيمَانُ وَالشُّرْعَىٰ ۗ ثُمَّ كَيْفَ نَبَيُّكُمْ  
تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے؟ وَتَجِدَكَ حَذًا لَا قَهْدَٰى وَالضَّمَىٰ ۗ اور اللہ نے تم کو ناواقف  
راہ پایا، پھر تمہیں راستہ بتایا۔

اس کے ساتھ قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبوت سے پہلے علم و معرفت کے انہی عام  
ذرائع سے، جو دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں۔ ایمان بالغیب کی منزل طے کر چکے ہوتے تھے۔ وحی اگر جو  
کچھ بھی کرتی تھی وہ بس یہ تھا کہ پہلے جن حقیقتوں پر ان کا دل گواہی دیتا تھا، اب انہی کے متعلق وحی یقینی اور قطعی  
شہادت دے دیتی تھی کہ وہ حق ہیں، اور انہی صداقتوں کا عینی مشاہدہ کرایا جاتا تھا تا کہ وہ پورے و قوف سے  
دنیا کے سامنے ان کی گواہی دے سکیں۔ یہ مضمون سورہ ہود میں تکرار بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے متعلق فرمایا:

اَقَمْنَ كَانَ عَلٰى بَيْتِنَا مِنْ رَبِّهِ وَ  
 يَتْلُوهُ شَاهِدًا مِّنْهُ وَ مِنْ قَبْلِهِ  
 كِتَابٌ مُّرْسَلٌ اِمَامًا وَرَحْمَةً  
 پھر کیا وہ شخص جو پہلے اپنے رب کی طرف سے ایک  
 دلیل روشن پر تھا (یعنی عقلی و فطری ہدایت پر)  
 اس کے بعد خدا کی طرف سے ایک گواہ بھی اس  
 کے پاس آگیا (یعنی قرآن) اور اس سے پہلے موعیٰ  
 (رکوع ۲)

کی کتاب بھی رہنا اور رحمت کے طور پر موجود تھی (کیا وہ اس صداقت کے بارے میں شک کر سکتا ہے)  
 پھر اس کے بعد یہی مضمون رکوع ۳ میں حضرت نوح کی زبان سے ارا ہوتا ہے:

يَقَوْمِ اَمَّا اَنْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى بَيْتِنَا  
 مِنْ تَابِي وَ اَنْتُمْ سَاخِمَةٌ مِنْ عِنْدِ  
 قَوْمِيَّكَ عَلَيْكُمْ اَنْكُرُكُمْ مَوْحَا وَ  
 اَنْتُمْ لَهَا كَرِهْتُمْ  
 اُسے میری قوم کے لوگو! غور تو کرو، اگر میں اپنے  
 رب کی طرف سے ایک دلیل روشن پر تھا، اور  
 اس کے بعد اُس نے اپنی طرف سے مجھ کو رحمت  
 (روحی و مہرت) سے بھی نوازا، اور وہ چیز تم کو

نظر نہیں آتی، قراب کیا ہم اسے زبردستی تمہارے سر چھپک دیں!

پھر اسی مضمون کو چھٹے رکوع میں حضرت صالح اور انھوں میں حضرت شعیب دہراتے ہیں۔ اس سے  
 یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وحی کے ذریعے سے حقیقت کا براہ راست علم پانے سے پہلے انبیاء علیہم  
 السلام مشاہدے اور غور و فکر کی فطری قابلیتوں کو صحیح طریقے پر استعمال کر کے دجسے اوپر کی آیات میں  
 مِنَ الذِّكْرِ سے تعبیر کیا گیا ہے) توجید و معاد کی حقیقتیں تک پہنچ جاتے تھے۔ اور ان کی یہ رسالتی مہربی نہیں  
 بلکہ کسی ہوتی تھی۔ اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ انہیں علم وحی عطا کرتا تھا، اور یہ چیز کسی نہیں بلکہ وہی ہوتی تھی  
 یہ مشاہدہ آثار، اور غور و فکر اور عقل عام (Common Sense) کا استعمال ان  
 قیاس آرائیوں اور اس حرج و منحین (Speculation) سے بالکل ایک مختلف چیز ہے  
 جس کا ارتکاب فلاسفہ کیا کرتے ہیں۔ یہ تو وہ چیز ہے جس پر قرآن مجید بر انسان کو خود آمادہ کرنے کی کوشش  
 کرتا ہے اور بار بار اس سے کہتا ہے کہ آنکھیں کھول کر خدا کی قدرت کے آثار کو دیکھو اور ان سے صحیح نتیجہ  
 اخذ کرو۔

### علم غیبِ رسل

یہ خیال درست نہیں ہے کہ رسولوں کو بس اتنا ہی علم غیب دیا گیا تھا جتنا بندوں کو پہنچانا مطلوب  
 تھا۔ یہ بات قرآن اور حدیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یعقوب کے متعلق اشارہ

ہوا ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا:

اِنِّيْ اَمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ  
میں خدا کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔  
روست - ۱۱

علاوہ بریں قرآن مجید کے بکثرت مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قوموں پر عذاب بھیجنے سے پہلے ان کے نبیوں کو خبری و سے دی گئیں مگر انہوں نے عذاب کے وقت اور اس کی تفصیلی کیفیت سے اپنی قوم کو مطلع نہ کیا حضرت نوح علیہ السلام کو تو اتنے پہلے عذاب کی خبر دے دی گئی تھی کہ انہوں نے طوفان آنے سے پہلے کشتی بنالی۔ لیکن انہوں نے اپنی قوم کو یہ نہیں بتایا کہ تم پر پانی کا عذاب آنے والا ہے پھر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کے ایسے ایسے حالات بتائے گئے تھے جو آپ کی امت کو نہیں بتائے گئے۔ چنانچہ ایک مرتبہ خطبہ دیتے ہوئے حضور نے ارشاد فرمایا کہ: يَا اُمَّةَ مُحَمَّدٍ مَا لَكُمْ لَوْ تَعْلَمُونَ مَا عَلِمْتُ لَصَدَعْتُمْ قَدِيحًا وَ لَسَبَبْتُمْ كَثِيْرًا (بخاری - باب الصدوقہ فی الکسوف)۔  
”آئے محمد کی قوم! خدا کی قسم اگر تم کو وہ باتیں معلوم ہوتیں جو میں جانتا ہوں تو تم کم مہنتے اور بہت رونے۔“

ایک اور موقع پر حضور نے فرمایا:

لَا اَمْرَ اَكْبَرُ مِنْ قَدْرِيْ كَمَا اَمْرَ اَكْبَرُ -  
”میں تم کو سچے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا سامنے سے دیکھتا ہوں۔“  
(بخاری، باب عظمتہ امام الناس)

غرض بکثرت آیات اور روایات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ رسولوں کو جو علم غیب دیا گیا تھا وہ اس سے بہت زیادہ تھا جو ان کے واسطے سے بدون تکس پہنچا۔ اور عقل بھی نہ ہی چاہتی ہے کہ ایسا ہو کیونکہ بندوں کو غیب کی صرف وہی باتیں معلوم ہونے کی ضرورت ہے جن کا تعلق عقائد ایمانیہ سے ہے لیکن رسولوں کو ان کے سوا اور بہت سی ایسی معلومات حاصل ہوئی چاہیں جو فرائض رسالت انجام دینے میں ان کے لیے مددگار ہوں، جس طرح سلطنت کو پالیسی اور اس کے امور سے نائب اس سلطنت اور گورنروں کو ایک ناس منڈک واقف ہونا ضروری ہے اور عام رعایا تک ان رازوں کا پتہ بنانا بجا ہے مفید ہونے کے اُلٹا مضر ہوتا ہے۔ اسی طرح ملکوت الہی کے بھی بہت سے امور ہیں جو خدا کے خاص نمائندے اور اس کے رازوں جانتے ہیں اور عام رعیت ان سے یہ خبر ہے۔ یہ علم غیب رسولوں کو تو اپنے فرائض انجام دینے میں مدد دیتا ہے لیکن عام رعایا ان اس علم کی ضرورت ہی کہتی ہے اور نہ اس کا عمل ہی کر سکتی ہے زیادہ صحت کے ساتھ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ جہد میں اسی قدر ہے کہ نبی کا علم خدا کے علم سے کم اور بندوں کے علم سے زیادہ ہوتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ وہ کتنا ہوتا ہے اور کتنا نہیں تو اس کو اپنے اپنے کا کوئی پیمانہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

## انبیاء کی کڑی نگرانی

انسانی معاشرے میں نبی کا مقام اتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی بات بھی جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آئے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتی، نبی کی زندگی میں اگر پیش آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کی زندگی پر ایسی کڑی نگرانی رکھی گئی ہے کہ ان کا کوئی اونٹنی اقدام بھی مٹا دیا اپنی سے مٹا ہوا نہ ہو۔ ایسا کوئی فعل بھی اگر نبی سے صادر ہوتا ہے تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی ہے تاکہ اسلامی قانون اور اس کے اصول اپنی بالکل صحیح صورت میں نہ صرف خدا کی کتاب، بلکہ نبی کے اُسورۂ حسنہ کی صورت میں بھی خدا کے بندوں تک پہنچ جائیں اور ان میں فتنہ برابری کوئی چیز اسی شامل نہ ہونے پستے جو مٹا دیا اپنی سے مٹا ہوا نہ ہو۔

## براہِ راست علم و مشاہدہ

انبیاء علیہم السلام میں سے ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے ان کے منصب کی مناسبت سے مگر تسموات وارض کا مشاہدہ کرایا ہے اور واقعی حجابات پرچ میں سے ہٹا کر آنکھوں سے وہ حقیقتیں دکھائی ہیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر وہ مامور کیے گئے تھے، تاکہ ان کا مقام ایک فلسفی کے مقام سے بالکل متمیز ہو جائے۔ فلسفی جو کچھ بھی کہتا ہے قیاس اور گمان سے کہتا ہے، وہ خود اگر اپنی حیثیت سے واقف ہو تو کبھی اپنی کسی رائے کی صداقت پر شہادت نہ دے گا مگر انبیاء جو کچھ کہتے ہیں وہ براہِ راست علم اور مشاہدے کی بنا پر کہتے ہیں، اور وہ نقل کے سامنے یہ شہادت دے سکتے ہیں کہ ہم ان باتوں کو جانتے ہیں اور یہ ہماری آنکھوں کی حقیقتیں ہیں۔

## غیر معمولی قوتیں

وَکَمَا فَصَّلْتَ الْجَبْرُ قَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ  
إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنِّي  
لَقَدْ دُونَ - (یوسف: ۹۴)

جب یہ قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے دکتان میں کہا، میں یوسف کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں، تم لوگ کہیں یہ نہ کہنے لگو کہ میں بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہوں۔

اس سے انبیاء علیہم السلام کی غیر معمولی قوتوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی قافلہ حضرت یوسف کا قیصر کے مصر سے چلا ہے اور اُدھر سنکیٹروں میل کے فاصلے پر حضرت یعقوبؑ اس کی ہیک پالیتے ہیں مگر اس سے یہ بھی

انہی کی غیر معمولی قوتوں اور صلاحیتوں اور ان کی خصوصی تزئین کے اہتمام کے بارے میں چند تفصیلی عبارات زیر ہے۔  
رسالت آنحضرتؐ کی شخصی اور نبوی حیثیت کی فصل رسالت اور اس کے احکام میں درج ہیں۔ (ترجمہ)

معلم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی یہ قومیں کچھ ان کی ذاتی ذمہئیں بلکہ اللہ کی بخشش سے ان کو ملی تھیں اور اللہ جیب اور جن قدر چاہتا تھا انہیں کام کرنے کا موقع دیتا تھا حضرت یوسفؑ برسوں مصر میں موجود رہے اور کبھی حضرت یعقوبؑ کو ان کی خوشبو نہ آئی مگر اب بیکار توت اور اک کی تیزی کا یہ عالم ہو گیا کہ ابھی قیصر مصر سے چلا ہے اور ان ، جھپک آئی شروع ہو گئی نیک

### بشریت نسبتاً

تمام بچنے انبیاء بھی بشر ہی تھے ، کوئی نرالی مخلوق نہ تھے تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ آج پہلی مرتبہ ہی پیش نہیں آیا ہے کہ ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے ۔

پہلے انبیاء بھی اسی کام کے لیے آئے تھے جو کام اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں یہی ان کا مشن تھا اور یہی ان کی تعلیم تھی

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ یہاں ہے ۔ بڑے بڑے مصائب سے وہ گزرے ہیں سا ہا سال مصائب میں مبتلا رہے ہیں شخصی اور ذاتی مصائب میں بھی اور اپنے مخالفوں کے ڈالنے ہوئے مصائب میں بھی ، مگر آخر کار اللہ کی نصرت و تائید ان کو حاصل ہوتی ہے ، اس نے اپنے فضل و رحمت سے ان کو فوازا ہے ان کی دعاؤں کو قبول کیا ہے ، ان کی تکلیفوں کو رفع کیا ہے ، ان کے مخالفوں کو نچا دکھا ہے ، اور معجزانہ طریقوں پر ان کی مدد کی ہے ۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبول بارگاہ ہونے کے باوجود ، اور اس کی طرف سے بڑی بڑی حیرت انگیز باتیں پانے کے باوجود ، کسی وہ بندے اور بشر ہی ۔ اور نسبت ان میں سے کسی کو حاصل نہ تھی ایلے

### عصمت نسبتاً کا مفہوم

انبیاء بھی انسان ہی ہوتے ہیں ، اور کوئی انسان بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ہر ذلت اُس بلند ترین معیار کمال پر قائم رہے جو مومن کے لیے مقرر کیا گیا ہے ۔ ایسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی صیبا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے لیکن جو نبی کہ اسے یہ احساس ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احساس کو دیا جاتا ہے کہ اس کا قدم معیار مطلوب سے نیچے جا رہا ہے ، وہ فوراً توبہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کی اصلاح کرنے میں اسے ایک لمحہ کے لیے تامل نہیں ہوتا حضرت نوحؑ کی اخلاقی رفعت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ابھی جان جان جو ان بظاہر آنکھوں کے سامنے غرق ہوا ہے اور اس قطار سے کیلومترمذہ کو

لے انبیاء کی بشریت کے موضوع پر آگے ایک مستقل فصل دی جا رہی ہے ۔ (درمیان)

آ رہا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں مستحب فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لیے اپنا بھنا کہ وہ تمہاری مشاب سے پیدا ہو رہا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے، تو وہ فوراً اپنے دل کے زخم سے بے پروا ہو کر اس طرز فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضا ہے۔

نبی کی معصومیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور لغزش و خطا کی قوت و استعداد سلب کر لی گئی ہے حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہتا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے لیکن بشریت کی تمام صفات سے متصف ہونے کے باوجود، اور بخلہ انسانی جذبات، احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خدا ترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر میں اپنے رب کی ایسی زبردست محبتیں اور دلیلیں رکھتا ہے جن کے مقابلہ میں خواہش نفس کسی کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نالوستہ اس سے کوئی لغزش سرزد ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحی جلی کے ذریعہ سے اس کی اصلاح فرما دیتا ہے، کیونکہ اس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے، ایک پوری امت کی لغزش ہے۔ اور وہ راستہ سے بال برابر ہٹ جاتے تو دنیا گرا ہی میں میلوں ڈور نکل جاتے۔

### اوصاف انبیاء کے متعلق چند آیات

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا - (مریم - ۴۱)  
وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ مُوسَى إِنَّهُ كَانَ مُخْلَصًا وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا -

اور اس کتاب میں ابراہیم کا تقہ بیان کر دینا ہے کہ وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔ اور ذکر کرو اس کتاب میں موسیٰ کا وہ ایک چید شخص تھا اور رسول نبی تھا۔

وَإِذْ نَادَيْنَاهُ مِنْ جَانِبِ الطُّورِ الْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَاهُ نَجِيًّا - (مریم - ۵۴-۵۵)

اور ہم نے اس کو طور کے واپسی جانب سے پکارا اور دائیں گنگوڑ سے اس کو قریب عطا کیا۔

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا -

اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا وہ اپنا گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا۔

وَإِذْ كُنَّا فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا - وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا - (مریم - ۵۴، ۵۵)

اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کرو وہ ایک راست باز انسان اور رسول نبی تھا اور اسے ہم نے بلند مقام پر اٹھایا تھا۔



یہ وہ پیغمبر ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا آدم کی اولاد میں سے، اور ان لوگوں کی نسل سے جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا اور یحییٰ کی نسل سے اور اسرائیل کی نسل سے اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔ ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمان کی آیات ان کی سنائی باقیں تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے اس سے پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہوشیاری بخشی تھی اور ہم اس کو خوب جانتے تھے۔ اور ہم اسے اور لوگوں کو بچا کر اُس سرزمین کی نیک نکالی سے نکلے جس میں ہم نے دنیا والوں کو لیے برکتیں رکھی ہیں اور ہم نے اسے اسحق عطا کیا اور یعقوب اس پر فریاد اور ہر ایک کو صلح بنایا۔ اور ہم نے اُن کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے سہنائی کرتے تھے اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ نیک لوگوں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

اور لوگوں کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اُسے اُس سستی سے بچا کر نکال دیا جو بد کاریاں کرتی۔ درحقیقت وہ بڑی ہی بُری خاستق قوم تھی۔ لوگوں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ صالح لوگوں میں سے تھا۔

اور یہی نعمت ہم نے نوح کو دی۔ یاد کرو کہ ان صلب سے پہلے اُس نے ہمیں پکارا تھا ہم نے اس کی دعا قبول کی، اور اسے اور اس کے گھرانے

أُولَئِكَ الَّذِينَ أَعْمَرَ اللَّهُ عَلَيْهُمْ  
مِنَ النَّبِيِّينَ مِن ذُرِّيَّتِهِ آدَمَ وَ  
يَسْمَعُ حَمَلْنَا بَعَثْنَا نُوحًا وَ مِنْ  
ذُرِّيَّتِهِ إِبْرَاهِيمَ وَ إِسْمَاعِيلَ وَ مَعْنَى  
هُدَيْنَا وَ اجْتَبَيْنَا إِذَا تَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمُ  
الْبُيُوتَ التَّرَاحُيْمَ حَرُّوا مُسْحَدًا وَ مَكِينًا۔

درمیرم - ۱۵۸

وَ كَفَدْنَا بِحَنَانِنَا إِسْرَافَهُمْ مَرشَدَةً  
مِن قَبْلُ وَ كُنَّا بِهِمُ عَلِيمِينَ۔ (الانبیاء: ۱۵۸)  
وَ جَعَلْنَاهُ وَ نُوحًا إِلَى الْأَرْضِ النَّبِيَّ  
بُرْكَانًا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ۔ وَ وَهَبْنَا لَهُ  
إِسْحَاقَ وَ يَعْقُوبَ نَافِلَةً وَ كَلَّمَا  
جَعَلْنَا طَلُوتَ بْنَ - وَ جَعَلْنَاهُمْ آيَةً  
يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ  
وَ إِقَامَ الصَّلَاةِ وَ آتَاءَ الزَّكَاةِ  
وَ كَانُوا عَابِدِينَ۔

الانبیاء ۱۴۳-۱۴۴

وَ كَلَّمَا آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَ عِلْمًا وَ  
تَجْنِيئَهُ مِنَ الْقُرَيْبِ الَّذِي كَانَتْ تَعْمَلُ  
الْخَبَائِثَ۔ إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمَ سَوْفٍ  
فَاسِقِينَ۔ وَ أَدْخَلْنَاهُ فِي رَحْمَتِنَا  
إِنَّهُ مِنَ الصَّالِحِينَ۔ (الانبیاء: ۱۴۵)  
وَ نُوحًا إِذْ نَادَى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا  
لَهُ فَجَعَلْنَاهُ وَ أَهْلَهُ مِنَ الْعَرَبِ  
الْعَرَبِيِّينَ وَ نَصَرْنَاهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِينَ

كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا إِنَّهُمْ كَانُوا قَوْمًا سَاجِدِينَ  
فَأَعْرَفْنَاهُمْ أَجْبَعِينَ -

(الانبیاء: ۷۶-۷۷)

کو رسد عظیم سے نجات دی اور اس قوم کے مقابلے  
میں اُس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا  
تھا وہ بڑے بڑے لوگ تھے جنہیں ہم نے ان سے  
کو غرق کر دیا۔

وَدَاوُدَ وَ سُلَيْمَانَ إِذْ جَاهَدَا  
فِي الْحَرْبِ إِذْ نَفَسَتْ فِيهِمُ الْقَوْمُ  
وَ كُنَّا لِحُكْمِهِمْ شَاهِدِينَ فَفَقَّمْنَا  
سُلَيْمَانَ وَ كَلَّمَا حُكْمًا وَ عِلْمًا  
وَ نَحَرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ فَنَبَّحْنَا  
وَ الطَّيْرَ وَ كُنَّا فَاعِلِينَ وَ مَكَرْتَهُ  
مَنْعَتَهُ لَبُوسٍ لَّكُمْ لَتُخْسِنَكُمْ  
بِأَسْمِكُمْ - قَهْلُ أَنتُمْ شَاكِرُونَ - وَ  
لِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِكَ  
إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَرَكْنَا فِيهَا - وَ كُنَّا  
بِقَلْبِ شَيْطَانٍ مِّنْ عَالَمِينَ - وَ مِنَ الشَّيَاطِينِ  
مَنْ يَخُوضُونَ لَهُمْ وَ يَعْمَلُونَ عَمَلًا  
ذُرًّا ذَرًّا - وَ كُنَّا لَهُمْ حَافِظِينَ -

(الانبیاء: ۸۱-۸۲)

اور اسی نعمت سے ہم نے داؤد و سلیمان کو سرفراز کیا۔  
یا دیکھو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک کھیت کے  
مقدسے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے  
وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں پھیل گئی تھیں اور  
ہم اُن کی عدالت خود دیکھ رہے تھے اُس وقت  
ہم نے صبح فیصلہ سلیمان کو کھیا دیا، حالانکہ دونوں کو ہم  
نے حکم اور علم عطا کیا تھا اور داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور  
زردوں کو مخر کر دیا تھا نیز سب کچھ ہم نے اس فعل کے کرنے والے  
مہی تھے! اور ہم نے اُس کو تہا رسے خاند سے  
یہیے زرد بنانے کی صنعت سکھا دی تھی تاکہ  
تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے پھر کیا تم شکر  
گزار ہو اور تسلیم کے یہیے ہم نے تیرموا کو مستحضر کر دیا  
تھا جو اُس نے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلی تھی  
جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں ہم ہر چیز کا علم رکھتے  
ہے اور شیطاں میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے پیسے غوطے لگاتے  
اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ ان سب کے نگران ہم ہی تھے۔

اس سیاق و سباق میں حضرت داؤد و سلیمان کے اس خاص واقعے کا ذکر کرنے سے مقصود یہ نہیں نہیں کرنا  
ہے کہ نسب یا وہ علیہم السلام تہی ہونے اور اللہ کی طرف سے غیر معمولی طاقتیں اور تقابلیتیں پانے کے باوجود ہوتے  
انسان ہی تھے، اکتہت کا کوئی شائبہ اُن میں نہ ہوتا تھا۔ اس مقدسے میں حضرت داؤد کی رہنمائی وحی کے ذریعہ  
سے نہ کی گئی اور وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر گئے، حضرت سلیمان کی رہنمائی کی گئی اور انہوں نے صبح فیصلہ کیا، حالانکہ  
نہی دونوں ہی تھے۔ ان دونوں بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی یہی بات سمجھانے کے لیے ہے

کہ یہ وہی کمالات تھے اور اس طرح کے کمالات کسی کو خدا نہیں بنا دیتے۔ **آیہ ۱۸۴**

وَأَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَفِئْتَسِيًّا  
الْعُرْوَةَ أَنْتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ -  
فَأَسَجْنَا لَهُ فَكَلَّمْنَا مَا بِهِ مِنْ صُوْرٍ  
وَأَاتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ  
رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذَكَرَىٰ  
بِالْعَبِيدِ -  
والانبیاء: ۸۳-۸۴

اور یہی رہو شہنشاہ اور حکم و علم کی نعمت، ہم نے  
ایوب کو دی تھی۔ یاد کرو، جبکہ اس نے اپنے رب  
کو پکارا کہ مجھے بیماری لگ گئی ہے اور نواہم  
الراحمین ہے، ہم نے اس کی دعا قبول کی اور جو  
تکلیف اسے تھی اس کو دور کر دیا، اور صرف  
اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیئے بلکہ ان  
کے ساتھ اتنے ہی اور بھی دیتے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق پر عبادت  
گزاروں کے لیے۔

وَأِسْمَاعِيلَ وَإِدْرِيسَ وَذَا الْكِفْلِ  
كُلٌّ مِّنَ الصَّابِرِينَ وَأَدْخَلْنَاهُمْ فِي  
رَحْمَتِنَا - إِنَّهُمْ مِّنَ الصَّالِحِينَ -  
والانبیاء: ۸۶

اور یہی نعمت اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل  
کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو ہم  
نے اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں  
میں سے تھے۔

وَذَاللُّنثِ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا  
كَذَّبَتْ أَنْ تَنْفَعِيَا عَلَيْهِ فَنَادَىٰ  
فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَّآ إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ  
سُبْحٰنَكَ عَنِّي كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ  
فَأَسَجْنَا لَهُ وَجَّيْنَهُ مِنَ الْعَمِّ وَ  
كَذٰلِكَ نُبَيِّئُ الْمُؤْمِنِينَ -  
والانبیاء: ۸۷-۸۸

اور کھلی دل سے کہہ رہے تھے نوازا گیا دکر جبکہ وہ  
بگڑ کر بیلا گیا تھا اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر گرفت  
نہ کریں گے، آخر کو اس نے تارکیوں میں سے  
پکارا وہ نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے  
تیری ذات، بے شک میں نے قصور کیا، تب  
ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو  
نجات بخشی اور اسی طرح ہم مومنین کو بچا دیا  
کرتے ہیں۔

وَذَكَرِيَّا إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ رَبِّ لَا  
تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ  
فَأَسَجْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَ  
أَصَلَّمْنَا لَهُ نَرُوحَهُ إِنَّهُمْ كَانُوا

اور زکریا کو جبکہ اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ اپنے  
پروردگار مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور بہترین وارث تو  
تو ہی ہے۔ پس ہم نے اس کی دعا قبول کی اور  
اسے یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے

درست کر دیا۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ  
 ڈھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور عزت کے  
 ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے

يَسْرِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا  
 رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خِشَعِينَ  
 (الانبیاء: ۹۰)

حضرت زکریا کے واقعے کا ذکر کرنے سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ یہ سارے نبی محض نبی سے اور  
 انسان تھے، الوہیت کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ دوسروں کو اولاد بخشنے والے نہ تھے بلکہ خود اللہ کے آگے اولاد  
 کے لیے ہاتھ پھیلانے والے تھے۔ حضرت یونس کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ایک نبی اولوالعزم ہونے کے باوجود  
 ان سے تصور سرزد ہوا تو انہیں پکڑ لیا گیا۔ اور جب وہ اپنے رب کے آگے جھک گئے تو ان پر فضل بھی ایسا کیا  
 گیا کہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لائے گئے۔ حضرت ابراہیم کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ نبی کا بتلانے سے مصیبت  
 ہونا کوئی نرالی بات نہیں ہے، اور نبی بھی جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو خدا ہی کے آگے شفا کے لیے  
 ہاتھ پھیلاتا ہے۔ وہ دوسروں کو شفا دینے والا نہیں، خدا سے شفا مانگنے والا ہوتا ہے۔ پھر ان سب باتوں  
 کے ساتھ ایک طرف یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ یہ سارے انبیاء تو حید کے قائل تھے اور  
 اپنی حاجات ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ لے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ  
 اللہ تعالیٰ ہمیشہ غیر معمولی طور پر اپنے نبیوں کی مدد کرتا رہا ہے، آغاز میں خواہ کیسی ہی آزمائشوں سے ان  
 کو سابقہ پیش آیا ہو مگر آخر کار ان کی دعائیں معجزانہ نشان کے ساتھ پوری ہوتی ہیں۔

# باب ۱۰

# وُحی

## وحی کا مفہوم، صورتیں اور اقسام

### لغوی اور اصطلاحی معنی

وحی کے معنی میں اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات، ٹوٹنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا یا پیغام بھیجنا۔ وحی کے لغوی معنی ہیں "اشارہ سرخ" اور "اشارہ غشی"، یعنی ایسا اشارہ جو معرفت کے ساتھ اس طرح کیا جائے کہ اس اشارہ کرنے والا جانے یا وہ شخص جسے اشارہ کیا گیا ہے۔ باتنی کسی اور شخص کو اس کا پتہ نہ چلنے پاتے اس لفظ کو اصطلاحاً اس ہدایت کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو بحلی کی کونڈک طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے کسی بندے کے دل میں ڈالی جاتے۔

اللہ تعالیٰ کے کسی کے پاس آنے یا اس کے پاس کسی کے جانے اور روبرو اس سے گفتگو کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ غالب اور حکیم ہوتے۔ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جب بھی وہ کسی بندے سے رابطہ قائم کرنا چاہے، کوئی دشواری اس کے ارادے کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتی، اور وہ اپنی حکمت سے اس کام کے لیے وحی کا طریقہ اختیار فرماتا ہے۔

### اقسام وحی

"وحی" کا لفظ اگرچہ اب صرف اس وحی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انبیاء پر آتی ہے لیکن قرآن میں یہ اصطلاحی فرق نہیں پایا جاتا یہاں آسمانوں پر بھی وحی ہوتی ہے جس کے مطابق ان کا سارا نظام چلتا ہے (وَأوحی فی کلّ شئآءٍ آموخاً۔ تم السجدہ)۔ زمین پر بھی وحی ہوتی ہے جس کا اشارہ پاتے ہیں وہ اپنی سرگزشت سنانے لگتی ہے۔ (قُلْ مَنذِرًا مِّنذُرِ رَبِّكَ آتَاكَ مَا تَرَیٰ وَرَبُّكَ عَلِيمٌ خَفِیٌّ۔ اذقو حجرات ربك انی اللہ کی کہتی ائی معکم۔ الانفال)۔ شہد کی مکھی کو اس کا پورا کام وحی و فطری تعلیم کے ذریعے سے سکھایا جاتا ہے جیسا کہ سورہ نمل کی آیت ۱۸ میں آپ دیکھتے ہیں اور یہ وحی صرف شہد کی مکھی تک ہی محدود نہیں ہے۔ مچل کو تیرنا، پرندے کو اڑنا اور نوزائیدہ بچے کو دو دھڑپنا بھی وحی خداوندی ہی سکھایا کرتی ہے پھر ایک انسان کو

غور و فکر اور تحقیق و تجسس کے بغیر جو صحیح تدبیر یا صائب راستے، یا فکر و عمل کی صحیح راہ سمجھائی جاتی ہے وہ بھی ہی ہے (وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّ مُوسَىٰ أَنْ أَرْضِعِيهِ - القصص)۔ اور اس وحی سے کوئی انسان بھی محروم نہیں ہے لہذا میں جننے اکتشافات ہوتے ہیں جنہی مفید ایجادیں ہوتی ہیں، بڑے بڑے مدبرین، فاتحین، مفکرین اور مصلحین نے جو سر کے کام کیے ہیں ان سب میں اس وحی کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ بلکہ عام انسانوں کو آتے دن اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں کہ کسی بیٹھے بیٹھے دل میں ایک بات آئی، یا کوئی تدبیر سوچ بھر گئی، یا خواب میں کچھ دکھائی دیا اور بعد میں تجربے سے پتہ چلا کہ وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو غیب سے انہیں حاصل ہوئی تھی۔ ان بہت سی اقسام میں سے ایک خاص قسم کی وحی وہ ہے جس سے انبیاء علیہم السلام نوازے جاتے ہیں، اور یہ وحی اپنی خصوصیت میں دوسری اقسام سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس میں وحی کیسے جانے والے کو پورا شعور ہوتا ہے کہ یہ وحی خدا کی طرف سے آرہی ہے اسے اس کے من جانب اللہ ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ وہ عقائد اور احکام اور قوانین اور ہدایات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور اسے نازل کرنے کی غرض یہ ہوتی ہے کہ نبی اس کے ذریعے سے نوری انسانی کی رہنمائی کرے۔

### غلط فہمی

سورہ شوریٰ کی آیت اُوَيْسِلَ رَسُولًا فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ فِي رُوحٍ كَثِيرٍ کی وہ صورت مذکور ہے جس کے ذریعے سے تمام کتب آسمانی انبیاء علیہم السلام تک پہنچی ہیں یعنی اللہ اپنے ایک فرشتے کے ذریعے سے نازل کے پاس وحی بھیجتا ہے بعض لوگوں نے اس فقرے کی غلط تاویل کر کے اس کو یہ معنی پہناتے ہیں کہ اللہ کوئی رسول بھیجتا ہے، جو اس کے حکم سے عام لوگوں تک اُسی کا پیغام پہنچاتا ہے، لیکن قرآن کے الفاظ فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ دیکھو یعنی فرشتہ وحی کرتا ہے۔ یا پہنچاتا ہے۔ اسی کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے، ان کی اس تاویل کا غلط ہونا بالکل عیاں کر دیتے ہیں۔ عام انسانوں کے سامنے انبیاء کی تبلیغ کو وحی کرنے سے نہ قرآن میں کہیں تعبیر کیا گیا ہے اور نہ عربی زبان میں انسان کی انسان سے علانیہ گفتگو کو "وحی" کے لفظ سے تعبیر کرنے کی کوئی گنجائش ہے لغت میں وحی کے معنی ہی خفیہ اور سریرے اشارے کے ہیں۔ انبیاء کی تبلیغ پر اس لفظ کا اطلاق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو عربی زبان سے بالکل نا بلند ہرگز نہ

### اقسام وحی کی مزید توضیح

ایک قسم کی وحی وہ ہے جسے وحی جبلی یا طبیعی کہا جاسکتا ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ہر مخلوق کو اس کے کرنے کا کام سکھاتا ہے۔ یہ وحی انسانوں سے بڑھ کر جانوروں پر اور شاید ان سے بڑھ کر نباتات و جمادات پر ہوتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جسے وحی جزئی کہا جاسکتا ہے جس کے ذریعے کسی خاص موقع پر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو امور زندگی میں سے کسی امر کے متعلق کوئی علم یا کوئی ہدایت دیتا ہے یا کوئی تدبیر بھیجتا ہے

ہے۔ یہ وحی آئے دن عام انسانوں پر ہوتی رہتی ہے۔ دنیا میں بڑی بڑی ایجادیں اسی وحی کی بدولت ہوئی ہیں۔ بڑے بڑے علمی اکتشافات اسی وحی کے ذریعے سے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے اہم تاریخی واقعات میں اسی وحی کی کار فرمائی نظر آتی ہے جب کہ کسی اہم موقع پر کوئی خاص تدبیر بلا غور و فکر اچانک سوجھ گئی اور اس کے تاریخ کی رفتار پر ایک فیصلہ کن اثر ڈال دیا۔ ایسی ہی وحی حضرت موسیٰ کی والدہ پر بھی ہوئی تھی۔ ان دونوں قسم کی وحیوں سے بالکل مختلف وحی وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے بند سے کوئی نئی غیبیہ پر مطلع فرماتا ہے، اور اسے نظام زندگی کے متعلق ہدایت بخشنا ہے تاکہ وہ اس علم اور اس ہدایت کو عام انسانوں تک پہنچائے اور انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتے۔ یہ وحی انبیاء کے لیے خاص ہے۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس نوعیت کا علم، نوراہ اس کا نام اتقاد رکھیے، الہام رکھیے، کشف رکھیے یا اصطلاحاً اسے وحی سے تعبیر کیجیے، انبیاء و رسل کے سوا کسی کو نہیں دیا جاتا۔ اور یہ علم صرف انبیاء ہی کو اس طور پر دیا جاتا ہے کہ انہیں اس کے من جانب اللہ ہونے اور شیطان کی دراندازی سے بالکل محفوظ ہونے اور خود اپنے ذاتی خیالات، تشریحات اور خواہشات کی آلائشوں سے بھی پاک ہونے کا پورا یقین ہوتا ہے۔ نیز یہی علم حجت شمری ہے۔ اس کی پابندی ہر انسان پر فرض ہے اور اس کے دوسرے انسانوں تک پہنچانے اور اس پر ایمان کی دعوت سب کا خدا کو دینے پر انبیاء و علیہم السلام مامور ہوتے ہیں۔ اور پھر یہی وہ وحی ہے کہ جس پر ایمان لانا لازماً نجات اور جس سے روگردانی کرنا قطعی طور پر موجب خسراں ہوتا ہے۔

انبیاء کے سوا دوسرے انسانوں کو اگر اس تیسری قسم کے علم کا کوئی جزو نصیب بھی ہوتا ہے تو وہ ایسے دھندلے اشارے کی حد تک ہوتا ہے جسے ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے وحی نبوت کی روشنی سے مدد لینا یعنی کتاب و سنت پر مشتمل رہنمائی کر کے اس کی صحت اور عدم صحت کو جانچنا اور بصورتِ صحت اس کا نشا متعین کرنا ضروری ہے۔ جو شخص اپنے الہام کو ایک مستقل بالذات ذریعہ ہدایت سمجھے اور وحی نبوت کی کسوٹی پر اس کو پرکھے بغیر اس پر خود عمل کرے اور دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے۔ اس کے ایسے طرز عمل کو از روئے شریعت کوئی سند جواز نہیں دی جاسکتی۔ قرآن میں اس حقیقت کو متعدد مقامات پر صاف صاف بیان کیا گیا ہے۔

غرضاً سورہ جن کی آخری آیات میں تو اسے بالکل ہی کھول کر فرمایا گیا ہے کہ:

فَلِمَ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ	وہ عالم الغیب ہے، اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں
أَعْدَا إِلَّا مَن ارْتَضَىٰ مِن تَرْتُوتِ	کرنا، سوائے اُس رسول کے جسے اُس نے غیب کا
فَاتَّهَ يُسَلِّتُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَ مِن	کوئی علم دینے کے لیے پسند کر لیا ہو تو اس کے
خَلْفِهِ رَهَدًا لِيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا	اُسے اور سمجھے وہ محاذ لگا دیتا ہے تاکہ وہ جانے



بِرِسَالَتِ رَبِّهِمْ وَأَحَادِلِ إِنْسَانِكُمْ  
وَأَحْطَىٰ كُلِّ شَيْءٍ عِندَهُ -

(سورہ جن ۲۸: ۲۸) ہے اور ایک ایک چیز کو اس نے گن رکھا ہے۔

اگر ہم غور کریں تو یہ بات باسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ امت کے صالح و فاسق آدمیوں کو نبی کا سا کشف و الہام نہ دینے اور اس سے کم تر ایک طرح کا تابعداء کشف و الہام دینے میں کیا مصلحت ہے پہلی چیز عطا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی چیز نبی اور امتی کے درمیان بنائے فرق ہے، اسے دور کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اور دوسری چیز دینے کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ نبی کے بعد اس کے کام کو جاری رکھنے کی کوشش کریں وہ اس بات کے محتاج ہوتے ہیں کہ وہیں میں ان کو نکھانہ بصیرت اور اقامت وین کی سعی میں ان کو صحیح رہنمائی اللہ کی طرف سے حاصل ہو۔ وہ چیز غیر شعوری طور پر تو ہر شخص اور صحیح فکر خاوم دین کو غمٹی جاتی ہے لیکن اگر کسی کو شعوری طور پر یہی ملے دی جاسے تو یہ اللہ کا انعام ہے۔

### وحی بصورت خواب

كَلَّمَآ بَلَّغْ مَعَهُ اسْتَعَىٰ قَالَ نَبِيَّيْ  
إِنِّي آوَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَدْبَحَكَ فَأَنْظُرْ  
مَاذَا تَدْرِي ط قَالَ يَا بَيْتِ أَفْعَلُ مَا  
مَكُونُ - (المصافات : ۱۰۲)

کہا، اب جان جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کہنا ہے۔

یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ پیغمبر آپ کے خواب کو بیٹے نے محض خواب نہیں بلکہ خدا کا حکم سمجھا تھا۔ اگر یہ فی الواقع حکم نہ ہوتا تو نہ وری تھا کہ اللہ تعالیٰ صراحتاً یا اشارتاً اس امر کی تصریح فرمادیتا کہ فرزند ابراہیم نے غلط فہمی سے اس کو حکم سمجھ لیا۔ لیکن پورا سابق و سابق ایسے کسی اشارے سے خالی ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ انبیا کا خواب محض خواب نہیں ہوتا بلکہ وہ بھی وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ غلط ہے کہ جس بات سے ایک انبیا قاعدہ خدا کی شریعت میں شامل ہو سکتا ہو، وہ اگر مبنی بر حقیقت نہ ہوتی بلکہ محض ایک غلط فہمی ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی تردید نہ فرماتا۔ قرآن کو کلام الہی ماننے والے کو یہ تسلیم کرنا محال ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی خبریں چوک بھی صادر ہو سکتی ہیں۔

### شہد کی مکھی پر وحی

وَأَوْحَىٰ رَبُّكَ إِلَى النَّحْلِ أَنِ اتَّخِذِي

وَمَا الْغَيْبِيَّ يُبَيِّنُكَ وَالْفَلَّاحُ ۝ ۶۸ ۝ دینی گری کہ پتا معلوم نہیں اپنے گھرنے۔

گنتی کے سورہ سے وحی کے معنی ہیں تخییر اور لطیفہ اشارہ کے ہرے اشارہ کرنے والے اور اشارہ پانے والے کے سوا کوئی اور محسوس نہ کرے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ القاء (دل میں بات ڈال دینے) اور ابہام (مخفی تعلیم دینے) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو جو تعلیم دیتا ہے وہ چونکہ کسی محتجب و درنگاویں نہیں دی جاتی بلکہ ایسے لطیفہ طریقوں سے دی جاتی ہے کہ بظاہر کوئی تعلیم دیتا اور کوئی تعلیم پانا نظر نہیں آتا، اس لیے اس کو قرآن میں وحی، ابہام اور القاء کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اب یہ تینوں الفاظ الگ الگ اصطلاحوں کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔ لفظ وحی انبیاء کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ ابہام کو اولیاء اور زندگان خاص کے لیے خاص کر دیا گیا ہے۔ اور القاء نسبتہ عام ہے لکن

### اُمّ مومنیٰ پر وحی

إِذْ آوَجِبْنَا إِلَى الْمَرْكَبِ الْكَلْبِيِّ

نمبر: ۱۶۸

یاد کرو وہ وقت جبکہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا ایسا اشارہ جو وحی کے ذریعہ سے ہی کیا جاتا ہے۔

”ہم نے موسیٰ کی ماں کو اشارہ کیا کہ ان کو دو وہ پلا بچر حبیب تجھے اُس کی جان کا خطرہ ہو تو گے دریا میں ڈال دے، اور کچھ عورت اور تم نہ کر۔“

وَآوَجِبْنَا إِلَى الْمَرْكَبِ الْكَلْبِيِّ  
إِذْ آوَجِبْنَا إِلَى الْمَرْكَبِ الْكَلْبِيِّ  
فِي الْكَلْبِيِّ (الشمس: ۷)

یہی حضرت مومنیٰ کی والدہ نے یہ کام اللہ تعالیٰ کے اشارے پر کیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی ان کو یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ اس طریقے پر عمل کرنے میں نہ صرف یہ کہ تمہارے بچے کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے، بلکہ ہم بچے کو تمہارے پاس ہی پالا میں گے اور یہ کہ تمہارا یہ بچہ اُسے چل کر مہارار رسول ہوئے والا ہے لکن شیاطین کا اپنے ساتھیوں کو وحی کرنا قرآن میں بتایا گیا ہے کہ:

وَأَنَّ الشَّيَاطِينَ كَيْفَ يُكَذِّبُونَكَ  
أَوَلَيْدَلِيهِمْ رِيحٌ يَنْفُخُونَ فِيهَا  
مُحْضَرٌ پروجی انا لولکھا واقعہ نہیں  
أَنَا أَوْجِبْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْجِبْنَا  
إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَ

”شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک و اعتراضات ایجاد کرتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑا لیا۔“  
”اے محمد! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی

أَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَطَرَفٌ بَعْضُهُمْ تَحَىٰ لَوْرُحْمِ نَعْمَ اِبْرَاهِيمَ، اِسْمَاعِيلَ، اِسْمَاعِيلَ  
 اِسْمَاعِيلَ وَكَعْقُوبَ وَالْاَسْبَابِ وَالنَّسَبِ) يعقوب اور اسرار لا يعقوب پر بھی وحی کی۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز کے گھنٹے نہیں آتے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔  
 ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں بلکہ دراصل ان کو بھی اسی ایک منبع  
 علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام کھیلے انبیاء کو ہدایت ملتی رہی ہے۔ اور وہ بھی اسی ایک صداقت و حقیقت  
 کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں لہذا  
 حضور پر قرآن کا وحی کیا جانا

وَ اَوْحَىٰ اِلَىٰ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِاَنْذِرْكُمْ

بِهِ وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْاٰنْعَامِ - (۱۹)

وَ اِذَا تَنَزَّلَتْ عَلَيْنَا نَزْلًا

قَالَ الْكٰفِرِيْنَ لَا يَزُجُوْنَ بِعَاوُنَا اَنْتَ

بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَا اَوْ يَدْبُلُوْهُ قَوْلٌ

مَّا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اَبْدِلَهٗ سِوَا تِلْكَ اَنْتَ

نَفْسِيْۗ اِنْ اَتَيْتُمْ اِلَّا مَا يُوْحَىٰ اِلَىٰ-

(یونس: ۱۵)

اور یہ قرآن میری طرف بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ  
 تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کر دوں  
 ”جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی  
 جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے غصے کی توقع نہیں  
 رکھتے کہتے ہیں کہ اس کے بجائے کوئی اور قرآن  
 لادیا اس میں کچھ ترمیم کرو۔ اسے محمد، ان سے  
 کہو میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں  
 کوئی تغیر و تبدل کر لوں جس کو میں اس وحی کا

بذریعہ وحی جو میرے پاس آئی ہے۔“

اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہنے کا حکم دیا گیا کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں بلکہ  
 یہ وحی کے ذریعہ سے میرے پاس آئی ہے جس میں کسی زور و بدل کا کلمہ اعلیٰ نہیں۔ اور یہ بھی کہ اس معاملہ میں  
 مصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ قبول کرنا ہو تو اس پورے دین کو جو ان کا توں قبول کر رہے پورے  
 کر ذکر دو۔

تو اسے پیغمبر کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ان چیزوں

میں سے کسی چیز کو چھوڑ دو جو تمہاری طرف

وحی کی جارہی ہیں اور اس سے دل تنگ ہو۔“

فَلَعَلَّكَ نَارِكُ بَغْضٍ مَّا يُوْحَىٰ

اِلَيْكَ وُضِّئَتْ اِيْمٌ صَدْرِكُ -

(ہود: ۱۲)

یعنی ہماری نگاہ میں قیمتی انسان وہ ہے جو نیک ہو اور نیکی کے راستے پر صبر و ثبات اور پامردی کے  
 ساتھ چلنے والا ہو۔ لہذا جس تعصب سے، جس بے رخی سے، جس تضییح و دستبرد سے اور جس جاہلانہ اظہارِ  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سے تمہارا مقابلہ کیا جا رہا ہے ان کی وجہ سے تمہارے پاس تمہاری ثبات میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ جو صدراقت تم پر بذریعہ وحی مشکفت کی گئی ہے اس کے اظہار و اعلان میں اور اس کی طرف دعوت دینے میں تمہیں قطعاً کوئی باک نہ ہو۔ تمہارے دل میں اس خیال کا کبھی گزرتیک نہ ہو کہ فلاں بات کیسے کہوں جبکہ لوگ سنتے ہی اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں اور فلاں حقیقت کا اظہار کیسے کروں جبکہ کوئی اس کے سنتے تک کا روادار نہیں ہے۔ کوئی ملنے یا نہ ملنے تمہیں حق پتے ہوا سے بے کم و کاست اور بے خوف بیان کیسے جاؤ گے سب معاملات اللہ کے حوالہ ہیں۔

”اے محمد! یہ غیب کی خبریں ہیں جو تم تمہاری طرف وحی کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے تم ان کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم“

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهَا اِلَيْكَ ۗ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا - (مجاد: ۲۶)

”الز۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا تدعا صحت صحت بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم راہل عرب، اس کو اچھی طرح سمجھ سکو۔ اے محمد! ہم اس قرآن کو تمہاری طرف وحی کر کے بہترین پیرایہ میں واقعتاً اور عقلاً تم سے بیان کرتے ہیں“

اَلرَّحْمٰنُ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ الْمُبِيْنُ ۗ اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۗ كَحَنْ نَّقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصِيصِ ۗ يٰمٰٓا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ - (الرحمن: ۱)

”اے محمد! یہ قصہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تم پر وحی کر رہے ہیں اور تم اس وقت موجود نہ تھے جب یوسف کے بھائیوں نے آپس میں اتفاق کر کے سازش کی تھی“

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهَا اِلَيْكَ ۗ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذَا جَمَعُوْا اَمْرُهُمْ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ - (يوسف: ۱۰۲)

”اے محمد! اسی شان سے ہم نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے ایک ایسی قوم میں جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکی ہیں تاکہ تم ان لوگوں کو وہ پیغام سناؤ جو ہم نے تم پر بذریعہ وحی نازل کیا ہے اسی

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنَا فِيْ اُمَّتِكَ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا اُمَمٌ لَّمَّا لَمَلُوْا عَلَيْنَا الَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ ۗ وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ - (الرعد: ۳۰)

حال میں کہ یہ اپنے نہایت بہرہ بان خدا کے کافر بنے ہوتے ہیں  
مضمون پر وحی آنے کے مختلف طریقے  
قرآن میں بتایا گیا ہے کہ :

وَمَا كَانَ لِيُبَشِّرَ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ  
 إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ تَحْتِ سَجَابِ أَوْ  
 يُذِيلُ رَسُولًا فَيُصِغِي بِأَذْنِهِ مَا يَشَاءُ  
 إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ  
 (الشورى - ۵۱)

کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو بہ  
 بات کرے۔ اس کی بات یا روحی (اشادہ) کے  
 طور پر ہوتی ہے یا پریشانی سے بچنے کے  
 کوئی پیغام بردار فرشتہ بھیجتا ہے۔ وہ اس کے حکم  
 سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ وہ برتر اور حکیم ہے۔

یہ بات قرآن اور حدیث و روایں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان غیبی طریقوں سے ہدایات دی

گئی ہیں

۱۔ حدیث میں حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتدا ہی پہلے خوابوں سے ہوتی  
 تھی (بخاری و مسلم)۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا ہے، پھر انچھ احادیث میں آپ کے جہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے  
 جن میں آپ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے، یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی آپ کے ایک خواب کو قرآن  
 کے ساتھ ذکر آیا ہے (الفتح - ۲۶)۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضور نے فرمایا: خداں بات  
 میرے دل میں ڈالی گئی ہے یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ ان  
 تمام چیزیں وحی کی پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور سادہ شیبہ قدس سرہ بھی زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

۲۔ معراج کے موقع پر حضور کو وحی کی دوسری قسم سے بھی مشرت فرمایا گیا۔ متعدد صحیح احادیث میں حضور کو  
 پنج دفعہ نماز کا حکم دیا گیا، اور حضور کے اس پر بار بار عرض ہوئی کہ اسے کھڑے ہو کر بنی طور پر آیا ہے اس سے صاف معلوم  
 ہوتا ہے کہ اس وقت اللہ اور اس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ایسا ہی مکالمہ ہوا تھا جیسا کہ ان لوگوں  
 میں حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوا۔

۳۔ ربی تیسری قسم، قرآن کے متعلق قرآن خود ہی شہادت دیتا ہے کہ اُسے جو پہلی آیتیں تھیں وہی سے رسول  
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا گیا، جیسا کہ البقرہ ۹۷، اور الشعراء ۱۹۲ تا ۱۹۵ میں ارشاد ہوا ہے:

فرید توضح

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی مختلف طریقوں سے آئی تھی۔ اس کی تفصیل علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں  
 اس طرح کی ہے:

۱۔ سچا خواب، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدائی صورت تھی۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے تھے وہ اس  
 طرح صاف صاف آتا تھا جیسے پدیدہ صبح۔

۲۔ فرشتہ آپ کے ذہن و قلب میں آتا اور بات داتا تھا، پھر اس کے کہ وہ آپ کو نظر آتے، اس کی مثال  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

وہ حدیث ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ رُوح القدس (جبریل) نے میرے ذہن میں یہ بات ڈالی ہے، ریاچگی ہے، کہ کوئی متنفس ہرگز نہ مرے گا جب تک کہ اپنے جتنے کا پورا رزق نہ پالے، لہذا اللہ سے ڈر کر کام کرو اور طلبِ رزق کا اچھا طریقہ اختیار کرو اور رزق میں تاخیر تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اسے اللہ کی نافرمانی کے ساتھ طلب کرنے لگو، کیونکہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے (یعنی اس کا انعام) وہ صرف اس کی اطاعت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔

۳- فرشتہ آپ کے سامنے بصورتِ انسان نمودار ہو کر یا نہ کرنا تھا اور اُس وقت تک مخاطب رہتا تھا جب تک کہ آپ اس کی بات پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیں، اس صورت میں کبھی کبھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ صحابہ نے بھی اُس کو دیکھا ہے۔

۴- وہی سے پہلے آپ کے کان میں ایک گھنٹی سی یعنی شروع ہوئی تھی اور اس کے ساتھ پھر فرشتہ بات کرنا تھا، یہ وہی کی شدید ترین شکل تھی جس سے سخت عبادت سے بھی آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے تھے، اگر آپ اونٹ پر سوار ہوتے تھے تو وہ بوجھ کے مارے بیٹھ جاتا تھا۔ ایک دفعہ اس حال میں وہی آئی کہ آپ زید بن ثابت کے زانو پر گر گئے بیٹھے تھے۔ اس وقت ان پر اتنا بوجھ پڑا کہ ان کی مان گرنے لگی تھی۔

۵- آپ فرشتے کو اس کی اصلی صورت میں دیکھتے تھے جس میں اللہ نے اسے پیدا کیا ہے، پھر جو کچھ اللہ کا حکم ہوتا ہے اسے وہ آپ پر وحی کرتا تھا۔ یہ شکل وہ مرتبہ پیش آئی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نجم میں بیان کیا ہے۔

۶- براہِ راست اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی کی جبکہ آپ معراج میں آسمانوں پر تھے اور وہاں نماز فرض کی اور دوسری باتیں ارشاد فرمائیں

۷- اللہ تعالیٰ نے فرشتے کے توسط کے بغیر آپ سے گفتگو کی جس طرح موسیٰ علیہ السلام سے کی تھی۔ حضرت موسیٰ کے لیے تو یہ مرتبہ قرآن سے ثابت ہے۔ رہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، تو آپ کے حق میں اس کا ذکر معراج کی حدیث میں آیا ہے۔

ان کے علاوہ بعض لوگوں نے ایک آشوبی شکل بھی بیان کی ہے اور وہ یہ کہ اللہ نے بے پردہ ہو کر آپ سے گفتگو کی۔ یہ ان لوگوں کا مذہب ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو دیکھا مگر اس مشے میں سلف اور خلف کے درمیان اختلاف ہے ۱۱

(زاد المعاد - ج اول ص ۲۳-۲۵)

سیوطی نے اتقان جلد اول میں ایک پوری فصل اسی مضمون پر لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے :

”چالیس سال کی عمر میں جب آپ نبی ہوئے تو ابتدائی تین سال تک اسراہیل آپ کی تعلیم و تربیت پر مامور رہے اور ان کے ذریعہ سے قرآن کا کوئی حصہ نازل نہیں ہوا۔ پھر جبریل وحی لانے پر مقرر ہوئے اور وہ ۲۰ سال تک قرآن لاتے رہے۔ وحی کی صورتیں حسب ذیل تھیں :-

۱۔ کان میں گھنٹی جیٹی شروع ہوتی اور پھر فرشتے کی آواز آتی۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ پہلے آپ سب طرف سے توجہ دیا کر اس آواز کو سننے کے لیے ہمت منو جو ہو جائیں۔ حضور کا بیان ہے کہ یہ شکل آپ کے لیے سب سے زیادہ شدید تھی۔

۲۔ آپ کے ذہن و قلب میں ایک بات ڈالی جاتی تھی، جیسا کہ آپ نے خود بیان فرمایا ہے۔

۳۔ فرشتہ آپ سے انسانی شکل میں آگیا کرتا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وحی کی یہ

صورت میرے لیے سب سے زیادہ ہلکی ہوتی تھی۔

۴۔ فرشتہ خراب میں آکر آپ سے بات کرتا۔

۵۔ اللہ تعالیٰ آپ سے براہ راست کلام کرتا، خواہ بیداری میں یا خواب میں<sup>۸</sup>۔

(الانعام۔ جلد اول، ص ۴۴، ۴۵)

## قرآن کا پہنچ کر وہ وحی الہی ہے

نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم و تربیت اور صحبت نہیں پائی تھی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چہرے یکا یک دعوتِ نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے چھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی آپ ان مسائل سے دلچسپی لیتے نہ تھے، ان مباحث پر گفتگو کرتے نہ تھے، اور ان خیالات کا اظہار کرتے نہ تھے۔ نہیں دیکھے گئے جو اب قرآن کی پنے درپے سورتوں میں زیر بحث آرہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جاسکتا ہو جو آپ نے اچانک چالیسویں سال پہنچ کر دینی سفر شروع کر دی۔ یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپ کے اندر آتی ہوئی چیز ہے۔ ﷺ

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْعَرَبِ إِذْ  
قَعَبْنَا إِلَى مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ  
مِنَ الشَّاهِدِينَ وَ لَقَدْ أَنشَأْنَا قُرُونًا  
أَعْمَرَ مُحَمَّدًا تَمَّ اس دَفْتِ مَغْرِبِي كَوْشِي فِي مَوْجُودِي تَحِي  
جِبِ بَمِ نِي مُوسَى كَوْرِي قَوْمَانِ شَرِيعَتِ عَطَا كِيَا، اُو  
تَمَّ شَاهِدِينَ فِي شَامِلِي تَحِي، بَلَكَّ اس كِيَا قَوْمَانِ

تَقَاوَلَعِ عَلَيَّ الْعُرُومُ وَمَا كُنْتُ نَادِيًا  
 فِي أَهْلِ مَدِينَةٍ تَشَلُّوا عَلَيْكُمْ إِنِّي نَا  
 وَكَلْنَا كُنَّا مُرْسِدِينَ وَمَا كُنْتُ بِجَانِبِ  
 الطُّورِ إِذْ نَادَيْتُنَا وَكَذَلِكَ رَحِمْنَا مَن  
 رَبَّنَا لِيُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتُفَحِرُونَ  
 لِيُنذِرَ مَن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ  
 (القصاص ۲۳-۲۶)

زمانے تک، ہم بہت سی نسلیں اٹھا چکے ہیں اور  
 ان پر بہت زمانہ گزر چکا ہے تم اہل مدین کے نزدیک  
 بھی موجود نہ تھے کہ ان کو ہماری آیات سنا رہے  
 ہوتے، مگر اس وقت کی یہ خبریں بھیجے جائے  
 ہیں۔ اور تم طور کے دامن میں بھی اس وقت موجود  
 نہ تھے جب ہم نے (کوئی کو پہلی مرتبہ پکارا تھا مگر  
 تمہارے اب کی رحمت ہے کہ تم کو یہ معلومات  
 دی جا رہی ہیں، تاکہ تم ان لوگوں کو متذکرہ کرو جن کے پاس تم سے پہلے کوئی مشتبہ کرنے والا نہیں آیا تھا۔  
 وہ ہوش میں آئیں۔

یہ تین باتیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جس وقت یہ باتیں کہی گئی تھیں اس  
 وقت مکہ کے تمام سردار اور عام کفار اس بات پر پوری طرح متفق ہوئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح آپ کو غیر نبی اور  
 معاند اللہ جھوٹا مدعی ثابت کر دیں۔ ان کی مدد کے لیے یہودیوں کے علماء اور عیسائیوں کے راہب بھی حجاز کی کشتیوں  
 میں موجود تھے۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہیں عالم بالا ہے، اگر یہ قرآن نہیں سنا جاتے تھے، بلکہ اس وقت کے رہنے  
 والے تھے اور آپ کی زندگی کا کوئی گوشہ آپ کی نبی اور آپ کے قبیلے کے لوگوں سے چھپا ہوا نہ تھا۔ یہی وجہ ہے  
 کہ جس وقت اس کلمے پہلے کے انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کے طور پر یہ تین باتیں ارشاد  
 فرمائی گئیں، اس وقت مکہ اور حجاز، اور پورے عرب میں کوئی ایک شخص بھی اٹھ کر وہ یہودہ بات نہ کہہ سکا جو  
 آج کے مشرکین کہتے ہیں۔ اگرچہ جھوٹے گھڑنے میں وہ لوگ ان سے کچھ کہہ سکتے تھے، لیکن ایسا درویشی فریاد آخر  
 وہ کیسے بول سکتے تھے جو ایک لوہے کے لیے بھی نہ چل سکتا ہو۔ وہ کیسے کہتے کہ اسے محمد، تم فلاں فلاں یہودی عالموں  
 اور عیسائی راہبوں سے یہ معلومات حاصل کر لیتے ہو، کیونکہ پورے ملک میں وہ اس غرض کے لیے کسی کا نام  
 نہیں لے سکتے تھے جس کا نام بھی وہ لیتے، فوراً ہی یہ ثابت ہو جاتا کہ اس سے آنحضرت نے کوئی معلومات حاصل  
 نہیں کی ہیں۔ وہ کیسے کہتے کہ اسے محمد تمہارے پانچ پھلنی تاریخ اور علوم و ادب کی ایک لائبریری موجود ہے جس  
 کی مدد سے تم یہ ساری تقریریں کر رہے ہو، کیونکہ لائبریری تو درکنار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کہاں سے وہ ایک  
 کاغذ کا پرزہ بھی برآمد نہیں کر سکتے تھے جس میں یہ معلومات لکھی ہوئی ہوں۔ منجھ کا بچہ بچہ جانتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم  
 لکھے پڑھے آدمی نہیں ہیں، اور کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ نے کچھ مشرکین کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں جو  
 عبرانی اور سریانی اور یونانی کتابوں کے ترجمے کر کے آپ کو دیتے ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی بڑے سے بڑا بے حیا آدمی



مجھے یہ دیکھ کر کہنے کی جرأت نہ رکھتا تھا کہ تمام فلسطین کے تجارتی سفروں میں آپ یہ معلومات حاصل کر آتے تھے کیونکہ یہ سفر نہ بنائے ہوئے تھے، بلکہ ہی کے تجارتی تلفے ہر سفر میں آپ کے ساتھ لگے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس وقت ایسا دعویٰ کرتا تو سینکڑوں زندہ شاہد یہ شہادت دے دیتے کہ وہاں آپ نے کسی سٹھ کوئی درس نہیں دیا۔ اور آپ کی وفات کے بعد تو دو سال کے اندر ہی روسیوں سے مسلمان برسرِ پیکر ہو گئے تھے۔ اگر کہیں جھوٹا ہی تمام فلسطین میں کسی عیسائی راہب یا یہودی رتی سے حضور نے کوئی مذاکرہ کیا ہوتا تو روسی سلطنت رانی کا پہاڑ بنا کر پڑھ کر پڑھ کر نے میں ذرا دریغ نہ کرتی کہ خدا، معاذ اللہ سب کچھ یہاں سے سیکھ گئے تھے اور مجھے جا کر نبی بن بیٹھے۔ غرض اس زمانے میں جبکہ قرآن کا یہ پہلی قریش کے کفار و مشرکین کے اپنے پیغام موت کی حیثیت رکھتا تھا، اور اس کو ٹھیلانے کی ضرورت موجود زمانے کے منتشر عقین کی نسبت اُن لوگوں کو بیدار بنانا زیادہ اہم تھی، کوئی شخص بھی کہیں سے ایسا کوئی مواد فراہم کر کے نہ لاسکا جس سے وہ یہ ثابت کر سکتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی کے سوا ان معلومات کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود ہے جس کی نشان دہی کی جاسکتی ہو۔

یہ بات بھی جانینی چاہیے کہ قرآن نے یہ پہلی اسی ایک جگہ نہیں دیا ہے بلکہ متعدد مقامات پر مختلف فقوں کے سلسلے میں دیا ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت مریم کا قصہ بیان کر کے فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اٰنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ  
اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ  
اٰتْلٰهُمْ اٰيٰهُمْ يَكْفُلُ مَرْجُوْمًا  
كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ -

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے ذریعے  
سے تمہیں دے رہے ہیں، تم اُن لوگوں کے آس  
پاس کہیں موجود نہ تھے جبکہ وہ اپنے فرسے پر سٹے  
کرنے کے لیے پھینک رہے تھے کہ مریم کی کفالت  
کون کرے۔ اور تم اس وقت موجود تھے جبکہ وہ  
جھگڑ رہے تھے۔

رآل عمران: ۴۴

حضرت یوسفؑ کا قصہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

ذٰلِكَ مِنْ اٰنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ  
اِلَيْكَ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اٰجْمَعُوْا  
اٰمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ -

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم وحی کے  
ذریعے سے تمہیں دے رہے ہیں، تم ان کے دینی یوسفؑ  
کے بھائیوں کے، آس پاس کہیں موجود نہ تھے جبکہ  
انہوں نے اپنی تدبیر پر اتفاق کیا اور جب کہ وہ  
اپنی چال چل رہے تھے۔

یوسف: ۱۰۲

اسی طرح حضرت نوحؑ کا مفصل قصہ بیان کر کے فرمایا:

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ لَا يُخْبِتُهَا  
 أَنْبَاءُ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنتَ لَا  
 تَعْلَمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا - ۱۳۹

یہ باتیں غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم پر  
 وحی کر رہے ہیں انہیں اور تمہاری قوم کو اس سے  
 پہلے ان کا کوئی علم نہ تھا۔

اس چیز کی بار بار تکرار سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن مجید اپنے منجانب اللہ ہونے اور محمد  
 صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے پر جو بڑے بڑے دلائل دیتا تھا ان میں سے ایک یہ دلیل تھی کہ سینکڑوں  
 ہزاروں برس پہلے کے گزرے ہوئے واقعات کی جو تفصیلات ایک آدمی کی زبان سے بیان ہو رہی ہیں ان کے  
 علم کا کوئی ذریعہ اس کے پاس وحی کے سوا نہیں ہے۔ اور یہ چیز ان اہم اسباب میں سے ایک تھی جن کی بنا پر نبی  
 صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر لوگ اس بات پر یقین لانے پہلے جا رہے تھے کہ واقعی آپ اللہ کے نبی ہیں اور آپ  
 پر وحی آتی ہے۔ اب یہ ہر شخص خود تصور کر سکتا ہے کہ اسلامی تحریک کے مخالفین کے لیے اس زمانے میں ان چیزیں  
 کی تردید کرنا کیسی کچھ اہمیت رکھتا ہوگا، اور انہوں نے اس کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کی کوششوں میں  
 کیا کسراٹھا رکھی ہوگی۔ نیز یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر معاذ اللہ اس پہنچ میں نہ ماسی بھی کوئی کمزوری ہوتی  
 تو اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے شہادتیں فراہم کرنا ہم عصر لوگوں کے لیے مشکل نہ تھا۔

وحی کی تشبیہ بارش سے

قرآن میں دو مقامات پر اشارۃ نبی اکرم پر نازل ہونے والی وحی کو بارانِ رحمت سے تشبیہ دی گئی ہے :

أَنْزَلْنَا مِنْ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ  
 أَرْدَابًا لَبِقَدَرِهَا - (الرعد - ۱۷)

اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور ہر ندی نال اپنے  
 ظرف کے مطابق اسے کھلنے لگا۔

اس تشبیہ میں اس علم کو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے سے نازل کیا گیا تھا آسمانی بارش سے تشبیہ دی  
 گئی ہے اور ایمان لانے والے سلیم الفطرت لوگوں کو ان ندی نالوں کے مانند ٹھہرایا گیا ہے جو اپنے اپنے ظرف  
 کے مطابق بارانِ رحمت سے بھر پور ہو کر نہروں و نالوں کو جاتے ہیں، اور اسی ہنگامہ و شور و شکر کو جو تحریکِ اسلامی  
 کے خلاف منکرین و مخالفین نے برپا کر رکھی تھی۔ اس جھگ اور خس و خاشاک سے تشبیہ دی گئی ہے جو ہمیشہ  
 سیلاب کے اٹھتے ہی سطح پر اپنی اچھل کود دکھانی شروع کر دیتا ہے۔

اللَّهُ تَرَاتِ اللَّهُ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ  
 مَاءً فَصَبَّحَهُ الْأَرْضُ مَخْضَرَةً (الرعد - ۶۳)

تو تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمان سے پانی بنا  
 ہے اور اس کی بدولت زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔

یہاں پھر ظاہر مفہوم کے پیچھے ایک اشارہ چھپا ہوا ہے۔ ظاہر مفہوم تو محض اللہ کی قدرت کا بیان ہے  
 مگر لطیف اشارہ اس میں یہ ہے کہ جس طرح خدا کی برساتی ہوئی بارش کا ایک چھینٹا پڑتے ہی تم دیکھتے ہو کہ شوکھی

بڑی ہونی زمین نیویک لہذا بالظنی ہے۔ اسی طرح یہ وحی کا باران رحمت جو آج ہو رہا ہے منقریب تم کو یہ منظر دکھانے والا ہے کہ یہی عرب کا نبی رحمتان علم اور اخلاق اور تہذیب صالح کا وہ گلزار بن جاتے گا جو حشریم فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا علیہ

## وحی رسالت خدا کی رحمت ہے

”اے برادران قوم! خدا سوچو تو رہی کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر قائم تھا اور پھر اس نے مجھ کو اپنی خاص رحمت سے بھی نوازا ہوا“

قَالَ يَقَوْمِ آدَانِيْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى  
بَيِّنَاتٍ مِّنْ رَبِّيْ وَ اَتَيْنِي رَحْمَةً  
مِّنْ عِنْدِيْ - (سورہ: ۲۸)

یہ وہی بات ہے جو پچھلے رکوع میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلائی جا چکی ہے کہ پہلے میں خود آفاق و انفس میں خدا کی نشانیوں دیکھ کر توحید کی حقیقت تک پہنچ چکا تھا، پھر خدا نے اپنی رحمت (یعنی وحی) اسے مجھے نوازا، اور ان حقیقتوں کا براہ راست علم مجھے بخش دیا جن پر میرا دل پہنے سے گواہی دے رہا تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تمام پیغمبر نبوت سے قبل اپنے غور و فکر سے ایمان بالغیب حاصل کر چکے ہوتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان کو منسوب نبوت عطا کرتے وقت، ایمان بالمشاہدہ عطا کرتا تھا علیہ

صالح نے کہا ”اے برادران قوم تم نے کچھ اس بات پر بھی غور کیا کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک صاف شہادت رکھتا تھا اور پھر اس نے اپنی رحمت سے بھی نوازا ہوا“

قَالَ يَقَوْمِ آدَانِيْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى  
بَيِّنَاتٍ مِّنْ رَبِّيْ وَ اَتَيْنِي رَحْمَةً  
- (سورہ: ۶۳)

## وحی رسالت کے لیے لفظ رُوح کا استعمال

وہ اس رُوح کو اپنے بس بندے پر پاتا ہے، اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے اور اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو آگاہ کر دو کہ میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے لہذا تم مجھ سے ڈرو۔

يُنزِلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوحِ مِنْ اَمْرِيْ  
عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِيْ اَنْ اُنزِلُوْا  
اِنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلاَّ اَنَا فَاتَّقُوْنِ -  
(النحل: ۲۱)

یعنی رُوح نبوت کو جس سے بھر کر نبی کام اور کلام کرتا ہے۔ یہ وحی اور یہ پیغمبرانہ اسپرٹ چونکہ اخلاقی زندگی میں وہی مقام رکھتی ہے۔ جو طبعی زندگی میں رُوح کا مقام ہے، اس لیے قرآن میں متعدد مقامات پر محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اس کے لیے رُوح کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

وَيَكُونَنَّ مِنَ الرُّوحِ وَثِقِلَ التَّوَجُّعُ  
مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أَذْرَيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ  
رِثًا قَلِيلًا - (نبی اسرائیل، ۸۵)

یہ لوگ تم سے رُوح کے متعلق پوچھنے میں کہو یہ  
رُوح میرے رب کے حکم سے آتی ہے مگر تم لوگوں  
نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہاں رُوح سے مراد جان ہے، یعنی لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رُوح حیات کے متعلق پوچھا تھا کہ اس کی تہنیت کیا ہے۔ اور اس کا جواب یہ دیا گیا کہ وہ اللہ کے حکم سے آتی ہے لیکن میں یہی تسلیم کرنے میں سخت ناتواں ہے۔ اس لیے کہ یہ معنی صرف اس صورت میں لیے جاسکتے ہیں جبکہ سیاق و سباق کو نظر انداز کر دیا جائے اور مسئلہ کلام سے باہل الٹ کر کے اس آیت کو ایک منفرد جملے کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ ورنہ اگر سلسلہ کلام میں رکھ کر دیکھا جائے تو رُوح کو جان کے معنی میں لینے سے عبارت میں سخت بے ربطی محسوس ہوتی ہے اور اس امر کی کوئی مقبول وجہ سمجھیں نہیں آتی کہ جہاں پہلے نین آیتوں میں قرآن کے نسخہ شفا ہونے اور منکرین قرآن کے ظالم اور کفر نعمت ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، اور جہاں بعد کی آیتوں میں پھر قرآن کے کلام الہی ہونے پر استدلال کیا گیا ہے، وہاں آخر کس مناسبت سے یہ مضمون آگیا کہ جانداروں میں جان خدا کے حکم سے آتی ہے ؟

ربط عبارت کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہاں رُوح سے مراد وحی یا وحی لانے والا فرشتہ ہی ہو سکتا ہے جس کے معنی کا سوال دراصل یہ تھا کہ یہ قرآن تم کہاں سے لائے ہو؟ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آئے محمد، تم سے یہ لوگ رُوح، یعنی ماخذ قرآن، یا ذریعہ حصول قرآن کے بارے میں دریافت کرتے ہیں انھیں بتا دو کہ یہ رُوح میرے رب کے حکم سے آتی ہے۔ مگر تم لوگوں نے علم سے اتنا کم بہرہ پایا ہے کہ تم انسانی نعمت کے کلام اور وحی ربانی کے ذریعہ سے نازل ہونے والے کلام کا فرق نہیں سمجھتے اور اس کلام پر یہ شبہ کرتے ہو کہ اسے کوئی انسان گھڑ رہا ہے۔

یہ تفسیر نہ صرف اس لحاظ سے قابل ترجیح ہے کہ تقریر یا سبق اور تقریر یا بعد کے ساتھ آیت کا ربط اسی تفسیر کا تقاضا ہے، بلکہ خود قرآن مجید میں بھی دوسرے مقامات پر یہ مضمون قریب قریب ان ہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ مومن میں ارشاد ہوا ہے۔

يُلَقِّنِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرٍ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ يُخَلِّدُ وَيُؤَمِّمُ السَّلَافَ

”وہ اپنے حکم سے اپنے جس بندے پر چاہتا ہے رُوح نازل کرتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے اگٹھے ہونے کے دن سے آگاہ کر دے“ اور سورہ شوریٰ میں فرمایا: وَكُنَّا بِكَ أَوْعَيْنًا أَتَبًا وَرُوحًا مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ“ اور اسی طرح ہم نے تیری طرف ایک رُوح اپنے حکم سے بھیجی۔ تو نہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہے“

صلحت ہیں۔ ابن عباسؓ، قتادہ اور جن ابوسری رحمہم اللہ نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ ابن جریر نے اس قول کو قتادہ کے حوالہ سے ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ابن عباسؓ اس بات کو حجاباً بیان کرتے تھے اور سببِ روت المعانیؒ کی اور قتادہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "روت سے غزا و جہاد میں اور مال و اصل یہ تھا کہ وہ جیسے نازل ہوتے ہیں اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر وحی کا اتمام ہوتا ہے۔"   
 وَكَذَلِكَ أَوْخَيْنَا أَكْبَادًا رُوحًا مِّنْ رُّوحِنَا۔ اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک روت تمہاری طرف وحی کی ہے۔ (الشوریٰ - ۵۲)

روح سے مراد وحی، یا وہ تعلیم ہے جو وحی کے ذریعہ سے حضور کو دی گئی تھی۔ وحی کو وہ کلام کے شواہد و دلائل

جو کلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے یہ نہا ہی کلام ہے۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے روتوں میں، چار باتیں شہادت کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ کتاب بڑی خیر و برکت والی ہے، یعنی اس میں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین اصول پیش کیے گئے ہیں۔ عقائد صحیحہ کی تعلیم ہے۔ بھلائیوں کی ترغیب ہے۔ اخلاقی فاضلہ کی تلقین ہے۔ پاکیزہ زندگی گہرا کرنے کی ہدایت ہے۔ اور پھر یہ جہالت، خود غرضی، تنگ نظری، ظلم، فحش اور دوسری آن براہیموں سے، جن کا انہار تم لوگوں کے کتب مقدسہ کے مجموعہ میں پھر دکھایا ہے، بالکل پاک ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے پہلے خدا کی طرف سے جو ہدایت نامے آئے تھے یہ کتاب ان سے الگ ہٹ کر کوئی مختلف ہدایت پیش نہیں کرتی بلکہ اسی چیز کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو ان میں پیش کی گئی تھی۔

تیسرے یہ کہ یہ کتاب اسی مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے جو ہر زمانہ میں اللہ کی طرف سے کتابوں کے نزول کا مقصد رہا ہے، یعنی نفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور کج روی کے انجام بد سے خبردار کرنا۔

چوتھے یہ کہ اس کتاب کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ان لوگوں کو نہیں سمیٹا جو دنیا پرست اور خواہش نفس کے بندے ہیں، بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے گروہ میں لایا جن کی نظر حیات دنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے، اور پھر اس کتاب سے متاثر ہو کر جو انقلاب ان کی زندگی میں رونما ہوا ہے اس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی کے اعتبار سے ممتاز ہیں کیا یہ خصوصیت اور یہ نتائج کسی ایسی کتاب کے ہوتے ہیں جسے کسی جھوٹے انسان کے گھڑ لیا ہو جو اپنی تصنیف کو خدا کی طرف منسوب کر دینے کی آزمائشی تجربانہ جسارت تک کر گزرے؟

باب

بُيُوتِ مُحَمَّدٍؐ كِي ضُرُفِرت

اور

اُس كے دلائل

# پچھلے انبیاء کے بعد آپ کے مبعوث کیے جانے کی وجہ

وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِن بَعْدِهِمْ لَكِنِّي أَشَدُّ مُرَائِبٌ - وَالشُّرْحُ - ۱۴۷

۱۴۷ اور یقیناً یہ ہے کہ انہوں کے بعد جو لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے وہ اس کی طرف سے تیرے اضطراب انگیز شک میں پورے ہوتے ہیں۔

ہر نبی اور اس کے قریبی تابعین کا فہرہ گزر جانے کے بعد جب پچھلی نسلوں تک کتاب اللہ پہنچی تو انہوں نے اسے یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں لیا، بلکہ وہ اس کے متعلق سخت شک اور زہمی الجھنوں میں مبتلا ہو گئیں اس حالت میں ان کے مبتلا ہو جانے کے بہت سے وجوہ تھے جنہیں ہم اس صورت حال کا مطالعہ کر کے باسانی سمجھ سکتے ہیں جو تورات و انجیل کے معاملہ میں پیش آئی ہے۔ ان دونوں کتابوں کو انہوں نے ان کی اصلی حالت پر ان کی اصل عبارت اور زبان میں محفوظ رکھ کر پچھلی نسلوں تک نہیں پہنچایا، ان میں خدا کے کلام کے ساتھ تفسیر و تاریخ اور سماجی دلائل اور فقہاء کے نکالے ہوئے جزئیات کی صورت میں انسانی کام گڈ مڈ کر دیا۔ ان کے ترجموں کو آٹا، پوانج دیا کہ اصل غائب ہو گئی اور صرف ترجمے باقی رہ گئے۔ ان کی تاریخی سند بھی اس طرح ضائع کر دی کہ اب کوئی شخص بھی پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ جو کتاب اُس کے ہاتھ میں ہے وہ وہی ہے جو حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کے ذریعہ سے دیا دلوں کو ملی تھی۔ پھر ان کے اکابر نے وقتاً فوقتاً مذہب، الہیات، فلسفہ، قانون، طبعیات، نفسیات اور اجتماعیات کی ایسی بحثیں چھیڑیں اور ایسے نظامات فکر کی بنا ڈالی جن کی بھول بھلیوں میں پھنس کر لوگوں کے لیے یہ طے کرنا محال ہو گیا کہ ان پیچیدہ راستوں کے درمیان حق کی سیدھی شاہراہ کونسی ہے۔ اور چونکہ کتاب اللہ اپنی اصل حالت اور قابل اعتماد صورت میں موجود نہ تھی اس لیے لوگ کسی ایسی سند کی طرف رجوع ہی نہ کر سکتے تھے جو حق کو باطل سے متمیز کرنے میں ان کی مدد کرتی ہے۔

واضح رہے کہ عرب میں دین حق کی روشنی سب سے پہلے حضرت ہود اور حضرت صالح کے ذریعہ سے پہنچی تھی جو زمانہ قبل تاریخ میں گزرے ہیں پھر حضرت ابراہیم واسمعیل علیہما السلام آئے جن کا زمانہ حضور کے طے نہ ہونے کا

برس قبل گزرا ہے۔ اس کے بعد آناری پیغمبر جو بپ کی سرزمین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کیے گئے وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے<sup>۵۹</sup>

### اہل عرب پہلے سے خود ایک نبی مانگ رہے تھے

وَأَسْمُوا بِاللّٰهِ جَهْدًا أَيْسَارًا  
 يٰ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا جَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ  
 لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ يَتْلُو صُورًا مِّنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَيَخْتَلِفُ فِيهَا الْهَاءُ  
 مِّنْ إِحْدَى الْأَقْسَامِ ۚ فَذَا لَئِيْلٌ لَّكُم مَّا كُنْتُمْ تُوعَدُونَ

یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کے لوگ سنا اور فرشتوں کے لوگ خصوصاً یہودی نصاریٰ کی بُڑھی ہوئی اخلاقی حالت کو دیکھ کر کہا کرتے تھے۔

اسی طرح سورۃ انفاس میں آیا ہے:

أَنْ تَقْرُونَا إِنَّمَا أَنْزَلَ بِكُتُبٍ  
 عَلَى طَائِفَتَيْنِ مِّنْ قَبْلِنَا وَإِنْ كُنَّا  
 عَنْ دِينِهِمْ لَبُغْضِينَ أَوْ لَعَنُونَ  
 لَوْ أَنَّآ أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ كُنَّا  
 أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۚ (انعام: ۱۵۶، ۱۵۷)

اس کتاب کے آسنے کے بعد اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو ہی لگی تھی۔ اور ہم کو کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کیا پڑھتے پڑھاتے تھے۔ اور اب تم یہ جہان بھی نہیں کر سکتے کہ اگر ہم پر کتاب نازل کی گئی ہوتی تو ہم ان سے زیادہ راست روایت ہوتے!

سورۃ شمس میں اس طرح ارشاد ہے:

وَإِنْ كَانُوا كَافِرِينَ لَوْ آتَيْنَاكَ  
 الذِّكْرَ مِنَّا لَمَلَأْنَا كَلِمَتَكَ  
 أَكْثَرَ مِمَّا كَلَّمْنَا بِهَا  
 نَبِيًّا مِّنْ قَبْلِكَ ۚ (الشمس: ۱۹، ۲۰)

یہ لوگ پہلے تو کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے پاس وہ ذکر ہوتا جو پہلی قوموں کو ملا تھا تو ہم اللہ کے پیغمبر بندے ہوتے!

### ایک روشن دلیل کے ظہور کی ضرورت

لَهُ سِيْرٌ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ  
 الْكِتَابِ وَ الْمُشْرِكِينَ مُنْعَكِينَ حَتَّىٰ  
 تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَاتُ مِنْ رَبِّ اللَّهِ  
 فَلَا يَكْفُرُونَ بِنَبِيِّهِمْ  
 حَتَّىٰ يَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَاتُ (البقرہ: ۲۰۱)

اہل کتاب اور مشرکین میں سے جو لوگ کافر تھے وہ اپنے کفر سے باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس وہ دلیل روشن نہ آجائے جن سے اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک سمجھے پڑے۔

کرنا ہے۔



یعنی ان کے معاملت کفر سے نکلنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ ایک دلیل روشن اگر انہیں کفر کی ہر صورت کا غلط اور خلاف حق ہونا سمجھاتے اور راہِ راست کو واضح اور موکل طریقہ سے ان کے سامنے پیش کر دے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس دلیل روشن کے آجانے کے بعد وہ سب کفرت بازا بنانے والے تھے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دلیل کی غیر موجودگی میں نران کا اس حالت سے نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ البتہ اس کے آنے کے بعد بھی ان میں جو لوگ اپنے کفر پر قائم رہیں اس کی ذمہ داری پھر انہی پر ہے، اس کے بعد وہ اللہ سے یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ آپ نے ہماری ہدایت کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ وہی بات ہے جو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے مثلاً سورہ نمل میں فرمایا: **وَقَالَ اللَّهُ فَضَلُّوا السَّبِيلَ**، سیدھا راستہ بتانا اللہ کے ذمہ ہے۔ آیت 4: **شَوْذِلِيلٍ مِّنْ فِرْيَايَا اِنَّ عَلَيَّا لَلْغَدَابِي**، راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے۔ آیت 12: **اِنَّا اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَلِمًا اَوْحَيْنَا اِلَى نُوْحٍ وَالتَّيْمِيْنِ مِّنْ بَعْدِهٖ - مَرْسَلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنذِرِيْنَ لِّمَنْ لَّا يَكُوْنُ يَتْلُو عَلٰى اللّٰهِ حُجَّةً بَعْدَ الرُّسُلِ**، اے نبی! ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے جس طرف نوح اور اس کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی تھی۔ ان رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنایا گیا تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے افسوس نہ ہو۔ آیت 17: **اِنَّمَا اَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّاُنذِرًا**۔

یہ اہلِ اِکْتِسَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلُنَا  
 یُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰی قَلْبِكُمْ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ  
 تَقُوْلُوْا مَا جَاءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّاَنْ  
 نَّذِيْرًا فَمَا جَاءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّاَنْذِيْرٌ۔  
 (المائدہ- 14)

دینے والا اور خبردار کرنے والا آگیا۔ اللہ  
 وَ مَا تَعْتَرِقَ الَّذِيْنَ اٰتَوْا اَلْكِتٰبَ  
 اِلَّا مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمْ اَلْبَيِّنَةُ۔  
 (البینہ ۴)

یعنی اس سے پہلے اہل کتاب جو مختلف گمراہیوں میں جھنک کر بے شمار فرقوں میں بٹ گئے تھے اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ان کی رہنمائی کے لیے دلیل روشن بھیجی تھی بلکہ یہ روش انہوں نے اللہ کی جانب سے رہنمائی آجانے کے بعد اختیار کی تھی، اسی لیے اپنی گمراہی کے وہ خود ذمہ دار تھے، کیونکہ ان پر نجات تمام کی جا چکی تھی۔ اسی طرح اب جو تک ان کے صحیفے پاک نہیں رہے ہیں اور ان کی کتابیں بالکل راست اور



تہذیب لکھانا صدیوں تک ریگستان میں آزادی کی زندگی بسر کرنے کے سبب سے ان میں جہالت پھیل گئی تھی اور وہ اپنی جہالت میں اس قدر سخت ہو گئے تھے کہ ان کو آدمی بنا کر کسی معمولی انسان کے بسے کا کام نہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ان میں یہ قابلیت ضرور موجود تھی کہ اگر کوئی زبردست انسان ان کی اصلاح کر دے اور اس کی تعلیم کے اثر سے وہ کسی اعلیٰ درجہ کے مفکر کو سنے کر اٹھ کھڑے ہوں تو دنیا کو زبرد زبردائیں پیغمبر عالم کی تعلیم کو پھیلانے کے لیے ایسی ہی جوان اور طاقتور قوم کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد عربی زبان کو دیکھو۔ تم جب اس زبان کو پڑھو گے اور اس کے علم و ادب کا مطالعہ کرو گے تو تم کو معلوم ہوگا کہ بلند خیالات کو ادا کرنے اور خدائی علم کی نہایت نازک اور باریک باتیں بیان کرنے اور دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی اور زبان نہیں ہے۔ اس زبان کے مختصر جملوں میں بڑے بڑے معانی ادا ہو جاتے ہیں۔ اور پیران میں ایسا درہنہ ہے کہ دلوں میں تیر و شمشیر کی طرح اثر کرتے ہیں۔ ایسی شیرینی ہوتی ہے کہ کانوں میں رس پڑتا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نغمہ ہوتا ہے کہ آوی بے اختیار بھڑوٹے لگتا ہے۔ قرآن مجید کتاب کے لیے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی۔

پس اللہ تعالیٰ کی یہ بہت بڑی حکمت تھی کہ اس نے تمام جہانوں کی پیغمبری کے لیے عرب کے مقام کو منتخب کیا۔ جہالت زدہ قوم کے لیے بہترین رہنما

ایک قوم صدیوں سے سخت جہالت، سستی اور بد حالی میں مبتلا چلی آتی ہے۔ لہذا ایک اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت اس پر رہتی ہے اور وہ اس کے اندر ایک بہترین رہنما اٹھاتا ہے اور اسے جہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے خود اپنا کلام اس رہنما پر نازل کرتا ہے تاکہ وہ عقلمند سے بیدار ہو، جاہلانہ اوہام کے چکر سے آگاہ ہو کر زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرے۔

مگر اس قوم کے نادان لوگ اور اس کے خود غرض قبائلی سردار اس رہنما کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں اور اسے ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ جول جول سال پر سال گزرتے جاتے ہیں ان کی خداداد اثرات بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اسے قتل کر دینے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کیا تم باری نالافتی کی وجہ سے ہم تمہاری اصلاح کی کوشش چھوڑ دیں؟ اس درجہ نصیحت کا سلسلہ روکے دیں؟ اور تمہیں اسی ہستی میں پڑا رہنے دیں جس میں تم صدیوں سے گمے ہوئے ہو؟ کیا تمہارے نزدیک واقعی ہماری رحمت کا تقاضا یہی ہونا چاہیے؟ تم نے کچھ سوچا بھی کہ خدا کے فضل کو ٹھکرانا اور حق سامنے آجانے کے بعد باطل پر اصرار کرنا تمہیں کس انجام سے دوچار کرے گا۔ ۵۱

۵۱۔ کہہ کر پیغمبر عرب میں پیدا نہیں ہوا۔

# نبوت محمدی کا عقلی ثبوت

تھوڑی دیر کے لیے جہانی آنکھیں بند کر کے تصور کی آنکھیں کھول لیجیے اور ایک ہزار چار سو برس پیچھے پلٹ کر دنیا کی حالت پر نظر ڈالیے۔ یہ کیسی دنیا تھی؟

## ۴ صدیوں پہلے کی دنیا

انسان اور انسان کے درمیان تبادلہ خیالات کے وسائل کس قدر کم تھے۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق کے ذرائع اتنے محدود تھے۔ انسان کی معلومات کس قدر کم تھیں۔ اس کے خیالات کس قدر ناقص تھے۔ اس پر دم اور تلاش کا کس قدر غلبہ تھا۔ جہالت کے اندھیرے میں علم کی روشنی کتنی دھندلی تھی اور اس اندھیرے کو دیکھنے کیلئے کتنی ذہنوں کے ساتھ پھیل چکی تھی۔ دنیا میں شمار تھا، ٹیلیفون تھا، نہ ریڈیو تھا، نہ ٹیلی ویژن تھا، نہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے تھے نہ کتابیں نہ مطابع نہ اشاعت خانے۔ نہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت تھی۔ نہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے تھے نہ کتابیں کثرت سے لکھی جاتی تھیں۔ نہ کثرت سے ان کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے ایک عالم کی معلومات بعض خیالات سے لکھی جاتی تھیں۔ نہ کثرت سے ان کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے ایک عالم کی معلومات بعض خیالات سے موجودہ زمانے کے ایک عام آدمی کی بہ نسبت کم تھیں۔ اس زمانے کی اونچی سوسائٹی کا آدمی بھی موجودہ زمانے کے ایک مزدور کی بہ نسبت کم شائستہ تھا۔ اس زمانے کا ایک نہایت روشن خیال آدمی بھی آج کل کے تاریکیاں آدمی سے زیادہ تاریک خیال تھا۔ جو باتیں آج ہر کس و نا کس کو معلوم ہیں وہ اس زمانے میں برسوں کی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد مشکل معلوم ہو سکتی تھیں جو معلومات آج روشنی کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی ہیں اور ہر بچے کو ہوش سنبھالتے ہی حاصل ہو جاتی ہیں، ان کے لیے اس زمانے میں سینکڑوں میل کے سفر کیے جاتے تھے، اور عربی اس کی جستجو میں بہت جاتی تھیں۔ جن باتوں کو آج اورام و خرافات سمجھا جاتا ہے، وہ اس زمانے کے خفاقی تھے۔ جن افعال کو آج ناشائستہ اور وحشیانہ کہا جاتا ہے، وہ اس زمانے کے عام معمولات تھے جن طریقوں سے آج انسان کا ضمیر نفرت کرتا ہے، وہ اس زمانے کے اخلاقیات میں نہ صرف جاڑھے بلکہ کوئی شخص یہ خیال بھی نہ کرتا تھا کہ ان کے خلاف بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔ انسان کی عجات پرستی اس قدر بڑی ہوئی تھی کہ

وہ کسی چیز میں اُس وقت تک کوئی صداقت، کوئی بزرگی تسلیم ہی نہ کر سکتا تھا جب تک وہ فرق العظمت نہ ہو۔  
خلافتِ عادت نہ ہو، غیر معمولی نہ ہو۔ تھی کہ انسان خود اپنے آپ کو اس قدر ذلیل سمجھتا تھا کہ کسی انسان کا خدا  
وسیدہ ہونا یا کسی خدا رسیدہ کا انسان ہونا اُس کے تصور کی رسائی سے بہت دور تھا۔

### سرزمینِ عرب کے احوال

اِس تاریکِ قدیم زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تصرف اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا جو مالک  
اُس زمانے کے معیار تمدن کے لحاظ سے متمیز تھے ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھک پڑا ہوا  
تھا۔ اس کے ارد گرد ایران، روم اور مصر کے ملکوں میں علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی  
جاتی تھی مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جدا کر رکھا تھا۔ عرب سو راگراؤٹوں پر  
مہینوں کی مسافت طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے، اور صرف اموال کا تبادلہ کر کے واپس  
آجاتے تھے علم و تہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ اُن کے ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا، نہ کتب خانہ  
نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، نہ علوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنہیں بھٹا  
پڑھنا آتا تھا۔ مگر وہ بھی انسان نہیں کہ وہ اِس زمانے کے علوم و فنون سے آشنا ہوں۔ ان کے پاس ایک اعلیٰ  
درجے کی باقاعدہ زبان ضرور تھی جس میں بلند خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ اُن میں بہترین ادبی  
ذائقہ بھی موجود تھا۔ مگر اُن کے لٹریچر کے جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان  
کی معلومات کس قدر محدود تھیں۔ تہذیب و تمدن میں ان کا درجہ کس قدر نسبت تھا۔ اُن پر اویا مہ کا کس قدر  
غلبہ تھا۔ ان کے خیالات اور ان کی عادات میں گنتی جہالت اور وحشت تھی۔ ان کے اخلاقی تصورات کتنے  
بھدے تھے۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ کوئی ضابطہ نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا اور صرف قبائل کے  
قانون کی پیروی کی جاتی تھی جس کا جس پر بس چلتا اسے مارنا اور اس کے مال پزنا بلص ہر جانا۔ یہ بات ایک عرب  
بدوی کے لہجہ سے بات کرتے ہوئے کہہ کر شخص اُس کے قبیلے کا نہیں ہے اُسے وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اُن کے مال پر کیوں  
نہ تصرف ہو جائے۔

اخلاق و تہذیب و شائستگی کے جو کچھ بھی تصورات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ  
تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً نا آشنا تھے۔ ان کی زندگی نہایت گندہ  
تھی۔ ان کے طریقے و حشیانہ تھے، زنا، جوا، شراب، رہبرنی اور قتل و خونریزی ان کی زندگی کے معمولات تھے جو ایک  
دوسرے کے سامنے بے تکلف برہنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عمریں نہایت ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ وہ اپنی  
محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں زردہ دفن کر دیتے تھے محض اس ہابلانہ خیال کی بنا پر کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ وہ اپنے باپ کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انہیں کھانے اور لباس اور طہارت کے معمولی آداب تک معلوم نہ تھے۔

مذہب کے باب میں وہ ان تمام جہالتوں اور غلطیوں کے حصہ دار تھے جن میں اس زمانے کی دنیا بھلا تھی۔ جنت پرستی، ارواح پرستی، کو ایک پرستی، غرض ایک خدا کی پرستش کے سوا اس وقت دنیا میں جتنی پرستیاں پائی جاتی تھیں، وہ سب ان میں سزا جھنیں۔ انہیں سے قدیم اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم ان کے پاس نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل ان کے باپ ہیں مگر یہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عباد اور نمود کے قصے بھی ان میں مشہور تھے مگر ان کی ہر روایات عرب کے مؤرخین نے نقل کی ہیں ان کو پڑھ جائیے، کہیں آپ کو صحیح اور جوڑی کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ ان کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے ایسا نئے نبی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں مگر وہ جی کچھ نہیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر ان اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو مفسرین اسلام نے نقل کی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل عرب اور غرضی اسرائیل جن انبیاءت واقعت تھے وہ جیسے انسان تھے اور شرت کے متعلق ان لوگوں کا تصور کس قدر گھٹیا درجہ کا تھا۔

### ایک شخصیت سامنے آتی ہے!

ایسے زمانہ میں ایسے ملک میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے بچپن میں باپ اور دادا کا سایہ اس کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔ اس لیے اس گنتی گزری حالت میں ایک بڑے بچے کو بے ضروری بہت ترسیتا سکتی تھی وہ بھی اس کو نہیں ملتی۔ ہوش سنبھالتا ہے تو بدوی لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو سوداگری میں لگ جاتا ہے۔ اٹھنا، بیٹھنا، طمانینا، سب کچھ انہی عربوں کے ساتھ ہے جن کا حال اوپر آپ نے دیکھ لیا ہے۔ یہ وہ نام تک نہیں تھی کہ پڑھنا کھنا تک نہیں آتا کسی عالم کی صحبت بھی بیٹھ نہ ہوتی کہ "عالم" کا وجود اس وقت تمام عرب میں کہیں نہ تھا۔ چند تہذیب سے عرب سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق ضرور ہوا۔ مگر یہ سفر صرف شام کے علاقے تک تھے اور ویسے ہی تجارتی سفر تھے جیسے اس زمانے میں عرب کے تجارتی قافلے کیا کرتے تھے۔ بالفرض اگر ان آسمان کے دوران میں اس نے کچھ آثار علم و تہذیب کا مشاہدہ کیا اور کچھ اہل علم سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تو ظاہر ہے کہ ایسے متفکر مشاہدات اور ایسی ہنگامی ملاقاتوں سے کسی انسان کی سیرت نہیں بن جاتی۔ ان کا اثر کسی شخص پر اتنا نہ بردست نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل آزاد، بالکل مختلف اور اتنا بلند ہو جائے کہ اس میں اور اس کے ماحول میں کچھ نسبت ہی نہ رہے۔ ان سے اساطیر حاصل ہونا ممکن نہیں ہے جو ایک ان ٹرچہ بدوی کو ایک ملک کا نہیں تمام دنیا کا، اور کائنات

کا نہیں تمام زمانوں کا لیڈر بنا دے۔ اگر کسی درجہ میں اُس نے باہر کے لوگوں سے علمی استفادہ کیا بھی تو جو حکومت اُس وقت دُنیا میں کسی کو حاصل ہی نہ تھیں۔ مذہب، اخلاق، ہندسب اور تمدن کے جو خصوصیات اور اصول اُس وقت دُنیا میں کہیں موجود ہی نہ تھے، انسانی سیرت کے جو نمونے اُس وقت کہیں پائے ہی نہ جاتے تھے، ان کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

### اُس کا کردار

صرف عرب ہی کا نہیں دُنیا کا ماحول پیش نظر رکھیے اور دیکھیے۔

یہ شخص جن لوگوں میں پیدا ہوا جن میں بچپن گزارا، جن کے ساتھ پلی کر جوان ہوا، جن سے اس کا میل جول رہا، جن سے اُس کے معاملات رہے، ابتدا ہی سے عادات میں، اخلاق میں وہ اُن سب سے مختلف نظر آتا ہے۔ وہ کبھی بھڑکے نہیں بولتا، اُس کی صداقت پر اس کی ساری قوم گواہی دیتی ہے۔ اس کے کسی بدترین دشمن نے کبھی اُس پر یہ الزام نہیں لگایا کہ اُس نے فلاں موقع پر بھڑکے بولا تھا۔ وہ کسی سے بدکلامی نہیں کرتا۔ کسی نے اس کی زبان سے کبھی کالی یا کوئی فحش بات نہیں سنی۔ وہ لوگوں سے ہر قسم سے معاملات کرتا ہے، مگر کبھی کسی سے تلخ کلامی اور ٹوٹو میں نہیں کی نسبت ہی نہیں آتی۔ اُس کی زبان میں ہمتی کے جھانکے شہسوی ہے اور وہ بھی ایسی کہ جو اس سے ملتا ہے گویا ہو جاتا ہے۔ وہ کسی سے بد معاہلی نہیں کرتا کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ برسوں سوداگری کا پیشہ کرنے کے باوجود کسی کا ایک پیسہ بھی نامانوس نظر قیہ سے نہیں دیتا۔ جن لوگوں سے اُس کے معاملات پیش آتے ہیں وہ سب اس کی ایمانداری پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ ساری قوم اس کو امین کہتی ہے۔ دشمن کا اپنے قسمتی مال اُس کے پاس رکھوانے میں اور وہ اُن کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ بے حیا لوگوں کے درمیان وہ ایسا حیا دار ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے اس کو برہنہ نہیں دیکھا۔ بد اخلاقوں کے درمیان وہ ایسا پاکیزہ اخلاق ہے کہ کسی بدکاری میں مبتلا نہیں ہونا شراب اور خمر کے ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ ناشائستہ لوگوں کے درمیان وہ ایسا شائستہ ہے کہ ہر بدتمیزی اور گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کے ہر کام میں پاکیزگی اور پختہ پائی جاتی ہے۔ سنگدلوں کے درمیان وہ ایسا نرم دل ہے کہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ غمیوں اور بے یاری کی مدد کرتا ہے۔ مسافروں کی میزبانی کرتا ہے کسی کو اس سے دکھ نہیں پہنچتا اور وہ دوسروں کی خاطر دکھ اٹھاتا ہے۔ وحشیوں کے درمیان وہ ایسا صلح پسند ہے کہ اپنی قوم میں نسا اور خونریزی کی گرم بازاری دیکھ کر اس کو ازیت ہوتی ہے۔ اپنے قبیلہ کی لڑائیوں سے دامن بچاتا ہے اور مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش رہتا ہے۔ بیت پرستوں کے درمیان وہ ایسا سلیم الفطرت اور صلح پسند ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز اُسے پوجنے کے لائق نظر نہیں آتی کسی مخلوق کے آگے اُس کا سر نہیں ٹھکتا۔ بتوں کے پڑھانے کا کھانا بھی وہ قبول نہیں کرتا۔ اس کا دل خود بخود شریک اور مخلوق پرستی سے نفرت کرتا ہے۔

اس باطن میں یہ شخص ایسا متاثر نظر آتا ہے جیسے گھسا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن ہے، یا بھروسے کے ڈبیر میں ایک ہیرا چمک رہا ہے۔

### ذہنی و روحانی تغیر

تقریباً پچیس سال تک ایسی پاک صاف، شرفیائے زندگی بسر کرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے۔ وہ اس تاریکی سے گھبرا اٹھتا ہے جو اس کے ہر طرف قیود نظر آرہی تھی۔ وہ جہالت، بد اخلاقی، بد کناری، بد نظمی، شرک اور بت پرستی کے اس ہونٹاک سمندر سے نکل جانا چاہتا ہے جو اسے گھیرے ہوئے تھا۔ اس باطن میں اس کو کوئی چیز بھی اپنی طبیعت کے مناسب نظر نہیں آتی۔ وہ سب سے الگ ہو کر آبادی سے دور پہاڑوں کی صحبت میں جا جا کر بیٹھنے لگتا ہے۔ تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گزار دیتا ہے۔ روزے رکھ رکھ کر اپنی روح اور اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے۔ سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے۔ کئی ایسی روشنی دیکھتا ہے جس سے وہ اس چاروں طرف مچھاتی ہوئی تاریکی کو دور کر دے۔ ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے اس بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر پھر سے منوار دے۔

### پیغام انقلاب

یگانگ اس کی حالت میں ایک غفیر انسان تغیر رونما ہوتا ہے۔ ایک دم سے اس کے دل میں وہ روشنی ابھرتی ہے جو پہلے اس میں نہ تھی۔ اچانک اس کے اندر وہ طاقت بھر جاتی ہے جس سے وہ اس وقت تک خالی تھا۔ وہ غار کی تنہائی سے نکل آتا ہے۔ اپنی قوم کے پاس آتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ یہ بت جن کے آگے تم جھکتے ہو یہ سب بے حقیقت چیزیں ہیں، انہیں چھوڑ دو۔ کوئی انسان، کوئی دولت، کوئی پیڑھا، کوئی تیارہ، اس قابل نہیں کہ تم اس کے آگے سر جھکاؤ اور اس کی بندگی و عبادت کرو اور اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرو۔ یہ زمین، یہ چاند، یہ سورج، یہ ستارے، یہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہی تمہارا اور سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہی مارنے اور جلانے والا ہے۔ اسی کی بندگی کرو۔ اسی کا حکم مانو اور اسی کے آگے سر جھکاؤ۔ یہ چوری، یہ لوٹ مار، یہ قتل و غارت، یہ ظلم و ستم، یہ بے حیائیاں اور بدکاریاں جو تم کرنے ہو سب گناہ ہیں۔ انہیں چھوڑ دو۔ خدا انہیں پسند نہیں کرتا۔ سچ بولو۔ انصاف کرو۔ نہ کسی کی جان کو نہ کسی کا مال چھینو۔ جو کچھ بھی لو حق کے ساتھ نہ جو کچھ دوسرے کے ساتھ دو۔ تم سب انسان ہو۔ انسان اور انسان سب برابر ہیں۔ نہ کوئی ذات کا داغ لے کر پیدا ہوا، اور نہ کوئی عزت کا تمہارے کو دنیا میں آیا۔ بزرگی اور شرف نسل اور نسب میں نہیں صرف خدا پرستی اور سچائی اور پاکیزگی میں ہے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے اور نیک اور پاک ہے، وہی اعلیٰ درجے کا انسان ہے۔ اور جو ایسا نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ مرے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے۔ تم میں سے ہر شخص اپنے حال کے لیے خدا



کے سامنے جوابدہ ہے۔ اُس خدا کے سامنے جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔ تم کوئی چیز اُس سے چھپا نہیں سکتے۔ تمہاری زندگی کا پورا کارنامہ اُس کے سامنے بے کم و کاست پیش ہوگا، اور اسی کارنامہ کے لحاظ سے وہ تمہارے انجام کا فیصلہ کرے گا۔ اُس عادل تحقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی، نہ رشوت چلے گی، نہ کسی کا نسب پر چھا جائے گا۔ وہاں صرف ایمان اور نیک عمل کی پوجھ ہوگی جس کے پاس یہ سامان ہوگا وہ جنت میں بلائے گا۔ اور جس کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہ ہوگا وہ نامراد ووزیر میں ڈالا جائے گا۔

یہ تھا وہ انجام جسے لے کر وہ خار سے نکلا۔

## قوم کا ردِ عمل

جابل قوم اُس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ گالیاں دیتی ہے۔ پتھر مارتی ہے۔ ایک دو دن نہیں اکتھے تیرہ برس تک اس پر سخت سے سخت ظلم تو لگتی ہے۔ یہاں تک کہ اُسے وطن سے نکال باہر کر دیتی ہے۔ اور پھر نکالنے پر بھی دم نہیں لیتی۔ جہاں وہ جا کر پناہ لیتا ہے وہاں بھی اسے ہر طرح ستاتی ہے۔ تمام عرب کو اس کے خلاف اُتار دیتی ہے اور کابل اٹھرتی اس کے خلاف بڑے بڑے پیکار کرتی ہے۔ وہ ان سب تکلیفوں کو سہتا ہے مگر اپنی بات سے نہیں ٹکتا۔

یہ قوم اُس کی دشمن کیوں ہوئی؟ کیا زر اور زمین کا جھگڑا تھا؟ کیا خون کا کوئی دعویٰ تھا؟ کیا وہ ان سے دنیا کی کوئی چیز بھی مانگ رہا تھا؟ نہیں، ساری دشمنی صرف اس بات پر تھی کہ وہ ایک خدا کی بندگی اور پرہیزگاری اور نیکو کاری کی تعلیم کیوں دیتا ہے۔ بہت پرستی اور تبرک اور بد عملی کے خلاف تبلیغ کیوں کرتا ہے۔ پتھاروں اور پردہ بتوں کی مشیاتی پر کیوں ضرب لگاتا ہے سرداروں کی سرداری کا ظلم کیوں توڑتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان سے اونچ نیچ کا فرق کیوں مٹانا چاہتا ہے۔ قبائلی اور نسلی تقسیمات کو جاہلیت کیوں قرار دیتا ہے۔ زمانہ قدیم سے سوسائٹی کا جو نظام بندھا پلا آ رہا ہے، اسے کیوں توڑنا چاہتا ہے۔ قوم کہتی تھی کہ یہ باتیں جو تو کہہ رہا ہے، یہ سب نادانی روایات اور زوی طریقہ کے خلاف ہیں۔ تو ان کو چھوڑ دے۔ ورنہ ہم تیرا جینا مشکل کریں گے

## تکلیف شدہ اُمم کیوں؟

اچھا تو اس شخص نے یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں؟ قوم اس کو یاد دلا رہی ہے۔ یہ بے پر آما وہ تھی، دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں ڈالنے کو تیار تھی، بشرطیکہ وہ اس تعلیم سے باز آجائے۔ مگر اُس نے ان سب کو ٹھکرا دیا اور اپنی تعلیم کو خاطر چھوڑ کر انا اور ظلم مہنا قبول کیا۔ یہ آخر کیوں؟ کیا ان کے خدا پرست اور نیکو کار بن جانے میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ تھا؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کے مقابلے میں ریاست اور امارت اور دولت اور عیش کے سارے لالچ بھی ناقابل التفات تھے؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کی خاطر ایک شخص سخت سے سخت جسمانی اور روحانی آذیتوں

میں مبتلا ہونا اور کمال ۱۲ سال تک رہنا بھی گوارا کر سکتا ہو؟ خود کرو کیا نیک نفسی، ایشیا اور میدردی بنی نوع کا اس سے بھی بلند تر کوئی مرتبہ تمہارے تصور میں آ سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فائدہ کی خاطر نہیں، دوسروں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں اٹھاتے؟ جن کی بھلائی اور بہتری کے لیے وہ کوشش کرتا ہے وہی اس کو پھر ماریں، گالیاں دیں، گھر سے بے گھر کر دیں، خرمیب الوطنی میں بھی اس کا پھینکا نہ چھوڑیں، اور ان سب باتوں پر بھی وہ ان کا بھلا چاہنے سے باز نہ آئے۔

پھر دیکھو! کیا کوئی جھوٹا شخص کسی بے اصل بات کہنے لگے ایسی شخصیتیں برداشت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی پتھر تھے ٹرانے والا شخص محض گمان اور قیاس سے کوئی بات کہہ کر اس پر آناجم سکتا ہے کہ مسیبتوں کے بہاڑ اس پر ٹوٹ جائیگا زمین اس پر تنگ کر دی جاتے، تمام ملک اس کے غلامانہ اٹھ کھڑا ہو، بڑی بڑی فوجیں اس پر آئندہ امٹ کر آئیں، مگر وہ اپنی بات سے ایک سر ٹوٹنے پر آمادہ نہ ہو؟ یہ استقامت، یہ عزم، یہ ثبات، خود گواہی دے رہا ہے کہ اس کو اپنی صداقت پر یقین تھا۔ اگر اس کے دل میں شک و شبہ کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو وہ مسلسل ۱۲ سال تک مصائب کے ان پے درپے طوفانوں کے مقابلے میں کبھی نہ ٹھہر سکتا۔

یہ تو اس کے انقلابِ حال کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔

### انقلابِ حال کا دوسرا پہلو

چالیس برس کی عمر تک وہ ایک عرب تھا، عام عربوں کی طرح۔ اس دوران میں کسی نے اس سے سوچا کہ کوئی ایک جاؤ بیان مقرر کی حیثیت سے نہ جانا۔ کسی نے اس کو اقبالیہ اور فلسفہ انفاق اور قانون اور سیاسیات اور معاشیات اور عمرانیات کے مسائل پر بحث کرتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس سے نندا اور ملائکہ اور آسمانی کتابوں اور کچھ اہلبیاد اور اہل ایمہہ اور قیامت اور حیات بعد الموت اور روزخ اور حقیقت کے متعلق ایک لفظ بھی نہ سنا۔ وہ پاکیزہ اخلاق، ثبات، الطوار اور بہترین سیرت و کردار اور ضرور رکھتا تھا، مگر چالیس برس کی عمر تک پہنچنے تک اس کی ذات میں کوئی بھی غیر معمولی بات نہ پائی گئی جس سے لوگ متوقع ہوتے کہ شخص آپ کچھ عیشے والا ہے۔ اس وقت تک جاننے والے اس کو محض ایک نامور شاعر اور نہایت شریف انسان کی حیثیت سے جانتے تھے، مگر چالیس برس کے بعد جب وہ اپنے غار سے ایک نیا پیغام لے کر نکلا تو یک لخت اس کی کا یا سی ٹی ہوئی تھی۔

اب وہ ایک حیرت انگیز کلام سنار بنا تھا جس کو سن کر سارا عرب مبہوت ہو گیا۔ اس کلام کی شدت تاثیر کا یہ حال تھا کہ اس کے سنے سے کٹے دشمن بھی اس کو سننے سے ہرتے ڈرتے تھے کہ کہیں یہ دل میں اتر نہ جائے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زور بیان کا یہ عالم تھا کہ تمام قوم عرب کو جس میں بڑے بڑے شاعر، خطیب اور زبان آوری کے مدعی موجود تھے، اس نے چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا کہ تم سب مل کر ایک ہی سورت، اس کی مانند بنا لو۔ مگر کوئی اس کے مقابلے کی برأت نہ کر سکا ایسا بے مثل کلام کبھی عرب کے کافروں نے سنا ہی نہ تھا۔

اب یگانگ وہ ایک بے مثل حکیم، ایک لاجواب مُصلِحِ اخلاق و تمدن، ایک برستہ انگیز ماہر سیاست ایک زبردست مُتَقِن، ایک اعلیٰ درجہ کا جج، ایک بے نظیر سپہ سالار بن کر ظاہر ہوا۔ اُس نے، اُس ان پڑھ صحرائین نے، حکمت اور دانائی کی وہ باتیں کہنی شروع کر دیں جو نہ اس سے پہلے کسی نے کہی تھیں۔ نہ کوئی اس کے بعد کہہ سکا۔ وہ اتنی اہلیات پر فیصلہ کن تقریریں کرنے لگا۔ تاریخ اقوام سے عروج و زوال اُمم کے فلسفہ پر لکھ دینے لگا۔ پُرانے مصلحین کے کارناموں پر تھہرے اور مذاہبِ عالم پر تنقید اور اختلافاتِ اقوام کے فیصلے کرنے لگا۔ اخلاق اور تہذیب اور شائستگی کا درس دینے لگا۔

اس نے معاشرت اور معیشت اور اجتماعی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق قوانین بنانے شروع کر دیئے اور ایسے قوانین بنائے کہ بڑے بڑے علماء اور عقلاء غور و غوض اور غم بھر کے تجربات سے بہ شکل ان کی حکمتوں کو سمجھتے ہیں، اور دنیا کے تجربات جتنے بڑھتے جاتے ہیں، اُن کی حکمتیں اور زیادہ کھلتی جاتی ہیں۔

وہ خاموش پُر امن سوداگر جس نے کبھی تمام عمر تلوار نہ چلائی تھی، کبھی کوئی فوجی تربیت نہ پائی تھی، حتیٰ کہ جوڑ بھڑیں صحت ایک مرتبہ ایک لڑائی میں محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا، دیکھتے دیکھتے ایک بہادر سپاہی بن گیا جس کا قدم سخت سے سخت معرکوں میں بھی اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹا۔ ایسا زبردست جنرل بن گیا جس نے ۹ سال کے اندر تمام ملک عرب کو فتح کر لیا۔ ایسا حیرت انگیز عسکری لیڈر بن گیا کہ اس کی پیدا کی ہوئی فوجی تنظیم اور جنگی رُوح کے اثر سے بے سرو سامان عربوں نے چند سال میں دنیا کی دو عظیم الشان فوجی طاقتوں کو اکٹھا کر رکھ دیا۔

وہ اگ ٹھنک رہنے والا سکون پسند انسان، جس کے اندر کسی نے چالیس برس تک سیاسی دلچسپی کی بو بھی نہ پائی تھی، یگانگ آغا زبردست ریاضت اور عذوبن کر ظاہر ہوا کہ ۲۳ سال کے اندر اُس نے ۱۲ اکر مربع میل میں پھیلے ہوئے گنجانے کے منتشر جنگجو، جاہل، سرکش، بغیر تمدن اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والے قبائل کو، ریل اور تار اور ریڈیو اور پوسٹ کی لڑکے بغیر، ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک قانون اور ایک نظامِ حکومت کا تابع بنا دیا۔ اُس نے اُن کے خیالات بدل ڈیٹے ان کے اخلاق بدل دیئے، اُن کی ناشائستگی کو اعلیٰ درجہ کی شائستگی میں، ان کی وحشیت کو بہترین مدنیت میں، ان کی بد کرداری اور بد اخلاقی کو صلاح و تقویٰ اور مکارمِ اخلاق میں، اُن کی سرکشی اور انا کی کو انتہا درجہ کی پابندی قانون اور اطاعتِ امر میں تبدیل کر دیا۔ اُس باخجہ قوم کو، جس کی گردنیں صدیوں سے کئی ایک بھی قابلِ ذکر انسان پیدا نہ ہوئے تھے، اُس نے ایسا مردم نیر بنا دیا کہ اس میں ہزار در ہزار اعلیٰ درجہ والے کھڑے ہوئے اور دنیا کو دین اور اخلاق اور تہذیب کا درس دینے کے لیے پارہاگ عالم میں پھیل گئے۔

## اخلاقی طریق کار

اور یہ کام اُس نے ظلم اور سب اور دغا اور فریب سے انجام نہیں دیا، بلکہ دل موہ لینے والے اخلاق اور دعوں کو سخر



عقلیت اور حقیقت پسندی اور متقیانہ دنیا داری کی طرف پھیر دیا۔ اس نے محسوس معجزے مانگتے والی دنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور انہی کو معیار صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اُس نے خرقِ مادت میں خدا کی خدائی کے آثار ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور انہیں آثارِ فطرت (Natural Phenomena) میں خدا کی نشانیاں دیکھنے کا محرکہ بنایا۔ اُس نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو قیاسِ آرائی (Speculation) سے ہٹا کر تعقل اور تفکر، مشاہدہ اور تحقیق کے راستے پر لگایا۔ اُس نے عقل اور حس کے انفرادی محدود انسان کو بتائے۔ مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی۔ دین سے علم و عمل کا اور علم و عمل سے دین کا رابطہ قائم کیا۔ مذہب کی طاقت سے دنیا میں سائنٹفک اسپرٹ اور سائنٹفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی۔ اُس نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا اور علم کی طاقت سے توحید کا اعتقاد ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا کہ مشرکوں اور بت پرستوں کے مذہب بھی وحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اُس نے اخلاق اور روحانیت کے بنیادی تصورات کو بدلا۔ جو لوگ ترک دنیا اور نفس کشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے، جن کے نزدیک نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیاوی زندگی کے معاملات میں مقصد لینے سے روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی، ان کو اسی نے تمدن اور سماج اور دنیوی عمل کے اندر فضیلتِ اخلاق ارتقا سے روحانی اور حصولِ نجات کا راستہ دکھایا۔ پھر وہی ہے جس نے انسان کو اُس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ جو لوگ بھگوان اور اتار اور ابنِ اللہ کے سوا کسی کو باری اور رہنما تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھے، ان کو اُسی نے بتایا کہ انسان اور تمہارے ہی جیسا انسان آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور خداوندِ عالم کا خلیفہ ہو سکتا ہے جو لوگ ہر طاقتور انسان کو اپنا خدا بناتے تھے۔ ان کو اُسی نے سمجھایا کہ انسان نجیز انسان کے اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص تقدس اور حکمرانی اور آقائی کا پیدائشی حق رکھ سکے، اور نہ کسی پر ناپاکی اور محکومیت اور غلامی کا پیدائشی راجح لگا ہوا ہے۔ اسی تعلیم نے دنیا میں وحدتِ انسانی اور مساوات اور جمہوریت اور آزادی کے تعلیمات پیدا کیے ہیں۔

تصورات سے آگے بڑھیے۔ آپ کو اُس آچی کی لیڈر شپ کے عملی نتائج دنیا کے قوانین اور طریقوں اور معاملات میں اس کثرت سے نظر آئیں گے کہ ان کا شمار مشکل ہو جاتے گا۔ اخلاق اور مذہب، شائستگی اور لہارت و نظافت کے کتنے ہی اسول ہیں جو اس کی تعلیم سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئے ہیں معاشرت کے جو قوانین اس نے بنا دیے تھے، دنیا کے کس قدر ان کی خوشہ چینی کی، اور اب تک کی بارہی ہے۔ معاشیات کے جو اصول اس نے سکھائے تھے، اُن سے دنیا میں کتنی تھر کیس پیدا ہوئیں اور اب تک پیدا ہونے جا رہی ہیں۔ حکومت کے جو طریقے اس نے اختیار کیے تھے، ان سے دنیا کے سیاسی نظریات میں کتنے انقلاب برپا ہوئے اور ہر جہے ہیں۔ عدل اور قانون کے جو اسول اُس نے وضع کیے تھے، انہوں نے دنیا کے عدالتی نظامات اور قانونی افکار کو کس قدر متاثر کیا اور اب

تک ان کی تاثیر خاموشی سے جاری ہے۔ جنگ اور صلح اور بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب جس شخص نے عملاً دنیا میں قائم کی وہ دراصل یہی عرب کا آئی ہے۔ ورنہ پہلے دنیا اس سے ناواقف تھی کہ جنگ کی بھی کوئی تہذیب ہو سکتی ہے، اور مختلف قوموں میں مشترک انسانیت کی بنیاد پر بھی معاملات ہونے ممکن ہیں۔

## جامع کمالات شخصیت

انسانی تاریخ کے منظر میں اس حیرت انگیز انسان کی بلند و بالا شخصیت اتنی اُبھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک کے بڑے سے بڑے تاریخی انسان جن کو دنیا اکابر (Heroes) میں شمار کرتی ہے جب اس کے مقابلے میں لائے جاتے ہیں تو اس کے آگے بڑے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے اکابر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمال کی چمک و مک انسانیت کی زندگی کے ایک دو شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بارشاہ ہے، مگر عملی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پتلا ہے، مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبیر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظریات اجتماعی زندگی کے ایک پہلو پر اتنی زیادہ گہری عیب ہے کہ دوسرے پہلو اچھل ہو گئے۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو نیا تو معیشت و سیاست کو ٹھکرا دیا کسی نے معیشت و سیاست کو نیا تو اخلاق و روحانیت کو نظر انداز کر دیا۔ غرض تاریخ میں ہر طرف ایک رُخسہ ہیرو ہی نظر آتے ہیں۔ مگر تنہا ہی ایک شخصیت ایسی ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ وہ خود ہی فلسفی اور حکیم بھی ہے اور خود ہی اپنے فلسفہ کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی تدبیر بھی ہے، فوجی لیڈر بھی ہے، دانشور قانون بھی ہے، معلم اخلاق بھی ہے، مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے۔ اس کی نظر انسان کی پوری زندگی پر پھیلتی ہے اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب اور جسم کی صفائی کے طریقوں سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک ایک ایک چیز کے متعلق وہ احکام اور ہدایات دیتا ہے۔ اپنے نظریات کے مطابق ایک تہذیب (Civilization) وجود میں لاکر دکھا دیتا ہے۔ اور زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازن (Equilibrium) قائم کرتا ہے کہ افراط و تفریط کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ کیا اس جامعیت کا کوئی دوسرا شخص تمہاری نظر میں ہے۔

## ماحول سے مافوق ہستی

دنیا کی بڑی بڑی شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو کم و بیش اپنے ماحول کی پیدا کردہ نہ ہو۔ مگر اس شخص کی شان سب سے فرالی ہے۔ اس کے بنانے میں اس کے ماحول کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا اور نہ کسی دلیل سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ عرب کا ماحول اُس وقت تاریخی طور پر ایسے ایک انسان کی پیدائش کا متفقہ تھا۔ بہت کچھ تو ان کرتم جو کچھ کہہ سکتے ہو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہو گا کہ تاریخی اسباب عرب میں ایک ایسے لیڈر کے ظہور کا

تفاسد کر رہے تھے، جو تباہی افشار کر مٹا کر ایک قوم بنانا، اور ممالک کو فتح کر کے عربوں کی معاشی فلاح و بہبود کا سامان کرنا۔ یعنی ایک سیشنٹ لیڈر جو اس وقت کی تمام عربی خصوصیات کا حامل ہوتا، ظلم، بے رحمی، خون ریزی اور بگڑا دغا، غرض ہر ممکن تدبیر سے اپنی قوم کو خوش حال بنانا، اور ایک سلطنت پیدا کر کے اپنے پسماندوں کے لیے چھوڑ دینا۔ اس کے سوا اس وقت کی عربی تاریخ کا کوئی تعاضل ثابت نہیں کر سکتے۔ ہیگل کے فلسفہ تاریخ یا مارکس کی مادی تعبیر تاریخ کے نقطہ نظر سے تم حد سے صیہی حکم لگا سکتے ہو کہ اس ماحول میں ایک قوم اور سلطنت بنانے والا ظاہر ہونا چاہیے تھا یا ظاہر ہو سکتا تھا مگر ہیگل یا مارکس فلسفہ اس واقعہ کی توجیہ کیوں کر کرے گا کہ اس وقت اس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہوا جو بہترین اخلاق کھانے والا اور انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا، اور جاہلیت کے اوہام و تعصبات کو ٹٹانے والا تھا جس کی نظر قوم اور نسل اور ملک کی حدیں توڑ کر پوری انسانیت پر پھیل گئی جس نے اپنی قوم کے لیے نہیں بلکہ عالم انسانی کے لیے ایک اخلاقی و روحانی اور تمدنی و سیاسی نظام کی بنیاد ڈالی جس نے معاشی معاملات اور سیاست دونوں اور بین الاقوامی تعلقات کو عالم خیال میں نہیں بلکہ عالم واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھا دیا اور روحانیت اور مادیت کی ایسی معتدل اور متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت و دانائی کا دیباہی شاہکار ہے جیسا اس وقت تھا ہا کیا ایسے شخص کو تم عرب جاہلیت کے ماحول کی پیداوار کہہ سکتے ہو؟

### تاریخ سار شخصیت

یہی نہیں کہ وہ شخص اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتا بلکہ سب ہم اس کے کارنامے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے۔ اس کی نظروں اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی صدیوں اور ہزاروں (Millenniums) کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ وہ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کے لیے ایسی اخلاقی و عملی ہدایات دیتا ہے جو ہر حال میں کیساں مناسبت کے ساتھ ٹھیک بنتی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کو تاریخ نے پُرانا کر دیا ہے، جن کی تعریف ہم صرف اس شخصیت سے کر سکتے ہیں کہ اپنے زمانے کے اچھے رہنما تھے۔ سب سے الگ اور سب سے ممتاز، وہ انسانیت کا ایسا رہنما ہے جو تاریخ کے ساتھ حرکت و March کرتا ہے اور ہر دور میں ویسا ہی جدید Modern، نظر آتا ہے جیسا اس سے پہلے دور کے لیے تھا۔

تم جن لوگوں کو قیامتی کے ساتھ تاریخ بنانے والے (Makers of History) کا لقب دیتے ہو وہ حقیقت میں تاریخ کے بناتے ہوئے (Creatures of History) ہیں۔ وراثت تاریخ بنانے والا پوری انسانی تاریخ میں صرف یہی ایک شخص ہے۔ دنیا کے تین لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کیے ہیں ان کے حالات پر تحقیق نگاہ ڈالو تو دیکھو گے کہ اس موقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے اور وہ اسباب خود ہی اس

انقلاب کا رخ اور راستہ بھی معین کر رہے تھے جس کے پیدا ہونے کے وہ متقاضی تھے۔ انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضاء کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے اس ایکڑ کا پارٹ ادا کر دیا جس کے لیے سیلج اور کام ووزن پہلے سے معین ہوں۔ مگر تاریخ بنانے والوں یا انقلاب برپا کرنے والوں کی پوری جماعت میں یہ اکیلا ایسا شخص ہے کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے وہاں اس نے خود اسباب کو پیدا کیا۔ جہاں انقلاب کا مولد موجود نہ تھا وہاں اس کا مولد خود بنایا گیا۔ جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی وہاں اس نے خود اپنے مطلب کے آدمی تیار کیے۔ اپنی زبردست شخصیت کو گھلا کر ہزار ہا انسانوں کے قالب میں اتار دیا اور ان کو ویسا بنا یا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کی طاقت اور قوت ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان کیا۔ خود ہی اس کی صورت اور نوعیت معین کی، اور خود ہی اپنے اردو سے کے زور سے حالات کی رفتار کو مزید کر اس رستے پر چلایا جس پر وہ اُسے چلانا چاہتا تھا۔ اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگریزوں کو اور کہاں نظر آتا ہے؟

### اس کی کمال درجہ راستبازی

آئیے اب اس سوال پر غور کیجیے کہ ہم، سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں، عرب جیسے تاریک تریک کے ایک گوشے میں ایک گلہ بانی اور سوداگری کرنے والے اُن پٹھانوں کے اندر یکایک آنا علم، اتنی روشنی، اتنی طاقت اتنے کمالات، اتنی زبردست تربیت یافتہ قومیں پیدا ہو جانے کا کوئی ذریعہ تھا؟ آپ سمجھتے ہیں کہ جب اس کے اپنے دل و دماغ کی پیداوار تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اسی کے دل و دماغ کی پیداوار تھی تو اس کو نبوت کا نہیں خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا۔ اور اگر وہ ایسا دعویٰ کرتا تو وہ دنیا جس نے رام کو خدا بنا لیا، جس نے کرشن کو گھگوران قرار دینے میں ناکل نہ کیا، جس نے بوجھ کو خود بخود مسبوک بنا لیا، جس نے شیخ کو آپ اپنی مرضی سے ابن اللہ مان لیا، جس نے آگ اور پانی اور ہوا تک کو پرجہ ڈالا، وہ ایسے زبردست باکمال شخص کو خدا مان لینے سے کبھی انکار نہ کرتی، مگر دیکھو وہ خود کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں سے کسی ایک کا کرڈیٹ بھی خود نہیں لیتا کہتا ہے کہ میں ایک انسان ہوں نہیں جیسا انسان۔ میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں سب کچھ خدا کا ہے اور خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ کلام جس کی نظیر لائے سے تمام نوع انسانی عاجز ہے، میرا کلام نہیں ہے میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے، فقط لفظ خدا کی طرف سے میرے پاس آیا ہے اور اس کی تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔ یہ کارنامے جو میں نے دکھائے، یہ تو انہیں جو میں نے وضع کیے، یہ اصول جو میں نے تہیں سکھائے، ان میں سے کوئی چیز بھی میں نے خود نہیں گھڑی ہے۔ میں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر چیز میں خدا کی رہنمائی کا محتاج ہوں۔ اُدھر سے جو اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔

دیکھو یہ کیسی خیریت انگریز صداقت ہے کیسی انانیت اور راست بازی ہے۔ ٹھوٹا انسان تو ٹھوٹا بننے کے لیے



و دوسروں کے ایسے کلمات کا ذکر بدیہت بھی ہے۔ لیکن میں تا عمل نہیں کرتا جن کے اصل مانعہ کا پتہ باسناقی میں برآیا ہے۔ لیکن یہ شخص آں کلمات کو بھی اپنی عظمت و شہرت و شہرت نہیں کرتا جن کو اگر وہ ایسے کلمات کہتا تو کوئی اس کو ٹھٹھا نہ سکتا تھا۔ لیکن کسی کے پاس ان کے اصلی مانعہ کا پتہ ہی نہیں ہے۔ یا تو اس سے زیادہ کھل ہوئی ہوگی اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس شخص سے زیادہ کیا اور کون ہوگا جس کو ایک نہایت مختصر ذریعہ سے ایسے بے نظمیہ کلمات حاصل ہوں اور وہ بلا تکلف اپنے اصلی مانعہ کا حوالہ دے سکے؟ تب تو کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تسبیحی ذکر کریں؟

# نبوتِ محمدی پر قرآن میں استدلال

## چند اہم نکات

قرآن کہتا ہے:

وَمَا كُنْتُمْ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكُمْ إِذْ أَلَّزَمْتُمُ الْمُبْتَلِينَ إِنَّ هَذَا مِنْ آيَاتِنَا يَنْذَرُكُمْ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ	اے نبی! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اہل پرست لوگ تم تک میں پڑ سکتے تھے۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخدا گیا ہے۔
(العنکبوت: ۴۸-۴۹)	

اس آیت میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان پڑھتے تھے آپ کے اہل وطن اور رشتہ دہراری کے لوگ جن کے درمیان روزِ پیدائش سے سنِ کھولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی، اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی، نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔

### امی ہونے سے نبوت پر استدلال

اس امر واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات انبیاء و سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدن و ممالک و معیشت کے اہم مسائل

لہ قرآن میں نبوتِ محمدی پر بحث و استدلال کا سلسلہ اتنا وسیع ہے کہ اس کو اس کتاب کے ایک مضمون میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ پھر قرآنی استدلال کی جو توضیحات مولانا مودودی نے کی ہیں، ان سب کو یکجا کیا جائے تو یہ مضمون خود ایک کتاب بن جائے گا۔ پس چند اہم نکات کے متعلق مولانا کی مختصر بحثیں یہاں درج کی جا رہی ہیں۔

درتیب

پرس و سچ اور گہرے علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے۔ یہ اس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو روشنت و خواندہ کا علم ہوتا اور لوگوں کے کبھی اسے کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا

۱۔ قرآن مجید کے اس بیان و استدلال کے بعد ان لوگوں کی جرات حیرت انگیز ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خاندانہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن صامت الفاظ میں حضور کے نام خاندانہ ہونے کو آپ کی نبوت کے حق میں ایک طاقتور ثبوت کے طور پر پیش کر رہا ہے جن روایات کا سہارا لے کر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضور سے کلمے تھے، یا بعد میں آپ نے کھانا پڑھنا سیکھ لیا تھا وہ اول تو پہلی ہی نظر میں رد کر دینے کے لائق ہیں کیونکہ قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی پھر وہ بکلمے خود بھی اتنی کمزور ہیں کہ ان پر کسی استدلال کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے ایک بخاری کی یہ روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کا معاہدہ جب کھاجا رہا تھا تو کفار بکلمے کے نام سے نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ رسول اللہ کے جانے پر اعتراض کیا۔ اس پر حضور نے کاتب یعنی حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ اچھا رسول اللہ کا لفظ کاٹ کر محمد بن عبد اللہ بکلمہ دو۔ حضرت علیؑ نے لفظ رسول اللہ کاٹنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حضور نے ان کے ہاتھ سے لے کر وہ الفاظ خود کاٹ دیئے اور محمد بن عبد اللہ بکلمہ دیا۔

لیکن یہ روایت براء بن عازب سے بخاری میں چار جگہ اور مسلم میں دو جگہ وارد ہوئی ہے اور سب جگہ الفاظ ختمت میں؛ (۱) بخاری کتاب الصلح میں ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں؛ قال لعلي ا محمد فقال علي ما انا بالذي احماء فمحاء رسول الله مبداه حضور نے حضرت علیؑ سے فرمایا یہ الفاظ کاٹ دو، انہوں نے عرض کیا میں تو نہیں کاٹ سکتا۔ آخر کار حضور نے اپنے ہاتھ سے انہیں کاٹ دیا۔

(۲) اسی کتاب میں دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں؛ ثم قال لعلي اصم رسول الله قال لا والله لا احموا ابدأ فاحخذ رسول الله الكتاب فكتب هذا ما قاله صلى الله عليه محمد بن عبد الله - پھر علیؑ سے کہا کہ رسول اللہ کاٹ دو۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم میں آپ کا نام کبھی نہ کاٹوں گا۔ آخر حضور نے تحریر کے رکھنا یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے کیا (۳) تیسری روایت ابی براء بن عازب سے بخاری کتاب الجزیہ میں یہ ہے؛ وكان لا يكتب فقال لعلي اصم رسول الله فقال والله لا احماء ابدأ قال فاريتك قال فاراء ابا فمحاء النبي صلى الله عليه وسلم مبداه۔ حضور خود رکھ سکتے تھے۔ آپ نے حضرت علیؑ سے کہا رسول اللہ کاٹ دو۔ انہوں نے عرض کیا خدا کی قسم میں یہ الفاظ ہرگز نہ کاٹوں گا۔ اس پر حضور نے فرمایا مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں یہ الفاظ لکھے ہیں۔ انہوں نے آپ کو جگہ بتائی اور آپ نے اپنے ہاتھ سے وہ الفاظ کاٹ دیئے۔

(۴) چوتھی روایت بخاری کتاب الجزیہ میں یہ ہے؛ فاحخذ رسول الله صلى الله عليه وسلم الكتاب وليس

ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ ٹنک کرنے کی کچھ بنیاد موجود بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اخذ و التماس سے حاصل

یجس یکتب فکتب ہذا ما فاخو محمد بن عبد اللہ۔ پس حضور نے وہ تحریر لے لی، ورنہ خالی آپ کھانا نہ جانتے تھے اور آپ نے لکھا یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ نے طے کیا۔

(۵) انہی براہین عازب سے مسلم کتاب الجہاد میں ایک روایت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کے انکار کرنے پر حضور نے اپنے ہاتھ سے رسول اللہ کے الفاظ مشاویئے۔

(۶) دوسری روایت اسی کتاب میں ان سے یہ منقول ہے کہ حضور نے حضرت علیؑ سے فرمایا مجھے بناؤ رسول اللہ کا لفظ کہاں ہے، حضرت علیؑ نے آپ کو جگہ بتائی، اور آپ نے اسے مٹا کر ابن عبد اللہ لکھ دیا۔

روایات کا یہ اضطراب صاف تباہ رہا ہے کہ بیچ کے ماہیوں نے حضرت براہین عازب رضی اللہ عنہ کے الفاظ جوں کے توں نقل نہیں کیے ہیں، اس لیے ان میں سے کسی ایک کی نقل پر بھی ایسا مکمل اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ یقینی طور پر یہ کہا جاسکے کہ حضور نے محمد بن عبد اللہ کے الفاظ اپنے دست مبارک ہی سے لکھے تھے۔ ہر سکتا ہے کہ صحیح صورت واقعہ یہ ہو کہ جب حضرت علیؑ نے رسول اللہ کے لفظ ٹٹلنے سے انکار کیا تو آپ نے اس کی جگہ ان سے پوچھ کر یہ لفظ اپنے ہاتھ سے مشاویئے اور پھر ان سے یا کسی دوسرے کاتب سے ابن عبد اللہ کے الفاظ لکھوا دیتے ہوں۔ دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر صلح نامہ دو کاتب لکھ رہے تھے۔ ایک حضرت علیؑ، دوسرے محمد بن مسلمہ رقیع الباری، جلد ۵، ص ۲۱۶۔ اس لیے یہ امر بعید نہیں ہے کہ جو کام ایک کاتب نے کیا تھا وہ دوسرے کاتب سے لیا گیا ہو۔

دوسری روایت جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خزانہ ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے مجاہد سے ابن ابی شیبہ اور عمر بن شیبہ نے نقل کی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں کہ ما مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حتی کتب وقرأ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے تھے، لیکن اول تریہ سنداً بہت ضعیف روایت ہے، جیسا کہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں فضیلت الاصل لہ۔ دوسرے اس کی کمزوری تیل بھی واضح ہے کہ اگر حضور نے فی الواقع بعد میں پڑھنا لکھنا سیکھا ہوتا تو یہ بات مشہور ہو جاتی، بہت سے صحابہ اس کو روایت کرنے اور یہ بھی معلوم ہوتا کہ حضور نے کس شخص یا کس شخص سے یہ تعلیم حاصل کی تھی لیکن سوائے ایک عون بن عبد اللہ کے، جن سے مجاہد نے یہ بات سنی، اور کوئی شخص اسے روایت نہیں کرتا۔ اور یہ عون بھی صحابہ نہیں بلکہ تابعی ہیں جنہوں نے قطعاً یہ نہیں بتایا کہ انہیں کس صحابی یا کس صحابیوں سے اس واقعہ کا علم ہوا نظر ہے کہ ایسی کمزور روایتوں کی بنیاد پر کوئی ایسی بات قابل تسلیم نہیں ہو سکتی جو مشہور و معروف واقعات کی تردید کرتی ہو۔

کیا گیا ہے لیکن اُس کی اُمیت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی خیابا دہانی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خاص بہت دھرتی کے سوا اس کی نبوت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی وجہ میں بھی محمول کہا جاسکتا ہو۔

ایک آدمی کا قرآن عیسیٰ کتاب پیش کرنا اور یکایک اُن غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تاریخ کے آثار کبھی کسی کے مشاہدے میں نہیں آتے، یہی دانش و توحش رکھنے والوں کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں۔ دنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جاسکے، آدمی اس کے اپنے ماحول میں اُن اسباب کا پتہ چلا سکتا ہے جو اس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے لیے اس کو تیار کرنے میں کارفرما تھے۔ اُس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک کھل مناسبت پائی جاتی ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مظاہرہ اُن کا کوئی ماخذ آپ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں نہ اس وقت کے عربی معاشرے میں، اور نہ گندومستیس کے جن ممالک سے عرب کے تعلقات تھے اُن کے معاشرے میں، کہیں زور و راز سے بھی وہ غنما ضرور اُٹھو کر نہیں نکالے جاسکتے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر یہاں فرمایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں بلکہ ہیئت سی روشن نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر نہ آتی ہو تو نہ آتے، مگر جو لوگ علم رکھنے والے ہیں وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو سکتے ہیں کہ یہ نشانی ایک پیغمبری کی ہو سکتی ہے۔

<p>یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ اناری گئیں اس شخص پر نشانیاں اس کے رب کی طرف سے کہہ کر نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں اور میں صرف خبردار کرتے والا ہوں کھول کھول کر۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی، کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر نشانی جاتی ہے، درحقیقت اس</p>	<p>وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْكَ آيَاتٌ مِّن رَّبِّكَ لَعَلَّ نَسَاءَ الْكَاذِبَاتِ عِنْدَكَ أَتَمَّ وَ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَأَوَّلُكُمْ يَكْفِيهِمْ إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ عَرَبًا مِّن فِي ذَالِكَ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ</p>
---	--

نے نبوت محمدی کا عقلی ثبوت، میں بھی یہ استدلال شامل ہے مگر وہاں قرآنی استدلال کو سامنے لے کر ایک حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ اس پر اس موقع پر قرآن اُن مفسرین کو بھی جواب دے رہا ہے جو حضور کی نبوت کو تسلیم کرنے کی شرط کے طور پر غیر عقلی نشانی یعنی معجزہ طلب کرتے تھے۔

داعلیٰ کی موت : ۵۰-۵۱ میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو

ایمان لائے ہیں :

یعنی اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن عظیمی کتاب کا نازل ہونا، کیا یہ بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ تمہاری رشتہ پر یقین لائے کے لیے یہ کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے ان کے لیے وہ معجزے تھے مگر یہ معجزہ تو سر وقت تمہارے سامنے ہے، تمہیں کسے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے، تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔

نبوت سے پہلے کی زندگی سے استشہاد

فَقَدْ بَشَّرْنَا بِبَيْتِكَ مُحَمَّدًا مِنْ قَبْلِهِ

”آخر اس سے پہلے میں ایک عظیم لوگوں کے درمیان“

(یونس - ۱۴) گزار چکا ہوں“

یہ ایک زبردست دلیل ہے مشرکین قریش کے اس خیال کی تردید میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے نکل کر خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مستف نہیں ہیں بلکہ یہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو بھر دُور کی چیز تھے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو ان کے سامنے کی چیز تھی۔ آپ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گزارے تھے، ان کے شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کی آگلیوں کے سامنے آپ کا بچپن گزرا، جوان ہوئے، اور پھر عمر کو پہنچا رہنا سہنا، طمانینا، مین دین، شادی بیاہ، غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انہی کے ساتھ تھا اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے چھپا ہوا نہیں تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔ آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل حیاں تھیں۔ آپ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا۔

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے کوئی ایسی تعلیم، تربیت اور صحبت نہیں پائی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوئیں جن کے چٹھے پکا ایک دعوے سے نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے بھی آپ ان مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے، ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے، جو اب قرآن کی ان پے درپے سورتوں میں زیر بحث آ رہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس سال کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گھر سے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی باتوں اور آپ کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی ہے کہ وہ عظیم الشان دعوت کی تہیہ کہا جاسکتا ہو جو آپ نے اپنا ایک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی، یہ اس باطنی امر کا ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپ کے اندر آتی ہوئی چیز ہے۔ اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی

عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تک کے بعض چالاک لوگوں نے جب خود محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپ کے داغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کار انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمد کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے۔ لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے بھی زیادہ لغو تھی۔ کیونکہ مکہ تو درکنار پورے عرب میں کوئی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر اتنی نگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مستفہ ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کیسے رہ سکتا ہے؟

دوسری بات جو آپ کی سابق زندگی میں نمایاں تھی، وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے اوصاف میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ کی سیرت میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اتنے ہوا ہے۔ برعکس اس کے جن جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پیش آیا تھا وہ آپ کو ایک نہایت سچے، بے داغ اور قابل اعتماد (امین)، انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ ہی سال پہلے تمیر کعبہ کے سلسلہ میں وہ مشہور واقعہ پیش آچکا تھا جس میں عجزِ انور کو نصب کرنے کے معاملہ پر قریش کے مختلف خاندان جھگڑا پڑے تھے اور آپس میں طے ہوا تھا کہ کل بچ پیدا شخص جو حرم میں داخل ہوگا اسی کو پانچ مان لیا جائے گا۔ دوسرے روز وہ شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو وہاں داخل ہوئے۔ آپ کو دیکھتے ہی سب لوگ پکار اٹھے ہذا لامین رضینا، ہذا محمدؐ یہ بالکل راست باز آدمی ہے، ہم اس پر راضی ہیں۔ یہ تو محمدؐ ہے، اس طرح آپ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلہ قریش سے بھرے مجمع میں آپ کے امین ہونے کی شہادت سے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ، جعل اور فریب سے کام نہ لیا تھا، وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان جعل فریب لے کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اپنے ذہن کے کچھ باتیں تصنیف کیں اور ان کو پورے زور و شجاعت کے ساتھ خدا کی طرف منسوب کرنے لگا۔

وَ كَذَابٌ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ ذُجْحًا  
اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے حکم سے ایک  
مِنْ أَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا  
روحِ تہاری طرف وحی کی تمہیں کچھ بتا تھا کہ  
الْكِتَابِ وَلَا الْإِنَّمَانِ - (المشوری: ۵۲)  
کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے۔

نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضور علیہ السلام کے ذہن میں یہ تصور تک نہ آیا تھا کہ آپ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے یا ملنی چاہیے۔ بلکہ آپ ہرے سے کتب آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اسی طرح آپ کو اللہ پر ایمان تو ضرور تھا مگر یہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملا کر اور نبوت اور کتب الہی اور آخرت کے

متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفار مکہ سے بھی چھپی ہوئی نہ تھیں بلکہ مفصلہ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ نہ اسے سکتا تھا کہ اس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کسی حضور کی زبان سے کتاب الہی کا ذکر سنا ہو یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہو کہ لوگوں کو تھکان نکلان چیزوں پر ایمان لانا چاہیے ظاہر رہتا ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے خود نبی بن بیٹھنے کی تیاری کر لیا ہو تو اس کی رسالت کو کبھی نہیں ہو سکتی کہ چالیس سال تک اس کے ساتھ شب و روز کا میل جول رکھنے والے اس کی زبان سے کتاب اور ایمان کا نفاذ تک نہ ہوتی اور چالیس سال کے بعد یکایک وہ انہی موضوعات پر وضو آں و حار تقریریں کرنے لگے۔

وَمَا كُنْتُمْ تُرْجَوْنَ أَن يُبَلِّغَ إِلَيْكُمْ  
الْكِتَابَ إِلَّا رَحْمَةً مِنَّا قَلِيلًا  
فَلَا تَكْفُرُوا بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی، یہ تو جس تمہارے رب کی ہرمانی سے تم پر نازل ہوئی ہے، پس تم کانٹوں کے مددگار نہ بنو۔

(القصص - ۱۸۶)

یہ بات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت میں پیش کی جا رہی ہے جس طرح موسیٰ علیہ السلام بائبل بچھرتے تھے کہ انہیں نبی بنایا جانے والا ہے اور ایک عظیم الشان مٹھی پر وہ مامور کیے جانے والے ہیں، ان کے حاشیہ خیال میں بھی اس کا ارادہ یا خواہش تو درکنار اس کی توقع تک بھی نہ گزری تھی، بس ایک براہ چلنے انہیں کھینچ بلایا گیا اور نبی بنا کر وہ حیرت انگیز کام ان سے لیا گیا جو ان کی سابق زندگی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا تھا، ٹھیک ایسا ہی معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی پیش آیا، مکہ کے لوگ خود جانتے تھے کہ غار حرا سے تین روز آپ نبوت کا پیغام لے کر آتے ہیں، اس سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی کو کچھ بھی، آپ کے مسائل کے متعلق کیا نئی بات چیت کیا تھی، آپ کی گفتگو کچھ موضوعات کیا تھے، آپ کی دلچسپیاں اور سرگرمیاں کس نوعیت کی تھیں، بیڑی زندگی صداقت، دیانت، امانت اور پاکبازی سے لبریز ضرور تھی۔ اس میں اتہائی شرافت، امن پسندی، پاس ہمد، ادائے حقوق اور خدمت خلق کا رنگ بھی غیر معمولی شان کے ساتھ نمایاں تھا، مگر اس میں کوئی چیز ایسی موجود نہ تھی جس کی بنا پر کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ خیالی گزرتا ہو کہ یہ نیک بندہ کل نبوت کا دعویٰ کرنے لگے والا ہے۔ آپ سے قریب ترین رابطہ ضبط رکھنے والوں میں، آپ کے رشتہ داروں اور مہربانوں اور دوستوں میں کوئی شخص یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ آپ پہلے سے نبی بننے کی تیاری کر رہے تھے۔ کسی نے ان مسائل اور موضوعات کے متعلق کبھی ایک نفاذ تک آپ کی زبان سے نہ سنا تھا جو غار حرا کی اُس انقلابی ساعت کے بعد کیا ایک آپ کی زبان پر جاری ہونے شروع ہو گئے۔ کسی نے آپ کو وہ مخصوص زبان اور وہ الفاظ اور اصطلاحات استعمال کرنے نہ سنا تھا جو اچانک قرآن کی صورت میں لوگ آپ سے سننے لگے۔ کبھی آپ دعا کہنے کو کہتے نہ ہوئے تھے۔



کبھی کوئی دعوت اور تحریک کے لئے نہ اٹھے تھے۔ بلکہ کبھی آپ کی کسی سرگرمی سے یہ گمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ آپ نے اجتماعی مسائل کے حل، یا مذہبی اصلاح یا اخلاقی اصلاح کے لیے کوئی کام شروع کرنے کی فکر میں ہیں اس انقلابی سماعت سے ایک دن پہلے تک آپ کی زندگی ایک ایسے تاجر کی زندگی نظر آتی تھی جو سید سے سادہ، جائز طریقوں سے اپنی روزی کما رہا ہے، اپنے بال بچوں کے ساتھ نفسی خوشی رہتا ہے، ہمالوں کی ترانے، غزلیوں کی مدد اور شہزادوں سے حسن سلوک کرتا ہے، اور کبھی کبھی عبادت کے لیے خلوت میں جا بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کا ایک ایک ایک عالمگیر نازلہ ڈال دینے والی خطابت کے ساتھ اٹھنا، ایک انقلاب اگنیر دعوت شروع کر دینا، ایک نرالا ٹریچر پیدا کر دینا، ایک مستقل فلسفہ حیات اور نظام فکر و اخلاق و تمدن کے سامنے آجانا، اتنا بڑا تغیر ہے جو انسانی نفسیات کے لحاظ سے کسی بناوٹ اور تیاری اور ارادی کوشش کے نتیجے میں قطعاً ممکن نہیں سکتا۔ اس لیے کہ ایسی ہر کوشش اور تیاری حلال تاریخی ارتقاء کے مراحل سے گزرتی ہے اور یہ مراحل ان لوگوں سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتے جن کے درمیان آدمی مشابہ روز گزارتا ہو۔ اگر آنحضرت کی زندگی ان مراحل سے گزری ہوتی تو مکہ میں سینکڑوں زبانیں یہ کہنے والی ہوتیں کہ ہم نہ کہتے تھے، یہ شخص ایک دن کوئی بڑا دعویٰ لے کر اٹھنے والا ہے۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ گفتار گمراہ نے آپ پر ہر طرح کے اعتراضات کیے، مگر یہ اعتراضات کرنے والا ان میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تھا۔

پھر یہ بات کہ آپ خود بھی نبوت کے خواہش مند، یا اس کے لیے متوقع اور منتظر نہ تھے، بلکہ پوری بے خبری کی حالت میں اچانک آپ کو اس معاملہ سے سابقہ پیش آگیا، اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے جو احادیث میں آغاز وحی کی کیفیت کے متعلق منقول ہوا ہے۔ جبریلؑ سے پہلی ملاقات اور سورہ علق کی ابتدائی آیات کے نزل کے بعد آپ غار حراء سے کاپٹے اور لرزتے ہوئے گھر پہنچے ہیں۔ گھر والوں سے کہتے ہیں کہ "مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ" کچھ دیر کے بعد جب ذرا خوفِ زندگی کی کیفیت دور ہوئی ہے تو اپنی رفیقِ زندگی کو سارا ماجرا سنا کر کہتے ہیں کہ "مجھے اپنی جان کا ڈر ہے" وہ فوراً جواب دیتی ہیں "ہرگز نہیں۔ آپ کو اللہ کبھی رنج میں نہ ڈالے گا۔ آپ تو قرابت داروں کے حق ادا کرتے ہیں۔ بے کس کو سہارا دیتے ہیں۔ بے زر کی دستگیری کرتے ہیں۔ ہمالوں کی ترانے کہتے ہیں۔ ہر کارِ غیر میں مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں" پھر وہ آپ کو لے کر قریبن نزل کے پاس جاتی ہیں جو ان کے چچا زاد بھائی اور اہل کتاب میں سے ایک زوی علم اور راسخ آدمی تھے۔ وہ آپ سے سارا واقعہ سننے کے بعد بلا تامل کہتے ہیں کہ "یہ جو آپ کے پاس آیا ہے وہی ناموس (کارِ خاص پر مامور فرشتہ) ہے جو موسیٰ کے پاس آتا تھا۔ کاش میں جبران ہوتا اور اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قدم آپ کو نکال دے گی" آپ پر چھتے ہیں "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟" وہ جواب دیتے ہیں "ہاں، کوئی شخص ایسا نہیں گزرا کہ وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ لاسے ہیں اور لوگ اس کے دشمن نہ ہو گئے ہوں"

پر پڑا واقعہ اس حالت کی تصویر کشی کرتا ہے جو بالکل فطری طور پر ایک خلالت توفیق ایک انتہائی غیر معمولی تجربہ پیش آجانے سے کسی سیدھے سادھے انسان پر طاری ہو سکتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے نبی بننے کی فکر میں ہوتے، اپنے متعلق یہ سوچ رہے ہوتے کہ مجھ جیسے آدمی کو نبی ہونا چاہیے، اور اس انتظار میں مرتبے کر کے اپنے ذہن پر زور ڈال رہے ہوتے کہ کب کوئی فرشتہ آئے گا اور میرے پاس پیغام لانا ہے، تو غار خراہ والا معاملہ پیش آتے ہی آپ خوشی سے اچھل پڑتے اور بڑے دم دعوے کے ساتھ پہاڑ سے اتر کر سیدھے اپنی قوم کے سامنے پہنچتے اور اپنی نبوت کا اعلان کر دیتے۔ لیکن اس کے برعکس یہاں حالت یہ ہے کہ جو کچھ دکھا تھا اس پر شہد رہ جاتے ہیں، کانپتے اور لرزتے ہوتے گھر پہنچتے ہیں، لحاف اوڑھ کر لیٹ جاتے ہیں، دروازے ٹھیرا ہے تو چری کر چکے سے بتاتے ہیں کہ آج عار کی انتہائی میں مجھ پر یہ حادثہ گزرا ہے، معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے، مجھے اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی یہ کیفیت نبوت کے کسی اُمیدوار کی کیفیت سے کس قدر مختلف ہے۔

پھر بیوی سے بڑھ کر شوہر کی زندگی، اس کے حالات اور اس کے خیالات کو کون جان سکتا ہے؟ اگر ان کے تجربے میں پہلے سے یہ باتی ہوئی ہوتی کہ میں نبوت کے اُمیدوار میں اور ہر وقت فرشتے کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں، تو ان کا جواب ہرگز وہ نہ ہوتا جو حضرت خدیجہ نے دیا۔ وہ کہتیں کہ میں گھبراتے کیوں ہو جس چیز کی مدتوں سے تمنا تھی وہ مل گئی، چلو، اب سیری کی دوکان چکاؤ، میں بھی نذرانے سنبھالنے کی تیاری کرتی ہوں لیکن وہ پندرہ برس کی رفاقت میں آپ کی زندگی کا جو رنگ دیکھ چکی تھیں اس کی بنا پر انہیں یہ بات سمجھنے میں ایک لمحہ کی دیر بھی نہ لگی کہ ایسے نیک اور بے لوث انسان کے پاس شیطان نہیں آسکتا، نہ اللہ اس کو کسی بُری آزمائش میں ڈال سکتا ہے، اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ سراسر حقیقت ہے۔

ادریبی معاملہ و زقرین زُفَل کا بھی ہے۔ وہ کوئی باہر کے آدمی نہ تھے بلکہ حضور کی اپنی برادری کے آدمی اور قریب کے رشتے سے برادر نسبتی تھے۔ پھر ایک ذی علم عیسائی ہونے کی حیثیت سے نبوت اور کتاب اور وحی کو بناوٹ اور تصنیع سے تمیز کر سکتے تھے۔ عمر میں کئی سال بڑھے ہونے کی وجہ سے آپ کی پوری زندگی بچپن سے اُس وقت تک ان کے سامنے تھی۔ انہوں نے بھی آپ کی زبان سے جبرائیل کی سرگزشت سنتے ہی فوراً کہہ دیا کہ یہ آنے والا یقیناً وہی فرشتہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر وحی لانا تھا۔ کیونکہ یہاں بھی وہی صورت پیش آئی تھی جو موسیٰ کے ساتھ پیش آئی تھی کہ ایک انتہائی پاکیزہ سیرت کا سیدھا سادھا انسان بالکل خالی الذہن ہے، نبوت کی فکر میں رہنا تو درکنار، اس کے حصول کا تصور تک اس کے حاشیہ خیال میں کبھی نہیں آیا ہے، اور اچانک وہ پورے حواس کی حالت میں غلامیہ اس تجربے سے رو چار ہوتا ہے۔ اسی چیز نے اُن کو دو اور دو چار کی طرح بلا انکی تامل اس نتیجہ تک پہنچا دیا کہ میں کوئی قریب نفس یا شیطان کی رشتہ نہیں ہے، بلکہ اس سچے انسان نے اپنے کسی

ارادے اور خواہش کے بغیر جو کچھ دیکھا ہے وہ دراصل حقیقت ہی کا مشاہدہ ہے۔  
 یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ایسا یقین ثبوت ہے کہ ایک حقیقت پسند انسان مشکل ہی سے اس کا  
 انکار کر سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں متعدد مقامات پر اسے دلیل نبوت کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ  
 یونس میں فرمایا:

قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُمْ عَلَيْكُمْ  
 وَلَا أَدْرَأْسَكُمْ بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ  
 عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ۔  
 (آیت: ۱۶)

اُسے ہی ان سے کہو کہ اگر اللہ نے یہ نہ چاہا ہوتا  
 تو میں کبھی یہ قرآن تمہیں نہ سنانا بلکہ اس کی نوبت تک  
 وہ تم کو نہ دیتا۔ آخر میں اس سے پہلے ایک عمر  
 تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم اتنی بات  
 بھی نہیں سمجھتے ہو۔

اور شوریٰ میں فرمایا:

مَا كُنْتُ نَذِيرٌ مَّا الْكُتُبُ وَلَا  
 الْإِيمَانُ وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا  
 نَقْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِمَّنْ عِبَادِنَا  
 (آیت: ۱۵۲)

اُسے ہی تم تو جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی  
 ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے، مگر ہم نے اس وحی کو ایک  
 نور بنا دیا جس سے ہم رہنمائی کرتے ہیں اپنے بندوں  
 میں سے جن کی چاہتے ہیں۔

مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، یونس، حاشیہ ۲۱۔ جلد سوم، عنکبوت: ۸۸ تا ۹۲،  
 جلد چہارم، الشوریٰ، حاشیہ ۸۳۔ ۸۴۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی اور صحابہ کرام کی زندگیوں پر آپ کی تعلیم و تربیت کے حیرت انگیز اثرات  
 اور وہ بلند پایہ عناصر جو قرآن میں ارشاد ہو رہے تھے یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص  
 انبیاء کے احوال اور کتب آسمانی کی طرف سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرت کی نبوت میں شک  
 کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

رَسُوْلٌ مِّنْ اٰتِهٖ يَسْئَلُوْا حٰدِثًا  
 مَّا هُوَ فِیْهَا كَمَبِّ قَبِيْلَةٍ۔ (البقرہ: ۱۲۹)

یعنی اللہ کی طرف سے ایک رسول جو آپ صلی  
 پر وہ کہہ سنا ہے جن میں بالکل راست اور درست  
 تصویریں نکلی ہوئی ہوں۔

یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذات خود ایک دلیل روشن کہا گیا ہے، اس لیے کہ آپ کی نبوت سے پہلے  
 کسی اور نبی کی زندگی، آپ کا اُمتی ہونے کے باوجود قرآن جیسی کتاب پیش کرنا، آپ کی تعلیم اور صحبت کے اثر سے

ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں غیر معمولی انقلاب رونما ہو جانا، آپ کا باکل معقول عقائد، نہایت مستحضری عبادت کمال درجہ کے پاکیزہ اخلاق، اور انسانی زندگی کے ایسے بہترین اصول و احکام کی تعلیم دینا، آپ کے قول اور عمل میں پوری پوری مطابقت کا پایا جانا، اور آپ کا ہر قسم کی فراحتوں اور مخالفتوں کے مقابلے میں انتہائی اولوالعزمی کے ساتھ اپنی دعوت پر ثابت قدم رہنا، یہ ساری باتیں اس بات کی کھلی علامات تھیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

**قرآن ایک معجزانہ کلام اور نبوت کی دلیل ہے**

مَنْزِيْلٌ اَنْكَبِرٌ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَبِّ الْغَلْبِيْنَ ؕ اَمْ يَكْفُرُوْنَ اَفْتَرَدُوْا  
بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَالسَّجْدَةُ: (۲-۱)

اس کتاب کی منزل بلاشبہ رب الغلبین کی طرف سے ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں بلکہ یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے بلکہ مزید براں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لا ریب فیہ ابے شک یہ خدا کی کتاب ہے۔ اس کے منزل من اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس تاکید ہی فقرے کو اگر نزول قرآن کے واقعاتی پس منظر اور خود قرآن کے سیاق و سباق میں رکھا کر دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے، اور یہ دلیل کلمہ عظیمہ کے باشندوں سے پرشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی ان کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی زندگی بھی اور اس کے بعد کی بھی۔۔۔۔۔ وہ اس کتاب کی زبان اور طرز بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرز بیان میں بالکل فرق پاتے تھے اور اس بات کو براہ راست جانتے تھے کہ ایک ہی شخص کے دو اشعار اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہل زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ ان کے سامنے ادیب اور شاعر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ ان کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور اس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے، اور جو پاکیزہ مشاہین اس کلام میں پیش کیے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ انہیں اس کتاب میں، اور اس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دور دور بھی اُس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی مجھوٹے مدعی کا کام

۱۔ قرآن کو میں چیلنج کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اِنَّا نَحْنُ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ؕ وَهُوَ اس کی معجزانہ حیثیت کو نمایاں کرتا ہے اور اس چیلنج کے جواب میں عاجز رہ کر مخالفین نے یہ زبان سکوت پر اقرار کر لیا کہ یہ کلام انسانی کا و شوق کا حاصل نہیں ہے۔

قرآن کی اس معجزانہ اور فوق الانسانی حیثیت کو اللہ تعالیٰ نے حضور کی نبوت کی دلیل قرار دیا ہے۔ (ترجمہ)

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اور بخلاف کلمہ بھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خود وہ بین لگا کر بھی اس امر کی نشان دہی نہیں کر سکتے تھے کہ شہوت کا یہ دعویٰ کون  
 جوہر ہی ارفع علیہ و تکبر اپنی نزالت کے لیے با اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم یا قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں  
 اور اس کا ہم میں ان کی اپنی کیا خواہش پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف ان کی قوم کے لیے  
 لگ کر کھڑے رہتے ہیں اور اس سے دلالت ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ یہ ساری باتیں مل کر  
 کہ خود دلیل دعویٰ یعنی ہونی نہیں اسی لیے اس میں متکثر نہیں ہو کتنا باہکل کا قیاس کرنا کہ اس کتاب کا ریب الصلیہ میں کی طرف  
 سے ماہر ل شہدہ ہونا بہر شک و شبہ سے بالائز ہے۔

# بعثت سرِ عالم کے متعلق توراہ و انجیل کی پیشگوئیاں

حضرت عیسیٰ کا ایک اہم قول

وَ اِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ بَنِيَّ  
اِسْرَائِيْلَ اِنِّي مَرْسُوْلٌ اِلَيْكُمْ  
مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ  
(النصف : ۱۲)

اور یاد کرو عیسیٰ ابن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی  
تھی کہ ” اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف بھیجا ہوا  
رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اُس توراہ  
کی جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے۔“

اس فقرے کے تین معنی ہیں اور تینوں صحیح ہیں :

ایک یہ کہ میں کوئی الگ اور نرالا دین نہیں لایا ہوں، بلکہ وہی دین لایا ہوں جو موسیٰ علیہ السلام لائے تھے۔  
میں توراہ کی تردید کرتا ہوں نہیں آیا ہوں بلکہ اس کی تصدیق کر رہا ہوں، جس طرح ہمیشہ سے خدا کے رسول اپنے  
سے پہلے آئے ہوئے رسولوں کی تصدیق کرتے رہے ہیں لہذا کوئی وجہ نہیں کہ تم میری رسالت کو تسلیم کرنے میں تامل کرو  
دوسرے معنی یہ ہیں کہ میں ان بشارتوں کا مصداق ہوں جو میری آمد کے متعلق توراہ میں موجود ہیں لہذا بھانسنے  
اس کے کہ تم میری مخالفت کرو، تمہیں تو اس بات کا خیر مقدم کرنا چاہیے کہ جس کے آنے کی خبر کھلے انبیاء نے دی تھی وہ  
آگیا۔

اور اس فقرے کو بعد والے فقرے کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے تیسرے معنی یہ نکلتے ہیں کہ میں اللہ کے رسول احمد  
صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق توراہ کی وہی بشارت کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی ان کے آنے کی بشارت دیتا  
ہوں۔ اس تیسرے معنی کے لحاظ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس قول کا اشارہ اس بشارت کی طرف ہے جو رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے دی تھی۔

توراہ کی صریح پیشگوئی

اُس میں وہ فرماتے ہیں :

”خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا۔ تم اس کی سننا۔ یہ تیری اُس درخواست کے مطابق ہو گا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن ۶ باب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہوتا کہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے مُتے میں لوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام کہے کہے گا نہ سنے گا تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔“ (سنن ترمذی، باب ۱۸ - آیات ۱۵-۱۹)

یہ تورات کی صریح پیشین گوئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہو سکتی۔ اس میں حضرت موسیٰ اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سننا رہے ہیں کہ میں تیرے لیے تیرے میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کے ”بھائیوں“ سے مراد خود اسی قوم کا کوئی قبیلہ یا خاندان نہیں ہو سکتا بلکہ کوئی دوسری ایسی قوم ہی ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اُس کا قریبی نسلی رشتہ ہو۔ اگر مراد خود بنی اسرائیل میں سے کسی نبی کی آمد ہوتی تو الفاظ یہ ہوتے کہ میں تمہارے لیے خود تم ہی میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ لہذا بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد محالہ بنی اسرائیل ہی ہو سکتے ہیں جو حضرت ابراہیم کی اولاد ہونے کی بنا پر اُن کے نسبی رشتہ دار ہیں۔ مزید برآں اس پیشین گوئی کا مصداق بنی اسرائیل کا کوئی نبی اس وجہ سے بھی نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں کوئی ایک نبی نہیں، بہت سارے نبی آتے ہیں جن کے ذکر سے بائبل بھری پڑی ہے۔

دوسری بات اس بشارت میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جو نبی برپا کیا جائے گا وہ حضرت موسیٰ کے مانند ہو گا اس سے مراد ظاہر ہے کہ شکل و صورت یا حالات زندگی میں مشابہ ہونا تو نہیں ہے، کیونکہ اس لحاظ سے کوئی فرد بھی کسی دوسرے فرد کے مانند نہیں ہوا کرتا۔ اور اس سے مراد محض وصفت نبوت میں مماثلت بھی نہیں ہے، کیونکہ یہ وصفت اُن تمام انبیاء میں مشترک ہے جو حضرت موسیٰ کے بعد آتے ہیں، اس لیے کسی ایک نبی کی یہ خصوصیت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس وصفت میں اُن کے مانند ہو۔ پس ان دونوں پہلوؤں سے مشابہت کے خارج از بحث ہو جانے کے بعد کوئی اور وجہ مماثلت جس کی بنا پر آئے والے ایک نبی کی تخصیص قابل فہم ہو، اس کے سوا نہیں ہو سکتی کہ وہ نبی ایک مستقل شریعت لانے کے اعتبار سے حضرت موسیٰ کے مانند ہو۔ اور یہ خصوصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ آپ سے پہلے بنی اسرائیل میں جو نبی بھی آئے تھے وہ شریعت موسوی کے پیرو تھے، ان میں سے کوئی بھی ایک مستقل شریعت لے کر نہ آیا تھا۔

اس تعبیر کو مزید تقویت پیشین گوئی کے ان الفاظ سے ملتی ہے کہ ”یہ تیری (یعنی بنی اسرائیل کی) اس درخواست

کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے جمع کے دن حورب میں کی تھی کہ محمد کو نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر  
 ٹھنٹی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہوتا کہ میں مر نہ جاؤں۔ اور خداوند نے محمد سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں  
 ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اراہا حکام اُس کے  
 مُنہ میں ڈالوں گا۔ اس عبارت میں حورب سے مراد وہ پہاڑ ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پہلی مرتبہ حکام  
 شریعت دیتے گئے تھے۔ اور بنی اسرائیل کی جس درخواست کا اس میں ذکر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اُنہ  
 اگر کوئی شریعت ہم کو دی جائے تو ان خورنک حالات میں نہ دی جائے جو حورب پہاڑ کے دامن میں شریعت  
 دیتے وقت پیدا کیے گئے تھے۔ اُن حالات کا ذکر قرآن میں بھی موجود ہے اور بائبل میں بھی۔ دیکھئے ہر البقرہ،  
 آیات ۵۵-۵۶-۶۳۔ الاعراف، آیات ۱۵۵-۱۶۱۔ بائبل، کتاب خروج، ۱۹: ۱۶-۱۸۔ اس کے جواب میں  
 حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری یہ درخواست قبول کر لی ہے، اُس کا ارشاد ہے کہ  
 میں اُن کے لیے ایک ایسا نبی برپا کروں گا جس کے مُنہ میں میں اپنا کلام ڈالوں گا یعنی آئندہ شریعت دینے کے وقت وہ خود کلامت پیدا  
 کیے جائیں گے جو حورب پہاڑ کے دامن میں پیدا کیے گئے تھے۔ بلکہ اب جو بنی اس منصب پر مامور کیا جائے گا اُن  
 کے مُنہ میں بس اللہ کا کلام ڈالا جائے گا اور وہ اسے خلقِ نداد کو سنا دے گا۔ اس تصریح پر غور کرنے کے بعد کیا  
 اس امر میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اس کا مسدق کوئی اور نہیں ہے۔ پھر  
 موسیٰ کے بعد مستقل شریعت صرف آپ ہی کو دی گئی، اس کے عطا کرنے کے وقت کوئی ایسا مجمع نہیں ہوا جیسا  
 حورب پہاڑ کے دامن میں بنی اسرائیل کا ہوا تھا اور کسی وقت بھی احکام شریعت دینے کے موقع پر وہ حالات پیدا  
 نہیں کیے گئے جو وہاں پیدا کیے گئے تھے۔

## انجیل میں نبوتِ محمدی کی بشارت

حضرت عیسیٰ نے نبوتِ محمدی کی جو بشارت دی تھی اس کا ذکر قرآن میں یوں آیا ہے:

<p>اور یاد کرو عیسیٰ بن مریم کی وہ بات جو اس نے کہی          تھی کہ آسے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا          بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس          توراہ کی جو محمد سے پہلے آئی ہوئی موجود ہے اور          بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے          بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔</p>	<p>وَ اِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ          اِسْمٰرِئِلَ اِنِّیْ رَسُوْلٌ اَللّٰهِ وَ اٰتٰی کُمْ مِّمَّا          تَمَآیَنَ بَیْدَیْ مِنْ التَّوْرَةِ وَ مَسٰدِقًا          مِّنْ رَّسُوْلِیْ بَآئِنٍ مِّنْ بَعْدِ اِسْمٰهٖ اَحْمَدُ          فَکَلِمًا جَاہِلٌ مِّنْہُمْ بِالْحَقِّ یَنسُبُوْنَ قَالُوْا          هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ - راعنہ - ۶۷</p>
--	--



یہ قرآن مجید کی ایک بڑی اہم آیت ہے جس پر مخالفین اسلام کی طرف سے بڑی بے درستی کی گئی۔ یہ اور بڑی زبانیت مجربانہ سے بھی کام لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہ زوال اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف صاف نام ہے کہ آپ کی آمد کی بشارت تھی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس پر پیر کے ساتھ بحث کی جائے۔

### ۱۔ محمد اور احمد

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی احمد بتایا گیا ہے۔ احمد کے دو معنی ہیں، ایک، وہ شخص جو اللہ کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا ہو۔ دوسرے، وہ شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی گئی ہو، یا جو بندوں میں سب سے زیادہ قابل تعریف ہو۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ بھی حضور کا ایک نام تھا۔ مسلم اور ابوداؤد کی جیسی میں حضرت ابوسنی اشعری کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا کہ انا محمد وانا احمد، والحمد للہ... یہیں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور میں حاضر ہوں... اسی مضمون کی روایات حضرت مجتہدین عظیم سے امام مالک، بخاری، مسلم دارقطنی، ترمذی، اور نسائی نے نقل کی ہیں۔ حضور کا یہ اسم گرامی صحابہ میں معروف تھا، چنانچہ حضرت حسان بن ثابت کا شعر ہے:

صلی اللہ من یحیی بعرضہ والظہیون علی المبارک احمد

”اللہ نے اور اس کے عرش کے گرد چلنے لگتے ہوئے فرشتوں نے اور سب پاکیزہ ہستیوں نے بابرکت احمد“

پر درود بھیجا ہے“

تاریخ سے بھی یہ ثابت ہے کہ حضور کا نام مبارک صرف محمد ہی نہ تھا بلکہ احمد بھی تھا۔ عرب کا پورا ٹریبیچر اس بات سے خالی ہے کہ حضور سے پہلے کسی کا نام احمد رکھا گیا ہو۔ اور حضور کے بعد احمد اور غلام احمد اتنے لوگوں کے نام رکھے گئے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ زمانہ نبوت سے لے کر آج تک تمام امت میں آپ کا یہ اسم گرامی معلوم و معروف رہا ہے۔ اگر حضور کا یہ اسم گرامی نہ ہوتا تو اپنی قوموں کے نام غلام احمد رکھنے والوں نے آخر کس احمد کا غلام ان کو قرار دیا ہوتا؟

نہ علاوہ انہیں مجرمی طور پر بائبل میں جا بجا حضور کی بعثت کی پیشینگی کی مذکور ہے۔ اس سلسلے میں قرآن نے اجمالاً یہ بیان کر دیا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اذِکُمْ لَیْزُجْنِبْنَ اِلَیْکُمْ لَیْسَ لَکُمْ اِلَیْھِمْ فِیْ شَیْءٍ مِّنْ اَمْرِہُمْ شَیْءٌ۔ (سورۃ المائدہ - ۱۵۷)۔ مثال کے طور پر تورات اور انجیل کے حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں یہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق صاف اشارات موجود ہیں:

استغفار باب ۸، آیت ۵ تا ۱۹، متی، باب ۲۱، آیت ۲۳ تا ۲۷، یوحنا، باب ۱، آیت ۱۰ تا ۱۲، یوحنا، باب ۸، آیت ۱۵ تا ۱۷، وایت ۱۵ تا ۲۰، یوحنا، باب ۱۵، آیت ۲۵ تا ۲۷، یوحنا، باب ۱۶، آیت ۲۸ تا ۳۰، (مواقع و مرتبہ)

## ۲- حضرت مسیح، حضرت الیاس اور وہ نبی

انجیل پر چنانچہ اس بات پر گواہ ہے کہ مسیح کی آمد کے زمانے میں بنی اسرائیل تین شخصیتوں کے منتظر تھے۔ ایک مسیح، دوسرے الیاء (یعنی حضرت الیاس کی آمد ثانی)، اور تیسرے وہ نبی۔ انجیل کے الفاظ یہ ہیں:

اور یوحنا حضرت یحییٰ علیہ السلام، کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کامن اور لاہوی یوحنا کو اُس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے، تو اُس نے انکار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ فرمایا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا پھر کون ہے؟ کیا تو الیاء ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے اس سے کہا پھر تو ہے کون؟... اُس نے کہا میں بیاباں میں ایک چکر دانے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی ماہ سیدھی کرو... انہوں نے اس سے یہ سوال کیا کہ اگر تو مسیح ہے نہ الیاء نہ وہ نبی تو پھر تیسرے کیوں دیتا ہے؟ (باب ۱- آیات ۱۹-۲۵)

یہ الفاظ اس بات پر صریح دلالت کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت مسیح اور حضرت الیاس کے علاوہ ایک اور نبی کے منتظر تھے، اور وہ حضرت یحییٰ انہ تھے۔ اُس نبی کی آمد کا عقیدہ بنی اسرائیل کے ہاں اس قدر مشہور و معروف تھا کہ وہ وہ نبی کہہ دینا گویا اس کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بالکل کافی تھا، یہ کہنے کی ضرورت بھی نہ تھی کہ جس کی خبر تو راہ میں دی گئی ہے۔ مزید برآں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس نبی کی طرف وہ اشارہ کر رہے تھے اس کا آنا قطعی طور پر ثابت تھا، کیونکہ جب حضرت یحییٰ سے یہ سوالات کیے گئے تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی اور نبی آئے والا نہیں ہے، تم کس نبی کے متعلق پوچھ رہے ہو۔

## ۳- انجیل یوحنا کی عبارات

اب وہ پیشین گوئیاں دیکھیے جو انجیل یوحنا میں مسلسل باب ۴ سے ۶ تک منقول ہوئی ہیں:-

"اے میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بھیجے گا کہ اب تک تمہارے ساتھ رہے، یعنی رُوح حق جسے دُنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے اور تمہارے اندر ہے" (۱۴:۱۶-۱۷)

"میں نے یہ باتیں تمہارے ساتھ کہی ہیں لیکن مددگار یعنی رُوح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمہیں یاد دلائے گا" (۱۴:۲۵-۲۶)

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا

کچھ نہیں" (۱۴:۳۰-۳۱)

لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو تمہیں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کا راج

جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا“ (۲۶:۱۵)

”لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار

تمہارے پاس نہ آسکے گا لیکن اگر باقیوں کا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا“ (۴:۱۶)

”مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برواشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی

سچائی کا راج آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ

سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلالی ظاہر کرے گا۔ اس لیے کہ مجھ ہی سے

حاصل کر کے نہیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لیے میں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے

حاصل کرتا ہے اور تمہیں خبریں دیگا“ (۱۵:۲۶)

۴۔ مذکورہ عبارات کے مفہوم کا تعین

ان عبارتوں کے معنی متعین کرنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ مسیح علیہ السلام اور ان کے ہم عصر

اہل فلسطین کی عام زبان آرامی زبان کی وہ بولی تھی جسے سُرانی (Syriac) کہا جاتا ہے۔ مسیح کی پیدائش سے دو

ڑھائی سو برس پہلے ہی سلوٹی (Seleucid) اقتدار کے زمانے میں اس علاقے سے عبرانی زحمت جو

چکی تھی اور سُرانی نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اگرچہ سلوٹی اور پھر رومی سلطنتوں کے اثر سے یونانی زبان بھی اس علاقے

میں پھیل گئی تھی، مگر وہ صرف اُس طبقے تک محدود رہی جو سرکار و دربار میں رسائی پا کر، یارسانی حاصل کرنے کی خاطر یونانی

زود ہو گیا تھا فلسطین کے عام لوگ سُرانی کی ایک خاص بولی (Dialect) استعمال کرتے تھے جس کے لیے

اور تقطعات اور محاورات دمشق کے علاقے میں بولی جانے والی سُرانی سے مختلف تھے، اور اس ملک کے عوام یونانی

سے اس قدر ناواقف تھے کہ جب مسند میں یروشلم پر قبضہ کرنے کے بعد رومی جنرل تیتس (Titus) نے

اہل یروشلم کو یونانی میں خطاب کیا تو اس کا ترجمہ سُرانی زبان میں کرنا پڑا۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ اکثر

مسیح نے اپنے شاگردوں سے جو کچھ کہا تھا وہ لامحالہ سُرانی زبان ہی میں ہو گا۔

دوسری بات یہ جانی ضروری ہے کہ بائبل کی چاروں انجیلیں اُن یونانی بولنے والے عیسائیوں کی لکھی ہوئی

ہیں جو حضرت عیسیٰ کے بعد اس مذہب میں داخل ہوئے تھے۔ ان تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اقوال و اعمال

کی تفصیلات سُرانی بولنے والے عیسائیوں کے ذریعہ سے کسی تحریر کی صورت میں نہیں بلکہ زبانی روایات کی شکل میں

پہنچی تھیں اور ان سُرانی روایات کو انہوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے درج کیا تھا۔ ان میں سے کوئی انجیل بھی مسند

سے پہلے کی لکھی ہوئی نہیں ہے، اور انجیل کو جتنا تو حضرت عیسیٰ کے ایک صدی بعد غالباً ایشیائے کوچک کے شہر

افسوس میں لکھی گئی ہے۔ مزید یہ کہ ان انجیلوں کا بھی کوئی اصل نسخہ اُس یونانی زبان میں محفوظ نہیں ہے جس میں ابتداء میں لکھی گئی تھیں۔ مطبع کی ایجاد سے پہلے کے چھتے یونانی مسودات جگہ جگہ سے تلاش کر کے جمع کیے گئے ہیں ان میں سترہ کئی بچے، چوتھی صدی سے پہلے کا نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تین صدیوں کے دوران میں ان کے اندر کیا کچھ رد و بدل ہوئے ہوں گے۔ اس معاملہ کو جو چیز خاص طور پر مشتبه بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ عیسائی اپنی انجیلوں میں اپنی پسند کے مطابق دانستہ تغیر و تبدل کرنے کو بالکل جائز سمجھتے رہے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون "بائبل" کا مستفید لکھتا ہے:

"بائبل میں ایسے نمایاں تغیرات دانستہ کیے گئے ہیں جیسے مثلاً بعض پوری پوری عبارتوں کو کسی جگہ سے ماخذ سے لے کر کتاب میں شامل کر دینا۔۔۔۔۔ یہ تغیرات صرف کچھ ایسے لوگوں نے باقاعدہ کیے ہیں جنہیں اصل کتاب کے اندر شامل کرنے کے لیے کہیں سے کوئی مواد مل گیا، اور وہ اپنے آپ کو اس کا حجاز سمجھتے رہے کہ کتاب کو بہتر یا زیادہ مفید بنانے کے لیے اس کے اندر اپنی طرف سے اس مواد کا اضافہ کریں۔۔۔۔۔ بہت سے اضافے دوسری صدی ہی میں ہو گئے تھے اور کچھ نہیں معلوم کہ ان کا ماخذ کیا تھا۔"

اس سورت حال میں قطعی طور پر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انجیلوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جواوہال ہمیں ملتے ہیں وہ بالکل ٹھیک ٹھیک نقل ہوئے ہیں اور ان کے اندر کوئی رد و بدل نہیں ہوا ہے۔

تیسری اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی تقریباً تین صدیوں تک فلسطین کے عیسائی باشندوں کی زبان سُرائی رہی اور کہیں نویں صدی عیسوی میں جا کر عربی زبان نے اُس کی جگہ لی۔ ان سُرائی بولنے والے اول فلسطین کے ذریعہ سے عیسائی روایات کے متعلق جو معلومات ابتدائی تین صدیوں کے مسلمان علماء کو حاصل ہوئیں وہ اُن لوگوں کی معلومات کی بہ نسبت زیادہ معتبر مونی چاہئیں جنہیں سُرائی سے یونانی اور پھر یونانی سے لاطینی زبانوں میں ترجمہ در ترجمہ ہو کر یہ معلومات پہنچیں۔ کیونکہ مسیح کی زبان سے نکلے ہوئے اصل سُرائی الفاظ اُن کے ہاں محفوظ رہنے کے زیادہ امکانات تھے۔

۵۔ وہ دنیا کا سردار ہو گا

ان ناقابل انکار تاریخی حقائق کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے کہ انجیل یوحنا کی مذکورہ بالا عبارات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دے رہے ہیں جس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ وہ "دنیا کا سردار اور سرور عالم ہو گا" "ایزیک" رہے گا، "سچائی کی تمام راہیں دکھائے گا" اور خود اُن کی یعنی حضرت عیسیٰ کی "گواہی دینگا" یوحنا کی ان عبارتوں میں "روح القدس اور سچائی کی روح" وغیرہ الفاظ شامل کیے گئے ہیں جو نیکو کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے مگر اس کے باوجود ان سب عبارتوں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس آنے والے کی خبر دی گئی

ہے وہ کوئی روح نہیں بلکہ کوئی انسان اور خاص شخص ہے جس کی تعلیم عالمگیر، ہمہ گیر، اور قیامت تک باقی رہنے والی ہوگی۔ اس شخص خاص کے لیے اردو ترجمے میں ”مدگار“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور یونانی میں یونانی زبان کا ہر لفظ استعمال کیا گیا تھا، اس کے بارے میں عیسائیوں کو اصرار ہے کہ وہ Paracetus تھا مگر اس کے معنی متعین کرنے میں خود عیسائی علماء کو سخت زحمت پیش آتی ہے۔ اصل یونانی زبان میں Paracetus کے کئی معنی ہیں، کسی جگہ کی طرف بلانا، مدد کے لیے پکارنا، انذار و تنبیہ، ترغیب، اکسانا، انجا کرنا، دعانا، پیر، لفظ ہیلینی Helenic مفہوم میں یہ معنی دیتا ہے، تسلی دینا، تسکین بخشنا، بہت افزائی کرنا۔ بائبل میں اس لفظ کو جہاں جہاں استعمال کیا گیا ہے، ان سب مقامات پر اس کے کوئی معنی بھی ٹیک نہیں بیٹھتا۔ اور انجیل (Gospel) نے کہیں اس کا ترجمہ Consolator کیا ہے اور کہیں Director مگر دوسرے مفسرین نے ان دونوں ترجموں کو رد کر دیا کیونکہ اول تو یہ یونانی کلام کے لحاظ سے صحیح نہیں ہیں، دوسرے تمام عبارتوں میں جہاں یہ لفظ آیا ہے، یہ معنی نہیں چلتے۔ بعض اور مترجمین نے اس کا ترجمہ Teacher کیا ہے، مگر یونانی زبان کے استعمالات سے یہ معنی بھی اخذ نہیں کیے جاسکتے۔ تروویان اور اسٹائن نے لفظ Advocat کو ترجیح دی ہے۔

اور بعض اور لوگوں نے Assistant اور Comforter اور Counselor

وغیرہ الفاظ اختیار کیے ہیں (ملاحظہ ہو سائیکلو پیڈیا آف سائیکل ٹریجر، لفظ پیر نکلیٹس)۔

اب دلچسپ بات یہ ہے کہ یونانی زبان ہی میں ایک دوسرا لفظ Periclytos موجود ہے جس

کے معنی ہیں ”تعمیرت کیا ہوا“ یہ لفظ بالکل ”تعمیرت کا ہم معنی ہے، اور لفظ میں اس کے اور Paracletus

کے درمیان بڑی مشابہت پاتی جاتی ہے۔ کیا بعید ہے کہ جیسا کہ حضرات اپنی مذہبی کتابوں میں اپنی مرضی اور پسند کے مطابق بے تلفت و قور بدل کر لینے کے خوگر رہے ہیں انہوں نے یوحنا کی نقل کر وہ پیشین گوئی کے اس لفظ کو اپنے عقیدے کے خلاف پڑتا دیکھ کر اس کے اہل میں یہ زرا سا تغیر کر دیا۔ اس کی پڑتال کرنے کے ایسے یوحنا کی بھی ہوئی ابتدائی یونانی انجیل بھی کہیں موجود نہیں ہے جس سے یہ تحقیق کیا جاسکے کہ وہاں ان دونوں الفاظ میں سے اصل کونسا لفظ استعمال کیا گیا تھا۔

۶۔ تمخضاً

لیکن فیصلہ اس پر بھی موقوف نہیں ہے کہ یوحنا نے یونانی زبان میں دراصل کونسا لفظ لکھا تھا، کیونکہ بہر حال وہ بھی ترجمہ ہی تھا اور حضرت مسیح کی زبان، جیسا کہ اوپر ہم بیان کر چکے ہیں فلسطین کی سُرمانی تھی۔ اس لیے انہوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہوگا وہ لامحالہ کوئی سُرمانی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ اصل سُرمانی لفظ ہمیں ابن ہشام کی سیرت میں مل جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اسی کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی

یونانی لفظ کیا ہے۔ محمد بن اسحاق کے حوالے سے ابن ہشام نے یحییٰ بن یزید کی روایت کی انجیل کے باب ۱۵، آیات ۲۲ تا ۲۷ اور باب ۱۶ آیت ۱ کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے اور اس میں یونانی "فارقلیطس" کے بجائے سریانی زبان کا لفظ "مٹھختا" استعمال کیا گیا ہے پھر ابن اسحاق یا ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ "مٹھختا" کے معنی سریانی میں محمد اور یونانی میں برطیس ہیں (ابن ہشام، جلد اول، ص ۲۴۸)۔

اب دیکھیے کہ تاریخی طور پر فلسطین کے عام عیسائی باشندوں کی زبان نویں صدی عیسوی تک سریانی تھی۔ یہ علاقہ ساتویں صدی کے نصیب اول سے اسلامی مقبوضات میں شامل تھا۔ ابن اسحاق نے ۶۶۷ء میں اور ابن ہشام نے ۶۲۵ء میں وفات پائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان دونوں کے زمانے میں فلسطینی عیسائی سریانی بولتے تھے، اور ان دونوں کے لیے اپنے ملک کی عیسائی رعایا سے ربط پیدا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا۔ نیز اس زمانے میں یونانی بولنے والے عیسائی بھی لاکھوں کی تعداد میں اسلامی مقبوضات کے اندر رہتے تھے، اس لیے ان کے لیے یہ معلوم کرنا بھی مشکل نہ تھا کہ سریانی کے کس لفظ کا ہم معنی یونانی زبان کا کونسا لفظ ہے۔ اب اگر ابن اسحاق کے نقل کردہ نیز ہمے میں سریانی لفظ "مٹھختا" استعمال ہوا ہے، اور ابن اسحاق یا ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ عربی میں اس کا ہم معنی لفظ محمد اور یونانی میں برطیس ہے، تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسیٰ نے حضور کا نام مبارک لے کر آپ ہی کے آنے کی بشارت دی تھی، اور ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یونانی انجیل میں دراصل لفظ Pariclytos استعمال ہوا تھا جسے عیسائی حضرت

نے بعد میں کسی وقت Paracletus سے بدل دیا۔

### ۷۔ نجاشی کی شہادت

اس سے بھی قدیم تاریخی شہادت حضرت عبدالقدر بن مسعود کی یہ روایت ہے کہ مہاجرین ہمیشہ کو حب نجاشی اپنے دیار میں بلایا، اور حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں تو اس نے کہا: "مَرَحَبًا بِكَرْمٍ وَبِمَنْ جَعَلَهُ مِنْ عُنْدِي، اَشْهَدُ اَنْهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ اِنَّهُ الَّذِي نَجَّكَ مِنَ الْاِجْيِثِ وَ اِنَّهُ الَّذِي بَشَّرَكَ بِعِيسَى بْنِ مَرْيَمَ رَسُوْلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ" یعنی "مرحبا تم کو اور اس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آتے ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں، اور وہی ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ ابن مریم نے دی تھی" یہ قصہ احادیث میں خود حضرت جعفر اور اہم سنی علماء سے بھی منقول ہوا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک نبی کی پیشین گوئی کر گئے ہیں، بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس نبی کی ایسی صاف نشاندہی انجیل میں موجود تھی جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی نا اہل نہ ہوا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ نبی ہیں۔ البتہ اس روایت

سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰ کی اس بشارت کے متعلق نجاشی کا ذریعہ معلومات ہی انجیل پوچھتا تھی یا کوئی اور ذریعہ بھی اس کو جاننے کا اُس وقت موجود تھا۔

### ۸۔ انجیل برناباس

حقیقت یہ ہے کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بارے میں حضرت عیسیٰ کی پیشین گوئیوں کو نہیں خود حضرت عیسیٰ کے اپنے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جن کو کسی کلیسا نے معتبر و مستقیم انجیل (Canonical Gospels) قرار دینے رکھا ہے، بلکہ اس کا زیادہ قابل اعتماد ذریعہ وہ انجیل برناباس ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مشکوک اصحت Apocryphal کہتا ہے۔ عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ صدیوں تک یہ دنیا سے ناپید رہی ہے۔ سو لہذا یہ صدیوں میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکس (Sixtus) کے کتب خانے میں پایا جاتا تھا اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرنا ہوا۔ ۱۷۸۵ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں بیچ گیا۔ ۱۹۱۹ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیئر ٹیڈن پریس سے شائع ہو گیا تھا مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ کتاب تو اُس مذہب کی بڑی کاٹے دیے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے فائب کر دیتے گئے اور پھر کسی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔ ورنہ اگر ایک نسخہ اسی اطالوی ترجمہ سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارویں صدی میں پایا جاتا تھا، جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں فائب کر دیا گیا اور آج اس کا بھی کہیں پتہ نشان نہیں ملتا مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمے کی ایک نوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے اسے فقط بغلط پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے بعض تعصب اور عناد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

مسیحی لٹریچر میں اس انجیل کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر روک دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برناباس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اس بنا پر برل دیگا کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اقل تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کر وہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے، اگر یہ کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوتی اور ملکتے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مقدمہ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک

کا علم نہ تھا۔ یقربلی، مسعودی، البیرونی، ابن خزم، ابن تیمیہ اور دوسرے محققین، جو مسلمانوں میں مسیحی ٹیڑھیوں کے وسیع اطلاع رکھنے والے تھے، ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برناباس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیا سے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں ان کی بہترین نمونہ ابن ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ہیں، اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برناباس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل اس بات کے جھوٹ ہونے کی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے بھی ۵۰ سال پہلے پوپ گلابیس اول Galasus کے زمانے میں بدعتیہ اور گمراہ کن (Heretical) کتابوں کی جو فہرست تئیب کی گئی تھی، اور ایک پاپائی فتوے کے ذریعہ سے جن کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا، ان میں انجیل برناباس (Evangelium Barnabi) بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اُس وقت کونسا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی تھی؟

### ۹۔ انجیل برناباس کا تعارف

قبل اس کے کہ اس انجیل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بنا تین نقل کی جائیں اس کا مختصر تعارف کر دینا ضروری ہے، تاکہ اس کی اہمیت معلوم ہو جائے اور یہ بھی سمجھ میں آجائے کہ عیسائی حضرات اس سے آنسو ناراض کیوں ہیں۔

بائبل میں جو چار انجیلیں قانونی اور معتبر قرار دے کر شامل کی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسیٰ کا صحابی نہ تھا۔ اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ اس نے آنحضرت کے صحابہوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں، جن ذرائع سے ان لوگوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان کا کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ راوی نے کیا خود واقعات دیکھے اور وہ اقوال سنے ہیں جنہیں وہ بیان کر رہا ہے یا ایک یا چند واسطوں سے یہ باتیں اسے پہنچی ہیں۔ بخلاف اس کے انجیل برناباس کا مصنف کہتا ہے کہ میں مسیح کے آدھن بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں، شروع سے آخر وقت تک مسیح کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سے اقوال اس کتاب میں درج کر رہا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت حضرت مسیح نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط فہمیاں لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالات دنیا کے سامنے لانا میری ذمہ داری ہے۔

یہ برناباس کون تھا؟ بائبل کی کتاب اعمال میں بڑی کثرت سے اس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو حضرت عیسیٰ کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مسیحیت کی تبلیغ اور پیروائی مسیح کی مدد و اعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ وہ کب دین مسیح میں داخل ہوا، اور ابتدائی بازواریوں



کہ جو فہرست تین انجیلوں میں دی گئی ہے اس میں بھی کہیں اس کا نام درج نہیں ہے۔ اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس انجیل کا مصنف وہی برناباس ہے یا کوئی اور معنی، اور مرقس کے حواریوں <sup>Disciples</sup> کی جو فہرست دی ہے، برناباس کی وہی ہوتی فہرست اس سے صرف دو ناموں میں مختلف ہے۔ ایک تو، جس کے بجائے برناباس خود اپنا نام دے رہا ہے، دوسرا شمعون ثنائی، جس کی جگہ وہ یوحنا بن یعقوب کا نام لیا ہے۔ لوقا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ جیسا کہ ناصیح جو کا کہ بعد میں کسی وقت صرف برناباس کو حواریوں سے خارج کر کے لیے تو ان کا نام داخل کیا گیا ہے تاکہ اس کی انجیل سے پہچان چھڑایا جاسکے، اور اس طرح کے تغیرات اپنی نمبری کتابوں میں کر لینا ان حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔

اس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصب کے بغیر کھلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ان چاروں سے بدرجہا بڑھتا ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوتے ہیں اور اس طرح بیان ہوتے ہیں جیسے کوئی شخص فی الواقع وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور ان واقعات میں خود شریک تھا۔ چاروں انجیلوں کی بے ربط داستانوں کے مقابلہ میں یہ تاریخی بیان زیادہ مربوط بھی ہے اور اس سے سلسلہ واقعات بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بہ نسبت زیادہ واضح اور مفصل اور مؤثر طریقے سے بیان ہوتی ہیں۔ تو عہد کی تعلیم شریک کی ترویج و صفات باری تعالیٰ، عبادت کی رُوح، اور اخلاقِ فاضلہ کے مضامین اس میں بڑے ہی پُر زور اور مدلل اور مفصل ہیں جن سبق آموز تعلیمات سکھ سیرا پر میں مسیح نے یہ مضامین بیان کیے ہیں ان کا عشر عشر مشیر بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کی زبان، طرز بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ یہ کوئی جعلی داستان نہیں ہے جو بعد میں کسی نے گھڑی بنا، بلکہ اس میں حضرت مسیح انجیل اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصلی شان میں بہت زیادہ نمایاں ہو کر عبادت سے سامنے آتے ہیں، اور اس میں تضادات کا نام و نشان بھی نہیں ہے جو انجیل اربعہ میں ان کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

اس انجیل میں حضرت عیسیٰ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات ٹھیک ٹھیک ایک نئی اور آزاد تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ تمام پیچھے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ صاف کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے سوا معرفت حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور جو انبیاء کو چھوڑنا ہے وہ ذرا اصل خدا کو چھوڑنا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں

جن کی تعلیم تمام انبیاء نے دی ہے۔ نماز، روزے اور زکوٰۃ کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی نمازوں کا جو ذکر کثرت مقامات پر برناباس نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا اور تہجد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے، اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے۔ انبیاء میں سے وہ حضرت داؤد سلیمان کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کو انبیاء کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے حضرت اسماعیل کو وہ ذریعہ قرار دیتے ہیں اور ایک یہودی عالم سے اقرار کرتے ہیں کہ نبی الواقع ذریعہ حضرت اسماعیل ہی تھے اور نبی اسرائیل نے زبردستی کھینچ لیا کہ حضرت اسحاق کو ذریعہ بنا رکھا ہے۔ آخرت اور قیامت اور جنت و دوزخ کے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

### ۱۔ عیسائی انجیل برناباس کے کیوں مخالف ہیں؟

عیسائی جس وجہ سے انجیل برناباس کے مخالف ہیں، وہ دراصل یہ نہیں ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جگہ جگہ صاف اور واضح بتائیں ہیں، کیونکہ وہ تو حضور کی پیدائش سے بھی بہت پہلے اس انجیل کو لکھ چکے تھے ان کی ناراضی کی اصل وجہ کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیلی بحث درکار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، مروجہ شریعت کا اتباع کرتے تھے، عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے بنی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰ کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لاتے تھے اور وہ ان کو مسیح مانتے تھے۔ بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہوا تو اس نے یہودیوں کو بائبل اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی اور اس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی بلکہ ان کے زمانے میں وہ ان کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک ان کے پیروؤں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہوا تو اس نے ایک نیا دین بنا کر شروع کیا اس وقت بھی اس نے حضرت عیسیٰ کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی بلکہ ان کے کلمات الہام کو بنایا۔ اور اس سے دین کی تشکیل میں اس کے پیش نظر میں یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام غیر یہودیوں اور دنیا قبولی کر لے۔ اس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی شریعت یہود کی تمام بائبلوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام و حلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے فتنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو یہودی دنیا کو خاص طور پر پناہ گوارہ تھا۔ حتیٰ کہ اس نے مسیح کی انوکھی اور ان کے ابن خدا ہونے اور صلیب پر جان فشانی اور آلام کے پیدائشی گناہ کا تقارہ بن جانے کا مفہوم بھی تسلیت کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے مزاج سے یہ بہت

مناسبت رکھتا تھا۔ مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے ان بدعات کی فراہمت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سلسلہ غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست مہلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر لوگ کسی طرح نہ ٹھہر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیح کی اُورسیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔ مگر چوتھی صدی کے آغاز (۳۲۵ء) میں نیقیہ (Nicaea) کی کونسل نے پرلوسی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مستم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قبضہ تھوڑے عیسائوں کے زلمے میں ہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھہرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۸۱ء میں پہلی مرتبہ اٹھانا سینڈ (Athanasius) کے ایک خط کے ذریعہ معتبر و مستم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا، پھر اس کی توثیق ۳۸۲ء میں پوپ (پیسینس (Damascus) کے زیر صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ کلاسیس (Gelasius) نے اس مجموعہ کو مستم قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جو غیر مستم تھیں۔ حالانکہ جن پرلوسی عقائد کو دنیا و بنا کر مذہبی کتابوں کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم بید و غوی نہیں کر سکا ہے کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی۔ بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔

انجیل بنیاباں ان غیر مستم کتابوں میں اس لیے شامل کی گئی کہ وہ مسیحیت کے اس سرکاری عقیدے کے باطل خلاف تھی۔ اس کا مقصد کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصد تصنیف یہ بیان کرنا ہے کہ ”ان لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جاتے جو شیطان کے دھوکے میں آکر شروع کو ان ائمہ قرار دیتے ہیں، جنہ کو غیر فروری ٹھہراتے ہیں اور عوام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکہ کھانے والا پرلوسی بھی ہے، وہ بتا دیتے کہ سب عیسائی دنیا میں موجود تھے اُس زمانے میں ان کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے مشرک رومی سپاہیوں نے ان کو خدا اور عیسیٰ نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا، پھر یہ عقیدت بنی اسرائیل کے عوام کو بھی لگ گئی۔ اس پر حضرت عیسیٰ تخت پریشان ہوئے۔ انہوں نے بار بار نہایت شدت کے ساتھ اپنے متعلق اس غلط عقیدے کی تردید کی اور کہا کہ میں ان کی دُعا سے ناگروں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صا اور کرانے گئے جو خود حضرت عیسیٰ سے صا اور ہونے لگے تاکہ لوگ اس غلط خیال سے باز آجائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صا اور ہو رہے ہیں وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت عیسیٰ کی منقطع تقریریں نقل کرتے ہیں انہوں نے بڑی سختی کے ساتھ اس غلط عقیدے کی تردید کی

تھی، اور جگہ جگہ یہ بتانا ہے کہ آنجناب اس گمراہی کے پھیلنے پر کس قدر پریشان تھے۔ مزید براں وہ اس پر یوسی غیبیہ کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے صلیب پر جان دی تھی۔ وہ اپنے چشم دید حالات پر بیان کرتا ہے کہ جب یہود اور اسکریٹی یہودیوں کے سردار کاہن سے رشوت لے کر حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرانے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجناب کو اٹھا لے گئے، اور یہود اور اسکریٹی کی شکل اور آواز باطل مہی کر دی گئی جو حضرت عیسیٰ کی تھی صلیب پر وہی پڑھایا گیا تھا کہ حضرت عیسیٰ۔ اس طرح یہ انجیل پر یوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی تہذیبی توثیق کرتی ہے۔ حالانکہ نزولِ قرآن سے ۵۰ سال پہلے اُس کے ان بیانات ہی کی بنا پر مسیحی پادری اسے رد کر چکے تھے۔

## ۱۱۔ انجیل برناباس کی مفصل پیشین گوئیاں

اس بحث سے یہ بات واضح ہر جاتی ہے کہ انجیل برناباس درحقیقت انانجیل اور بعد سے زیادہ مضمر انجیل ہے، مسیح علیہ السلام کی تعلیمات اور سیرت اور اقوال کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، اور یہ عیسائیوں کی اپنی بدستوری ہے کہ اس انجیل کے ذریعہ سے اپنے عقائد کی تصحیح اور حضرت مسیح کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جو موقع ان کو ملا تھا مکمل محض خدا کی بنا پر انہوں نے کھو دیا۔ اس کے بعد ہم پورے اطمینان کے ساتھ وہ بشارتیں نقل کر سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں برناباس نے حضرت عیسیٰ سے روایت کی ہیں۔ ان بشارتوں میں کہیں حضرت عیسیٰ حضور کا نام لیتے ہیں، کہیں رسول اللہ کہتے ہیں، کہیں آپ کے لیے مسیح کا لفظ استعمال کرتے ہیں، کہیں قابلِ تعریف (Admirable) کہتے ہیں، اور کہیں صاف صاف ایسے فقرے ارشاد فرماتے ہیں جو بالکل لالا الا اللہ محمد رسول اللہ کے ہم معنی ہیں ہمارے لیے ان ساری بشارتوں کو نقل کرنا مشکل ہے کیونکہ وہ اتنی زیادہ ہیں، اور جگہ جگہ مختلف پیرایوں اور سیاق و سباق میں آئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔ یہاں ہم محض بطور نمونہ ان میں سے چند کو نقل کرتے ہیں:

”تمام انبیاء جن کو خدا نے دنیا میں بھیجا جن کی تعداد ایک لاکھ ۴۴ ہزار تھی، انہوں نے ابہام کے ساتھ بات کی مگر میرے بعد تمام انبیاء اور مقدس ستیوں کا نور آسے گا جو انبیاء کی کبی ہوئی باتوں کے اندھیرے پر روشنی ڈال دینگا کیونکہ وہ خدا کا رسول ہے“ (باب ۱۴)

”مذہبوں اور مذاہبوں نے کہا اگر تو مسیح سے، نہ الیاس، نہ کوئی اور نبی، تو کیوں توئی تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسیح سے بھی زیادہ بنا کر پیش کرتا ہے؟ ایسے نے جواب دیا ”میرے خدا میرے ہاتھ سے دکھاتا ہے وہ یہ ظاہر کرنے میں کہ میں وہی کچھ کہتا ہوں جو خدا چاہتا ہے۔ وہ نہ درحقیقت میں اپنے آپ کو اُس مسیح سے بڑا شمار کیجے جانے کے قابل نہیں قرار دیتا جس کا تم ذکر کر رہے ہو میں تو اُس خدا کے رسول

کے موزے کے بند یا اس کی جوتی کے تیسے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں جس کو تم مسیح کہتے ہو، جو مجھ سے پہلے بنا یا گیا تھا اور میرے بعد آئے گا اور صداقت کی باتیں لے کر آئے گا تاکہ اس کے دین کی کوئی آہانتا نہ ہو" (باب ۲۲)۔

وہ بالیقین میں تم سے کہتا ہوں کہ ہر نبی جو آیا ہے وہ صرف ایک قوم کے لیے خدا کی رحمت کا نشان بن کر پیدا ہوا ہے۔ اس وجہ سے ان انبیاء کی باتیں ان لوگوں کے سوا کہیں اور نہیں بھلیں جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ مگر خدا کا رسول جب آئے گا، نسا گریا اس کو اپنے ہاتھ کی ٹھہرے دیکھا یہاں تک کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو جو اس کی تعلیم پائیں گی، نجات اور رحمت پہنچا دینگا۔ وہ بے خدا لوگوں پر اقتدار لے کر آئے گا اور بت پرستی کا ایسا قلعہ تم کو لے گا کہ شیطان پریشان ہو جائے گا" (اس کے آگے شاگردوں کے ساتھ ایک طویل مکالمہ میں حضرت عیسیٰ تصریح کرتے ہیں کہ وہ نبی اسماعیل میں سے ہو گا۔ باب ۲۳)۔

» اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کا رسول وہ رونق ہے جس سے خدا کی پیدا کی ہوئی قربت پر تمام چیزوں کو خوشی نصیب ہوگی کیونکہ وہ خیر اور نصیحت، حکمت اور طاقت، خشیت اور محبت، نرم اور ذرا کی روع سے آراستہ ہے۔ وہ فیاضی اور رحمت، عدل اور تقویٰ، شرافت اور صبر کی روع سے نری ہے جو اس نے خدا سے ان تمام چیزوں کی نسبت میں گنتی پائی ہے جنہیں خدا نے اپنی مخلوق میں سے روع بخشی ہے کیسا مبارک وقت ہو گا جب وہ دنیا میں آئے گا۔ یقین جانو، میں نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعلیم کی ہے جس طرح ہر نبی نے اس کو دیکھا ہے اور اس کی تعلیم کی ہے۔ اس کی روع کو دیکھنے ہی سے خدا نے ان کو جوت دی۔ اور یہ میں نے اس کو دیکھا تو میری روع سکینت سے بھر گئی یہ کہتے ہوئے کہ اے محمد، خدا تمہارے ساتھ ہو، اور وہ مجھے تمہاری جوتی کے سسے باندھنے کے قابل بنا دے، کیونکہ یہ مرتبہ بھی پاؤں تو میں ایک بڑا نبی اور خدا کی ایک مقدس ہستی ہو جاؤں گا (باب ۲۴)۔

» (میرے جلنے سے تمہارا دل پریشان نہ ہو، نہ تم خوف کرو، کیونکہ میں نے تم کو پیدا نہیں کیا ہے بلکہ خدا ہمارا خالق ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ہے، وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔ رہا میں، تو اس وقت میں تمہارا میں اس رسول خدا کے لیے راستہ تیار کرنے آیا ہوں جو دنیا کے لیے نجات لے کر آئے گا۔ اور میں نے کہا، استاد میں اس کی نشانی بنا دے تاکہ ہم اسے پہچان لیں۔ یسوع نے جواب دیا، وہ تمہارے زمانے میں نہیں آئے گا بلکہ تمہارے کچھ سال بعد آئے گا جبکہ میری انجیل ایسی مسخ ہو چکی ہوگی کہ مشکل سے کوئی ۳۰ آدمی مومن باقی رہ جائیں گے۔ اس وقت اللہ دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنے رسول کو بھیجے گا جس کے سر پر سفید بادل کا سایہ ہو گا جس سے وہ خدا کا برگزیدہ جانا جائے گا اور اس کے ذریعہ سے خدا کی

معدت دنیا کو حاصل ہوگی۔ وہ بنے خدا لوگوں کے نجات بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا اور زمین پر بہت پرستی کو مٹا دے گا۔ اور مجھے اس کی ٹہنی خوشی ہے کہ میں کہ اس کے ذریعہ سے ہمارا خدا پہنچا جائیگا اور اس کی تقدیر میں ہوگی اور میری صداقت دنیا کو معلوم ہوگی اور وہ ان لوگوں سے اس نام کے گناہ کے انسان سے بڑھ کر کچھ فرادہ دیں گے۔ . . . . وہ ایک ایسی صداقت کے ساتھ آئے گا جو تمام امتیاز کی لاتی ہوئی صداقت سے زیادہ واضح ہوگی" (باب ۷۲)

"خدا کا عہد پرورش میں، بعد سلیمان کے اندر کیا گیا تھا کہ کہیں اور مگر میری بات کا یقین کرو کہ ایک وقت آئے گا جب خدا اپنی رحمت ایک اور شہر میں نازل فرمائے گا، پھر ہر جگہ اس کی عبادت ہو سکے گی، اور اللہ اپنی رحمت سے ہر جگہ سچی نماز کو قبول فرمائے گا۔ . . . میں دراصل اسرائیل کے گھر لے کر کی طرف نجات کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، مگر میرے بعد مسیح آئے گا، خدا کا بھیجا ہوا، تمام دنیا کی طرف، جس کے لیے خدا نے یہ ساری دنیا بنائی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں اللہ کی عبادت ہوگی، اور اس کی رحمت نازل ہوگی" (باب ۸۳)

"یسوع نے سردار کاہن سے کہا: اترو خدا کی قسم جس کے حضور میری جان ماننا ہے، میں وہ ایک نہیں ہوں جس کی آمد کا تمام دنیا کی قومیں انتظار کر رہی ہیں، جس کا وعدہ خدا نے ہمارے باپ ابراہیم سے یہ کہہ کر کیا تھا کہ تیری نسل کے وسیلے سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی" (مذہب انش، ۱۲: ۸)۔ مگر جب خدا مجھے دنیا سے لے جاتے گا تو شیطان پھر یہ بغاوت برپا کرے گا کہ: پھر میرا گارو گے مجھے خدا اور خدا کا بیٹا نہیں۔ اس کی وجہ سے میری باتوں اور میری تعلیمات کو مسخ کر دیا جائے گا یہاں تک کہ مشعل ۳۰ صاحب ایمان باقی رہ جائیں گے اس وقت خدا دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنا رسول بھیجے گا جس کے لیے اس نے دنیا کی یہ ساری چیزیں بنائی ہیں، جو قوت کے ساتھ جنوب سے آئے گا اور جن کو رحمت پرستوں کے ساتھ برپا کر دے گا، جو شیطان سے وہ اقتدار چھین لے گا جو اس نے انسانوں پر حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کی رحمت ان لوگوں کی نجات کے لیے اپنے ساتھ لائے گا جو اس پر ایمان لائیں گے، اور مبارک ہے وہ جو اس کی باتوں کو مانے" (باب ۹۶)

"سردار کاہن نے پوچھا کیا خدا کے اس رسول کے بعد دوسرے نبی بھی آئیں گے، یسوع نے جواب دیا اس کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے پتے نبی نہیں آئیں گے مگر بہت سے جھوٹے نبی آجائیں گے جن کا بطن بڑا ٹھم ہے کیونکہ شیطان خدا کے عاقلانہ فیصلے کی وجہ سے ان کو اٹھائے گا اور وہ میری انجیل کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائیں گے" (باب ۱۰۶)

” سردار کاہن نے پوچھا کہ وہ مسیح کس نام سے پکارا جائے گا اور کیا نشانیاں اس کی آمد کو ظاہر کریں گی؟ شروع نے جواب دیا اس مسیح کا نام قابل تعریف ہے، کیونکہ خدا نے جب اس کی آمد پیدا کی تھی اس وقت اس کا یہ نام خود رکھا تھا اور وہ ان سے ایک تعلق نشان میں رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا ”نہ محمد، انتظار کہہ کیونکہ تیری ہی خاطر میں جنت، دنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کر مل گا اور اس کو مجھے تمہارے طور پر دوں گا، یہاں تک کہ جو تیری تبرک کرے گا اسے برکت دی جائے گی اور جو تجھ پر لعنت کرے گا اس پر لعنت کی جائے گی جب میں تجھے دنیا کی طرف بھیجوں گا تو میں تجھ کو اپنے پیغامبر نجات کی کیفیت سے بھیجوں گا تیری بات سچی ہوگی یہاں تک کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے مگر تیرا دین نہیں ٹلے گا۔ سو اس کا مبارک نام محمد ہے۔“ (باب ۹۰)

بنا ہوا کتاب سے ایک مرفوع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسیٰ نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو بعد میں یہودیہ اسکرپتی نکلا) مجھے ۲۰ سکوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے گا، پھر فرمایا: ”اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا، کیونکہ خدا مجھے زیہ سے اُپر اٹھائے گا اور اس خدا کی صورت ایسی بدل دیکھا کہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ نہیں ہی ہوں۔“ نام جب وہ ایک بڑی موت مرے گا تو ایک مدت تک میری ہی تذیل ہوتی رہے گی مگر جب محمدؐ خدا کا مقدر رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دور کر دی جائے گی۔ اور خدا یہ اس لیے کرے گا کہ میں نے اس مسیح کی صداقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مجھے اس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ میں زندہ ہوں اور اس وقت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ (باب ۱۱۳)

”دشاگردوں سے حضرت عیسیٰ نے کہا، بے شک میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری کتاب سے صداقت مسخ نہ کر دی گئی ہوتی تو خدا ہمارے باپ و اُمّ کو ایک دوسری کتاب نہ دیتا۔ اور اگر وہ دونوں کتاب میں صحیح نہ کی گئی ہوتی تو خدا مجھے انجیل نہ دیتا، کیونکہ خدا نے ہمارا خدا بننے والا نہیں ہے اور اس نے سب انسانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے۔ لہذا جب اللہ کا رسول آئے گا تو وہ اس لیے آئے گا کہ ان ساری چیزوں کو صاف کر دے جن سے بے صدا لوگوں نے میری کتاب کو آلودہ کر دیا ہے۔“ (باب ۱۳۴)

## دو شبہات کا جواب

ان صاف اور منقطع پیشین گوئیوں میں مدت تین چیزیں ایسی ہیں جو باہمی النظر میں نگاہ کرکھینکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں، اور انجیل بنا ہوا اس کی متعدد دوسری عبارتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مسیح ہونے کا اظہار کیا ہے۔ دوسری یہ کہ مدت انہی عبارتوں میں نہیں بلکہ اس انجیل کے بہت سے مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قابل

عربی نام محمدؐ لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ انبیاء کی پیشین گوئیوں کا عام طریقہ نہیں ہے کہ بعد کی آنے والی کسی ہستی کا اصل نام لیا جائے۔ تیسری یہ کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسیح کہا گیا ہے۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ صرف انجیل برنابا ہی میں نہیں بلکہ کونوفا کی انجیل میں بھی یہ ذکر موجود ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے شاگردوں کو اس بات سے منع کیا تھا کہ وہ آپ کو مسیح کہیں۔ کونوفا کے الفاظ یہ ہیں: "اُس نے اُن سے کہا لیکن تم مجھے کیا کہتے ہو؟ پطرس نے جواب میں کہا خدا کا مسیح۔ اس نے ان کو تاکید کر کے حکم دیا کہ یہ کسی سے نہ کہناؤ؛ ۲۰-۲۱) غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں مسیح کے منتظر تھے اس کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ خوار کے زور سے دشمنانِ حق کو مغلوب کرے گا۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ مسیح میں نہیں ہوں بلکہ وہ میرے بعد آنے والا ہے۔

دوسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ برنابا کا جراثا لوی ترجمہ اس وقت دنیا میں موجود ہے اس کے اندر حضورؐ کا نام بے شک محمدؐ لکھا ہوا ہے، مگر یہ کسی کو بھی معلوم نہیں ہے کہ یہ کتاب کن کن زبانوں سے ترجمہ و ترجمہ ہوتی ہوئی اعلیٰ زبان میں پہنچی ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل انجیل برنابا میں شرمانی زبان میں ہوگی۔ کیونکہ وہ حضرت عیسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کی زبان تھی۔ اگر وہ اصل کتاب دستیاب ہوتی تو دیکھا جاسکتا تھا کہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی کیا لکھا گیا تھا اب جو کچھ قیاس کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اصل میں تو حضرت عیسیٰؑ نے لفظ "محمدؐ" استعمال کیا ہو گا جیسا کہ ہم ابن اسحاق کے دیکھتے ہوئے انجیل یوتنا کے حوالہ سے بتا چکے ہیں، پھر مختلف ترجموں نے اپنی اپنی زبانوں میں اس کے ترجمے کر دیئے ہوں گے۔ اس کے بعد غالباً کسی مترجم نے یہ دیکھ کر پیشین گوئی میں آنے والے کا جو نام بتایا گیا ہے وہ بالکل لفظ "محمدؐ" کا ہم معنی ہے، آپ کا یہی اسم گرامی نکھ دیا ہو گا۔ اس لیے صرف اس نام کی تصریح یہ شبہ پیدا کر دینے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہے کہ لڑی انجیل برنابا میں کسی مسلمان نے جعلی تصنیف کر دی ہے۔

تیسرے شبہ کا جواب یہ ہے کہ لفظ "مسیح" حقیقت ایک اسرائیلی اصطلاح ہے جسے قرآن مجید میں مخصوص طور پر حضرت عیسیٰؑ کے لیے صرف اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ یہودی ان کے مسیح ہونے کا انکار کرتے تھے، ورنہ یہ نہ قرآن کی اصطلاح ہے نہ قرآن میں کہیں اس کو اسرائیلی اصطلاح کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لفظ مسیح استعمال کیا ہوا تو قرآن میں آپ کے لیے یہ لفظ استعمال نہ کیا گیا ہو تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ انجیل برنابا میں آپ کی طرف کوئی ایسی چیز منسوب کرتی ہے جس سے قرآن انکار کرتا ہے۔ دراصل بنی اسرائیل کے ہاں قدیم طریقہ یہ تھا کہ کسی چیز یا کسی شخص کو جب کسی مقدس مقصد کے لیے مختص یا جانا تھا تو اس چیز پر یا اس شخص کے سر پر تیل مل کر اسے متبرک (Consecrate) کر دیا جاتا تھا۔ عبرانی زبان میں تیل ملنے کے اس فعل کو مسیح کہتے تھے اور جس پر یہ ملا جاتا تھا اسے مسیح کہا جاتا تھا۔ عبادت



گا کہ ظہور اسی طریقہ سے کیج کر کے عبادت کے لیے وقف کیے جاتے تھے۔ کاپلہنوں کا

Priests

۱

کہانت و Priest hood کے تہذیب پر مامور کرتے وقت بھی مسیح کی جانا تھا۔ بادشاہ اور شاہی

جب خدا کی عبادت سے بادشاہت یا برکت کے لیے مامور کیے جاتے تو انہیں مسیح کی جانا چنانچہ بائبل کی رو سے یہ پہلی کناریہ ہیں کہنت سے جاتے ہیں، عہدت بادشاہ کا بن کی حیثیت سے مسیح تھے حضرت موسیٰ کا بن اور بنی کی حیثیت سے، عبادت بادشاہ کا بن اور شاہ اور شاہ کے خلیفہ سے، حضرت داؤد بادشاہ اور شاہ کی حیثیت سے، ناکہ یہ خلیفہ بادشاہ

اور کا بن کی حیثیت سے اور حضرت ایشیہ بنی کی حیثیت سے مسیح تھے۔ بعد میں یہ بھی ضروری نہ رہا تھا کہ تمام نیکو بنی کسی کو مامور کیا جاتے، جبکہ بعض کسی کا مامور بننا ہی مسیح ہونے کا ہم معنی بن گیا تھا۔ مثال کے طور پر دیکھیے۔ اسلاطین، باب ۹ میں ذکر آیا ہے کہ خدا نے حضرت ایلیاس اولیاء کو حکم دیا کہ وہ آئین کو مسیح کر کے آلام و مشقوں کا بادشاہ ہو، اور شاہی کے بیٹے یا پورا مسیح کر کے اسرائیل کا بادشاہ ہو، اور ایشیہ والا یعنی کو مسیح کر کے تیری نگہ بنی جو دانیل کے کسی کے سر پر بھی تیل نہیں ملا گیا۔ بس خدا کی عبادت سے ان کی ماموریت کا فیصلہ بنا دینا اگر یا انہیں مسیح کر دینا تھا۔ پس اسرائیلی قصور کے سہارا ہی غلط مسیح و عہدت سے مامور بننا اور اسی معنی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس غلطی کو استعمال کیا تھا۔ و غلط مسیح کے اسرائیلی غم کو ان شرعیہ کے لیے لاشعور ہو کر نکل پڑا، آت سیدگی اور سوچہ، لفظ یہ عیساہ ۱۰۰۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

# سرورِ عالم

## پوری دُنیا کی مشترک میراث

بمِ سلطان حضرت محمد علی اللہ علیہ وسلم کو "سرورِ عالم" کہتے ہیں۔ سیدتی سادوی زبان میں اس کا مطلب ہے "دُنیا کا سرور"۔ ہندی میں اس کا ترجمہ "جگت گرو" ہوگا اور انگریزی میں "Leader of the World"۔ بظاہر یہ بہت بڑا خطاب ہے، مگر جس بلند پایہ سنی کو یہ خطاب دیا گیا ہے، اس کا کارنامہ واقعی ایسا ہے کہ اس کو سرورِ عالم کہنا سب لائق نہیں عین حقیقت ہے۔

دیکھیے! کسی شخص کو دُنیا کا لیڈر کہنے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہونی چاہیے کہ اُس نے کسی خاص قوم یا نسل یا طبقہ کی بھلائی کے لیے نہیں بلکہ تمام دُنیا کے انسانوں کی بھلائی کے لیے کام کیا ہو۔ ایک مُحبِ وطن یا ایک قوم پرست لیڈر کی آپ اس حیثیت سے یعنی چاہی قدر کر لیں کہ اُس نے اپنے لوگوں کی بڑی خدمت کی، لیکن اگر آپ اس کے ہم وطن یا ہم قوم نہیں ہیں تو وہ آپ کا لیڈر بہر حال نہیں ہو سکتا۔ جس شخص کی محبت، خیر خواہی اور کارگزاری سب کچھ چین یا ہسپانیہ تک محدود ہو، ایک ہندوستانی کو اُس سے کیا قدرتی تہ وہ اسے اپنا لیڈر مانے؟ اگر وہ اپنی قوم کو دوسروں سے افضل ٹھہراتا ہو اور دوسروں کو گرا کر اپنی قوم کو چرھانا چاہتا ہو تب تو دوسری قوم کے لوگ اُنہی اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہیں۔ ساری قوموں کے انسان کسی ایک شخص کو اپنا لیڈر صرف اُسی صورت میں مان سکتے ہیں جبکہ اس کی نگاہ میں سب قومیں اور سب آدمی یکساں ہوں، وہ سب کا یکساں خیر خواہ ہو، اور اپنی خیر خواہی میں کسی طرت ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دے۔

دوسری اہم شرط جو دُنیا کا لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس نے ایسے اصول پیش

ملہ یہ ایک نشری تقریر ہے جو تقسیم سے کئی سال پہلے مسئلہ میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی گئی تھی اس کے خطاب صرف مسلمان نہ تھے، بلکہ ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی سب تھے۔ درمیان میں

کیے ہوں جو ساری دنیا کے انسانوں کی رہنمائی کرتے ہوں اور جن میں انسانی زندگی کے تمام اہم مسائل کا حل موجود ہو۔ لیڈر کے معنی ہی رہنما کے ہیں۔ لیڈر کی ضرورت ہوتی ہی اس لیے ہے کہ وہ فلاح اور بہتری کا راستہ بتاتے۔ لہذا دنیا کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جو ساری دنیا کے لوگوں کو ایسا طریقہ بتاتے جس میں سب کی فلاح ہو۔ تیسری لازمی شرط دنیا کا لیڈر ہونے کے لیے یہ ہے کہ اس کی رہنمائی کسی خاص زمانے کے لیے نہ ہو بلکہ بر حال اور ہر زمانے میں کیساں مفید، کیساں صحیح اور کیساں قابل پیروی ہو۔ جس لیڈر کی رہنمائی ایک زمانے میں کارآمد اور دوسرے زمانے میں بیکار ہو اس کو دنیا کا لیڈر نہیں کہا جاسکتا۔ دنیا کا لیڈر تو وہی ہے کہ دنیا جب تک قائم رہے اس کی رہنمائی بھی کارآمد رہے۔

چوتھی اہم ترین شرط یہ ہے کہ اس نے صرف اصول پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا ہو بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کو زندگی میں عملاً جاری کر کے دکھایا ہو اور ان کی بنیاد پر ایک جمعی جاگتی سرساستی پیدا کر دی ہو۔ بعض اصول پیش کرنے والا زیادہ سے زیادہ ایک مفکر (Thinker) ہو سکتا ہے، لیڈر نہیں ہو سکتا۔ لیڈر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اصولوں کو عمل میں لاکر دکھائے۔ آئیے اب ہم دیکھیں کہ یہ چاروں شرطیں آس سستی میں کہاں تک پائی جاتی ہیں جس کو ہم ”سرورِ عالم“ کہتے ہیں۔

پہلی شرط کو سمجھیں۔ آپ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ایک ہی نظر میں محسوس کریں گے کہ یہ کسی قوم پرست یا محبتِ وطن کی زندگی نہیں ہے بلکہ ایک محبتِ انسانیت اور ایک عالمگیر نظریہ رکھنے والے انسان کی زندگی ہے۔ ان کی نگاہ میں تمام انسان یکساں تھے۔ کسی خاندان، کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل یا کسی ملک کے خاص مفاد سے انہیں دلچسپی نہ تھی۔ امیر اور غریب، اویچ اور بیچ مارے، لدر گورے، عرب اور غیر عرب، مشرقی اور مغربی، سامی اور آیین، سب کو وہ اس حیثیت سے دیکھتے تھے کہ یہ سب ایک ہی انسانی نسل کے افراد ہیں۔ ان کی زبان سے تمام عمر کرتی ایک لفظ یا ایک فقرہ ہی ایسا نہ نکلا، اور نہ زندگی بھر میں کوئی کام انہوں نے ایسا کیا جس سے یہ شبہ کیا جاسکتا ہو کہ انہیں کسی ایک طبقہ انسانی کے مفاد سے زیادہ تعلق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی ہی میں حبشی، ایرانی، رومی، مصری اور اسرائیلی، اسی طرح ان کے رفیق کارہے جس طرح عرب۔ اور ان کے بعد زمین کے ہر گوشے میں ہر نسل اور ہر قوم کے انسانوں نے ان کو اسی طرح اپنا رہنما تسلیم کیا جس طرح خود ان کی اپنی قوم نے۔ یہ اسی خاص انسانیت ہی کا کرشمہ تو ہے کہ آج آپ ایک ہندوستانی کی زبان

۱۰ خیال رہے کہ یہ تقریر اس زمانے میں ہوئی تھی جب ہندوستان اور پاکستان دونوں ایک ملک تھے۔ (۱۹۴۷ء)

سے اس شخص کی تعریف سن رہے ہیں جو صدیوں پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا۔

اب دوسری اور تیسری شرط کو ایک ساتھ لیجیے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انھوں نے ان لوگوں کو  
 انھوں کے وقتی اور مقامی مسائل سے بحث کر کے وہیں اپنا وقت ضائع نہیں کیا بلکہ اپنی پوری قوت دنیا میں انسانیت  
 کے اُس بڑے مسئلے کو حل کرنے میں صرف کر دی جس سے تمام انسانوں کے سارے چھوٹے چھوٹے مسائل خود  
 حل ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑا مسئلہ کیا ہے؟ وہ صرف یہ ہے کہ:

”کائنات کا نظام فی الواقع جس اصول پر قائم ہے، انسان کی زندگی کا نظام بھی اسی کے مطابق  
 ہو۔ کیونکہ انسان اس کائنات کا ایک جزو ہے اور جزو کی حرکت کا کل کے خلاف ہونا ہی شرابی کا موجب بنتا ہے۔  
 اگر آپ اس بات کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کی آسان صورت یہ ہے کہ اپنی نگاہ کو دورا کو شش کر کے  
 زمان اور مکان کی قیور سے آزاد کر لیجیے اور پھر سے گزرتے نہیں پر اس طرح نظر ڈالیے کہ ابتداء سے آج تک اور  
 آئندہ غیر محدود زمان تک بسنے والے تمام انسان بیک وقت آپ کے سامنے ہوں پھر دیکھیے کہ انسان کی  
 زندگی میں شرابی کی جتنی صورتیں پیدا ہوتی ہیں یا ہوتی ممکن ہیں ان سب کی جڑ کیا ہے، یا کیا ہو سکتی ہے اس حوال  
 پر آپ ہنسا غور کریں گے، جتنی چھان بین اور تحقیق کریں گے، حاصل یہی نکالے گا کہ،  
 ”انسان کی خدا سے بغاوت تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔“

اس لیے کہ خدا سے باغی ہو کر انسان لازمی طور پر دو صورتوں میں سے کوئی ایک ہی صورت اختیار کرتا  
 ہے: یا تو وہ اپنے آپ کو خود مختار اور غیر ذمہ دار سمجھ کر من مانی اور روایاں کرتے نکلتا ہے، اور یہ چیز آئے عالم  
 بنا دیتی ہے۔ یا پھر وہ خدا کے سوا دوسروں کے حکم کے آگے سر جھکانے لگتا ہے، اور اس سے دنیا میں نساد  
 کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں خراب نتائج کیوں نکلتے ہیں؟ اس کا سیدھا اور صاف  
 جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا چونکہ حقیقت کے خلاف ہے اس لیے اس کا نتیجہ بڑا نکلتا ہے۔ یہ ساری کائنات فی الواقع  
 نہ ان کی سلطنت ہے۔ زمین، سورج، چاند، ہوا، پانی، روشنی، سب خدا کی ملک ہیں اور انسان اس سلطنت میں  
 پیدا نشی بند ہے۔ (Born Subject) ان کی حیثیت رکھتا ہے، یہ پوری سلطنت جس نظام پر  
 چل رہی ہے، اگر انسان اس کا ایک جزو ہونے کے باوجود اس سے مختلف رویہ اختیار کرے تو لامحالہ اس کا  
 ایسا رویہ تباہ کن نتائج ہی پیدا کرے گا اس کا یہ سمجھنا کہ مجھ سے اوپر کوئی معتقد برا علی نہیں ہے جس کے منہ میں  
 جواب وہ ہوں، واقعہ کے خلاف ہے اس لیے جب وہ خود مختار بن کر خریدتا ہے، اس طرح تعمیر پر کام کرتا ہے۔  
 اپنا قانون زندگی آپ تجویز کرتا ہے تو نتیجہ بڑا نکلتا ہے۔ اسی طرح اس کا نیکو اور اسی اور کہ صاحب اختیار  
 آقا اور اس سے عورت یا لایع رکھنا، اس کی آفتابی کے آگے نکالنا یا ابھی تہمت کے خلاف ہے کیونکہ وہ

یہ حیثیت نہیں رکھتا لہذا اس کا نتیجہ بھی بُرا ہی نکلتا ہے۔ صحیح تعمیر برآمد ہونے کی صورت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ زمین و آسمان میں جو حقیقی حکومت ہے، انسان اُس کے سامنے سر جھکا دے، اپنی غوری و خود سری کو اس کے آگے تسلیم کر دے، اپنی اطاعت اور بندگی کو اس کے لیے خالص کر دے، اور اپنی زندگی کا ضابطہ و قانون خود بننے یا دوسروں سے بننے کے بجائے اُس سے لے۔

یہ بنیادی اصلاح کی تجویز ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی زندگی کے لیے پیش کی ہے۔ یہ مشرق اور مغرب کی قید سے آزاد ہے۔ روتے زمین میں جہاں جہاں انسان کہا رہا ہے یہی ایک اصلاحی تجویز ان کی زندگی کی بگڑی ہوئی شکل کو درست کر سکتی ہے۔ اور یہ باطنی و مستقبل کی قید سے بھی آزاد ہے۔ ڈیڑھ ہزار برس پہلے جو حقیقی صلح اور کارگر تھی اتنی ہی آج ہے اور اتنی ہی دس ہزار برس بعد بھی ہوگی۔

اب آخری شرط باقی رہ جاتی ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف خیالی نقشہ ہی پیش نہیں کیا بلکہ اُس نقشہ پر ایک زندہ سوسائٹی پیدا کر کے دکھا دی۔ انہوں نے ۲۳ برس کی مختصر مدت میں لاکھوں انسانوں کو خدا کی حکومت کے آگے سراطاعت سمجھانے پر آمادہ کر لیا۔ ان سے خود پرستی بھی چھرائی اور خدا کے سوا دوسروں کی بندگی بھی۔ پھر اُن کو جمع کر کے خالص خدا کی بندگی پر ایک نیا نظامِ اخلاق، نیا نظامِ تمدن، نیا نظامِ معیشت، اور نیا نظامِ حکومت بنایا، اور تمام دنیا کے سامنے اس بات کا عملی مظاہرہ کر کے دکھا دیا کہ جو اصول وہ پیش کر رہے ہیں اس پر کسی زندگی بنتی ہے، اور دوسرے اصولوں کی زندگی کے مقابلہ میں وہ کتنی اچھی کتنی پاکیزہ اور کتنی صالح ہے۔

یہ وہ کارنامہ ہے جس کی بنا پر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سرورِ عالم یا سارے جہاں کا لیڈر کہتے ہیں۔ اُن کا یہ کلام کسی خاص قوم کے لیے نہ تھا تمام انسانوں کے لیے تھا یہ انسانیت کی مشترک میراث ہے جس پر کسی کا حق کسی دوسرے سے کم یا زیادہ نہیں ہے۔ جو چاہے اس میراث سے فائدہ اٹھائے یہیں نہیں سمجھتا کہ اس کے خلاف کسی کو تعصب رکھنے کی اجازت ہے اور جب ہو سکتی ہے۔

# سورۃ عالم کا اصلی کا زامہ

دنیا جانتی ہے کہ نبی عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انسانیت کے اُس برگزیدہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو قدیم ترین زمانہ سے نوبہ انسانی کو خدا پرستی اور محسن اخلاق کی تعلیم دینے کے لیے اُتھا رہا ہے۔ ایک خدا کی بندگی اور پاکیزہ اخلاقی زندگی کا درس جو ہمیشہ سے دنیا کے پیغمبر، پشی اور مثنی دیتے رہے ہیں وہی آنحضرت نے بھی دیا ہے، انہوں نے کسی نئے خدا کا تصور پیش نہیں کیا ہے اور نہ کسی نر لے اخلاق ہی کا سبھی دیا ہے جو ان سے پہلے کے سربران انسانیت کی تعلیم سے مختلف ہو پھر سوال یہ ہے کہ اُن کا وہ اصلی کا زامہ کیا ہے جس کی بنا پر ہم انہیں تاریخ انسانی کا سب سے بڑا آدمی قرار دیتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بے شک آنحضرت سے پہلے انسان خدا کی ہستی اور اس کی وحدانیت سے آشنا تھا، مگر اس بات سے پوری طرح واقف نہ تھا کہ اس فلسفیانہ حقیقت کا انسانی اخلاق سے کیا تعلق ہے۔ بلاشبہ انسان کو اخلاق کے عمدہ اوصولوں سے آگاہی حاصل تھی، مگر اسے واضح طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ زندگی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں میں ان اخلاقی اوصولوں کی عملی ترجمانی کس طرح ہونی چاہیے۔ خدا پر ایمان اصول اخلاق اور عملی زندگی، یہ نہیں آگہ ایک چیزیں تھیں جن کے درمیان کوئی منطقی رابطہ، کوئی گہرا تعلق، اور کوئی پیوستہ شے موجود نہ تھا۔ یہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے ان تینوں کو ملا کر ایک نظام میں سمویا اور ان کے اتزاج سے ایک مکمل تہذیب و تمدن کا نقشہ محض خیال کی دنیا میں نہیں بلکہ عمل کی دنیا میں بھی قائم کر کے رکھ دیا۔

## ایمان عمل انگیز قوت ہے!

انہوں نے بتایا کہ خدا پر ایمان محض ایک فلسفیانہ حقیقت کے مان لینے کا نام نہیں ہے بلکہ اس ایمان کا مزاج اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک خاص قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتا ہے۔ اور اس اخلاق کا ظہور انسان کی عملی زندگی کے رویے میں ہونا چاہیے۔ ایمان ایک نغمہ ہے جو نفس انسانی میں جڑ کر پڑتے ہی اپنی فطرت کے مطابق عملی زندگی کے ایک پورے درخت کی تخلیق شروع کر دیتا ہے۔ اور اس درخت کے تنے سے لے کر اُس کی شاخ شاخ اور پتی پتی

(تک میں اخلاق کا وہ جیون روحانی ساری اہمیت ہے جس کی ستریں حکم کے ریشوں سے اُبتی ہیں جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ زمین میں بنی تو جلتے آسم کی گٹھلی اور اس سے نکل آتے لیوں کا وضعت، اُسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ دل میں بریا تو گیا ہو خدا پرستی کا بیج اور اس سے رونما ہو جلتے ایک مادہ پرستانہ زندگی جس کی رگ رگ میں بد اخلاقی کی نوح سمریت کیے ہوئے ہو۔ خدا پرستی سے پیدا ہونے والے اخلاق اور ترک، دبتریت یا رہبانیت سے پیدا ہونے والے اخلاق یکساں نہیں ہو سکتے۔ زندگی کے یہ سب نظریے اپنے الگ الگ فرائج رکھتے ہیں اور ہر ایک کا فرائج دوسرے سے مختلف قسم کے اخلاقیات کا تقاضا کرتا ہے۔

### پوری زندگی کے لیے خدا پرستانہ اخلاق

پھر جو اخلاق خدا پرستی سے پیدا ہوتے ہیں وہ صرف ایک خاص عابد ذرا ہدگر وہ کے لیے مخصوص نہیں ہیں کہ صرف خانقاہ کی چار دیواری اور عزت کے گوشے ہی میں ان کا ظہور ہو سکے۔ ان کا اطلاق وسیع پہلے پر پوری انسانی زندگی اور اس کے ہر میر پہلو میں ہونا چاہیے۔ اگر ایک تاجر خدا پرست ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی تجارت میں خدا پرستانہ اخلاق ظاہر نہ ہو۔ اگر ایک جج خدا پرست ہے تو عدالت کی کرسی پر، اور ایک پولیس میں خدا پرست ہے تو پولیس پوسٹ پر اس سے غیر خدا پرستانہ اخلاق ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح اگر کوئی قوم خدا پرست ہے تو اس کی شہری زندگی میں، اس کے انتظام ملکی میں، اس کی خارجی سیاست میں، اور اس کی صلح و جنگ میں خدا پرستانہ اخلاق کی نمود ہوئی چاہیے۔ ورنہ اس کا ایمان باللہ محض ایک لفظ بے معنی ہے۔ (م)

### حضور کی تعلیم کے چند اسباق

اب رہی بیبات کہ خدا پرستی کس قسم کے اخلاق کا تقاضا کرتی ہے اور ان اخلاقیات کا ظہور کس طرح انسان کی عملی زندگی میں، اور انفرادی و اجتماعی رویہ میں ہونا چاہیے، تو یہ ایک وسیع مضمون ہے جسے ایک مختصر گفتگو میں سمیٹنا مشکل ہے۔ مگر میں نمونے کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات آپ کو سناؤں گا جن سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ آنحضرت کے مرتب کیے ہوئے نظام زندگی میں ایمان، اخلاق اور عمل کا امتزاج کس نوعیت کا ہے۔

حضور فرماتے ہیں :-

الایمان بضع وسبعون شعبۃ افضلها قول لا الہ الا اللہ وادناها امانة الاذی

عن الطریق والحباء شعبۃ من الایمان -

ایمان کے بہت سے شعبے ہیں۔ اس کی بڑی بہت سے قسم خدا کے سوا کسی کو معبود نہ مانو، اور اس کی

آخری شاخ یہ ہے کہ راستے میں اگر تم کوئی ایسی چیز دیکھو جو بندگان خدا کو تکلیف دینے والی ہو تو

اُسے ہٹا دو۔ اور جیابھی ایمان ہی کا ایک شعبہ ہے۔



الطهور يشهد الايمان

”عجم و لباس کی پاکیزگی آدھا ایمان ہے“

الْمُؤْمِنُ مِنَ الْأَمَانَةِ عَلَى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ

”مؤمن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنی جان و مال کا کوئی خطرہ نہ ہو۔“

لَا إِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ -

”اُس شخص میں ایمان نہیں ہے جس میں امانت داری نہیں اور وہ شخص بے دین ہے جو عہد کا پابند نہیں۔“

إِذَا سَأَلَكَ حَسَنًا فَسَأَلَكَ سَيِّئًا تَدَّكَ فَأَنْتَ مُؤْمِنٌ -

”جب نیکی کر کے تجھے خوشی ہو اور بُرائی کر کے تجھے کھچتا دیکھو تو تو مؤمن ہے۔“

الإيمان الدبير والسماحة -

”ایمان کھل اور فراخ دلی کا نام ہے۔“

أَفْضَلُ الْإِيْمَانِ أَنْ تُحِبَّ لِلَّهِ وَتُبْقِضَ لِلَّهِ وَتَعْمَلَ لِسَانَكَ فِي ذِكْرِ اللَّهِ

وَأَنْ تُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ وَتُكْرَهُ لِهَرْمَانِكَ

لِنَفْسِكَ -

”بہترین ایمانی حالت یہ ہے کہ تیری دوستی اور دشمنی خدا واسطے کی ہو، تیری زبان پر خدا کا

نام جاری ہو اور تو دوسروں کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے اور اُن کے لیے وہی

کچھ ناپسند کرے جو اپنے لیے ناپسند کرتا ہے۔“

أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا وَالظَّهْرُ بِأَهْلِهِ -

”اہل ایمان میں سب سے زیادہ کامل ایمان اُس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں

اور جو اپنے گھر والوں کے ساتھ حسن سلوک میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔“

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِهْ ضَيْقَهُ وَلَا يُؤْذِ جَارَهُ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ

وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُتَّقِ خَيْرًا أَوْ لِيُحْمَدِكْ

”جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے اپنے بھان کی عزت کرنی چاہیے، اپنے بھان سے

”مذہب واضح رہے کہ یہ عربی عبارات نشر نہیں کی گئی تھیں بلکہ ان کا مرتب ترجمہ نشر کیا گیا تھا، بعد میں جب یہ شائع ہوئی تو ترجمہ

ساتھ اصل عربی عبارتیں بھی دیکھی گئی تھیں۔ (ترجمہ)



ان کا سر کر چھوڑنے سے نہیں خدا نے منع فرمایا ہے۔

أَتَذُنُّونَ مِنَ السَّائِقُونَ إِلَى قَبْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ؟ قَالُوا اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قَالَ الَّذِينَ إِذَا أَعْطُوا الْحَقَّ قَبْلُوكُمْ وَإِذَا سَأَلْتُمْ بِكُنُوتِهِ وَحَكْمَتِهِ لِنَاسٍ كَكُمِ هَهُمْ لَا تَفْقَهُونَ.

وہ جانتے ہو قیامت کے روز خدا کے سامنے میں سب سے پہلے جگہ پانے والے لوگ کون ہونگے۔  
 وہ جن کا حال یہ رہا کہ جب بھی حق ان کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے مان لیا، اور جب بھی حق ان سے  
 مانگا گیا تو انہوں نے کھلے دل سے دیا، اور دوسروں کے معاملہ میں انہوں نے وہی فیصلہ کیا جو وہ خود  
 اپنے معاملہ میں چاہتے تھے۔

أَهْمِنُوا لِي سِنًا مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَهْمِنُ لَكُمْ الْجَنَّةَ. أَصَدِّقُوا إِذَا حَدَّثْتُمْ، وَأَوْفُوا  
 إِذَا وَعَدْتُمْ، وَأَذُوا إِذَا نَهَيْتُمْ، وَاحْفَظُوا أَمْرَ بَعْضِكُمْ، وَغَضُّوا الْبَصَارَ كَمَا وَكَفُّوا  
 أَيْدِيَكُمْ.

وہ تم مجھ باتوں کی مجھے ضمانت دو میں نہیں جنت کی ضمانت دیتا ہوں، بلکہ تو سچ برار۔ وعدہ کرو تو  
 وفا کرو، امانت میں پورے اترو۔ بدکاری سے پرہیز کرو۔ بد نظری سے بچو۔ اور ظلم سے ہاتھ روکو۔  
 لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ خَيْبٌ وَلَا تَجْمِيلٌ وَلَا مَنَانٌ

”وہو کہ باز اور نخیل اور احسان جیسے والا آدمی جنت میں نہیں جا سکتا۔“  
 لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ تَبَّتْ مِنْ الشَّحْتِ وَمَلَّ لِحْمٌ تَبَّتْ مِنَ الشَّحْتِ نَاسًا  
 اَقْلَى بِهِ۔

”جنت میں وہ گوشت نہیں جا سکتا جو حرام کے تقویٰ سے بنا ہو۔ حرام خوری سے پلیم ہوئے  
 جسم کے لیے تو آگ ہی زیادہ موزوں ہے۔“

مَنْ بَاعَ عَيْبًا لَمْ يَبِهِ لَمْ يَزَلْ فِي مَقْتَبِ اللَّهِ وَلَمْ يَنْزَلِ الْمَدِيكَةَ تَلَعْتَهُ  
 ”جس شخص نے عیب دار چیز بیچی اور خریدار کو عیب سے آگاہ نہ کیا اس پر خدا کا غضب بھرا ہوا رہتا  
 ہے اور فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔“

لَوْ أَنَّ رَجُلًا قَتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ قَتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ عَاشَ ثُمَّ  
 قَتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ عَاشَ وَقَلْبُهُ دَرِينٌ مَا دَخَلَ الْجَنَّةَ حَتَّى يُقْسَى دِينَهُ۔  
 ”اگر کسی شخص نے عیب سے خرید کر لیا اور اس پر خدا کا غضب بھرا ہوا رہتا ہے اور فرشتے اس پر لعنت بھیجتے رہتے ہیں۔“

میں نہیں جاسکتا اگر اس پر فرض ہوا اور وہ ادا نہ کیا گیا ہو۔

رَبُّ الرَّجُلِ لَيَعْلَمُ الْمَوَاقِفَ بَطَانَةِ اللَّهِ حِينَ تَسْتَدِينُ نَحْمُحِبُّهُمَا الْمَوْتِ  
فِيصَدَّاقَيْنِ فِي الْوَجْهِ فَتَجِبُ لَهُمَا النَّارُ۔

مرد ہر یا عورت، اگر انہوں نے اپنی زندگی کے ساتھ سال بھی اللہ کی فرمانبرداری میں بسر کیے ہوں  
لیکن جب ان کی موت کا وقت آیا تو وصیت میں کسی کی حق نفی کر کے اُسے نقصان پہنچایا تو دونوں

دوزخ کے مستحق ہوں گے۔  
لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ سِوَى الْمَلَائِكَةِ۔

”وہ شخص سنت میں داخل نہ ہوگا جو اپنے ماتحتوں پر بڑی طرح افسری کرے گا۔“

أَلَا أُحِبُّكُمْ بِأَفْضَلِ مِنْ دَرَجَةِ الْحَيَّامِ وَالصَّادِقَةِ وَالصَّالِحَةِ؛ إِسْلَامُ خَلْقِ الْبَيْنِ  
وَإِسْلَامُ خَلْقِ الْبَيْنِ هِيَ الْحَالِقَةُ۔

”میں تمہیں بتاؤں کہ روز سے اور خیرات اور نماز سے بھی افضل کیا چیز ہے؟ وہ ہے بگاری میں صلح کرنا  
اور لوگوں کے باہمی تعنت میں مساوات اور انا و فعل ہے جو آدمی کی ساری نیکیوں پر پانی پھیر دیتا ہے؟“

إِنَّ الْمَغْلَسَ مِنْ أُمَّتِي مَنْ يَأْتِي يَوْمًا لِيُصَلِّئَهُ بِصَلْوَةٍ وَصِيَامٍ وَزَكَاةٍ وَيَأْتِي قَدْ كَسَمَ  
هَذَا وَفَدَتْ هَذَا أَوْ أَكَلَ مَا لَ هَذَا وَسَقَى دَمَ هَذَا وَصَرَ هَذَا فَيُعْطَى هَذَا مِنْ  
حَسَنَاتِهِ فَإِنْ قَصَبْتُمْ حَسَنَاتِهِ قَبْلَ أَنْ يُفْعَلَ مَا عَلَيْهِمْ أَمِغْدًا مِنْ حَطَايَاهُمْ فَطَرِحَتْ  
عَلَيْهِمْ نَمْرٌ طَرِحَ فِي النَّارِ۔

”اصل مغلس وہ ہے جو قیامت کے روز خدا کے حضور اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کے ساتھ نماز،  
روزہ، زکوٰۃ سب ہی کچھ تھا، مگر اس کے ساتھ وہ کسی کو گالی دے کر آیا تھا، کسی پر بہتان لگا کر آیا تھا، کسی  
کا مال مارکھا یا تھا، کسی کا خون بہا یا تھا، اور کسی کو پیٹ کر آیا تھا پھر خدا نے اس کی ایک ایک نیکی ان مغلوں  
پر بانٹ دی اور جب اس کے بھی حساب چکنا نہ ہوا تو ان کے گناہ لے کر اس پر ڈال دیئے اور اسے  
دوزخ میں بھونک دیا۔“

لَنْ يَهْلِكَ النَّاسُ حَتَّى يُعَذِّبُوا مِنْ أَنْفُسِهِمْ۔

”لوگ کبھی نجات سے محروم نہ ہوں اگر اپنی برائیوں کی تاویلیں کر کے اپنے نفس کو برا بنوں پر  
مطہن نہ کرنے رہیں۔“

أَلْحَسْبُكَ سُلْعَةٌ

وہ جو تاخیر میں طرہاٹنے کے لیے مال رکھ رکھے وہ ملوثوں ہے<sup>۱۱</sup>

مَنْ أَحْتَكِرْ كَلْبًا مَا آذَى بِيَدَيْهِ الْفَلَاحُ وَغَدِيرٌ بِرِيٍّ وَمَنْ أَلْفَهُ -

جس نے چالیس دن تک اس نسبت سے رکھ رکھا کہ قیمتیں چڑھ جائیں تو سودا کا افسوس سے اور اس کا خوار سے کوئی تعلق نہیں ہے<sup>۱۲</sup>

مَنْ أَحْتَكِرْ كَلْبًا مَا آذَى بِيَدَيْهِ الْفَلَاحُ وَغَدِيرٌ بِرِيٍّ وَمَنْ أَلْفَهُ -

”چالیس دن تک اسے رکھ رکھ کر خیرات بھی کرو سے تو معاملات نیک لیا جائیگا“

یہ بھی اصلی اشد علیہ و سلیم کے بہت سے اقوال ہیں۔ سے چند یہاں جو ہمیں نے محض نوتے کے طور پر آپ کے سامنے

دہن کیے ہیں۔ ان سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ حضور نے ایمان سے افلاق کا اور افلاق سے نڈھال کے تمام شعبوں کا

تعلق کس طرح قائم کیا ہے۔ تاہم شیخ کا ملاحظہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آپ نے ان باتوں کو صرف باتوں کی حد تک

ہی نہ رکھا بلکہ عمل کی دنیا میں ایک سو پورے ٹکڑے کے نظام نعتوان و بیاسست کو ابھی بنایا و مولد پر تمام کر کے رکھا دیا۔

اور آپ کا یہ بھی وہ گونا گوار ہے جس کی بنا پر آپ نوتے اثنافی کے سب سے بڑے رہنما ہیں۔<sup>۱۳</sup>

باب

تعمیر و ترمیم

# ختم نبوت کی حقیقت اور اس کے دلائل

## ختم نبوت کی صحیح توضیح

جب تک انسانی تمدن اس حد پر نہیں پہنچا تھا کہ کسی نبی کا پیغام عام ہو سکے اور انسانوں کی کوئی ایسی امت تیار نہ ہوتی تھی کہ نبی کے پیغام اور اس کی تعلیم اور اس کے اسوہ کو محفوظ رکھ سکے اور دنیا کے گوشے گوشے میں سے پھیلا سکے، اس وقت تک سلسلہ نبوت جاری رہا اور مختلف قوموں اور ملکوں میں نبی بھیجے جاتے رہے مگر جب ایک طرف تو تمدن اس حد تک ترقی کر گیا کہ ایک نبی کا پیغام عالمگیر ہو سکتا تھا، اور دوسری طرف ہدایت حق قبول کرنے والوں کی ایک ایسی امت بھی بن گئی جو کتاب الہی کو اور کتاب کے لانے والے کی سیرت اور اس کی مکمل عملی رہنمائی کو قبول کی توں محفوظ رکھنے کے قابل تھی تو نبوت کی خدمت پر کسی مزید آدمی کو مامور کرنے کی حاجت باقی نہ رہی ایسا حضور سے پہلے کے دور کے مخصوص احوال

ابتداء ہر قوم میں الگ الگ پیغمبر آتے تھے اور ان کی تعلیم ان کی قوم ہی کے اندر محدود رہتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت سب قومیں ایک دوسرے سے الگ تھیں۔ ان کے درمیان زیادہ میل جول نہ تھا۔ ہر قوم اپنے وطن کی حدود میں گہرا مقید تھی۔ ایسی حالت میں کوئی عام اور مشترک تعلیم تمام قوموں میں پھیلانی بہت مشکل تھی۔ اس کے علاوہ مختلف قوموں کے حالات ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ جہالت زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ اس جہالت کی بدولت اعتقاد اور اخلاق کی جو خواہاں پیدا ہوتی تھیں وہ ہر جگہ مختلف صورت کی تھیں۔ اس لیے ضروری تھا کہ ہر قوم کے پیغمبر کو الگ الگ تعلیم و ہدایت میں آہستہ آہستہ غلط خیالات کو مٹا کر صحیح خیالات کو پھیلائیں۔ رفتہ رفتہ باہم نظر نہیں

ملے جو لوگ ختم نبوت کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ انسانی شعور کم اس کی ضرورت نہیں رہی، وہ دراصل سلسلہ نبوت کی توہین اور اس پر حملہ کرتے ہیں۔ اس تعبیر کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ایک خاص شعوری حالت تک ہی اس ہدایت کی ضرورت ہے جو بنی لاقی ہیں۔ اس کے بعد انسان نبوت کی رہنمائی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ (امولٹ)

کو چھوڑ کر اعلیٰ درجہ کے قوانین کی پیروی سکھائیں اور اس طرح ان کی تربیت کریں جیسے بچوں کی کی جاتی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ اس طریقہ سے قوموں کی تعلیم میں کتنے ہزار برس صرف ہوتے ہوں گے۔ بہر حال ترقی کرتے کرتے آخر کار وہ وقت آیا جب نوب انسانی بچپن کی حالت سے گزر کر سن بلوغ کو پہنچنے لگی۔ تجارت و صنعت و حرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ قوموں کے تعلقات ایک دوسرے سے قائم ہو گئے۔ چین و جاپان سے لے کر یورپ و افریقہ کے دور دراز ملکوں تک جہاز رانی اور فضائی کے سفروں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اکثر قوموں میں تحریر کا رواج ہوا علوم و فنون پھیلے اور قوموں کے درمیان خیالات اور علمی مضامین کا تبادلہ ہونے لگا۔ بڑے بڑے فاتح پیدا ہوئے اور انہوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کر کے کئی کئی ملکوں اور کئی کئی قوموں کو ایک سیاسی نظام میں ملا دیا۔ اس طرح وہ دوری اور جدائی جو پہلے انسانی قوموں میں پائی جاتی تھی رفتہ رفتہ کم ہوتی چلی گئی اور یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کی ایک ہی تعلیم اور ایک ہی شریعت تمام دنیا کے لیے بھی جائے۔ اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے انسان کی حالت اس حد تک ترقی کر چکی تھی کہ گویا وہ خود ہی ایک منسک مدرسہ مانگ رہا تھا۔ بودھ مت اگرچہ کوئی پورا مذہب نہ تھا اور اس میں محض چند اخلاقی اصول ہی تھے، مگر ہندوستان سے نکل کر وہ ایک طرف جاپان اور منگولیا تک اور دوسری طرف افغانستان اور تاجکستان تک پھیل گیا اور اس کی تبلیغ کرنے والے دور دور ملکوں تک جا پہنچے۔ اس کے چند صدی بعد عیسائی مذہب پیدا ہوا۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسلام ہی کی تعلیم لے کر آئے تھے، مگر ان کے بعد عیسائیت کے نام سے ایک ناقص مذہب بنا لیا گیا اور عیسائیوں نے اس مذہب کو ایران سے لے کر افریقہ اور یورپ کے پورے درازہ ملکوں میں پھیلا دیا۔ یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ اس وقت دنیا خود ایک عام انسانی مذہب مانگت رہی تھی اور اس کے لیے یہاں تک تیار ہو گئی تھی کہ جب اسے کوئی پورا اور صحیح مذہب نہ ملا تو اس نے کچھ اور ناقص مذہبوں ہی کو انسانی قوموں میں پھیلا کر شروع کر دیا۔

### تیکمیل دین اور ختم نبوت

یہ وقت تھا جب تمام دنیا اور تمام انسانی قوموں کے لیے ایک پیغمبر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کی سرزمین میں پیدا کیا گیا اور ان کو اسلام کی پوری تعلیم اور مکمل قانون دے کر اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اسے ساری جہاں میں پھیلا دیں۔

خوب سمجھ لیجیے کہ اس زمانہ میں اسلام کا تاج اور سیدھا راستہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور قرآن مجید کے سوا نہیں ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام نوب انسانی کے لیے خدا کے پیغمبر ہیں۔ ان پر پیغمبری کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ انسان کو جس قدر ہدایت دیتا چاہتا تھا وہ سب کی سب اس نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعہ بھیج دی۔ اب جو شخص حق کا طالب ہو اور خدا کا مسلم بندہ بننا چاہتا ہو اس پر لازم ہے کہ خدا کے آخری پیغمبر پر ایمان



دیتے۔ جو کچھ تعلیم انہوں نے دی ہے اس کو ماننے اور جو طریقہ انہوں نے بتایا ہے اس کی پیروی کرے۔ ۵۲

### ختم نبوت پر دلائل

پیغمبری کی حقیقت کو جو شخص بھی سمجھتا ہو اس کے لیے یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ پیغمبر روز بروز پیدا نہیں ہوتے، نہ یہ ضروری ہے کہ ہر قوم کے لیے ہر وقت ایک پیغمبر ہو۔ پیغمبر کی زندگی دراصل اس کی تعلیم و ہدایت کی زندگی ہے۔ جب تک اس کی تعلیم اور ہدایت زندہ ہے، اس وقت تک گویا وہ خود زندہ ہے۔ پچھلے پیغمبروں کا دور ختم ہو گیا، کیونکہ جو تعلیم انہوں نے دی تھی دنیا نے اس کو بدل ڈالا۔ جو کتابیں وہ لاسکتے تھے ان میں سے ایک ہی آج اصل صورت میں موجود نہیں۔ خود ان کے پیروں بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ہمارے پاس پیغمبروں کی دی ہوئی اس کتابیں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی سیرتوں کو بھی بھلا دیا۔ پچھلے پیغمبروں میں سے کسی ایک کے بھی صحیح اور معتبر حالات آج کہیں نہیں ملتے۔ یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس زمانہ میں پیدا ہوئے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ کیا کام انہوں نے کیے؟ کس طرح زندگی بسر کی؟ کن باتوں کی تعلیم دی؟ اور کن باتوں سے روکا؟ مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذرہ نبوت جاری ہے، کیونکہ ان کی تعلیم و ہدایت زندہ ہے۔ جو قرآن انہوں نے دیا تھا وہ اپنے اصلی الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ اس میں ایک حرت، ایک نطقہ، ایک زیروزبر کا بھی فرق نہیں آیا۔ ان کی زندگی کے حالات، ان کے اقوال، ان کے افعال، سب کے سب محفوظ ہیں اور زیورہ سو برس سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد بھی تاریخ میں ان کا نقشہ ایسا صاف نظر آتا ہے کہ گویا ہم خود آنحضرت کو دیکھ رہے ہیں۔ دنیا کے کسی شخص کی زندگی بھی اتنی محفوظ نہیں جتنی آنحضرت کی زندگی محفوظ ہے۔ ہم اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں ہر وقت آنحضرت کی زندگی سے سبق لے سکتے ہیں۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ آنحضرت کے بعد کسی دوسرے پیغمبر کی ضرورت نہیں۔

ایک پیغمبر کے بعد دوسرا پیغمبر آنے کی صرف تین ہی وجہیں ہو سکتی ہیں:

- ۱۔ یا تو پہلے پیغمبر کی تعلیم و ہدایت مٹ گئی ہو اور اس کو پھر پیش کرنے کی ضرورت ہو۔
  - ۲۔ یا پہلے پیغمبر کی تعلیم مشکل نہ ہو اور اس میں ترمیم یا احسانہ کی ضرورت ہو۔
  - ۳۔ یا پہلے پیغمبر کی تعلیم ایک خاص قوم تک محدود ہو اور دوسری قوم یا قوموں کے لیے ایک الگ پیغمبر کی ضرورت ہو۔
- یہ تینوں وجہیں اب باقی نہیں رہیں۔

۱۔ ایک چوتھی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک پیغمبر کی موجودگی میں اس کی ترویج کیلئے ضرورت ہو جیسا کہ ہے۔ لیکن ہم نے اس کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ قرآن مجید میں اس کی صرف دو مثالیں مذکور ہیں۔ اور ان مستثنیٰ مثالوں سے یہ نتیجہ نہیں نکلا کہ دوسرا پیغمبر بھیجئے گا توئی عام قاعدہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہے۔ (مرواقت)

۱۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و ہدایت زندہ ہے اور وہ ذرائع پوری طرح محفوظ ہیں جن سے ہر وقت یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ حضور کا دین کیا تھا، کیا ہدایت کے کراپے آتے تھے، کس طرح زندگی کو آپ نے راجح کیا، اور کن طریقوں کو آپ نے مٹانے اور بند کرنے کی کوشش فرمائی پس جب کہ آپ کی تعلیم و ہدایت مٹی ہی نہیں تو اس کو از سر نو پیش کرنے کے لیے کسی نبی کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو اسلام کی مکمل تعلیم دی جا چکی ہے۔ اب نہ اس میں کچھ گھٹانے بڑھانے کی ضرورت ہے اور نہ کوئی ایسا نقص باقی رہ گیا ہے جس کی تکمیل کے لیے کسی نبی کے آنے کی حاجت ہو۔ لہذا دوسری وجہ بھی دور ہو گئی۔

۳۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی جلسہ و جمعے کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں اور تمام انسانوں کے لیے آپ کی تعلیم کافی ہے لہذا اب کسی خاص قوم کے لیے الگ نبی آنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح تیسری وجہ بھی دور ہو گئی۔

اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین کہا گیا ہے، یعنی سلسلہ نبوت کو ختم کر دینے والا۔ اب دنیا کو کسی دوسرے نبی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر خود چلیں اور دوسروں کو چلا سکیں۔ آپ کی تعلیمات کو سمجھیں، ان پر عمل کریں اور دنیا میں اس قانون کی حکومت قائم کریں جس کو کہے کہ آنحضرت تشریف لائے تھے۔ ﷺ

تمام نوع انسانی کے لیے ذریعہ ہدایت

وَمَا رَسَلْنَاكَ إِلَّا نِعْمَةً لِلنَّاسِ

بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَئِن كُنَّا لِلنَّاسِ

لَا عَالَمِينَ۔ (سبا: ۲۸)

اے نبی! ہم نے تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے

بشارت دینے والا بھیجا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں

ہیں۔

یعنی تم صرف اسی شہر، یا اسی ملک، یا اسی زمانے کے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نبی بنا کر بھیجے گئے ہو مگر یہ تمہارے ہم عصر اہل وطن تمہاری قدر و منزلت کو نہیں سمجھتے اور ان کو احساس نہیں ہے کہ کسی عظیم ہستی کی بعثت سے ان کو نواز گیا ہے۔ یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف اپنے ملک یا اپنے زمانے کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک پوری نوع بشری کے لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کی گئی ہے جیسا کہ:

اور میری طرف سے قرآن بھی بھیجا گیا ہے تاکہ اس کے

ذریعہ سے میں تم کو اور ہر اس شخص کو تنبیہ کروں جسے

کہ اَرْجِيْ اِلَيْهِ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِأَنْذِرْكُمْ

بِهِ وَرَعْنًا تَلْبَعًا۔ (انعام: ۱۹)

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ

جَبِينًا - (الاحزاب: ۱۵۸)

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ -

(الانبیاء: ۱۰۱)

- تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَى عَبْدِهِ

لِيُفَكِّرَ بِلِقَاءِ رَبِّهِمْ كَذُنُوبًا - (الفرقان: ۱)

آگے نبی کہہ کر اسے انسانوں میں تم سب کی طرف  
اللہ کا رسول ہوں۔

اور آگے نبی، ہم نے نہیں بھیجا تم کو مگر تمام جہان  
والوں کے لیے رحمت کے طور پر

بڑی برکت والا ہے وہ جس نے اپنے بندے پر فرقان  
نازل کیا، اگر وہ تمام جہان والوں کے لیے مشنبتہ  
کرنے والا ہو۔

یہی مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی بہت سی احادیث میں مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے مثلاً:  
بُعِثْتُ إِلَى الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ -

بِسْمِ اللَّهِ رَوَيْتُ أَبُو مُوسَى أَشْعَرِي

أَمَّا أَنَا فَأُرْسِلْتُ إِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ

عَامَّةً وَكَانَ مِنْ قَبْلِي إِنَّمَا يُرْسَلُ إِلَى

قَوْمٍ وَحَدِيدٌ - وَمُسَدِّحٌ رَوَيْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ مَرْثَدٍ

كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلَى قَوْمٍ خَاصَّةً

وَتُبْعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً مَدَنِيٌّ بَخَّارِيُّ

مِنْ حَدِيثِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ

بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَمَا تَبَيَّنَ

اصْبِعِينَ - (بخاری و مسلم)

میں جو امت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف بھیجا  
کیا ہوں، حالانکہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی گزرا ہے وہ  
اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔

پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا  
تھا اور میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں

میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں۔ یہ فرماتا  
ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں۔

مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی داخل نہیں ہے، اسی طرح میرے اور قیامت  
کے درمیان بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میرے بعد میں قیامت ہی ہے اور قیامت تک میں ہی رہنے والا ہوں۔

ساری انسانیت کے لیے بشیر و نذیر

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا

وَأَنْتَ مِنَ الَّذِينَ لَا تَخْلَفُونَ

(طہ: ۱۲۴)

تم تو میں ایک نبی بنا کر کے واسطے ہو، ہم نے تم کو حق  
کے ساتھ بھیجا ہے، بشارت دینے والا اور ڈرانے  
والا بنا کر، اور کوئی آفت ایسی نہیں گزری ہے

جس میں کوئی مشنبتہ کرنے والا نہ آیا ہو۔

پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اُسے نبی تھا بلکہ کام لوگوں کو خبردار کر دینے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی ہوش میں نہیں آتا اور اپنی گراہیوں ہی میں جھکتا رہتا ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اچھوٹا کہ دکھانے اور بیروں کو سنانے کی خدمت تمہارے سپرد نہیں کی گئی ہے۔

اور دوسری آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اِشْرَافِ ہوتی ہے یعنی یہ کہ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں گزری ہے جس کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی مبعوث نہ فرماتے ہوں۔ سورہ رعد میں فرمایا۔ وَيَكْلِفُ نَفْسًا كَافِرًا (سورہ بقرہ میں فرمایا: وَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِي شَيْخِ الْأَوَّلِينَ رَايِبًا ۝۱۰)۔ سورہ نحل میں فرمایا: وَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا (آیت ۳۶)۔ سورہ شفاء میں فرمایا: وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِ إِلَّا تَقَاتُا مَمْلُوكًا (آیت ۲۰۸)۔ مگر اس سلسلے میں دو باتیں سمجھ لینی چاہئیں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ اول یہ کہ ایک نبی کی تبلیغ جہاں جہاں تک پہنچ سکتی ہو وہاں کے لیے وہی نبی کافی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر سر برستی اور ہر سر قوم میں الگ الگ ہی انبیاء بھیجے جائیں۔ دوم یہ کہ ایک نبی کی دعوت و ہدایت کے آثار اور اس کی رہنمائی کے نقوش قدم جب تک دنیا میں محفوظ رہیں اُس وقت تک کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ لازم نہیں کہ ہر نسل اور ہر گشت کے لیے الگ نبی بھیجا جائے۔

آپ نوری انسانی کے لیے خدا کی رحمت ہیں

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

اُسے محمدؐ جو تم کو بھیجا ہے تیرے دراصل دنیا

والوں کے حق میں ہماری رحمت ہے

(الانبیاء۔ آیت: ۱۰۷)

دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے۔“ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دراصل نوری انسانی کے لیے خدا کی رحمت اور رہبرانی ہے کیونکہ آپ نے اگر غفلت میں پڑی ہوتی تو دنیا کو چوڑکا دیا ہے، اور اسے وہ علم دیا ہے جو حق اور باطل کا فرق واضح کرتا ہے اور اس کو بالکل غیر مشتبہ طریقہ سے تباہ کیا ہے کہ اس کے لیے تباہی کی راہ کونسی ہے اور سلامتی کی راہ کونسی۔ کفار اگر حضور کی بعثت کو اپنے لیے رحمت اور مصیبت سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں بھڑک ڈال دی ہے، ناخن سے گوشت جھا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر فرمایا گیا کہ نادانو! تم جسے رحمت سمجھ رہے ہو یہ درحقیقت تمہارے لیے خدا کی رحمت ہے۔

آپ تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ

اُسے محمدؐ کہو کہ اُسے انسانوں میں تم سب کی طرف

اِیْکُمُ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اُس خدا کا پیغمبر میں جو زمین و آسمانوں کی بادشاہی

والا عرفان - الاعراف - ۵۰ - فانما نكبتہ -

وَبَشِّرِ الصَّالِحِينَ الَّذِينَ إِذَا أُتُوا بِرَسُولٍ إِذَا أَنَّهُمْ لَهُمْ كَلِمَةٌ وَسِعَ الْبُرْجَانَ

”امت کا لفظ بیان محض قوم کے نبی میں نہیں ہے بلکہ ایک مثال کی آمد کے بعد اس کی دعوت جن لوگوں تک پہنچے وہ سب اس کی امت ہیں۔ نیز اس کے لیے یہ بھی مذکور نہیں ہے کہ رسول ان کے درمیان زندہ موجود ہو، بلکہ رسول کے بعد بھی جب تک اس کی تعلیم موجود رہے اور ہر شخص کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن ہو کہ وہ حقیقت کس چیز کی تعلیم دیتا ہے، اس وقت تک دنیا کے سب لوگ اس کی امت ہی قرار پائیں گے اور ان پر وہ حکم نازل ہوگا جو آگے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد تمام دنیا کے انسان آپ کی امت ہیں اور اس وقت تک رہیں گے جب تک قرآن اپنی خاص صورت میں شائع ہوتا رہے گا۔ اسی وجہ سے آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ”ہر قوم میں ایک رسول ہے“ بلکہ ارشاد یہ ہوا ہے کہ ”ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔“

اللہ نے ہر بستی میں ایک ایک نبی بھیجے کے بجائے ساری دنیا کے لیے آپ ہی کو نبی مقرر کیا ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ رَسُولًا مُّذَكِّرًا  
اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک  
نذیر (ٹھاکھڑا کرتے) : الفرقان (۱۵)

یعنی ایسا کرنا ہماری قدرت سے باہر نہ تھا۔ ہم چاہتے تو جگہ جگہ نبی پیدا کر سکتے تھے۔ مگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور دنیا بھر کے لیے ایک ہی بعوت کر دیا۔ جس طرح ایک سورج سارے جہان کے لیے کافی ہو رہا ہے اسی طرح یہ ایک آفتاب ہدایت ہی سب جہان والوں کے لیے کافی ہے۔

قرآن پاک میں حضور کو خبردار کرنے والا، ممتنبہ کرنے والا، غفلت اور گمراہی کے بُرے نتائج سے ڈرانے والا کے خطاب سے نوازا گیا ہے اور ساتھ ہی سارے جہان والوں کے لیے نذیر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی دعوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کسی ایک ملک کے لیے نہیں، پوری دنیا کے لیے ہے اور اپنی ہی زمانے کے لیے نہیں، آٹے والے تمام زمانوں کے لیے ہے۔ یہ مضمون متعدد مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً: يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں، والاعراف، آیت ۱۵۸۔ وَأَوْحِيَ إِلَيْهِ هَذَا الْقُرْآنَ لِأَنَّ كَلِمَةً وَوَسَّعَ بِمَنْعَةٍ۔

”میری طرف یہ قرآن بھیجا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے میں تم کو خبردار کروں اور جس شخص کو بھی یہ پہنچے وہ انعام پا جائے۔ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا۔ ہم نے تم کو سارے ہی انسانوں کے لیے بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔“ آیت ۱۰۸۔ اور اسی مضمون کو خوب کھول کھول کر نبی صلی اللہ

علیہ وسلم نے احادیث میں بار بار بیان فرمایا ہے کہ بُعِثْتُ فِي الْأَحْمَرِ وَالْأَسْوَدِ عِثْمِينَ كَلِمَةً أَوْ كَرْمَةً  
 سب کی طرف بھیجا گیا ہوں۔ اور کائنات پہنچی بُعِثْتُ إِلَى قَوْمِهِمْ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً۔  
 دیکھئے ایک نبی خاص طور پر اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔ اور میں عام طور پر تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔  
 بخاری و مسلم، وَأُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً وَخُتِمَ فِي الشَّيْئُونَ۔ میں ساری مخلقت کی طرف بھیجا گیا ہوں اور  
 اور ختم کر دیتے گئے میری آمد پر انبیاء علیہم السلام  
 آپ ہی خدا کے آخری نبی ہیں

قَرِيبٌ أَكِيكًا هَيْتَ لَوْ كُنَّ كَعِصَابٍ كَالْوَقْتِ أَوْ  
 وَهِيَ كَرَفْعَتِ فِي مِثْمَرٍ مَوْطَرٍ سَوِيَّةٍ هِيَ۔  
 اِنْتَزَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُدًى فِي  
 عَفْوَةٍ مُعْرَضُونَ۔ (الانبیاء- ۱)

مُراد ہے قُربِ قیامت یعنی اب وہ وقت دُور نہیں ہے جب لوگوں کو اپنا حساب پیش کرنے کے  
 لیے اپنے رب کے آگے حاضر ہونا پڑے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس بات کی علامت ہے کہ فروع  
 انسانی کی تاریخ اب اپنے آخری دور میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنے آغاز کی بنسبت اپنے انجام  
 سے قُرب تر ہے۔ آغاز اور وسط کے مرحلے گزر چکے ہیں اور آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ہے  
 جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپ نے اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا:  
 بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةَ كَعَفَاةٍ۔ میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح  
 ہیں۔ یعنی میرے بعد اب بس قیامت ہی ہے، کسی اور نبی کی دعوت پہنچ میں عامل نہیں ہے۔ سنبھلنا ہے تو میری  
 دعوت پر سنبھل جاؤ۔ کوئی اور ہادی اور شیر و نذیر آنے والا نہیں ہے۔ ۱۹

آپ پر نبوت کے ختم ہونے کے متعلق ایک اہم اشارہ

وَإِذَا أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا  
 آتَيْنَهُمْ مِنْ كِتَابٍ رَبِّكَ تَتَمَّ جَاءَكُمْ  
 رَسُولٌ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ  
 وَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ وَأَقْرَبُ إِلَيْكُمْ فَأَخَذْتُمْ  
 عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ أَصْوَابَكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ  
 الْكٰفِرُونَ۔ (آل عمران- ۸۱)

یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ "آج ہم نے  
 تمہیں کتاب و حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر  
 کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اُسی تعلیم کی تائید  
 کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے  
 تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی  
 یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ نے پوچھا کیا تم اس کا انکار کرتے  
 ہو؟ اور اس پر میری طرف سے عہد کی بخاری و ترمذی انہما نے ہوا، انہوں نے کہا "ہاں ہم انکار کرتے ہیں۔  
 مسئلہ یہ ہے کہ پیغمبر سے اس امر کا عہد لیا جاتا رہا ہے  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اس کے پیروؤں پر بھی آپ سے آپ ماند ہو جاتا ہے۔۔۔ کہ جو نبی ہماری طرف سے اُس دین کی تبلیغ و اقامت کے لیے بھیجا جاتے جس کی تبلیغ و اقامت پر ہم مامور ہوتے ہو، اس کا نہیں ساتھ دینا ہوگا۔ اُس کے ساتھ تعصب نہ برتا۔ اپنے آپ کو دین کا اجارہ دار نہ بھناتا۔ حق کی مخالفت نہ کرنا۔ بلکہ جہاں جو شخص بھی ہماری طرف سے حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے اٹھایا جاتے اس کے جھنڈے سے تلخے صحیح ہو جانا۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بہتر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور یہی بنا پر بہتر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کوئی عہد لیا گیا ہو۔ یا آپ نے اپنی امت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا مَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ  
مِّنْكُمْ لِكَيْتَقْوُوْا عَلٰىكُمُ الْيَقِيْنَ ۗ فَمَنْ  
اَتٰتٰكُم مِّنْ بَعْدِ ۤاُولٰٓئِكَ فَاَصْلَحْمْ  
وَلَا تَتَّبِعُوْهُمْ ۗ (الاحزاب : ۳۵)

اُسے سنی آدم، یاد رکھو، اگر تمہارے پاس خود تم ہی  
میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات  
سنا رہے ہوں، تو جو کوئی تمہاری طرف سے پیچھے گا تو  
اپنے رویہ کی اصلاح کر لیا اس کے لیے کسی  
خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

یہ بات قرآن مجید میں ہر جگہ اُس موقع پر ارشاد فرمائی گئی ہے جہاں آدم و خواہاں ملہما التمام کے جنت سے  
اُتارے جانے کا ذکر آیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورہ بقرہ، آیات ۳۸-۳۹۔ ظہر آیات ۱۲۳-۱۲۴، لہذا یہاں بھی  
اس کو اسی موقع سے متعلق سمجھا جائے گا، یعنی نوح انسانی کی زندگی کا آغاز جب ہو رہا تھا اسی وقت یہ بات  
ساتھ ظہر پر سمجھا دی گئی تھی۔ ۹۲

۱۔ نبوت کا معاملہ جیسا کچھ نازک ہے، غلط ہے۔ اس کو ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے ایمان و کفر اور اس کی نجات یا  
بربادی کا انحصار ہے۔ لیکن قرآن میں جہاں اس کے کہ جہنم کے بعد کسی نبی کے آنے کی خبر دی جاتی، اُٹا یہ فرمایا گیا کہ آپ  
خاتم النبیین ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اس کے کہ اپنی امت کو نبی کے بعد کے آنے والے کسی نبی پر ایمان  
لانے کی ہدایت کی ہوئی، بہتر سے امداد دینے میں آپ نے تصریح فرمائی کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور آپ پر نبوت  
ختم ہو گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کو ہمارے دین و ایمان سے آنز کیا دشمنی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا، مگر اللہ اور رسول دونوں ایسی باتیں فرماتے جن کی وجہ سے ہم اس کو نہ مان کر کفر اور مذہب  
انحراف میں مبتلا ہوتے۔ (مترجم)

### منکیرین ختم نبوت کے نلاف چند آیات سے استدلال

۱۱) وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ  
وَمَا نَكَرَ مِنْ شَوْجِذٍ فَأَبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ  
وَعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ وَآخَذْنَا مِنْهُمُ  
مِيثَاقًا غَلِيظًا۔ (الاحزاب آیت ۷)

اور اُسے نبیؑ یا دیکھو اُس عہد پر ایمان کو جو ہم نے  
سب پیغمبروں سے لیا۔ ہے تم سے بھی اور نوحؑ اور  
ابراہیمؑ اور موسیٰ اور عیسیٰ بن مریم سے بھی سب سے  
ہم پختہ عہد سے چکے ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات یاد دلاتا ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ سے  
بھی اللہ تعالیٰ ایک پختہ عہد لے چکا ہے جس کی آپ کو سختی کے ساتھ پابندی کرنی چاہیے۔ اس عہد سے کہ نسا عہد  
مُراد ہے، اور پتے جو سلسلہ کلام چلا آرہا ہے اس پر غور کرنے سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مُراد  
یہ عہد ہے کہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے بر حکم کی نورو اطاعت کرے گا اور دوسروں سے کہ اسے گا، اللہ کی باتوں کو کلمہ  
کاست پہنچاتے گا اور انہیں عمل نافذ کرنے کی سعی و کوشش میں کوئی دریغ نہ کرے گا قرآن مجید میں اس عہد کا ذکر  
مستعد مقامات پر کیا گیا ہے مثلاً:

۱۲) تَتَرَعَّ لَكُمْ مِنَ الَّذِينَ مَا وَصَّي بِهِ  
نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَ مَا  
وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى  
أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ۔  
(الشوریٰ: ۱۳)

اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا تمہارے لیے وہ دین  
جس کی ہدایت کی تھی اس نے نوحؑ کو اور جس کی وحی  
کی گئی، اُسے محمدؐ تمہاری طرف اور جس کی ہدایت  
کی گئی ابراہیمؑ اور موسیٰ اور عیسیٰ کو اس تاکید کے  
ساتھ کہ تم لوگ قائم کر دین کو اور اس میں تفرق نہ کرو۔

۱۳) وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ الَّذِينَ آتَيْنَا  
الْكِتَابَ لَعْنَتَهُمْ بَلَاغًا وَلَا تَلْمِزُونَهُ  
(آل عمران: ۱۸۴)

اور یاد کرو اس بات کو کہ اللہ نے عہد لیا تھا ان لوگوں  
سے جن کو کتاب دی گئی تھی کہ تم لوگ اس کی تعظیم کو  
بیان کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں۔

۱۴) وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ  
لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ۔ (البقرہ: ۸۳)

اور یاد کرو کہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ  
تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو گے۔

۱۵) أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِيثَاقُ الْكِتَابِ  
... خذوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ  
مَّا ذُكِّرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔

کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا؟ مضبوطی  
کے ساتھ تھا جو اس چیز کو جو ہم نے تمہیں دی ہے اور  
یاد رکھو اس ہدایت کو جو اس میں ہے توقع ہے  
کہ تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے۔



(۶) وَأَذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَ  
 مِيثَاقَهُ الَّذِي تَقَعَّضْتُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ  
 سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (المائدہ - ۷)

اور اُسے سنا لو، یاد رکھو اللہ کے اس احسان کو جو  
 اس نے تم پر کیا ہے اور اس عہد کو جو اس نے تم سے  
 لیا ہے جبکہ تم نے کہا ہم نے سنا اور اطاعت کی

اس عہد کو اس سیاق و سباق میں اللہ تعالیٰ جس وجہ سے یاد دل رہا ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم شہادتِ  
 اعداء کے اندیشے سے عہد بردے نشتر کے معاملہ میں باطنیت کی رسم توڑتے ہوئے جھجک رہے تھے۔ آپ کو  
 بار بار یہ شہر لاقح ہو رہی تھی کہ معاملہ ایک ناموں سے شناسی کرنے کا پے میں خواہ تھی ہی نیک نیتی کے ساتھ نفس  
 اصلاح و عاشرہ کی خاطر یہ کام کروں، مگر دشمن ہی کہیں گے کہ یہ کام دراصل نفس پرستی کی خاطر کیا گیا ہے اور صبح کا  
 لبادہ اس شخص نے محض فریب دینے کے لیے اوڑھ رکھا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ حضور سے فرما رہا ہے کہ تم ہمارے  
 مقرر کیے ہوئے پیغمبر ہو، تمام پیغمبروں کی طرح تم سے بھی ہمارا یہ نکتہ معاہدہ ہے کہ جو کچھ بھی حکم ہم دیں گے اس کو توڑ  
 بجالاؤ گے اور دوسروں کو اس کی پیروی کا حکم دو گے، لہذا تم کسی کے طعن و تشنیع کی پروا نہ کرو کسی سے شرم لو  
 خوف نہ کرو اور جو خدا مستہم تم سے لینا چاہتے ہیں اسے بلا تامل انہما دو۔

ایک گروہ اس میثاق سے وہ میثاق مراد لیتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے تمام انبیاء اور ان  
 کی امتوں سے، اس بات کے لیے لیا گیا تھا کہ وہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لائیں گے اور اس کا ساتھ دیں گے اس  
 تاویل کی بنیاد پر اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبوت کا وجود نہ ہو سکتا ہے اور  
 حضور سے بھی یہ میثاق لیا گیا ہے کہ آپ کے بعد جو نبی آئے آپ کی امت اس پر ایمان لائے گی۔ لیکن آیت کا سیاق  
 و سباق صاف بتا رہا ہے کہ یہ تاویل بالکل غلط ہے جس مسئلہ میں یہ آیت آئی ہے اس میں یہ کہنے کا سر سے  
 سے کوئی موقع ہی نہیں ہے کہ آپ کے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور آپ کی امت کو ان پر ایمان لانا چاہیے۔ یہ غہوم  
 اس کا لیا جاسے تو یہ آیت یہاں بالکل بے جواز اور بے دخل ہو جاتی ہے علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں کوئی صراحت  
 ایسی نہیں ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ یہاں میثاق سے کوئی میثاق مراد ہے۔ لامحالہ اس کی نوعیت معلوم کرنے  
 کے لیے ہم کو قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی طرف رجوع کرنا ہو گا جہاں انبیاء سے یہے ہوئے موافق کا ذکر  
 کیا گیا ہے۔ اب اگر سارے قرآن میں صرف ایک ہی میثاق کا ذکر ہوتا اور وہ بعد کے آنے والے انبیاء پر ایمان لنے  
 کے بارے میں ہوتا تو یہ خیال کرنا درست ہوتا کہ یہاں بھی میثاق سے مراد وہی میثاق ہے۔ لیکن قرآن پاک کو جس شخص نے  
 بھی آنکھیں کھول کر پڑھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس کتاب میں بہت سے بیانات کا ذکر ہے جو انبیاء علیہم السلام  
 ان کی امتوں سے لیے گئے ہیں۔ لہذا ان مختلف موافق میں سے وہ میثاق یہاں مراد لینا صحیح ہو گا جو اس سیاق و  
 سباق سے مناسبت رکھتا ہو، نہ کہ وہ میثاق جس کے ذکر کا یہاں کوئی موقع نہ ہو۔ اسی طرح کی غلط تاویل سے

یہ بات کھل جاتی ہے کہ بعض لوگ قرآن سے ہدایت لینے نہیں بیٹھتے بلکہ اُسے ہدایت دینے بیٹھ جاتے ہیں۔

(۱۴) قَمَعَنَ اَظْلَمَهُ مَعْنَى اَفْكَرَى عَلَيَّ  
 اللّٰهُ كَذَّبَا اَوْ كَذَّبَتْ بِالْبَيْتِ طَرِيقَهُ لَا  
 يَفْعَلُ الْمَلْجُؤُونَ -  
 پھر اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو کہ جھوٹی  
 بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی  
 واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کہیں

دریس: ۱۴) فلاح نہیں پاسکتے۔

بعض نادان لوگ "فلاح" کو طویل عمر یا ذمیوی خوشحالی یا ذمیوی فردغ کے معنی میں لے لیتے ہیں، اور پھر اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ جو شخص ہرگز کا دعویٰ کر کے جتنا رہے، یا دنیا میں پھلے پھولے۔ یا اس کی دعویٰ کو فردغ نصیب ہو، اسے ہی برحق مان لینا چاہیے کیونکہ اس نے فلاح پائی۔ اگر وہ ہی برحق نہ ہوتا تو جھوٹا دعویٰ کرتے ہی مار ڈالا جاتا، یا جھوٹوں مارا جاتا اور دنیا میں اس کی بات چلنے ہی نہ پاتی۔ لیکن یہ اعتقادنا استدلال صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح "فلاح" کا مفہم جانتا ہو، نہ اُس قانون اجمال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مجرموں کے لیے مقرر فرمایا ہے، اور نہ ہی سمجھتا ہو کہ اس سلسلہ بیان میں یہ فقرہ کس معنی میں آیا ہے۔

اول تو یہ بات کہ "مجرم فلاح نہیں پاسکتے" اس سیاق میں اس حقیقت سے فرمائی ہی نہیں گئی ہے کہ یہ کسی کے دعوئے ہرگز کو رکھنے کا معیار ہے جس سے عام لوگ جانچ کر خود فیصلہ کر لیں کہ جو دعویٰ ہرگز "فلاح" پارہا ہو اس کے دعوئے کو مانیں اور جو فلاح نہ پارہا ہو اس کا انکار کریں۔ بلکہ یہاں تو یہ بات اس معنی میں کہی گئی ہے کہ "میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی، اس لیے میں خود تو یہ مجرم نہیں کر سکتا کہ ہرگز کا جھوٹا دعویٰ کروں، البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم سچے نبی کو جھٹلانے کا مجرم کر رہے ہو اس لیے تمہیں فلاح نصیب نہیں ہوگی۔"

پھر فلاح کا لفظ بھی قرآن میں ذمیوی فلاح کے محدود معنی میں نہیں آیا ہے، بلکہ اس سے مراد وہ پائیدار کامیابی ہے جو کسی شہران پر فتح ہونے والی نہ ہو، قلع نظر اس سے کہ ذمیوی زندگی کے اس ابتدائی مرحلہ میں اس کے اندر کامیابی کا کوئی پہلو ہو یا نہ ہو، ہو سکتا ہے کہ ایک داعی ضلالت دنیا میں نہرے سے جیسے، خوب چلے پھولے اور اس کی گراہی کو بڑا فردغ نصیب ہو، مگر یہ قرآن کی اصطلاح میں فلاح نہیں، عین شہران ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک داعی حق دنیا میں سخت مصیبتوں سے دوچار ہو، شدتِ آلام سے تندرہ سال ہو کہ باظالموں کی دستبردازیوں کا شکار ہو کر دنیا سے جلد ہی رخصت ہو جائے، اور کوئی اسے مان کر نہ دے، مگر یہ قرآن کی زبان میں شہران نہیں عین فلاح ہے۔

علاوہ بریں نزان میں جبکہ جگہ یہ یا سب پوری تشریح کے ساتھ میان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کو کچھ کرنے میں جلدی نہیں کیا کرتا بلکہ انہیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے، اور اگر وہ اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا لے اور زیادہ بگڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے اور سب اوقات ان کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے نفس کی چھپی ہوئی غماز سرانجام کو پوری طرح ظہور میں لے آئیں اور اپنے عمل کی بنا پر اس سزا کے مستحق ہو جائیں جس کے وہ اپنی بُری صفات کی وجہ سے فی الحقیقت مستحق ہیں۔ پس اگر کسی جھوٹے مدعی کی سی درازہ ہو رہی ہو اور اس پر ذریعہ "علاج" کی برسات برس رہی ہو تو نعمتِ خلقی ہوگی اگر اس کی اس حالت کو اس کے برسرِ عرابت ہونے کی دلیل سمجھا جائے۔ خدا کا قانون اجمال و استدراج جس طرح تمام مجرموں کے لیے عام ہے اسی طرح جھوٹے مدعیانِ نبوت کے لیے بھی ہے اور ان کے اس سے مستثنیٰ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ پھر شیطان کو قیامت تک کے لیے جو مہلت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اس میں بھی یہ استثنا نہیں مذکور نہیں ہے کہ تیرے اور تو سارے فریب چلنے دیتے جائیں گے لیکن اگر تو اپنی طرف سے کوئی نبی گھڑا کرے گا تو یہ فریب نہ چلے دیا جائیگا۔

ممکن ہے کوئی شخص ہماری اس بات کے جواب میں وہ آیت پیش کرے جو سورہ الحاقہ آیات ۴۴-۴۵ میں ارشاد ہوئی ہے کہ: **وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ**۔ **لَعَلَّ نَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ**۔ یعنی اگر محمد نے خود گھڑ کر کوئی بات ہمارے نام سے کہی ہوتی تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور اس کی رگِ دل کاٹ ڈالتے۔ لیکن اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ جو شخص نبی الواقع خدا کی طرف سے نبی مقرر کیا گیا ہو وہ اگر جھوٹی بات گھڑ کر وحی کی حیثیت سے پیش کرے تو فوراً پکڑا جائے۔ اس سے یہ استدلال کرنا کہ جو مدعی نبوت پکڑا نہیں جا رہا ہے وہ ضرور سچا ہے، ایک منطقی مقالہ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خدا کے قانونِ اجمال و استدراج میں جو استثنا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے وہ صرف پتے نبی کے لیے ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلنا کہ جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے وہ بھی اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کلری ملازموں کے لیے حکومت نے جو قانون بنایا ہو اس کا اطلاق صرف انہی لوگوں پر ہوگا جو واقعی سرکاری ملازم ہوں۔ رہے وہ لوگ جو جعلی طور پر اپنے آپ کو ایک سرکاری عہدہ دار کی حیثیت سے پیش کریں، تو ان پر سزا بلکہ ملازمت کا نفاذ نہ ہوگا بلکہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا جو سزا بلکہ فوجداری کے تحت عام بد معاشوں اور مجرموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ علاوہ بریں سورہ الحاقہ کی اس آیت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے وہ بھی اس عرض کے لیے نہیں فرمایا گیا کہ لوگوں کو نبی کے پرکھنے کا معیار بتایا جائے کہ اگر پردہ غیب سے کوئی ہاتھ نو دار ہو کر اس کی رگِ دل اچانک کاٹنے لے تو سمجھیں جھوٹا ہے ورنہ مان لیں کہ سچا ہے نبی کے صادق یا کاذب ہونے کی جانچ اگر اس کی سیرت، اس کے کام اور اس چیز سے جو وہ پیش کر رہا ہو، ممکن نہ ہوتی تو ایسے غیر معقول معیار تجزیہ کرنے

کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔

خاتم القبتین کے بعد دعوات سے نبوت

سوال: ”ترکیبان القرآن“ جنوری، فروری کے س ۲۳۶ پر آپ نے لکھا ہے کہ میرا تجربہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی جھوٹ کو فروغ نہیں دیتا میرا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ . . . . . جن لوگوں کو میں صداقت و دیانت سے بے پروا اور خوف خدا سے خالی پاتا ہوں، ان کی باتوں کا کبھی جواب نہیں دیتا . . . . . خدا ہی ان سے بدلے سکتا ہے . . . . . اور ان کا پردہ انشاء اللہ دنیا ہی میں فاش ہوگا . . . . . میں عرض کر دوں کہ میں نے جماعت احمدیہ کے نظریہ کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے کام سے پوری لی ہے میرے مندرجہ ذیل استفسارات اسی ضمن میں ہیں:

۱۔ یہ نبوت آپ ہی کا تجربہ نہیں، بلکہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ”اللہ تعالیٰ کا ذریعہ سے محبت نہیں کرتا۔ اور اللہ کی لعنت ہے جھوٹوں پر“ اور پھر اس قسم کے جھوٹوں پر کہ ”وَلَا تَقُولُ عَلٰی مَا لَا یَعْلَمُ الْبَعْضُ الْاٰیٰتِ بِلٰلِہِ . . . . . ان کی مزا تو فری گرفت اور دو سال (۱۹۷۲) سے لے کر آج تک بالیسین شہر قطعاً جنتہ الذکوٰۃ ما کا قہر (۱۹۷۲)۔ اس صورت میں اگر مرزا صاحب جھوٹے تھے تو کیا وجہ ہے کہ (۱) ابھی تک اللہ تعالیٰ نے ان پر کوئی گرفت نہیں کی، (۲) ان کی جماعت بڑھ رہی ہے اور مرزا صاحب کے مشن کو جہاں جہاں کے نزدیک گراہ کن ہے تقویت پہنچ رہی ہے اور اب تو اس جماعت کی جڑیں بیرونی ممالک میں مضبوط ہو گئی ہیں اور، مرزا صاحب کے پیغام کو ساٹھ سال جو گئے ہیں۔ ہم کب تک خدائی قیامت کا انتظار کریں؟ فی الحال تروہ ترقی کر رہے ہیں (۳) جو معتقدین یا افراد اس گروہ کی مخالفت کر رہے ہیں وہ کیوں اسے ترک نہیں کر دیتے اور معاملہ خدا پر نہیں چھوڑ دیتے؟

۲۔ صفر ۲۲۲ پر آپ کی جماعت کے ایک جرمنی نژاد ہمدرد نے برلن میں جماعت احمدیہ کے ساتھ تبلیغ اسلام میں تعاون کا نوکر کیا ہے۔ اگر آپ بھی ان کی تبلیغ اسلام کو صحیح سمجھتے ہیں تو پاکستان میں ان کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے؟

جواب: آپ سرسری نظر سے ایک تدعی نبوت کے معاملے کو دیکھ رہے ہیں یہ طریقہ ایسے اہم مسئلے پر راستے قائم کرنے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ تو سراسر ایک جھوٹے الزام کے بارے میں تھا جو بعض خود غرض لوگوں نے میرے اوپر لگایا تھا۔ اس بات کو آپ چسپاں کر رہے ہیں ایک ایسے شخص کے معاملے پر جس نے فی الواقع نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ ایک تدعی نبوت کے معاملے میں لامحالہ دو صورتوں میں سے ایک صورت پیش آتی ہے: اگر وہ چلتا ہے تو اس کو نہ ملتے والا کافر اور اگر وہ ٹھہرتا ہے

اور اس کو ماننے والا کافر۔ ایک ایسے نازک معاملے کا فیصلہ آپ صرف اتنی سی بات پر کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی تک ان پر کوئی گرفت نہیں کی، اور ان کی جماعت بڑھ رہی ہے، اور یہ کہ ”ہم کب تک خدا کی فیصلہ کا انتظار کریں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے اور اس کی جماعت ترقی کرتی نظر آتے اور آپ کی تجویز کردہ مدت انتظار کے اندر اس پر خدا کی طرف سے گرفت نہ ہو تو بس یہ باتیں اس کو نبی مان لینے کے لیے کافی ہیں؟ کیا آپ کے ذہن میں نبوت کو جانچنے کے یہی معیار ہیں؟

آیت: **وَلَوْ تَشَاءُونَ لَبَدَّلْنَا تِلْكَ الْقُرْآنَ وَمَا أَنتَ بِمُعْتَدٍ** سے جو استدلال آپ نے کیا ہے وہ نبیادی طور پر غلط ہے۔ اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو حقیقت میں اللہ کے نبی ہیں، اگر خدا کی مرضی کے بغیر کوئی بات خود تصنیف کر کے خدا کے نام سے پیش کریں تو ان کی رگ گلو کاٹ دی جائے گی۔ اس سے یہ معنی نکالنا صحیح نہیں ہے کہ جو شخص حقیقت میں نبی نہ ہو اور غلط طور پر اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کرے اس کی رگ گلو بھی کاٹی جائے گی۔ نیز اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سچے اور تجھوٹے نبی کی پہچان کے لیے یہ بات ایک معیار کے طور پر پیش نہیں کی ہے کہ جس مدعی نبوت کی رگ گلو نہ کاٹی جائے وہ سچا نبی ہے اور جس کی رگ کاٹ دی جائے وہ جھوٹا مدعی۔ قرآن کی آیتوں میں تاویل کی یہ کھینچ تان جو ظاہر ہے کہ آپ کی اپنی ایچ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ مرزا صاحب کی جماعت سے ہی آپ نے سیکھی ہے، بجائے خود اس بات کی علامت ہے کہ یہ جماعت صرف خدا سے کس قدر خالی ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص نبوت کا دعویٰ کرے اس کی بات کو ان معیاروں پر نہیں جانچا جائے گا جو آپ نے پیش کیے ہیں بلکہ اسے پورے اطمینان کے ساتھ اس نبیاد پر زور دیا جائے گا کہ قرآن و احادیث سچے اور معاملے میں قطعی ناطق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ ان دلائل سے بھی واقف ہوں جو مرزا صاحب اور ان کے قبیحین نے باب نبوت کے کھلے ہونے پر قائم کیے ہیں۔ مگر آپ صاف عرض کرتا ہوں کہ ان دلائل سے اگر کوئی متاثر ہو سکتا ہے تو وہ صرف ایک بے علم یا کم علم آدمی ہی ہو سکتا ہے، ایک صاحب علم آدمی ان کے دلائل دیکھ کر صرف ان کے جہل ہی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

ترجمان القرآن میں جرمنی کا جو مکتوب شائع ہوا ہے اس کی اشاعت کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی ہر بات ہمارے نزدیک سچی ہے۔ ہمارا مدعا تو یہ تھا کہ ہمارے ملک کے مسلمانوں کو اپنے جرمن نو مسلم بھائیوں کی حالت سے آگاہ کیا جائے اور ان کی مدد پر آگیا جائے۔ وہ لوگ بھاریے سنتے سنتے مسلمان ہیں، ان کو کیا غیر کر دینا ہے؟ اسلام میں کس قسم کے نفعیہ اٹھ رہے ہیں۔ ان کو تو اسلام کے نام سے جو چیز جہاں سے بھی ملے گی وہ اس سے اپنی تشنگی بھاننے کی کوشش کریں گے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ انہیں اسلام کے متعلق صحیح اطلاع فراہم کرنے دیں۔

درت اندیشہ ہے کہ وہ بے پار سے ناواقفیت میں کسی فتنے کا شکار نہ ہو جائیں۔

سوال: آپ کا جواب ملا۔ افسوس کہ وہ میری تشفی کے لیے کافی نہیں ہے۔ میں نے آپ ہی کی وی ہوتی  
حقیقتاً خدا تعالیٰ خود جو ٹکے کو مرزا سے لگا۔ کی روشنی میں پوچھا تھا کہ مرزا غلام احمد صاحب قادیانی  
جو سب مسلمانوں کے نزدیک کا ذب ہیں ان پر کیوں خدا تعالیٰ کی گرفت نہیں ہوتی، اور یہ کہ خدا تعالیٰ  
کس طرح اپنے بندوں کو اتنے عرصے سے گمراہ ہونے دیکھ رہا ہے۔

میں مرزا صاحب کی تعریف کر وہ تقریباً ۲۵ کتب تحقیقی نظر سے دیکھ چکا ہوں، اور اس کے  
بعد ملنے اسلام کی بعض کتب بھی ان کے رد میں دیکھی ہیں مجھے اقرار ہے کہ میں نے آپ کی کوئی  
کتاب اس موضوع پر نہیں پڑھی۔ ویسے علماء کی کتب کے متعلق میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ:

انہوں نے مرزا صاحب کی تحریروں میں تعریف کر کے غلط مطالب ان کی طرف منسوب کیے ہیں۔  
جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے اس پر انہیں عبور نہیں تھا بعد میں میری خط و کتابت پر  
یہ لوگ عموماً خاموش رہتے ہیں۔ مرزا صاحب کی کتب سے ہیں جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ مرزا صاحب  
کی ذات اور اقوال معنی ظاہر و باطن آنحضرت صلعم کے عشق سے پر ہے، ہیں اس بنیاد کو لے کر مرزا  
صاحب کے دعوے کی طرف بڑھا تھا اور اب مجھ پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ:

۱۔ مرزا صاحب کے دعاوی قرآن اور اقوال نبوی کے خلاف نہیں۔

۲۔ مرزا صاحب کی نبوت آنحضرت کی شان ٹھٹھانے کے لیے نہیں، بلکہ اگر موسوی فیضان سے

قریب قریب نبی ہو سکتے ہیں تو تمام محمدی کے سابق گاؤں گاؤں ایسے لوگ ہونے چاہیں جو بتائیں کہ ہم نے

شریعت محمدیہ پر عمل کر کے مکالمہ الہیہ حاصل کیا ہے۔ خود مرزا صاحب نے فرمایا ہے کہ

آیں چشمہ رواں چل نخلی خد اودیم

یک قطرہ ز بحر کمال محسبہ است

اب آپ نے پھر مجھے مرزا صاحب کے دعوے کو پرکھنے کی اجازت دی ہے، کیا آپ براہ کرم

قرآن کریم سے میری رہنمائی کے لیے مرزا صاحب کے کسی ایک دعوے کو چھوٹا ثابت کر دیں گے؟

جواب: پھیلا خط آپ کی تشفی کے لیے کافی ہو جاتا، اگر آپ تشفی چاہتے ہیں تو ترجمان القرآن میں جو کچھ

لکھا تھا وہ تران لوگوں کے بارے میں تھا جو مجھ پر ایک ٹھوٹا بہتان لگا رہے ہیں، اور اس میں اللہ تعالیٰ پر یہ

اعتقاد ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ ضرور چھوڑیں گے مرزا سے لگا۔ مگر آپ اسے ایک مدعی نبوت کے دعوے کو چھیننے

کے لیے معیار ٹھیرا رہے ہیں اور معیار بھی اس شان کے ساتھ کہ اگر مدعی کو سزا ملتی ہوتی نظر نہ آئے تو ضرور

سچا ہے؟ کیا واقعی لوگوں کے صادق و کاذب اور راہ یاب و گمراہ ہونے کے لیے یہ کوئی صحیح معیار ہے کہ جسے دنیا میں سزا مل جائے وہ جھوٹا اور گمراہ، اور جسے سزا نہ ملے وہ سچا اور ہدایت یافتہ؟

آپ عجیب بات فرما رہے ہیں کہ مرزا صاحب کے دعوے کو ۱۰ سال گزر چکے ہیں، آخر تک تک کوئی اختلاف کرنے۔ دعوائے نبوت کی صداقت کو پرکھنے کی یہ عجیب کسوٹی جو آپ نے تجویز فرمائی ہے، فرما اس کی توضیح نہ فرماتے کہ ایک جھوٹے مدعی کو آپ کے نزدیک کس قسم کی سزا ملنی چاہیے؟ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ نبی سے ایک ہاتھ بڑھے اور اس کی رگ رگ گلو کاٹ دے، تو میں عرض کروں گا کہ یہ سزا تو مسیلت تک کو نہیں تھی جس نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اگر آپ کا مراد یہ ہے کہ جو مدعی نبوت انسانوں کے ہاتھ سے مارا جائے وہ جھوٹا ہے، تو ان اقبالیہ کے متعلق آپ کیا فرمائیں گے جن کی نبوت کی تسمیہ

خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ ان کی قوم نے انہیں قتل کر دیا، قرآن میں یہ آیات تو آپ کی نظر سے گزری ہی ہونگی کہ قُلْ تَدَّعَاؤُكُمْ كَبُرَ عَلَىٰ مَنْ قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَاللَّذَىٰ قَتَلْتُمْ قَلْبًا قَتَلْتُمْ هُمْ أَنْ كُنْتُمْ ضَالِّينَ (آل عمران: ۱۸۳) اور فَبِمَا نَفَعْتِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعْنَهُمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَيْدِيَّاءَ بَعْتِ بَعْضِي فِي السَّامِ (۱۵۵)۔ ان آیات کی روشنی میں آپ کو ایک مرتبہ پھر اپنے انداز فکر پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ نبی کا دعویٰ اس طرح کے معیاروں پر نہیں چا نچا جاتا۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ اس سے پہلے آتے ہوئے کلام الہی کی روشنی میں اُس کا مقام کیا ہے؟ وہ چیز کیا لایا ہے؟ اور اس کی زندگی کیسی ہے؟ ان معیاروں پر کوئی شخص پورا نہ اترتا ہو تو آپ سخت غلطی کریں گے اگر اس کے دعوے کو صرف اس بنا پر مان لیں گے کہ آپ کی آنکھوں نے اسے اس دنیا میں سزا ملنے نہیں دیکھا۔

جو نین معیار میں نے اوپر بیان کیے ہیں ان میں سے ٹوٹرا لڈ کر دو معیار ایسی صورت میں سرے سے قابل لحاظ ہی نہیں رہتے جبکہ پہلے ہی معیار سے کسی مدعی نبوت کا دعویٰ خیریت نگزر سکے جب قرآن اور احادیث سے یہ ثابت ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی نیا نبی نہیں آسکتا تو یہ دیکھنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے کہ حضور کے بعد دعوائے نبوت کرنے والا کیا لایا ہے اور کیسا انسان ہے۔ اگرچہ مرزا صاحب سے نزدیک دوسرے اور تیسرے معیار کے لحاظ سے بھی تمام نبوت سے اس قدر فرود تریں کہ باب نبوت کھلا ہی ہوتا تو کم از کم کوئی مقبول آدمی تو ان پر نبوت کا گمان نہیں کر سکتا تھا، لیکن میں اس بحث کو قرآن و حدیث کے مطلق فیصلے کے بعد غیر ضروری بھی سمجھتا ہوں اور خدا اور رسول کے مقابلے میں گستاخی بھی۔

یہ سوال کہ قرآن و حدیث سے باب نبوت کے قطعی طور پر بند ہونے کے دلائل کیا ہیں، اس کا متعلق نہیں ہے کہ ایک خط میں اس کا جواب دیا جائے اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے فرصت دی تو انشاء اللہ اس موضوع پر محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ایک مشتمل مضمون لکھوں گا، ورنہ سورۃ احزاب کی تفسیر میں تو یہ بحث آئی ہی ہے ۹۵  
تخم نبوت کے خلاف قادیانیوں کی ایک اور دلیل

سوال: تعلیم القرآن، سورۃ آل عمران، ۲۶۰، آیت ”وَ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ...“  
... الخ کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے حاشیہ نمبر ۶۹ میں درج کیا ہے کہ ”یہاں اتنی بات اور  
کچھ یعنی چاہیے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہ عہد لیا جاتا رہا ہے، اور اسی بنا پر  
ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے  
لیکن نہ قرآن میں، نہ حدیث میں، کہیں بھی اس امر کا تذکرہ نہیں ملتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا  
عہد لیا گیا ہو، یا آپ نے اپنی امت کو کبھی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی  
ہدایت فرمائی ہو۔“

اس عبارت کا مطالعہ کرنے کے بعد دل میں یہ بات آئی کہ شک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نہیں فرمایا،  
لیکن خود قرآن مجید میں سورۃ احزاب میں ایک ميثاق کا ذکر ملتا ہے: ”وَ إِذَا أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ  
مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَ وُجَّهٌ...“ الخ یہاں لفظ ”ميثاق“ کے ذریعے نبی صلی اللہ علیہ  
وسلم سے خطاب ہے۔ ”ميثاق“ وہی ہے کہ جس کا ذکر سورۃ آل عمران میں ہو چکا ہے۔ ہر دو سوروں یعنی آل عمران  
اور الاحزاب کی مذکورہ بالا آیات میں ميثاق کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی ميثاق جو دوسرے انبیاء  
سے لیا گیا تھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی لیا گیا ہے۔

دراصل یہ سوال احمدیوں کی ایک کتاب پڑھنے سے پیدا ہوا ہے جس میں ان دونوں صورتوں  
کی تفسیر کی ہے کہ وہ یہ ہے کہ ”ميثاق“ پر بڑی بحث درج ہے۔  
جواب: آیت ”وَ إِذَا أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَ وُجَّهٌ...“ (الاحزاب) سے ماورائی حدیث جو  
استدلال کرتے ہیں وہ اگر مبنی پر انحصار ہے تو ان کی جہالت پر دلالت کرتا ہے اور اگر قصداً دھوکا دینے کی نیت ہے تو یہ  
ان کی ضلالت پر دلالت ہے۔ وہ ایک مضمون تو سورۃ آل عمران کی آیت ”وَ إِذَا أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَ وُجَّهٌ...“ سے لیتے ہیں جس میں  
انبیاء اور ان کی امتوں سے کسی آئینے نبی کی پیروی کا عہد لیا گیا ہے، اور دوسرا مضمون سورۃ احزاب کی مذکورہ بالا آیت  
لیتے ہیں جس میں دوسرے انبیاء کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ایک عہد لیا جانے کا ذکر ہے۔ پھر دونوں کو جوڑ کر اس سے یہ لیا  
مضمون خود بنا دیتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی آنے والے نبی پر ایمان لانے اور اس کی تائید و نصرت کرنے کا عہد لیا  
گیا تھا حالانکہ جس آیت میں آئینے نبی پر ایمان لانے کے ميثاق کا ذکر ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ عہد مہرے محمد صلی اللہ علیہ وسلم  
سے بھی لیا، اور اس آیت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عہد لیا جانے کا ذکر ہے اس میں کوئی تصریح اس امر کی نہیں کہ یہ عہد کسی آئینے نبی کی پیروی



کا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر ان دو مختلف مضمونوں کو جوڑ کر ایک تیسرا مضمون جو قرآن میں کہیں نہ تھا، کس دلیل سے پیدا کر لیا گیا؟ اس کے لیے اگر ہو سکتی تھیں تو زمین ہی دلیلیں ہو سکتی تھیں: یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کو جمع کر کے اعلان فرمایا ہوتا کہ "لوگو! اللہ نے مجھ سے یہ عہد لیا ہے کہ میرے بعد جو نبی آئے اس پر میں ایمان لاؤں اور اس کی تائید و نصرت کروں، لہذا میرے قبیح ہونے کی حیثیت سے تم بھی اس کا عہد کرو"۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حدیث کے پورے ذخیرے میں اس مضمون کا کہیں نام و نشان تک نہیں، بلکہ اگلی بکثرت روایات ایسی موجود ہیں جن سے یہ مضمون نکلتا ہے کہ حضور پر سلسلہ نبوت ختم ہو گیا اور آپ کے بعد اب کوئی نبی پیدا ہونے والا نہیں ہے۔ کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسا اہم عیاشق لیا گیا ہوتا اور آپ نے اسے یوں نظر انداز کر دیا ہوتا، اور اگلی ایسی باتیں فرمائی ہوتیں جن سے حجت پکڑ کر آپ کی اُمت کا سوا ذی اعظم خدا کے کسی فرستادہ نبی پر ایمان لانے سے محروم رہ جاتا؟

دوسری دلیل اس مضمون کو پیدا کرنے کے لیے یہ ہو سکتی تھی کہ قرآن میں انبیاء اور امدان کی اُمتوں سے بس ایک ہی عیاشق ایسے جانے کا ذکر ہوتا، یعنی یہ کہ بعد کے آنے والے نبی پر ایمان لانا۔ اس کے سوا کسی اور عیاشق کا پورے قرآن میں کہیں ذکر ہی نہ ہوتا۔ اس صورت میں یہ استدلال کیا جاسکتا تھا کہ سورہ اعراب والی آیت عیاشق میں بھی لامحالہ یہی عیاشق مراد ہو گا۔ لیکن اس دلیل کے لیے بھی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ قرآن میں ایک نہیں بلکہ متعدد عیاشقوں کا ذکر آیا ہے مثلاً سورہ بقرہ رکوع۔ امین بنی اسرائیل سے اللہ کی بندگی اور والدین سے حسن سلوک اور آپس کی خونریزی سے پرہیز وغیرہ کا عیاشق لیا جاتا ہے۔ سورہ آل عمران رکوع ۱۹ میں تمام اہل کتاب سے اس بات کا عیاشق لیا جاتا ہے کہ خدا کی جو کتاب تمہارے حوالے کی گئی ہے اس کی تعلیمات کو چھپاؤ گے نہیں بلکہ اس کی عام اشاعت کرو گے۔ سورہ اعراف رکوع ۲۱ میں بنی اسرائیل سے عہد لیا جاتا ہے کہ وہ اللہ کے نام پر حق کے سوا کوئی بات نہ کہیں گے، اور اللہ کی ہی ہوئی کتاب کو مضبوطی سے سے تمہا میں گے، اور اس کی تعلیمات کو یاد رکھیں گے۔ سورہ مائدہ رکوع امین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروں کو ایک عیاشق یاد دلایا جاتا ہے جو انہوں نے اللہ سے کیا تھا۔ اور وہ یہ ہے کہ تم اللہ سے سچ و طاعت کا عہد کر چکے ہو۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر سورہ اعراب والی آیت میں عیاشق کے مضمون کی تصریح کے بغیر محمد و عیاشق کا ذکر آیا تھا، تو اس خلا کو ان بہت سے عیاشقوں میں سے کسی ایک سے بھرنے کے بجائے باخصوص سورہ آل عمران رکوع ۹ والے عیاشق ہی سے کیوں بھرا جاتے؟ اس تزیج کے لیے خود ایک دلیل درکار ہے جو کہیں موجود نہیں۔ اس کے جواب میں اگر کہتی یہ کہے کہ دونوں جگہ چونکہ نبیوں سے عیاشق لینے کا ذکر ہے اس لیے ایک آیت کی تشریح دوسری آیت سے کرنی گئی، تو میں عرض کروں گا کہ دوسرے جتنے عیاشق بھی انبیاء کی اُمتوں سے لیے گئے ہیں وہ براہ راست

کسی اُمت سے نہیں لیے گئے بلکہ انبیاء کے واسطے ہی سے لیے گئے ہیں۔ اور آخر قرآن میں بصیرت رکھنے والا کون شخص اس بات سے ناواقف ہے کہ ہر نبی سے کتاب اللہ کو مضبوط تھا منے اور اس کے احکام کی پیروی کرنے کا عہد لیا گیا ہے؟

تیسری دلیل یہ ہے کہ نبی تھی کہ سورہ احزاب کا سیاق و سباق یہ بتا رہا ہوتا کہ یہاں میثاق سے مراد آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق ہی ہو سکتا ہے لیکن یہاں معاملہ بالکل ہی برعکس ہے۔ سیاق و سباق تو اٹا اس بات پر لڑا کر رہا ہے کہ یہاں یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے۔ سورہ احزاب شروع ہی اس فقرے سے ہوتی ہے کہ: "اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں سے نہ دو، اور جو وحی تمہارا رب بھیجتا ہے اسی کے مطابق عمل کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔" اس کے بعد یہ حکم سنایا جاتا ہے کہ جاہلیت کے زمانے سے متبانی بنانے کا جو طریقہ چلا آ رہا ہے اُس کو اور اُس سے تعلق رکھنے والے تمام اہل ایمان اور رسول کو توڑنا۔ اس کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ غیر خوئی رشتوں میں صرف ایک ہی رشتہ ایسا ہے جو خوئی رشتوں سے بھی بڑھ کر حرمت والا ہے، اور وہ ہے نبی اور مومنین کا رشتہ، جس کی بنا پر نبی کی جہریاں ان کی ماؤں کی طرح ان پر حرام ہیں، ورنہ باقی تمام معاملات میں رجم اور خوئی رشتے ہی اللہ کی کتاب کی رو سے حرمت اور استحقاق وراثت کے لیے اولیٰ اور انساب میں۔ یہ احکام بیان فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ میثاق یاد دلاتا ہے جو اس نے تمام انبیاء سے ہمیشہ لیا ہے اور ان کی طرح آپ سے بھی لیا ہے۔ اب ہر متحول آدمی خود ہی دیکھ سکتا ہے کہ اس سلسلہ کلام میں آخر کس مناسبت سے ایک آنے والے نبی پر ایمان لانے کا میثاق یاد دلایا جاسکتا تھا، یہاں تو اگر یاد دلایا جاسکتا تھا تو وہی میثاق یاد دلایا جاسکتا تھا جو خدا کی کتاب کو مضبوط تھا منے اور اس کے احکام کو یاد رکھنے اور ان پر عمل کرنے اور دنیا پر ان کا اظہار کرنے کے لیے تمام انبیاء سے لیا گیا ہے۔ پھر آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صاف صاف حکم دیتا ہے کہ آپ خود اپنے متبانی ازیدین ہارثہ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر کے جاہلیت کے اس وہم کو توڑ دیں جس کی بنا پر لوگ منہ بوسے بیٹے کو بالکل صلی بیٹے کی طرح سمجھتے تھے۔ اور جب کفار و منافقین اس پر اعتراضات کی بوجھا کر رہے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو علی الترتیب تین جواب دیتا ہے:

(۱) اول تو محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں کہ اس کی مطلقہ بیوی اُن پر حرام ہوتی،

(۲) اور اگر تم یہ کہتے ہو کہ وہ اُن کے لیے حلال تھی بھی تو اُس سے نکاح کرنا کیا ضرور تھا، تو یہ اس لیے ضروری تھا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں جن کا کام یہی ہے کہ جس چیز کو اللہ مٹانا چاہتا ہے، اُسے خود آگے بڑھ کر مٹاتے،

(۳) اور مزید برآں ان کو ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ محض رسول ہی نہیں ہیں بلکہ خاتم النبیین ہیں، اگر وہ جاہلیت کی ان رسوں کو مٹا کر نہ جاتیں گے تو پھر کوئی ایسا نبی آنے والا بھی نہیں ہے جو انہیں مٹائے

اس مضمون لائق کو اگر کوئی شخص مضمون سابق کے ساتھ ملا کر پڑھے تو وہ چین کے ساتھ یہ کہہ دے گا کہ اس سباق و سباق میں جو شباق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلایا گیا ہے اُس سے مراد اور جو شباق بھی ہو، بہر حال کسی کلمے والے نبی پر ایمان لانے کا شباق تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔

دیکھ لیجیے، آیت زیر بحث سے قاریانہوں کے بیان کردہ معنی یعنی کے لیے ہی نہیں دلیلیں ہو سکتی تھیں، اور یہاں ان میں سے ہر دلیل اُن کے مدعا کے لیے غیر مفید، بلکہ الٹی ان کے مدعا کے خلاف ہے۔ اب اگر ان کے پاس کوئی چوتھی دلیل ہو تو وہ ان سے دریافت کیجیے، اور ان تینوں دلیلوں کا جواب بھی ان سے لیجیے ورنہ یہ باتشے کے سوا چارہ نہیں کہ اس آیت سے جو معنی انہوں نے لیے ہیں وہ یا تو جہالت کی بنا پر نکالے ہیں، یا پھر خدا سے بیخوف ہو کر خلق خدا کو گمراہ کرتے کے لیے نکالے ہیں۔ بہر حال ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر مرزا صاحب نبی تھے تو آخر کیا معاملہ ہے کہ ابھی ان کے صحابہ کا دور بھی ختم نہیں ہوا ہے اور ان کی ساری اُمت اس وقت تابعین اور تبع تابعین پر مشتمل ہے۔ پھر بھی حال یہ ہے کہ کتاب اللہ سے ان کی اُمت میں علی الاعلان ایسے قلم استدلال کیے جاتے ہیں اور پوری اُمت میں ایک آواز بھی اس جہالت یا ناخدا ترسی کے خلاف بلند نہیں ہوتی۔

### آیت ختم نبوت میں تین دلائل

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ ابًا أَحَدٍ قَبْلَ رَبِّ جَالِكُمْ	(لوگو! محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے
وَالَكُنْتُمْ أَشْوَاقًا لِّمَا تَنْبِئِينَ وَ	باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم
كَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا - (الاحزاب: ۴۰)	النبيين میں اور اللہ ہر چیز پر علم رکھنے والا ہے)

ختم نبوت کا جو ذکر اس سورہ (الاحزاب) میں آیا ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ عرب میں منہ بولے بیٹے کو بالکل حقیقی بیٹے کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ وہ حقیقی بیٹے کی طرح میراث پاتا تھا۔ منہ بولے باپ کی بیوی اور بیویوں سے اسی طرح خلا ملا رکھتا تھا جس طرح ماں بیٹے اور بھائی بہنوں میں ہوا کرتا ہے۔ اور منہ بولے بیٹے کے بعد وہ ساری عورتیں اس کے اور منہ بولے باپ کے درمیان قائم ہو جاتی تھیں جو نسبی رشتے کی بنا پر قائم ہوا کرتی تھیں۔ اللہ اس رسم کو توڑنا چاہتا تھا۔ اُس نے پہلے حکم دیا کہ منہ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے کوئی شخص حقیقی بیٹا نہیں ہو جائے (آیت ۴۰)۔ لیکن دلوں میں صدیوں کے رواج کی وجہ سے حرمت کا جو پھیل چکا ہوا تھا وہ آسانی سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اس رسم کو مٹا دیا جائے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت زینب نے (جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے تھے) حضرت زینب کو (جو ان کے نکاح میں تھیں) خلا دے دی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس فرمایا کہ یہ موقع ہے اس سخت قسم کی باہلی رسم کو توڑنے کا جب تک آئے تو

اپنے نسبتی کی مطلقہ بیوی سے نکاح نہ کریں گے۔ متبثی کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کا جاہلی تخیل نہ منسٹ سکے گا۔ لیکن آپ یہ بھی جانتے تھے کہ مدینہ کے منافقین اور اطرافِ مدینہ کے پیرو اور تکہ کے گھٹا راس فعلی پر ایک طوفانِ عظیم برپا کر دیں گے اور آپ کو بدنام کرنے اور اسلام کو دوسرا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھیں گے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود چکچکا رہے تھے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا اور آپ نے حضرت زینب کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس پر جیسا کہ اندیشہ تھا، اعتراضات اور شبان طرازی اور اقرار پر وازی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور خود مسلمان عوام کے دلوں میں بھی طرح طرح کے دوسرے پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ انہی اعتراضات اور دوسروں کو دور کرنے کے لیے سورۃ احزاب کے پانچویں رکوع کی آیات (۳۷-۴۰) نازل ہوئیں۔

ان آیات میں پہلے تو اللہ تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ یہ نکاح ہمارے حکم سے ہوا ہے اور اس لیے ہوا ہے کہ رسول کے لیے اپنے نسبتی لڑکوں کی بیوہ اور مطلقہ بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے پھر فرماتا ہے کہ ایک نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ کا حکم کجا لارنے میں وہ کسی کے خوف سے چکچکا رہے۔ اس کے بعد اس بحث کو اس بات پر ختم فرماتا ہے کہ:

”محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ مگر وہ اللہ کے رسول ہیں اور قائم نسبتین ہیں۔“

اس موقع پر یہ فقرہ جواشاد فرمایا اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مستتر نہیں کے جواب میں تین دلائل دینا چاہتا ہے۔ اس ایک فقرے میں ان تمام اعتراضات کی جڑ کاٹ دی گئی ہے جو مخالفین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نکاح پر کر رہے تھے۔

ان کا اولین اعتراض یہ تھا کہ آپ نے اپنی بہو سے نکاح کیا ہے حالانکہ آپ کی اپنی شریعت میں بھی بیٹے کی منکوحہ باپ پر حرام ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ یہ نکاح بچائے خود قابل اعتراض نہیں ہے کیونکہ جس شخص کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا گیا ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعی بیٹا نہ تھا اور آپ اس کے حقیقی باپ نہ تھے۔ اسی لیے فرمایا: ”محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ یعنی جس شخص کی مطلقہ سے نکاح کیا گیا ہے وہ بیٹا تھا کب کہ اُس کی مطلقہ سے نکاح حرام ہوتا؟ تم لوگ تو خود جانتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ سنا سے کوئی بیٹا ہے ہی نہیں۔“

ان کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ اچھا، اگر سنا بولا بیٹا حقیقی بیٹا نہیں ہے، تب بھی اس کی چھوٹی بہو عورت سے نکاح کر لینا زیادہ سے زیادہ بس جائز ہی ہو سکتا تھا، آخر اس کا کرنا کیا ضرور تھا؟ اس کے جواب میں فرمایا گیا مگر وہ اللہ کے رسول ہیں یعنی رسول ہونے کی حیثیت سے اُن پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ جس حلال چیز کو تمہاری رسموں نے خواہ مخواہ حرام کر رکھا ہے، اس کے بارے میں تمام تعصبات کاٹنا نہ کرو۔ اور اس کی جلت کے معاملے میں کسی

شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

تیسرے یہ کہ یہ کام اس لیے اور بھی ضروری تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض نبی ہی نہیں بلکہ آخری نبی ہیں اس لیے مزید تاکید کے لیے فرمایا "اور وہ خاتم النبیین ہیں" یعنی ان کے بعد کوئی رسول تو اور نہ کوئی نبی تک آئے والا نہیں ہے کہ اگر قانون اور معاشرے کی کوئی اصلاح ان کے زمانے میں نافذ ہونے سے رہ جاتے تو بعد کا آنے والا نبی یہ کس ٹوپی کر دے۔ لہذا یہ اور بھی ضروری ہو گیا تھا کہ اس رسمِ جاہلیت کا خاتمہ خود ہی کر کے جائیں، کیونکہ اب اگر آپ کے ہاتھوں میں یہ جاہلانہ رسم نہ ٹوٹی تو پھر قیامت تک نہ ٹوٹ سکے گی۔ آپ کے بعد کوئی اور نبی آئے والا نہیں ہے کہ جو کسر آپ سے چھوٹ جاتے اُتے وہ اگر ٹوٹا کر دے۔

اس کے بعد مزید زور دیتے ہوئے فرمایا کہ "اللہ برحقیر کا علم رکھنے والا ہے" یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس رسمِ جاہلیت کو ختم کرا دینا کیوں ضروری تھا اور ایسا نہ کرنے میں کیا تباہت تھی۔ وہ جانتا ہے کہ اب اُس کی طریت سے کوئی نبی آئے والا نہیں ہے۔ لہذا اگر اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے اُس نے اس رسم کا خاتمہ کر دیا تو پھر کوئی دوسری ہستی دنیا میں ایسی نہ ہوگی جس کے ٹوٹنے سے یہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جائے۔ بعد کے مشعلین اگر اسے ٹوڑیں گے بھی تو ان میں کسی کا فعل بھی اپنے پیچھے ایسا دائمی اور عالمگیر اقدار نہ رکھے گا کہ ہر ملک اور ہر زمانے میں لوگ اس کا اتباع کرنے لگیں، اور ان میں سے کسی کی شخصیت بھی اپنے اندر اس قدر کی حامل نہ ہوگی کہ کسی فعل کا محض اس کی شدت ہونا ہی لوگوں کے دلوں سے کہ بہتہ کے برصورتوں کا قلع قمع کر دے۔

انہوں نے یہ کہ موجودہ زمانے میں ایک گروہ نے اس آیت کی غلط تالیفات کر کے ایک بہت بڑے فتنے کا دروازہ کھول دیا ہے اس لیے ختم نبوت کے مسئلے کی پوری توضیح اور اس گروہ کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی تردید کے لیے ہم پوری وضاحت سے مسئلہ ختم نبوت بیان کرتے ہیں۔

# عقیدہ ختم نبوت پر جان سختی بحث

ایک گروہ جن سے راہ دور میں بھی نبوت کا عقیدہ غلطی سے لڑا گیا ہے، آیت **مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّبِّهِمْ يَرْبُؤُهُمْ وَلَٰكِن رَّبُّهُمْ الرَّحْمَنُ الَّذِي فَطَرَهُمْ أَتَمًّا** کے لفظ **خَاتَمَ النَّبِيِّينَ** کے معنی میں آپ کی مہر کرنا ہے، اور اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو انبیاء بھی آئیں گے وہ آپ کی مہر لگنے سے ہی نہیں گے، یا بالفاظ دیگر جب تک کسی کی نبوت پر آپ کی مہر نہ لگے وہ نبی نہ ہوسکے گا۔ لیکن جس سلسلہ بیان میں یہ آیت وارد ہوتی ہے اس کے اندر دیکھ کر اسے دیکھا جائے تو اس لفظ کا یہ مفہوم لینے کی قطعاً کوئی گنجائش نظر نہیں آتی، بلکہ اگر یہی اس کے معنی ہوں تو یہاں یہ لفظ بے محل ہی نہیں مقصود کلام کے بھی غایت ہو جاتا ہے۔ آخر اس بات کا کیا نام ہے کہ اوپر سے تو نکاح زینب پر مفسرین کے اعتراضات اور ان کے پیدا کیے ہوئے شکوک و شبہات کا جواب دیا جا رہا ہو اور یہاں تک یہ بات کہہ ڈالی جائے کہ محمد نبیوں کی مہر ہیں، آئندہ جو نبی بھی بنے گا، ان کی مہر تک کر بنے گا، اس سیاق و سباق میں یہ بات نہ صرف یہ کہ باطل ہے بلکہ اس سے وہ استدلال اٹھا کر زور ہو جاتا ہے جو اوپر سے مفسرین کے جواب میں چلا آ رہا ہے۔ اس سہرت میں تو مفسرین کے لیے یہ کہنے کا اچھا موقع تھا کہ آپ یہ کام اس وقت نہ کرتے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس رسم کو مٹانے کی ایسی ہی کچھ شدید ضرورت ہے تو آپ کے بعد آپ کی مہر تک لگ کر جو انبیاء آتے رہیں گے ان میں سے کوئی اسے اشارے کا۔

ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ **خَاتَمَ** انبیین کے معنی افضل انبیین کے ہے، یعنی نبوت کا دروازہ نوکھلا ہوا ہے، **الْبَتَّةَ** کالات نبوت جنسور پر ختم ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ مفہوم لینے میں بھی وہی قباحت ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے۔ سیاق و سباق سے یہ مفہوم بھی کوئی مناسب نہیں رکھتا، بلکہ اٹھا اس کے خلاف پڑتا ہے۔ کفار و منافقین کہہ سکتے تھے کہ حضرت، کم تر وہ جسے کہی ہو بہر حال آپ کے بعد بھی نبی آتے رہیں گے پھر کیا ضرورت تھا کہ اس رسم کو بھی آپ ہی مٹا کر نثر لیں گے جلتے۔

## خاتم النبیین کے لغوی معنی

پس یہاں تک سیاق و سباق کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النبیین کے معنی سلسلہ نبوت کو ختم کر دینے والے ہی کے لیے باتیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے، لغت بھی اسی معنی کی متفقہ ہے۔ عربی لغت اور محاورے کی روشنی سے ختم کے معنی مہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے، اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔

خَتَمَ الْعَمَلُ كَمَا مَعْنَى هِيَ تَوَرَّجَ عِنْدَ الْعَمَلِ: کام سے فارغ ہو گیا:

خَتَمَ الْأَدَاءَ كَمَا مَعْنَى هِيَ بَرَزَ كَمَا مَعْنَى هِيَ تَوَرَّجَ عِنْدَ الْعَمَلِ: تاکہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس

کے اندر داخل ہو:

خَتَمَ الْكِتَابَ كَمَا مَعْنَى هِيَ خَتَمَ بِنَدْوَى كَمَا مَعْنَى هِيَ خَتَمَ بِنَدْوَى: تاکہ خط محفوظ ہو جائے:

خَتَمَ عَلَى الْقَلْبِ: دل پر مہر لگا دی تاکہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے، نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس

میں سے نکل سکے:

خَتَمَ الْكَلِمَ: وہ مزاج کسی چیز کو پھینکے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے۔

خَتَمَ عَلَى عَيْنَيْهِ: عاقبت و اخوت، ہر چیز کے خاتم سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت:

خَتَمَ الشَّيْءَ: بلیغ اخذ، ہر کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا۔ اسی معنی میں ختم قرآن

ہوتے ہیں اور اسی معنی میں متواتر کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

خَتَمَ الْقَوْمَ: اخذ صمد، خاتم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی۔ ملاحظہ ہو لسان العرب، قاموس اور

انزب (الموارث)

سلسلہ یہاں لغت کی صورت میں نامور و نامور، لیکن بات ابھی تین کتابوں پر منحصر نہیں ہے۔ عربی زبان کی کوئی مقبر لغت

نامور رکھتا ہے، اس میں نہ تو خانہ کی ہی نسبت بلکہ میں سکھیں، نظم نبوت، ندا کے دین میں تعجب دکھانے کے لیے لغت کو پھول کر اس

بات کا مبارک لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی شخص کو خاتم الاستعداد، یا خاتم العقاب یا خاتم المفسرین کہنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جس

شخص کو یہ لقب دیا گیا ہے اس کے بعد کوئی شاعر یا فقیہ یا مفسر پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کے کمال

اُس شخص پر ختم ہو گئے۔ حالانکہ مبالغے کے طور پر اس طرح کے القاب کا استعمال یہ معنی برکت نہیں رکھتا کہ لغت کے اعتبار سے خاتم

کے اصل معنی ہی کامل یا افضل کے ہر باتیں اور آخری کے معنی ہیں یہ لفظ استعمال کرنا سرے سے غلط قرار پاتے۔ یہ بات صرف

دو شخص کہہ سکتا ہے جو زبان کے قواعد سے ناواقف ہو کسی زبان میں بھی یہ قادمہ نہیں ہے کہ اگر کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنی کے بجائے

اسی بنا پر تمام اہل لغت اور اہل تفسیر نے بالاتفاق خاتم النبیین کے معنی آخر النبیین کے لیے ہی عربی لغت و محاورے کی رو سے خاتم کے معنی ڈاک خانے کی مہر کے نہیں ہیں جسے لگا لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مہر ہے جو خانے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے نہ باہر کی کوئی چیز اندر جاسے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

قرآن کے حیاق و سباق اور لغت کے لحاظ سے اس لفظ کا جو مفہوم ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

(۱) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نبی اسرائیل کی تیاری

كانت بنو اسرائیل تسوسهم الانبیاء

انبیاء کیا کرتے تھے جب کوئی نبی مر بنا تو دور مرانی

كلما هلك نبی خلفه نبی، واته لانی

اس کا جانشین ہوتا مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا

بعدی و سیکون خلفاء (بخاری، کتاب التنبؤ

بلکہ خلفاء ہوں گے

باب ما ذکر عن نبی اسرائیل

(۲) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری اور مجھ سے پہلے

کبھی کسی مجاز کسی دوسرے معنی میں لیا جاتا ہو تو وہی معنی اس کے اصل معنی بن جائیں اور لغت کی رو سے جو اس کے حقیقی معنی ہیں ان میں اس کا استعمال ممنوع ہو جاتے۔ آپ کسی عرب کے سامنے جب کہیں گے کہ جَاءَ خَاتَمُ الْقَوْمِ، تو وہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لے گا کہ قبیلے کا ناضل و کامل آدمی آگیا، بلکہ اس کا مطلب وہ یہی ہے گا کہ پورا کا پورا قبیلہ آگیا ہے حتیٰ کہ آخری آدمی جو رہ گیا تھا وہ بھی آگیا۔

اس کے ساتھ یہ بات بھی لگا رہی چاہیے کہ خاتم الشعراء اور خاتم المرثیین وغیرہ القاب جو بعض لوگوں کو دیے گئے ہیں ان کے دینے والے انسان تھے اور انسان کبھی یہ نہیں جان سکتا کہ جس شخص کو وہ کسی صفت کے اعتبار سے خاتم کہہ رہا ہے اس کے بعد پھر کوئی اس صفت کا حامل پیدا نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے انسانی کلام میں ان القاب کی منیبت مباحث اور اعتراض کمال سے زیادہ کچھ ہو ہی نہیں سکتی لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کے متعلق یہ کہدے کہ فلاں صفت اُس پر ختم ہوگئی تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم سے بھی انسانی کلام کی طرح مجازی کلام مجاہدیں اللہ نے اگر کسی کو خاتم الشعراء کہہ یا ہوتا تو یقیناً اس کے بعد کوئی شاعر نہیں ہو سکتا تھا۔ اور اس نے جسے خاتم النبیین کہہ دیا، غیر ممکن ہے کہ اس کے بعد کوئی نبی ہو سکے۔ اسی لیے کہ اللہ عالم احیاء اور انسان عالم الغیب نہیں ہیں۔ اللہ کا کسی کو خاتم النبیین کہنا اور انسانی کلام کسی کو خاتم الشعراء اور خاتم القاب وغیرہ کہنا یا آخر المرثیین میں سے ہونا سب سے محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ



گنبد سے ہوتے انبیاء کی شمال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور نوب حسین و حمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی بجگہ چھوٹی ہوئی تھی لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خرابی پر اظہارِ حیرت کرتے تھے، مگر کہتے تھے کہ اس بجگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ نہیں ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ہو

ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنوا بیتاً قاضیاً واحملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ و یعجبون لہ و یقولون ہلا و جمعت ہذا اللبنۃ، فانا اللبنۃ و انا خاتم النبیین (بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین،

چکی ہے، اب کئی جگہ باقی نہیں رہے جسے پرکرنے کے لیے کوئی ہی آئے۔)

اسی مضمون کی چار حدیثیں مسلم، کتاب اغصائل، باب خاتم النبیین میں ہیں اور آخری حدیث میں یہ الفاظ شامل ہیں: وَجِئْتُ قَضَعْتُ الْاَنْبِيَاءَ اِطْسَ فِيْ اَيَّامِيْ نَسِيْتُ الْاَنْبِيَاءَ كَمَا سَلَسْتُ خَمْرًا كَرِيْمًا

یہی حدیث انہی الفاظ میں ترمذی، کتاب المناقب، باب فضل النبی، اور کتاب الاداب، باب الامثال میں ہے۔  
مسند ابوداؤد، طبائعی میں یہ حدیث جابر بن عبد اللہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلے میں آئی ہے اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: ختمت بی الانبیاء، میرے ذریعے سے انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

مہذب احمد میں تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ اس ضمن کی احادیث حضرت ابی بن کعب، حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم سے نقل کی گئی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے چھ بناؤں میں انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے، (۱) مجھے جامع و مختصر بات کہنے کی صلاحیت دی گئی (۲) مجھے رعب کے ذریعے سے نصرت بخشی گئی (۳) میرے لیے اسبابِ غنیمت حلال کیے گئے (۴) میرے لیے زمین کو سیر بھی بنا دیا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی یعنی میری شریعت میں نماز، صوم، عبادت کا ہوں میں ہی نہیں بلکہ روضے زمین پر ہر جگہ پھیلی جاسکتی ہے اور پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمم کر کے وضو کی حاجت بھی پوری کی جاسکتی ہے اور غسل کی حاجت بھی۔ (۵) مجھے تمنا دینا کے لیے رسول بنا دیا گیا (۶) اور میرے اوپر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

(۳) ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فُضِّلْتُ عَلَى الْاَنْبِيَاءِ بِسِتِّ اَعْطَيْتُ جَمَاعَ الْكَلْمِ، وَنُصِرْتُ بِالرَّعْبِ، وَاجْتَلَيْتُ لِي الْغَنَائِمُ، وَجِئْتُ لِي الْاَرْضُ مِنْ مَسْجِدٍ اَوْ طَهْرًا، وَاُمِرْتُ بِسِتِّ اِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً، وَخُتِمَ لِي النَّبِيُّونَ۔ (مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، شریعت میں نماز، صوم، عبادت کا ہوں میں ہی نہیں بلکہ روضے زمین پر ہر جگہ پھیلی جاسکتی ہے اور پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمم کر کے وضو کی حاجت بھی پوری کی جاسکتی ہے اور غسل کی حاجت بھی۔ (۵) مجھے تمنا دینا کے لیے رسول بنا دیا گیا (۶) اور میرے اوپر انبیاء کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

(۴) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رسالت اور



دوستدار اسرار و آیات البراهین انسانی۔ (البرہانوں) صحاح نواسب۔ (یعنی وہی وہ) سب کوئی امکان نہیں ہے  
 زیادہ سے زیادہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی مدد سے کوئی اشارہ ملے گا بھی تو اس اچھے خواہنے ذریعہ سے مل جائے گا  
 (۹) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم لو کان بعدی نبی لکان عمرو بن الخطاب (ترمذی)  
 نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہی ہوتا۔  
 کتاب المناقب،

۱۰) قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ سے  
 فرمایا میرے ساتھ تمہاری نسبت وہی ہے جو موسیٰ  
 کے ساتھ ہارون کی تھی، مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں  
 الا انہ لا نبی بعدی (بخاری و مسلم، کتابہ)

ہے

و سائل الصحابہ

بخاری و مسلم نے یہ حدیث غزوہ تبوک کے ذکر میں بھی نقل کی ہے۔ مسند احمد میں اس مضمون کی دو روایتیں حضرت  
 سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کی گئی ہیں جن میں سے ایک کا آخری فقرہ یوں ہے: الا انہ لا نبی بعدی، مگر  
 میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ البرہان و طبیبی امام احمد اور محمد بن اسحاق نے اس سلسلے میں جو تفصیلی روایات  
 نقل کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ تبوک کے لیے تشریف لے جاتے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت  
 علیؑ کو مدیثہ طبیبی کی حفاظت و نگرانی کے لیے اپنے پیچھے چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ منافقین نے اس پر ازبطن  
 کی باتیں ان کے بارے میں کہنی شروع کر دیں۔ انہوں نے جاکر حضورؐ سے عرض کیا: یا رسول اللہ کیا آپ مجھے عزتوں  
 اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں؟ اس موقع پر حضورؐ نے ان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تم میرے ساتھ وہی نسبت  
 رکھتے ہو جو موسیٰ کے ساتھ ہارون رکھتے تھے۔ یعنی جس طرح حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارون کو  
 بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا تھا اسی طرح میں تم کو مدیثہ کی حفاظت کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں، لیکن اس کے  
 ساتھ ہی حضورؐ کو اندیشہ ہوا کہ حضرت ہارون کے ساتھ یہ تشبیہ کہیں بعد میں کسی فتنے کی بنیاد نہ بن جائے، اس لیے فوراً  
 آپ نے یہ تصریح فرمادی کہ میرے بعد کوئی شخص نبی ہونے والا نہیں ہے۔

(۱۱) عن ثوبان قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 و سلم: ... وانہ سیکون فی امتی  
 کذا یون ثلاثون کلہم یرید عہد نبی  
 وانا خاتم النبیین الا نبی بعدی۔  
 ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 وسلم نے فرمایا: ... اور یہ کہ میری امت میں تیرے بعد  
 ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہوگا، اور وہی کرے گا  
 والا کہ میرا نام انہیں ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی

(البرہان و کتاب المناقب) نہیں



یہ احادیث بکثرت صحابہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں، اور کثرت محدثین سے ان کو روایت کی گئی ہے۔ سندوں سے نقل کیا ہے۔ ان کے منالاعد سے صحت معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف اوقات میں مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپؐ کی آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ انہیں ہے نبوت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے، اور آپؐ کے بعد جو لوگ بھی رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں وہ زبانی و قلمی ہیں۔ قرآن کے الفاظ "خاتم النبیین" کی اس سے زیادہ مستند و معتبر و قطعی الثبوت تشریح اور کیا ہو سکتی ہے۔ رسول پاکؐ کا ارشاد تو بجا ہے خود سند و حجت ہے۔ مگر جب وہ قرآن کی ایک نعت کا تشریح کر رہے ہوں تو وہ وہی زیادہ قوی حجت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعد کوئی نبی نہ آئے گا اور ان کی تفسیر کا حق دار اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ ختم نبوت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور جو اس سے قبل آیا گیا تھی قابل التفات بھی سمجھیں؟

صحابہ کرام کا اجماع

قرآن و سنت کے بعد تیسرے درجے میں بہترین حیثیت صحابہ کرام کے اجماع کی ہے۔ یہ بات تمام خبردار بھی

ناظر پڑھنے کے لیے سفر کرے۔ ان میں سے پہلی مسجد مسجد الحرام ہے جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنا تھا۔ وہی پہلی مسجد تھی ہے جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ اور تیسری مسجد مدینہ طیبہ کی مسجد نبویؐ ہے جس کی بنا حضورؐ نے ہی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی۔ حضورؐ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اب چونکہ میرے بعد کوئی نبی نہ آئے گا، اس لیے میری اس مسجد کے بعد نہ جانے کوئی چوتھی مسجد ایسی بنے والی نہیں ہے جس میں نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مسجدوں سے زیادہ ہو اور جس کی عروہ نماز کا ثواب سے سفر کر کے جانا درست ہو۔

لے منکرین ختم نبوت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے مقابلے میں اگر کوئی چیز پیش کرے ہیں اور وہ یہ ثابت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا قلوا انہم خاتم الانبیاء ولا یقبلوا الا بی بعدا، یہ تو کہہ کر حضورؐ خاتم الانبیاء ہیں مگر یہ نہ کہہ کر آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، لیکن اول تو حضورؐ کے صحت و سلامت ارشادات کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کے کسی قول کو پیش کرنا ہی سخت گستاخی و بے ادبی ہے۔ اس پر مزید یہ کہ حضرت عائشہؓ کی طہارت جس روایت میں یہ قول مذکور کیا گیا ہے وہ بجا ہے خود غیر مستند ہے۔ اسے حدیث کی کسی معتبر کتاب میں کسی قابل ذکر محدث نے نقل نہیں کیا۔ جسے تفسیر کی ایک کتاب مؤلف ثور اور لغت حدیث کی ایک کتاب مجمع البحار سے اس کو نقل کیا جاتا ہے مگر اس کی سند کا کچھ پتہ نہیں ملتا۔ ایسی نکتہ ضعیف ترین روایت اور وہ بھی ایک صحابیہ کے قول کو لاکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے جنہیں تمام اکابر محدثین نے صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔



حضرت کی وفات کے فوراً بعد ہوتی ہے، ابو بکر کی قیادت میں ہوتی ہے، اور صحابہ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوتی ہے اجماع صحابہ کی اس سے زیادہ صریح نشان شاید ہی کوئی اور ہو۔

### علاقتے ائمتہ کا اجماع

اجماع صحابہ کے بعد چوتھے غیر پر مسائل دین میں جس چیز کو حجت کی حیثیت حاصل ہے وہ دور صحابہ کے بعد کے عہدائے ائمتہ کا اجماع ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلے صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے، اور پوری دنیا کے اسلام میں ہر ملک کے علماء اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا، اور یہ کہ جو عہد آپ کے بعد اس منصب کا دعویٰ کرے، یا اس کو مانے، وہ کافر مانع از قلت اسلام ہے۔ اس سلسلہ کے بھی چند شواہد ملنا نظر ہوں:

۱۔ امام ابو حنیفہ دستارِ سنت کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں " اس پر امام اعظم نے فرمایا کہ "جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے وہ بھی کافر ہو جانتے گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا ہے کہ لا نبی بعدی (مناقب الامام الاعظم ابن حنیفہ لابن احمد المکی، ج ۱ ص ۱۶۱ مطبوعہ مکتبہ المدینہ)۔

۲۔ علامہ ابن حجر عسقلانی (رحمۃ اللہ علیہ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں آیت **وَلَكِنْ تَسْأَلُونَ اللَّهَ وَحَاقَتِ السُّبُطُ** کا مطلب بیان کرتے ہیں: **الذی حتم النبوة فطبع علیہا فلا تفتح لاحد بعدہ الی قیام الساعة** جس نے نبوت کو حتم کر دیا اور اس پر نہ کھلا دیا، اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا (تفسیر ابن جریر جلد ۲، صفحہ ۱۲)۔

۳۔ امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) اپنی کتاب "عقیدہ سفینہ" میں صحت صحابین، ان خصوصاً امام ابو حنیفہ (ام ابو حنیفہ) اور امام محمد رحمہم اللہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے نبوت کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں: اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے برگزیدہ نبی اور پسندیدہ رسول میں اور وہ خاتم الانبیاء، امام الاقبا، سید المرسلین اور سید رب العالمین ہیں، اور ان کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور خواہش نفس کی بندگی ہے۔ (شرح الطحاوی فی تفسیر الشفیعہ، دار المعارف مصر، صفحات ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰)۔

۴۔ علامہ ابن خزم آندلسی (رحمۃ اللہ علیہ) کہتے ہیں: یقیناً نبی کا سلسلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف، اور اللہ عزوجل فرما چکا ہے کہ تمہیں میں تمہارے مروجوں میں سے کسی کے باپ، مگر وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں (غزالی، ج ۱ ص ۱۵)۔

۵۔ امام غزالی کی اس رائے کو ہم ان کی اصل عبارت کے ساتھ اس لیے نقل کر رہے ہیں کہ منکرین تم نبوت سے اس جو ان کی صحت کو بڑے زور شور سے چیلنا چاہتے تھے۔ محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

لو فتح هذا الباب راي باب الكاس  
 كون الاجماع حجة (انجوالی امور تشبیحہ  
 وحوار قائلو قال یجوز ان یبعث من  
 بعد نبینا محمد صلی اللہ علیہ وسلم  
 فی بعد التوقف فی تکفیرہ ، ومستبعد  
 استحالة ذلك عند البحث تستمد من  
 الاجماع لا محالة ، فان العقل لا یحیلہ  
 وما نقل فیہ من قوله لا نبی بعدی  
 ومن قوله تعالی خاتم النبیین ، فلا  
 یجوز هذا القائل عن تأویلہ ، فیقول  
 خاتم النبیین اراد به اولوا العزم من  
 الرسول ، فان قالوا النبیین عام ، فلا یجد  
 تخصیص العام ، وقوله لا نبی بعدی  
 لم یرد به الرسول وقوف بین النبیین  
 الرسول والنقی اعلی مرتبة من الرسول  
 الی غیر ذلك من انواع الھدیان ، فلما  
 وامثاله لا یسکن ان تدعی استحالة  
 من حیث مجرد اللفظ ، فان فی تاویل  
 ظواہر التشبیہ قضینا باحتمالات البعد  
 من ہذہ ، ولحمین ذاك مطلقاً للنص  
 ولكن الرد علی هذا القائل ان الامة  
 قہمت بالاجماع من هذا اللفظ ومن  
 قرائن احواله انه افہم عدم نبی بعدی  
 ابداً وصدق رسول اللہ ابداً وانہ لیس  
 فیہ تاویل ولا تخصیص فمکرو هذا کا

اگر یہ دروازہ (یعنی اجماع کو سخت ماننے سے انکار  
 کا دروازہ کھول دیا جاتے تو بڑی تیس دنوں تک  
 تربت پہنچ جاتی ہے مثلاً اگر کہیں والہ کہے کہ ہمارے  
 نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی رسول کی بعثت  
 ممکن ہے تو اس کی تکفیر میں تاویل کو ناجائز ثابت کرنا  
 چاہتا ہوا ہے لامحالہ اجماع سے مدد یعنی ٹرے گے  
 کیونکہ عقل اس کے عدم جواز کا فیصلہ نہیں کرتی۔ اور  
 جہاں تک نقل کا تعلق ہے اس عقیدہ کا قائل لانی  
 بعدی اور خاتم النبیین کی تاویل کرنے سے عام بزبورگا۔  
 وہ کہتے گا کہ خاتم النبیین سے مراد اولوا العزم رسولوں  
 کا خاتم ہونا ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ نبیین کا لفظ  
 عام ہے تو عام کو خاص قرار دے دینا اس کے لیے کچھ  
 مشکل نہ ہوگا۔ اور لانی بعدی کے متعلق وہ کہہ  
 دینگا کہ لا رسول بعدی تو نہیں کہا گیا ہے، رسول  
 اور نبی میں فرق ہے، اور نبی کا مرتبہ رسول سے بلند  
 ہے غرض اس طرح کی بکواس بہت کچھ کی جاسکتی  
 ہے۔ اور محض لفظ کے اعتبار سے ایسی تاویلات  
 کو ہم محال نہیں سمجھتے، بلکہ ظواہر تشبیہ کی تاویل میں  
 ہم اس سے بھی زیادہ بعید احتمالات کی گنجائش  
 مانتے ہیں۔ اور اس طرح کی تاویلیں کرنے والے کے  
 متعلق ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ نسوس کا انکار  
 کر رہا ہے لیکن اس قول کے قائل کی تردید میں  
 ہم یہ کہیں گے کہ امت نے بالافتاق اس لفظ  
 (یعنی لانی بعدی) سے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم  
 کے قرائن احوال سے یہ سمجھا ہے کہ حضور کا مطلب



يكون الامتداد الاجماع - راتقدا والى الامتداد  
 یہ تھا کہ آپ کے بعد کبھی نہ کوئی نبی آئے گا نہ رسول  
 المطبۃ الادبیہ، مصر، ص ۱۱۴) نیز امتت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس میں کسی تاویل

اور شخصیں کی گنجائش نہیں ہے۔ لہذا ایسے شخص کو منکر اجماع کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(۶) محی الشیئۃ بقوی (متوفی ۱۰۵۷ھ) اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں: اللہ نے آپ کے ذریعہ سے نبوت کو ختم کیا، پس آپ انبیاء کے خاتم ہیں۔۔۔ اور ابن عباس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ (جلد ۳، ص ۱۵۸)

(۷) علامہ زنجیزی (۱۰۵۷ھ - ۱۱۳۸ھ) تفسیر کشف میں لکھتے ہیں: اگر تم کہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی کیسے ہوئے جبکہ حضرت عیسیٰ آخر زمانے میں نازل ہونگے؟ تو میں کہوں گا کہ آپ کا آخری نبی ہونا اس معنی میں ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنا یا جائے گا، اور عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے، اور جب وہ نازل ہونگے تو شریعت محمدیہ کے پیرو اور آپ کے نبی کی طرت نماز پڑھنے والے کی حقیقت سے نازل ہونگے۔ گویا کہ وہ آپ ہی کی امت ہے، کے ایک فرد ہیں۔ (جلد ۲، ص ۲۱۵)

(۸) قاضی عیاض (متوفی ۱۰۵۷ھ) لکھتے ہیں: جو شخص خود اپنے حق میں نبوت کا دعویٰ کرے، یا اس کو یا زور لگے کہ آدمی نبوت کا اکتساب کر سکتا ہے اور معناتی قلب کے ذریعہ سے مزید نبوت کو پہنچ سکتا ہے، جیسا کہ بعض فلسفی اور غالی صوفی کہتے ہیں، اور اسی طرح جو شخص نبوت کا دعویٰ تو نہ کرے مگر یہ دعویٰ کرے کہ اس پر دعویٰ آتی ہے۔۔۔ ایسے سب لوگ کافر اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جھٹلانے والے ہیں، کیونکہ آپ نے خبر دی ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ اور آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ خبر پہنچائی ہے کہ آپ نبوت کے ختم کرنے والے ہیں اور تمام انسانوں کی طرت آپ کو بھیجا گیا ہے اور تمام امت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر مشہور پر محمول ہے، اس کے معنی و مفہوم میں کسی تاویل و تفسیر کی گنجائش نہیں ہے۔ لہذا ان تمام گروہوں کے کافر ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں، برائے اجماع بھی اور برائے نقل بھی۔ (شفاء، جلد ۲، ص ۲۶۰ - ۲۶۱)

(۹) علامہ شہرستانی (متوفی ۱۰۵۷ھ) اپنی مشہور کتاب الملل والنحل میں لکھتے ہیں: اور اسی طرح جو کہے... کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہے، و بجز عیسیٰ علیہ السلام کے، تو اس کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہے۔ (جلد ۳، ص ۲۳۹)

(۱۰) امام نازی (۱۰۵۷ھ - ۱۱۶۶ھ) اپنی تفسیر کبیر میں آیت خاتم النبیین کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں

اُس سلسلہ بیان میں وخت آخر انبیین اس لیے فرمایا کہ جس نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی ہو وہ اگر نصیحت اور توضیح احکام میں کوئی کسر چھوڑ جائے تو اس کے بعد آنے والا نبی اُمت پورا کر سکتا ہے۔ مگر جس کے بعد کوئی آنے والا نبی نہ ہو اپنی اُمت پر زیادہ تفتیح ہوتا ہے اور اس کو زیادہ واضح رہنمائی دینا ہے کیونکہ اس کی مثال اُس باپ کی ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ اس کے بیٹے کا کوئی ولی و سرپرست اُس کے بعد نہیں رہے گا۔

وجلد ۶، ص ۵۸۱

(۱۱) علامہ بیضاوی (متوفی ۶۸۵ھ) اپنی تفسیر انوار التفسیر میں لکھتے ہیں: یعنی آپ انبیاء میں سب سے آخری نبی ہیں جس نے اُن کا سلسلہ ختم کر دیا، یا جس سے انبیاء کے سلسلے پر قیام کر دی گئی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپ کے بعد نازل ہونا اس ختم نبوت میں قاطع نہیں ہے کیونکہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپ ہی کے دین پر ہوں گے۔ (جلد ۴، ص ۱۶۴)

(۱۲) علامہ حافظ الدین (متوفی ۷۸۵ھ) اپنی تفسیر مدارک التفسیر میں لکھتے ہیں: اور آپ تمام انبیین ہیں۔ . . . یعنی نبیوں میں سب سے آخری۔ آپ کے بعد کوئی شخص ہی نہیں بنایا جاسکتا۔ رہے عیسیٰ تو یہ وہ انبیاء میں سے ہیں جو آپ سے پہلے ہی بنائے جا چکے تھے۔ اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے گویا کہ وہ آپ کی اُمت کے افراد میں سے ہیں۔ (ص ۴۷۱)

(۱۳) علامہ علاؤ الدین بغدادی (متوفی ۷۲۵ھ) اپنی تفسیر خازن میں لکھتے ہیں: وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ یعنی اللہ نے آپ پر نبوت ختم کر دی، اب نہ آپ کے بعد کوئی نبوت ہے نہ آپ کے بعد کوئی اُس میں شریک۔ . . . وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا، یعنی یہ بات اللہ کے علم پر ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں رہے گا۔ (ص ۴۴۴)

(۱۴) علامہ ابن کثیر (متوفی ۷۸۵ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں: پس یہ آیت اس باب میں نقص صریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور جب آپ کے بعد نبی کوئی نہیں تو رسول پدھر جبہ اولیٰ نہیں ہے، کیوں کہ رسالت کا منصب خاص ہے اور نبوت کا منصب عام، ہر نبی کو ملتا ہوا ہے مگر سربراہی، رسالہ نہیں ہوتا۔ . . . حضور کے بعد جو شخص بھی اس مقام کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے، قرآن و حلال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے۔ نہ کیسے ہی خرق عادت اور شعبہ سے اور جاؤ اور ظلم اور کوششے بنا کر لے آئے۔ . . . یہی حیثیت ہر اس شخص کی ہے جو قیامت تک اس منصب کا دعویٰ ہو۔

وجلد ۳، ص ۱۰۳-۱۰۴ (۴۹۴)

(۱۵) علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) تفسیر جلالین میں لکھتے ہیں: وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا، یعنی

اللہ اس بات کو جاننا چاہتا ہے کہ آنحضرت کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ نازل ہونے لگے تو آپ کی شریعت کے مطابق عمل کریں گے۔ (ص ۷۸)

(۱۶) علامہ ابن نجیم (ممتونی سنہ ۹۷۵ھ) اصول فقہ کی مشہور کتاب الأشیاء والنظاموں کتاب التیہ، باب الردہ میں لکھتے ہیں: "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، کیونکہ یہ ان باتوں میں سے ہے جن کا جاننا اور ماننا ضروریات دین میں سے ہے۔" (ص ۱۷۹)

(۱۷) علامہ تلمیذی (ممتونی سنہ ۱۰۱۷ھ) شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: "ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے۔" (ص ۲۰۲)

(۱۸) شیخ اسماعیل حنفی (ممتونی سنہ ۱۱۳۰ھ) تفسیر رموز البیان میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہاں صرف لفظ خاتم کے زبر کے ساتھ پڑھا جاوے گا جس کے معنی ہیں آخر ختم کے جس سے پھر کی باقی ہے جیسے طابع اہل چیز کہہتے ہیں جس سے ٹھکانا یا جاتے۔ مراد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں سب سے آخری تھے جن کے ذریعہ سے نبیوں کے سلسلے پر پھر لگا دی گئی۔ فارسی میں اسے پھر پیغمبران کہیں گے یعنی آپ سے نبوت کا دروازہ منقطع کر دیا گیا اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باقی تاریخوں نے اس بات کے ذریعے کے ساتھ خاتم پڑھا ہے، یعنی آپ پھر کرنے والے تھے۔ فارسی میں اسے پھر کنندہ پیغمبران کہیں گے۔ اس طرح یہ لفظ بھی خاتم کا ہم معنی ہی ہے۔۔۔ اب آپ کی امت کے علماء آپ سے صرف ولایت ہی کی میراث پائیں گے، نبوت کی میراث آپ کی شخصیت کے باعث ختم ہو چکی۔ اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپ کے بعد نازل ہونا آپ کے خاتم النبیین ہونے میں تاویح نہیں ہے کیونکہ خاتم النبیین ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ بنایا جاسکے گا۔۔۔ اور عیسیٰ آپ سے پہلے ہی بنا کر چکے تھے، اور عیسیٰ وہ نازل ہوں گے تو شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ آپ ہی کے قبیلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں گے۔ آپ کی امت کے ایک فرد کی طرح ہوں گے۔ نہ ان کی طرف دیکھیں گے اور نہ وہ سنتے احکام دیں گے بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ ہوں گے۔۔۔ اور اہل سنت والجماعت اس بات کے قائل ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا الَّذِينَ يَدْعُونَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ وَنَحْنُ نَحْمِلُ صَلَاتَهُمْ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ**۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لَا نَبِيَّ بَعْدِي**۔ اب جو کوئی کہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہے تو اس کو کافر قرار دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس نے نص کا انکار کیا۔ اور اسی طرح اس شخص کی بھی تکفیر کی جاسکتی ہے جو اس میں شک کرے، کیونکہ محبت نے تو کو باطل سے تمیز کر دیا ہے۔ اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے

بعد نبوت کا دعویٰ کر کے اس کا دعویٰ باطل کے سوا کچھ اور بھری نہیں سکتا۔ (جلد ۲۲، صفحہ ۱۸۸)

(۱۹) تیسری عالمگیری، وقت بارہویں صدی ہجری میں اوزنگ زبیب عالمگیری کے حکم سے ہندوستان کے بہت سے اکابر علماء نے مزید کیا تھا، اس میں نکھایہ: اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں تو وہ مسلم نہیں ہے۔ اور اگر وہ سمجھے کہ میں اللہ کا رسول ہوں یا میں پیغمبر ہوں تو اس کی تکفیر کی جاسکتی ہے۔

(جلد ۲، ص ۲۹۳)

(۲۰) تلامذہ شاکانی (متوفی ۱۲۵۵ھ) اپنی تفسیر فتح القدر میں لکھتے ہیں: جمہور نے لفظ خاتم کو مستعمل کیا ہے مگر یہ چڑھا ہے اور خاصہ نے زبر کے ساتھ پہلی قراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے انبیاء کو ختم کیا، یعنی سب کے آخر میں آئے۔ اور دوسری قراءت کے معنی یہ ہیں کہ آپ ان کے لیے ہر کی طرح ہو گئے جس کے ذریعہ ہمہ ان کا سلسلہ منبر ہو گیا اور جس کے شمول سے ان کا گروہ فریق ہوا۔ (جلد ۲، ص ۲۴۵)

(۲۱) علامہ آلوسی (متوفی ۱۲۷۰ھ) تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں: "یٰٰ اے اللہ! رسول کی نسبت عام ہے۔ لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے سے خود بخود لازم آتا ہے کہ آپ خاتم النبیین بھی ہیں۔ اور آپ کے نام انبیاء و رسول ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں وحدت نبوت سے آپ کے متصہ ہونے کے بعد اسب جن جن میں سے ہر ایک کے لیے نبوت کا وصف منقطع ہو گیا، "عظمت" ص ۳۲، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو شخص وحی نبوت کا مدعی ہو اسے کافر قرار دیا جائے گا۔ اس امر میں صحابہ کرام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔" (جلد ۲۲، ص ۳۸) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا ایک ایسی بات ہے جسے کتاب اللہ نے صاف صاف بیان کیا، سنت نے واضح طور پر اس کی تصریح کی، اور امت نے اس پر اجماع کیا۔ لہذا جو اس کے خلاف کوئی دعویٰ کرے لے

کافر قرار دیا جاسکتا ہے گا۔" (جلد ۲۲، ص ۲۹)

یہ ہندوستان سے لے کر مراکش اور آندلس تک، اور ترکی سے لے کر چین تک ہر مسلمان ملک کے اکابر علماء و نقباء اور محدثین و مفتیین کی تصریحات ہیں۔ ہم نے ان کے ناموں کے ساتھ ان کے مین ولادت و وفات بھی دے دیے ہیں جن سے ہر شخص ایک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ پہلی صدی سے تیرھویں صدی تک تاریخ اسلام کی ہر صدی کے اکابر ان میں شامل ہیں۔ اگرچہ ہم چودھویں صدی کے علماء سے اسلام کی تصریحات بھی نقل کر سکتے تھے، مگر ہم نے قصداً انہیں اس لیے چھوڑ دیا کہ ان کی تفسیر کے جواب میں ایک شخص یہ جملہ کر سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اس دور کے باطنی نبوت کی ضد میں ختم نبوت کے یہ معنی بیان کیے ہیں اس لیے ہم نے پہلے علماء کی تحریریں نقل کی ہیں جو ظاہر ہے کہ آج کے کسی شخص سے کوئی ضد نہ رکھ سکتے تھے۔ ان تحریروں سے یہ بات قطعی طور پر

ثابت ہو جاتی ہے کہ پہلی صدی سے آج تک پوری دنیا کے اسلام متفقہ طور پر پانچ خانم انبیئین کے معنی آخری نبی ہی سمجھتی رہی ہے، حضور کے بعد نبوت کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند تسلیم کرنا ہر زمانے میں تمام مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ رہا ہے۔ اور اس امر میں مسلمانوں کے درمیان کبھی کوئی اختلاف منہ نہیں رہا کہ جو شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کرے اور جو اس کے دعوے کو مانے وہ دائرۃ اسلام سے خارج ہے۔

اب یہ دیکھنا ہر صاحب عقل آدمی کا اپنا کام ہے کہ لفظ خانم انبیئین کا جو مفہوم لغت سے ثابت ہے جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے، جس کی تصریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود فرمادی ہے، جہاں پر صحابہ کرام کا اجماع ہے، اور جسے صحابہ کرام کے زمانے سے لے کر آج تک تمام دنیا کے مسلمان بلا اختلاف ماننے رہے ہیں، اس کے خلاف کوئی دوسرا مفہوم لینے اور کسی نئے نئے نبی کے لیے نبوت کا دروازہ کھولنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے، اور ایسے لوگوں کو کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے جنہوں نے باب نبوت کے مغفرت ہونے کا محض خیال ہی ظاہر نہیں کیا ہے بلکہ اس دروازے سے ایک صاحب یرم نبوت میں داخل بھی ہو سکتے ہیں اور یہ لوگ ان کی نبوت پر ایمان بھی لے آتے ہیں۔

اس سلسلے میں تین باتیں اور قابل غور ہیں:

### ایک اہم سوال

پہلی بات یہ ہے کہ نبوت کا معاملہ ایک بڑا ہی نازک معاملہ ہے۔ قرآن مجید کی روش سے یہ اسلام کے ان بنیادی عقائد میں سے ہے جس کے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کے کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہوا اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر اور وہ نبی نہ ہوا اور آدمی اس کو مان لے تو کافر۔ ایسے ایک نازک معاملے میں تو اللہ تعالیٰ سے کسی بے احتیاطی کی بدترجہ اولی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا ہوتا تو اللہ تعالیٰ خود قرآن میں صاف صاف اُس کی تصریح فرماتا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اُس کا کھلا کھلا اعلان کرتا اور حضور دنیا سے کبھی تشریف نہ لے جاتے جب تک اپنی امت کو اچھی طرح خبردار نہ کر دیتے کہ میرے بعد بھی انبیاء آئیں گے اور تمہیں ان کو ماننا ہوگا۔ آخر اللہ اور اس کے رسول کو ہمارے دین و ایمان سے کیا دشمنی تھی کہ حضور کے بعد نبوت کا دروازہ تو کھلا ہوتا اور کوئی نبی آنے والا بھی بڑا جس پر ایمان لاسکے بغیر ہم مسلمان نہ ہو سکتے، مگر ہم کو نہ صرف یہ کہ اس سے بے خبر رکھا جاتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ اور اس کا رسول، دونوں ایسی باتیں فرمادیتے جن سے تیرہ سو برس تک ساری امت یہی سمجھتی رہی اور آج بھی سمجھ رہی ہے کہ حضور کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

اب اگر بعضی مجال نبوت کا دروازہ واقعی کھلا بھی ہو اور کوئی نبی آج بھی جاتے تو ہم بے خوف و خطر اس کا انکار کر دیں گے۔ خطرہ ہو سکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی باندھنیں ہی کا تو ہو سکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا تو ہم یہ سارا ریکارڈ برسرِ عدالت لا کر رکھ دیں گے جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر بھی اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا۔ لیکن اگر نبوت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی تدعی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کونسا ریکارڈ خدا کی عطا میں پیش کر سکتا ہے جس سے وہ ایمانی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیشی ہونے سے پہلے اسے اپنی صفائی کے نوادہ کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے، اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کر کے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ یہ کام کر رہا ہے کیا ایک عقل مند آدمی اس پر اتنا دکر کے کفر کی سزا کا خطرہ منول لے سکتا ہے؟ اب نئے نبی کی آخر ضرورت کیا ہے؟

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اس شخص میں پیدا ہو جا یا کرے جس نے عبادت اور عملِ صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے، اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیاء پر انبیا نہیں بھیجے جاتے۔

قرآن مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیاء مبعوث ہوتے ہیں:

اول یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اُس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم ٹھلا دی گئی ہو، یا اس میں تحریف ہو گئی ہو اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعہ مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیل دین کے لیے مزید انبیاء کی ضرورت ہو۔

چہاڑم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اُس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔  
قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضور کو نام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دنیا کی تمدنی تاریخ  
بتا رہی ہے کہ آپ کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہتے ہیں کہ آپ کی دعوت سب قوموں  
کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیاء آنے کی کوئی حاجت باقی  
نہیں رہتی۔

قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت سے رہا ہے  
کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں منہج و تحریف کا کوئی  
عمل نہیں ہوا ہے۔ جو کتاب آپ لائے تھے اس میں ایک لفظ کی بھی کمی و بیشی آج تک نہیں ہوئی، نہ قیامت  
تک ہو سکتی ہے۔ جو ہدایت آپ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اس طرح ہیں  
مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی۔  
پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضور کے ذریعہ سے دین کی تکمیل کر دی گئی۔ لہذا  
تکمیل دین کے لیے بھی آپ کوئی نبی درکار نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضور کے زمانے میں آپ کے  
ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کونسی ہے جس کے لیے آپ کے بعد ایک نبی کی ضرورت  
ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اس سے پوچھیں گے  
کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر  
ہوتا ہے کہ اس پر وحی کی جاتے، اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے، یا پھلے پیغام  
کی تکمیل کرنے کے لیے، یا اس کو تحریفیات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور  
ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں، تو اب اصلاح کے  
لیے صرف مسلمانوں کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیاء کی۔

نئی نبوت اب اُمت کے لیے رحمت نہیں

تیسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب بھی کسی قوم میں آتے گا فوراً اس میں کفر و ایمان کا سوال اٹھ  
کھڑا ہوگا۔ جو اس کو مانیں گے وہ ایک اُمت قرار پائیں گے اور جو اس کو نہ مانیں گے وہ لامحالہ دوسری اُمت  
ہوں گے۔ ان دونوں اُمتوں کا اختلاف محض فرعی اختلاف نہ ہوگا بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا

ایسا بنیادی اختلاف ہوگا جو انہیں اُس وقت تک جمع نہ ہونے دینگا جب تک ان میں سے کوئی اپنا عقیدہ نہ چھوڑ دے۔ پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ الگ الگ ہوں گے، کیونکہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیشینگی ہوتی دھی اور اس کی سنت سے قانون لے گا اور دوسرا گروہ اس کے ماخذ قانون ہونے کا سب سے منکر ہوگا۔ اس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بنانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگا۔ ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اُس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختم نبوت اُمت مسئلہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے جس کی بدولت ہی اس اُمت کا ایک دائمی اور عالمگیر برادری بننا ممکن ہوا ہے۔ اس چیز نے مسلمان کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے جو ان کے اندر مستقل تفریق کا موجب ہو سکتا ہو۔ اب جو شخص بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و رہبر مانتے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور ماخذ ہدایت کی طرف رجوع کرنے کا قائل نہ ہو وہ اس برادری کا فرد ہے اور ہر وقت ہو سکتا ہے۔ یہ وحدت اس اُمت کو کبھی نصیب نہ ہو سکتی تھی اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہو جاتا۔ کیونکہ ہر نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔

آدمی سوچے تو اس کی عقل خود یہ کہہ دے گی کہ جب تمام دنیا کے لیے ایک نبی بھیج دیا جائے، اور جب اس نبی کے ذریعہ سے دین کی تکمیل بھی کر دی جائے، اور جب اس نبی کی تعلیم کو پوری طرح محفوظ بھی کر دیا جائے، تو نبوت کا دروازہ بند ہو جانا چاہیے تاکہ اُس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہو کر تمام دنیا میں ہمیشہ کے لیے اہل ایمان کی ایک ہی اُمت بن سکے اور بلا ضرورت نئے نئے نبیوں کی آمد سے اس اُمت میں بار بار تفرق نہ برپا ہوتا رہے۔ یہی خولہ "ظلی" ہو یا "یروزی"، اُمتی ہو یا صاحبِ سرِ رعیت اور صاحبِ کتاب، ہر حال میں جو شخص نبی ہوگا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوگا، اس کے آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کے ماننے والے ایک اُمت بنیں اور ماننے والے کافر قرار پائیں۔ یہ تفریق اُس حالت میں تو ناگزیر ہے، بلکہ نبی کے بھیجے جانے کی فی الواقع ضرورت ہو، مگر جب اس کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہے تو خدا کی حکمت اور اس کی رحمت سے یہ بات قطعی بعید ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو کفر و ایمان کی کشمکش میں مبتلا کرے اور انہیں کبھی ایک اُمت نہ بننے دے۔ لہذا جو کچھ قرآن سے ثابت ہے اور جو کچھ سنت اور اجماع سے ثابت ہے عقل بھی اسی کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہی رہنا چاہیے۔



# ”مسیح موعود“ کی حقیقت احادیث کی روشنی میں

نئی نبوت کی طرف بلاسنے والے حضرات عام طور پر یا واقعہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ احادیث میں مسیح موعود کے آنے کی خبر دی گئی ہے، اور مسیح نبی تھے، اس لیے اُن کے آنے سے ختم نبوت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی بلکہ ختم نبوت بھی برقی اور اس کے باوجود مسیح موعود کا آنا بھی برقی۔

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ”مسیح موعود سے مراد عیسیٰ ابن مریم نہیں ہیں۔ ان کا تو انتقال ہو چکا۔ اب جس کے آنے کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ قیبل مسیح، یعنی حضرت عیسیٰ کے مانند ایک مسیح ہے، لہذا وہ فلاں شخص ہے جو آپکا ہے۔ اُس کا ماننا عقیدہ ختم نبوت کے خلاف نہیں ہے۔“

اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہم یہاں پورے حوالوں کے ساتھ وہ مستند روایات نقل کیے گئے ہیں جو اس مسئلے کے متعلق حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان احادیث کو دیکھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا اور آج اس کو کیا بنایا جا رہا ہے۔

احادیث در باب نزول عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام

(۱) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ	حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
علیہ وسلم والذی نفسی بیدہ لیسونک	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم سے ہے اُس ذات کی
ان ینزل فیکم ابن مویہ حکمنا عدلاً	جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اتریں گے
فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویبغ	تمہارے درمیان ابن مریمؑ حاکم عادل بن کرے، پھر
الحروب ویفیض المال حتی لا یقبلہ	وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور مختصر کر دے ہلاک

لے واضح رہے کہ مسیح موعود کے آنے یا نہ آنے کا معاملہ قرآن کے متعلق ہی نہیں رکھتا۔ اس کا سا بار دار و مدار احادیث پر ہے۔ اب اگر کوئی مسیح آنا ہے تو وہ مسیح آنا ہے جس کا ذکر صحیح و معتبر احادیث میں ہے۔ اور اگر کوئی ان احادیث کو نہیں مانتا تو مرنے سے کسی مسیح کو آنا ہی نہیں ہے۔ یہ محض سخرہ پن جو گا کہ اس عقیدے کی بنا تو احادیث پر ہے، اور پھر ان احادیث میں ہیں بیخ نکالی جاسے جو مسیح کی آمد کے بارے میں صحیح ترین اور معتبر ترین ہیں۔ (مترجم)

أحد حتى تكفتم المسجد الواحدة خيراً  
 من الدنيا وما فيها وبتجاری کتاب امامیث  
 الانبیاء، باب نزول عیسیٰ ابن مریم مسلم، باب بیان  
 نزول عیسیٰ ابن مریم بنوری (ابن ابی نعیم)، باب فی نزول  
 عیسیٰ بن مریم احمد، مرویات ابو ہریرہؓ  
 کریں گے؟ اور جنگ کا خاتمہ کریں گے دوسری  
 روایت میں حرب کے بجائے جزیرہ کا لفظ ہے، یعنی  
 جزیرہ ختم کریں گے؟ اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس  
 کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور درحالت یہ جو  
 ہائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور ایک  
 سجدہ کر لیا دنیا و ما فیہا سے بہتر ہوگا؟

(۲) ایک اور روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ لا تقوم الساعة حتى ينزل عيسى ابن مريم  
 ... قیامت قائم نہ ہوگی جب تک نازل نہ ہو لیں عیسیٰ ابن مریم ... اور اس کے بعد وہی مضمون ہے  
 جو اوپر کی حدیث میں بیان ہوا ہے (تجاری، کتاب المظالم، باب کسر الصلیب - ابن ماجہ، کتاب الفتن  
 باب عقنۃ الدجال)

(۳) عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ  
 علیہ وسلم قال کیف انتم اذا نزل  
 ابن مریم فیکمروا ما کممتمکمہ وبتجاری  
 حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیسے ہو گے تم جبکہ  
 تمہارے درمیان ابن مریم آئیں گے اور تمہارا

صلیب کو ٹوڑ دینے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم  
 ہو جائے گی۔ دین عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے یعنی حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر لعنت  
 کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا۔ اور انبیاء کی امتوں کے درمیان عیسائوں کی امتیازی خصوصیت ہے  
 کہ انہوں نے مرث عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کر دی تھی کہ خنزیر تک کو حلال کر لیا جو تمام انبیاء کی شریعتوں میں  
 حرام رہا ہے پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آکر خود اعلان کر دیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہ میں نے صلیب پر جان دینی  
 نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بناؤں عیسائی عقیدے کے لیے سر سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے  
 کہ میں نے تو نہ اپنے پیروں کے لیے سڑ حلال کیا تھا اور نہ ان کو شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھیرایا تھا، تو عیسائیت کی  
 دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

۳۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ملتوں کے اختلافات ختم ہو کر سب لوگ ایک ملت  
 اسلام میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح نہ جنگ ہوگی اور نہ کسی پر جزیرہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر اگلے حوالے  
 نمبر وہ ادالت کر رہی ہیں۔

امام اُس وقت خود تم میں سے ہو گا۔

کتاب احوال و بیعت الانبیاء، باب نزول عیسیٰ مسلم،

بیان نزول عیسیٰ مستند احمد، مرویات ابی ہریرہ

(۴) عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم قال ینزل عیسیٰ ابن مریم

فیقتل الخنزیر ویحو الصلیب و یجمعه

لہ الصلوٰۃ ویعطي المال حتی لا یقبل

ویضع الخراج وینزل الروحاء فیہج

منہا، او یصنم، او یجمعہما (مستند احمد)

بسند مرویات ابی ہریرہ، مسلم، کتاب الحج

باب جواز التمتع فی الحج والتبران،

ہے کہ حضور نے ان میں سے کونسی بات فرمائی تھی۔

(۵) عن ابی ہریرۃ (بعد ذکر خروج النبی)

فبینا ہم رجلاً ون لقتال بیوت الصوت

اذا قیمت الصلوٰۃ فینزل عیسیٰ ابن

مریم فیا شہر فاذا سراجا عدوان اللہ یدوب

کما یدوب الملح فی السماء فلو توککہ

لانذاب حتی یتہلک ولكن یقتلہ اللہ

بیدۃ فی ربہم دمعہ فی حریتہ۔ (مشکوٰۃ،

کتاب النعمان، باب الملاحم، بھارت مسلم)۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو شادیں گے اور ان کے بچے نماز جمع کی پائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہو گا اور وہ خراج ساقط کر دیں گے اور روحانہ کے مقام پر نازل کریں گے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، یادوں کو جمع کریں گے۔ راوی کو شک

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے وہ رجال کے خروج کا ذکر کرنے کے بعد حضور نے فرمایا: اس آٹھویں کہ مسلمان اُس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے، جنہیں باندھ کر رہے ہوں گے اور نماز کے پینے تکبیر اقامت کہی جا چکی ہوگی کہ عیسیٰ ابن مریم نازل ہو جائیں گے اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا دشمن یعنی رجال ان کو دیکھتے ہی اس طرح گھٹنے لگے گا جیسے ٹک پانی میں گھٹنا ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام اُس کو اُس کے حال پر ہی پھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گھٹل کر مارتے۔ مگر اللہ اُس کو ان کے ہاتھ سے قتل کرے گا اور وہ اپنے نیرے میں اُس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔

یعنی نماز میں حضرت عیسیٰ امامت نہیں کریں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہو گا اسی کے پیچھے وہ نماز پڑھیں گے۔ ۲۵ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔

۱۷۰۰ء کے زمانے میں جن صاحب کو شیل سے قرار دیا گیا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں نہ حج کیا اور نہ عمرہ۔

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میرے اور ان (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) کے درمیان کوئی تہی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ آترنے والے ہیں، پس جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، وہ ایک میاں قد آدمی ہیں، رنگ مائل بسرفی و سپیدی ہے، دو زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر کے بال ایسے ہوں گے گریا آٹا ان سے پانی ٹپکنے والا ہے، حالانکہ وہ بھیسے ہوئے نہ ہوں گے۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے صلیب کو پاش پاش کر دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیرہ ختم کر دیں گے، اور اللہ ان کے مانے میں اسلام کے سوا تمام عقول کو مٹا دے گا۔ اور وہ مسیح و تبال کو ہلاک کر دیں گے، اور زمین میں بڑے

چالیس سال ٹھہریں گے۔ پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ... پھر عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ آئیے، آپ نماز پڑھائیے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو چکے ہو۔ اُس عزت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اس امت کو دی ہے۔

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما نے ابن عباس کے سلسلے میں روایت کرتے ہیں کہ پھر عمر بن خطاب نے عرض کیا: یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسے قتل کر دوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

(۶) عن ابی ہریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لیس یبئی و بئیکہ نبی (یعنی عیسیٰ) وانہ نازل فاذا امر ایتسو و فاعرفوہ رجل مردوع الی الحمر تاک و ایماض، بین مہمرتین کان رأسہ یقطروان لہم عیبہ بلل فیقاتل الناس علی الاسلام فیدق الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیرۃ ویهدک اللہ فی زمانہ الملک کلہا الاسلام ویهدک المسیم الدجال فیہمکت فی الارض اربعین سنۃ ثم یتوفی فیصلی علیہ المسلمون۔

راؤد اور، کتاب الملاحم، باب خروج الرجال۔

(۷) عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم... فیقول عیسیٰ بن مریم صلی اللہ علیہ وسلم فیقول لا ان بعضکم علی بعض امراء تکرمہ اللہ ہذا الامۃ۔ (تسلم، بیان نزول عیسیٰ ابن مریم، مسند احمد بسند مرویات جابر بن عبد اللہ)

(۸) عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فی قصۃ ابن صیاد فقال عمر بن الخطاب اذن لی فاقول یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ین یکن ہو فلیست صاحبہ

فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (یعنی دجال) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو گے اسے تو عیسیٰ ابن مریم ہی قتل کریں گے۔ اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمہیں اہل عہد (یعنی ذمیوں) میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

بابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ دجال کا قصہ بیان کرنے ہوتے ہی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُس وقت تک ایک عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام مسلمانوں کے درمیان آجائیں گے پھر نماز پڑھیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ اسے روح اللہ آگے بڑھائے مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تمہارے امام ہی کو آگے بڑھانا چاہیے، وہی نماز پڑھائے۔ پھر صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمان دجال کے مقابلے پر نکلیں گے۔ فرمایا: جب وہ کذاب حضرت عیسیٰ کو دیکھے گا تو گھٹنے لگے گا جیسے تمک پانی میں گھٹنا ہے پھر وہ اس کی طرف بڑھیں گے اور اسے قتل کر دیں گے اور حالت

پرہیزگی کو برکت اور پتھر پکارا نہیں گئے کہ اسے روح اللہ پر بیہوشی میرے نیچے چھپا ہوا ہے۔ دجال کے پیروں میں سے کوئی بچے گا جسے وہ (یعنی عیسیٰ) قتل نہ کر دیں۔

حضرت نواس بن سمرعان کلابی (قصہ دجال بیان کرنے پر تھے) روایت کرتے ہیں: اس زمانہ میں کہ دجال یہ کچھ کر رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو بھیج دے گا اور وہ دمشق کے مشرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس، زبردنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازووں پر اپنے ہاتھ رکھے ہوئے آئیں گے۔ جب

انما صاحبہ عیسیٰ ابن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام، وان لا یکن فلیس تک ان تقتل رجلا من اهل العہد (مشکوٰۃ کتاب الفتن باب قصہ ابن صیاد، بحوالہ شرح السنۃ بخاری)

(۹) عن جابر بن عبد اللہ رقی قصۃ الدجال، فاذا ہجر عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام فتفامر الصلوٰۃ فیقال لہ تقدیر یا روح اللہ فیتقول لیتقدیر اما مکم فلیصل بکم فاذا صلی صلوٰۃ الصبح خرجوا الیہ فیاں فجین یری الکناب ینماث کما ینماث الملیح فی الماء فیمشی الیہ فیقئلہ حتی ان الشجر والحدیر ینادی یا روح اللہ هذا الیہودی، فلا یتروک من کان ینتبعہ احد الا قتلہ۔ (مسند احمد، بسند روایات جابر بن عبد اللہ)

(۱۰) عن النّوّاس بن سمرعان رقی قصۃ الدجال، فیہما ہو کذابک اذ بعث اللہ المسیح ابن مریم فی نزل عند المناسرة الیہیضا و شوق دمشق بین مہر و ذنین و اضعاف کفیبہ علی اجنحة ملکین اذ اطأ اسر اسلہ قطرو اذ امر فعدہ تحد رمنہ جمان کالمروء فلا یجل لکا فر عید من یح نغسہ الامات و

وہ سر جھکا میں گئے تو ایسا محسوس ہو گا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اٹھا میں گئے تو مقل کا طرح قطرے ڈھکے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کا تڑک پھینچے گی۔ اور وہ ان کی نظر تک جائے گی۔ وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابن مریم و جمال کا چھپا کریں گے اور گدگد سے دو وار سے پر اسے جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔

عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رجال میری امت میں نکمے گا اور چالیس دنیں نہیں جاتا چالیس دن یا چالیس دن یا چالیس سال رہے گا پھر اللہ عیسیٰ ابن مریم کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عروہ بن مسعود (ایک صحابی) سے مشابہ ہو گا۔ وہ اس کا چھپا کریں گے اور اسے ہلاک کر دیں گے، پھر سات سال تک رگ اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت نہ ہوگی۔

حدیث ابن اسید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک تہذیبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے آپ نے پوچھا کیا بات ہو رہی ہے، لوگوں نے عرض کیا ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا وہ ہرگز قائم

نفسد یفتی الی حیث یختی طرفہ فیطیہ حتی یدرکہ بیاب لدا فبقتلہ۔ وسلم، ذکر الدجال۔ ابروا وود، کتاب الملائم، یا خروج الدجال ترمذی، ابواب الفتن، باب فی فتنۃ الدجال۔ ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنۃ الدجال،

(۱۱) عن عبد اللہ بن عمرو قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخرج الدجال فی استی فیما کنت اربعین الی اربعین یوماً او اربعین شهراً او اربعین عاماً، فبیعت اللہ عیسیٰ ابن مریم کانہ عروہ بن مسعود فبطلہ فیہا لکہ ثیر سیکت الناس سبع سنین لیس بین اثنتین عداوة (مسلم، ذکر الدجال)

(۱۲) عن حدیثہ بن اسید الغفاری قال اطلح النبی صلی اللہ علیہ وسلم علینا ونحن نتذکر فقال ما تذکرون قالوا نذکر الساعة قال انھا لن تقوم حتی تذکروا قبلھا عشر ايات فذکر الذخا

لہ واضح رہے کہ لہدہ Lvdda، قسطنطنیہ میں ریاست اسرائیلی کے دارالسلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈا بنا رکھا ہے۔  
تھے یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کا اپنا قول ہے۔

نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے اس نشانیاں ظاہر نہ ہو جائیں۔ پھر آپ کے لئے وہ دس نشانیاں بتائیں (۱۱) دُحُوَان، (۱۲) وَتَبَال، (۱۳) وَابْتِهَ الْأَرْضُ (۱۴) سُورُجِ كَالْمَغْرِبِ سے طلوع ہونا، (۱۵) عَلِيٌّ ابْنِ مَرْثَمٍ كَالنُّزُولِ، (۱۶) يَا جُورُجُ وَيَا جُورُجُ، (۱۷) تَيْنٌ بُرْسٌ خَصْفٌ، ایک مشرق میں، (۱۸) دُوسْرَا مَغْرِبِيْنِ (۱۹) تَيْسْرَا حِيْرِيْرَةَ الْعَرَبِ مِيْنِ (۲۰) سَبِّ سِے آخر میں ایک زبردست آگ جو زمین سے اٹھے گی اور لوگوں کو پالکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آرا و کردہ غلامِ نبویؐ روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: سیرتِ آہستہ کے دو لشکر ایسے ہیں جن کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچا لیا۔ ایک وہ لشکر جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا وہ جو علیؑ ابن مرثم کے ساتھ ہوگا۔

مُجِيبُ بِنِ جَابِرِيْرَةَ انصاری کہتے ہیں، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ابن مرثم عیال کو لود کے دروازے پر قتل کریں گے۔

ابو امامہ باہلی ایک طویل حدیث میں وقال کا ذکر کرتے ہوئے، روایت کرتے ہیں کہ میں اس وقت جب مسلمانوں کا امام صبح کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوگا علیؑ ابن مرثم ان پر اترا میں گئے۔

وَالدَّجَالُ وَالذَّابِقَةُ وَطُلُوعُ الشَّمْسِ مِنْ مَغْرِبِهَا وَنُزُولُ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَيَا جُورُجُ وَمَا جُورُجُ وَثَلَاثَةُ خُصُوفٍ، خُصْفٌ بِالْمَشْرِقِ وَخُصْفٌ بِالْمَغْرِبِ، وَخُصْفٌ بِجَزِيْرَةِ الْعَرَبِ وَآخِرُ ذَلِكَ نَارٌ تَخْرُجُ مِنَ الْعِيْنِ تَطْرُقُ النَّاسَ إِلَى مَحْشَرِهِمْ وَتَسْمُ بِكُتَابِ الْفِتَنِ وَاشْرَاطُ السَّاعَةِ أَبُو رُوَيْدٍ، كِتَابُ الْمَلَأَمِ، بَابُ الْمَلَاتِ السَّاعَةِ

(۱۳) عَنْ ثَوْبَانَ مَوْلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَصَا تَانِ مِنَ اصْتِي إِحْرَزَهُمَا اللَّهُ تَعَالَى مِنَ النَّارِ - عَصَا يَتَعْتَرَوُ الْعَنْدَ، وَعَصَا يَتَكُونُ مَعَ عَيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَتَسْمَى، كِتَابُ الْجَاهِدِ مُسْتَدْرَكًا لِسُلَيْمَةَ رَأِيَتْ ثَوْبَانَ، (۱۴) عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جَابِرِيْرَةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ يَقْتُلُ ابْنُ مَرْيَمَ الدَّجَالَ بِبَابِ لُدٍّ مُسْتَدْرَكًا تَرْبُفِي، (بُؤَابُ الْفِتَنِ)

(۱۵) عَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ رَفِي حَدِيثِ طَرِيْلِي فِي ذِكْرِ الدَّجَالِ، فَبَيْنَمَا أَصَابَهُمْ قَدْ تَقَدَّمَ يَصِلِي بِهِمَا الصَّبِيحُ إِذَا نَزَلَ عَلَيْهِمْ عِيسَى بِنِ مَرْيَمَ فَرُجِمَ ذَلِكَ الْإِمَامَ بِتِكْصِ عَيْسَى

فَهْتَمِي لِيَتَقَدَّرَ عَيْسَىٰ فَيَنْتَمِعَ عَيْسَىٰ بِبَدَاةِ  
 بَيْنِ كَتْفَيْهِ ثُمَّ لِيَقْبَلُ لَهُ تَقْدِيمَ فَضْلِ فَانْهَاجَا  
 لِكِ اِقْبَمَتِ فَيُصَلِّيْ بِهَمَامَا مَسْمَرًا ذَا  
 اَلْضُرُوفِ قَالَ عَيْسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِفْتَحُوا  
 الْبَابَ فَيَقْتَمِعُ وَرَوَاةُ الدَّجَالِ وَمَعَهُ  
 سَبْعُونَ اَلْفًا يَهُودِيًّا كُلُّهُمْ قَوَسِيْعَةٌ  
 مَحَلِّيٌّ وَسَاجِدٌ فَاذْ اَنْظُرَالِيَه الدَّجَالُ ذَا بِي كَمَا  
 يَذُوبُ السَّلْحُ فِي الْمَاءِ وَيَطْلُقُ هَارِبًا وَ  
 يَقُولُ عَيْسَىٰ اِنَّ لِي فِيْكَ ضَرْبَةٌ لَنْ تَسْبِقَنِي  
 بِهَا فَيُدْرِكُهٗ عِنْدَ بَابِ اللُّذَّةِ الشَّرْقِيِّ فَيَهْزِمُ  
 اِيَّاهُ الْيَهُودُ . . . . . وَتَمَلُّا الْاَرْضَ مِنْ  
 الْمُسْلِمِ كَمَا يَمَلُّا الْاَنْاءَ مِنَ الْعَامِرِ وَتَكُوْنُ  
 الْكَلِمَةُ وَاِحْدَةً فَلَا يَعْبُدُ اِلَّا اللّٰهَ تَعَالَىٰ  
 ذَا بِنِ مَاجِهٖ كِتَابُ الْفِتَنِ ، بَابُ نَمْنَمَةِ الدَّجَالِ :

ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔“

(۱۶) عَنْ عَثْمَانَ بْنِ اِبْنِ الْعَاصِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ  
 اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ . . . . . وَ  
 يَنْزِلُ عَيْسَىٰ اِبْنُ مَرْيَمَ عَلَيْهِ السَّلَامُ عِنْدَ  
 سَلْوَةِ الْفَجْرِ فَيَقُوْلُ لَهُ اِمِيْرُهُمْ يَا رُوْحُ  
 اللّٰهِ تَقْدِمُ ، صَلَّى . فَيَقُوْلُ هٰذِهِ الْاَمْسَةُ  
 بَعْضُهُمْ اِهٖ رَا عَرَفَى بَعْضٌ فَيَقْدِمُ رَا مِيْرَهُمْ  
 فَيَمْسِي ، فَاذْ اَقْبَضَتْ صَلْوَتُهٗ اَخَذَ عَيْسَىٰ  
 حَرِيْبَهٗ فَيَذْهَبُ نَحْوَ الدَّجَالِ فَاذْ اَبْدَاةِ  
 الدَّجَالِ ذَا بِي كَمَا يَذُوبُ الرِّصَاصُ فَيَضْمُ  
 حَرِيْبَهٗ بَيْنِ شَنْدُوْبَتِهٖ فَيَقْتُلُهٗ وَيَهْزِمُ

ادام پیچھے پیچھے گا تاکہ عیسیٰ آگے بڑھیں، مگر عیسیٰ اس کے  
 شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ نہیں تم ہی  
 نماز پڑھاؤ کیونکہ یہ تمہارے لیے ہی کھڑی ہوئی چنانچہ  
 چنانچہ وہی نماز پڑھائے گا۔ سلام پھیرنے کے بعد عیسیٰ  
 علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھولو، چنانچہ وہ  
 کھولا جائے گا۔ باہر دو جمال، ہر نماز میں پہنچنے والے  
 ساتھ موجود ہوگا۔ جو نبی کہ عیسیٰ علیہ السلام پر اس کی  
 نظر پڑے گی وہ اس طرح گھٹنے لگے گا جیسے تک پانی  
 میں گھٹنا ہے اور وہ بھاگ نکلے گا۔ عیسیٰ کہیں گے میرے  
 پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے تو  
 بچ کر نہ جاسکے گا۔ پھر وہ اسے لڑتے کے مشرقی دروازے  
 پر جائیں گے اور اللہ پہنچا دیوں گا۔ ہر اسے گا۔  
 . . . اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی  
 جیسے برتن پانی سے بھر جاتے ہیں۔ سب دنیا کا کلر ایک

عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول  
 اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرمانے سنا ہے . . . . .  
 اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام فجر کی نماز کے  
 وقت اتر آئیں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے  
 کہے گا کہ آسے رُوح اللہ! آپ نماز پڑھائیے  
 وہ جواب دیں گے کہ اس امت کے لوگ خود ہی  
 ایک دوسرے پر امیر ہیں۔ تب مسلمانوں کا امیر آگے  
 ٹیڑھ کر نماز پڑھائے گا۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسیٰ  
 اپنا حربہ لے کر دو جمال کی طرف چلیں گے۔ وہ جب  
 ان کو دیکھے گا تو اس طرح گھٹنے لگے گا جیسے سید گھٹنا



عیسیٰ علیہ السلام اپنے حواریوں سے اس کو بلا کر کہیں گے اور اس کے ساتھ نیکوئی نہ کریں گے مگر کہیں انہیں چھینے کو جبکہ نہ ملے گی، حتیٰ کہ ذریت

سمرہ بن جندب (ایک طویل حدیث میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں: پھر نبی کے وقت مسلمانوں کے درمیان عیسیٰ ابن مریم آجائیں گے اور اللہ و جمال اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا یہاں تک کہ دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکار اٹھیں گی کہ اے مومن، یہ کافر میرے پیچھے چھپا ہوا ہے، آ اور اسے قتل کر۔

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں عیسیٰ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری ہوگا یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا فیصلہ آجائے اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہو جائیں۔

حضرت عائشہ (رجال کے قسے میں) روایت کرتی ہیں: پھر عیسیٰ علیہ السلام انہیں گے اور رجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک امام عادل اور حکم منصب کی حیثیت سے رہیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام سفینہ (رجال کے قسے میں) روایت کرتے ہیں: پھر عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ

اسے چاہے لیں یومئذ شیخا یواری منہم احد حتی ان الشجر ليقول یا صومن ہذا کافر دُستار احمد خیرانی بحاکم، پکاریں گے اے مومن، یہ کافر یہاں موجود ہے۔

(۱۷) عن سمرة بن جندب عن النبي صلى الله عليه وسلم رقا حديث طويل، فيصيح فيهم عيسى ابن مريم فيضرمه الله و جنوده حتى ان اجذرا الحافطوا صل الشجر ليتأدى يا صومن هذا كافر يستغرب فتعال اقتله دستار احمد بحاکم،

(۱۸) عن عمران بن حصين ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال لا تزال طائفة من امتي على الحق ظاهرين على من تاؤهم حتى ياتي امر الله تبارك وتعالى وينزل عيسى ابن مريم عليه السلام - دستار احمد

(۱۹) عن عائشة رقا قصة الدجال، فيقول عيسى عليه السلام فيقتله ثم يمكث عيسى عليه السلام في الارض اربعين سنة اما ما دعا دلا وحكما مفصلا - دستار احمد

(۲۰) عن سفينة صولى رسول الله صلى الله عليه وسلم رقا قصة الدجال، فيقول عيسى عليه السلام فيقتلك الله تعالى

ردجال کو اذیت کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔  
 حضرت حذیفہ بن یمان ردجال کا ذکر کرتے ہوئے  
 بیان کرتے ہیں: پھر جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے  
 کھڑے ہو گئے تو ان کی آنکھوں کے سامنے عیسیٰ ابن  
 مریم آتر آئیں گے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے  
 پھر سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے کہیں گے کہ پھر  
 اور اس دشمن خدا کے درمیان سے ہٹ جاؤ۔۔۔  
 اور اللہ ردجال کے ساتھیوں پر مسلمانوں کو تسلط  
 کرے گا اور مسلمان انہیں خوب ماریں گے یہاں تک  
 کہ وحشت اور پتھر پکاراٹھیں گے اسے عبداللہ بن  
 عبدالرحمن، اسے سلمان، یہ رہا ایک یہودی ماہر  
 اس طرح اللہ ان کو فنا کرے گا اور مسلمان غالب  
 ہوں گے اور یسلیب توڑ دیں گے انٹرنیٹ کو قتل کر  
 دیں گے اور جزیرہ ساقط کر دیں گے۔

عند عقبة آفیق (مسند احمد)  
 (۲۱) عن حذیفة رقی ذکر الدجال فلما  
 قاموا يصلون نزل عیسیٰ ابن مریم  
 امامهم فصلى بهم فلما انصرفت قال  
 هكذا فرجوا بیني وبين عدو الله...  
 وليصل الله عليهم المسلمين فيقتلونهم  
 حتى ان الثجر والحجر لينا دى يا عبدا لله  
 يا عبدا الرحمن يا مسلم هذا اليهودي  
 فاقتلهم فيقتلهم الله تعالى ويظهر  
 المسلمون فيكسرون الصليب ويقتلون  
 الخنزير وليصنعون الحزبية (مسندك حاكم)  
 مسلم میں بھی یہ روایت اختصار کے ساتھ آئی ہے اور  
 حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد ۵ ص ۵۴ میں اسے  
 صحیح قرار دیا ہے۔

یہ جملہ ۲۱ روایات ہیں جو صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں  
 اگرچہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے لیکن طویل کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان  
 سب کو نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف وہ روایتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

ان احادیث سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی مسیح موعود یا "قیل مسیح" یا "بروز مسیح" کا  
 سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ ان میں اس امر کی کوئی گنجائش ہے کہ کوئی شخص اس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ

لے اذیت کی گھاٹی کہتے ہیں، تمام اور اسرائیل کی سرحد پر موجود ریاست تمام کا آخری شہر ہے۔ اس کے آگے مغرب  
 کی جانب پنڈیل کے فاصلہ پر کبریت نامی جھیل ہے جس میں سے دریائے اردن نکلتا ہے، اور اس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں  
 کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے جو تقریباً ڈیڑھ دو ہزار فیسٹ تک گہرائی میں اتر کر اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سے دریائے  
 اردن کبریت میں سے نکلتا ہے۔ اسی پہاڑی راستے کو عقبہ آفیق کی گھاٹی کہتے ہیں۔ (دمولف)



دربال کے نکتے کا استیساں کر دیں اس غرض کے لیے وہ ایسے طریقے سے نازل ہو گئے کہ جن مسلمانوں کے درمیان ان کا نزول ہوگا انہیں اس امر میں کوئی شک نہ رہے گا کہ یہ یعنی ابن عمر ہی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر نازل ہوئے ہیں۔ وہ اگر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے، جو بھی مسلمانوں کا امام اُس وقت ہوگا اسی کے پیچھے نماز پڑھیں گے، اور جو میں اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا اسی کو آگے رکھیں گے، تاکہ اس شہر کی کوئی اور نبی

اللہ علیہ السلام راجعاً سے ۱۳۵ھ میں ان ک طرت وحی ہوئی اور نہ وہ احکام مقرر کریں گے

بلکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔

اور یہی بات علامہ آلوسی تفسیر روح المعانی میں کہتے ہیں:

ثم انه عليه السلام حين ينزل باق على نبوته  
 السابغة لرب عز وجل عنها بحان نكند لا يتعبد  
 بصا لستجها في حقه وحض غيره وتكليفه  
 باسكاره هذه الشريعة اصلاً وخرقاً فلا  
 يكون اليه عليه السلام روحى ولا نصيب احكام  
 بل يكون خديفه لرسول الله صلى الله عليه  
 وسلم وحاكما من حكامه منته بين ائتمته -  
 راجعاً ۲۲ ص ۳۲

پھر عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو وہ اپنی باقی  
 نبوت پر باقی ہوں گے، پھر حال اُس سے مغزول تو نہ ہو  
 جائیں گے، مگر وہ اپنی پھلی شریعت کے پیرو نہ ہوں گے  
 کیونکہ وہ ان کے اور دوسرے سب لوگوں کے حق میں شریعت  
 پر چلے اور اب وہ اصول اور فروع میں اس شریعت  
 کی پیروی پر مکلف ہو گئے، لہذا ان پر نہ اپنے وحی آئیگی  
 اور نہ انہیں احکام مقرر کرنے کا اعتبار ہوگا، بلکہ وہ  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب اور آپ کی امت

ہیں۔ امت محمدیہ کے حاکموں میں سے ایک حاکم کی حیثیت سے کام کریں گے۔

امام رازی اس بات کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

انتظار الانبياء الى صبيحة يوم صلي الله  
 عليه وسلم فعند صبيحة انتمت ثلاث المدة  
 فلا يبعد ان يصير ابي عيسى ابن مريه بعد  
 نزوله تبعاً للمحمد (تفسیر کبیر ج ۳ ص ۳۲۲)

انبیاء کا دور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک تھا جب  
 آپ صبح ہو گئے تو انبیاء کی آمد کا زمانہ ختم ہو گیا۔  
 اب یہ بات عجیب از قیاس نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰؑ  
 نازل ہونے کے بعد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تابع ہونے لگے

سے اگرچہ دو روایتوں (نمبر ۲۱ و ۲۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہونے کے بعد اپنی نماز اور  
 پڑھائیں گے، لیکن بیشتر اور قوی تر روایات (نمبر ۲-۳-۴-۵-۹-۱۶) یہی کہتی ہیں کہ وہ نماز میں امامت کرانے سے انکار کریں گے اور  
 جو اس وقت مسلمانوں کا امام ہوگا اسی کو آگے رکھیں گے۔ اسی بات کو محمد بن ابراہیم اور فخر بن عبد اللہ نے بالانفاذ تسلیم کیا ہے۔  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

گنجائش بھی نہ رہے کہ وہ اپنی سابق پیغمبرانہ حیثیت کی طرح اب پھر پیغمبری کے فرائض انجام دینے کے لیے واپس آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی جماعت میں اگر خدا کا پیغمبر موجود ہو تو نہ اس کا کوئی امام دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور نہ امیر پس جب وہ مسلمانوں کی جماعت میں آکر محض ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں گے تو یہ گویا خود بخود اس امر کا اعلان ہوگا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لاتے ہیں، اور اس بنا پر ان کی آمد سے مہم نبوت کے ٹوٹنے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔

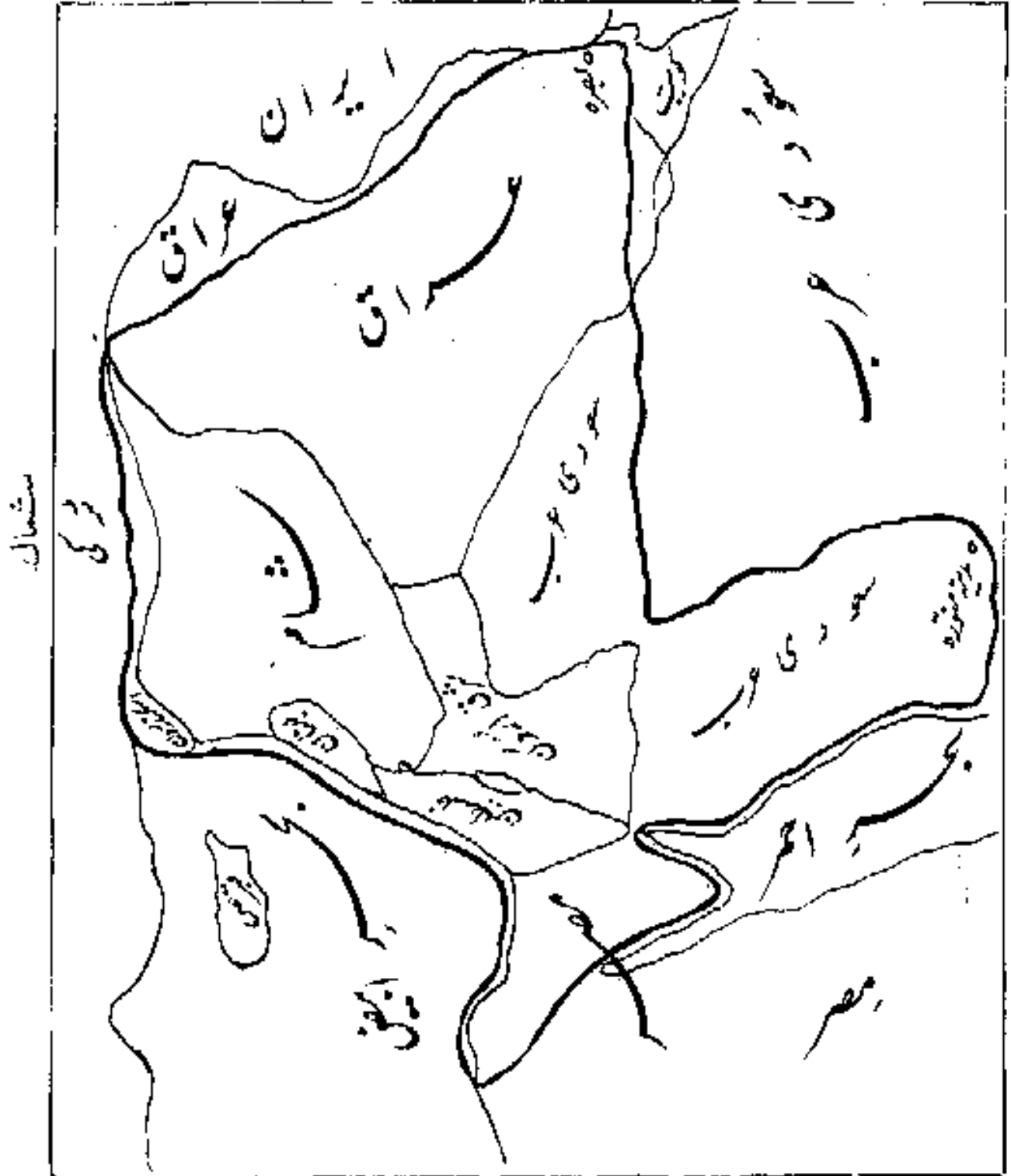
ان کا آنا بلا تشبیہ اسی نوعیت کا ہوگا جیسے ایک صدر ریاست کے دور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں مملکت کی کوئی خدمت انجام دے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک صدر کے دور میں کسی سابق صدر کے محض آجانے سے آئین نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دو صورتوں میں آئین کی خلاف ورزی لازم آتی ہے۔ ایک یہ کہ سابق صدر آکر پھر سے فرائض صدارت سنبھالنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص اس کی سابق صدارت کا بھی انکار کر دے، کیونکہ یہ ان تمام کاموں کے جواز کو پہنچ کرنے کا ہم معنی ہوگا جو اس کے دور صدارت میں انجام پائے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی نہ ہونو جاسکتے خود سابق صدر کی آمد آئینی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ یہی معاملہ حضرت عیسیٰ کی آمد تانی کا بھی ہے کہ ان کے محض آجانے سے ختم نبوت نہیں ٹوٹتی۔ البتہ اگر وہ آکر پھر نبوت کا منصب سنبھال لیں اور فرائض نبوت انجام دینے شروع کر دیں یا کوئی شخص ان کی سابق نبوت کا بھی انکار کر دے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے آئین نبوت کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ احادیث نے پوری وضاحت کے ساتھ دونوں صورتوں کا سدباب کر دیا ہے۔ ایک طرف وہ تصریح کرتی ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ اور دوسری طرف وہ خبر دیتی ہیں کہ عیسیٰ ابن مریم دوبارہ نازل ہوں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی یہ آمد تانی منصب نبوت کے فرائض انجام دینے کے لیے نہ ہوگی اسی طرح ان کی آمد سے مسلمانوں کے اندر کفر و ایمان کا بھی کوئی نیا سوال پیدا نہ ہوگا۔ ان کی سابقہ نبوت پر تو آج بھی اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کافر ہو جائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی اس نبوت پر ایمان رکھتے تھے اور آپ کی ساری امت ابتدا سے ان کی مومن ہے یہی حیثیت اُس وقت بھی ہوگی۔ مسلمان کسی نازہ نبوت پر ایمان نہ لائیں گے بلکہ صلی ابن مریم علیہ السلام کی سابقہ نبوت ہی پر ایمان رکھیں گے جس طرح آج رکھتے ہیں۔ یہ چیز نہ آج ختم نبوت کے خلاف ہے نہ اُس وقت ہوگی۔

آخری بات جو ان احادیث سے، اور کثرت دوسری احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہاں جس کے فتنہ عظیم کا استیصال کر لے کے لیے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو بھیجا جائے گا، یہودیوں میں سے ہوگا اور اپنے آپ کو مسیح کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اس معاملے کی حقیقت کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ

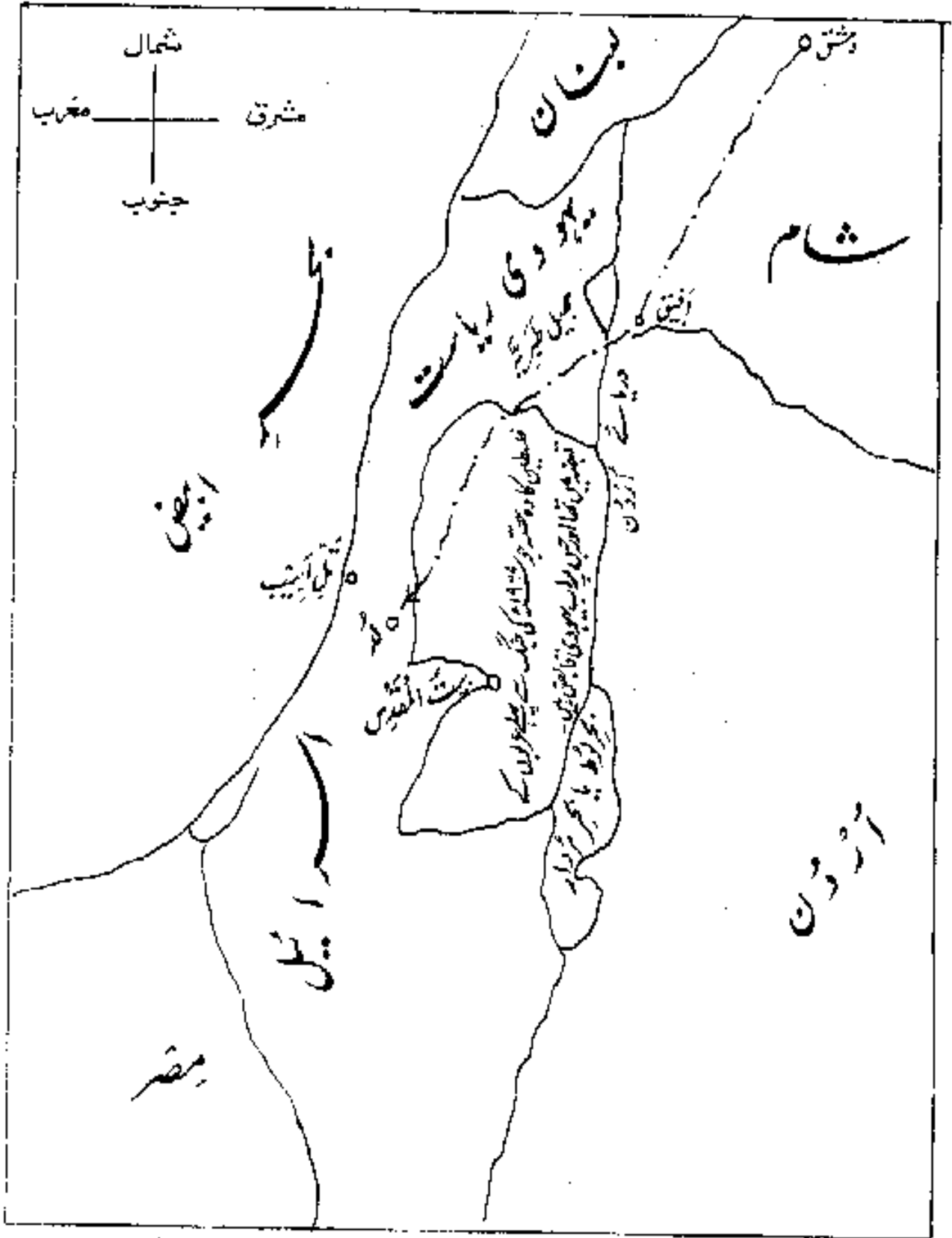
یہودیوں کی تاریخ اور ان کے مذہبی تصورات سے واقف نہ ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل بے درپے تشریل کی حالت میں مبتلا ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ آخر کار بابل اور اسیریا کی سلطنتوں نے ان کو غلام بنا کر زمین میں نشر مبر کر دیا، تو انبیائے نبی اسرائیل نے ان کو خوشخبری دینی شروع کی کہ خدا کی طرف سے ایک مسیح آنے والا ہے جو ان کو اس ذلت سے نجات دلائے گا۔ ان پیشین گوئیوں کی بنا پر یہودی ایک ایسے مسیح کی آمد کے متوقع تھے جو بادشاہ ہو، لو کہ ملک فتح کرے، بنی اسرائیل کو ملک سے لاکر فلسطین میں جمع کر دے، اور ان کی ایک زبردست سلطنت قائم کر دے۔ لیکن ان کی ان توقعات کے خلاف جب حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام خدا کی طرف سے مسیح ہو کر آئے اور کوئی لشکر ساتھ نہ لائے تو یہودیوں نے ان کی مسیحیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انہیں ہلاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ اُس وقت سے آج تک دنیا بھر کے یہودی اُس مسیح موعود (Promised Messiah) کے منتظر ہیں جس کے آنے کی خوشخبریاں ان کو دی گئی تھیں۔ ان کا لٹریچر اس آنے والے دور کے سہانے خوابوں سے بھرا ہوا ہے۔ تلخ اور رنجوں کے اربابیت میں اُس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اُس کی خیالی قدرت کے سہارے صدیوں سے یہودی ہی رہے ہیں اور یہ اُمید لینے بیٹھے ہیں کہ یہ مسیح موجود ایک زبردست جنگی و سیاسی لیڈر ہو گا جو دریائے نیل سے دریائے فرات تک کا علاقہ جیسے یہودی اپنی میراث کا ملک سمجھتے ہیں، انہیں واپس دلائے گا، اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لا کر اس ملک میں بھر ستے جمع کر دے گا۔

اب اگر کوئی شخص مشرق وسطیٰ کے حالات پر ایک نگاہ ڈالے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے پس منظر میں ان کو دیکھے تو وہ فوراً یہ محسوس کرے گا کہ اُس دنیا کی اکبر کے ظہور کے لیے (مسیح بائبل تیار ہو چکا ہے جو حضور کی دی ہوئی خبروں کے مطابق یہودیوں کا مسیح موعود بن کر اٹھے گا۔ فلسطین کے بڑے حصے سے مسلمان نکل کے جا چکے ہیں اور وہاں اسرائیلی کے نام سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی گئی ہے۔ اس ریاست میں دنیا بھر کے یہودی کچھ کچھ کر چلے آ رہے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اس کو ایک زبردست جنگی طاقت بنا دیا ہے۔ بیڑی سرمایے کی بے پایاں امداد سے یہودی سائنس دان اور ماہرین فنون اُس کو روز افزوں ترقی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ اور اُس کی بیخود گروتھ کی مسلمان قوموں کے لیے ایک خطرہ عظیم بن گئی ہے۔ اس ریاست کے لیڈروں نے اپنی اس ننا کو کچھ چھپا کر نہیں رکھا ہے کہ وہ اپنی "میراث کا ملک" حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مستقبل کی یہودی سلطنت کا جو نقشہ وہ ایک مدت سے کھلم کھلا تالیف کر رہے ہیں اُسے مقابل کے صفحے پر ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پورا شام، پورا لبنان، پورا اردن اور تقریباً سارا عراق لینے کے علاوہ ترکی سے اسکندرون، مصر سے سینا اور یمن کا علاقہ اور سعودی عرب سے بالائی عمانہ وود کا علاقہ بھی لینے میں مددگار ہو رہے ہیں۔ ان

وہ یہودی ریاست جس کا خواب اسرائیل کے لیڈر دیکھ رہے ہیں :-



# تحقیقی مسیح کے نزول کا مقام





حالات کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ کسی عالمگیر جنگ کی شہرتوں سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور ٹھیک اُس موقع پر وہ وصال اکبر ان کا مسیح موعود بن کر اٹھے گا جس کے ظہور کی خبر دینے ہی پڑی صلی اللہ علیہ وسلم نے اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اُس زمانے میں مسلمانوں پر مسائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹیں گے کہ ایک دن ایک سال کے برابر محسوس ہوگا۔ اسی بنا پر آپ فتنہ مسیح وصال سے خود بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے اور اپنی امت کو بھی پناہ مانگنے کی نصیحت فرماتے تھے۔

اس مسیح وصال کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی مثیل مسیح کو نہیں بلکہ اُس اسمعیل مسیح کو نازل فرمائے گا جسے دو ہزار برس پہلے یہودیوں نے مائنتے سے انکار کر دیا تھا اور تب وہ اپنی دانست میں صلیب پر چڑھا کر ٹھکانے لگا چکے تھے۔ اس حقیقی مسیح کے نزول کی جگہ ہندوستان یا افریقہ یا امریکہ میں نہیں بلکہ دمشق میں ہوگی کیونکہ یہی مقام اُس وقت میں محاذ جنگ پر ہوگا۔ براہ کرم دوسرے صفحے پر نقشہ ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اسرائیل کی سرحد سے دمشق بمشکل ۵۰-۶۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہی جو احادیث ہم نقل کر آئے ہیں ان کا مسنونہ اگر آپ کو یاد ہے تو آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہ ہوگی کہ مسیح وصال ۷۰ ہزار یہودیوں کا لشکر لے کر شام میں ٹھکے گا، اور دمشق کے سامنے جا پہنچے گا۔ ٹھیک اُس نازک موقع پر دمشق کے مشرقی حصے میں ایک سفید مینار کے قریب حضرت عیسیٰ ابن مریم صبح نماز میں ہوں گے اور نماز فجر کے بعد مسلمانوں کو اس کے مقابلے پر لے کر نکلیں گے۔ اُن کے حملے سے وصال سپا ہو کر افیق کی گھاٹی سے (ملاحظہ ہو حدیث نمبر ۲۱) اسرائیل کی طرف پٹے گا اور وہ اس کا نقاب کریں گے۔ آخر کار گد کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر وہ اُن کے ہاتھ سے مارا جائے گا (حدیث نمبر ۱۰-۱۱-۱۵)۔ اس کے بعد یہودی جن جن کو قتل کیے جائیں گے اور ملت یہود کا خاتمہ ہو جائے گا (حدیث نمبر ۹-۱۵-۲۱) عیسائیت بھی حضرت عیسیٰ کی طرف سے اظہار حقیقت ہو جانے کے بعد ختم ہو جائے گی (حدیث نمبر ۱-۲-۳-۶) اور تمام ملتیں ایک ہی ملت مسلمہ میں ضم ہو جائیں گی (حدیث نمبر ۷-۱۵)۔

یہ ہے وہ تسیقیت جو کسی اشتباہ کے بغیر احادیث میں صاف نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اس امر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ مسیح موعود کے نام سے جو کاروبار ہمارے ملک میں پھیلا گیا ہے وہ ایک جعل سازی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

اس جعل سازی کا سبب زیادہ مستحکم انگیزہ ظہور ہے کہ جو صاحب اپنے آپ کو ان پیش گوئیوں کا مصداق قرار دیتے ہیں انہوں نے خود عیسیٰ ابن مریم یعنی مسیح کے لیے یہ دسیپ تاویل فرمائی ہے:

”اُس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) براہین احمدیہ کے نمبر سے حقے میں میرا نام مریم رکھا۔ پھر جیسا کہ براہین احمدیہ سے ظاہر ہے، دو برس تک صفت و کمیت میں میں نے پرورش پائی۔۔۔ پھر مریم کی طرح عیسیٰ کی

رکن مجدد میں بیعت کی گئی اور استغفار سے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا، اور اگر کئی مہینے کے بعد، جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اُس الہام کے جو سب سے آخر ہر امین احمدیہ کے حصہ چہارم میں درج ہے، مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرایا (کشتی نوح، ص ۸۷-۸۸-۸۹)۔  
یعنی پہلے مریم بنے، پھر خود ہی حاملہ ہوئے، پھر اپنے پیٹ سے آپ عیسیٰ (ابن مریم بن کر) تولد ہو گئے! اس کے بعد یہ مشکل پیش آتی کہ عیسیٰ ابن مریم کا نزول تو احادیث کی رو سے دمشق میں ہونا تھا جو کئی ہزار برس سے شام کا ایک مشہور و معروف مقام ہے اور آج بھی دنیا کے نقشے پر اسی نام سے موجود ہے۔ یہ مشکل ایک دوسری طرف تاویل کے یوں رفع کی گئی:

» واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر مشابہت اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے نسبت کا نام دمشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو زبیری الطبع اور زبیری طبع کی عادات اور خیالات کے پیرو ہیں... یہ قصہ قادیان بوریہ اس کے کہ اکثر زبیری الطبع لوگ اس میں سکونت رکھتے ہیں دمشق سے ایک مشابہت اور نسبت رکھتا ہے۔ (عاشیہ انزالہ اوہام ص ۶۳ تا ۶۴)

پھر ایک اور الجھن یہ باقی رہ گئی کہ احادیث کی رو سے ابن مریم کو ایک سفید منارہ کے پاس اترا تھا چنانچہ اس کا اصل یہ نکال لیا گیا کہ مسیح صاحب نے اگر اپنا منارہ خود بنوا لیا۔ اب اسے کون دیکھتا ہے کہ احادیث کی رو سے منارہ وہاں ابن مریم کے نزول سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا، اور یہاں وہ مسیح موعود صاحب کی تشریح آوری کے بعد تعبیر کیا گیا۔

آخری اور زبردست الجھن یہ تھی کہ احادیث کی رو سے تہ عیسیٰ (ابن مریم) کو لہ کے دروازے پر وصال کو قتل کرنا تھا۔ اس مشکل کو رفع کرنے کی فکر میں پہلے طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں کبھی تسلیم کیا گیا کہ نہ بیت المقدس کے یہاں میں سے ایک گاؤں کا نام ہے (انزالہ اوہام)، شائع کردہ انجمن احمدیہ لاہور، تفسیر خورشید صفحہ ۲۲۰) پھر کہا گیا کہ لہ ان لوگوں کو کہتے ہیں جو بے جا جھگڑا کرنے والے ہوں... جب وصال کے سجا جھگڑے کا ان تک پہنچ جائیں گے تب مسیح موعود ظہور کرے گا اور اس کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ کرے گا۔ (انزالہ اوہام صفحہ ۷۰)۔ لیکن جب اس سے بھی بات نہ بنی تو صاف کہہ دیا گیا کہ لہ سے مراد لہ صیاناں ہے اور اس کے دروازے پر وصال کے قتل سے مراد یہ ہے کہ انصار کی مخالفت کے باوجود وہیں سب سے پہلے مرزا صاحب کے ہاتھ پر حجت ہوئی۔ (الہدٰی ص ۹)

ان تاویلات کو شخص بھی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹے بیروپ (False

Impersonation) کا صریح انکشاف ہے جو عمل الاعلان کیا گیا ہے۔

# قاویہائیوں کی مزید باویلاست باطلہ

صریح نصوص سے گریز

جب کسی مسئلے کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے بالکل عداوت اور صریح نصوص میں کر دیا ہو تو پھر آخری سلسلے میں ان نصوص کو چھوڑ کر دوسری آیات و احادیث سے جو دراصل اس خاص مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے وارد نہیں ہوئی ہیں۔ اپنے مطلب کے معنی نکالنا اور نصوص قطعیہ کے بالکل خلاف عقیدہ یا عمل اختیار کر لینا و تحقیقت انتہائی گمراہی بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف بدترین بغاوت ہے۔ جو شخص فلائیم اللہ اور اس کے فرمان کے خلاف کوئی مسکاب اختیار کرتا ہے وہ تو کم تر درجے کی بغاوت کرتا ہے۔ مگر بہت بڑے درجے کی بغاوت ہے کہ آدمی اللہ اور رسول کے فیصلے کے خلاف خود اللہ اور رسول ہی کے ارشادات کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے لگے۔ یہ کام جو لوگ کرتے ہیں ان کے متعلق ہم کسی طرح بھی یہ فریق نہیں کر سکتے کہ وہ سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول کو مانتے ہیں۔ یہ سوال کہ شہداء محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں یا نہیں؟ اور آپ کے بعد کوئی نبی آسکتا ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ہم آیت **وَمَنْ يُبَدِّلِ اللَّهُ وَرَسُولَهُ** النساء: ۴۶ اور آیت **يُنَبِّئُ آذَانَ** (اعلانہ: ۳۵) اور ایسی ہی دوسری آیتوں کی طرف صرف اس صورت میں رجوع کر سکتے تھے جب کہ اللہ اور اس کے رسول نے خاص طور پر یہی سوال کا جواب کسی خاص نص میں نہ دے دیا ہو۔ مگر جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت **ثُمَّ لَمْ يَلْقَ فِيهَا** اور ایسی ہی دوسری آیات کی طرف رجوع کرنا، اور پھر ان سے نصوص قطعیہ صریح کے خلاف مطالب نکالنا صرف اس شخص کا کام ہو سکتا ہے جو خود اسے بالکل بے خوف ہو چکا ہو اور جسے یہ بھی یقین نہ ہو کہ کسی سرکردہ کے سامنے جواب دہی بھی کرنی ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے تعزیرات پاکستان کی ایک خاص دفعہ میں ایک فعل کو بالفاظ صریح مجرم قرار دیا گیا ہو۔ اور کوئی شخص اس دفعہ کو چھوڑ کر قانون کی دوسری غیر متعلق دفعات کا جائزہ اس غرض کے لیے لیتا پھرے کہ کہیں سے کوئی اشارہ اور کہیں سے کوئی نکتہ نکال کر اور پھر انہیں جوڑ جا کر اسی فعل کو ثابت کر دے جسے قانون کی ایک صریح دفعہ مجرم قرار دے رہی ہے۔ اس طرح

کا استدلال اگر دنیا کی پونیس اور عدالت کے رہائے نہیں چل سکتا، تو آخر یہ خدا کے ہاں کیسے چل جائے گا؟

### زبردستی کا استدلال

پھر جن آیات سے قادیانی استدلال کرتے ہیں بجائے خود ان کو پڑھ کر دیکھا جائے تو آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ ان میں سے وہ مضمون آخر کہاں نکلتا ہے جو یہ لوگ زبردستی ان سے منجھڑنا چاہتے ہیں جن مختلف آیات کو یہ لوگ تلمیح مشق بنا تے ہیں۔ ان کے صحیح مفہوم پر غور کرنا ضروری ہے۔

آیت مَن يُطِيعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ (النساء ۴۹) میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے انبیاء و صدیقین اور شہداء و صالحین کے ساتھ ہوں گے۔ اس سے یہ مضمون کیسے نکل آیا کہ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہ یا تو نبی ہو جائیں گے یا صدیق یا شہید یا صالح؛ پھر سورہ مدیہ کی آیت ملاحظہ فرمائیے۔ اس میں ارشاد ہوا ہے کہ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِۦٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ السَّٰبِقُونَ اَلَّذِيْنَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يَدْخُلُوْنَهَا مِنْۢ بَابٍ وَّ لَا يَحْتَسِبُوْنَ فِيْهَا عَمَلًا سَابِقًا ؕ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (البقرہ ۱۹۵) اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ ایمان کے نتیجے میں جو دولت کسی کو مل سکتی ہے وہ صرف صدیقی اور شہید ہوجانے کی ہے۔ رہے انبیاء تو ان کی معیت نصیب ہو جانا ہی اہل ایمان کے لیے کافی ہے کسی عمل کے انعام میں کسی شخص کا نبی ہوجانا ممکن نہیں ہے۔ اسی بنا پر سورہ نساء کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والے انبیاء و صدیقین و شہداء کے ساتھ ہوں گے۔ اور سورہ مدیہ کی آیت میں فرمایا کہ اللہ اور رسول پر ایمان لائے جانے خود صدیقی اور شہداء بن جائیں گے۔

یہی آیت یٰۤاٰمَنُوْا مَا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيُخْرِجَكُم مِّنْ اٰمِنٍ (اعراف ۴۵) تو وہ ایک سلسلہ بیان سے تعلق کرتی ہے جو سورہ اعراف میں آیت ۶۷ تک مسلسل چلی رہا ہے۔ اس سیاق و سباق میں رکھ کر اسے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ نبی آدم سے یہ خطاب آغاز تخلیق انسانی میں کیا گیا تھا جس کو پڑھ کر یہ مطلب سمجھنے کا لاجا سکتا ہے کہ ان آیات میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کے آنے کا ذکر ہے۔ اس میں تو اس وقت کا قصہ بیان کیا جا رہا ہے جب حضرت آدم اور ان کی بیوی کو جنت سے نکال کر زمین پر لایا گیا تھا۔ ۹۹

### سورہ اعراف کی آیت کا صحیح مفہوم

سورہ اعراف کی آیت ۴۵ کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے جو خوب قاریانی حضرات نکالتے ہیں وہ اس نچے کے برعکس ہے جو سلسلہ کلام میں اسے رکھ کر دیکھنے سے نکلتا ہے۔ دراصل یہ آیت جس سلسلہ کلام میں وارد ہوتی ہے وہ سورہ اعراف کے رکوع دوم سے رکوع چہارم کے وسط تک مسلسل بیان ہوا ہے۔ پہلے رکوع دوم میں آدم و حوا کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ پھر رکوع سوم و چہارم میں ان ناسخ پر تنبیہ دیکھا گیا ہے جو اس قصے سے نکلنے میں اس

سیاق و سباق کو ذہن میں رکھ کر آیت ۳۵ کو پڑھا جائے تو سمات معلوم ہوتا ہے کہ ”یٰٰسَیُّوْا اٰدَمَ کَیْطَیْبَ“ کے الفاظ سے خطاب کر کے جو بات کہی گئی ہے اس کا تعلق آغاز آفرینش کے وقت سے ہے تاکہ نزول قرآن کے وقت سے یہ الفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ آغاز آفرینش ہی میں اولاد آدم کو اس بات پر متنبہ کر دیا گیا تھا کہ تمہاری نجات اس بات کی پیروی پر موقوف ہے جو خدا کی طرف سے تم کو بھیجی جائے۔

اس مضمون کی آیات قرآن میں تین مقامات پر آئی ہیں اور تینوں مقامات پر قصہ آدم و حوا کے سلسلے ہی میں اس کو وارد کیا گیا ہے۔ پہلی آیت سورہ بقرہ میں ہے (آیت نمبر ۲۰۸)۔ دوسری آیت سورہ اعراف میں ہے (آیت نمبر ۱۷۳) اور تیسری آیت سورہ طہ میں ہے (آیت نمبر ۱۲۳)۔ ان تینوں آیتوں کا مضمون بھی باہم مشابہ ہے اور موقع و محل بھی مشابہ۔ مفسرین قرآن بھی دوسری آیتوں کی طرح سورہ اعراف کی اس آیت کو قصہ آدم و حوا ہی سے متعلق قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ضمن میں حضرت ابراہیمؑ کی شکل کا قول نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے یہاں حضرت آدم اور ان کی ذریت کو کجا اور ایک ہی وقت میں خطاب کیا ہے۔ امام رازیؒ اپنی تفسیر کبیر میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”اگر خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوا، حالانکہ وہ خاتم الانبیاء ہیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ یہاں امتوں کے بارے میں اپنی مسکنت بیان فرما رہا ہے۔ علامہ آلوسیؒ اپنی تفسیر روح المعانی میں فرماتے ہیں کہ ”یہاں ہر قوم کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہے اسے حکایت بیان کیا جا رہا ہے۔ یہاں نبی آدم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت مراد لینا مستبعد اور ظاہر کے خلاف ہے۔ کیونکہ یہاں جمع کا لفظ ”رسل“ استعمال ہوا ہے۔ علامہ آلوسیؒ کے ارشاد کے آخری حصے کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہاں امت محمدیہ سے خطاب ہوا ہے تو پھر اس امت کو یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ”کبھی تم میں رسل آئیں“ کیوں کہ اس امت میں ایک رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا مزید رسولوں کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سورہ مؤمنون کی آیت کا مفہوم

آیت ”یٰٰۤاَيُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاَعْتَمَدُوْا صٰلِحٰتِہُنَّ لِیَسَّۤا فَعَمَلُکُمْ عَلَیْمٌ“ (مؤمنون - ۱۵) کو بھی اگر اس کے سیاق و سباق سے الگ نہ کیا جائے تو اس سے وہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا جو قادیانی حضرات نے نکالا ہے۔ یہ آیت جس سلسلہ کلام میں وارد ہوئی ہے وہ رکوع روم سے مسلسل چلا آ رہا ہے، اس میں حضرت نوح سے لے کر حضرت عیسیٰ بن مریمؑ تک مختلف زمانوں کے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کا ذکر کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ ہر سبب اور ہر زمانے میں انبیاء ایک ہی تعلیم دیتے رہے ہیں، ایک ہی ان سب کا طریقہ رہا ہے، اور ایک ہی طریقے سے ان سب پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوتا رہا ہے۔ اس کے برعکس گمراہ قرین ہمیشہ خدا کے رستے کو چھوڑ کر غلط کاری میں مبتلا ہوتی رہی ہیں۔ اس سلسلہ بیان میں یہ آیت اس معنی میں نہیں آئی ہے کہ ”اے رسول اور جو

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آئے والے ہو تم پاک رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام رسولوں کو، جن کو علیہ السلام کے وقت سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک آئے تھے، اللہ تعالیٰ نے یہی ہدایت فرمائی تھی کہ پاک رزق کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

اس آیت سے بھی مفسرین قرآن نے کبھی یہ مطلب نہیں لیا کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انبیاء کی آمد کا دروازہ کھولتی ہے۔ اگر کوئی مزید تحقیق و اطمینان کرنا چاہے تو مختلف تفسیروں میں اس مقام کو دیکھ سکتا ہے۔ احادیث سے قادیانیوں کا غلط استدلال

حدیث کو عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا نے روایت کیا کہ اگر ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم زندہ رہتے تو نبی ہوتے، اسے قادیانی حضرات جو استدلال کرتے ہیں وہ چاروجہ سے غلط ہے۔

اولیٰ یہ کہ جس روایت میں اسے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے اس کی سند ضعیف ہے اور محدثین میں سے کسی نے بھی اس کو قوی تسلیم نہیں کیا ہے۔

دوم یہ کہ نووی اور ابن عبد البر صیہیہ اکابر محدثین اس مضمون کو بالکل ناقابل اعتبار قرار دیتے ہیں۔ امام نووی اپنی کتاب تہذیب الاسماء والصفات میں لکھتے ہیں:

اما ما روي عن بعض المتقدمين لوعائش  
ابراهيم كان نبيا في اطل وجسا من اهل  
الكلاب على الغيبات ومجازفة د هجو  
علا عن ايديهم۔  
نہی وہ بات جو بعض متقدمین سے منقول ہے کہ اگر  
ابراہیم زندہ ہوتے تو نبی ہوتے، تو وہ باطل ہے اور  
تہذیب کی باتوں پر کلام کرنے کی لیے جاہل و جاہل  
اور بے سوچے سمجھے ایک بڑی بات منہ سے نکال دینا ہے۔

اور علامہ ابن عبد البر صیہیہ لکھتے ہیں:  
لا ادرى ما هذا فقد وجد نوع غليله اسلا  
غیر نبی و لو لم یولد النبی الانبیاء کان کل  
احد نبیا لانهم من نوع علیہ السلام۔  
وہ میں نہیں جانتا کہ یہ کیا مضمون ہے۔ نوح علیہ السلام  
کے ہاں غیر نبی اولاد ہو چکی ہے۔ حالانکہ اگر نبی کا بیٹا  
نبی ہی ہوتا ضروری ہوتا تو آج سب نبی ہوتے کیونکہ  
سب کے سب نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

سوم یہ کہ اکثر روایات میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائی یا بھانجے کے قول کی حیثیت سے نقل کیا گیا ہے اور وہ اس کے ساتھ یہ تسبیح بھی کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو تک کوئی نبی نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے صاحبزادے کو اٹھایا۔ مثال کے طور پر بخاری کی روایت یہ ہے:

عن اسمعيل بن ابي خالد قال قلت  
اسماعیل بن ابی خالد کہتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ

لعبدہ اللہ بن ابی اوفی اور آیت ابوہم بن ابی  
 صلی اللہ علیہ وسلم؟ قال مات صحباً  
 ولو قُضی ان یکون بعد محمد صلی اللہ علیہ  
 وسلم نبی عاشقاً لبتد ولکن لا نبی بعدہ۔  
 دہخاری کتاب الادب باب من سعی باسناد الانبیاء  
 بن ابی اوفی صحابی ہے پوچھا کہ آپ نے نبی صلی اللہ  
 علیہ وسلم کے ساتھ جو اسے ابراہیمؑ کو دیکھا ہے، انہوں  
 نے کہا کہ وہ یحییٰ ہی میں فوت ہو گئے۔ اگر اللہ تعالیٰ کا  
 فیصلہ یہ ہوتا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی ہو  
 تو آپ کا صاحبزادہ زندہ رہتا مگر حضور کے بعد کوئی  
 اور نبی نہیں ہے۔

اسی سے ملتی جلتی روایت حضرت انس سے بھی منقول ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:  
 ولو لبتی لکان نبیاً لکن لعریق لان نبیکم  
 اخذ الانبیاء۔ (تفسیر روح المعانی جلد ۲ صفحہ ۳)  
 کیونکہ تمہارے نبی آخری نبی ہیں۔

چہاں ہم یہ کہ اگر بالفرض صحابہ کرام کی یہ تصریح یا سنت بھی نہ ہوتی، اور محدثین کے اقوال بھی موقود نہ ہوتے جن میں اس  
 روایت کو جزئی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی سببیت سے منقول ہوئی ہے ضعیف اور ناقابل اعتبار قرار دیا گیا  
 ہے، تب بھی وہ کسی طرح قابل قبول نہ ہوتی کیونکہ یہ بات علم حدیث کے مستند اصولوں میں سے ہے کہ اگر کسی  
 ایک روایت سے کوئی ایسا مضمون نکلتا ہو جو بہت سی احادیث کے خلاف پڑتا ہو تو اسے قبول نہیں کیا جا  
 سکتا۔ اب ایک طرف وہ کثیر التعداد صحیح اور قوی السند احادیث ہیں جن میں صاف صاف تصریح کی گئی ہے کہ  
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اور دوسری طرف یہ اکیلی روایت ہے جو باب نبوت  
 کے نکلے ہوئے کا امکان ظاہر کرتی ہے۔ آخر کس طرح جانز ہے کہ اس ایک روایت کے مقابلے میں ان سب روایتوں  
 کو ساقط کر دیا جائے۔ اللہ

خاتمہ کلام

قرآن مجید اور حدیث، دونوں کی رو سے نبوت کا معاملہ دین میں اساسی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس پر آدمی  
 کے کفر و ایمان کا مدار اور آخرت میں اس کی فلاح و خسران کا انحصار ہے۔ اگر آدمی ایک سچے نبی کو نہ مانے تو کافر اور  
 جھوٹے نبی کو مان لے تو کافر۔ اس طرح کی اہمیت اور نزاکت رکھنے والے کسی معاملے کو بھی اللہ اور اس کے رسول گئے  
 مجہوم اور پیچیدہ اور مشکوک نہیں رکھا ہے، بلکہ صاف اور واضح طریقہ سے رہنمائی دی ہے تاکہ انسان کا دین و ایمان  
 نظر سے نہیں نہ پڑے اور اس کے گمراہ ہونے کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول پر نہ عائد ہو۔ اب دیکھیے محمد صلی اللہ  
 علیہ وسلم سے پہلے کبھی کسی نبی کے زمانہ میں یہ نہیں کہا گیا کہ نبوت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور اب کوئی نبی آنے والا  
 نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ انبیاء کی آمد کا دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا، کوئی شخص اس نبی پر کسی مدعی نبوت

کا انکار کر دینے میں حق بجانب نہ تھا کہ اب کسی نبی کے آنے کا امکان ہی نہیں ہے۔ پھر اُس زمانے میں انبیاء علیہم السلام اپنے بعد آنے والے نبیوں کی آمد کے لیے پیش گوئی بھی کرتے رہتے تھے اور اپنے پیروؤں سے عہد لیتے تھے کہ بعد میں جو نبی آجیں ان کی بھی وہ پیروی کریں گے۔ یہ تہنیز اور بھی اس بات کو مؤکد کر دیتی تھی کہ جو شخص نبی کی عقیدت سے اپنے آپ کو پیش کرے اُسے بلا نا اہل رد نہ کر دیا جائے بلکہ اس کی دعوت اور شخصیت اور اس کے کام اور احوال کو منظرِ غائر دیکھ کر جاننے کی کوشش کی جائے کہ آیا وہ واقعی نبی ہے یا ٹھوٹا مدعی نبوت ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد یہ معاملہ بالکل اٹھ ہو گیا۔ اب صرف یہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی نبی کی آمد کی پیش گوئی نہیں کی اور نہ اپنی امت سے اس کے اتباع کا عہد لیا، بلکہ اس کے برعکس قرآن میں اعلان کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دو نہیں بلکہ متعدد حدیثیں نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بکثرت مُسنَد و معتبر واسطوں سے امت کو ملیں کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہے، اب کوئی نبی آنے والا نہیں، اب جو مدعی نبوت اُٹھیں گے وہ مجال ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نگاہ میں لوگوں کے کفر و ایمان کا معاملہ نازک اور اہم نہیں رہا؟ کیا حضور سے پہلے ہی کے مومنین اس کے مستحق تھے کہ انہیں کفر کے خطرے میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول واضح طور پر باب نبوت کے مغلوح ہونے اور انبیاء کی آمد کے متعلق خبریں دینے کا اہتمام فرماتے رہتے، مگر اب ہمیں انہوں نے جان بوجھ کر اس خطرے میں مبتلا کیا ہے کہ ایک طرف تو نبی کے آنے کا امکان بھی ہو جس کے اٹھنے یا نہ اٹھنے پر ہمارے کافر یا مومن ہونے کا انحصار ہے، اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسول نے سرت اٹھے یہی کتنا نہ کیا ہو کہ ہمیں اس کی آمد سے آگاہ نہ کیا، بلکہ اس سے گزر کر یہ درپے درپے وہ ایسی باتیں ارشاد فرماتے چلے گئے جن کی بنا پر ہم باب نبوت کو بند بھیجیں اور مدعی نبوت کو ماننے سے انکار کر دیں؟ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی ہم سے ایسی دھوکہ بازی کر سکتے ہیں؟

خاتم النبیین کے معنی کی جو تاویل بھی قاریابی پائیں کرتے رہیں، مگر کم از کم ایک بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے معنی سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں۔ اور امت کے نافرمانوں سے لاکھ نافرمانوں سے ہزار نوسو نافرمانوں سے فی کور علماء اور عوام اس کے یہی معنی لیتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نبوت جیسے نازک معاملے میں جس پر مسلمانوں کے کفر و ایمان کا مدار ہے کیا اللہ میاں کو ایسی ہی زبان استعمال کرنی چاہیے تھی جس سے چند قاریانین کے سوا ساری امت یہی سمجھے کہ اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ارشادات تو کسی نادیل کی گنجائش بھی نہیں چھوڑتے۔ ان میں نوصات صاف مختلف طریقوں سے اس بات کو کھول کر ہی کہہ دیا گیا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اللہ کے رسول کو ہم سے ایسی ہی دشمنی تھی کہ





بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## اِتِّبَاعُ وَاطَاعَةُ رَسُولٍ

جو لوگ اسلام قبول کر لیں اور امت مسلمہ میں داخل ہو جائیں، ان کے لیے رسول کی حیثیت محض پیغام پہنچا دینے والے کی نہیں ہے، بلکہ رسول ان کے لیے معلم اور مہر ترقی بھی ہے، اسلامی زندگی کا نمونہ بھی ہے اور ایسا امیر بھی ہے جس کی اطاعت ہر زمانے میں بے چوڑ و چڑا کی جانی چاہیے۔

معلم، مہر ترقی اور نمونہ

معلم کی حیثیت سے رسول کا کام یہ ہے کہ پیغام الہی کی تعلیمات اور اس کے قوانین کی تشریح و توضیح کرے اور یَعْلَمُهُمْ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ مہر ترقی ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ ترقیاتی تعلیمات اور قوانین کے مطابق مسلمانوں کی تربیت کرے اور ان کی زندگیاں اسی سانچے میں ڈھالے (رَدِّیْكَ بِنَهْدِیْ)۔ نمونہ ہونے کی حیثیت سے اس کا کام یہ ہے کہ خود ترقیاتی تعلیم کا عملی نمونہ بن کر دکھائے تاکہ اس کی زندگی اُس زندگی کی ٹھیک ٹھیک تصویر ہو جو کتاب اللہ کے مقصود کے مطابق ایک مسلمان کی زندگی ہونی چاہیے، اور اس کے ہر قول اور ہر فعل کو دیکھ کر معلوم ہو جائے کہ زبان کو اس طرح استعمال کرنا، اور اپنی قوموں سے یوں کام لینا، اور دنیا کی زندگی میں ایسا برتاؤ رکھنا کتاب اللہ کے مقصود کے مطابق ہے، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے وہ فحشاء کے کتاب کے خلاف ہے (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ اور مَا يَلْبِغُ عَنِ الصَّوْمِ اِنْ هُوَ الْاَوْحَىٰ يُوْحَىٰ)۔ اس کے ساتھ ہی رسول کی حیثیت مسلمانوں کے امیر کی بھی ہے۔ ایسا امیر نہیں جس سے نزاع کی جاسکے، بلکہ ایسا امیر جس کے حکم کو بے چون و چرا ماننا ویسا ہی فرض ہے جیسا قرآن کی آیات کو ماننا فرض ہے (فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اِلٰهَ اللّٰهِ وَالْيَوْمَآءِ الَّتِي اُنزِلَ فِيْهَا الْكِتَابُ فَتَحْمِلُوْا وِجْرَتَهُنَّ كَمَا كُنْتُمْ تُحْمِلُوْنَ وِجْرَتَكُمْ يَوْمَ الْاٰثَمِ فَتُحْمَلُوْنَ)۔ ایسا امیر نہیں جو صرف اپنی زندگی ہی میں امیر رہتا ہے، بلکہ ایسا امیر جو تیارستہ تک کے لیے امت مسلمہ کا امیر ہے جس کے احکام مسلمانوں کے لیے ہر زمانے اور ہر حال میں مرجع ہیں۔

سرسن پیغام نبوی نہیں

جو لوگ آیت اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ الْاٰثَمِ اور اس کی ہم معنی آیات سے استدلال کر کے رسول کے کام کو صرف پیغام نبوی تک محدود کرتے ہیں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ رسول کی خالص مبلغانہ حیثیت صرف اُس وقت

تک پہنچے جب تک کہ لوگ دائرۃ اسلام میں داخل نہ ہوں، اور وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے رسولؐ کی تعلیم کو بھی قبول نہ کیا ہو۔ رہے وہ لوگ جو اسلام قبول کر کے اُمتِ مسلمہ میں داخل ہو جاتیں، تو ان کے لیے رسولؐ کی حیثیت محض مبلغ کی نہیں ہے بلکہ وہ ان کا لیڈر ہے، فرماں روا ہے، مقتضی ہے، قاضی ہے، معلم ہے، مربی ہے اور واسع التسلیم و خورنہ ہے۔

جو تفریق انہوں نے محمد بن عبداللہؐ بحیثیت انسان، اور محمد بن رسول اللہؐ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے یہ قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں ہے۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسولؐ ہی مجھے کی حیثیت ہے جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے کہ حیاتِ جلالی کے آخری سائن تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسولؐ تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولؐ خدا کی حیثیت سے تھا۔ اسی حیثیت میں آپ مبلغ اور معلم بھی تھے، مربی اور مرنر کی بھی تھے، قاضی اور حاکم بھی تھے، امام اور امیر بھی تھے، مخفی کہ آپ کی سخی اور خاندانی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اس حیثیت کے تحت آگئے تھے۔ اور ان تمام حیثیتوں میں آپ کی پاک زندگی ایک انسانِ کامل اور مسلمِ خالص اور مومنِ صادق کی زندگی کا ایسا نمونہ تھی جس کو حق تعالیٰ نے ہر اس شخص کے لیے بہترین قابلِ تقلید نمونہ قرار دیا تھا جو اللہ کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہو۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَآمَنَ بِمَا

قرآن مجید میں کہیں کوئی خفیت سے خفیت اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت رسالت اور بحیثیت انسانی اور بحیثیت امارت میں کوئی فرق کیا گیا ہو۔ اور یہ فرق کیسے کیا جاسکتا ہے؟ جب آپ خدا کے رسول تھے تو لازم تھا کہ آپ کی پوری زندگی خدا کی شریعت کے ماتحت ہو، اس شریعت کی فائزہ ہو، اور آپ سے کوئی ایسا فعل اور کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہو جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔

ہو اسے نفس سے محفوظ

اسی بات کی طرف سورۃ النجم کی ابتدائی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے کہ مَا خَلَقْنَاكُمْ وَمَا هُوَ قَبْلًا  
صاحبِ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، نہ بد راہ ہوا، نہ گمراہ ہوا، وَمَا يَنْطَلِقُ مِنَ الْعَوَىٰ۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے  
ہو اسے نفس کی بنا پر نہیں کہتا۔ اِنَّ هُوَ الْاَوْحٰى يُوحٰى۔ اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی  
ہے۔ وَعَلَّمَہٗ شَدِيدًا الْعَوٰى۔ اس کو ایسے استاد نے تعلیم دی ہے جس کی قرآن میں بڑی زبردست ہے، کہنے والے  
کہتے ہیں کہ ان آیات میں محض قرآن کے متن ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے جس کا کفار انکار کرتے تھے لیکن مجھے ان آیات  
میں کہیں کوئی خفیت سا اشارہ بھی قرآن کی طرف نظر نہیں آتا۔ اِنَّ هُوَ الْاَوْحٰى يُوحٰى میں مجھ کی ضمیر نطقِ رسولؐ کی  
طرف پھرتی ہے جس کا ذکر وَهٗ يَنْطَلِقُ مِنَ الْعَوٰى میں کیا گیا ہے۔ ان آیات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی

بنا پر لفظی رسول کو صرف قرآن کے ساتھ مخصوص کیا جاسکتا ہو۔ ہر وہ بات جس پر لفظی رسول کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، آیات مذکورہ کی بنا پر وحی برگی اور ہوائے نفس سے پاک ہوگی۔ یہ تصریح قرآن میں اسی لیے کی گئی ہے کہ رسول کو کہ جن لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے ان کو رسول کے بدرجہی اور گہراہی اور ہوائے نفس سے محفوظ ہونے کا کمال اطمینان ہو جاتے اور وہ جان لیں کہ رسول کی ہر بات خدا کی طرف سے ہے۔ ورنہ اگر اس کی کسی ایک بات کے بارے میں بھی یہ شبہ ہو جاتے کہ وہ خواہش نفس پر مبنی ہے اور خدا کی طرف سے نہیں ہے، تو رسول کی رسالت پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ گفتار اسی چیز کے منکر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ نعوذ باللہ رسول کو جنوں ہے۔ یا کوئی آدمی اس کو ٹپچھا جاتا ہے، یا وہ اپنے دل سے باتیں بنا کر کہتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر اس غلط خیال کی تردید کی ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ نہ تبارا صاحب بدراہ ہے نہ گمراہ، اور نہ خواہش نفس کی بنا پر کچھ کہتا ہے۔ اُس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق تعالیٰ ہے جو خاص ہماری طرف سے ہے۔ اس کو کوئی انسان یا جن یا شیطان نہیں ٹپچھتا بلکہ وہ معلم سبق دیتا ہے جو شدیہ القوی ہے۔ یہی بات خردی سلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی زبان مبارک کی طرف اشارہ کر کے فرمائی کہ ذوالذی نفسی بیدہ ما یخدر جمنہ الا حقاً۔ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق ہی نکلتا ہے۔

ہر حال میں واجب الاطاعت نمونہ

انسوس ہے کہ کچھ لوگوں کو اس حیثیت سے انکار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آنحضرت اپنے گھر میں ازواج مطہرات سے، یا باہر دیگر حضرات سے جو گفتگو فرماتے تھے، اُس کے متعلق نہ وحی ہونے کا دعویٰ تھا نہ گفتار کو کوئی بحث تھی۔ میں کہتا ہوں کہ آنحضرت جس وقت جس حالت میں جو کچھ بھی کہتے تھے رسول کی حیثیت سے کہتے تھے سب کچھ صلاحت و دعوت اور ہوائے نفس سے پاک تھا۔ اللہ نے جو فطرت سلیمہ آپ کو عنایت فرمائی تھی، اور تقویٰ و پاکیزگی کے جو حدود آپ کو بتائے تھے، آپ کے تمام اقوال و افعال اسی فطرت سے صادر اور انہی حدود سے محدود ہوتے تھے۔ ان کے اندر تمام عالم انسانی کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ تھا۔ اور انہی سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز ہے، کونسی چیز حرام ہے اور کونسی حلال، کونسی باتیں حق تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہیں اور کونسی اُس کے خلاف ہیں، کن امور میں ہم کو راستے اور اجتہاد کی آزادی حاصل ہے اور کن امور میں نہیں ہے۔ کس طرح ہم اطاعت امر کریں کس طرح نوری سے معاملات طے کریں، اور کیا معنی ہیں ہمارے بین میں بہنویت کے۔ آپ خدا کے مامور کردہ امیر تھے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے بنائے ہوئے امیر نہیں تھے، نہ خود بن گئے تھے، بلکہ آپ خدا کے مقرر کیے ہوئے امیر تھے۔ آپ کی امارت آپ کی رسالت سے الگ نہ تھی۔ دراصل آپ رسول خدا ہونے کے

حقیقت ہی سے امیر تھے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ آپ امیر نہیں بلکہ مأمور من اللہ تھے۔ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر وہ اس لیے تھا کہ آپ اپنی امت کے لیے مشاورت کا نمونہ پیش کریں اور خود اپنے عمل سے جمہوریت (Democracy) کے صحیح اصول کی طرف رہنمائی فرمادیں اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ آپ کی حقیقت دوسرے امیروں کی سی ہے۔ دوسرے امراء کے لیے تو یہ قانون مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مشورے سے کام کریں، وَأَمْرُهُمْ شُرَاةٌ بِكَيْفِمْ (الشوری: ۳۹)۔ اور یہ کہ اگر شوری میں نزاع ہو تو نورا اور رسول کی طرف رجوع کیا جائے، فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (النساء: ۵۹)۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں مشورہ لینے کا حکم دیا گیا ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ جب آپ کسی بات کا عزم فرمائیں تو خدا پر بھروسہ کر کے عمل کا اقدام فرمائیں۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (آل عمران: ۱۵۹)۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشورہ کے محتاج نہ تھے، بلکہ آپ کو شوری کا حکم صرف اس لیے دیا گیا تھا کہ آپ کے مبارک ہاتھوں سے ایک صحیح جمہوری طرز حکومت کی بنیاد پڑ جائے۔ رسول کی اطاعت بہ حقیقت امیر

یہی بات کہ امیر کی حیثیت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت صرف آپ کے عہد تک تھی، تو یہ بھی غلط ہے۔ اور جس آیت سے استدلال کیا گیا ہے اس سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ سورۃ انفال کی آیت ۲۰ کے الفاظ ذَاتَ مَنَّةٍ تَنْتَظِرُ سے یہ مطلب لے لیا گیا ہے کہ اطاعت رسول کا حکم صرف ان لوگوں کو دیا گیا تھا جو اس وقت مشورہ کا حکم سن رہے تھے۔ لیکن سورۃ انفال ہی اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ إِن كُنْتُمْ تُحِبُّونَ فَإِن كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا أُمَّةَ نَبِيِّكُمْ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (آیت ۲۰)۔ اس سے ایمان لانے والوں کو اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور رسول کے حکم سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو۔ اس آیت میں اوپہلی آیات میں رسول کے ساتھ اللہ کی اطاعت کا ذکر بار بار کیا گیا ہے جس سے یہ یاد دلانا مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے۔ پھر یہ جگہ لفظ رسول آیا ہے، امیر کا لفظ کسی جگہ بھی استعمال نہیں کیا گیا اور نہ کوئی مخفی سے مخفی اشارہ ایسا موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہاں رسول سے مراد رسول کی ایسی امیرانہ حیثیت ہے جو رسالت سے مختلف ہو۔ پھر رسول کے حکم سے منہ موڑنے کو منع کیا گیا ہے جس پر سخت عذاب کی دھمکی اور پردی جا چکی ہے۔

اس کے بعد وَأَنْتُمْ تَسْمَعُونَ کہنے کا منشا اسات یہ ہے کہ تم ہمارے ان ناکیدی احکام کو سنتے ہوئے جہاں رسول کی اطاعت سے کبھی منہ نہ موڑو۔ یہاں أَنْتُمْ اور تَسْمَعُونَ کے مخاطب صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اس وقت موجود تھے، بلکہ قیامت تک جو لوگ ایمان کے ساتھ قرآن کرئیں گے ان سب پر لازم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حکم ان کو پہنچے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں۔

ایک عجیب طرز استدلال

یہ کہنا کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غرائض امارت اسی طرح ہنگامی ہیں جس طرح دوسرے امراء کے ہوا کرتے ہیں، کیونکہ آج ہم جہاد میں بدر و اُحد کی طرح نیرہ و شمشیر سے نہیں لڑ سکتے“ ایک بہت ہی عجیب طرز استدلال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں جن اسلوہ سے کام لیا وہ اسلحہ تو ضرور ایک خاص ماحول سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حضور نے اپنی لڑائیوں میں جہاد کے غرائض کو بطور بے تعلق، اور جن غرائض کو برتنے کی ہدایت آپ نے فرمائی تھی، وہ کسی عہد کے لیے مخصوص نہ تھے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے ایک دائمی قانون جنگ بنا دیا ہے شریعی نقطہ نگاہ سے یہ سوال اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ تلوار استعمال کرتے ہیں یا سندوق یا توپ، بلکہ اہمیت اس سوال کی ہے کہ آپ اپنے اسلوہ کس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں؟ اور کس طرح ان سے خونریزی کا کام لیتے ہیں؟ اس باب میں جو نمونہ آنحضرت نے اپنے غزوات میں پیش فرمایا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اسلامی جہاد کا ایک مکمل نمونہ ہے اور معنوی حقیقت سے سرورِ عالم قیامت تک کے لیے ہر مسلمان نوجوان کے سالارِ اعظم ہیں۔

حضور کی امارت کی امتیازی شان

ایک صاحب نے امارت اور رسالت میں خود یہ فرق بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے امراء سے نزاع اور اختلاف کرنے کا حق ماسل ہے ورنہ انھوں نے رسول سے نزاع نہیں کی جاسکتی۔ اب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیرانہ حیثیت ویسی ہی ہے جیسی دوسرے امراء کی ہے تو کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کسی مسلمان کو نزاع کا حق حاصل تھا؟ جس امیر کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے تک کی اجازت نہ تھی، اور جس کے مقابلہ میں محض اونچی آواز سے بولنے پر تمام عمر کے اعمال غارت ہو جانے کی دھمکی دی گئی تھی (المجرات، آیت ۲) اور جس سے جھگڑا کرنے والے کو دوزخ میں جھونک دینے والے کا خوف دلا یا گیا تھا (النساء، آیت ۵۱) کیا اس امیر سے منازعت کرنے کا حق کسی مسلمان کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اگر نہیں تو کہاں اُس امیر کی امارت اور کہاں اُن امراء کی امارت جن سے منازعت کا حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔

اطاعت کے تین مراتب

اُن تمام احکام کو جو اطاعت رسول سے متعلق ہیں، اطاعت امیر کے احکام قرار دینا اور یہ کہنا کہ:

• اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ ساتھ آئے ہیں ان سے مراد امارت ہے جس کا قانون کتاب اللہ ہے اور جس کے نافذ کرنے والے رسول اللہ یا ان کے جانشین ہیں۔ **فَمَنْ أَتَّبِعْكَ مَعِيَ إِلَّا نَفَالٌ قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ**۔ مالِ غنیمت کا حکم عہد رسالت تک محدود نہ تھا بلکہ آئندہ کے لیے بھی ہے جس کی تعمیل خلافت کا فرضیہ ہے۔۔۔۔۔ آخری اختیار اللہ و رسول یعنی امارت ہے۔ اس لیے رسول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے وہی ان کے خلفاء کا بھی ہوگا۔

یعنی مسدود سیرج تباؤ ہے قرآن مجید میں اطاعتِ خدا، اطاعتِ رسول اور اطاعتِ اولی الامر کے تین مراتب بیان کیے گئے ہیں۔ اطاعتِ خدا سے مراد قرآن مجید کے احکام کی اطاعت ہے۔ اطاعتِ رسول سے مراد رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور عمل کی پیروی ہے۔ اور اطاعتِ اولی الامر سے مراد مسلمانوں کے اُمراء اور اربابِ حلہ عقید کی اطاعت ہے۔ پہلے دونوں مراتب کے متعلق قرآن میں ایک جگہ نہیں میسر ہوئی جبکہ اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ خدا اور رسول کے احکام میں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ مسلمانوں کا کام سننا اور اطاعت کرنا ہے۔ خدا اور رسول کے فیصلہ کے بعد کسی مسلمان کو یہ اختیار باقی نہیں رہتا کہ وہ اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرے۔ رہا تعمیر امت نہ تو اس کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسول کے احکام کے تابع ہے، اور نزاع کی صورت میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کرنا لازم ہے۔ ایسے صاف اور کھلے ہوئے احکام کے موجود ہونے پر اسے اس کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے کہ خدا اور رسول سے مراد امارت لی جائے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصبِ امارت کو اُس امارت کے ساتھ ملا دیا جائے جو مسلمانوں کے عام اُمراء کو حاصل ہے۔ اس معاملہ میں **قُلِ الْأَنْفَالُ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ** سے جو استدلال کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اموالِ غنیمت خدا اور رسول کے ہیں کہنے کا مدعا یہ ہے کہ خدا اور رسول نے اسلامی جماعت کا جو نظام قائم کیا ہے اُس کے مصالح میں ختم مرنے کیے جائیں۔ اس سے یہ مطلب کہاں نکلتا ہے کہ اللہ اور رسول سے مراد امارت ہے۔

### ندہی اور تمدنی امور کی غلط تفسیر

قرآن میں کوئی غنیمت سے تفسیر اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر یہ حکم نکلتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محض ندہی اعمال ہی دائماً قابلِ تقلید ہیں، رہے تمدنی و اجتماعی امور میں آپ کے فیصلے اور آپ کے نافذ کردہ قوانین تو وہ صورت اُس عہد کے لیے مخصوص تھے جس میں نافذ کیے گئے تھے۔ اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں موجود ہو جس سے ان دونوں قسم کے اعمال میں فرق کیا جاسکتا ہے اور دونوں کے احکام مختلف قرار دیتے جاسکتے ہیں تو اس کو پیش کیا جائے۔ مجھ کو تو قرآن میں صاف حکم یہ ملتا ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِمَنْ يَدِينُكَ أَنْ يُقْبَلَ عَلَيْهِ إِذْ تَقْبَلُ

”کسی موزن مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ





# نبی کی اطاعت اور زاوی رائے کا اسلامی تصور

ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں :

”شورہٴ اعراب میں حضرت زید بن عارضہ اور حضرت زینب رضی اللہ عنہما کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس کے سلسلہ میں ایک اہم شبہ پیدا ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے فرمایا اُحْسِبُكَ عَلِيَّةً زَوْجًاكَ وَاللَّوْنُ لِلَّهِ رَاجِعِي بِرِي كَوَاطِبِي زَوْجِيَّتِي ہن سے اور اللہ سے ڈر، مگر حضرت زینب نے اس حکم نبوی کی خلاف ورزی کی اور حضرت زینب کو طلاق دے دی۔ اس فعل کے خلاف حکم پہلے میں تو کوئی شبہ نہیں اور قرآن کے الفاظ بیان میں صراحتاً یا کثرتاً ایسی کوئی بات بھی نہیں پائی جاتی جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زینب کی اس تفریق کو ادنیٰ درجہ میں بھی ناپسند کیا ہو، بلکہ بیان واقعہ کی ابتدا میں ان کا ذکر لفظاً اَلْعَصْرَ اللّٰهُ عَلَيْنَا حَسْبِنَا پر اللہ نے انعام کیا کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی کے حکم کی خلاف ورزی بھی کی جاسکتی ہے اور نبی کا قول اگر ثابت بھی ہو جائے کہ وہ نبی ہی کا قول ہے تب بھی وہ اُس طرح واجب الاطاعت نہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان واجب الاطاعت ہے“

سوال میں کئی پیچیدگی نہیں چند لفظوں میں شبہ کو رفع کیا جاسکتا تھا۔ لیکن دراصل شبہ جہاں سے پیدا ہوتا ہے وہاں مستند غلط فہمیوں کا منبع ہے، اور ان غلط فہمیوں کا سلسلہ دوڑنا شروع ہوتا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شبہ کو رفع کرنے کے ساتھ اس کی اسل اور اس کے فروع کی طرف بھی کچھ اشارات کر دیتے جائیں۔

حاکم صرف اللہ ہے

قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں سے زیادہ صراحت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ حاکم مطلقاً بجز اللہ کے اور کوئی نہیں۔ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ (خدا کے سوا حکم کسی کے لیے نہیں ہے)۔ صرف اسی کو یہ حق ہے کہ بسا چاہے حکم دے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (اللہ جو چاہے حکم دے)۔ وہی ایک ایسا حاکم ہے جس کے احکام میں کسی چُون و چرا کی گنجائش نہیں لَا يَسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ (اس کے کسی کام کے بارے میں سوال نہیں کیا جاسکتا)۔ اطاعت اسی کی فرض ہے اور اس لیے فرض ہے کہ انسان اپنی عین خلاقیت کے لحاظ سے اس کا بندہ ہے اور دراصل صرف اسی کی بندگی کیلئے

پیدا کیا گیا ہے، وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (یعنی نے جن اور انسان کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں)۔ اُس کے سوا انسان نہ کسی کا مخلوق ہے نہ بندہ نہ پروردہ۔ اسی لیے دراصل کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی اطاعت فرض نہیں۔ يَتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَخَافُونَ عَذَابَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَدِيرًا (وہ پوجتے ہیں کہ حکم میں بنا بھی کچھ حصہ ہے) کہہ دو کہ حکم پورا کا پورا اللہ کے لیے ہے) کسی انسان کو نہ تو دوسرے انسان پر مطلقاً مختلفہ (Absolute Authority) حاصل ہے اور نہ کسی انسان پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے حکم کی اطاعت کرے محض اس بنا پر کہ اُس خاص شخص کا حکم ہے۔

## انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی

قرآن کے نزول کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلاوہ نکال دے اور اللہ یعنی مطاعِ حقیقی (Real Sovereign) کا بندہ بنانے کے بعد اس کو راستے اور ضمیر کی فوری آزادی عطا کرے۔ چنانچہ انسانی غلامی کے خلافت سب سے بڑھ کر جس کتاب نے بہا دیا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ یہ کتاب کسی انسان کا یہ حق تسلیم نہیں کرتی کہ بطور خود اس کے حلال کیسے ہوئے کو حلال اور اس کے حرام کیسے ہوئے کو حرام سمجھا جائے اور اس کے حکم اور اس کی ممانعت کی اس طرح اطاعت کی جائے کہ گویا وہ اپنے محکوموں کے لیے بشر الا خدا ہے۔ اس قسم کی اطاعت اور حکوم کو قرآن شریک کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے اور جو لوگ اپنے علماء و مشائخ کو پتوں

اور پرہتوں کو، پولیوں اور پادریوں کو اور ذمیوں حاکموں کو اَرَبَاتِ قُلُوبِ الْغَايِبِ (gods other than God) بنا لیتے ہیں، انہیں مشرک ٹھہراتا ہے، کیونکہ انسان جب کسی انسان کی ایسی اطاعت کرے گا تو لامحالہ اس کی زمین اور حیثیت کا دستور اور عبودیت کا جذبہ ہی کا رفرما ہوگا۔ ایک انسان دوسرے انسان کے مقابلہ میں اپنے دل اور دماغ اور روح اور جسم کی آزادی سے کلیتہً دست بردار ہوتا ہی اُس وقت ہے جب وہ اس کو یا تو خلا سے بُری اور محبوب و تقاض سے پاک اور جزو کل کا عالم سمجھ لیتا ہے، یا یہ سمجھتا ہے کہ وہ ذاتی حق کی بنا پر امر و نہی کا مالک ہے اور اُسے حکومت کا طبعی حق حاصل ہے، یا یہ گمان کرتا ہے کہ وہی دراصل نفع اور نقص پہنچانے والا اور رزق دینے اور رزق نہ رکھنے والا ہے۔ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کو ان صفات کا حامل سمجھنا ہی شرک اور غلامی کی بڑھ ہے اور توحید جس کا لازمی نتیجہ مخلوق کی غلامی سے انسان کی آزادی ہے، یہ ہے کہ خدا کے سوا تمام چیزوں کو ان صفات سے خالی سمجھا جائے اور اُن کے حق حکمرانی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔

نبی کی اطاعت کس حیثیت سے؟

یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد، اب اس امر کی تحقیق کیجیے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے، یہ کس حیثیت سے ہے۔ یہ اطاعت اس حیثیت سے سرگز نہیں ہے کہ نبی وہ خاص شخص

مثلاً ابنِ عمرؓ، یا ابنِ مریم یا ابنِ عبداللہؓ ہے، اور یہ شخص خاص ہونے کی بنا پر اس کو حکم دینے اور منع کرنے کا حلال کرنے اور حرام ٹھہرانے کا حق حاصل ہے۔ اگر ایسا ہو تو معاذ اللہ نبیؐ خود بھی اربابِ حق میں سے ایک ہو جائے گا، اور اس طرح خود اسی کے ہاتھوں وہ مقصد فوت ہو کر رہے گا جس کے لیے وہ نبی بنا کر بھیجا گیا ہے قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم بشر ہو، قَدْ سَبَّحَانَ رَبِّيَ قَدْ كُنْتُ الْإِنْسَانَ شَوْلاً رَأَيْتُ ابْنَ آدَمَ مِنْهُمُ كَمَا بَدَأْتُهُمْ يَوْمَ نَحْمِلُ الْأَفْئِدَةَ كَغَيْرِكُمْ فَرَّقَ بَيْنَ الْوَالِدِ وَالْبَتْنِ مِثْلَ مَا يَفْعَلُ الْآبَاءُ بِأَوْلَادِهِمْ وَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ لَقَدْ كُنَّا أَتَيْنَاهُمْ بِالْحَقِّ وَالْحَقَّ لَا يُنْفَكُ عَنْهُمُ غَيْرُ مَنبُوتٍ هُمْ فِيهَا كَالْبَشَرِ أَوَّلِينَ (البقرہ: ۱۷۷)۔ البتہ نبی ہونے کی حیثیت سے اس میں اتنی بڑی عظمت ہے کہ اس کو خدا کی طرف سے جب نبوت عطا کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ ”حکم“ بھی عطا ہوتا ہے، اُولَئِكَ الَّذِينَ أَنْزَلْنَا لَهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنَّبُوَّةَ لِيُخْبِرُوا بَيْنَ النَّاسِ وَهُمْ فِيهَا كَالْبَشَرِ أَوَّلِينَ (البقرہ: ۱۷۷)۔ اس کو ہم نے ان کے معہوم میں قوتِ فیصلہ (Judgement) اور آئندہ حکومت (Authority) دونوں شامل ہیں۔ پس نبی کو جو آئندہ حاصل ہے وہ ذاتی آئندہ نہیں بلکہ انور یعنی کہ وہ آئندہ ہے۔ اس لیے اس کی اطاعت و راضی ہونے کی اطاعت ہے مَنِ اطَاعَ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَاعَ اللَّهَ (جس نے رسول کی اطاعت کی، اس نے خدا کی اطاعت کی)۔ وہ بھی جیسا ہی اس لیے جاتا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کے احکام نافذ کرے اور تم ان احکام کی اطاعت کرو، وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ (ہم نے جو نبی بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے)۔ اس حیثیت میں اس کا حکم خدا کا حکم ہے اور کسی کو اس میں چون و چرا کرنے کا حق نہیں، وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُسْتَقِيمِ نُفِضْ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصَلِّهِمْ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا (جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد نبی سے جھگڑا کرے اور ایسا طریق اختیار کرے جو ایمان لانے والوں کے طریقے سے مختلف ہو تو جو دھروہ ٹرسے گا ہم بھی اسے اسی طرف موڑ دیں گے۔ اور اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بہت ہی بُری جہنم قرار ہے)۔

بے چون و چرا اطاعت

عمل تو دیکھا اگر دل میں بھی اس کی نافرمانی کا خیال آجائے تو قطعاً ایمان سلب ہو جاتا ہے، فَلَا زَرْعَ إِلَّا لِمَنْ يُمْنُوهُ حَتَّىٰ يَجْلُجُوا فِيهَا فَيَنْجَعُوا مِنْهَا وَلَا يُجِدُوا فِيهَا أَنْفُسَهُمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَقَدْ جِئْتُمُوهُنَّ لَعْنًا (خدا کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے آپ کے استلانات میں توجہ نہ کر لیں اور تسلیم نہ کریں اور جو کچھ تفصیل کے لیے اس پر اپنے دل میں بھی کوئی غلطی محسوس نہ کریں بلکہ اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیں) اور اس نافرمانی کا نتیجہ ابدی نحران و نامرادی ہے، كَيْفَ يَكْفُرُونَ بِالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا الرَّسُولُ لَنَا وَمَا نَسْأَلُكُمْ بِهِمُ الْأَرْسَالَ إِنِ لَأَكْثَرُ لَكُمْ



تم خدا کو چھوڑ کر مجھ کو ربت بنا لو اور میری خواہشات نفس کی پابندی کرو۔

## نبیؐ بے حیثیت نبیؐ کی اطاعت

اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے بار بار اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے، جو اصل ایمان ہے، اور جس سے کسی مومن کو سزا دی گیا معنی یک سر سر مو انحراف کا بھی تھی نہیں، وہ دراصل نبیؐ بحیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبیؐ بحیثیت نبیؐ کی اطاعت ہے یعنی اُس علم، اُس ہدایت، اُس حکم اور اُس قانون کی اطاعت جسے اللہ کا نبیؐ اللہ کی طرف سے اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ پس درحقیقت اسلام جس اطاعت کی بندش میں انسان کو باندھتا ہے، وہ دراصل انسان کی اطاعت نہیں بلکہ خدا کی اطاعت ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ

بِمَا أَرَادَ اللَّهُ. (النساء: آیت ۱۰۵)

اسے نبیؐ، ہم نے تمہاری طرف کتاب برحقی آما رہی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اُس حق کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تم کو دکھایا ہے۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ كُفِرُوا

بِالْقَلْبِ مِمَّا أُنزِلَ إِلَيْهِمْ. (المائدہ - ۴۵)

اور جو اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

إِن آتَيْتُمُ الْإِنَّمَاءَ بِمِثْلِ مَا آتَىٰ الْوَالِدَ (النعام: ۵۰)

اس آیت میں جس طرح پدر سے انسان بندے ہوئے ہیں اسی طرح خود نبیؐ بحیثیت انسان بھی بندھا ہوا ہے۔ میں تو صرف اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو تم پر وحی کی جاتی ہے۔

## نبیؐ کی اطاعت خدا کے حکم کے تحت

یہ اور ایسی ہی بہت سی آیات اس امر پر واضح دلالت کرتی ہیں کہ اطاعت دراصل صرف حق تعالیٰ بل شانہ کی ہے اور اسلام آیا ہی اس لیے ہے کہ غیر اللہ کی بندگی اور انسان پر انسان کی خداوندی کا قلع قمع کر دے۔ اسلام میں کسی انسان کی اطاعت بحیثیت انسان ہونے کے نہیں ہے۔ نبیؐ کی اطاعت ہے تو اس بنا پر ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کو حکم عطا کیا گیا ہے۔ حکام کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ اللہ اور رسولؐ کے احکام کو نافذ کرنے والے ہیں۔ علماء کی اطاعت ہے تو اس بنا پر کہ وہ خدا اور رسولؐ کے امر و نہی اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود سے آگاہ کرنے والے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی شخص خدا کا حکم پیش کرے تو مسلمان پر واجب ہے کہ اس کے آگے سر نہجکا دے۔ وہ اس میں ہرگز چون و چرا کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کو خدا کے مقابلے میں خربت فکر اور آزادی راستے حاصل نہیں لیکن اگر کوئی انسان خدا کا نہیں، خود اپنا کوئی خیالی پیش کرے، تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کو آزادانہ اتفاق کرنے کا بھی اختیار ہے۔ اور آزادانہ

اختلاف کرنے کا بھی۔ اس معاملہ میں علماء اور حکام تو درکنار، خود نبی کی ذاتی راستے سے بھی اختلاف کرنے میں کوئی چیز نافع نہیں ہے۔  
حضور کے مشن کے دو حصے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا ایک حصہ یہ تھا کہ خدا کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلاوہ انسان کی گردن میں ڈال دیں۔ اور دوسرا حصہ یہ تھا کہ انسان کی اطاعت و فرمانبرداری کا قلاوہ اس کی گردن سے آٹا ہو سکیں۔ یہ دونوں کام آپ کے مقصد بعثت میں شامل تھے، اور دونوں کی اہمیت یکساں تھی۔ پہلے کام کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپ تمام مسلمانوں کو اپنی کامل اور غیر مشروط اطاعت پر مجبور کریں کیونکہ آپ کی اطاعت ہی پر خدا کی اطاعت متروک نہ تھی۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے کام کی تکمیل کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری تھا کہ سب سے پہلے آپ خود اپنے عمل اور اپنے بڑاڑے سے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کر دیں کہ کسی انسان کی، حتیٰ کہ خود محمد بن عبد اللہ بحیثیت انسان کی اطاعت بھی ان پر واجب نہیں ہے اور ان کی روعیں انسان کی بندگی سے قطعی آزاد ہیں۔ یہ دراصل ایک نہایت نازک کام تھا۔ ایک ہی ذات میں حیثیت نبوت اور حیثیت بشریت دونوں جمع تھیں۔ اور ان کو کسی واضح نقطہ امتیاز کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ گمراہی کے رسول پاک نے اللہ کی بخشی ہوئی تھکت سے اس کام کو بہترین طریق پر انجام دیا آپ نے ایک طرف نبی ہونے کی حیثیت سے اپنی ایسی اطاعت کرائی کہ تاریخ عالم میں کبھی کسی ایمر کی ایسی اطاعت نہیں کی گئی۔ اور دوسری طرف انسان ہونے کی حیثیت سے آپ نے اپنے جان نثار مشیعین کو ایسی آزادی راستے عملی کہ دنیا کے کسی بڑے سے بڑے جمہوریت پسند سردار نے بھی اپنے ماتحتوں کو ایسی آزادی نہیں بخشی۔ اگر کوئی شخص اس امر پر غور کرے کہ نبی ہونے کی حیثیت سے آپ کو اپنے پیروں پر کتنا بڑا اقتدار حاصل تھا اور مسلمان کتنی گہری عقیدت آپ کے ساتھ رکھتے تھے، اور پھر یہ دیکھے کہ اتنا زبردست اقتدار رکھنے کے باوجود آپ کس طرح معاشرت اور معاملات میں ہمیشہ اور ہر وقت اپنی پیغمبرانہ حیثیت اور انسانی حیثیت کو الگ الگ رکھتے تھے، اور پیغمبرانہ حیثیت میں اپنی بے چوں و چرا اطاعت کرنے کے ساتھ انسانی حیثیت میں لوگوں کو کتنی مکمل آزادی راستے عطا فرماتے اور خود اپنی ذاتی آراء سے اختلاف کرنے میں کس طرح ان کی ہمت افزائی کرتے تھے، تو اسے ماننا پڑے گا کہ یہ کمال درجہ کا ضبط نفس، بہ جرئت انگریز قوت، امتیاز، اور ایسی مکمل بصیرت صرف ایک نبی ہی کو میسر آسکتی ہے۔ اس مقام پر ایسا محسوس ہوا ہے کہ نبی کی شخصی حیثیت الگ ہونے کے باوجود اس کی پیغمبرانہ حیثیت میں گم ہو جاتی ہے نبی اپنی شخصی حیثیت میں بھی پیغمبری کے فرائض انجام دیتا ہے۔ وہ جب اپنی شخصی حیثیت میں کام کرتا ہے تو اس وقت وہ اپنے پیروں میں آزادی فکر کی روع بھونکتا ہے، انہیں سکھاتا ہے کہ انسان کے مقابلہ میں ان کو کس طرح آزادی راستے

استعمال کرنی چاہیے، اور انہیں بتانا ہے کہ آزادی راستے کا حق ان کو ہر انسان کے مقابلہ میں حاصل ہے، حتیٰ کہ اس انسانِ کامل، اس عظیم الشان شخصیت کے مقابلہ میں بھی وہ راستے کی پوری آزادی رکھتے ہیں جس کو وہ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے بلند ترین اقدار کا درجہ دینے پر مجبور ہیں۔ نبی کے سوا کسی دوسرے کو لوگوں پر ایسا مکمل اقتدار نصیب ہو تو وہ ضرور ان کو اپنا بندہ بنا لے اور ان پر اپنے وہی حقوق جملتے جو دنیا میں لوگوں اور پیروں اور پندتوں اور باؤنسابوں نے جما کر دکھا دیئے۔ حضور فرماتے ہیں کہ:

انما انا بشر اذا امرتكم بشئ ع  
 من دينكم فخذوا به واذا امرتكم  
 بشئ من راي فانا انا بشر۔

میں بھی ایک انسان ہی ہوں جب میں تم کو تمہارے  
 دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانو اور جب  
 میں اپنی رائے سے کچھ کہوں تو بس میں بھی ایک انسان  
 ہی ہوں۔

### آزادی راستے کو نشرو نما دینے کی چند مثالیں

ایک دفعہ حضور نے مدینے کے اخباروں کو کھجور کی کاشت کے متعلق ایک مشورہ دیا۔ لوگوں نے اس پر عمل کیا مگر وہ مفید ثابت نہ ہوا۔ آپ سے اس بارے میں عرض کیا گیا تو جواب میں آپ نے فرمایا:

راي انما خلقت طعاً ولا توادوني  
 بالظلمة والظلم اذا حدثتكم عن الله شيئا  
 فخذوا به فانى له ان ابا على الله۔

میں نے تو انہمازہ سے ایک بات کہی تھی تم میری رائے  
 باتوں کو نہ جو گمان اور راستے پر مبنی ہوں۔ ہاں  
 بس میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اس کو  
 نہ کر کیونکہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندا۔

جنگ بدر کے موقع پر حضور اہل بدر میں جہاں خیمہ زن ہوئے تھے وہ جگہ من سب زنتی حضرت بنی نضیر نے آپ سے دریافت کیا کہ اس مقام کا انتخاب وحی کے ذریعہ کیا گیا ہے یا محض ایک تدبیر جنگ کے طور پر ہے؟ فرمایا وحی نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ اگر ایسا ہے تو میری رائے میں آگے بڑھ کر قلائ مقام پر خیمہ زن ہونا چاہیے حضور نے ان کی رائے کو قبول فرمایا اور اسی پر عمل کیا۔

اسیران جنگ بدر کے مسئلہ میں حضور نے صحابہ کی جماعت سے مشورہ لیا اور خود بھی ایک عام رکن جماعت کی حیثیت سے رائے دی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے آپ کی اور سید فی اکبر کی رائے سے بے تکلف اختلاف کیا جس کا واقعہ تمام تاریخوں میں مشہور ہے۔ اسی مجلس میں حضور نے خود اپنے نام اور العباس کا مسئلہ بھی پیش کیا اور اسے فرمایا اگر تمہاری مرضی ہو تو ان سے فدیر میں جو ہا لیا گیا ہے وہ انہیں واپس کر دیا جائے جب صحابہ نے بخوشی اس کی اجازت دی، تب آپ نے بار انہیں واپس کیا



غزوہ خندق کے موقع پر حضور نے نبی عظیمؐ سے صلح کرنے کا ارادہ فرمایا۔ انصار کے سرداروں نے عرض کیا کہ اگر یہ ارادہ وحی کی بنا پر ہے تو مجال کلام نہیں، اور اگر حضور اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس تجویز سے اختلاف ہے۔ حضور نے انہی کی رائے قبول فرمائی اور اپنے ہاتھ سے صلحنامہ کا مسودہ تیار کر ڈالا۔ صلح نامہ میرے موقع پر تمام مسلمانوں کو بظاہر دیکھ کر صلح کرنا پسند نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے علامہ اس سے اختلاف کیا مگر سبب حضور نے فرمایا کہ یہ کام میں خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے کر رہا ہوں تو باوجودیکہ غیرت اسلامی کی بنا پر سب فوج تھے، کسی نے دم مارنے کی جرأت نہ کی۔ حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ مرتے دم تک اس عقلی کے کفار سے طرح طرح سے ادا کرنے رہے کہ وہ ایک ایسے امر میں حضور سے اختلاف کر بیٹھے جو بحیثیت رسولؐ کیا جا رہا تھا۔

جنگِ حنین کے موقع پر تقسیمِ خناتم میں آپؐ نے مؤلفۃ القلوب کے ساتھ جو فیاضی ظاہر فرمائی تھی اس پر انصار چین بچیں ہوئے۔ حضور نے ان کو بلایا۔ اپنے فعل کی تائید میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خدا کا نبی ہوں جو جاہلوں کو بلاتا ہے، بلکہ ایک تقریر کی جس طرح ایک جمہوری حکومت کا سردار اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کے سامنے کرنا ہوتے ان کے ایمان بالرسالت سے اپیل نہیں کی بلکہ ان کی عقل اور ان کے جذبات سے اپیل کی اور انہیں مطمئن کر کے واپس فرمایا۔

یہ تو خیر ان لوگوں کے ساتھ معاملہ تھا جو سوسائٹی میں بڑی اونچی پوزیشن رکھتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں اور لونڈیوں تک میں استقلال رائے کی روح پھونک دی تھی۔ ہریرہ ایک لونڈی تھی جو اپنے شوہر سے متنفر ہو گئی تھی مگر شوہر اس کا عاشق بنا رہا تھا۔ وہ اس کے پیچھے رونا پھرتا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے کہا کہ تو اپنے شوہر سے رجوع کر لیتی تو اچھا تھا۔ اس نے پوچھا "یا رسول اللہ کیا آپ حکم دیتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "حکم نہیں بلکہ سفارش کرتا ہوں" اس نے کہا "اگر یہ سفارش ہے تو میں اُس کے پاس جانا نہیں چاہتی"۔

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب قرینہ سے یا خود غور سے تشریح سے لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ آپؐ کوئی بات اپنی رائے سے فرما رہے ہیں تو وہ آزادی کے ساتھ اس میں اظہارِ رائے کرتے تھے اور آپؐ خود اس آزادی اظہارِ رائے میں ان کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔ ایسے موقع پر اختلاف کرنا نہ صرف جائز تھا بلکہ آپؐ کے نزدیک پسندیدہ تھا، اور آپؐ خود لمبا اوقات اپنی رائے سے رجوع فرما لیتے تھے۔

### حضرت زیدؓ کے واقعہ کی حقیقت

اب حضرت زیدؓ کے واقعہ کی طرف رجوع کیجیے۔ حضور کے ساتھ ان کے تعلقات کئی طرح کے تھے۔ ایک تعلق یہ تھا کہ آپؐ ان کے پیشوا تھے اور وہ آپؐ کے پیرو تھے۔ دوسرا تعلق یہ تھا کہ آپؐ ان کے برادرِ بستی تھے اور وہ آپؐ کے بہنوئی تھے۔ تیسرا تعلق یہ تھا کہ آپؐ ان کے مرنے والے تھے اور وہ آپؐ کے پروردہ تھے۔ پوری سے ان کا

نباہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے طلاق وینے کا ارادہ کیا۔ آپ نے ان کو وہی مشورہ دیا جو سربراہِ نبوتی اپنے بہنوئی کو اور سربراہِ سرپرست اپنے پروردہ کو دے گا، یعنی یہ کہ خدا کا خوف کرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ مگر جس اختلافِ مزاج کی بنا پر نبویؐ میں باہم نفرت پیدا ہو گئی تھی اس کو حضرت زیدؓ خود زیادہ محسوس کر سکتے تھے۔ یہ معاملہ ان کے دین و ایمان کا نہیں بلکہ ان کے حیاتِ نفس کا تھا۔ اس لیے انہوں نے سفور کے مشورے کو قبول نہ کیا اور طلاق دے دی۔ یہ خلافِ ورنہی رسولی کے مقابلہ میں نہ تھی، نہ حضورؐ نے جو مشورہ دیا تھا وہ رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا، اس لیے نہ آپؐ ناماخذ ہوتے نہ ندادنا راض ہوتا۔ اگر حضورؐ کی جگہ کوئی اور ایسا شخص ہوتا جس نے کسی کو بچپن ہی پالا ہو اور اس پر احساسات کیسے ہوں اور آخر میں غلامی سے داغدار ہونے کے باوجود اپنی بہن کی شادی اس سے کی ہو اور پھر اس نے باوجود منع کہنے کے اس کی بہن کو طلاق دے دی ہو، تو وہ ضرور ناراض ہوتا مگر حضورؐ نہ تھے اور برادرِ نبوتی ہی نہ تھے، بلکہ رسولِ خدا بھی تھے، اور رسول ہونے کی حیثیت سے یہ بھی آپؐ کا فرض تھا کہ انسان کو انسان کی بندگی سے آزاد کریں اور انسان کو انسان کے مقابلہ میں آزادی کا کھویا ہوا حق واپس دلوائیں اس لیے آپؐ نے حکم نہیں بلکہ مشورہ دیا اور اس مشورہ کے خلاف عمل کرنے پر قطعاً کسی ناراضی کا اظہار نہ فرمایا۔ اسی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپؐ کی ذات میں حیثیتِ نبوی اور حیثیتِ بشری الگ الگ بھی تھیں اور باہم بیوستہ بھی تھیں۔ آپؐ نے ان دونوں کے استعمالی میں ایسا حیرت انگیز توازن قائم کیا تھا کہ ایک ہی ایسے توازن پر قادر ہو سکتا ہے حیثیتِ بشری میں ہی آپؐ اس طرح عمل فرماتے تھے کہ نبوت کے فرائض اس کے ضمن میں ادا ہوتے رہتے تھے۔

حضورؐ کی تعلیم کردہ حضرتِ فکر

سرکارِ رسالتؐ نے جس عزتِ فکر کی تخم ریزی کی تھی، اور احکامِ الہی کی اطاعت کے ساتھ ساتھ انسان کے مقابلہ میں آزادی رائے استعمال کرنے کا جو سبق اپنے تابعین کو خود اپنے عمل اور اپنے بتاؤ سے سکھایا تھا، اسی کا یہ اثر تھا کہ صحابہؓ کو تمام انسانوں سے زیادہ احکامِ الہی کے اطاعت کیش اور تمام انسانوں سے زیادہ آزادی و جمہوریت پسند تھے۔ وہ بڑے سے بڑے شخص کے مقابلہ میں بھی اپنی راستے کی آزادی کو قربان نہ کرتے تھے۔ ان کی ذہنیت سے یہ بات بالکل اجید تھی کہ کسی رائے کو محض اس بنا پر تنقید سے بالاتر سمجھیں کہ وہ نللاں بڑے آدمی کی رائے ہے۔ ان میں سے جو بڑے آدمی تھے جن کی بڑائی کو وہ خود تسلیم کرتے تھے اور جن کی بڑائی آج ایک دنیا تسلیم کر رہی ہے، ان کی راستے کو بھی انہوں نے محض ان کی بڑائی کی بنا پر قبول نہ کیا بلکہ آزادی کے ساتھ روکھی کیا اور قبول ہی کیا۔ خلفائے راشدین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ اس آزادی رائے کے حامی تھے۔ انہوں نے اپنے آفاقی پیروی میں لوگوں کی آزادی کو نہ صرف گوارا کیا بلکہ اس کی ہمت افزائی کی اور کبھی کسی

چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی یہ مطالبہ نہ کیا کہ ہم بڑے آدمی ہیں اس لیے ہماری بات بچے چونک دے اور آپس میں کفر  
تحریریت فکر خلافت راشدہ کے بعد

نصفائے راشدین کے بعد بنی اُمیہ اور بنی عباس نے حریتِ فکر کو خوف اور طعن و لاذرِ ظلم و ستم اور زرباشی کی طاقتوں  
سے ہر طرح کچلنے کی کوشش کی، مگر تابعین اور تابع تابعین میں اور ان کے بعد بھی ایک مدت تک مسلمانوں میں یہ رُوح باقی  
رہی۔ ابتدائی دو تین صدیوں تک آپ کو تاریخِ اسلامی میں اس کے نہایت روشن نشانات نظر آتے ہیں گے۔ اُمراء اور حکام  
کے مقابلہ میں آزادی تو نسبتاً ایک چھوٹی چیز ہے۔ رُوح اور دماغ کی آزادی کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ انسان جس کو  
مقدس سمجھے، جس کی عزت و عظمت اس کے پسناتے قلب میں جاگزیں ہو، اس کی بھی اندھی تقلید سے انکار کر دے، اور  
اس کے مقابلہ میں آزادی کے ساتھ سوچے اور آزادی کے ساتھ راستے قائم کرے۔ یہی سپرٹ ہم کو اُس دور کے اہل  
علم میں نظر آتی ہے۔

ائمہ فقہاء کی حریتِ فکر

صحابہ کرام سے بڑھ کر مقدس بنیاں اور کون ہوں گی؟ اور حضراتِ تابعین سے بڑھ کر کس کے دل میں ان کا  
احترام ہوگا؟ مگر یہ لوگ آزادی کے ساتھ صحابہ کرام کی آراء پر نقد کرتے تھے، ان کے اختلافات میں مماکہ کرتے  
تھے، اور ایک کی راستے کو چھوڑ کر دوسرے کی راستے قبول کرتے تھے۔ اختلافِ صحابہ کے معاملہ میں امام مالکؒ کس صفائی  
کے ساتھ فرماتے ہیں کہ خطا و مہمات فانظرونی ذالک... صحابہ کی آراء میں خطا بھی ہے اور مہمات بھی تم خود غور  
کر کے راستے قائم کرو۔ اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے: احد الفولین خطا و الما اشر فیہ موضوع۔ دو  
مختلف اقوال میں سے ایک پر حال غلط ہوگا۔

خود ان بزرگوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہم خطا سے بری ہیں، اور تم اپنی فکر و نظر کو بالکل معطل کر کے  
صرف ہماری راستے کی پیروی کرو۔ تینا ابو بکر صدیقؓ جب کسی مسئلہ میں اپنی رائے سے کچھ فرماتے تو ساتھ ہی یہ بھی  
فرمادیتے کہ ہذا رائی فان یکن صوابا فمن اللہ وان یکن خطا فذمّی و استغفر اللہ! یہ میری رائے  
ہے اور درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اگر غلط ہے تو میری خطا ہے اور میں خدا سے معذرت چاہتا ہوں۔  
حضرت عمرؓ فرماتے ہیں لا تجعوا اخطاء الراي سنة لامة۔ رائے کی غلطی کو امت کے لیے سنت

ذراوتہ

حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے الا لا یقلدت احدکم دینہ رجلاً، ان احدکم کفر کفرہ  
انہ لا یقلدتہ فی الشرا۔ خبر دار کوئی شخص اپنے دین کے معاملہ میں کسی دوسرے شخص کی اندھی تقلید نہ کرے کہ  
وہ مومن ہو یا کافر، اور وہ کافر ہو تو یہ بھی کافر ہوگا۔ رائی اور غلطی میں کسی کی پیروی نہیں ہے۔  
محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

انما اجابوا حطی واصیب فانظروا  
فی دانی فکلما وافق الکتاب والسنن فخذوا  
وکلما لم یوافق الکتاب والسنن فانزکوہ

نہیں ایک انسان ہوں۔ میری رائے غلط بھی ہوتی  
ہے اور درست بھی۔ تم میری رائے پر غور کرو۔ جو  
کچھ کتاب و سنت کے موافق پاؤ اسے قبول کرو

اور جو بات خلاف دیکھو اسے چھوڑ دو۔

امام مالکؒ کا یہ واقعہ تاریخوں میں موجود ہے کہ خلیفہ منصور عباسی ان کی کتاب الموطا کو تمام عالم اسلام  
کا دستور العمل بنانا چاہتا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ تمام مذاہب فقہیہ کو موقوف کر کے صرف مذہب مالکیؒ  
کو رائج کر دے۔ مگر امام صاحب نے خود اس کو ایسا کرنے سے روک دیا کیونکہ وہ دوسروں سے تحقیق و تامل  
راستے اور اجتہاد کا حق سلب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:

لا یجزل لاحد ان یتقول مقالتنا  
حتی یعلم من ابن قلنا۔

کسی شخص کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے قول کا قائل  
ہو تا وقتیکہ اسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے قول کا  
ماخذ کیا ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

مثل الذی یطلب العلم بلا حجة  
کمثل حاطب لیل یحمل حزمة حطب  
وقبیل اقل تلذذہ وهو لا یدری

”جو شخص دلیل کے بغیر علم حاصل کرتا ہے اس کی مثال  
اس شخص کی سی ہے جو رات کو کھڑیاں چن رہا ہے۔ وہ  
کھڑیوں کا ٹٹھا اٹھاتا ہے اور اس کو خبر نہیں کہ اس  
گٹھے میں کہیں سانپ بھی چھپا ہوا ہے جو اسے ڈس گا“

اسلامی حریتِ فکر و نظر کی تباہی کا دور

تقریباً تین صدیوں تک تحقیق و اجتہاد اور حریتِ فکر و نظر اور آزادی طلبِ حق کی وہ اسپرٹ مسلمانوں میں  
پوری شان کے ساتھ باقی رہی جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تبعین میں پیدا کر گئے تھے۔ اس کے بعد انفرادی و حکام اور  
علماء و مشائخ کے استبداد نے اس روح کو کھانا اثر مروج کر دیا۔ سوچنے والے دماغوں سے سوچنے کا حق اور دیکھنے والی  
آنکھوں سے دیکھنے کا حق امد پونے والی زبانوں سے بولنے کا حق سلب کر لیا گیا۔ درباروں سے لے کر مدرسوں اور  
خانقاہوں تک ہر جگہ مسلمانوں کو غلامی کی باقاعدہ تربیت دی جانے لگی، ولی اور و مایع، روج اور حم کی غلامی  
ان پر پوری طرح مستط ہو گئی۔ دربار والوں نے اپنے سامنے رکوع اور سجدے کر کے غلامانہ ذمیت پیدا کی۔

دور سے والوں نے خدا پرستی کے ساتھ اکابر پرستی کا زہر پاناغوں میں آم آ کر اٹھا لیا۔ خالق و مالوں نے جمعیت کے مسلمانوں کو مسیح کر کے منہ میں قلعہ لگا کر دلوں میں ڈالا جس سے زیادہ سخت اور کھلیا رہی طوق انسان نے انسان کے لیے کبھی ایسا کرنا نہیں سیکھا جب خیر اللہ کے سامنے نہیں کہہ سکتے گھبراتے ہیں خیر اللہ کے آگے نہ اڑتی طرح ہاتھ بانہ سے ہائے گھبرائے انسان کے سامنے نظر آئی کر کہینا مشورہ اولیا ہو جائے، بحیب انسان کے ہاتھ اور پاؤں چوسے جائے گھبرائے انسان، انسان کا خدا زندہ اور آن و مانا بن جائے، بحیب انسان بناتے خود اور خودی کا حق راہ کرتا ہے اللہ و مشیت رسول اللہ کی سند سے، بے نیاز تر قرار دیا جائے، بحیب انسان خفا سے ایک آنکھ سے بڑی اور بحیب سے مشورہ کہہ لیا جاتے، بحیب انسان کا حکم اور اس کی رائے اٹھنا اور نہ سہی مثلاً اسی طرح و بحیب الاطاعت قرار دے لیا جاتے جس طرح خدا کا حکم و بحیب الاطاعت ہے تو حکم گھبرائے کہ اس وقت سے منہ موریے کیے گئے جو الانسید الا ابدان فلا تشیرک پہلے شیطان کی لالچین بھینٹا بیٹھا اور باوجود حق اللہ سے انکار تو میں وہی گئی تھی۔ اس کے بعد کہہ کر آج کل، انقلاب، روحانیت، مکتبہ، اور سوال اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

## رسالت اور اس کے احکام

اطاعتِ رسول کے مسئلہ میں یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ کوئی رسول اپنی ذاتی حیثیت میں مطاع اور مقبول نہیں ہو سکتا۔ نہ موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت اور پیروی اس بنا پر ہے کہ وہ موسیٰ بن عمران ہیں، نہ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اس وجہ سے لائق اطاعت و اتباع ہیں کہ وہ عیسیٰ بن مریم ہیں، اور نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اس حیثیت سے لازم ہے کہ آپ محمد بن عبد اللہ ہیں۔ اطاعت اور پیروی جو کچھ بھی ہے صرف اس حیثیت سے ہے کہ یہ حضرات اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ نے ان کو وہ علم حق عطا کیا جو عام انسانوں کو عطا نہیں کیا اور ان کو وہ پدائیت بخشی جو عام انسانوں کو نہیں بخشی، اور ان کو دنیا میں اپنی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے کے وسیع طریقے بتائے جن کو عام لوگ اپنی رائے و غفل یا انبیا کے سوا دوسرے لوگوں کی رہنمائی سے معلوم نہیں کر سکتے۔ اس اختلاف میں امر میں واقع ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ رسول کی اطاعت اور پیروی کس امر میں ہے اور کس حد تک ہے۔

ایک گروہ کا نقطہ نظر

ایک گروہ کہتا ہے کہ اطاعت اور پیروی صرف اس کتاب کی ہے جو اللہ کی طرف سے اس کا رسول نے کرنا ہے۔ تبلیغ کتاب کے بعد رسول کی حیثیت رسالت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ بھی ویسا ہی ایک انسان ہے جیسے اور دوسرے انسان۔ اگر دوسرے انسان امیر اور سردار تو ہیں تو محض نظم و ضبط (Discipline) کے لیے ان کی اطاعت لازم ہوگی، مگر مذہبی فریضہ نہ ہوگی۔ دوسرے اگر عالم، حکیم اور مُتَّقِن ہوں تو ان کے اوصاف و Merits کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی پیروی کی جاسکتی ہے، اور یہ پیروی اختیاری ہوگی، واجب نہ ہوگی۔ یہی معاملہ رسول خدا کا بھی ہے۔ تبلیغ کتاب کے سوا دوسرے تمام معاملات میں رسول کی حیثیت محض شخص ہے۔ حیثیت ایک شخص کے اگر وہ امیر ہے تو اس کی اطاعت بالمشافہہ ہے نہ کہ دائمی۔ اگر وہ فاضل ہے تو اس کے فیصلے وہیں تک نافذ ہوں گے جہاں تک اس کے حدود و اقتدار Jurisdiction ہیں۔ ان سے باہر زیادہ سے زیادہ ایک فاضل حج کی حیثیت سے اس کے فیصلے بطور ایک نظیر کے لیے باہر نہیں گئے نہ کہ

ایک شارح اور واضح قانون کی حیثیت سے۔ اگر وہ حکیم ہے تو اس کی زبان سے جو حکمت اور اخلاق کی باتیں نکلیں گی وہ اپنی تدریجیت کے لحاظ سے قبول کی جائیں گی جس طرح دوسرے علماء و عقلاء کی ایسی ہی باتیں قبول کی جاتی ہیں۔ بعض اس بنا پر کہ وہ حامل منصب رسالت کی زبان سے نکلی ہیں وہ داخل دین نہیں سمجھے جاتیں گی۔ اسی طرح اگر وہ ایک سیرت انسان ہے اور اس کی زندگی اپنے اطوار، آداب اور معاملات کے اعتبار سے ایک بہترین زندگی ہے تو ہم بلا اختیار اس کو نمونہ (Model) بنائیں گے، جس طرح ایک غیر نبی کی اچھی زندگی نمونہ قرار دینے میں ہم ممتاز ہیں۔ لیکن اُس کا کوئی عمل اور قول ہمارے لیے اخلاق، معاشرت، معیشت اور معاملات میں ایسا قانون نہ ہوگا جس کی پیروی ہم پر واجب ہو۔

دوسرے گروہ کا نقطہ نظر

ایک دوسرا گروہ اس خیال میں ٹھوڑی سی ترمیم کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے رسول کے ذمہ صرف کتاب پھیلانا ہی نہ تھا بلکہ کتاب کے احکام پر عمل کر کے دکھانا دینا بھی تھا کہ امت اس نمونہ پر عمل ہو۔ لہذا عبادت و معاملات وغیرہ کے متعلق احکام کتاب کی جو تفصیلی عملی صورت رسول نے بتائی ہے، اس کی پیروی بھی کتاب ہی کی پیروی ہے، اور دینی فرض ہے۔ باقی ہے وہ معاملات جو احکام کتاب کے علاوہ رسول اپنی شخصی حیثیت میں ایک امیر، ایک قاضی، ایک شہنشاہ، ایک گیم ایک شہری، اور ایک فرد جماعت کی حیثیت سے انجام دے، تو ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو ایک دائمی اور عالمگیر ضابطہ و قانون بنا سکے والی ہو اور جس کی پیروی ہمیشہ کے لیے ایک دینی فرض ہو۔

تیسرے گروہ کا نقطہ نظر

ایک تیسرا گروہ وہ ہے جو رسول کی حیثیت رسالت کو اس کی زندگی کے ایک بہت بڑے حصے پر حاوی سمجھتا ہے۔ اخلاق، معاشرت، معاملات، احکام و تقاضا، اور بہت سے دوسرے معاملات میں اس کے قول اور فعل کا خدا کی جانب سے ہونا تسلیم کرتا ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ یہ سب چیزیں امت کے لیے اسوہ حسنہ ہیں مگر وہ حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی میں فرق ضرور کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ رسول کی زندگی کے بعض معاملات ایسے ضروری ہیں جو حیثیت رسالت سے خارج ہیں اور قابل تقلید نمونہ نہیں۔ اگرچہ وہ کوئی ایسا واضح نقطہ نہیں پہنچ سکتا جو حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی میں بین امتیاز کر دیتا ہو، اور ایسی حد مقرر کرتا ہو جہاں پہنچ کر رسول کی حیثیت محض ایک انسان کی رہ جاتی ہے۔

چوتھے گروہ کا نقطہ نظر

چوتھا گروہ کہتا ہے کہ رسول کی شخصی حیثیت اور رسالت کی حیثیت اگرچہ امتیاز میں دو جدا جدا چیزیں ہیں مگر دُجڑ میں یہ دونوں ایک ہی ہیں اور ان کے درمیان عملاً کوئی فرق کرنا ممکن نہیں ہے۔ منصب رسالت دنیوی اور دُجڑ کی طرح نہیں ہے کہ عہدہ دار جب تک اپنے عہدہ کی گڑھی پر بیٹھا ہے، عہدہ دار ہے، اور جب اُس سے اترتا

ایک عام انسان ہے۔ بلکہ رسول جس وقت منصب رسالت پر مرفراز ہوتا ہے، اُس وقت سے مرتے دم تک وہ ہر وقت اور ہر آن مامرز (On Duty) ہوتا ہے اور وہ کوئی ایسا فعل نہیں کر سکتا جو اُس سلطنت کی پالیسی کے خلاف ہو جس کا وہ نمائندہ بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کی زندگی کے معاملات، عام اس سے کہ وہ امام کی حیثیت سے ہوں یا امیر کی حیثیت سے، سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے ہوں یا ایک شوہر، باپ، بھائی، رشتہ دار اور دوست کی حیثیت سے، سب پر اُس کی حیثیت رسالت اس طرح جاری ہوتی ہے کہ اس کی ذمہ داریاں کسی حال میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے ٹٹک نہیں ہوتیں، حتیٰ کہ جب وہ اپنی خلوت میں اپنی پوری کے پاس ہوتا ہے، اُس وقت بھی وہ اسی طرح اللہ کا رسول ہوتا ہے جس طرح وہ مسجد میں نماز پڑھانے ہوتے ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کچھ کرتا ہے، اللہ کی ہدایت کے تحت کرتا ہے۔ اس پر ہر آن اللہ کی طرف سے سخت نگرانی ہوتی ہے جس کے تحت وہ اُن ہی حدود کے اندر رہ کر چلنے پر مجبور ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کر دی ہیں، اور اپنے اقوال میں، اعمال میں، اور زندگی کے پورے رویے میں دنیا کے سامنے اس امر کا مظاہرہ کرتا ہے کہ یہ ہیں وہ اصول جن پر انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام قائم ہونا چاہیے، اور یہ ہیں وہ حدود جن کے دائرے میں انسان کی آزادی عمل کو محدود ہونا چاہیے۔ اس خدمت کو نبی اپنی شخصی خانگی زندگی میں اسی طرح انجام دیتا رہتا ہے جس طرح اپنی سرکاری حیثیت میں، اور کسی معاملہ میں بھی اگر اس کے مدم کو ذرا سی تعزیر ہو جاتی ہے تو اس کو فوراً تنبیہ کی جاتی ہے، کیونکہ اس کی خطا صرف اسی کی خطا نہیں بلکہ ایک پوری امت کی خطا ہے۔ اس کو بھیجئے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان زندگی بسر کر کے ان کے سامنے ایک ”مسلم“ کی زندگی کا نمونہ پیش کر دے اور صرف یہی نہیں کہ انفرادی معاملات میں ان کی رہنمائی کر کے ان کو فرداً فرداً مسلمان بنائے، بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کا تمدنی، سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام قائم کر کے صحیح معنوں میں ایک مسلم سوسائٹی بھی وجود میں لے آئے۔ لہذا اس کا خطا اور غلطی سے محفوظ ہونا لازم ہے تاکہ کامل اعتماد کے ساتھ اس کی پیروی کی جاسکے اور اس کے قول و فعل کو بالکلہ اسلام کی تعلیم اور اسلامیت کا معیار قرار دیا جاسکے۔ اس میں شک نہیں کہ نبی کے اقوال و افعال میں تقیید و تاسی کے لحاظ سے فرق مراتب ضرور ہے بعض درجہ اور فرضیت کے درجہ میں ہیں، بعض استحباب کے درجہ میں، اور بعض ایسے ہیں جن کی حیثیت درجہ اشکال کی ہے لیکن فی الجملہ نبی کی پوری زندگی ایک ایسا نمونہ (Model) ہے جس کو اسی لیے پیش کیا گیا ہے کہ نبی آدم اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کریں جو شخص اس نمونہ کی مطابقت میں جتنا بڑھا ہوا ہوگا وہ اتنا ہی کامل انسان اور مسلمان ہوگا۔ اور جو اس کی مطابقت کے کم از کم ناگزیر مرتبہ سے بھی گھٹے جاسے گا وہ اپنی کوتاہی کے لحاظ سے فاسق و فاجر، گمراہ اور مغضوب ہوگا۔

میرے نزدیک یہی آخری گروہ حق ہے، اور میں قرآن اور عقل کی روشنی میں جتنا زیادہ غور کرتا ہوں اس



مسک کی حقانیت پر میرا یقین بڑھتا جاتا ہے۔

پچھن سے انبیاء کی تربیت کا خصوصی اہتمام

انبیاء علیہم السلام کے جو حالات قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں ان کو دیکھنے سے مجھ کو نبوت کی حقیقت یہ نہیں معلوم ہوتی کہ اللہ تعالیٰ ایک ایک راہ چھتے کسی کو پکڑ کر اپنی کتاب پہنچانے کے لیے مامور کر دیتا ہو، یا کسی شخص

کو اس طور پر اپنی پیغام بری کے لیے مقرر کرتا ہو کہ وہ ایک جزوقتی مزدور (Part Time Worker)

ہے جو مقررہ اوقات میں ایک مقررہ کام کر دیتا ہے اور اس کام کو ختم کرنے کے بعد آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کرے۔

برعکس اس کے ہیں دیکھتا ہوں کہ اللہ نے جب کسی قوم میں نبی بھیجا چاہا ہے تو خاص طور پر ایک شخص کو اسی جیسے

پیدا کیا ہے کہ وہ نبوت کی خدمت انجام دے۔ اس کے اندر انسانیت کی وہ بلند ترین صفات اور وہ اعلیٰ درجہ

کی ذہنی و روحانی قوتیں و عینت کی ہیں جو اس اہم ترین منصب کو سنبھالنے کے لیے ضروری ہیں۔ پیدائش کے وقت

سے خاص اپنی نگرانی میں اس کی پرورش اور تربیت کرائی ہے۔ نبوت عطا کرنے سے پہلے اس کو اخلاقی عبور ہے،

گراہیوں اور غلط کاریوں سے محفوظ رکھا ہے۔ خطرات اور ہنگاموں سے اس کو بچایا ہے۔ اور ایسے حالات میں

اس کی پرورش کی ہے جن میں اس کی استعداد و نبوت ثروت سے ترقی کر کے فعالیت کی طرف بڑھتی رہی ہے پھر جب

وہ اپنے کمال کو پہنچ گیا ہے تو اس کو خاص اپنے پاس سے علم اور قوت فیصلہ (Judgement) اور

تذہد و ایت عطا کر کے منصب نبوت پر مامور کیا ہے اور اس سے اس طرح یہ کام لیا ہے کہ اس منصب پر آنے

کے بعد سے آخری ساتن تک اس کی پوری زندگی اسی کام کے لیے وقف رہی ہے۔ اس کے لیے دنیا میں تلاوت

آیات اور تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کے سوا کوئی مشغول نہیں رہا ہے۔ رات، دن، اٹھتے بیٹھتے چھپتے

پھرتے اس کو یہی مومن رہی ہے کہ گراہیوں کو براہ راست پر لاسنے، اور براہ راست پر آجانے والوں کو ترقی

کی اعلیٰ منزلوں پر جانے سے قابل بنائے۔ وہ ہمیشہ ایک ہمہ وقتی ملازم (Whole Time

Servant) رہا ہے جس کو کبھی چھٹی نہیں ملی۔ اور کبھی اس کے لیے اتنا شہ کار (Working Hours)

مقرر کیے گئے۔ اس پر خدا کی طرف سے شدید نگرانی مقرر رہی ہے کہ خطا نہ کرنے پاستے۔ جو اس کے نفس کے اتباع

اور شیطانی وسوسوں سے اس کی سخت حفاظت کی گئی ہے۔ اور معاملات کو بالکل اس کی بشری عقل اور اس کے

انسانی اجتہاد پر نہیں چھوڑ دیا گیا، بلکہ جہاں بھی اس کی خواہش یا اس کے اجتہاد نے خدا کے مقرر کیے ہوئے خط

مستقیم سے بال برابر بھی جنبش کی ہے، وہیں اس کو ٹوک کر سیدھا کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کی پیدائش اور اس

کی بعثت کا مقصد ہی یہ رہا ہے کہ خدا کے بندوں کو سوا ذرا سبیل اور اس مستقیم پر چلائے۔ اگر وہ اس خط

کے ایک سر موٹی جی بھتا تو عام انسان میں اس سے ڈوب نکل جاتے۔

یہ جو فرمایا کہ: "ہاں، میں اس کے لفظ لفظ پر قرآن گواہ ہے۔"

۱۔ یہ بات کہ انبیاء علیہم السلام پیدائش سے پہلے ہی نبوت کے لیے مافرد کر دیئے جاتے تھے اور ان کو خاص طور پر اسی مقصد کے لیے پیدا کیا جاتا تھا، متعدد انبیاء کے احوال سے معلوم ہوتی ہے مثلاً حضرت اسماعیل کی پیدائش سے پہلے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی پیدائش اور نبوت کی خوشخبری دے دی جاتی ہے۔ **وَلَمَّا نَسُوا مَا آمَنُوا** **يَا صَالِحُ** **بِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ** (الزمر: ۲۵)۔ حضرت یوسفؑ کے متعلق بھی یہی میں حضرت یعقوبؑ کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو برگزیدہ کرنے اور ابراہیم واسحق علیہما السلام کی طرح ان پر اپنی نعمت کا اتمام کرنے والا ہے حضرت زکریاؑ کے لیے دعا کرنے میں تو ان کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی خوشخبری ان الفاظ میں دی جاتی ہے کہ **إِنَّ آيَاتِنَا عَلَيْكَ يُكْتَبُ كِتَابًا كَرِيمًا** **فَتَنبَأْ بِنَبَأِ ذَاكَ النَّبِيِّ** **الَّذِي نَبَأْنَا** **دَاوُدَ** **وَإِسْمَاعِيلَ** **وَإِسْحَاقَ** **وَيُحْيِي الْمَيِّتَ وَيُخْرِجُ الْحَبَّ وَالْحَبَّةَ** **وَالزُّنْبُرَ مِنَ النَّارِ** **وَالسَّيِّدَةَ مَرْيَمَ** **وَأَحْمَدًا وَنَبِيًّا** **مِنَ السُّلَيْمِينَ** **ذَٰلِكَ نَبَأُ** **آيَاتِنَا** **الَّتِي نَكْتُبُهَا** **عَلَيْكَ** **كِتَابًا كَرِيمًا** (مائدہ: ۱۱۰)۔ حضرت مریمؑ کے پاس خاص طور پر فرشتہ بھیجا جاتا ہے کہ ان کو ایک پاک طہیثت لڑکے (غلام زکی) کی خوشخبری دے۔ اور جب ان کے وزن حمل کا وقت آتا ہے تو خاص حق تعالیٰ کی طرف سے ان کی زچگی کے انتظامات ہوتے ہیں۔ **وَلَمَّا نَسُوا مَا آمَنُوا** **يَا صَالِحُ** **بِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ** (الزمر: ۲۵)۔ وہ بھی عام چرواہوں کی طرح نہ تھا۔ اسے مصر میں خاص طور پر فرعونیت کو تباہ کرنے اور بنی اسرائیل کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے پیدا کیا گیا۔ اس کو قتل سے بچانے کے لیے ایک تابوت میں رکھا اور دریا میں ڈنوا دیا گیا۔ اسے خاص اسی فرعون کے گھر میں پہنچا دیا گیا جس کو وہ تباہ کرنے والا تھا۔ اس کو پارسی صورت دی گئی کہ فرعون کے گھروالوں کے دل میں گھر کیسے۔ **رَوَّافَتُنَّ عَلَيْكَ حَبَابًا حَبَابًا** (اس کے منہ کو تمام عورتوں کے رُودھ سے روک دیا گیا۔ اور اس کی پرورش کا انتظام خاص طور پر حق تعالیٰ کی نگرانی میں ہوا) **وَلَمَّا نَسُوا مَا آمَنُوا** **يَا صَالِحُ** **بِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ** (الزمر: ۲۵)۔ یہ چند مثالیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام خاص طور پر نبوت ہی کے لیے پیدا کیے جاتے تھے۔

غیر معمولی قابلیتیں اور خصوصی صلاحیتیں

پھر دیکھیے کہ اس طرح جن لوگوں کو پیدا کیا جاتا ہے وہ عام انسانوں کی طرح نہیں ہوتے بلکہ غیر معمولی قابلیتوں کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ ان کی فطرت نہایت پاکیزہ ہوتی ہے۔ ان کے ذہن کا سانچہ ایسا ہوتا ہے کہ اس سے جو بات نکلتی ہے سیدھی نکلتی ہے۔ غلط روئی اور کج بینی کی استعداد ہی ان میں نہیں ہوتی۔ وہ سبکی طور پر اپنے ہلٹے جاتے ہیں کہ بلا ارادہ اور بلا کسی غور و فکر کے محض حواس اور وجدان (Intuition) سے وہ ان صحیح نتائج پر پہنچ جاتے ہیں جن پر دوسرے انسان غور و فکر کے بعد بھی غصص سنبھل سکتے۔ ان کے علوم کسی نہیں ہوتے بلکہ جیتی و دہی ہوتے ہیں۔ حق اور باطل، صحیح اور غلط کا امتیاز ان کی عین سرسنت میں ودیعت کیا جاتا ہے۔ وہ غلطی صحیح سمجھتے ہیں۔ صحیح جلتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یعقوبؑ کو دیکھیے حضرت یوسفؑ کا خواب سننے ہی ان کے دل میں گھٹاس پیدا ہو جاتی ہے کہ

اس بچے کو اس کے بھائی جینے نہ دیں گے۔ برادران یوسفؑ ان کو کھیل سکینے سے جانا چاہتے ہیں تو حضرت یعقوبؑ نہرت ان کی زبری نیت کو کھانپ جاتے ہیں۔ بلکہ ان کو ٹھیک وہ بہانہ بھی معلوم ہو جاتا ہے جو بعد میں وہ بنانے والے تھے۔ فرماتے ہیں وَأَخَاتُ أَنْ يَا حَلَّةُ الذَّائِبُ وَأَنْتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ۔ پھر حسب یوسفؑ کے بھائی خون کا بھرا جوار اگرا لاکر دکھاتے ہیں تو حضرت یعقوبؑ دیکھ کر فرماتے ہیں بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ أَنْفُسُكُمْ أَعْدَاءُ۔ اسی طرح جب برادران یوسفؑ مصر سے واپس آ کر کہتے ہیں کہ آپ کے بیٹے نے چوری کی ہے اور یقین دلانے کے لیے یہاں تک سزائیں کرتے ہیں کہ اس سستی کے لوگوں سے پوچھ بیچے جہاں سے ہم آ رہے ہیں تو حضرت یعقوبؑ پھر وہی جواب دیتے ہیں کہ یہ تمہارے نفس کا دھوکہ ہے۔ بیٹوں کو پھر مرض بھیجتے ہیں اور فرماتے ہیں كِرَادْهُبُوا فَتَحْتَسِبُوا اِهْنُ يَدُوسَفَ دَ آجِيْبُو۔ جہاں اور جا کر یوسفؑ اور اس کے بھائی کا پتہ پلا تو گویا ساہا سال گزر جانے کے بعد بھی ان کو یقین۔ ہے کہ حضرت یوسفؑ زندہ ہیں اور مصر ہی میں مر رہے ہیں۔ اس کے بعد جب حضرت یعقوبؑ کے بیٹے حضرت یوسفؑ کا قبضے لے کر مصر سے چلتے ہیں تو ان کو دُور ہی سے حضرت یوسفؑ کی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی نفسی و روحانی قوتیں کس قدر غیر معمولی ہوتی ہیں۔ یہ عورت حضرت یعقوبؑ ہی کی خصوصیت نہیں تمام انبیاء کا ہی حال ہے۔ حضرت یحییٰ کے متعلق ارشاد ہے:

وَأَيُّكُمْ الْحَكِيمُ صَبِيًّا وَحَتَانًا مِّنْ كَلِمَاتِ  
 كَوْنِكُمْ۔ (مریم: ۱۲۰-۱۱۳) اور پاک طینتی اپنی طرف سے عطا کی۔

حضرت عیسیٰ کی زبان سے گہوارے میں گہرا یا جاتا ہے کہ:

وَجَعَلْنِي مَبَارَكًا إِنَّ مَا كُنْتُ إِذْ وَصَلْتَنِي  
 بِالْعَسَلِ لِي إِذْ كَلِمَةٍ مَا دُمْتُ حَيًّا وَبَرًّا  
 بِوَالِدَاتِي وَكَمْ تَجْعَلْنِي حَبِيْبًا شَقِيْبًا۔ (مریم: ۳۱-۳۲)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خَلْقِي عَزِيْمٌ۔ (العنکب: ۳) اور تم انفاق کے بڑے رتبے پر ہو۔

یہ سب ان جہلی اور فطری کمالات کی طرف اشارات ہیں جن کو کے کہ انبیاء علیہم السلام پیدا ہوتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ ان کو اپنی فطری استعدادات کو ترقی دے کر فعلیت کی طرف لے جاتا ہے یہاں تک کہ ان کو وہ چیز عطا کرتا ہے جس کو قرآن میں علم اور حکم (توت فیصلہ) اور ہدایت اور تبتید وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں:

وَأَسْنَدُهُ مِنْ إِبْنِ مَالٍ تَعَدَّ مَوْتٌ .  
 میں نہ انکی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں  
 جانتے۔ (احزاب: ۶۲)

حدیث ابراہیم علیہ السلام کو مکہ کی ستمگاہ و ارض کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے (انعام: ۷۵) اور حجب  
 وہ اس مشاہدہ سے علم یقین لے کر بیٹھے ہیں تو اپنے باپ سے کہتے ہیں:-

يَا بَيْتَ رَبِّي قَدْ جَاءَ رَبِّي مِنَ الْعِلْبَةِ وَالْعُرْ  
 يَا بَيْتَ نَا تَبِعْنِي أَهْدِكَ سِرًّا طَائِفًا سِرِّيًّا .  
 اے میرے باپ! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو تیرے  
 پاس نہیں آیا، لہذا میری پیروی کر میں تجھے سیدھا  
 راستہ بتاؤں گا۔ (مریم: ۴۳)

حضرت یعقوب کے متعلق ارشاد ہے:

وَأَنَّهُ لَقَدْ دُعِيَ لِمَا عَلَّمَهُ وَكَانَتْ  
 أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ . (یوسف: ۶۸)

اور یقیناً وہ علم رکھتا تھا جو ہم نے اس کو تعلیم کیا تھا  
 مگر اکثر لوگ یہ راز نہیں جانتے۔

حضرت یوسف کے حق میں فرمایا:

وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَ  
 حِكْمًا . (یوسف: ۲۲)

اور جب وہ اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو دانش  
 اور قوت فیصلہ عطا کی۔

یہی بات حضرت موسیٰ کے حق میں بھی فرمائی (قصص: ۱۴) یہی حکم اور علم حضرت نوح کو عطا کیا گیا (انبیاء: ۷۴)  
 اور اسی غیر معمولی علم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی سرفراز ہوئے۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
 وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَتُكْفَلْ . (النساء: ۱۱۳)

اور انہوں نے تیرے اوپر کتاب اور حکمت اتاری اور  
 تجھے وہ علم دیا جو پہلے تو نہ جانتا تھا۔

قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَبِّي . (انعام: ۵۷)

کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح اور  
 روشن راستے پر ہوں۔

قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ  
 بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي . (یوسف: ۱۰۸)

کہو کہ یہ میرا راستہ ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں  
 میں بھی بصیرت پر ہوں اور وہ بھی جو میرے پیروں میں

اس علم اور حکم سے نبی اور عام انسانوں کے درمیان آغا علیہم تفاوت واقع ہو جاتا ہے جتنا ایک آنکھ  
 دالے اور ایک نابینا کے درمیان ہوتا ہے۔

إِنِّي أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ قُلْ هَلْ  
 يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ . (انعام: ۵۰)

میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی  
 جاتی ہے۔ کہو اے محمد! کیا انہما اور آنکھوں والا

دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

ان آیات میں جس چیز کا ذکر کیا گیا ہے وہ محسن کتاب نہیں ہے، بلکہ وہ ایک روشنی ہے جو انبیاء و علیہم السلام کے نفس میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ اسی لیے اس کا ذکر کتاب سے الگ کیا گیا ہے اور اسے انبیاء کی صفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ اس روشنی سے حقائق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی سے ان امور میں نظر کرتے ہیں جو ان کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ علماء نے اسی چیز کا نام ”وحی نسی“ رکھا ہے یعنی وہ اندرونی ہدایت و بصیرت جو ہر وقت ان بزرگوں کو حاصل رہتی ہے اور جس سے وہ ہر موقع پر کام لیتے ہیں۔ دوسرے لوگ غور و فکر کے بعد جن باتوں کی تک نہیں پہنچ سکتے اور جن امور میں حق و صواب معلوم نہیں کر سکتے ان میں نبی کی نظر اللہ کی وحی ہوئی بصیرت اور روشنی کے اندر سے ان واحد میں تک پہنچ جاتی تھی۔

خدا کی طرف سے مگرانی اور حفاظت کا انتظام

اس کے بعد قرآن مجید ہم کو بتاتا ہے کہ اللہ نے انبیاء علیہم السلام کو نہ صرف حکمت اور قوت فیصلہ اور غیر معمولی دانش و پیش عطا کی ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ ان پر خاص نظر رکھتا ہے غلطیوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ مگر اہمیتوں سے ان کو بچاتا ہے خواہ وہ انسانی اثرات کے تحت ہوں، یا شیطانی وساوس کے تحت، یا خود ان کے اپنے نفس سے پیدا ہوں۔ حتیٰ کہ اگر کلمہ نضائے بشریت کبھی وہ اپنے اجتہاد میں بھی غلطی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فوراً ان کی اصلاح کر دیتا ہے۔ حضرت یوسفؑ کے نقشے میں دیکھیے جب قریب تھا کہ عزیز مصر کی بیوی ان کو اپنے بال میں پھنسا لے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ”برہان“ دکھا کر ان کو بدکاری سے محفوظ کر دیا۔

اُس نے یوسفؑ سے ارادہ بد کر ڈالا اور وہ بھی اُس کی	بَلْ لَقَدْ هَمَمْتُ بِدَا وَهَمَّ بِهَا كَوْلًا اَنْ
طرف ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا یا	رَأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ - كَذٰلِكَ لِنُصَوِّرَ عَنْهُ
ہمراہ تاکہ ہم اُس کو برہان اور بے حیائی سے بھر دیں کیونکہ	الشُّؤْرَ وَالنَّجْسَ اَرَاتَهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ
وہ ہمارے ان بندوں میں سے تھا جن کو ہم نے اپنے	درجہ صفحہ: ۲۴۴

یہ مخصوص کر لیا تھا۔

حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو جب فرعون کے پاس جانے کا حکم دیا گیا تو انہیں خوف ہوا کہ کہیں فرعون ان پر زیادتی نہ کرے۔ اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ کچھ خوف نہ کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں، اور سب کچھ سن اور دیکھ رہا ہوں (ظہ: ۴۵-۴۶)۔ خوف بشریت کی بنا پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس بڑی کمزوری کو اپنی وحی سے دور کیا۔

حضرت فرخ بیگ کو ڈوبتے دیکھ کر چیخ اٹھے ”رَبِّ اِنَّ اِسْتِغْنٰی مِنْ اَهْلِیْ خَدَا یَا یٰ مِیْرٰثِیَا“ ہے یہ بشری کمزوری تھی۔ اللہ نے اسی وقت ان پر یتیمتہ واقع کر دی کہ وہ تیرے لطف سے بے نیاز ہو کرے، مگر تیرے ”اہل“ سے نہیں ہے

کیونکہ عمل غیر صالح ہے، بشرتیت نے محبت پدری کے جوش میں ذرا سی دیر کے لیے نبی کی نظر سے اس حقیقت کو چھپا دیا تھا کہ حق کے معاملہ میں باپ، بیٹا، بھائی، کوئی عزیز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے اسی وقت آنکھوں پر سے پردہ اٹھا دیا اور حضرت نوحؑ مطہر ہو گئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی متعدد مرتبہ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔ اپنی فطری برکت و رافت، کفار کو مسلمان بنانے کی حرص، کفار کی ایسٹ قلب، لوگوں کے چھوٹے سے چھوٹے احسان کا بدلہ دینے کی کوشش، منافقین کے دلوں میں ایمان کی دُوبے بچھو رکھنے کی خواہش، اور کبھی کبھی انھیں اپنے سے کئی اہتمامی نعرے پر دل کی جلی سے اس کی اصلاح کی گئی۔ عیسٰی وَكَوْنَلْ اَنْ بَجَاذِكَا الْاَعْصَى رَعِبَسْ، مَا كَانَ يَعْجَبِي اَنْ تَكُوْنَلْ كَلَهْ اَسْمَوِي رَاْعَالْ (۱۰۰)۔ عَمَّا اَللّٰهُ عَنكَ لِمَا اَدْرَيْتَ لَهْمَا (ترجمہ: ۱۰۰)۔ اِسْتَعْمَرُوْا لَهْمَا وَلَا تَسْتَعْمَرُوْا لَهْمَا اِسْتَعْمَرُوْا لَهْمَا سَبَبِيْنَ مَوْتُوْا لَهْمَا لَعْنَةُ اللّٰهِ لَهْمَا (ترجمہ: ۱۰۰)۔ كَلَّا لَتَعْلَمُنَّ عَلٰى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّآتَ اَيْدٍ اَوْ اَوْ اَوْ (۱۰۳)۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَجْهَرُوْنَ بِمَا اَخْلَا اَفْهًا لَكَ (ترجمہ: ۱۰۱)۔ یہ سب آیات اسی امر کی شہادت دیتی ہیں۔ لوگ ان آیات کو اس بات کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غلطیاں سرزد ہوتی تھیں اور آپ غلطیوں سے متبرک نہ تھے خصوصاً حضرات اہل قرآن کریم ان آیات کے ذریعہ سے اللہ کے رسول کی غلطیاں کھینچنے میں خاص مزہ آتا ہے لیکن دراصل یہی قرآن آیتیں ہیں جن سے صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اپنے نبی کو غلطیوں سے بچانے اور اس کی زندگی کو مستحکم و عمارت پر قائم رکھنے کی رحمت واری اللہ تعالیٰ نے براہ راست اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ یہی حقیقت صرف مذکورہ بالا آیات ہی ہیں، باقی نہیں ہوتی ہے، بلکہ قرآن میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اسے

اصولی حیثیت سے بھی بیان فرمایا ہے مثلاً فرمایا:

اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ تم کو براہ راست سے ہمارے کاحرم زہری چکا تھا مگر وہ عذر اپنے آپ کو بچانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے اور تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت آزاری بھیجے اور تم کو وہ علم دیا ہے جو تم پہلے نہ جانتے تھے۔

وَكَلَّا فَضَّلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ  
لَكَ تَبَتَّ طَايِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا  
يُضِلُّوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَحْتَوِيْكَ مِنْ شَيْءٍ  
فَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ  
عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء: ۱۱۲)

قریب تھا کہ وہ تم کو اس بات سے جو ہم نے تم پر ہی کی ہے خوف کر دیتے تاکہ تم اس کے سوا کچھ اور ہم پر بنا لو اور اس وقت وہ تم کو دوست بنا لیتے اگر

وَ اِنْ كَاوُوْا لِيَقْتُوْنَكَ مِنَ الذِّمِّيْ اَوْ عِيْنًا  
اِلَيْكَ لَتَعْمَرُنَّ عَلَيْنَا عِيْرَةً وَاِذَا لَأَخْلُدُوكَ  
حَيْلًا وَّلَوْلَا اَنْ يُبَدِّلَكَ لَعَدَدٌ مِّنْ نَّوْكُوْا

إِن يَسْفِرْ شَيْئًا قَلِيلًا -

ہم تو کم ثابت قدم نہ رکھتے تو کسی قدر تم ان کی طرف  
جھک ہی جاتے۔

(بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)

ہم لے تم سے پہلے جو نبی یا رسول بھی بھیجا ہے اُس نے  
جب کبھی کسی بات کی تمنا کی شیطان نے اس کی تمنا  
میں دوسرے ڈال دیا۔ مگر اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ نبی  
کے دل میں شیطان جو دوسرے بھی ڈالتا ہے اللہ سے

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَ  
لَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي  
أُمْنِيَّتِهِ فَيَلْسَنُ اللَّهُ مَا يُلْفِي الشَّيْطَانَ  
ثُمَّ يُخَلِّمُ اللَّهُ إِلَيْنَا - (الحج: ۵۲)

مٹا دیتا ہے اور پھر اپنی آیات کو مسترد کر دیتا ہے۔

ان اصولی ارشادات اور اوپر کی واقعاتی مثالوں سے سماعت معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی زندگی  
و شکیک ٹھیک معیار مطلوب پر قائم رکھنے کی ذمہ داری خود اپنے اوپر لی ہے اور اس نے اس بات کا سخت اہتمام  
کیا ہے کہ نبی سے جو لغزش بھی سرزد ہو جاتے اس کی فوراً اصلاح کر دے، خواہ وہ لغزش کسی ذاتی معاملہ میں ہو یا پبلک  
معاملہ میں۔ پھر اگر اصولی طور پر یہ بات مان لی جاتے تو اسی سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ جب تک جن کاموں پر اللہ  
تعالیٰ نے گرفت نہیں کی ہے وہ سب کے سب اللہ کے معیار مطلوب پر پورے اترتے ہیں، اور گویا ان پر خود اللہ  
ہی کی مہر تہمتی ثبت ہے۔

محاکمہ

یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ اس کی تفسیح کے لیے بالکل کافی ہے کہ نبوت کی حیثیت یہ نہیں ہے کہ ایک  
انسان جو تمام حیثیات سے دوسرے انسانوں جیسا ایک انسان ہو ایک عمر کو پہنچنے کے بعد یکا یک خدا کی فکر  
سے نزول وحی کے لیے چن لیا جائے اور پھر اس کتاب کے جو اس پر نازل کی گئی ہو اور کسی بات میں بھی اس کی  
راستے، اس کے خیالات، اُس کے اعمال، اس کے احکام اور اس کے فیصلے غیر نبی انسانوں سے ممتاز نہ ہوں،  
جیسا کہ پہلے گروہ کا گمان ہے، یا یہ کہ اس میں اور عام انسانوں میں حیرت آنا ہی فرق ہو کہ تنزیل کتاب کے ساتھ  
ساتھ اُن کو احکام کتاب کی عملی تفصیلات بھی تیار ہی گئی ہوں اور اس تعارض (تباہی حیثیت سے قطع نظر کہ  
وہ محض عام امیروں جیسا ایک امیر اور عام قاضیوں جیسا ایک قاضی اور عام لیڈروں جیسا ایک لیڈر ہو،  
جیسا کہ دوسرے گروہ کا خیال ہے۔ اسی طرح نبوت کی حقیقت یہ بھی نہیں ہے کہ نبی کی ذات بشریہ پر نبوت عارض  
ہوتی ہو، اور اس کے عروض کے بعد بھی نبی کی بشریت اور اسی کی نبوت دونوں علیحدہ علیحدہ رہتی ہوں، حتیٰ کہ ہم اس  
کی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر کے سرت اُس شعبہ کو اطاعت و اتباع کے لیے منتخب کر سکیں جو نبوت سے  
تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ تیسرے گروہ کا نظریہ ہے یہ تمینوں خیالات بے اصل ہیں۔

نبی کامل و اکمل بشریت سے آراستہ ہوتا ہے

ان کے برعکس قرآن مجید سے نبوت کی حقیقت پر جو روشنی پڑتی ہے، اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ نبی اپنی پیدائش اور پرورش کے مراحل سے گزرنے کے بعد نبوت کے لیے منتخب نہیں کیا جاتا ہے بلکہ وہ کاہنہ نبوت ہی کے لیے پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ اگرچہ بشری ہوتا ہے، اور ان تمام حدود سے محدود ہوا کرتا ہے جو حق تعالیٰ نے فطرتاً بشریت کے لیے مقرر فرمائی ہے، لیکن ان حدود میں اس کی بشریت آخری اور انتہا درجہ کی کامل و اکمل بشریت ہوتی ہے جس میں وہ تمام قوتیں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں جو زیادہ سے زیادہ ایک انسان کو حاصل ہونی ممکن ہیں۔ اس کے جسمانی، نفسانی، عقلی اور روحانی قوتی حد و ثبوت (Balance & Moderation)

کے انتہائی مقام پر ہوتے ہیں۔ اس کے ادراکات اتنے لطیف ہوتے ہیں کہ وہ بلا کسی عور و غور کے اپنے وجدان سے اس الہام الہی کو پالیتا ہے جس کی طرف *فَاللَّهُمَّ مَا قُودٌ خَادٍ لِقَوْلِنَا* میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی فطرت اتنی صحیح ہوتی ہے کہ وہ کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر صرف اپنے میل طبعی سے فحور کی راہ چھوڑ کر تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس کا قلب اتنا سلیم ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملہ میں جو اس کے سامنے آئے اس الہی ہدایت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتا ہے جس کی طرف *وَهَذَا نَبْلُ الْعَدِيدِينَ* میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اس کے قلب کی سلامت اور اس کی فطرت کی صحت اس کو خود بخود ان راستوں سے ہٹا دیتی ہے جو ضلالتوں کے خلات ہیں۔ اور وہ آپ سے آپ ان راستوں پر چلتا ہے جو عنایت الہی کے عین مطابق ہیں۔ یہی کامل و اکمل بشریت ہے جس کے ساتھ وہ صحیح معنوں میں بالفعل خدا کا خلیفہ ہوتا ہے، اور یہی چیز ہے جو اپنی نچنگی اور اپنے کمال کو پہنچ جانے کے بعد ہدایت عام کے منصب پر سرفراز کی جاتی ہے، حق تعالیٰ کی طرف سے علم کی مزید روشنی پاکر ہدایت میں نیر نبتی ہے، مصالح عامہ بشریہ کے لیے تعلیمات اور احکام کا منہبط قرار پاتی ہے، اور اصطلاح میں نبوت و رسالت سے موسوم ہوتی ہے۔ لہذا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ نبوت ایک عرض ہے جو ایک خاص وقت میں نبی کے جوہر انسانیت پر عارض ہوتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی انسانیت کاملہ کا جوہر ہے جو نبوت کی استعداد کے ساتھ پیدا کیا جاتا ہے اور فعلیت کی طرف ترقی کرتے کرتے آخر کار نبوت بنا دیا جاتا ہے۔ نبوت کا منصب ایسا نہیں ہے کہ ایک انسان تھا جو وانسر لے بنا دیا گیا، حتیٰ کہ اگر اس کی جگہ کوئی دوسرا انسان ہوتا تو وہ بھی اسی طرح وانسر لے بنا دیا جاسکتا تھا۔ بلکہ دراصل نبوت ایک پیدائشی چیز ہے اور نبی کی حیثیت ذاتی ہی اس کی حیثیت نبوی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا ہے کہ بعثت سے قبل اس کی حیثیت نبوی بالقوہ ہوتی ہے اور بعثت کے بعد بالفعل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہنر مند جیسے میٹھا پھل کہ وہ بالذات میٹھا پھل ہی پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کی مشاغل و نچنگی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر ہی ظاہر ہوتی ہے۔



## بحث سے متعلق چند آیات

اب ان آیات کا مفہوم اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ براہ اللہ تعالیٰ نے نبوت اور ذات نبوی کے حق میں متعدد مقامات پر ارشاد فرمائی ہیں۔ عین توضیح کے لیے ان آیات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے نقل کرتا ہوں:

(۱) وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُطِيعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَئِنْ

اللَّهُ يَجْتَبِي مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ فَأَمُّوا  
بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ - (آل عمران - ۱۷۹)

اللہ کا یہ قاعدہ نہیں ہے کہ تم کو براہ راست غیب کا علم ہے، بلکہ وہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے چن لیتا ہے۔ پس ایمان لو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر۔

(۲) وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا لِيُطِيعَ بِإِذْنِ اللَّهِ - (النساء، ۶۴)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جاوے اللہ کے اذن سے۔

(۳) مَنْ طِيعَ الرَّسُولَ فَقَدْ اطَّاعَ اللَّهَ وَالنَّاسَ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی تاہم اس کی قسم جب وہ ٹوٹتا ہے، تمہارا صاحب یعنی نبی، نہ تم کو رہا ہے اور نہ کی راہ، اور نہ وہ جو تمہاری نفس سے ہوتا ہے۔ وہ صرف وہی ہے جو اس پر کی جاتی ہے۔

(۴) فَاتَّبِعُوا إِذَا تَلَّوْا مَا نَزَّلَ مِنْكُمْ وَمَا عَلَّوْا وَمَا يَنْطَلِقُ مِنَ النَّهْيِ، إِنَّهُ هُوَ إِلَّا وَجْهُ يُؤْتِي - (الحج: ۴۳)

میں صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے تمہارے لیے رسول خدا میں ایک اچھا نمونہ ہے۔

(۵) إِنْ أَشِيعَ إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيْهِ - (النعام، ۱۵۰)

(۶) لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (آل نزاب، ۲۱)

اسے محض کہہ دو کہ اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

(۷) قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ - (آل عمران، ۳۱)

ابن ایمان کا کام تو یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلا یا جاسے تاکہ (رسول) ان کے ویرانہ فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور ان لیا ایسے ہی گونہ خراج پاتے واسے ہیں۔ اور اگر تم اس کی (یعنی رسول کی) اطاعت کرو گے تو ہرگز ہونے لگے۔

(۸) إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ . . . (النور، ۵۱ تا ۵۲)

یعنی رسول کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے اذن یا اس کے حکم کی بنا پر مطاع ہوتا ہے (رسولت)

پس قسم ہے تیرے پروردگار کی، انہیں اور ہرگز میں نہیں ہیں، جب تک کہ اُسے نبی وہ اپنے آپس کے جھگڑے میں کچھ کو فیصلہ کرنے والا نہ بنائیں، پھر توجہ فیصلہ کے اس سے اپنے دلوں میں کوئی تنگی بھی نہ پائیں بلکہ تسلیم کریں۔

(۹) قُلَّا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُخْلِفُوا فِيكُمْ شُرَكَاءَ لَكُمْ ذُرِّيَّتَكُمْ لِيُؤْمِنُوا بِكُمْ حَتَّىٰ تَكْفُرُوا بِهِنَّ لِمَ كَفَرْنَ فِيكُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ  
(النساء: ۶۵)

کسی مومن مرد یا عورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کرے تو اس کے لیے اپنے معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہے جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ مکمل گمراہی میں پڑ گیا۔

(۱۰) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمَا الْخِيفَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ أَمْرًا ذَرَاهُ يُجْزَأْ مِنْهُ مِثْقَالَ حَبِّ خَمَلٍ وَمَنْ يَعْصِ أَمْرًا نَهَىٰ فِيهِ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَسَفَ مِنْهُ حَبْطَ ثَلَاثِينَ رَجَبًا وَمَنْ أَسَءَلْهُ سَأَلًا يُغْنِيهِ عَنْ سَأَلِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ لَا يُلَاقِ اللَّهَ تَعَالَىٰ  
(احزاب: ۳۶)

ان آیات پر غور کیجیے تو تمام حقیقت آپ پر کھل جائے گی۔

نبیؐ اور عام انسانوں کا فرق

پہلی آیت میں نبیؐ اور عام انسانوں کے درمیان فرق ظاہر کیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ نبیؐ پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ اپنے فیصلہ کا علم ہر انسان پر فرود آتا ہے، مگر اپنے بندوں میں سے کسی خاص بند پر ظاہر کرتا ہے۔ اس لیے عام انسانوں پر لازم ہے کہ وہ اُس بندے سے پر ایمان لائیں۔  
اطاعت نبیؐ کا حکم مطلق ہے

(۲) دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ رسولؐ پر ایمان لانے کا نہ عاصرت ہی نہیں ہے کہ اس کو رسولؐ خدا مان لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ رسولؐ کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ یہ اطاعت کا حکم نہ صرف اس آیت میں، بلکہ قرآن کریم میں جہاں

لغہ غیب، یعنی وہ غیر محسوس حقیقتیں جن سے واقعہ ہوتے بغیر دنیا میں انسانی زندگی کے لیے کوئی صحیح طریقہ اور نظام نہیں بن سکتا، مثلاً یہ کہ انسان کی اسبیت کیا ہے، وہ آزاد ہے یا کسی کا محکوم، محکوم ہے تو کس کا محکوم ہے؟ اپنے حاکم سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اسے کبھی اپنے حاکم کو جواب دینا ہے یا نہیں؟ جواب دینا ہے تو کہاں؟ کس شکل میں؟ کس معیار پر؟ کن معاملات میں؟ اور اس جواب دہی میں کامیاب یا ناکام ہونے کا کیا نتیجہ ہوگا؟ ان سوالات کا جب تک کوئی جواب نہ آئے اور وہ بھی تمہاری دکانی جواب نہیں بلکہ علمی اور تقیینی جواب معلوم نہ ہو، انسانی زندگی کے لیے کوئی اسکیم نہیں بن سکتی اور یہی وہ علم ہے جس کو اللہ تعالیٰ اس آیت میں غیب کے علم سے تعبیر فرما رہا ہے (مترجم)



جاتا ہے کہ یہ تہا سے ہاتھ میں کیسا ہے؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ میری لاشی ہے، اس سے بکریاں چھاتا ہوں حکم ہوتا ہے کہ اس کو پھینک دو۔ جب لاشی اتر دیا جاتی ہے اور حضرت موسیٰ ڈر کر بھاگتے ہیں تو فرمایا جاتا ہے یا موسیٰ اقبلْ وَلَا تَخَفْ إِنَّكَ مِنَ الْآمِنِينَ۔ موسیٰ ڈرو نہیں، آگے بڑھو، تم امن میں ہو۔ پھر حکم دیا جاتا ہے اذْهَبْ اِلَىٰ فِرْعَوْنَ اِنَّهُ طَغَىٰ۔ فرعون کی طرف جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے۔ وہ اپنی مدد کے لیے ہارون علیہ السلام کو مانگتے ہیں اور یہ درخواست قبول کی جاتی ہے۔ دونوں بھائی فرعون کے پاس جاتے ہوئے ڈرتے ہیں تو ارشاد ہوتا ہے:

لَا تَخَافَا رَبِّيَ مَعَكُمْ اَسْتَكْبَرُوا وَآدَىٰ۔ ڈرو نہیں، میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ میں مُخِنَّا اور دیکھتا ہوں۔ فرعون کے دربار میں جاؤ گروں کے بنائے ہوئے سانپوں کو دیکھ کر حضرت موسیٰ ڈر جاتے ہیں تو وہی آتی ہے لَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْآمِنِیْنَ۔ مت ڈرو تمہارا ہی بول بالا ہو گا۔ جب فرعون پر اتمامِ حجت ہو چکا ہے تو اُن کو حکم دیا جاتا ہے کہ اَسْرِ بِعَبَادِنِیْ لَیْلًا اِنَّکُمْ مُّتَّبِعُونَ۔ میرے بندوں کو لے کر راتوں رات چل پڑو۔ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ دریا پر پہنچتے ہیں تو فرمان آتا ہے اِضْرِبْ یَعْقَابَ الْبَحْرِ وَرِیَابِهَا بِمَا عَصَا رُوہُ۔ کیا ان میں سے کوئی وحی بھی ایسی ہے جو کتاب کی صورت میں ہدایت عاقر کے لیے نازل ہوئی ہو؟ یہ سنا لیں اس امر کے ثبوت میں کافی ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف اللہ تعالیٰ متوجہ رہتا ہے اور ہر ایسے موقع پر جہاں بشری حکم دے گا اس کے غلطی کرنے کا امکان ہو اپنی وحی سے اُن کی رہنمائی کرتا رہتا ہے، اور یہ وحی اُس وحی سے ماسوا ہوتی ہے جو ہدایت عام کے لیے اُن کے واسطے سے بھی جاتی اور کتاب میں ثبت کی جاتی ہے تاکہ لوگوں کے لیے ایک الہی ہدایت نامہ اور دستور العمل کا کام

حضور پر وحی غیر مشکوٰہ کے کی چند مثالیں

ایسی ہی وحی غیر مشکوٰہ اور وحی خفی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل ہوتی تھی جس کی طرف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں حضور انور نے پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنایا تھا۔ اس کے متعلق کوئی حکم کتاب میں نہیں آیا۔ مگر جب اس قبلہ کو منسوخ کر کے بیت الاحرام کو قبلہ بنانے کا حکم دیا گیا اُس وقت ارشاد ہوا:

وَمَا جَعَلْنَا الْبَيْتَ الَّذِي كُنْتَ عَلَيْهِمْ اِلَّا لِيُعَلِّمُوا الْاٰیٰتِیْنَ لِقَوْمٍ يَعْلَمُوْنَ۔ (البقرہ - ۱۲۲)  
 جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے صرف اس لیے مقرر کیا تھا کہ رسول کا اتباع کرنے والے اور اتباع علی اعقابہ سے منہ موڑنے والے کے درمیان امتیاز ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ پہلے جو بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا، وہ وحی کی بنا پر تھا۔ جنگ اُحد کے موقع پر حضور نے مسلمانوں سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کے لیے فرشتے بھیجے گا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے حضور کے اس ارشاد کا ذکر قرآن میں اس طرح فرمایا:

وَمَا جَعَلْنَا اِلٰلٰهَ الْاٰنْبِیَآءِیْ نَكْمًا وَّ اَلْمَلَائِکَہُ اِلٰلٰہًا۔ (اللہ نے اس وعدے کو تمہارے لیے خوشخبری بنایا)



کی ابتدائی آیات میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ دراصل اسی حقیقت کا اظہار ہے۔ اور عیسائیا کہتے ہیں اس مضمون کے پہلے حصہ میں عرض کر چکا ہوں، یہ بات بھی قرآن کے کھول کر بیان کر دی ہے کہ انبیاء پر ہمیشہ اللہ کی نگرانی رہتی ہے، ان کو غلط روی سے محفوظ رکھا جاتا ہے اور اگر باقتضائے بشریت ان سے کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے، یا وہی غشی کے لطیف اشارے کو سمجھنے میں وہ کبھی غلطی کر جاتے ہیں، یا اپنے اجتہاد سے کوئی ایسی روش اختیار کر جاتے ہیں جو مرضاتِ الہی سے یکسر ٹھوکتی ہو تو اللہ تعالیٰ فوراً اُس کی اصلاح کرتا ہے اور تنبیہ کوکے سیدھے راستے پر لے آتا ہے۔ قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیائے کرام کی لغزشوں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی تنبیہوں کا جو ذکر آیا ہے اس کا ہرگز یہ نشا نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں سے انبیاء علیہم السلام کا اعتماد اٹھ جاتا اور لوگ پر سمجھنے لگیں کہ جب انبیاء بھی ہماری ہی طرح لغو یا اللہ غلط کار ہیں تو ان کے احکام کی اطاعت اور ان کی روش کی پیروی کامل اطمینان کے ساتھ کیسے کی جاسکتی ہے بلکہ اس ذکر سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو ہر اسے نفس کا اتباع کرنے یا اپنی راستے اور بشری اجتہاد پر چلنے کے لیے آزاد نہیں چھوڑ دیا ہے۔ وہ چونکہ اُس کی طرف سے اُس کے بندوں کی رہنمائی کے لیے مامور کیے گئے ہیں، اس لیے ان پر یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ وائفاً اُس کی ہدایت پر کار بند رہیں اور اپنی زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی اس کی رضا کے خلاف عمل نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بعض ایسی باتوں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تنبیہ کی گئی ہے جو عام انسانی زندگی میں قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مثلاً کسی انسان کا شہد کھانا یا نہ کھانا، اور کسی اندھے کی طرف توجہ نہ کرنا اور اس کے دخل و مقنولات پر نہیں چہرے جو جانا، یا کسی کے لیے دعائے مغفرت کرنا، کو نسا ایسا اہم واقعہ تھا، مگر اللہ نے نبیؐ کو ایسے چھوٹے معاملات میں بھی اپنی راستے یا دوسروں کی مرضی پر چلنے نہ دیا۔ اسی طرح جنگ کی شروعات سے کسی کو روکنا، کر دینا اور بعض قیدیوں کو خریدنے کے چھوڑ دینا ایک امیر کی زندگی میں محض ایک معمولی واقعہ ہے۔ مگر نبیؐ کی زندگی میں یہاں واقعہ اتنا اہم بن جاتا ہے کہ اس پر وحی جلی کے ذریعے سے تنبیہ کی جاتی ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اللہ کے نبی کی حیثیت عام امراء کی سی نہیں ہے کہ وہ اپنے اجتہاد پر عمل کرنے میں آزاد ہو۔ بلکہ منصب نبوت پر مامور ہونے کی وجہ سے نبیؐ کے لیے لازم ہے کہ اس کا اجتہاد بھی ٹھیک ٹھیک غناء الہی کے مطابق ہو۔ اگر وہ اپنے اجتہاد میں وحی غشی کے اشارے کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ کر مرضی الہی کے خلاف بال برابر بھی جنبش کرتا ہے تو اللہ وحی جلی سے اس کی اصلاح کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

نبیؐ کی راست روی مکمل طور پر قابل اعتماد ہے

اللہ نے اپنے نبیؐ کی اس خصوصیت کو ہمارے سامنے اسی لیے بیان فرمایا ہے کہ ہم کو اُس کے نبیؐ کی راست روی پر کامل اعتماد ہو اور ہم پورے وثوق کے ساتھ یقین رکھیں کہ نبیؐ کا قول اور عمل گراہی اور کج راہی اور اتباعِ ہوی اور بشری

فکر و راستے کی غلطیوں سے قطعاً محفوظ ہے۔ زندگی میں اس کا قدم مضبوطی کے ساتھ اس حوالہ مستقیم پر چاہتا ہے جو ٹھیک ٹھیک خدا کی بتائی جوتی ہے۔ اس کی سیرت پاک اسلامی سیرت کا ایک ایسا معیاری نمونہ ہے جس میں کسی نقص کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اور اللہ نے خاص طور پر اس کامل و مکمل نمونہ کو اسی لیے بنایا ہے کہ اس کے بندوں میں سے جو کوئی اس کا مقبول و محبوب بندہ بننا چاہے وہ بے خطر اس کی پیروی کرے۔ اس مقصد کو چھٹی اور ساتویں آیت میں کھول دیا گیا ہے چھٹی آیت میں فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے رسول اللہ میں ایک اُسوۂ حسنہ ہے، اور ساتویں آیت میں رسول اللہ کے اتباع کو محبوب الہی بننے کا واحد ذریعہ بتایا گیا ہے۔

نبی کی پوری زندگی اُسوۂ حسنہ ہے

یہاں پھر ہم کو کسی قسم کی تخیس و تھوید نظر نہیں آتی صریح تمہید و اطلاق ہے۔ رسول اللہ کی ذات کو مطلقاً اُسوۂ حسنہ بتایا گیا اور مطلقاً ہی آپ کے اتباع کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کا صحت مطلب یہ ہے کہ جس قدر زیادہ آپ کا اتباع کرو گے، اور اپنی زندگی میں سیرت پاک کا رنگ جتنا زیادہ پیدا کرو گے اتنا ہی تقرب تم کو بارگاہ الہی میں حاصل ہوگا اور حق تعالیٰ اتنا ہی تم کو پیارا کرے گا۔

دائرۂ استثناء

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو نمونہ قرار دینے اور آپ کے اتباع کا حکم دینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ تمام معاملات زندگی میں آپ نے جو کچھ کیا ہے، اور جس طرح کیا ہے، سب انسان بعینہ وہی فعل اسی طرح کریں اور اپنی زندگی میں آپ کی حیات طیبہ کی ایسی نقل اتاریں کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ رہے۔ یہ مقصد نہ قرآن کا ہے، نہ ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ ایک عام اور اجمالی حکم ہے جس پر عمل کرنے کی صحیح صورت ہم کو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریقہ سے معلوم ہو جاتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں، مجملہ میں عرض کرتا ہوں کہ جو امور خرافات و واجبات اور ارکان اسلام کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں تو حضور کے ارشادات کی اطاعت اور آپ کے عمل کی پیروی طابق التعل بالمثل کرنی ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور طہارت وغیرہ مسائل کہ ان میں جو کچھ آپ نے حکم دیا اور جس طرح خود عمل کر کے بتایا ہے، اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنی لازم ہے۔ رہے وہ امور جو اسلامی زندگی کی عام ہدایات سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً تمدنی، معاشی، اور سیاسی معاملات، اور معاشرت کے جزئیات، تو ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں آپ نے اخلاق اور حکمت اور ترائی کی تعلیم دی ہے، اور بعض ایسی ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ عمل کے مختلف طریقوں میں سے کونسا طریقہ توجہ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ پس اگر کوئی شخص ٹیکہ بندی کے ساتھ حضور کا اتباع کرنا چاہے اور اسی غرض سے آپ کی سنت کا مطالعہ کرے تو اس کے لیے یہ معلوم کرنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ کن امور میں آپ کا

ابتداء مطابق فعل بالمتعل ہونا چاہیے اور کن امور میں آپ کی سنت سے اخلاق و حکمت اور خیر و صلاح کے عام عمل مستنبط کرنے چاہئیں۔ مگر جن لوگوں کی طبیعت نزاع پسند واقع ہوتی ہے وہ اس میں طرح طرح کی توجہیں نکالتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی بولتے تھے تو کیا ہم بھی عربی بولیں؟ آپ نے عرب عورتوں سے شادیاں کیں تو کیا ہم بھی عربوں ہی میں شادیاں کریں؟ آپ ایک خاص وضع کا لباس پہنتے تھے تو کیا ہم بھی ویسا ہی لباس پہنیں؟ آپ ایک خاص قسم کی غذا کھاتے تھے تو کیا ہم بھی وہی غذا کھائیں؟ آپ کی معاشرت کا ایک خاص طریقہ تھا تو کیا ہم بھی بعینہ ویسی ہی معاشرت اختیار کریں؟ کاش یہ لوگ غور کرتے کہ اصل چیز وہ زبان نہیں ہے جو آپ بولتے تھے بلکہ وہ اخلاقی حدود ہیں جن کی پابندی کو حضور نے ہمیشہ کلام میں ملحوظ رکھا۔ اصل چیز یہ نہیں ہے کہ شادی عرب عورتوں سے کی جائے یا غیر عرب سے، بلکہ یہ ہے کہ جس عورت سے بھی کی جائے اس کے ساتھ ہمارا معاملہ کیسا ہو، اس کے حقوق ہم کس طرح ادا کریں، اور اپنے جائز شرعی اختیارات کو اس پر کس طرح استعمال کریں اس معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو برتاؤ اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ تھا اس سے بہتر نمونہ ایک مسلمان کی خانگی زندگی کے لیے اور کونسا ہو سکتا ہے؟ پھر یہ کس نے کہا کہ آپ جس وضع کا لباس پہنتے تھے وہ ایک شروع لباس ہے؟ اور جو کھانا آپ کھاتے تھے بعینہ وہی کھانا ہر مسلمان کو کھانا چاہیے؟ اس میں اتباع کے قابل جو چیز ہے وہ تو تقویٰ اور پاکیزگی کے وہ حدود ہیں جو آپ اپنے کھانے پینے اور پہننے اور سنانے میں ملحوظ رکھتے تھے۔ ان ہی حدود سے ہم کو معلوم ہو سکتا ہے کہ رہبانیت اور نفس پرستی کے درمیان جس معتدل روش کا ہم کو قرآن میں ایک مجمل سبق دیا گیا ہے اس پر ہم کس طرح عمل کریں کہ نہ تو طیبات سے ناروا اجتناب ہو اور نہ برائت یہی حال حضور کی پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے دوسرے تمام معاملات کا بھی ہے۔ وہ پاک زندگی پوری کی پوری ایک سچے اور خدا ترس مسلمان کی زندگی کا معیاری نمونہ تھی۔ حضرت عائشہ نے سچ فرمایا کہ کان مخلوقہ انقذت۔ اگر تم کو معلوم کرنا ہو کہ قرآن کی تعلیم اور اسپرٹ کے مطابق ایک مومن انسان کو دنیا میں کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے، تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھ لو جو اسلام خدا کی کتاب میں مجمل سچ وہی رسول خدا کی ذات میں تم کو مفصل نظر آئے گا۔

رسول ہمد وقت رسول ہے

الحمد للہ کہ تیسرے گروہ کے لوگ پہلے اور دوسرے گروہوں کے ہم خیال نہیں ہیں۔ مگر بعض احادیث سے ان کو یہ شبہ ہو گیا ہے کہ حضور ہر آن اور ہر حال میں رسول نہیں ہوتے تھے، اور آپ کا ہر قول اور ہر فعل بحیثیت رسول نہیں ہوتا تھا۔ یہ غلط فہمی جن روایات سے پیدا ہوتی ہے وہ دراصل ایک دوسری حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول ہی تھے، اور یہ شانیت



ہی تھی کہ آپ ہمیشہ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے تھے جس کے لیے آپ کو بھیجا گیا تھا۔ آپ کی مشیت کا مقصد یہ تو نہ تھا کہ لوگوں سے راستے اور عمل کی آزادی قطعاً سلب کر لیں اور ان کی عقل و فکر کو معطل کر دیں۔ نہ آپ دنیا کو زراعت اور صنعت و حرفت سکھانے آئے تھے۔ نہ آپ کو اس لیے بھیجا گیا تھا کہ لوگوں کے کاروبار اور ان کے فاقی معاملات میں ان کی رہنمائی فرمائیں۔

### اصل مقصد رسالت پر حضور کی توجیہ

آپ کی زندگی کا مقصد صرف ایک تھا اور وہ اسلام کو عقیدے کی حیثیت سے دلوں میں بٹھانا اور عمل کی حیثیت سے افراد کی سیرت اور سوسائٹی کے نظام میں نافذ کر دینا تھا۔ اس مقصد کے سوا دوسری کسی چیز کی طرف حضور نے کبھی توجیہ نہیں فرمائی۔ اور اگر شاذ و نادر کسی موقع پر کچھ فرمایا بھی تو صاف کہہ دیا کہ تم اپنی راستے اور عمل میں آزاد ہو، جس طرح چاہو کرو۔ اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِكُمْ دُنْيَاكُمْ۔ اگرچہ صحابہ کو آپ کے ہر ارشاد کو رسول کا ارشاد سمجھ کر بدل و جان اس کی اطاعت پر آمادہ تھے، اور آپ کو مطلقاً مطاع و متبوع سمجھتے تھے، اور اسی لیے جب کبھی حضور کسی دنیوی مسئلہ میں بھی کچھ ارشاد فرماتے تو صحابہ کو شدید گرتا تھا کہ شاید یہ حکم رسالت ہو۔ لیکن کبھی ایسا نہ ہوتا کہ آپ نے کسی ایسے مسئلے میں، جو آپ کے مقصد بعثت سے متعلق نہ تھا، حکم دیا جو اور انہیں اطاعت پر مجبور کیا ہو۔ ۲۳ سال کی قوت میں ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے مشن سے غافل نہ ہونا اور ہر آن اس باریک فرق کو ملحوظ رکھنا کہ کونسا معاملہ اس مشن سے تعلق رکھتا ہے، اور کون سا نہیں رکھتا، اور اپنے تابعین پر کامل اقدار رکھنے کے باوجود کبھی ان کو کسی غیر متعلق امر میں حکم نہ دینا، خود اس بات پر شاکہ ہے کہ نشان رسالت کسی وقت بھی حضور سے منقطع نہیں ہوتی تھی مگر یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ دنیوی معاملات میں جو کچھ حضور نے فرمایا وہ خدا کی وحی سے نہ تھا۔ اگرچہ آپ کے ایسے ارشادات آپ کے احکام نہیں ہیں، نہ آپ نے ان کو حکم کے انداز میں فرمایا، اور نہ کسی نے ان کو حکم سمجھا، مگر پھر بھی جو بات آپ کی زبان مبارک سے نکلی وہ سراسر حق تھی اور غلطی کا اس میں شائبہ تک نہ تھا۔ مثال کے طور پر طبی نبوی کے باب میں جو کچھ آپ سے ثابت ہے وہ ایسی ایسی حکیمانہ باتوں سے لبریز ہے جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ عرب کا اتنی جو طبیب نہ تھا، جس نے کسی فرق طب کی تحقیق نہ کی تھی، وہ کس طرح اس فن کی ان حقیقتوں تک پہنچا جو صدیوں کے تجربات کے بعد اب تک کشف ہو رہی ہیں۔ اس قسم کی سپیکٹروں میں شاید ہم کو حضور کے حکیمانہ ارشادات میں ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ باتیں تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں۔ مگر اللہ اپنے رسولوں کی جبلت میں جو غیر معمولی قوتیں ودیعت فرماتا ہے وہ صرف تبلیغ رسالت ہی کے لیے کام نہیں آتیں، بلکہ ہر معاملہ میں اپنی شان انبیاء دکھا کر رہتی ہیں۔ خدا دی اور نہ سازی کا تبلیغ رسالت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ مگر حضرت داؤد اس میں غیر معمولی کمال دکھاتے ہیں، اور حق تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ یہ فن ہم نے ان کو سکھایا تھا۔ وَهَلَلْنَا مَعْقِدًا لِّبَرٍّ لَّكُمُ الَّذِي نَحْنُ كَرِيمٌ يَا بَكْرُ (انبیاء: ۸۰)۔ پرندوں کی بولیاں بخشنا

سے تبلیغ رسالت کو کیا واسطہ؟ مگر حضرت سلیمانؑ اس میں کمال ظاہر فرماتے ہیں اور خود کہتے ہیں عَلَيْنَا مَطْلُوعُ النَّظِيرِ  
 (المفلح: ۱۶)۔ بخاری اور کئی ساری تبلیغ رسالت کا کرنا شعبہ ہے؛ مگر اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ سے یہ نہیں کہتا کہ ایک مضبوط  
 سہی کشتی بنالو، بلکہ فرماتا ہے، وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (ہود: ۳۷)  
 انبیاء کی زندگی کے دو شعبے

پس انبیاء کے حق میں یہ گمان کرنا صحیح نہیں کہ ان پر صرف وہی اُمور روجی کیسے گئے تھے جو براہ راست تبلیغ رسالت سے  
 تعلق رکھتے ہیں۔ وہ حقیقت ان کی ساری زندگی حق تعالیٰ کی ہدایت کے تابع تھی۔ البتہ اگر فرق ہے تو یہ کہ ان کی زندگی کا  
 ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ان کے قدم بقدم پیدا ہونے کے لیے ناگزیر شرط ہے۔ اور ایک شعبہ ایسا ہے جس میں  
 ان کا اتباع ہر مسلمان پر فرض نہیں، مگر جو شخص اللہ کا محبوب و مقبول بندہ بننا چاہتا ہو اور بارگاہ حق میں تقرب کا طلبگار  
 ہو، اس کے لیے بغیر اس کے چارہ نہیں کہ ٹھیک ٹھیک نبی کی سنت پر چلے، حتیٰ کہ اگر ایک سرٹو بھی اس خط سے  
 بٹے گا تو تقرب اور محبوبیت میں اسی انحراف کی حد تک کسر رہ جائے گی۔ اس لیے کہ محبوبیت کے لیے بجز اتباع  
 نبی کے اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں، فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ۔

### نبی کی امارت اور غیر نبی کی امارت کا فرق

اس بحث کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ نبی کی امارت اور دوسرے امیروں کی امارت میں کیا  
 فرق ہے اور نبی کے فیصلے اور دوسرے قاضیوں کے فیصلوں میں کتنا عظیم الشان تفاوت ہے۔ تاہم میں نے تین آئین  
 آخر میں ایسی نقل کی ہیں جن سے یہ فرق قطعی طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولؐ  
 اللہ کے حکم پر سرٹھکا دینا اور آپ کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ایمان کے لیے ضروری شرط ہے۔ جو اس سے انکار کرے  
 وہ مؤمن ہی نہیں۔ کیا یہ بات کسی دوسرے امیر یا قاضی کو حاصل ہے؛ اگر نہیں تو یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ اللہ  
 اور رسولؐ کے الفاظ ساتھ ساتھ قرآن میں جہاں جہاں آتے ہیں ان سے مراد امارت ہے۔ مجھے مولانا اعظم دہلوی  
 کے اسی قول پر اعتراض ہے اور میں اس کو قرآن مجید کی تعلیمات کے قطعاً خلاف سمجھتا ہوں۔ اولی الامر کی اطاعت  
 کا معاملہ تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اولی الامر کی اطاعت واجب ہے۔ اور  
 اولی الامر اسلامی حکومت کے وہ تمام فرائض انجام دیں گے جو رسولؐ اکرم اپنی حیات طیبہ میں انجام دیتے تھے،  
 اور معاملات میں اولی الامر کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوگا، حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اپنی دانست میں ان کے فیصلہ کو کلم  
 خدا اور رسولؐ کے خلاف بھی سمجھتا ہو تب بھی ایک حد تک اس کے لیے لازم ہوگا کہ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے  
 ان کے فیصلوں کو تسلیم کرے۔ لیکن اس کے یہ معنی کبھی نہیں ہو سکتے کہ امارت بعینہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں  
 اللہ اور رسولؐ کہا گیا ہے، اور امارت کے احکام ہو جو وہی ہیں جو اللہ اور رسولؐ کے احکام ہیں۔ اگر اس

تو انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اور اسبابِ حمل کو تندر کے کتابیب و شہادت سے مخبرت ہو رہا ہے کی صورت میں مشعل انہوں کے لیے کوئی چارہ آتے کی اطلاع کرتے کرتے اور اور بیا کرتے کہ ماہستوں میں ان کی پیروی کرنے کے سو اباقی نہ رہے گا۔  
 ایسی صورت میں اگر کوئی خیرۃ خدا اٹھے اور مشعل کی طوطی بھرتا کرنے کی کیا کرے تو مولانا اسلم جبریل لوری کے فتوے کی توجہ سے تو ظالم آمر اور اس خیرۃ خدا کو باقی قرار دے کر قتل کر دیتے ہیں بالکل حق بجانب قرار دینگے اور ان کو یہ کہنے کا حق ہو گا کہ اللہ اور رسولؐ تو ہم ہی ہیں، دوستوں کو ایسے جس کی طوطی تو ہم کو بھیزنا چاہتا ہے۔

# رسول کی حیثیت شخصی و حیثیت نبوی کا جائزہ

میرے دو مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع و اطاعت رسول" کا عربی ترجمہ دمشق کے رسالہ "المسلمون" میں شائع ہوا تھا۔ اس پر شام کے اہل علم حضرات نے مجھ کو توجیہ دلائی کہ ان دونوں مضامین میں کچھ تعارض محسوس ہوتا ہے جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے۔ نیز دمشق کے ایک صاحب نے مقدم الذکر مضمون پر حسب ذیل اعتراض بھی کیا۔

۱۔ کیا محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام باعتبار انسان ہمارے اندر ایک عام فرد کی حیثیت رکھتے ہیں؟ اور انسانی انسان ان کے اندر بھی ایسی ذاتی خواہشات پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر وہ لوگوں پر اپنی ذاتی غفلت کا سکہ جاتا ہے؟ اور اپنے شخصی اقتدار کے پتے میں جکڑی ہے؟ اگر یہ صورت ہے تو آپ کا بحیثیت نبی معصوم ہونا اور بحیثیت انسان محفوظ ہونا پر معنی دار ہے؟ آپ کی اس زندگی کی تفصیلات کیا فائدہ رکھتی ہیں جب کہ آپ انسان تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو منسب رسالت پر سرفراز نہیں فرمایا تھا؟ اور کیا رسول ہونے کے بعد آپ کی یہ حقیقی حیثیت بشری اور حیثیت نبوی یکجا ہو گئی ہیں؟ یا الگ الگ ہیں؟ اور کیا ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے؟ تاکہ محمد الرسول کی اطاعت کی جائے اور محمد الانسان کی مخالفت میں ہم آزاد ہوں؟ کیا اس تفریق کے لیے کوئی قاعدہ کلیہ موجود ہے جس کی روشنی میں ہم آپ کے انسانی کلام جس سے اختلاف کا ہر حق ہے۔ اور نبوی کلام جس سے جو واجب اطاعت ہے۔ کے درمیان خط امتیاز کھینچ سکیں؟

کیا نبی کی ذاتی راستے سے اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے؟ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے اندر یہ روح بھونکتے تھے کہ بحیثیت انسان ان کی اطاعت واجب نہیں ہے؟ بلکہ اپنی ذاتی راستے سے اختلاف کرنے میں ان کی بہت افزائی کرتے تھے؟ نیز کیا یہ درست ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے

اسی محبت اور دلیل کی بنا پر آپ سے بحیثیت انسان اختلاف کیا تھا۔ . . . ؟

ذیل کا مضمون انہی اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

"المسلمون" جلد ششم، شمارہ ۶، ۷ اور ۸ میں میرے جو مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع و

اطاعتِ رسولؐ کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں، ان کے متعلق مجھے توجہ دلائی گئی ہے کہ ان میں ناقص محسوس ہوتا ہے جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے یعنی پہلے مضمون میں تو کہا گیا ہے کہ نبیؐ کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبویؐ الگ الگ ہیں اور اسلام کی دعوت صرف حیثیتِ نبویؐ کی اطاعت کی طرف ہے نہ کہ حیثیتِ شخصی کی اطاعت کی طرف۔ لیکن دوسرے مضمون میں اس بات سے انکار کیا گیا ہے کہ نبیؐ کی دو حیثیتیں الگ الگ ہیں اور پورے اسرار کے ساتھ کہا گیا ہے کہ نبیؐ کی ایک ہی حیثیت تھی اور وہ تھی صرف نبیؐ ہونے کی حیثیت۔ ان دونوں باتوں میں توفیق و تطبیق کی کیا ضرورت ہے؟ علاوہ بریں میرے پہلے مضمون آزادوی کا اسلامی تصورِ نبردِ مشرق سے ایک حساب لے کر کہ سرالوات کیسے ہیں، جو السلوٰں کے شمارہ ۷ میں درج ہوتے ہیں اور جنہیں اوپر نقل کیا گیا ہے۔

یہ دونوں اعتراضات چونکہ ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ایک ہی مختصر مضمون میں ان کا

جواب دے رہا ہوں۔

دراصل اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری، اس اعتبار سے کہ حیثیتِ نفس الامری کیا ہے؟ دوسرے عملی اس لحاظ سے کہ جہاں تک نبیؐ کی ذات سے ہدایت اخذ کرنے کا تعلق ہے، آیا وہ ہمارے لیے پورا کا پورا نبیؐ اور صرف نبیؐ ہی ہے، یا ہم اس شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے صرف اس کی حیثیتِ نبویؐ کا اتباع اور اسی کی اطاعت کریں گے اور حیثیتِ شخصی کو چھوڑ دیں گے؟

بحث کا نظری پہلو

اب پہلے نظری پہلو کو سمجھیے۔ فرقان مجید اس معاملہ میں بالکل واضح ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبویؐ میں فرق ہے۔ وہ انسانوں کو اپنا بندہ بنانے کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بنانے کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ مَا كَانِ يَشْعُرُ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَ وَالنُّبُوَّةَ لِيَتَّبِعُونَ لِتَأْمُرُوا بِالْعَدْلِ وَنَهَىٰ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَنَّ يَتَّقُوا وَاللَّهُ يَتَّبِعُ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۷۹﴾ اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ پتھر ربانی نبوتہ (آل عمران آیت ۱۷۹) ان کے سپرد دو فریضے ایک ساتھ کیے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ لوگوں کو بر غیر اللہ کی بندگی سے نکالیں، جس میں دوسری سب مخلوقات کے ساتھ ان کی اپنی ذات بھی شامل تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کو صرف ایک اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔

ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا اور پیغام دے کر	وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا آتِ
کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاعت سے الگ رہو۔	الرُّسُلَ وَاللَّهُ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ۔ (راہل ۱۷۹)
اے نبیؐ کہو کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات	قُلْ يَا هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْغَالِبِ إِذَا جَاءَهُ سُوْرٌ
کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان کیسا ہے	بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ إِلَّا تَعْبَادُ اللَّهِ وَلَا تُشْرِكُ

بِه شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذُ بَعْضُنَا لِبَعْضٍ أَرْبَابًا مِمَّنْ  
 ذُكِرَ النَّاسُ - رَوَاهُ إِبْرَاهِيمُ (ص ۱۶)

یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کہ  
 شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی  
 کو اپنا رب بنائے۔

دین میں ان کی بے چون و چرا اطاعت کا جو حکم دیا گیا ہے وہ ان کے ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس بنا پر تھا  
 کہ رسول ہی وہ شخص ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی مرضی ظاہر فرماتا اور اپنے احکام بھیجتا ہے اسی  
 وجہ سے رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت قرار دی گئی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ وَالنَّسَاءُ ۶۴ ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ  
 اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے اور مَنْ طُيعَ الرَّسُولَ فَقَدْ طَاعَ اللَّهَ جن نے رسول کی اطاعت  
 کی اس نے اللہ کی اطاعت کی (النساء ۸۰)۔

اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی قرآن اور کثرت احادیث سے ثابت ہے کہ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 اللہ کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی رائے سے کی یا کبھی ہے اس میں بے چون و چرا اطاعت کا وہ مطالبہ آپ نے کبھی نہیں کیا جو  
 امر الہی کے تحت کوئی کام کرنے یا کوئی بات کہنے کی صورت میں کیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں نے اپنے مضامین  
 "آزادی کا اسلامی تصور" میں پیش کی ہیں۔ خصوصاً حضرت زینب کا حضور کے منع فرمانے کے باوجود سیدہ زینب رضی اللہ  
 عنہا کو طلاق دینا اور اللہ اور اس کے رسول کا ان پر کوئی نگیں نہ کرنا تو اس کی صریح مثال ہے جس کی کوئی توجیہ اس کے سوا  
 نہیں کی جاسکتی جو میں نے اس ضمن میں کی ہے۔ اور تا پیر نخل والے معاملے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے کو بالکل  
 صریح فرمایا ہے :-

انما انا بشر اذا امرتكم بشي من	میں بھی ایک انسان ہی ہوں، جب میں تم کو تمہارے
ديكم فخذوا به واذا امرتكم بشي من	دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانو اور جب میں
رائي فانما انا بشور - انما ظننت خطأ	اپنی رائے سے کچھ کہوں، تو بس میں بھی ایک انسان
فلا تقواخذوني بالظن ولكن اذا احدثتكم	ہی ہوں۔ میں نے اندازہ سے ایک بات کہی تھی۔
من الله شيئاً فخذوا به فانى لهما كذب	تم میری ان باتوں کو نہ لوجو گمان اور راستے پر مبنی ہونے
على الله - انتم اعلم بما هو ديتيا كهر	ہاں جب میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اس
رصعيم مسلم باب امتثال ما قاله شرعا دون	کو نہ لو۔ اس لیے کہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں بولنا
ما ذكره صلى الله عليه وسلم من معاليش	سے تمہیں اپنے ذمہ داری معاملات کا زیادہ علم ہے۔

الدنيا على سبيل الراي

یہ تو بے نظری اور اصولی فرق۔ اب اس کے عملی پہلو کر لیجیے۔

### بحث کا عملی پہلو

در اصل یہ ایک نازک اور پیچیدہ معاملہ تھا کہ ایک بشر کو اللہ تعالیٰ اپنا واحد نمائندہ بنا کر انسانوں کے درمیان اس دوسری خدمت پر مامور فرمائے کہ ایک طرف تو وہ بشر اپنے اہلخانے فرخ کو اپنی شخصیت سمیت تمام مخلوقات کی بندگی سے آزاد کرے اور خود اس آزادی کی انہیں تربیت دے، اور دوسری طرف وہی بشر ان سے اللہ کی شکل، بے چون و چرا اطاعت کرائے، اور اس اطاعت کا مرجع بھی تمام عملی اغراض کے لیے اس بشر کی اپنی ہی ذات میں حیشۃ الرسول ہو۔ یہ دو متضاد کام ایک ہی شخص کو بیک وقت کرنے تھے اور ان کے حدود ایک دوسرے کے ساتھ اتنے گٹھے بستے تھے کہ خود اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا کوئی دوسرا ان کے درمیان خطا یا تیار نہ کھینچ سکتا تھا۔

اس معاملہ کی نزاکت اور پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے جب ہم من باتوں پر غور کرتے ہیں:

آدل یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت احکام الہی کے تحت اپنی اطاعت کراتے تھے اُس وقت تو خدا بری ہے کہ آپ ایک وظیفہ رسالت انجام دیتے تھے۔ مگر جس وقت آپ اپنے انتہائی اطاعت گزار قبیلین کو خود اپنی ذات کی ذہنی غلامی سے آزاد کر کے تحریرِ فکر و ارستے کی تربیت دیتے تھے، جب آپ اپنی شخصی آراء کے مقابلے میں ہمت دلا کر تمام انسانوں کو خود اپنے سامنے استقلالِ فکر ترنا سکھاتے تھے کہ یہاں تم آزاد ہو اور یہاں تمہارے لیے سچ و اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، اس وقت بھی آپ دراصل وظیفہ رسالت ہی کا ایک حصہ اور فرخ تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے لیے آپ کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی کے فرق کو سمجھنا اور مٹا دینا یشتیر میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے اس طرح علیٰ غلی نظر آتی ہیں کہ ان کے درمیان صرف نظری فرق رہ جاتا ہے۔ عملاً اپنی شخصی حیثیت میں بھی کام کرتے وقت آپ نبوت ہی کا ایک کام کرتے پاتے جاتے ہیں۔

ثانیاً، جو معاملات بطور بالکل شخصی معاملات ہیں، مثلاً ایک انسان کا کھانا پینا، کپڑے پہننا، کھانا کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، گھر کا کام کاج کرنا، غسل و طہارت اور دفع حاجت وغیرہ، وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں خاص نبی نوعیت کے معاملات نہیں ہیں، بلکہ انہی میں شرعی حدود اور طریقوں اور آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ شامل ہے اور آدمی کے لیے خود یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں کہاں حیثیت رسالت ختم ہوتی ہے اور کہاں حیثیت شخصی شروع ہو جاتی ہے۔

ثالثاً، قرآن مجید میں بتاتا ہے کہ نبی کی ذات بحیثیت نبوی ایک اسوہ ہے جس کا ہر سبب اور ہر شرح ہمیں ہدایت کی روشنی دینا ہے، اور اس ذات کا کوئی فعل اور قول بھی جو اسے نفس یا استقلال و خواہش سے ذرہ برابر بھی

آکر وہ نہیں ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ

حَسَنَةٌ (الاحزاب: ۲۱)

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَمْرُنَاكَ شَاهِدًا  
وَمَا نَسْتَشِرُكَ وَنَذِيرًا وَذَاعِبًا إِلَى اللَّهِ بِأَذْنِهِ

وَسِرًا جَانِبًا (الاحزاب: ۲۶-۲۵)

تمہارے لیے اللہ کے رسولؐ میں بہترین اُسوہ  
ہے۔

آسے نبیؐ نے تمہیں (لوگوں کے لیے) گواہ اور  
بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور اس کے  
اذن سے اللہ کی طرف بلانے والا اور اللہ سے پراغ  
بنایا ہے۔

مَا مَسَّلَ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنْطِقُ

عَنِ النَّهْأَىٰ، إِنَّ هُوَ إِلَّا وَجْهُ يُوحَىٰ

(النجم: ۳۱، ۳۰)

تمہارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بہ راہ  
ہوئے نہ گمراہ ہوا۔ اور جو کچھ وہ کہتا ہے ہونے لگتا  
کی بنا پر نہیں کہتا۔ اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وہی جو  
اس پر نازل کی جاتی ہے۔

ان دو جہ سے نہ تو علم ہمارے لیے یہ ممکن ہے اور نہ شرعاً ہم اس کے مجاز ہیں کہ بطور خود نبی کی حیثیت شخصی اور  
حیثیت نبوی میں فرق کریں، اور آپ ہی آپ اس کے حدود متعین کر لیں، اور خود ہی یہ بھی طے کر لیں کہ فلاں گمراہ  
آپ کی حیثیت نبوی کے تحت تھے جن میں ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور فلاں شخصی حیثیت میں تھے جن میں ہم  
آپ کے اتباع اور اطاعت سے آزاد ہیں۔ اس فرق کے معلوم ہونے کا ذریعہ یا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم کی کوئی تصریح ہو سکتی ہے، یا پھر وہ اصول شریعت جو آپ ہی کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوں۔

چند قابل غور مثالیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ صحابہ کرام اپنی ذاتی راستے ظاہر کرنے  
سے پہلے آپ سے دریافت کر لیتے تھے کہ آپ کا ارشاد یا عمل حکم الہی کی بنا پر ہے یا اپنی ذاتی راستے پر۔ اور جب  
معلوم ہوتا کہ یہ آپ کی ذاتی راستے سے ہے تب وہ اپنی بات عرض کرتے تھے۔ چنانچہ غزوہ بدر میں حضرت  
حباب بن المنذر نے اپنی راستے پیش کرنے سے پہلے پوچھ لیا تھا کہ اس مقام کا انتخاب وحی کے ذریعے سے  
کیا گیا ہے جس سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، یا یہ محض ایک تدبیر جنگ کے طور پر  
ہے؟ اسی طرح غزوہ خندق میں حضرت سعد بن معاذ نے بنی غطفان سے صلح کی تدبیر پر اظہارِ راستے کرنے سے پہلے  
دریافت کر لیا کہ آسے اللہ کے رسولؐ! کیا یہ ارادہ وحی کی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ اس میں ہمارے لیے مجالِ کلام  
نہیں ہے، یا حضور صرف اپنی راستے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں؟



اور بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی یہ ظاہر فرما دیتے کہ قلال بات آپ اللہ کی طرف سے ایک حکم دین کے طور پر نہیں فرما رہے ہیں، بلکہ اپنی شخصی رائے ظاہر فرما رہے ہیں، جیسا کہ اوپر تاہمیر غل کے معاملہ میں حضور کے ارشادات گزر چکے ہیں۔

اور بعض اوقات معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہوتی تھی جس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حضور کا ارشاد اپنی شخصی حیثیت میں ہے۔ مثلاً حضرت زینب سے آپ کا فرمانا کہ اَمْسِكْ هَلِيكَ رَوْحَكَ وَ اَتَّقِ اللّٰهَ اپنی جبری کو طلاق نہ دو اور اللہ سے ڈرو۔ اس ارشاد کے متعلق یہ بات ظاہر تھی کہ یہ ایک مومن کو نبی کا حکم شرعی نہ تھا بلکہ ایک خاندان کے فرد کو بزرگ خاندان کا مشورہ تھا۔ اسی وجہ سے حضرت زینب نے حضور کے ارشاد کے باوجود حضرت زینب کو طلاق دی اور اللہ اور اس کے رسول کے اس پر کوئی نیکہ نہ کرنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت زینب نے آپ کے فرمان کی نوعیت ٹھیک شخص کی تھی۔

### ذوہر یا بعد میں حیثیت نبویہ کے تعین کی صورت

یہ تو وہ مثالیں ہیں جو حضور کی حیاتِ بطریقہ میں پیش آئی تھیں۔ ان کے علاوہ متعدد معاملات ایسے ہیں جن میں اب بھی اصولِ شریعت کی روشنی میں اس فرق کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً حضور کے لباس اور آپ کے کھانے کے معاملہ کو دیکھیے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آپ خاص وضع اور قطع کا لباس پہنتے تھے جو عرب میں اُس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپ کے شخصی ذوق کا دخل بھی تھا۔ اسی طرح آپ وہی کھانے کھاتے تھے جیسے آپ کے بعد میں اہل عرب کے گھروں میں پکتے تھے اور اُن کے انتخاب میں آپ کے اپنے ذوق کا بھی دخل ہوتا تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ اس کھانے اور پہننے میں آپ اپنے عمل اور قول سے شریعت کے حدود اور اسلامی آداب کی تعلیم دیتے تھے۔ اب یہ بات خود حضور ہی کے سکھاتے ہوئے اصولِ شریعت سے ہم کو معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے پہل چیز آپ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری چیز حیثیتِ نبویہ سے۔ اس لیے کہ شریعت نے جس کی تعلیم دینے کے لیے آپ اللہ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے، انسانی زندگی کے اس معاملہ کو اپنے دائرہ میں نہیں لیا ہے کہ لوگ اپنے لباس کس نمائش نمائش اور وضع قطع پر سوار ہوں اور اپنے کھانے کس طرح پکائیں، البتہ اس نے یہ چیز اپنے دائرہ عمل میں لی ہے کہ کھانے اور پہننے کے معاملے میں حرام اور حلال، جائز اور ناجائز کے حدود و معین کرے اور لوگوں کو ان آداب کی تعلیم دے جو اہل ایمان کے اخلاق و تہذیب سے مناسبت رکھتے ہیں۔

یہ فرق ہم کو حضور کی کسی تصریح سے معلوم ہو یا آپ کے سکھاتے ہوئے اصولِ شریعت سے، بہر حال اس کے علم کا ذریعہ نبی کی تعلیم ہی ہے۔ گریبا ہم آپ کی حیثیتِ شخصیت کے کام کو متعین کرنے کے لیے بھی آپ ہی کی حیثیتِ نبویہ کی طرف رجوع کریں گے۔ حیثیتِ شخصیت سے براہِ راست ہمارا کوئی معاملہ نہیں ہے جو آپ کی حیثیتِ نبویہ کو نظر انداز کر کے

ہم کہہ سکتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس میں پوچھنے والے اپنے دوسرے سنہنوں اتباع و اطاعت میں کوئی شک نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہم  
 ان کی بنیادی غلطی پہنچتے کہ وہ مکہ میں عبد اللہ یا تنباہ رسول اور مکہ میں عبد اللہ یا تنباہ انسان میں خود تفریق کر کے ان دونوں  
 حیثیتوں کے کاموں میں ایک خطا امتیاز کی طرح دیتے ہیں۔ آپ کی زندگی کے میں دائرے سے کہ وہ خود آپ کی حیثیت پر  
 سے آگے بڑھتے ہیں اس کے اتباع و اطاعت سے خود ہی انہوں نے آزادی اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ  
 علیہ وسلم کی شخصی اور زوجی حیثیتوں میں تفہیمت کے اعتبار سے جزیق بھی ہے وہ خدا اللہ اور خدا رسول ہے اور  
 ہمیں اس سے صرف اس لیے آگے کی کیا ہے کہ ہم میں تشبیہ کی گواہی میں مقابلاً جو کہ مکہ میں عبد اللہ کو اللہ کے ہوتے  
 سلسلے حقیقت پر سمجھ سکیں۔ لیکن امت کے لیے لازم آتا ہے کہ ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے رسول ہونے کی حیثیت  
 جنی کہ مکہ میں عبد اللہ کے مقابلے میں آگے ہم کو آزادی حاصل کی ہوئی ہے۔ تو وہ مکہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
 علاقہ کرنے سے ہوتی ہے۔ اور مکہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اس کے حضور و متبعین کرتے ہیں اور اس آزادی کے  
 استعمال کی ترتیب یہ بھی ہم کو رسول اللہ ہی سے ہی ہے۔

ان توضیحات کے بعد اگر میرے دونوں مضمونوں کو ملاحظہ کیا جائے تو کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہ سکتی۔ ۱۹۷۹

# منصب نبوت اور اس کے فرائض از روئے قرآن

رسول کے چار شعبہ ہائے کار

اس کتاب پاک میں چار مقامات پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کی یہ تفصیل بیان کی گئی ہے:

اور یاد رکھو جبکہ ابراہیم اور اسماعیل اس گھر رکھیں،  
 کی بیباویں اٹھا رہے تھے (اور انہوں نے دعا کی) اے  
 ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں خود انہی کے اندر سے  
 ایک رسول مبعوث فرما جو انہیں تیری آیات پڑھ کر  
 مناسحتے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور  
 ان کا تزکیہ کرے۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ  
 وَإِسْمَاعِيلُ ... رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ  
 رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ  
 الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ۔  
 (البقرہ: ۱۲۹)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہی میں سے ایک  
 رسول بھیجا جو تم کو ہمارے آیات پڑھ کر سناتا ہے  
 اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب و حکمت کی  
 تعلیم دیتا ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو  
 تم نہیں جانتے تھے۔

لَمَّا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو  
 عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ  
 وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔  
 (البقرہ: ۱۵۱)

اللہ نے ایمان لانے والوں پر انسان فرمایا جبکہ ان کے  
 اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں  
 اُس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا  
 ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

فَقَدَرْنَا لَكُمْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثْنَا  
 فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو  
 عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيهِمْ وَنُعَلِّمُهُمُ  
 الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔ (آء عمران- ۱۶۴)

یہ مضمون مشرکین و مشرکات کے اعتقادات و تشبیہات کو رد فرماتے ہوئے لکھا گیا تھا۔ انہیں  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا  
مِّنْهُمْ لَتَلْقَا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيَهُمْ  
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ -  
(المحمد ٥٢)

یہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہی میں سے  
ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر  
سنتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و  
حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں بار بار جس بات کو تباہید و تباہی لکھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف آیات نکران ہی  
سنادینے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے۔  
ایک یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں۔

دوسرے یہ کہ اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں  
اور تیسرے یہ کہ آپ افراد کا بھی اذہان کی اجتماعی بصیرت کا بھی تزکیہ کریں یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور  
اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہترین نظام اجتماعی کو نشوونما دیں

ظاہر ہے کہ کتاب اور حکمت کی تعلیم صرف قرآن کے الفاظ سنادینے سے نرا نہیں کوئی چیز تھی ورنہ اس کا الگ  
ذکر ہی معنی تھا۔ اسی طرح افراد اور معاشرے کی تربیت کے لیے آپ جو تدریس بھی اختیار فرماتے تھے وہ بھی قرآن کے  
الفاظ پڑھ کر سنادینے سے نرا نہیں کچھ تھیں، ورنہ تربیت کی الگ خدمت کا ذکر کرنے کے کوئی معنی نہ تھے اب فرمائیے  
کہ قرآن پہنچانے کے علاوہ یہ معلم اور مربی کے مناسب جو حضور کو حاصل تھے ان پر آپ خود فائز ہو گئے تھے یا اللہ تعالیٰ  
نے آپ کو ان پر مامور فرمایا تھا؟ کیا قرآن کی ان صاف اور مکرر نصیحت کے بعد اس کتاب پر ایمان رکھنے والا  
کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ دونوں مناسب رسالت کے اجزاء نہ تھے اور ان نذرت علی اللہ علیہ  
وسلم ان مناسب کے فرائض اور خدمات ہمیشہ رسول نہیں بلکہ اپنی پرائیویٹ حیثیت میں انجام دیتے تھے؟ اگر  
نہیں کہہ سکتا تو بتائیے کہ قرآن کے الفاظ سنانے سے زائد جو باقی مقصود نے تعلیم کتاب و حکمت کے سلسلے میں فرمائی  
اور اپنے قول و عمل سے افراد اور معاشرہ کی جو تربیت حضور نے کی اسے من جانتی اللہ جانتے اور سند تسلیم کرنے سے

انکار خود رسالت کا انکار نہیں تو اور کیا ہے؟

رسول بحیثیت شارح کتاب اللہ

سورہ نمل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ

مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ - (آیت ٤٤)

اور (اُسے نبی) اب ذکر ہم نے تمہاری طرف اس  
یے نازل کیا ہے کہ تم لوگوں کے لیے واضح کرو گے  
تعلیم کو جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو یہ خدمت کی گئی تھی کہ قرآن میں نازل ہونے والے احکام و ہدایات سے ان کی آپ تفسیر و تشریح فرمائیں۔ ایک مولیٰ ہی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ سکتا ہے کہ کسی بات کی تشریح اور توضیح محض اس کتاب کے الفاظ پر محدود کرنا و پیشہ سے نہیں ہوتی بلکہ تشریح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد کچھ کہتا ہے تاکہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے، اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی مسئلے سے متعلق ہو تو شارح عملی مظاہرہ **Practical Demonstration** کر کے

بتاتا ہے کہ مصنف کا غشا اس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ نہ ہو، تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و مدعا پر غصے و اسے کو بھرا کتاب ہی کے الفاظ سنا دینا کسی عقلی محنت کے نزدیک بھی تشریح و توضیح قرار نہیں پاسکتا۔ اب فرمائیے کہ اس آیت کی رو سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے شارح اپنی ذاتی حیثیت میں تھے یا خدا نے آپ کو شارح مقرر کیا تھا؟ یہاں تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر کتاب نازل کرنے کا مقصد ہی یہ بیان کر رہا ہے کہ رسول کو اپنے قول اور عمل سے اس کا مطلب واضح کرنے پھر کس طرح یہ ممکن ہے کہ شارح قرآن کی حیثیت سے آپ کے منصب کو رسالت کے منصب سے الگ قرار دیا جائے؟ اور آپ کے پہنچاتے ہوئے قرآن کو لے کر آپ کی شرح و تفسیر قبول کرنے سے انکار کر دیا جائے؟ کیا یہ انکار خود رسالت کا انکار نہ ہوگا؟

یہ آیت جس طرح ان منکرین نبوت کی محنت کے لیے قاطع تھی جو خدا کا ذکر تشریح کے ذریعہ سے آنے کو نہیں مانتے تھے اسی طرح آج یہ ان منکرین حدیث کی محنت کے لیے بھی قاطع ہے جو نبی کی تشریح و توضیح کے بغیر صرف ”ذکر“ کرنے لینا چاہتے ہیں۔ وہ خواہ اس بات کے قائل ہوں کہ نبی نے تشریح و توضیح کچھ بھی نہیں کی تھی صرف ”ذکر“ پیش کر دیا تھا، یا اس کے قائل ہوں کہ ماننے کے لائق صرف ”ذکر“ ہے نہ کہ نبی کی تشریح، یا اس کے قائل ہوں کہ اب ہمارے لیے صرف ذکر کافی ہے، نبی کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں، یا اس بات کے قائل ہوں کہ اب صرف ذکر ہی قابل اعتماد حالت میں باقی رہ گیا ہے نبی کی تشریح یا تو باقی ہی نہیں رہی یا باقی ہے بھی تو خبر دوسرے کے لائق نہیں ہے، غرض ان چاروں باتوں میں سے جس بات کے بھی وہ قائل ہوں ان کا مسک بہر حال قرآن کی اس آیت سے ٹکراتا ہے۔ اگر وہ پہلی بات کے قائل ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی نے اس غشا ہی کو فرست کر دیا جس کی خاطر ذکر فرستوں کے ہاتھ بچیں یا براہ راست لوگوں تک پہنچا دینے کے بجائے اسے واسطہ تبلیغ بنایا گیا تھا۔

اور اگر وہ چوتھی بات کے قائل ہیں تو دراصل یہ قرآن اور نبوت محمدی، دونوں کے نسخ کا اعلان ہے جس کے بعد اگر کوئی مسکب معقول باقی رہ جاتا ہے تو وہ صرف ان لوگوں کا مسک ہے جو ایک نئی نبوت اور نبی وحی کے قائل ہیں۔ اس لیے کہ آیت میں اللہ تعالیٰ خود قرآن مجید کے مقصد نزول کی تکمیل کے لیے نبی کی تشریح کو ناگزیر ٹھہرا رہا ہے اور نبی کی ضرورت ہی اس طرح ثابت کر رہا ہے کہ وہ ذکر کے غشا کی توضیح کرے۔ اب اگر منکرین حدیث کا یہ

قول صحیح ہے کہ نبی کی توحیح و تشریح دنیا میں باقی نہیں رہی ہے تو اس کے دو نتیجے کھٹے برستے ہیں پہلا نتیجہ یہ کہ نمونہ تمام کی حیثیت سے نبوت محمدی ختم ہو گئی اور سب سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اسی طرح کا وہ گیا ہے جیسا نبوت اور صلح اور شعیب علیہم السلام کے ساتھ ہے کہ ہم ان کی تصدیق تو کرتے ہیں، ان پر ایمان بھی لاتے ہیں، مگر ان کا کوئی اُسوہ ہمارے پاس نہیں ہے جس کا ہم اتباع کریں۔ یہ چیز نئی نبوت کی ضرورت آپ سے آپ پیدا کر رہی ہے۔ صرف ایک بے وقوف ہی اس کے بغیر ختم نبوت پر امر کر سکتا ہے۔

دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اکیلا قرآن چونکہ نبی کی تشریح و تفسیر کے بغیر خود اپنے بھیجنے والے کے قول کے مطابق ہدایت کے لیے ناکافی ہے، اس لیے قرآن کے ماننے والے خواہ کتنے ہی زور سے چیخ مچا کر اسے بجائے خود کافی قرار دیں، تاہی سست کی حمایت میں گویا ان حقیقت کی بات ہرگز نہیں چلی سکتی اور ایک نئی کتاب کے نزول کی ضرورت آپ سے آپ خود قرآن کی رو سے ثابت ہو جاتی ہے۔ فانظر عند اللہ! اس طرح یہ لوگ حقیقت میں انکارِ حدیث کے ذریعے اپنی کی بڑھکھوڑ رہے ہیں۔

### رسولِ بحیثیت پیشوا اور نمونہ تقلید

سورۃ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ إِن كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ اللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ  
 قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ فَإِن كُنْتُمْ تَحِبُّونَ اللَّهُ لَئِن لَّيُخَفِّرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ  
 (آیات ۳۱-۳۲)

اُسے نبی کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کر لگا... کہو کہ اطاعت کرو اللہ اور رسول کی، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کا فرود کر پسند نہیں کرنا۔

اور سورۃ احزاب میں فرماتا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُوا اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَاتَّبَعَ  
 (آیت ۲۰)

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک نمونہ تقلید ہے ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر کا امیدوار ہے۔

ان دونوں آیتوں میں خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو پیشوا مقرر کر رہا ہے، ان کی پیروی کا حکم دے رہا ہے ان کی زندگی کو نمونہ تقلید قرار دے رہا ہے، اور صاف فرما رہا ہے کہ یہ روش اختیار نہ کرو گے تو مجھ سے کوئی امید نہ رکھو۔ میری محبت اس کے بغیر نہیں حاصل نہیں ہو سکتی، بلکہ اس سے منہ موڑنا کفر ہے۔ اب فرمائیے کہ حضورؐ رہنما اور پیڑ خود بن بیٹھے تھے، یا مسلمانوں نے آپ کو منتخب کیا تھا؟ یا اللہ نے اس منصب پر آپ کو مقرر کیا تھا؟ اگر قرآن کے یہ الفاظ بالکل غیر مشتبہ طریقے سے آنحضرتؐ کو مقرر کیا تھا اور اللہ نے آپ کو مقرر کیا تھا، اور آپ کے نمونہ زندگی کی تقلید سے انکار کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اس کے جواب میں یہ کہنا سراسر لغو ہے کہ اس سے مراد قرآن کی پیروی ہے۔

اگر یہ مراد ہوتی تو قَاتِلُوا الْقُرْآنَ فرمایا جانا کہ قَاتِلُوا یعنی اور اس معورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو اُسوۂ حسنہ کہنے کے تو کوئی معنی ہی نہیں تھے۔

### رسول بحیثیت شاریع

سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

يَا مَعْزُومًا بِالْمَعْرُوفِ وَيُنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ  
وَجَلَّ لَقَمًا الطَّيِّبَاتِ وَ يُجَيِّدُ مَرْغَبِكُمْ  
الْحَبِيبَاتِ وَيَقْعَمُ عَنْهُمْ إِهْرَاسَهُمْ وَالْأَفْئَلِ  
الَّتِي كَانَتْ عَلَيْكُمْ - (آیت: ۱۵۷)

وہ ان کو معروض کا حکم دیتا ہے اور منکر سے ان کو روکتا ہے اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور نیند چھینتا رہتا ہے جو ان پر پڑھے ہوئے تھے۔

اس آیت کے الفاظ اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شرعی اختیارات (Legislative Powers) عطا کیے ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام یا حلال قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضور نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے وہ بھی اللہ کے دینے ہوئے اختیارات سے ہے، اس لیے وہ بھی قانونِ خداوندی کا ایک حصہ ہے۔ یہی بات سورۃ عنکبوت میں اسی صراحت کے ساتھ ارشاد ہوئی ہے:

وَمَا اَنْتُمْ بِالرُّسُلِ فَخُذُوا مَا وَصَّاهُمْ  
لَقَمًا عَنْهُ فَاَنْتُمْ وَاللَّهُ الْمَنَّانُ  
شَدِيدُ الْعِقَابِ - (آیت: ۱۷۷)

جو کچھ رسول نہیں دے گا اسے لے لو اور جس سے منع کر دے اُس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، اللہ بخشنے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سے کسی کی تینا دلیل نہیں کی جاسکتی کہ ان میں قرآن کے امر اور قرآن کی تحلیل و تحریم کا ذکر ہے تینا دلیل نہیں بلکہ اللہ کے کلام میں ترمیم ہوگی۔ اللہ نے تو یہاں امر نہی اور تحلیل و تحریم کو رسول کی کائنات قرار دیا ہے نہ کہ قرآن کا۔ پھر کیا کوئی شخص اللہ میں سے یہ کہنا چاہتا ہے کہ آپ سے بیان میں غلطی ہوگئی، آپ مجھ سے قرآن کے بجائے رسول کا نام لے سکتے؟

### رسول بحیثیت قاضی

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر اللہ تعالیٰ اس امر کی تصریح فرماتا ہے، کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی مقرر کیا ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں:

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ  
بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَوْكَلَكُمُ اللّٰهُ (النساء: ۵۸)

دے نبی، ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اللہ کی دیکھائی ہوئی

روشنی میں فیصلہ کرو۔

اور اسے نبی، کھڑا یا ایمان لایا جو اس کتاب پر  
جو اللہ نے نازل کی ہے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا  
درمیان عدل کروں

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ بلائے  
جائیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف تاکہ رسول ان کے  
درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور ان سے  
اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ  
کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو ہم دیکھتے ہو  
مناقشوں کو کہ وہ تم سے کتنی کمزور ہیں۔

پس (اسے نبی) تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ  
ہو گئے جب تک کہ وہ اپنے جھگڑوں میں مجھے فیصلہ  
کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو فیصلہ تو کرے اس کی  
طرف سے اپنے دل میں کئی شکی تک محسوس نہ کریں

بلکہ اسے بسر و چشم قبول کریں۔

یہ تمام آیتیں اس امر میں بالکل صریح ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ساختہ یا مسلمانوں کے مقرر کیے ہوئے نبی  
نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے نبی تھے۔ تیسری آیت بتا رہی ہے کہ آپ کی حج ہونے کی حیثیت رسالت  
کی حیثیت سے الگ نہیں تھی بلکہ رسول ہی کی حیثیت میں آپ حج بھی تھے۔ اور ایک مومن کا ایمان بالرسالت اس  
وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ آپ کی اس حیثیت کے آگے بھی سب سے طاعت کا رو بہ تہ اختیار کرے۔  
چوتھی آیت میں ما انزل اللہ (قرآن) اور رسول دونوں کا الگ الگ ذکر کیا گیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے  
کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لیے دو مستقل مرجع ہیں، ایک قرآن قانون کی حیثیت سے، دوسرے رسول حج کی حیثیت  
سے، اور ان دونوں سے تمہارا منافی کام ہے نہ کہ مومن کا۔ آخری آیت میں بالکل بے باگ طریقے سے کہا گیا  
ہے کہ رسول کو جو حج کی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا وہ مومن ہی نہیں ہے۔ غرض کہ اگر رسول کے دیئے ہوئے فیصلے  
پر کوئی شخص اپنے دل میں غبی تنگی محسوس کرے تو اس کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ کیا قرآن کی ان تصریحات کے بعد بھی کوئی  
صاحب یہ کہہ سکتے ہیں کہ آؤ اللہ اور رسول کی حیثیت سے فاضلی نہ تھے بلکہ دنیا کے عام جھگڑوں اور جھڑپوں کی طرح

وَقَدْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ  
وَأُعِزَّتْ لِعَدْلِ بَيْنِكُمْ - (الشوریٰ: ۱۷۵)

بِنَحَاكَاتٍ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا  
إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَكُمْ يَتَّبِعُونَ  
أَقْوَامًا اسْمِعْنَا وَأَطَعْنَا - (الشوریٰ: ۱۷۵)

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ  
اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ  
يَسْتَوُونَ مَعَكَ صَدُوقًا - (النساء: ۶۱)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّى يُحَكِّمُوكَ  
فِيمَا شَجَرَ بَيْنَكُمُ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ  
سِتْرًا جَاهِلًا مِمَّا فَتْنَيْتَ وَيَسْتَلِيمُوا إِلَيْنَا  
وَأَنْصَارًا - (النساء: ۶۵)



آپ بھی ایک حج یا عمرہ ٹیٹ تھے اس لیے ان کے فیصلوں کی طرح حضور کے فیصلے بھی ماننے والوں نہیں بن سکتے؛ کیا دنیا کے کسی حج کی برکت ہو سکتی ہے کہ اس کا فیصلہ اگر کوئی نہ مانے یا اس پر تنقید کرے یا اپنے دل میں بھی گسے لفظ سمجھے تو اس کا ایمان سب ہر جائے؛

### رسول بحیثیت حاکم و فرمانروا

قرآن مجید اسی صراحت اور تکرار کے ساتھ بکثرت مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حاکم و فرمانروا تھے اور آپ کو یہ منصب بھی رسول ہی کی بحیثیت سے عطا ہوا تھا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُذَكِّرَ الْأُولِيَاءَ بِأَذْنِ اللَّهِ .  
ہم نے کوئی رسول بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے۔

مَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ . (النساء: ۸۰)  
ات الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ  
(الفتح: ۱۰)  
جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔  
(اسے نبی) یعنی جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْغُوا إِلَهُمَا نَعْمَ اللَّهُ رَحِيمٌ رَحِيمٌ .  
اَسے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ مِنَ اللَّهِ لَوْمَةٌ إِذَا تَعَنَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ مِنْ أَمْرٍ مِمَّا عَمِلُوا وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَتَلَ مِثْلًا لِلْمُتَّقِينَ . (الاحزاب: ۳۶)  
اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ تنبیہ نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کا رسول کریم نے تو پھر ان کے لیے اپنے اُس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کر لینے کا اختیار باقی رہ جائے اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (إِن كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ)  
اَسے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم سے اولی الامر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اس کو پھر دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روزِ آخر پر۔

یہ آیات صاف بتا رہی ہیں کہ رسول کوئی ایسا حاکم نہیں ہے جو خود اپنی قائم کردہ برہمیت کا سربراہ بن بیٹھا ہو یا جسے لوگوں نے منتخب کر کے سربراہ بنا لیا ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا ہوا فرمانروا ہے اس کی فرمانروائی

اس کے منصب رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا رسول ہونا ہی اللہ کی طرف سے اُس کا ساکم مُطلق ہونا ہے۔ اس کی اطاعت جین اللہ کی اطاعت ہے۔ اس سے بیعت دراصل اللہ سے بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں مقبول نہ ہو۔ اُس کے مقابلے میں اہل ایمان کو دجن میں ظاہر ہے کہ پوری امت اور اُس کے حکمران اور اس کے "مرکزیت" سب شامل ہیں، قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ کر چکا ہو اس میں وہ خود کوئی فیصلہ کریں۔

ان نام تصریحات سے بڑھ کر صاف اور قطعی تصریح آخری آیت کرتی ہے جس میں یکے بعد دیگرے تین الامتوں کا حکم دیا گیا ہے:

سب سے پہلے اللہ کی اطاعت۔

اس کے بعد رسول کی اطاعت۔

پھر میرے درجے میں اولی الامر یعنی آپ کے "مرکزیت" کی اطاعت۔

اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسول اولی الامر میں شامل نہیں ہے بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے اور اس کا درجہ خدا کے بعد دوسرا نمبر ہے۔ دوسری بات جو اس آیت سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ اولی الامر سے نزاع ہو سکتی ہے مگر رسول سے نزاع نہیں ہو سکتی۔ تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ نزاعات میں فیصلے کے لیے مرجع دو ہیں، ایک اللہ اور دوسرا اس کے بعد اللہ کا رسول۔ ظاہر ہے کہ اگر مرجع صرف اللہ ہوتا تو صراحت کے ساتھ رسول کا ذکر محض بے معنی ہوتا۔ پھر جبکہ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے ماوا کتاب اللہ کی طرف رجوع کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے، تو رسول کی طرف رجوع کرنے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ عہد رسالت میں خود ذاتِ رسول کی طرف اور اس عہد کے بعد سنتِ رسول کی طرف رجوع کیا جلتے۔

بلکہ اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود عہد رسالت میں بھی بہت بڑی حد تک سنتِ رسول ہی مرجع تھی۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں اسلامی حکومت پورے جزیرہ عرب پر پھیل چکی تھی جس بارہ لاکھ مربع میل کے اس وسیع و عریض ملک میں یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہر معاملہ کا فیصلہ براہِ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرایا جائے۔ لہذا اُس زمانے میں ہی اسلامی حکومت کے گورنروں، قاضیوں اور دوسرے حکام کو معاملات کے فیصلے کرنے میں قرآن کے بعد جس دوسرے ماخذ قانون کی طرف رجوع کرنا ہوتا تھا وہ سنتِ رسول ہی تھی۔ ۸۱

عدلیہ کا طریق کار حضور کے عہد مبارک میں

حضور کی بیعتِ طیبہ میں جو معاملات براہِ راست آپ تک پہنچتے تھے ان میں تو اللہ اور رسول کا نشانہ بنانے والے اور اس کے مطابق نزاعات کا فیصلہ کرنے والے آپ خود تھے لیکن ظاہر بات ہے کہ پوری مملکت اسلامیہ میں پھیل چکی تھی

آبادی کو جو معاملات پیش آتے تھے وہ سب کے سب براہ راست حضورؐ کی ہچکچاہٹ سے جاتے تھے، اور نہ آپؐ ہی سے شخصاً ان کا فیصلہ حاصل کیا جاتا تھا۔ اس کے بجائے مملکت کے مختلف علاقوں میں آپؐ کی طرف سے معتمدین یا مقرر تھے جو لوگوں کو دین سکھاتے تھے اور عام لوگ اپنے روزمرہ کے معاملات میں انہی سے معلوم کرتے تھے کہ کتاب اللہ کا حکم کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طریقے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے علاوہ ہر علاقے میں امیر، عامل اور قاضی مقرر تھے جو اپنے اپنے اُترے عمل سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر معاملات کے فیصلے خود کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے قَوْلُهُ اِنِّى اللّٰهُ وَرَسُوْلُہِ كَا نَشَا ئِرًا كَرْمٌ كَا جَوْ طَرَفِیْہِ حَضْرَتُہٗ خُود لِسِنْدِ فَرَمَا تِہَا وَہِ حَضْرَتُہٗ مُعَا ذِنِ حَبِیْلِہِ كِى شَہُوْر حَدِیْثِہٖ یٰن بِلَانِ ہُوْمَا ہِیْہِ :

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
بعث معاذاً الى اليمن فقال كيف تقضى؟  
قال، اقتضى بما في كتاب الله - قال فان لم يكن  
في كتاب الله؟ قال فبسنن رسول الله، قال  
فان لم يكن في سنن رسول الله؟ قال  
اجتهد برأى - قال الحمد لله الذي وفق  
رسول الله -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن کی طرف قاضی بنا کر روانہ کیا تو ان سے پوچھا تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے عرض کیا اُس ہدایت کے مطابق جو اللہ کی کتاب میں ہے۔ تو یا اگر اللہ کی کتاب میں نہ ملے؟ عرض کیا پھر سنت رسول اللہ میں ہو۔ تو یا اگر سنت رسول اللہ میں بھی نہ ملے؟ عرض کیا میں اپنی رائے سے حق و سوا حق ایک پہنچنے کی، پوری کوشش کروں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ شک ہے اُس خدا کا جس نے رسول اللہ کے زباناؤں شخص کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق دی جو رسول اللہ کو پسند ہے۔ ۹

ترمذی، ابواب الاحکام۔ البردائود،  
کتاب الاقضیہ

### اسلامی نظام کی دستوری بنیادیں اور ان میں رسول کی حیثیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا  
الرَّسُولَ، وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِن مَّا نَزَعْتُمْ  
فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن  
كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ  
ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا -

اے ایمان لائے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت  
کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر  
ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے  
تو اسے اللہ اور رسولؐ کی طرف پھیر دو اگر تم وہی  
اللہ اور رسولؐ کو آخر پر ایمان رکھتے ہو یہی ایک صحیح طریق  
کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔

(انسار، ۵۹)

یہ آیت اسلام کے پورے مذہبی، تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد اور اسلامی ریاست کے دستور کی اولین ذمہ دہ ہے۔  
اس میں حسب ذیل اصول مستقل طور پر قائم کر دیئے گئے ہیں:

۱۱) اسلامی نظام میں اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے بندہ خدا ہے، باقی جو کچھ بھی ہے اس کے بعد ہے۔ مسلمان کی اندرونی زندگی، اور مسلمانوں کے اجتماعی نظام، دونوں کا مرکز و محور خدا کی فرمائندگی اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں اور وفاداریاں صرف اس صورت میں قبول کی جائیں گی کہ وہ خدا کی اطاعت اور وفاداری کی قدر قابل نہ ہوں بلکہ اس کے تحت اور اس کی تابع ہوں۔ ورنہ ہر وہ صلفہ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا جو اس اصلی اور بنیادی اطاعت کا حریف ہو یہی بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ ۗ خَالِقُ كَيْفَ تَأْتِي فِي كَيْفِ مَخْلُوقٍ كَيْفَ لِي كَوْنِي اطاعت نہیں ہے۔

۱۲) اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے۔ یہ کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے بلکہ اطاعت خدا کی راہ و عملی صورت ہے۔ رسول اس لیے مطاع ہے کہ وہی ایک مستند ذریعہ ہے جس سے ہم تک خدا کے احکام اور فرامین پہنچتے ہیں۔ ہم خدا کی اطاعت صرف اسی طریقہ سے کر سکتے ہیں کہ رسول کی اطاعت کریں۔ کوئی اطاعت خدا کے رسول کی سند کے بغیر مقبول نہیں ہے اور رسول کی پیروی سے منہ موڑنا خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اسی مضمون کو یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ مَرَدَا اطاعني فقد اطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله ۗ جس نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے خدا کی نافرمانی کی ۗ اور یہی بات خود قرآن میں پوری وضاحت کے ساتھ آگے آ رہی ہے۔

۱۳) مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد اور ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر واجب ہے وہ ان کی اولی الامر کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہوں۔ اولی الامر کے مفہوم میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے سربراہ کار ہوں، خواہ وہ ذہنی و فکری رہنمائی کرنے والے علماء ہوں، یا سیاسی رہنمائی کرنے والے لیڈر، یا ملکی انتظام کرنے والے حکام، یا عدالتی فیصلے کرنے والے جج، یا مذہبی و امور میں قبیلوں اور بستوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شہنشاہ اور سردار غرض جو کسی حیثیت سے بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہے وہ اس حیثیت میں اطاعت کا مستحق ہے، اور اس سے نزاع کر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں خلل ڈالنا درست نہیں ہے، بشرطیکہ وہ خود مسلمانوں کے گروہ میں سے ہو اور خدا و رسول کا مطیع ہو۔ یہ دونوں شرطیں اس اطاعت کے لیے لازمی ہیں، اور یہ نہ صرف آیت مذکورہ صدر میں صاف طور پر درج ہیں، بلکہ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری شہرت و بطل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ مثلاً حسب ذیل احادیث ملاحظہ ہوں:

مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند نہ آئے یا پسند نہ آئے تاکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اور جب اسے معصیت

اسمع و لا تد علی الامر المسلمانی

حاجب و کہ ما صالحو من جمعیتہ فان

اسر جمعیتہ فلا اسمع ولا اطاعہ۔

بخاری و مسلم

کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سنا یا پیسے اور نہ ماننا چاہیے۔

لا طاعة في معصية - انما الطاعة في

خدا اور رسول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے "معروف" میں ہے

المعروف - بخاری و مسلم

حضرت نے فرمایا تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو سزا

یكون عليكم امور تعرفون وتكفرون

ضمن انكوا فقد برئوا من كره فقد سلم

تو میں نے ان کے منکرانہ پر اظہارِ ناراضی کیا وہ بری الذمہ ہوا۔ اور جس نے ان کو پسند کیا وہ بھی برک

وانكمن من رضی ونابع . فقالوا افسلا

نقلنا لهم قال لا ما صلوا - مسلم

گیا مگر جو ان پر ناراضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ مائزہ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا، پھر حسب ایسے حکام کا دورہ کئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں۔

یعنی ترک نماز وہ علامت ہوگی جس سے صریح طور پر معلوم ہو جائے گا کہ وہ اطاعتِ خدا اور رسول سے باہر ہو گئے ہیں اور پھر ان کے خلاف بیروہدہ کرنا درست ہوگا۔

سئلوا المتكفرا الذين تبغضونهم و

حضرت نے فرمایا تمہارا سہ ہزاروں مرد اور وہ ہیں جو تمہارے لیے تبغض ہیں اور تم ان کے لیے تبغض ہو، تم ان پر

يبغضونكم وتلعنونهم ويلعنونكم قلنا

لعنت کرد اور وہ تم پر لعنت کریں صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! جب یہ سورت جو تو کیا پڑھان

يا رسول الله قلنا اذ هذا عندناك قال

لا ما اقاموا فيكم الصلوة ، لا ما اقاموا

کے مقابلہ پڑھا تمہیں؟ فرمایا نہیں، جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔

فيكم الصلوة - مسلم

اس حدیث میں اور پرانی شرط کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ اور اس حدیث سے گمان ہو سکتا تھا کہ اگر وہ اپنی اندرونی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جاسکتی لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد اور ان مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابند نماز ہوں، بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظام حکومت چل رہا ہو وہ کم از کم تمام مسلمانوں کا انتظام کرے۔ یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اصغرئی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے۔ ورنہ اگر یہ بھی نہ ہوتا پھر اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہو چکی ہے اور اسے اللہ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لیے جائز ہونی چاہی اسی بات کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے منجملہ اور باتوں کے ایک

اس امر کا عہد بھی لیا کہ ان لا تُسَارِعَ الْأَمْرَ اِهْلَهُ الْاِنْ تَوَوُّا لِقَضَائِهِمْ اِحَا عِنْدَكَ مِنْ اَللّٰهِ فَبِئْسَ بَرْحَانٌ لِّبَعْضِ بِيَدِكَ  
ہم اپنے سرداروں اور حکام سے نزاع نہ کریں گے، الا یہ کہ ہم ان کے کاموں میں کھلا کفر دیکھیں جس کی موجودگی میں ان کے  
خلاف ہمارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے دلیل موجود ہو۔ (بخاری و مسلم)

(۴) چوتھی بات جو آیت زیر بحث میں ایک مستقل اور تطبیح اصول کے طور پر لکھی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی

نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند Final Authority کی  
حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان، یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلہ  
یہی قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب تسلیم و قبول کریں گے۔  
اس طرح تمام مسائل زندگی میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے سند اور مرجع اور حنیف آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی  
خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام زندگی سے ممتاز کرتی ہے جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جاسکے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی  
نظام ہے۔

اس موقع پر بعض لوگ یہ شبہ پیش کرنے ہیں کہ تمام مسائل زندگی کے فیصلہ کے لیے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی طرف  
کیسے رجوع کیا جاسکتا ہے جبکہ میونسپلٹی اور پولیس اور ڈاک خانہ کے قواعد و ضوابط اور ایسے ہی بے شمار معاملات کے  
احکام سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ شبہ اصول دین کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ سلطان کو جو غیر  
کافر سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کافر مطلق آزادی کا دعویٰ ہے اور مسلمان فی الاصل بندہ ہونے کے بعد صرف اس  
دائرے میں آزادی سے مستفیع ہوتا ہے جو اس کے رب نے آسمان سے دی ہے۔ کافر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے  
بتائے ہوئے اصول اور قوانین اور ضوابط کے مطابق کرتا ہے اور سرے سے کسی خدا کی سند کا اپنے آپ کو جائز نہ  
سمجھتا ہی نہیں۔ اس کے برعکس مسلمان اپنے ہر معاملہ میں سب سے پہلے خدا اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف  
رجوع کرتا ہے، پھر اگر وہاں سے کوئی حکم ملے تو وہ اس کی پیروی کرتا ہے، اور اگر کوئی حکم نہ ملے تو وہ صرف اسی  
صورت میں آزادی عمل برتا ہے۔ اور اس کی یہ آزادی عمل اسی محبت پر مبنی ہوتی ہے کہ اس معاملہ میں شارع کا کوئی حکم  
دینا اس کی طرف سے آزادی عمل عطا کیے جانے کی دلیل ہے۔ ۱۱۱

# حضور پر قرآن کے علاوہ وحی کا نزول

اُسے بھی اس وحی کو عید ہی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان  
 کو حرکت نہ دیا اور اس کو یاد کر دینا اور پڑھنا اور پڑھنا چاہا  
 ذمہ ہے، لہذا جب ہم اسے پڑھا رہے ہو اور اس  
 وقت تم اس کی قرأت کو غور سے سمجھتے رہو پھر  
 اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

لَا تَحْزَنْكَ بِهِ نَسَائِكَ يَنْفَعُكَ بِشَعْلٍ بَدَا إِنَّ عَلَيْنَا  
 جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ فَإِذَا قَرَأْتَهُ فَكَانَ نَشِيغًا  
 قُدْرَتَهُ - نُفُورًا لِّعِبَادِنَا بِيَانَهُ -  
 رالعیاضہ: ۱۱۹ تا ۱۱۶

یہ ایک بڑی اہم آیت ہے جس سے خدا ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو  
 اُن گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔  
 اولاً، اس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوئی  
 تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں  
 ہے۔ اس لیے کہ قرآن کے احکام اور فرامین، اس کے اشارات، اس کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو  
 مفہوم و مدعا حضور کو سمجھا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا  
 دینا یا اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں بل جاتا۔ لہذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن  
 قرآن کی تفہیم و تشریح جو اللہ کی طرف سے کی جاتی تھی، وہ بہر حال الفاظ قرآن سے ما سراتھے۔ یہ وحی حسی کا ایک  
 اور ثبوت ہے۔ جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔

ثانیاً، قرآن کے مفہوم و مدعا اور اس کے احکام کی یہ تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو  
 بتائی گئی تھی آخر اسی لیے تو بتائی گئی تھی کہ آپ اپنے قول اور عمل سے اُس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور اس کے  
 احکام پر عمل کرنا سکھائیں۔ اگر یہ اُس کا مدعا نہ تھا اور یہ تشریح آپ کو صرف اس لیے بتائی گئی تھی کہ آپ اپنی ذات کی  
 حذک اس علم کو محدود رکھیں تو یہ ایک بے کار کام تھا، کیونکہ قرآن میں بتوشت کی ادائیگی میں اس سے کوئی مدد نہیں مل  
 سکتی تھی اس لیے صرف ایک جو قوت آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریحی علم سرے سے کوئی تشریحی حیثیت نہ رکھتا تھا۔  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

اللہ تعالیٰ ترخورد سورہ نحل آیت ۴۴ میں فرمایا ہے: **وَاذْكُرْ لَنَا تِلْكَ الْأُمَّةَ الَّتِي كُنَّا عَلَيْهَا تَرَكْنَا مَبْعُوثِينَ فِي الْأَرْضِ لِنَرَّاسِي مَا كُنَّا عَلَيْهِمْ وَإِنَّا لَآتِينَ بِهِمْ** اور آیت  
 نبیؐ، یہ لو کہ ہم نے تم پر اس میںے نازل کیا۔ ہے تاکہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح و توضیح کرتے جاؤ جو ان کے لیے  
 زاری گئی ہے۔ اور قرآن میں پارسنگ اللہ تعالیٰ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف  
 کتاب، اللہ کی آیات ستا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔ البقرہ، آیات ۱۲۹ و ۱۵۱ آئی عمران ۱۶۴  
 (تجوید، ۳)۔ اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو ماننا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی سیرت  
 مستندہ، بلکہ فی الحقیقت سرکارِ تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور عمل سے فرمادی ہے  
 کیونکہ وہ آپؐ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ خود قرآن کے نازل کرنے والے خدا کی تالی ہوئی تشریح ہے۔ اس کو چھوڑ کر یا  
 اس سے ہٹ کر جو شخص بھی قرآن کی کسی آیت یا اس کے کسی لفظ کا کوئی من مانا مفہوم بیان کرتا ہے وہ ایسی جسارت  
 کرتا ہے جس کا ارتکاب کوئی صاحب ایمان آدمی نہیں کر سکتا۔

ثالثاً قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیسے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت ایسی  
 ایسی ہیں جنہیں ایک عربی دان آدمی محض قرآن سے انحالاً پتہ نہ کر سکتا کہ ان کا حقیقی تبار کیا ہے اور ان میں  
 جو کلمہ بیان کیا گیا ہے اس پر کیسے عمل کیا جاتا ہے مثال کے طور پر لفظ صلوة ہی کو لے لیتے قرآن مجید میں ایمان کے  
 بعد اگر کسی عمل پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے تو وہ صلوة ہے لیکن بعض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس  
 کلمہ مفہوم تک متعین نہیں کر سکتا قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر زیادہ زیادہ جو کچھ وہ سمجھ سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ  
 نماز، زبان سے اے لفظ کو کسی خاص، اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے قرآن غالباً کوئی خاص فعل ہے  
 جسے انجام دینے کا اہل ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صرف قرآن کو پڑھ کر کوئی عربی دان یہ طے نہیں کر سکتا  
 کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر قرآن کے سمیٹنے والے نے اپنی طرف سے  
 ایک مفہوم کو مقرر کر کے اپنی اس اصطلاح کا مفہوم اسے ٹھیک ٹھیک نہ بتایا ہوتا اور صلوة کے حکم کی تعمیل کرنے کا  
 طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے نہ سکھا دیا ہوتا، تو کیا صرف قرآن کو پڑھ کر دنیا میں کوئی دو مسلمان بھی ایسے  
 ہو سکتے تھے جو حکم صلوة پر عمل کرنے کی کسی ایک شکل پر متفق ہو جاتے؟ آج ڈیڑھ ہزار برس سے مسلمان نسل در نسل  
 ایک ہی طرح جو نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں، اور دنیا کے ہر گوشے میں کروڑوں مسلمان جس طرح نماز کے حکم پر کیا  
 عمل کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف قرآن کے الفاظ ہی

لغات تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، (محل، حاشیہ ۴۰)

لے ان سب آیات کی تشریح ہم سنت کی ایسی حقیقت میں سفر ہم، سے، تاکہ تفہیم کے ساتھ کر چکے ہیں۔ درمؤلف



وحی نہیں فرماتے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا، اور اسی مطلب کی تسلیم آپ ان سب لوگوں کو دینے چلے گئے جنہوں نے قرآن کو اللہ کی کتاب اور آپ کو اللہ کا رسول مان لیا۔

رابعاً، قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسولؐ کی تبتائی اور رسولؐ نے اپنے قول اور عمل سے اس کی جو تسلیم اُمت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے منقول سند کے ساتھ انگوٹوں سے پھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضورؐ کی قرآنی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں رائج ہوا جس کی نسبتاً مستحکم روایتوں سے بھی بعد کی نسلوں کو انکی نسلوں سے ملیں، اور بعد کی نسلوں نے انکی نسلوں میں اس پر عمل درآمد ہونے سے پہلے اس ذریعہ علم کو قبول کرنے سے جو شخص زکا کر لیا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم ان تالیفنا بیاناً، فرما کر قرآن کا مطلب اپنے رسولؐ کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اُسے پورا کرنے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا، کیونکہ یہ ذمہ داری محض رسولؐ کی ذاتی صفت سے مطلب سمجھانے کے لیے نہیں لی گئی تھی، بلکہ اس غرض کے لیے لی گئی تھی کہ رسولؐ کے ذریعہ اُمت کو

کتاب الہی کا مطلب سمجھا جا سکتے، اور حدیث و سنت کے ماتخذ قانون ہونے کا انکار کرتے ہی آپ سے آپ یہ لازم آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکا ہے، اعاذنا اللہ من ذلک۔ اس کے جواب میں جو شخص یہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ بھی تولی تھیں، اُن سے ہم کہیں گے کہ حدیثوں کا گھڑا جانا خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آقاؐ یا اسلام میں پوری اُمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ آخر گرا ہی پھیلانے والوں کو چھوٹی حدیثیں گھڑنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟ جعل ساز لوگ وہی سکتے تو جعلی بناتے ہیں جن کا باہر میں چین ہو۔ جن لوگوں کی باہر میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون بیوقوف جعلی طور پر چھاپے لگا پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس اُمت نے اول روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذات پاک کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے، اور نتیجتاً غلط باتوں کے اُس ذات کی طرف منسوب ہونے کا خطرہ بڑھتا گیا آتا ہی زیادہ اس اُمت کے خیر خواہ اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے چلے گئے کہ صحیح کو غلط سے تمیز کیا جائے صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا ہے۔ سخت بد نصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر مغربی مستشرقین کے بہکائے میں آکر حدیث و سنت کو ناقابل اعتبار ٹھیراتے ہیں اور یہی جانتے کہ اپنی اس جاہلانہ جسارت سے وہ اسلام کو کتنا بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اللہ

قبلہ کا تقرر

قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ حضور پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے اور آپ

ان دونوں قسم کی وحیوں کا اتباع کرنے پر مامور تھے۔

اور ہم نے وہ قبلہ جس پر اب تک تم نے اسی لیے مقرر

کیا تھا تاکہ یہ دیکھیں کہ کون رسول کی پیروی کرنا ہے

اور کون اٹھنے پاؤں پھرتا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْفَيْثَةَ كُنْتُمْ عَلَيْهَا  
إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَرْسُلُ مِنَ النَّبِيِّينَ

فَلَمَّا عَقَبْتَهُ (البقرہ: ۱۲۳)

یہ سب سے زیادہ کھلی ہوئی آیت ہے جو ہر زاویہ کی جھکاٹ دیتی ہے اور ساتھ ساتھ اس مندرجہ کے کا بھی قلع قمع کر دیتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کسی صورت میں وحی نہیں آتی تھی اسجد حرام کو قبلہ قرار دینے سے پہلے مسلمانوں کا جو قبلہ تھا اسے قبلہ بنانے کا کوئی حکم قرآن میں نہیں آیا ہے اور یہ واقعہ ناقابل احکام ہے کہ وہ قبلہ آغا تر اسلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا اور تقریباً ۱۴ سال تک اسی کی طرف حضور اور صحابہ کرام نماز ادا کرتے رہے۔ ۱۴ سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کی اس آیت میں حضور کے اس فعل کی توثیق فرمائی، اور یہ اعلان فرمایا کہ یہ قبلہ ہمارا مقرر کیا ہوا تھا اور اسے ہم نے اپنے رسول کے ذریعہ سے اس لیے مقرر کیا تھا کہ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کون رسول کی پیروی کرنا ہے اور کون اس سے منہ موٹتا ہے۔ یہ ایک طرف اس امر کا صریح ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے احکام نازل ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف یہی آیت پروردی صراحت کے ساتھ بتاتی ہے کہ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احکام کا اتباع کرنے پر بھی مامور ہیں جو قرآن میں مذکور نہ ہوں، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمانوں کے ایمان بالرسالت کی آزمائش ہی اس طریقہ سے ہوتی ہے کہ رسول کے ذریعہ سے جو حکم دیا جاتا ہے اسے وہ مانتے ہیں یا نہیں۔ ﷻ

سوال یہ ہے کہ اگر حضور پر قرآن کے علاوہ اور کوئی وحی نہیں آتی تھی تو وہ حکم حضور کو کس ذریعہ سے ملا کیا یہ اس بات کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ حضور کو ایسے احکام بھی ملتے تھے جو قرآن میں درج نہیں ہیں؟ ﷻ

فتح مکہ کی بشارت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں خواب دیکھتے ہیں کہ آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہیں اور بیت اللہ کا لوٹا کیا ہے۔ آپ اس کی خبر صحابہ کرام کو دیتے ہیں۔ اور ۱۴ سال بعد مکہ کی فتح کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں کفار مکہ آپ کو مدینہ کے مقام پر روک دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ واقع ہوتی ہے بعض صحابی اس پر غمگین ہیں پوچھتے ہیں اور حضرت عمرؓ ان کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے ہمیں خیر نہ دی تھی کہ ہم مکہ میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا: کیا میں نے یہ کہا تھا کہ اسی سفر میں ایسا ہوگا؟ اس پر اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ  
مَحْكَمٌ دَلَالٌ وَ بَرَّائِنٌ سَمِيحٌ مُتَوَكِّفٌ مَوْضِعَاتٍ مَشْتَمَلٌ مَفْتٌ آن لائن مکتبہ

اللہ نے اپنے رسول کو تعیناً سچا خواب دکھایا تھا۔

لَدْخُلْنَ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللهُ اَمِيْن  
 مُكَلِّفِيْنَ مَرَاتٍ وَسُكْرٍ وَمَقْصُورِيْنَ لَا تَخْفَوْنَ  
 فَسَلِمَةٌ اَلَمْ تَعْلَمُوْا فَيَجْعَلْ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ  
 فَتْحًا قَرِيْبًا۔ (الفتح: آیت ۲۷)

تم ضرور مسجد حرام میں انشاء اللہ داخل ہو گے اس کے  
 ساتھ سر موٹا نہ ہوئے اور بال تراشئے ہوئے بغیر  
 اس کے کہ نہیں کسی قسم کا خوف ہو۔ اللہ کو علم تھا اس  
 بات کا جسے تم نہ جانتے تھے۔ اس لیے اس سے پہلے  
 اُس نے یہ قریب کی فتح (یعنی صلح حدیبیہ) اعلان کر دی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ کو خواب کے ذریعہ سے خبریں داخل ہونے کا یہ طریقہ بتایا گیا تھا کہ آپ اپنے ساتھیوں  
 کو لیکر مکہ کی طرف جائیں، کفار روکیں گے، آخر کار صلح ہوگی جس کے ذریعہ سے دوسرے سال عمرہ کا موقع بھی ملے گا۔  
 آئندہ کی فتوحات کا راستہ بھی کھل جائے گا۔ کیا یہ قرآن کے علاوہ دوسرے طریقوں سے ہدایات ملنے کا کھٹا ثبوت  
 نہیں ہے؟

### رانہ کی بات

(۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں میں سے ایک بیوی کو رانہ میں ایک بات بتاتے ہیں وہ اس کا ذکر دوسروں  
 سے کر دیتی ہیں حضورؐ اس پر باز نہیں کرتے ہیں تو وہ پڑھتی ہیں کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ میں نے یہ بات دوسروں  
 سے کہہ دی ہے حضورؐ جواب دیتے ہیں کہ مجھے علیم و خبیر نے خبر دی ہے۔

وَ اِذَا اسْتَرْتَنِیْ اِلٰی بَعْضِ اَمْرٍ وَّاجِدُ  
 حَدِيْثًا فَلَ مَا نَبَاتٍ بِہٖ وَاَطْعَمُوْهُ اللهُ عَلَیْہِ  
 عَمْرَتٌ بَعْضُہٗ وَاَعْرَضَ عَنْ کِبْحٍ فَلَمَّا  
 نَبَا ہَا بِہٖ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاکَ هٰذَا قَالَ  
 نَبَا فِی الْعَلِیْمِ الْخَبِیْرِ۔ (التحریم: ۳)

اور جبکہ نبی نے اپنی ایک بیوی سے رانہ میں ایک بات  
 کہی اور اس بیوی نے اس کی دوسروں کو خبر دے دی  
 اور اللہ نے نبی کو اس پر مطلع کر دیا تو نبی نے اس بیوی  
 کو اس کے قصور کا ایک حصہ تو بخاریا اور دوسرے  
 حصہ سے درگزر کیا پس جب نبی نے اس بیوی کو  
 اس کا قصور بتایا تو اس نے پوچھا آپ کو کس نے اس  
 کی خبر کر دی؟ نبی نے کہا مجھے علیم و خبیر نے بتایا۔

فرمائیے کہ قرآن میں وہ آیت کہاں ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع دی تھی  
 کہ تمہاری بیوی نے تمہاری رانہ کی بات دوسروں سے کہہ دی ہے؟ اگر نہیں ہے تو ثابت ہوا یا نہیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن  
 کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیجا بات بھیجتا تھا؟

### نکاح زینبؓ

(۳) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ پر لے بیٹے زینبؓ کا رشتہ اپنی بیوی کو طلاق دیتے ہیں اور اس کے بعد حضورؐ کی  
 محکم لائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

مختلف بیوی سے نکاح کر لیتے ہیں۔ اس پر منافقین و منافعین حضور کے خلاف پورے پگھلنے کے کا ایک شدید طوفان کھڑا کرتے ہیں اور اعتراضات کی برچھاڑ کرتے ہیں۔ ان اعتراضات کا جواب اللہ تعالیٰ سورۃ احزاب کے ایک پورے کورے میں دیتا ہے اور اس سلسلے میں لوگوں کو بتاتا ہے کہ ہمارے نبی نے یہ نکاح خود نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے حکم سے کیا ہے۔

فَلَمَّا فَتَحُوا لَهَا وَعَاطَوْهَا وَقَالَ اللَّهُ عَلَيْهَا طَهْرًا  
 لَمْ يَلَمَّهَا بِشَيْءٍ وَكَرِهَتْهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ فَتَزَوَّجَ فِي الْوَجْهِ  
 أَدْعِيَاءَ إِلَيْهَا إِذَا فَتَحُوا مَسْجِدًا وَطَهْرًا -  
 یہ حسب زینہ کا اس سے جو بھڑکیا تو ہم نے اس (عاتقہ) کا نکاح تم سے کر دیا تاکہ اہل ایمان کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہ رہے۔  
 جبکہ وہ ان سے بڑھ کر کے میں دینی انہیں ملاقا سے بچھے ہیں،

یہ آیت تو گزرتے ہوئے واقعہ کا بیان ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس واقعہ سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو حکم دیا گیا تھا کہ تم زینہ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لو وہ قرآن میں کس جگہ ہے؟  
 و رخت کاٹنے کی اجازت

۵، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبی نصیر کی مسلسل برہم کاریوں سے تنگ آکر مدینہ سے تھک کر ان کی بستریوں پر چڑھ جاتا کرتے ہیں۔ اور دورانِ محاصرہ میں اسلامی فوج گروہ پیش کے باغات کے بہت سے و رخت کاٹ ڈالتی ہے تاکہ تمہارے لیے راستہ صاف ہو۔ اس پر منافعین شور مچاتے ہیں کہ باغوں کو آباد کر اور ہر سے بھرے شہر دار درختوں کو کاٹ کر مسلمانوں نے فساد فی الارض برپا کیا ہے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ بَيْنِنَا أَوْ نَزَعْتُمْ مَوْجَا  
 تَابَتْكُمْ عَلَىٰ أَصُولِنَا فِي بِلَادِنَا (شعور المشرکین)  
 کھجوروں کے و رخت تم نے کاٹے اور جو کھڑے رہنے دیکھے۔ یہ دونوں کام اللہ کی اجازت سے تھے۔

کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ اجازت قرآن مجید کی کس آیت میں نازل ہوئی تھی؟

جنگ بدر سے پہلے کا ایک وعدہ

۶، جنگ بدر کے خاتمہ پر جب مالِ غنیمت کی تقسیم کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے اس وقت سورۃ انفال نازل ہوتی ہے اور فوری جنگ پر تبصرہ کیا جاتا ہے اس تبصرے کا آغاز اللہ تعالیٰ اُس وقت کرتا ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کے لیے گھر سے نکلے تھے، اور اس سلسلے میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَإِذْ يُعِيذُكُمْ اللَّهُ بِسِدْرَةِ الْبُنْدِيِّينَ  
 أَلَمْ نَكُفِّرْكُمْ وَنُقَلِّبْكُمْ وَأَنْتُمْ مُشْرِكُونَ  
 اور جبکہ اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ فرما رہا تھا کہ دو گروہوں  
 یعنی تمہاری فوج اور قریش کے لشکروں میں سے ایک  
 تمہارے ہاتھ آئے گا، اور تمہارے لیے کو بے زور  
 تَنْكُرُونَ لَكُمْ فَرِيضًا اللَّهُ أَنْ تَجِدُوا لَكُمْ

ایمان

تھا جو قرآن میں نازل نہیں ہوئے، اور وہ احکام بھی اسی طرح واجب الاطاعت تھے جس طرح قرآن میں نازل ہوئے  
وہ احکام۔

نماز کی منادی وہی اذان ہے جو آج ساری دنیا میں ہر روز پانچ وقت ہر مسجد میں دی جا رہی ہے مگر قرآن  
میں کسی جگہ نہ اس کے الفاظ بیان کیے گئے ہیں نہ کہیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ نماز کے لیے لوگوں کو اس طرح پکارا کرو۔ یہ چیز  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ ہے۔ قرآن میں اسی کی دو جگہ توثیق کی گئی ہے۔ ایک اس آیت میں دوسرے  
سورہ مائدہ کی آیت ۵۸ میں۔

اسی طرح جگہ کی یہ خاص نماز جو آج ساری دنیا کے مسلمان ادا کر رہے ہیں، اس کا بھی قرآن میں نہ حکم دیا گیا ہے  
نہ وقت اور طریق ادا کیا گیا ہے۔ یہ طرفہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جاری کردہ ہے، اور قرآن کی یہ آیت  
صرف اس کا وجہ اور اس کی شدت بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے  
اس صریح دلیل کے باوجود جو شخص یہ کہتا ہے کہ شرعی احکام صرف وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے وہ دراصل  
سنت کا نہیں خود قرآن کا بھی منکر ہے۔ ۱۱۱

نماز پڑھنے کا طریقہ

آرآیت الذی یتھی۔ عیناً اذاً  
تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا  
ہے جبکہ وہ نماز پڑھتا ہے۔  
(العنق: ۹-۱۰) صلی۔

بندے سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس طریقے سے حضور کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر  
کیا گیا ہے مثلاً سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى (بحی اسرائیل: ۱)۔ پاک  
ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو ایک راستہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ  
الْكِتَابَ وَاللَّكُوفَ ۱۱۰: تعریف ہے اس خدا کے لیے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی: وَأَنْتَ لَتَبْتَآمَ عَبْدَ اللَّهِ  
يَذْعُرُهُمْ كَأَوْفَا يُكَلِّمُونَ فَكَلِمَةً لِيَدًا راجع: ۱۹، ۲ اور یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کا بندہ اس کو پکارنے کے لیے کھڑا ہوا  
تو لوگ اس پر ٹوٹ پڑنے کے لیے تیار ہو گئے: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک خاص محبت کا انداز ہے جس سے اللہ  
تعالیٰ اپنی کتاب میں اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر فرماتا ہے۔ علامہ بریل اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ  
نے نبوت کے منصب پر سرفراز فرمانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھا دیا تھا اس طریقے کا ذکر  
قرآن مجید میں کہیں نہیں ہے کہ آئے ہی تم اس طرح نماز پڑھا کرو۔ لہذا یہ اس امر کا ایک اور ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپ کو ایسی باتوں  
کی تعلیم دی جاتی تھی جو قرآن میں درج نہیں ہیں۔ ۱۱۲

## مسئلہ شفاعت کے مختلف پہلو

[ نبوت کی حقیقت سے مسئلہ شفاعت کا گہرا تعلق دو وجہوں سے ہے: ایک اس وجہ سے کہ نبی اکرم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے منکرین و مخالفین نے یہ کہہ کر عقیدہ شفاعت کو اپنی ٹوٹال بنا یا ہے کہ ہم جن بزرگوں کی اولاد ہیں اور جن بڑے بڑے دیوی دیتاؤں کی عبادت کر کے ان کو خوش رکھتے ہیں، وہ اللہ کی بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں اور ان کی سفارش کی وجہ سے ہم اللہ کے پیچھے اور لاٹھے ہیں۔ سو میں ہمارے اعمال کی وجہ سے خدا کے غضب اور عذاب سے ڈرنا بے معنی ہے۔ قرآن نے اس تصور شفاعت کا مٹنے سے توڑ دیا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ قیامت میں انبیاء اور تبعاً جزوی طور پر پیغمدار کا اپنے ایسے پیروکاروں کے لیے شفاعت کرنا ثابت ہے جو مجموعی طور پر مصلحت الہی کے مطابق اچھی زندگی گزارتے ہوئے بعض مغزوں سے دوچار ہو گئے ہوں یا ان سے گناہوں کا ثقل درجی ہو یا وہ بار بار نام ہو جو اس اصلاح کی کوشش کرتے رہے ہوں۔

اس لحاظ سے شفاعت کا تعلق منصب نبوت سے ہے۔

ان دو وجہ کی بنا پر ہم نے مناسب سمجھا کہ ایک فصل مسئلہ شفاعت پر بھی بنیادی مباحث میں شامل ہونی چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس سلسلے میں مولانا کے قلم سے نہایت منسب عبارات نکلی ہیں۔

شفاعت کے مسئلے کو قرآن مجید میں کثرت مقامات پر اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے کہ کئی تنہا کو یہ جہانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آسکتی کہ شفاعت کون کر سکتا ہے اور کون نہیں کر سکتا، کس حالت میں کی جاسکتی ہے اور کس حالت میں نہیں کی جاسکتی، کس کے لیے اور کس کے لیے نہیں کی جاسکتی، اور کس کے حق میں نافع ہے اور کس کے حق میں نافع نہیں ہے۔ دنیا میں چونکہ لوگوں کی گمراہی کے بڑے اسباب میں سے ایک سبب شفاعت کے بارے میں غلط فہمیاں بھی ہیں، اس لیے قرآن نے اس مسئلے کو اتنا کھولی کر بیان کر دیا ہے کہ اس میں کسی استیاء کی گنجائش

# نبوت و بشریت

نظریہ جاہلیت کہ پیغمبر بشر نہیں ہو سکتا

ہر زمانے کے جاہل لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے جب کوئی رسول آیا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ کھاتا ہے، پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے، گوشت پوست کا بنا ہوا ہے، فیصلہ کر دیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہے کیونکہ بشر ہے۔ اور جب وہ گزر گیا تو ایک مدت کے بعد اس کے عقیدت مندوں میں ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے جو کہنے لگے کہ وہ بشر نہیں تھا کیونکہ پیغمبر تھا۔ چنانچہ کسی نے اسے خدا بنایا، اور کسی نے خدا کا بیٹا، اور کسی نے کہا کہ خدا اس میں مخلوق کر گیا ہے۔ غرض بشریت اور پیغمبری کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے لیے ہمیشہ ایک سمٹا ہی بنا رہا۔ ﷺ

مشرکین مکہ کا نقطہ نظر

اول تو اہل مکہ انسان کا رسول ہونا ہی عجیب سمجھتے تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ خدا کا پیغام لے کر آتا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پوست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہوتا ہم اگر آدمی ہی رسول بنا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترستیں اور جس کے حضور بار بار بانی کا شرف بڑی کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا۔ نہ یہ کہ ایک ایسا عامی آدمی خداوند عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں تجارتیں چنچا پھرتا ہو۔ بھلا اُس آدمی کو کون خاطر میں لائے گا جسے ہر ماہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اُس کے اندر غیر معمولی پن نہ پاتا ہو۔ بالفاظ دیگر اُن کی راستے میں رسول کی ضرورت اگر تھی تو عوام انسان کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ مجبور دکھانے یا ٹھٹھا ہٹھ سے دھونس جمانے کے لیے تھی۔ — یا پھر ایک فرشتہ اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسات دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوت کا حلیل القدر منصب عطا کر کے بس یوں ہی اکیلا چھوڑ دے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور نچر کھانا پھرے۔ —



بدرجہ آخران کا مطالبہ یہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسول ہمارے معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔ نہ خرچ کے لیے مال ملتے، نہ بھل کھانے کو کرتی باغ نصیب اور دعویٰ یہ کہ ہم اللہ رب العظیم کے پیغمبر ہیں۔ ۱۱۸

نبوت اور خدا رسیدگی کے متعلق جاہلانہ تصورات

نادان لوگوں کے ذہن میں ہمیشہ سے یہ اعتقاد تصور رہا ہے کہ جو شخص خدا رسیدہ ہو اسے انسانیت سے ماورا ہونا چاہیے۔ اُس سے عجائب و غرائب صادر ہونے چاہیں۔ وہ ایک اشارہ کرے اور پہاڑ سونے کا بن جائے۔ وہ ایک حکم کرے اور زمین خزانے اُگلنے لگے۔ اُس پر لوگوں کے اگلے پھلے سب حالات روشن ہوں۔ وہ تباہی سے کہ گم شدہ چیز کہاں رکھی ہے، مریض بچ جائے گا یا مر جائے گا، عالم کے پیٹ میں ترہے یا مادہ پھر اس کو انسانی کزور یا اور محدودیتوں سے بھی بالاتر ہونا چاہیے۔ بھلا وہ بھی کوئی خدا رسیدہ ہے جسے ٹھوک اور پھاس لگے، جسے عین آئے، جو بیوی بچے رکھتا ہو، جو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے خرید و فروخت کرتا ہو جسے کبھی قرض لینے کی ضرورت پیش آئے اور کبھی وہ مفلسی و تنگ دستی میں مبتلا ہو کر پریشان حال رہے۔ اس قسم کے تصورات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصرین کی ذہنیت پر مستط تھے۔ وہ جب آپ سے پیغمبری کا دعویٰ سنتے تھے تو آپ کی صداقت جانچنے کے لیے آپ سے غیب کی خبریں پوچھتے تھے، خوارقِ عادت کا مطالبہ کرتے تھے، اور آپ کو بالکل عام انسانوں جیسا ایک انسان دیکھ کر اعتراض کرتے تھے کہ یہ اچھا پیغمبر ہے جو کھاتا پیتا ہے، بیوی بچے رکھتا ہے اور بانٹوں میں چلتا پھرتا ہے۔ ۱۱۹

نبی کا بشر ہونا کیوں ضروری ہے؟

ذکر الہی والہامی پیغام، کو نبی پر نازل کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سورہ نحل کی ۴۴ ویں آیت میں فرماتا ہے:

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ  
مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ -

۱۰ اے نبی! ہم نے یہ ذکر تمہاری طرف نازل کیا ہے  
تاکہ تم لوگوں کے سامنے اُس چیز کی وضاحت کرو جو

اُن کی طرف بھیجی گئی ہے۔

اس مقصد کا تقاضا یہ تھا کہ لازماً ایک انسان ہی کو پیغمبر بنا کر بھیجا جائے۔ "ذکر" فرشتوں کے ذریعے بھی بھیجا جا سکتا تھا۔ بلکہ براہِ راست چھاپ کر ایک ایک انسان تک بھی پہنچایا جا سکتا تھا۔ مگر محض ذکر بھیج دینے سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت و ربوبیت اُس کی تشریح کی متقاضی تھی۔ اُس مقصد کی تکمیل کے لیے تو ضروری تھا کہ اس ذکر کو ایک قابل ترین انسان سے کر آئے۔ وہ اس کو تھوڑا تھوڑا

کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جن کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتے اُس کا مطلب سمجھائے جنہیں کچھ شک ہو ان کا شک رفع کرے۔ جنہیں کوئی اعتراض ہو اُن کے اعتراض کا جواب دے۔ جو مذاہم اور مخالفت اور مزاحمت کریں اُن کے مقابلہ میں وہ اُس طرح کاروبار برت کر دکھائے جو اس ذکر کے حاملین کی شان کے شایاں ہے۔ جو ان میں انہیں زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو کے متعلق ہدایات دے۔ اُن کے سامنے خود اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر پیش کرے اور اُن کو انفرادی و اجتماعی تربیت دے کر ساری دُنیا کے سامنے ایک ایسی سوسائٹی کو بلور مثال رکھ دے جس کا پورا اجتماعی نظام ذکر کے غشا کی شرح ہو۔ اللہ

انسان کی رہنمائی کے لیے انسان ہی نبی ہو سکتا ہے

پیغمبر کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ اگر پیغامِ سادہ سے، بلکہ اُس کا کام یہ بھی ہے کہ اس پیغام کے مطابق انسانی زندگی کی اصلاح کرے۔ اُسے انسانی احوال پر اُس پیغام کے اصولوں کا انطباق کرنا ہوتا ہے۔ اُسے خود اپنی زندگی میں ان اصولوں کا عملی مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔ اُسے اُن بے شمار مختلف انسانوں کے ذہن کی گتھیاں سلجھانی پڑتی ہیں جو اس کا پیغام سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُسے ماننے والوں کی تنظیم اور تربیت کرنی ہوتی ہے تاکہ اس پیغام کی تعلیمات کے مطابق ایک معاشرہ وجود میں آسکے۔ اُسے انکار اور مخالفت و مزاحمت کرنے والوں کے مقابلے میں جدوجہد کرنی ہوتی ہے تاکہ بگاڑ کی حمایت کرنے والی طاقتوں کو نیچا دکھایا جاسکے اور وہ اصلاح عمل میں آسکے جس کے لیے خدا نے اپنا پیغمبر مبعوث فرمایا ہے۔ یہ سارے کام جبکہ انسانوں ہی میں کرنے کے ہیں تو ان کے لیے انسان نہیں تو اور کون بھیجا جاتا؟ فرشتے تو زیادہ سے زیادہ یہی کرتا کرتا اور پیغام پہنچا کر چلا جاتا۔ انسانوں میں انسان کی طرح رہ کر انسان کے سے کام کرنا اور پھر انسانی زندگی میں منشا سے الہی کے مطابق اصلاح کر کے دکھانا کسی فرشتے کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کے لیے تو ایک انسان ہی موزوں ہو سکتا تھا۔ اللہ

# بشریت نسبتاً

آدم بشر تھے

وَلَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاكُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ ۗ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْرٰهٖمَ ۗ وَنُوْحًا ۗ وَاٰدَمَ ۗ سَجَدُوْۤا ۗ فَسَجَدُوْۤا ۗ

یہ جو فرمایا کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہاری صورت بنائی، پھر فرشتوں سے کہا آدم کو سجدہ کرو۔

یہ جو فرمایا کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی ابتدا کی، پھر تمہیں صورت بخشی، پھر فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا، اور تمہارا مادہ آفریش تیار کیا، پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی، پھر جب ایک زندہ انسان کی حیثیت سے آدم وجود میں آگیا تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ آدم علیہ السلام کو جو سجدہ کرایا گیا تھا وہ آدم ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ نوبہ انسانی کا فائدہ ہونے کی حیثیت سے تھا۔ اس آیت کی یہ تشریح خود قرآن مجید میں دوسرے مقامات پر بیان ہوتی ہے مثلاً سورہ ص:

۵ رکوع میں ہے:

تصویر کرو اس وقت کا جبکہ تمہارے رب نے فرشتوں

اِذْ قَال رَبِّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْۤ اٰتٰی خٰلِقٌۭ لِّبَشَرٍۭ

سے کہا کہ میں ایک بشر مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں

مَنْ طَبَعُوْهُ فَاِذْ اَسْوٰۤاۤنٌۭ وَّلَقْنٰتٌۭ جٰبِرٍۭ

پھر جب میں اسے پوری طرح تیار کر لوں اور اس کے

مِنْ رُوْحِیْ فَقَعُوْۤاۤ اِلَیْہٖۤ سٰجِدٍۭیۡنَ ۙ

اندرونی روح سے کچھ چھونک دوں تو تم سب اس کے

۵ رکوع ۵

آگے سجدہ میں گر جانا

اس آیت میں وہی تین مراتب ایک دوسرے انداز میں بیان کیے گئے ہیں یعنی پہلے مٹی سے ایک بشر کی تخلیق پھر اس کا شریعہ، یعنی اس کی شکل و صورت بنانا اور اس کے اعضاء اور اس کی قوتوں کا تناسب قائم کرنا، پھر اس کے

وضوح رہے کہ یہاں صرف ایسے چند آیات و کلام ذکر کیا گیا ہے جن کی بشریت پر قرآن میں صراحت سے کہا گیا ہے یا مطلقاً نہ کرئی تفصیل بحث کی ہے۔ (مترجمین)

اندر اپنی روح سے کچھ چھوڑ کر آدم کو موجود میں لے آنا۔ اسی مضمون کو سورہ بقرہ کو ع ۳ میں باہمی الفاظ اور کیا گیا ہے

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰئِكَةِ اِنِّيْ خَارِجٌ  
بَشَرًا مِّنْ سَلْصَالٍ مِّنْ سَمَاءٍ مَّنْسُوْبٍ  
فَاذْاَسْوَيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ  
فَتَعْوَالَهُ سٰجِدِيْنَ ۝ ٥ راجز ۲۸-۲۹

اور تصور کرو اس وقت کا جب تمہارے رب نے  
فرشتوں سے کہا کہ میں تمہارا بھی ہوئی مٹی کے حمارے  
سے ایک بشر پیدا کرتے والا ہوں، پھر جب میں اُسے  
پوری طرح تیار کر لوں اور اُس کے اندر اپنی روح سے

کچھ چھوڑ دوں تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا ۵

### نوح علیہ السلام کی بشریت

اور دروغ نہ کہا، میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس  
اللہ کے فرستے ہیں، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا  
علم رکھتا ہوں۔ نہ یہ میرا دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ  
ہوں۔ اور یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ جن لوگوں کو تمہاری  
آنکھیں حقارت سے دیکھتی ہیں انہیں اللہ نے کوئی  
بھلائی نہیں دی۔ ان کے نفس کا حال اللہ ہی بہتر  
مانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو ظالم ہوں گا۔

وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ عِندِيْ خَزَايِنُ اللّٰهِ وَ  
لَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا اَعُوْلُ اِنِّيْ مَتَكٌ وَّ  
لَا اَعُوْلُ بِذٰلِيْنَ تَزُوْرٰتِ اٰمِيْنِكُمْ لَوْنِ  
يُوْرِيْكُمْ اللّٰهُ خَيْرًا لِّلّٰهِ اَنْظَرَكُمْ بِمَا فِى  
اَنْفُسِكُمْ ۝ اِنِّيْ اِذَا لَمْتُ الظّٰلِمِيْنَ ۝  
دعوت۔ آیت (۳)

یہ اس بات کا جواب ہے جو مخالفین نے کہی تھی کہ ہمیں تو تم میں اپنے ہی جیسے ایک انسان نظر آتے ہو۔ اس پر  
حضرت نوح فرماتے ہیں کہ واقعی میں ایک انسان ہی ہوں۔ میں نے انسان کے سوا اور کچھ ہونے کا دعویٰ کب کیا تھا کہ  
مجھ پر یہ اعتراض کرتے ہو۔ میرا دعویٰ جو کچھ ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ خدا نے مجھے علم و عمل کا سیدھا راستہ دکھایا ہے۔  
اس کی آزمائش تم میں طرح چاہو کہ لو۔ مگر اس دعویٰ کی آزمائش کا یہ کونسا طریقہ ہے کہ کبھی تم مجھ سے غیب کی خبریں  
پوچھتے ہو، اور کبھی ایسے ایسے عجیب مطالبے کرتے ہو کہ گویا خدا کے خزانوں کی ساری کتابیں میرے پاس ہیں، اور کبھی  
اس بات پر اعتراض کرتے ہو کہ میں انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور چلتا پھرتا ہوں، گویا میں نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ  
کیا تھا۔ جن آدمی نے عقائد، اخلاق اور تمدن میں صحیح رہبری کا دعویٰ کیا ہے اُس سے ان چیزوں کے متعلق جو چاہو  
پوچھو، مگر تم عجیب لوگ ہو جو اس سے پوچھتے ہو کہ فلاں شخص کی بھینس کٹا رہنے لگا یا پڑیا۔ گویا انسانی زندگی کے لیے  
صحیح اصول اخلاق و تمدن بنانے کا کوئی تعلق بھینس کے عمل سے ہی ہے۔ ۱۲۳

۱۔ اس سے ثابت ہوا کہ پہلا نبی ہی بشر تھا، کیونکہ اسلام کا یہ مسلم عقیدہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے (مترجم)

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ  
مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ لَا يُرِيدُ أَنْ يَنْزِلَ  
عَلَيْكُمْ وَكَوْنًا آيَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا  
سَمِعْنَا بِمِثْلِهِ فِي الْآبَاءِ الَّذِينَ هُمْ  
إِلَّا رَجُلٌ يَدْعُو بِجَنْدٍ فَتَرْتَابُوا بِهِ خَتَّى جِيءَ  
وَالْمُؤْمِنُونَ - آيات ۲۳-۲۵

” اُس کی ذمینی حضرت نوح کی قوم کے جن سرداروں  
نے منہ سے انکار کیا وہ کہنے لگے کہ یہ شخص کچھ نہیں  
ہے مگر ایک بشرِ نغم ہی جیسا۔ اس کی غرض یہ ہے کہ  
تم پر بیزاری حاصل کرے۔ اللہ کو اگر بھیجا ہوتا تو  
فرشتے بھیجتا۔ یہ بات تو ہم نے اپنے باپ دادا کے  
دقتوں میں سنی ہی نہیں کہ بشر رسول بن کر آئے،  
کچھ نہیں، بس اس آدمی کو ذرا جنون لاسی ہو گیا ہے،  
کچھ نرت اور دیکھ لو (شاید افاقہ ہو جائے)۔

یہ خیال تمام گمراہ لوگوں کی مشترک گمراہیوں میں سے ایک ہے کہ بشر نبی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن نے بار بار اس  
جاہلانہ تصور کا ذکر کے اس کی تردید کی ہے اور اس بات کو پورے زور کے ساتھ بیان کیا ہے کہ تمام انبیاء انسان تھے  
اور انسانوں کے لیے انسان ہی ہونا چاہیے۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرِيكَ  
إِلَّا بَشَرًا مِثْلَهُمْ وَمَا نُرِيكَ إِلَّا الْإِنْسَانَ هُمْ  
أَرَادُوا لِنَادِي الشَّامِيِّ ۚ (مومود - ۲۴)

جواب میں اس کی ذمینی حضرت نوح کی قوم کے سرداروں  
جنہوں نے اس کی بات ماننے سے انکار کیا تھا، بولے  
ہماری نظر میں تو تم اس کے سوا کچھ نہیں ہو کہ میں ایک  
انسان ہوں جیسے۔ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری قوم میں سے بس ان لوگوں نے جو ہمارے ان ارادوں کے لیے آئے  
کچھ تپاری پیروی اختیار کر لی ہے۔

یہ وہی قدیم جاہلانہ اعتراض ہے جو کہ کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں پیش کرتے تھے کہ جو شخص ہماری  
بی طرح کا ایک معمولی انسان ہے، کھاتا پیتا ہے، چلتا پھرتا ہے، سوتا اور جاگتا ہے، بال بچے رکھتا ہے، آخر تم کیسے  
ہاں میں کہ وہ خدا کی طرف سے پیغمبر مقرر ہو کر آیا ہے۔

أَوْحَيْتُمْ أَنْ جَاءَ أَرَاكُنْ ذِكْرًا مِنْ رَبِّكُمْ  
عَلَىٰ رَجُلٍ مِثْلِكُمْ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيُخَوِّفَكُمْ  
تَعَلَّمْتُمْ نَحْمُونَ (الاعراف - آیت ۶۴)

حضرت نوح نے کہا ” کیا تمہیں اس بات پر تعجب ہوا  
کہ تمہارے پاس خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے  
ذمہ تمہارے رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار  
کرے اور تم غلط روی سے بچ جاؤ اور تم پر حکم کیا جائے؟

### حضرت ہود کی بشریت

” اس کی ذمینی حضرت ہود کی قوم کے جن سرداروں

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ  
مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ لَا يُرِيدُ أَنْ يَنْزِلَ  
عَلَيْكُمْ وَكَوْنًا آيَةً لِلَّذِينَ كَفَرُوا  
سَمِعْنَا بِمِثْلِهِ فِي الْآبَاءِ الَّذِينَ هُمْ  
إِلَّا رَجُلٌ يَدْعُو بِجَنْدٍ فَتَرْتَابُوا بِهِ خَتَّى جِيءَ  
وَالْمُؤْمِنُونَ - آيات ۲۳-۲۵

الْآخِرَةَ وَآتَوْهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا مَا كَانُوا  
 إِلَّا نَبْرًا مِمَّا كَانُوا يَكْفُرُونَ ۗ وَإِنَّمَا كُنَّا لَكُمْ  
 بَشَرًا مِمَّا تَشْكُرُونَ ۗ وَلَكِن آطَعْتُمْ قَبْلَ  
 تَشْكُرِكُمْ أَن كُنْتُمْ إِذْ أَخْبَرْتُمْ أَنَّ ۗ (المؤمنون ۳۴-۳۶)

نہ کفر کیا تھا اور آخرت کو جھٹلایا تھا اور جنہیں ہم نے دنیا  
 کی زندگی میں خوشحالی سے رکھی تھی، کہا کہ بیشخص کو پھر بھی نہیں  
 ہے، میں ایک بشر ہے تم ہی جیسا جو کچھ تم کھاتے ہو وہی  
 یہ کھاتے ہے اور جو کچھ تم پیتے ہو وہی یہ پیتا ہے۔ اب

اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو کھاتے ہی میں رہتے ؟

بعض لوگوں نے یہ غلط سمجھا ہے کہ یہ باتیں وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کرتے تھے۔ نہیں، یہ خطاب و اصل  
 لوام اناس سے تھا۔ سرداران قوم کو جب خطرہ ہوا کہ عوام پیغمبر کی پاکیزہ شخصیت اور دل لگتی باتوں سے متاثر ہو جائیں گے  
 اور ان کے متاثر ہو جانے کے بعد ہماری سرداری پیکر کس پر چلی گی تو انہوں نے یہ تقریریں کر کے عام لوگوں کو بھگانا  
 شروع کیا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے پیغمبری و پیغمبری کچھ نہیں ہے۔ محض اقتدار کی ٹھوک ہے جو اس شخص سے  
 یہ باتیں کر رہی ہے۔ بھائیو ذرا غور کرو کہ وہ آخر یہ شخص تم سے کس چیز میں غفلت ہے۔ ویسا ہی گوشت پوست کا  
 آدمی ہے جیسے تم ہو۔ کوئی فرق اس میں اور تم میں نہیں ہے پھر کہیں یہ ٹرا بنے اور تم اس کے فرمان کی اطاعت کرو۔ ان  
 تقریروں میں یہ بات گویا بلا نزاع تسلیم شدہ تھی کہ ہم جو تمہارے سردار ہیں تو ہمیں تو ہونا ہی چاہیے۔ ہمارے گوشت پوست  
 اور کھانے پینے کی نوعیت کی طرف دیکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو آپ سے آپ قائم اور مستم ہے البتہ  
 زیر بحث یہ نئی سرداری ہے جو اب قائم ہوتی نظر آ رہی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی بات ان سرداران قوم کی بات  
 سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی جن کے نزدیک قابل انعام اگر کوئی چیز تھی تو وہ اقتدار کی ٹھوک جو کسی سے آنے والے  
 کے اندر انہیں محسوس ہو، یا جس کے ہونے کا شبہ کیا جاسکے۔ رہا ان کا اپنا سیٹ تو وہ سمجھتے تھے کہ اقتدار بہر حال  
 اس کی فطری خوراک ہے جس سے اگر وہ بدبھنی کی تھک بھی بھر جائے تو قابل اغراض نہیں۔ لہذا

قَالَ لِيَقُومَ لَيْسَ فِي سَفَاهَةٍ وَ لَكِنِّي  
 رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۗ أَلَيْسَ لَكُمْ  
 رَسُولٌ رَبِّي وَإِنَّا لَكُمْ ناصِحٌ أَمِينٌ ۗ  
 أَدْعَابِكُمْ أَن جَاءَكُمْ ذِكْرًا مِّن رَّبِّكُمْ فَخُذُوا  
 رَجُلًا مِّنكُمْ لِيَتَذَكَّرَ بِهِ ۗ

اُس نے برعین حضرت ہوئے، کہا "اُسے سرداران قوم  
 میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں بلکہ میں رب العالمین کا  
 رسول ہوں، تم کو اپنے رب کے پیغامات پہنچانا ہونا  
 اور تمہارا ایسا خیر خواہ ہوں جن پر بھروسہ کیا جاسکتا  
 ہے۔ کیا تمہیں اس بات پر غیب ہوا کہ تمہارے پاس  
 خود تمہاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمہارا

والاعراف، ۱۷۹ تا ۱۸۴

رب کی یاد دہانی آئی تاکہ تمہیں خبردار کرے ؟

انہوں نے کہا اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے بھیجا، لہذا ہم

قَالُوا كَوَيْتًا رَبِّنَا لَأَنزَلْنَا مَلَائِكَةً فَإِنَّا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَلْبَسُوْا لِكُلِّ يَوْمٍ زِيْنًا ۗ (موم السجده: ۱۳)

حضرت صالح و شعیب کی بشرت

قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتُمْ مِنَ الْمَشْكُوْرِيْنَ ۝ مَا اَنْتُمْ

اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۗ قَالُوْا يَا بَنِيَّ اِن كُنْتُمْ مِنَ

الضّٰلِقِيْنَ ۝ (الشعراء: ۱۵۳-۱۵۴)

قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتُمْ مِنَ الْمَشْكُوْرِيْنَ ۝ مَا

اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۗ اِن نُّخَلِّقُكَ لَسِعْتِ

اَنْكٰرٍ يٰحِيَّةُ ۙ (الشعراء: ۱۵۵-۱۵۶)

حضرت موسیٰ و ہارون کی بشرت

فرعون اور اس کے درباریوں نے حضرت موسیٰ اور ہارون کے متعلق کہا:

مَخٰلِكًا ۗ اَفَلَا مِّنْ يَّبَشَرِيْنَ مِثْلِنَا ۗ وَقَوْمُهُمْ

لَنَا غِيْبَةٌ وَّ اَنْتُمْ اَنْتُمْ ۗ (القصص: ۳۷)

تمام انبیاء کی بشرت

قَالَتْ فَطَعْنُوْهُم مِّثْلَ عَمْرٰنَ ۗ اِنَّ اِلٰهَكُمْ

يَسْتَلِكُمْ ۗ وَاَنْتُمْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهِمْ ۗ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ (ابراہیم: ۱۱)

اُس بات کو نہیں مانتے جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔

ذمہ کی قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ تو محض ایک

سوزدہ آدمی ہے تو ہم بھیے ایک انسان کے سوا اور

کیا ہے۔ لاکرئی نشانی اگر تو سچا ہے۔

انہوں نے کہا تو محض سوزدہ آدمی ہے اور تو کچھ نہیں

ہے مگر ایک انسان ہم ہی جیسا، اور ہم تو تجھے جھوٹا

آدمی سمجھتے ہیں۔

کہنے لگے، کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان

لے آئیں؟ اور آدمی بھی وہ جن کی قوم ہماری بندگی ہے۔

ان کے رسولوں نے ان سے کہا، واقعی ہم کچھ نہیں ہیں

مگر تم ہی جیسے انسان لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے

جس کو چاہتا ہے نراتا ہے۔

یعنی بلاشبہ ہم ہیں تو انسان ہی مگر اللہ نے تمہارے درمیان ہم کو علم فی اور بصیرت کا طرہ عطا کرنے کے لیے منتخب کیا

ہے۔ اس میں تمہارے بس کی کوئی بات نہیں یہ تو اللہ کے اختیارات کا معاملہ ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو جو

چاہے دے۔ ہم نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ جاوے پاس آیا ہے وہ تمہارے پاس بھجوا دی، نہ یہی کر سکتے ہیں کہ جو

حقیقتیں ہم پر عکسیت ہوتی ہیں ان سے اکھیں بند کر لیں۔

انہوں نے رسولوں کو جواب دیا کہ تم کچھ نہیں ہو مگر ویسے ہی انسان

جیسے ہم ہیں تمہیں ان بستیوں کی بندگی سے روکنا چاہئے جو تم

بندگی باپ دادا سے ہوتی چلی آ رہی ہے اچھا تو لاؤ کوئی میری بندگی

قَالُوْا اِن اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۗ اِن كُنْتُمْ

اِن نُّخَلِّقُكُمْ مِّثْلَنَا ۗ اِن نُّخَلِّقُكُمْ مِّثْلَنَا ۗ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ (ابراہیم: ۱۰)

ان کا مطلب یہ تھا کہ تم پر حقیقت سے بالکل ہم جیسے انسان ہی نظر آتے ہو۔ کھلتے ہو پیتے ہو۔ سوتے ہو۔ یومی پتے

رکتے ہو۔ بھوک پیاس، بیماری، دنگی، سڑی، مٹی، ہر چیز کے احساس ہیں اور ہر شے کی کڑوی میٹھا کڑوا شہادہ ہر تباہی اور کوئی

غیر معمولی پن میں نظر نہیں آتا جس کی بنا پر ہم یہاں میں کلمہ کلمہ لپٹے ہوئے لوگ ہر روز تمہارے ہم کلام بننا ہے اور فرشتے تمہارے پاس آتے ہیں

# نبی اکرم بھی انسان تھے

گفاریتہ کہتے تھے کہ محمد رسول نہیں ہیں کیونکہ وہ انسان ہیں۔

وَقَالُوا لَوْ أَنَّا كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ الرَّسُولِ يُبَايِعُهُمْ بِلَا إِلَهِ إِلَّا اللَّهُ فَذَلِكُمُ الْكُفْرُ الْعَظِيمُ

کہتے ہیں کہ یہ کیا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔

وَأَسْرَدُوا لِلْجَبُونِ الَّذِينَ ظَلَمُوا هَذَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ أَفَتَأْتُونَ الْبُحْرَىٰ وَأَنْتُمْ بَصِيرُونَ - (الانبیاء: ۳)

اور یہ ظالم لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص ذمعی محمد صلی اللہ علیہ وسلم، تم جیسے ایک بشر کے سوا آخر اور کیا ہے پھر تم آنکھوں دیکھتے اس جاؤد کے شکار ہو جاؤ گے؟

## قدیم جاہلانہ خیال

قرآن مجید گفاریتہ کے اس جاہلانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ کئی نئی جہالت نہیں ہے جو آج پہلی بار ان لوگوں سے ظاہر ہو رہی ہو۔ بلکہ قدیم ترین زمانے سے تمام جہلاو اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں کہ جو بشر ہے وہ رسول نہیں ہو سکتا اور جو رسول ہے وہ بشر نہیں ہو سکتا۔ تو ہم تو رح کے سرداروں نے جب حضرت نوح کی رسالت کا انکار کیا تھا تو یہی کہتا تھا۔

مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُرِيدُ أَنْ يَتَّعِثَلَ عَلَيْكُمْ وَكُوشَاعًا لَّذُنُ لَأَنْتُمْ مَلَائِكَةٌ - مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي آيَاتِنَا الْأُولَىٰ - (المؤمنون: ۲۳)

یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا۔ اور چاہتا ہے کہ تم پر اپنی مصلحت ہمارے حالانکہ اللہ جانتا تو فرشتے نازل کرتا۔ ہم نے تو بات کبھی اپنے باپ دادا سے نہیں سنی کہ انسان رسول بن کر آئے۔

قریم عا د نے یہی بات حضرت بو بک کے متعلق بھی کہی تھی کہ:

مَا هَذَا إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ بَأَكْرَمِ مَا نَكُونُ

یہ شخص کچھ نہیں ہے مگر ایک بشر تم ہی جیسا۔ کھاتا ہے



وہی کچھ جو تم کھاتے ہو اور پیتا ہے وہی کچھ جو تم پیتے ہو۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اہانت کر لی تو تم بڑے گھٹلے میں رہو۔

مِنْهُ وَ يَشْرَبٌ مِّمَّا تَشْرَبُونَ ۝ وَالَّذِينَ  
أَطَعْتُمْ لِيَسْرًا وَعِثْكُمْ بِكُمْ إِذَا انْخَرَفْتُمْ  
(المؤمنون: ۳۳-۳۴)

قوم ٹھونڈے حضرت صالح کے متعلق بھی یہی کہا تھا کہ:

کیا ہم اپنے میں سے ایک بشر کی پیروی اختیار کریں؟

أَبَشْرًا مِّمَّا وَاحِدًا أَنْذَعْتُمْ (القمر: ۲۴)

اور یہی معاملہ قریب قریب تمام انبیاء کے ساتھ پیش آیا کہ گفار نے کہا اِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا تم کچھ نہیں ہو مگر ہم جیسے بشر اور انبیاء نے ان کو جواب دیا کہ اِنْ غُلِبْنَا الْغُلْبَةَ إِلَّا نَبَشْرٌ مِّثْلِكُمْ وَلَٰكِنْ اَللّٰهُ يَمُنُّ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِمَّنْ يَبْدَأُ ۝ ۱۱۰ (ابراہیم: ۱۱-۱۰)

ہدایت پانے میں رکاوٹ

اس کے بعد قرآن مجید کہتا ہے کہ یہی جاہلانہ خیال ہر زمانے میں لوگوں کو ہدایت قبول کرنے سے باز رکھتا رہا اور اسی بنا پر قوموں کی شامت آئی ہے۔

کیا انہیں ان لوگوں کی خبر نہیں پہنچی جنہوں نے اس سے پہلے کفر کیا تھا اور پھر اپنے کیے کا مزا کھکھ لیا اور آگے ان کے پیسے دردناک عذاب ہے؟ یہ سب کچھ اس لیے بڑا کہ ان کے پاس ان کے رسول کھلی گلی دلیس لے کر آئے رہے مگر انہوں نے کہا کیا اب

الْمَرْيَا بِتُكْفَرُوا نَبَاؤَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلُ  
قَدْ أَفْوَاهًا وَإِنَّمَا أَصْرُهُمْ وَاكْفَرُوا عَذَابًا  
أَلِيمٌ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُ كَانَتْ تَأْيِيهِمْ وَرُسُلِهِمْ  
بِالْبَيِّنَاتِ فَتَالُوا أَلَيْسَ بَشَرًا مِّثْلُكُمْ وَأَلَيْسَ  
بَشَرًا مِّثْلُكُمْ ۝ (التغابن: ۶)

انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟ (اسی بنا پر انہوں نے کفر کیا اور گنہ بھیر گئے)

لوگوں کے پاس جب ہدایت آئی تو انہوں نے پیرا نہیں ایمان لانے سے روکنے والی اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر

وَمَا مَنَعَهُ النَّاسُ أَنْ يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمْ  
الْحُكْمُ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَلَيْسَ بَشَرًا  
مِّثْلُنَا ۝ (سورہ ابراہیم: ۹)

بھیج دیا؟

یعنی ہر زمانے کے جاہل لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے جب کوئی رسول آیا تو انہوں نے یہ دیکھ کر کہ وہ کھانا کھاتا ہے، پیو پیتا ہے، پیو پیتا ہے، گشت پوست کا بنا ہوا ہے، فیصلہ کر دیا کہ یہ پیغمبر نہیں ہے کیونکہ بشر کبھی پیغمبر نہیں ہے۔ اور عجیب وہ گنہہ گنہہ گیا تو ایک مدت کے بعد اس کے عقیدت مندوں

میں ایسے لوگ پیدا ہونے شروع ہو گئے جو کہنے لگے کہ وہ بشر نہیں تھا، کیونکہ پیغمبر تھا۔ چنانچہ کسی نے اس کو خدا کا بیٹا کہا، اور کسی نے کہا کہ خدا اس میں مخلوق کر گیا تھا۔ غرض بشریت اور پیغمبری کا ایک ذات میں جمع ہونا جاہلوں کے لیے ہمیشہ ایک سماہی بنا رہا۔ ۱۲۹

ہمیشہ انسانوں ہی کو رسول بنایا گیا

پھر قرآن مجید پوری مہارت کے ساتھ کہتا ہے کہ اللہ نے ہمیشہ انسان ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے اور انسان کی ہدایت کے لیے انسان ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ کوئی فرشتہ یا بشریت سے بالاتر کوئی ہستی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ إِلَّا رِجَالًا مِّنْهُمْ  
 لِيَتْلُوهُم مَّا أُنزِلَ عَلَيْهِمْ لِيَتْلُوهُم مِّنْ أُمَّةٍ  
 لَّا يَعْلَمُونَ ۚ وَمَا جَعَلْنَاهُمْ حَسَدًا إِلَّا  
 يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ ۝

اسے نبی ہونے تم سے پہلے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا ہے جن پر ہم وحی کرتے تھے۔ اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو۔ اور ہم نے ان کو ایسے جسم نہیں بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھاتیں اور نہ وہ ہمیشہ پینے والے تھے۔

الانبیاء: ۷۷-۷۸

قُلْ لَوْ كَانَتْ فِي الْأَرْضِ مَلَائِكَةٌ يُّنشِرُونَ  
 السَّمْعَ لَكُنَّا عَنْكُمْ مِنَ السَّمْعَاءِ  
 مَلَكًا رَسُولًا ۚ (نبی اسرائیل: ۹۵)

اے نبی، (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ان پر فرشتے ہی کو رسول بنا کر نازل کرتے۔ ۱۳۰

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا  
 نُوْحِي إِلَيْهِمْ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ۗ أَفَلَا يَسِيرُونَ  
 فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ  
 الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ وَكَيْفَ الْأُولَىٰ  
 الْأَخْيَارُ ۗ حَسْبُ لِلَّذِينَ أَتَوْا أَفَلًا لَّعَالُونَ ۚ

وہ اے لوگو! ہم سے پہلے ہم نے جو پیغمبر بھی بھیجے تھے، وہ سب انسان ہی تھے اور انہی بستیوں کے رہنے والوں میں سے تھے۔ اور انہی کی طرف ہم وحی بھیجتے رہے ہیں۔ پھر کیا یہ لوگ زمین میں پہلے پھرے نہیں ہیں، ان قوموں کا انجام انہیں نظر نہ آیا جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں؟ یقیناً آخرت کا گھڑا ان لوگوں کے لیے اور زیادہ بہتر (پرست: ۱۰۹)

ہے جنہوں نے پیغمبروں کی بات مان کر، انہی کی روش اختیار کی، کیا اب میں تم لوگ نہ سمجھو گے؟

یہاں ایک بہت بڑے مضمون کو دو تین جملوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اس کو اگر کسی تفصیلی عبارت میں بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ تمہاری بات کی طرف اس لیے توجہ نہیں کرتے کہ جو شخص کل ان کے شہر میں پیدا ہوا اور اپنی کے درمیان پچھتے جوان اور جوان سے بڑھا ہوا ہو اس کے منسلک یہ کہے مان لیں کہ ایک ایک روز خدا نے اسے اپنا پیغمبر مقرر کر دیا ہے۔ لیکن یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے جس سے آج دنیا میں سنی مرتبہ انہی کو سابقہ پیش آیا ہو اور امت

پہلے بھی خدا اپنے نبی بھیج چکا ہے اور وہ سب بھی انسان ہی تھے۔ پھر یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ اچانک ایک اجنبی شخص کسی شہر میں نمودار ہو گیا ہو اور اس نے کہا ہو کہ میں پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ بلکہ جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اٹھائے گئے وہ سب ان کی اپنی ہی بستوں کے رہنے والے تھے۔ مسیح، موسیٰ، ابراہیم، نوح (عظیم السلام) آخر کون تھے؟ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جن قوموں نے ان لوگوں کی دعوتِ اصلاح کو قبول نہ کیا اور اپنے بے نیاد عقیدت اور بے حکام خواہشات کے پیچھے چلتی رہیں، ان کا انجام کیا ہوا۔ تم خود اپنے تجارتی سفروں میں عمار، ثمود، ذہین اور قوم لوط وغیرہ کے بناؤ شدہ علاقوں سے گزرتے رہے ہو۔ کیا وہاں کوئی سبق نہیں نہیں ملا؟ یہ انجام جو انھوں نے دنیا میں دیکھا، یہی تو خبر دے رہا ہے کہ عاقبت میں وہ اس سے بدتر انجام دیکھیں گے۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے دنیا میں اپنی اصلاح کرنی وہ صرف دنیا ہی میں اچھے نہ رہے، آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ بہتر ہوگا۔ اللہ

### بینا اور نابینا کا فرق

قُلْ لَّا أَقُولُ نَكْمُرُ عَلَيْكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ  
 لَّا أَعْلَمُ الْغَيْبُ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَكَلَّمٌ  
 إِنِّي أَنْبِئُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ مَا تَقُلْ هَلْ لَسِنَتِي  
 إِلَّا عُنْفَىٰ ۖ وَالْبَصِيرُ بَأْخَلَا تَشْكُرُونَ -  
 (الانعام: ۱۰۵)

اے محمد! ان سے کہو: میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔ پھر ان سے پوچھو کیا انہما اور آنکھوں والوں کے برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟

میں جن حقیقتوں کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کا میں نے مشاہدہ کیا ہے، وہ براہِ راست میرے تجربے میں آئی ہیں۔ مجھے وحی کے ذریعہ سے ان کا ٹھیک ٹھیک علم دیا گیا ہے، ان کے بارے میں میری شہادت آنکھوں دیکھی شہادت ہے۔ بھلا ان اس کے تم ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو کہ ان کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہو۔ وہ یا تو قیاس و گمان پر مبنی ہیں۔ یا محض اندھی تقلید پر۔ لہذا میرے اور تمہارے درمیان بینا اور نابینا کا سا فرق ہے۔ اور اسی بنا پر مجھے تم پر فوقیت حاصل ہے۔ نہ اس اعتبار سے کہ میرے پاس خدائی کے خزانے ہیں یا میں عالم الغیب ہوں یا انسانی کمزوریوں سے متبر ہوں۔ ۱۳۲

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّن قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا  
 لَهُمْ أَزْوَاجًا وَذُرِّيَّةً ۗ (الرعد: ۳۸)

اور اے نبی! تم سے پہلے ہی ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں اور ان کو ہم نے بیوی بچوں والا ہی بنا دیا تھا۔

یہ ایک اعتراض کا جواب ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا جاتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ اچھا نبی ہے جو بری اور نیچے رکھتا ہے۔ بھلا پیغمبروں کو بھی خواہشاتِ نفسانی سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟ ۱۳۳

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

### نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے تھا

إِذْ جَاءَتْهُمْ الرُّسُلُ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ  
 وَمِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا اللَّهَ لَمَّا قَالُوا  
 كُونُوا زُرِّيًّا لَا نَزْلَ لَكُمْ مَلَائِكَةٌ فَاِنَّا بِكُمْ كَاذِبِينَ  
 رقم السجده - ۱۲۳

جب خدا کے رسول اُن کے پاس آئے اور انہیں سچا یا کفر اللہ کے سوا کسی  
 کی بندگی نہ کرو تو انہوں نے کہا ہمارا رب چاہتا  
 تو فرشتے بھیجتا، لہذا ہم اس بات کو نہیں مانتے جس  
 کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔

یعنی اگر اللہ کو ہمارا یہ مذہب پسند نہ ہوتا اور وہ اس سے باز رکھنے کے لیے ہمارے پاس کوئی رسول بھیجتا چاہتا تو  
 فرشتوں کو بھیجتا۔ تم چونکہ فرشتے نہیں ہو بلکہ ہم جیسے انسان ہی ہوں اس لیے ہم یہ نہیں مانتے کہ تم کو خدا نے بھیجا ہے۔ اور اس غرض  
 کے لیے بھیجا ہے کہ ہم اپنا مذہب چھوڑ کر وہ دین اختیار کر لیں جسے تم پیش کر رہے ہو۔ کفار کا یہ کہنا کہ جس چیز کے لیے تم  
 بھیجے گئے ہو اُسے ہم نہیں مانتے، محض طنز کے طور پر تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو خدا کا بھیجا ہوا مانتے تھے اور  
 پھر ان کی بات مانتے سے انکار کرتے تھے، بلکہ یہ اُسی قسم کا طنز یہ اندازہ بیان ہے جیسے فرعون نے حضرت موسیٰ کے متعلق  
 اپنے درباریوں سے کہا تھا کہ اِنَّ رُسُوْلَكُمْ الَّذِيْ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ كَذِبُوْنَ (الشعراء، آیت ۲۴) یہ رسول صاحب جو  
 تمہارے پاس بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔

### نبی ہوتا تو کوئی بُرا آدمی ہوتا

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَذَا الْقُرْآنُ عَلٰی  
 رُسُلٍ مِّنَ الْفَرَسِيِّنَ عَظِيْمٍ (الزُّمُر، ۲۱)

کہتے ہیں، یہ قرآن دونوں شہروں کے بڑے آدمیوں  
 میں سے کسی پر کیوں نہ نازل کیا گیا؟

دونوں شہروں سے مراد مکہ اور مَدِیْنَةُ مَدِیْنَةُ ہیں۔ کفار کا یہ کہنا تھا کہ اگر واقعی خدا کو کوئی رسول بھیجتا ہوتا اور وہ اس پر  
 اپنی کتاب نازل کرنے کا ارادہ کرتا تو ہمارے ان مرکزی شہروں میں سے کسی بڑے آدمی کو اس غرض کے لیے منتخب کرتا،  
 رسول بنانے کے لیے اشد میاں کو ملا بھی تو وہ شخص جو تنہا پیدا ہوا جس کے حصے میں کوئی میراث نہ آتی، جس نے بکریاں  
 بچرا کر جوائی گزار دی، جو اب گزر اوقات بھی کرتا ہے تو بیوی کے مال سے تجارت کی کہ جو کسی غیبی کا شیخ یا کسی خانوادے  
 کا سربراہ نہیں ہے۔ کیا تمہیں ولید بن مغیرہ اور عقیب بن ربیعہ جیسے نامی گرامی سردار موجود نہ تھے؟ کیا طاقت میں عروہ  
 بن مسعود، سبیب بن مکرزہ، کنانہ بن عبد مکرزہ اور ابن عبد یامیل جیسے رئیس موجود نہ تھے؟ یہ تھا ان لوگوں کا استدلال پہلے تو  
 وہ یہی مانتے تھے کہ کوئی بشر ہی رسول ہو سکتا ہے۔ مگر جب قرآن مجید میں پلے درپلے دلائل دے کر ان  
 نے اس خیال کا پوری طرح ابطال کر دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ اس سے پہلے ہمیشہ بشر ہی رسول ہو کر آتے رہے ہیں  
 اور انسانوں کی ہدایت کے لیے بشر ہی رسول ہو سکتا ہے نہ کہ غیر بشر، اور جو رسول بھی دنیا میں آئے ہیں وہ بیکایک

آسمان سے نہیں اتر آتے تھے بلکہ انہی انسانی بستیوں میں پیدا ہوئے تھے، بازاروں میں چلتے پھرتے تھے، بالی بچوں کی طرح تھے، اور کھانے پینے سے میرا نہ تھے، تو انہوں نے یہ دوسرا پینتزا بدلا کہ اچھا، بشری رسول ہی مگر وہ کوئی بڑا آدمی ہونا چاہیے۔ مالدار ہو۔ با اثر ہو۔ بڑا تھے والا ہو۔ لوگوں میں اس کی شخصیت کی دھماک بھٹی ہوتی ہو۔ محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مرتبے کے لیے کیسے موزوں ہو سکتے ہیں؟ ۳۵

حضور پر سعی معاش کا اعتراض

وَقَالُوا مَا لَٰكِنَّ هَٰذَا الرَّسُولَ يَأْكُلُ الطَّعَامَ  
وَيَسْتَوِي فِي الْأَسْوَاقِ ۗ لَوْلَا أُنزِلَ  
مَلَٰئِكَةٌ مَّعَهُ فَذَبَرُوا ۗ (الفرقان، ۴)

کہتے ہیں یہ کیسا رسول ہے، جو کھانا کھاتا ہے اور  
بازاروں میں چلتا پھرتا ہے کیوں نہ اس کے پاس کوئی  
فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور نہ ماننے

والوں کو دھمکانا؟

یعنی اول تو انسان کا رسول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ خدا کا پیغام لے کر آنا تو کوئی فرشتہ آتا نہ کہ ایک گوشت پرست کا آدمی جو زندہ رہنے کے لیے غذا کا محتاج ہوتا ہے اگر آدمی ہی رسول بنا یا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ مستی ہونا چاہیے تھا جسے دیکھنے کے لیے آنکھیں ترسٹیں اور جس کے حضور بار بار بانی کائنات بری کوششوں سے کسی کو نصیب ہوتا، نہ یہ کہ ایک ایسا عام آدمی خداوند عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں بھینٹا پھرتا ہو۔ بھلا اس آدمی کو کون خاطر میں لاسے گا جسے ہر راہ چلتا روز دیکھتا ہو اور کسی پہلو سے بھی اس کے اندر کوئی غیر معمولی پن نہ پایا جاتا ہو۔ بالفاظ دیگر، ان کی رائے میں رسول کی ضرورت اگر تھی تو عوام الناس کو ہدایت دینے کے لیے نہیں بلکہ جو یہ دکھانے یا ٹھانڈے ہاتھ سے دھونس جمانے کے لیے تھی۔ ۳۶

وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ  
إِلَّا أَنَّهُمْ كَلَّمُوا الطَّعَامَ وَتَلَمَّذُوا  
فِي الْأَسْوَاقِ ۗ وَجَعَلْنَا لِبَعْضِكُمْ  
لِبَعْضٍ فِتْنَةً ۗ أَتَسْبِرُونَ ۗ وَكَانَ رَبُّكَ  
بَصِيرًا (الفرقان، ۲۰)

”اے محمد، تم سے پہلے جو رسول ہم نے بھیجے تھے۔  
وہ سب بھی کھانا کھاتے واسطے اور بازاروں میں  
چلتے پھرتے واسطے لوگ ہی تھے۔ دراصل ہم نے تم  
لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ  
بنا دیا ہے کیا تم سب کو تہمتا رہا رب سب

کچھ دیکھتا ہے۔“

یہ جواب ہے کفار مکہ کی اس بات کا جو وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے کہ کفار مکہ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسمعیل، حضرت موسیٰ اور عیسیٰ سے دوسرے انبیاء سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کی رسالت کو بھی تسلیم کرتے تھے اس لیے فرمایا لیالہ

آخر محمد مصلیٰ اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نزولِ انوارِ انوارِ کبریٰ کیوں اٹھا رہے ہو؟ پہلے کو نہ سنبھلیا گیا ہے جو کھانا نہ کھاتا  
 و ہوا نہ یاد نہ رہا اور میں نہ جانتا پھر ہوا اور تو اس نورِ وحی سے ان میں علمِ علیہ السلام جن کو وہ سب شیعوں نے خدا کا بیٹا بنا رکھا ہے  
 ز اور جن کا حضرت کفار کو نہ بھی کہہ سکتے ہیں، مگر پیڑا تھا، انجیلوں کے اپنے بیان کے مدعا ان کو نہ اپنی کہتے تھے اور یہ انوار  
 میں چلتے پھرتے تھے۔ ۱۳۱۵ھ

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نَحْنُ أَنْزَلْنَا  
 فِيهِمُ الْقُرْآنَ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي كَفَرُوا بِهِمْ وَيَعْلَمِ الَّذِينَ  
 كَفَرُوا لَهُمْ نَجْمًا ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ غَافِلٌ  
 اور سے کہہ، تم سے پہلے ہم نے انسانوں ہی کو  
 رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر یہ ہم وحی کیا کرتے تھے  
 تم لوگ اگر ظلم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو  
 ان صورتوں کو جو تم نے کہا یہ ہم نہیں دیکھتے کہ  
 وہ کھاتے نہ پھرتے اور نہ وہ سدا ہیٹے والے تھے۔

یہ جواب ہے کفار کے اس قول کا کہ یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے۔ وہ ہی مصلیٰ اللہ علیہ وسلم کی اہمیت  
 کو اس بات کی دلیل قرار دیتے تھے کہ آپ ہی نہیں ہو سکتے، جواب دیا ہے کہ چیتا نہ ماننے کے جن بڑے لوگوں کو تو ہا ہے  
 ہو کہ وہ خدا کی عمارت سے بیٹے گئے تھے اور سب بھی بشر تھے اور بشر ہوتے ہوئے ہی خدا کی وحی سے سرخوار ہوئے  
 تھے۔ ۱۳۱۵ھ

ایضاً

## نہیب کا جاہلی تصور اور اسلامی تصور

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا میں نہیب کا عام تصور یہ تھا کہ زندگی سب سے بہت سے امور دنیاوی سے یہ بھی ایک شعبہ ہے، یا دوسرے الفاظ میں انسان کی دنیوی زندگی کے ساتھ یہ ایک شعبہ کی حیثیت رکھتا ہے تاکہ بعد کی زندگی میں نجات کے لیے ایک سرٹیفکیٹ کے طور پر کام آئے۔ اُس کا تعلق عبادت اور نجات سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے۔ جس شخص کو نجات کے بند مرتبہ حاصل کرے۔ وہ اس کے لیے تو ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے تمام دوسرے شعبوں سے بے تعلق ہو کہ صرف اسی ایک شعبہ کا ہے۔ مگر جس کو اتنے بڑے مراتب مطلوب نہ ہوں، بلکہ محض نجات مطلوب ہو، اور اس کے ساتھ یہ تو دنیاوی امور، کہ جنہوں پر نظر عنایت رکھے اور ان کو دنیوی معاملات میں برکت عطا کرتا رہے۔ اُس کے لیے اُن کا کافی ہونا کہ اپنی دنیوی زندگی کے ساتھ اس غنیمت کو بھی لگاتے رکھے۔ دنیا کے سارے کام اپنے ڈسٹنگ پر چلتے رہیں اور ان کے ساتھ چند غنیمتی دوسروں کو ادا کر کے معبود کو بھی خوش کیا جاتا رہے۔ انسان کا تعلق خود اپنے نفس سے، اپنے اہل و عیال سے، اپنے گرد و پیش کی ساری دنیا سے ایک الگ چیز ہے۔ اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایسا دوسری چیز۔ ان دونوں کے درمیان کوئی ربط نہیں۔

یہ جاہلیت کا تصور تھا اور اس کی بنیاد پر کسی انسانی تہذیب و تمدن کی عمارت قائم نہ ہو سکتی تھی۔ تہذیب و تمدن کے معنی انسان کی پوری زندگی کے ہیں، اور جو چیز انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ ہو اُس پر پوری زندگی کی عمارت ظاہر ہے کہ کسی طرح قائم نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ہر جگہ نہیب اور تہذیب و تمدن ہمیشہ ایک دوسرے سے الگ رہے۔ ان دونوں کے ایک دوسرے پر تصور یا بہت اثر ضرور ڈالا، مگر یہ اثر اسی قسم کا تھا جو مختلف اور متضاد چیزوں کے یکجا ہونے سے مترتب ہوتا ہے۔ اس لیے یہ اثر کہیں بھی مفید نظر نہیں آتا۔ نہیب نے تہذیب و تمدن پر جب اثر ڈالا تو اس میں رہبانیت، مادی تعلقی سے نفرت، لذت و نیوی سے کراہت، عام اسباب سے بے تعلق، انسانی تعلقات میں انفرادیت، تناؤ اور تشعب کے عناصر داخل کر دیے۔



یہ اثر کسی معنی میں بھی ترقی پر ورنہ تھا۔ بلکہ دشمنی ترقی کی راہ میں انسان کے لیے ایک سنگِ گراں تھا۔ دوسری طرف تہذیب و تمدن نے، جس کی بنیاد سراسر مادیت اور خواہشاتِ نفس کے اتباع پر قائم تھی، مذہب پر جب بھی اثر ڈالا اُس کو گندا کر دیا۔ اُس نے مذہب میں نفس پرستی کی ساری نجاستیں داخل کر دیں اور اس سے ہمیشہ یہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کہ ہر اُس گندی اور بد سے بدتر چیز کو جسے نفس حاصل کرنا چاہے، مذہبی تقدس کا جامہ پہنا دیا جاسکے تاکہ نہ خود اپنا ضمیر ملامت کرے نہ کوئی دوسرا اُس کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ اسی چیز کا اثر ہے کہ بعض مذاہب کی عبادتوں تک میں ہم کو لذت پرستی اور بے حیائی کے ایسے طریقے ملتے ہیں جن کو مذہبی اہل کے باہر خود اُن مذاہب کے پیرو بھی بد اخلاقی سے تعبیر کرنے پر مجبور ہیں۔

مذہب اور تہذیب کے اس تعامل سے قطع نظر کر کے دیکھا جاسکے تو یہ حقیقت بالکل نمایاں نظر آتی ہے کہ دنیا میں ہر جگہ تہذیب و تمدن کی عمارت غیر مذہبی اور غیر اخلاقی دیواروں پر قائم ہوتی ہے۔ سچے مذہبی لوگ اپنی نجات کی فکر میں دنیا سے الگ رہے اور دنیا کے معاملات کو دنیا والوں نے اپنی خواہشاتِ نفس اور اپنے ناقص تجربات کی بنا پر — جن کو ہر زمانہ میں کامل سمجھا گیا اور جو ہر زمانہ تا بعد میں ناقص ہی ثابت ہوئے — جس طرح چاہا چلایا۔ اور اس کے ساتھ اگر ضرورت بھی تو اپنے معبود کو خوش کرنے کے لیے کچھ مذہبی رسمیں بھی ادا کر لیں۔ مذہب چونکہ ان کے لیے محض زندگی کا ایک ضمیمہ تھا اس لیے اگر وہ ساتھ رہا بھی تو محض ایک ضمیمہ ہی کی حیثیت سے رہا۔ ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم، ہر قسم کی معاشی بے انصافیوں، ہر قسم کی معاشرتی بے اعتدالیوں اور ہر قسم کی تمدنی کج رویوں کے ساتھ یہ ضمیمہ منسلک ہو سکتا تھا۔ اُس نے ٹھکی اور قزاقی کا بھی ساتھ دیا، جہاں سوزی اور غارت گری کا بھی، شوخواری اور قمار و نیت کا بھی، فحش کاری اور تہجیر گری کا بھی۔

### بمہ گیر اور جامع تصورِ دین

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس غرض کے لیے بھیجے گئے تھے وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ مذہب کے جاہلی تصور کو مٹا کر ایک عقلی و فکری تصور پیش کریں، اور صرف پیش ہی نہ کریں بلکہ اسی کی اساس پر تہذیب و تمدن کا ایک مکمل نظام قائم کر کے اور کامیابی کے ساتھ چلا کر دکھا دیں۔ آپ نے بتایا کہ مذہب قطعاً بے معنی ہے اگر وہ انسان کی زندگی کا محض ایک شعبہ یا ضمیمہ ہے۔ ایسی چیز کو دین و مذہب کے نام سے موسوم کرنا بھی غلط ہے۔ حقیقت میں دین وہ ہے جو زندگی کا ایک جز نہیں بلکہ تمام زندگی ہو، زندگی کی روح اور اس کی قوت محرکہ ہو، فہم و شعور اور فکر و نظر ہو، صبح و غلط میں اتنی یاد کرنے والی کسوٹی ہو، زندگی کے ہر میدان میں ہر بہر قدم پر راہِ راست اور راہِ کج کے درمیان فرق کر کے دکھائے، راہِ کج سے بچائے، راہِ راست پر استقامت اور

پیش قدمی کی طاقت بخشنے، اور زندگی کے اس لامتناہی سفر میں، جو دنیا سے لے کر آخرت تک مسلسل چلا جا رہا ہے، انسان کو ہر مرحلے سے کامیابی و سعادت کے ساتھ گزار دے۔

اسی مذہب کا نام اسلام ہے۔ یہ زندگی کا ضمیمہ بننے کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ اس کے آنے کا مقصد ہی آخرت ہو جاتا ہے اگر اس کو بھی پڑانے چاہی تصور کے ماتحت ایک ضمیمہ زندگی قرار دے دیا جائے۔ یہ جس قدر خدا اور انسان کے تعلق سے بحث کرتا ہے، اسی قدر انسان اور انسان کے تعلق سے بھی کرتا ہے، اور اسی قدر انسان اور ساری کائنات کے تعلق سے بھی۔ اس کے آنے کا اصل مقصد انسان کو اس حقیقت سے آگاہ کرنا ہے کہ تعلق کے پینچھے الگ اور ایک دوسرے سے مختلف و بیچارہ نہیں ہیں، بلکہ ایک مجموعہ کے مربوط اور مرتب اجزاء ہیں اور ان کی صحیح ترکیب ہی پر انسان کی فلاح کا دارومدار ہے۔ انسان اور کائنات کا تعلق درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اور خدا کا تعلق درست نہ ہو۔ پس یہ دونوں تعلق ایک دوسرے کی تحلیل و تفسیح کرتے ہیں، دونوں الگ الگ ایک کامیاب زندگی بناتے ہیں، اور مذہب کا اصل کام اسی کامیاب زندگی کے لیے انسان کو ذہنی و عملی حیثیت سے تیار کرنا ہے۔ جو مذہب یہ کام نہیں کرتا وہ مذہب ہی نہیں اور جو اس کام کو انجام دیتا ہے وہی اسلام ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

ایک خاص طرقي فکر اور نقطہ نظر

اسلام ایک خاص طرقي فکر (Attitude of Mind) ہے، اور پوری زندگی کے متعلق ایک

خاص نقطہ نظر (Outlook on life) ہے۔ اور پھر وہ ایک خاص طرز عمل ہے جس کا راستہ اسی طرقي فکراور اسی نظر نے زندگی سے متعلق ہوتا ہے۔ اس طرقي فکر اور طرز عمل سے جو حیثیت حاصل ہوتی ہے وہ مذہب اسلام ہے، وہ تہذیب اسلامی ہے، اور وہی تمدن اسلامی ہے۔ یہاں مذہب اور تہذیب و تمدن الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ وہی ایک طرقي فکر اور نظر نے حیات ہے جو زندگی کے ہر سانس کا تصنیف کرتا ہے۔ انسان پر خدا کے کیا حقوق ہیں؟ خود اس کے اپنے نفس کے کیا حقوق ہیں؟ ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، اور غریبوں اور قرابت داروں کے، پڑوسیوں اور عالمہ داروں کے، ہم مذہبوں اور غیر مذہبوں والوں کے؟ دشمنوں اور دوستوں کے، ساری نوع انسانی کے، غنی کے کائنات کی ہر چیز اور ہر قوت کے کیا حقوق ہیں؟ وہ ان حقوق کا تعین بھی کرتا ہے اور ان کے درمیان کامل توازن اور عمل بھی قائم کرتا ہے۔ ایک شخص کا مسلمان ہونا ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ وہ ان تمام حقوق کو پورے سے انصاف کے ساتھ ادا کرے گا، بغیر اس کے کہ ظلم کی راہ سے ایک حق کو دوسرے حق پر قربان کرے۔ پھر یہی طرقي فکر اور نظر نے حیات انسان کی زندگی کا ایک بلند اخلاقی نصب العین اور ایک پاکیزہ روحانی نہایتی نظر متعین کرتا ہے۔ اور زندگی کی تمام سعی و جہد کو خواہ وہ

کئی چیزیں ہیں جو ایسے راستوں پر ڈالنا چاہتا ہے جو ہر طرف سے اسی ایک مرکز کی طرف راہیں ہوں۔  
قیسدا کن معیار اقدار

یہ مرکز ایک فیصلہ کن چیز ہے۔ اسی کے لحاظ سے ہر شے کی قدر Value، مصلحتیں کی جاتی ہے اسی معیار پر ہر شے کو پرکھا جاتا ہے۔ جو شے اس مرکزی مقصد تک پہنچنے میں مددگار ہوتی ہے اسے اختیار کر لیا جاتا ہے اور جو شے سبزاہ ہوتی ہے اسے رد کر دیا جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے بڑے معاملات تک یہ معیار کیسا کارفرما ہے۔ وہ اس کا بھی فیصلہ کرتا ہے کہ ایک شخص کو اکل و شرب میں، لباس میں، پیشگی تعلقات میں، لین دین میں، بات چیت میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں کن حدود کو ملحوظ رکھنا چاہیے، تاکہ وہ مرکز مقصود کی طرف جانے والی سیدھی راہ پر قائم رہے اور ٹھیکے راستوں پر نہ پڑ جائے۔ اس کا فیصلہ بھی کرنا ہے کہ اجتماعی زندگی میں افراد کے باہمی روابط کن اصولوں پر مشتمل کیے جائیں جن سے معاشرت، حدیث، سیاست، غرض ہر شعبہ زندگی کا ارتقاء ایسے راستوں پر ہو جو اصل منزل مقصود کی طرف جانے والے ہوں اور وہ راہیں نہ اختیار کرے جو اس سے ڈور جھانسنے والی ہوں۔ اس کا فیصلہ بھی کرنا ہے کہ زمین و آسمان کی جن قوتوں پر انسان کو دسترس حاصل ہوا اور جو چیزیں اس کے لیے مستحق کی جائیں ان کو وہ کن طریقوں سے استعمال کرے، تاکہ وہ اس کے مقصد کی غلام بن جائیں اور کن طریقوں سے اجتناب کرے تاکہ وہ اس کی کامیابی میں مانع نہ ہوں۔ اس کا فیصلہ بھی کرنا ہے کہ اسلامی جماعت کے لوگوں کو غیر اسلامی جماعتوں کے ساتھ دوستی میں اور دشمنی میں، جنگ میں اور صلح میں، اشتراک اغراض میں اور اختلاف مقاصد میں، غلبہ کی حالت میں اور مغلوبی کے دور میں، علوم و فنون کے اکتساب میں اور تہذیب و تمدن کے لین دین میں کن اصولوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے تاکہ تاریخی تعلقات کے ان مختلف پہلوؤں میں وہ اپنے مقصد کی راہ سے ہٹنے نہ پائیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو بنی نوع انسان کے ان نادان اور گمراہ افراد سے بھی غلومایا کر یا، شہرزی یا غیر شعوبی طور پر، اس مقصد کی خدمت کے لیے جس وسائل فطرت کے اعتبار سے ان کا بھی ایسا ہی مقصد ہے جیسا کہ حیران اسناد ہے۔

تجدد سے حیران کا راز نامک

خاص وہ ایک ہی نقطہ نظر ہے جو مسجد سے لے کر بازار اور میدان کا راز نامک، طرہی عبادت سے لے کر بیرونی و داخلی جہاز کے طریق استعمال تک، غسل و بیخوار اور جہارت و استنجائت جزوی و کلی سے لے کر تہذیب و تمدن تک، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے بڑے سے بڑے مسائل تک، منتخب کی ابتدا کی تعبیر سے لے کر تاریخی نظریات کے انتہائی مشابہات اور قوانین طبیعی کی بلند ترین تحقیقات تک، زندگی کی تمام سماجی اور

رابطہ پایا جاتا ہے اور ان سب کو ایک مشین کے پڑوں کی طرح اس طرح جوڑتا ہے کہ ان کی حرکت اور تعامل سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہو۔  
**انقلابی تصور**

مذہب کی دنیا میں یہ ایک انقلابی تصور تھا اور یہ اہلیت کے خیر سے بہتے ہوئے دماغوں کی گرفت میں یہ تصور کبھی پوری طرح نہ اُسکا آج دنیا علم و عقل کے اعتبار سے چھٹی صدی عیسوی کے مقابلہ میں کس قدر آگے بڑھ چکی ہے۔ مگر آج بھی اتنی قدامت پرستی اور تاریک خیالی موجود ہے کہ یورپ کی شہرہ آفاق یونیورسٹیوں میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پاتے ہوئے لوگ بھی اس انقلاب انگیز تصور کے ادراک سے اسی طرح غافل ہیں جس طرح قدیم جاہلیت کے ان پڑھ اور کورن لوگ تھے۔ ہزاروں برس سے مذہب کا جو غلط تصور وراثت میں منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے، اُس کی گرفت دماغوں پر ابھی تک مضبوط چکی ہوئی ہے۔ عقلی تنقید اور علمی تحقیق کی بہترین تربیت سے بھی اُس کے بند نہیں کھلتے۔ خانقاہوں اور مسجدوں کے تاریک حجرے میں رہنے والے اگر مذہبیت کے معنی کو شہ عزالت میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کے بھیس اور دین داری کو عبادت کے دائرے میں محدود خیال کریں تو ہمارے تعجب نہیں، کہ وہ تو ہیں ہی "تاریک خیالی"۔ جاہل عوام اگر مذہب کو بائیس، آٹھ سو یا سو سے کہے سوالات میں محدود سمجھیں تو یہ بھی مفادِ حیرت نہیں کہ وہ تو ہیں ہی جاہل۔ مگر یہ ہمارے پروردگار کی تعظیم کو کیا ہوا کہ ان کے دماغوں سے بھی قدامت پرستی کی غلغلہ دور نہیں ہوتی؟ وہ بھی مذہبِ اسلام کو انہی معنوں میں ایک مذہب سمجھتے ہیں جن میں ایک غیر مسلم قدیم جاہلی تصور کے تحت سمجھتا ہے۔ ۱۳۹

# دین حق کیا ہے؟

قرآن جس دعوت کے ساتھ فریغ انسان کو اپنے پیش کردہ مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

إِنَّ الدِّينَ إِتِّمَافُ الْإِسْلَامِ (آل عمران - ۱۹) اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔

عزنا اس فقرے کا جو سیدھا سادھا مفہوم بیان کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ سچا مذہب تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے۔ اور اسلام کا جو تصور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک مذہب کا نام ہے جو اب سے تیرہ سو برس پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا اور جس کی بنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی تھی۔ "بنا ڈالی" کا لفظ میں قصداً اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بحیرت مسلمان اور اہل بیت سے بھی اسلام کا ہی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "بانی اسلام" کہتے اور سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اسلام کی ابتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی اور آپ ہی اس کے "Founder" ہیں۔ لہذا جب ایک غیر مسلم قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس فقرے پر پہنچتا ہے تو وہ یہ گمان کر کے سرسری طور پر اس سے گزر جاتا ہے کہ جس طرح ہر مذہب صرف اپنے ہی برقی ہونے اور دوسرے مذہبوں کے باطل ہونے کا مدعی ہے اسی طرح قرآن نے بھی اپنے پیش کردہ مذہب کے برقی ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ اور جب ایک مسلمان اسے پڑھتا ہے تو وہ اس وجہ سے اس پر غور کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس مذہب کو اس فقرہ میں برقی کہا گیا ہے اُسے وہ خود بھی برقی مانتا ہے۔ یا اگر غور و فکر کے لیے اس کے ذہن میں کوئی تحریک پیدا ہوتی ہے تو وہ بالعموم یہ فرض اختیار کر لیتی ہے کہ عیسائیت، ہندو مت، بودھ مت اور ایسے ہی دوسرے مذاہب سے اسلام کا مقابلہ کر کے اس کی حقانیت ثابت کی جائے لیکن درحقیقت قرآن میں یہ مقام ایسا ہے جس پر ایک بنجیدہ طالب علم کو ٹھیکر کہہ دیتا ہے، اُس سے زیادہ غور کرنا چاہیے جتنا

لہ یہ ایک تقریب ہے جو ایک تاریخ مسکنہ کو جامعہ ترقی دہلی میں کی گئی تھی۔

اب تک اس پر کیا گیا ہے۔

قرآن کے اس دعوے کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ہمیں "الدین" اور "الاسلام" کا مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔  
**الدین کا مفہوم**

عربی زبان میں لفظ "دین" کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنی غلبہ اور استیلاؤں کے ہیں۔ دوسرے معنی اطاعت اور غلامی کے۔ تیسرے معنی جزاء اور بدلہ کے۔ چوتھے معنی طریقہ اور مسلك کے یہاں یہ لفظ اسی چوتھے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی دین سے مراد وہ طریقہ زندگی یا طرز فکر و عمل ہے جس کی پیروی کی جائے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ قرآن محض دین نہیں کہہ رہا ہے بلکہ "الدین" کہہ رہا ہے۔ اس سے معنی میں وہی فرق واقع

ہو جاتا ہے جو انگریزی زبان میں **This is a way of life** کہنے کے بجائے **This is the way**

of Life کہنے سے واقع ہوتا ہے۔ یعنی قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک طریقہ زندگی ہے۔ بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریقہ زندگی یا طرز فکر و عمل ہے۔

پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن اس لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے۔ طریقہ زندگی سے اس کی مراد زندگی کے کسی خاص پہلو یا کسی خاص شعبہ کا طریقہ نہیں بلکہ پوری زندگی کا طریقہ ہے۔ اللہ ایک شخص کی انفرادی زندگی ہی کا طریقہ نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی کا طریقہ ہی ہے۔ ایک خاص ملک یا ایک خاص قوم یا ایک خاص زمانہ کی زندگی کا طریقہ نہیں بلکہ تمام زمانوں میں تمام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طریقہ ہے۔ لہذا قرآن کے دعوے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک پوجا پاٹ اور عالم بالا کے اعتقاد اور حیات بعد المات کے تصور کا ایک صحیح مجموعہ وہی ہے جس کا نام اسلام ہے۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ افراد انسانی کے مذہبی طرز خیال و عمل (جیسا کہ لفظ "مذہب" کا مفہوم آج کل کی مغربی اصطلاح میں لیا جاتا ہے) کی ایک صحیح صورت وہی ہے جسے اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے لوگوں، یا فلاں صدی تک کے انسانوں، یا فلاں دور مثلاً منصفی انقلاب سے پہلے تک کے آدمیوں کے لیے ایک صحیح نظام زندگی وہی ہے جس کو اسلام سے موسوم کیا گیا ہے۔

بلکہ صریح طور پر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ "ہر زمانے اور ہر دور میں پوری نوب انسانی کے لیے زمین پر زندگی بسر کرنے کا ایک ہی رنگ اللہ کے نزدیک صحیح ہے، اور وہ ڈھنگ وہی ہے جس کا نام اسلام ہے۔"

لہذا جیسے ہمیں کر رہا ہے، جو کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان کسی مقام پر قرآن کی کوئی نئی تفسیر کی گئی ہے جس کی دوسرے دین کا مفہوم نہایت سے اور خدا کے انفرادی تعلق تک محدود ہے اور تمدن و ریاست کے نظام سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ یہ تفسیر اگر خود قرآن سے اخذ کی گئی ہے تو یقیناً بڑی دلچسپ چیز ہوگی لیکن میں نے اٹھارہ سال تک قرآن کا جو تحقیقی مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

## الاسلام کا مفہوم

۱۔ لفظ "اسلام" کو صحیح عربی زبان میں اس کے معنی میں سپر ڈال دینا، جھک جانا، اطاعت قبول کر لینا، اپنے آپ کو سپر ڈکر دینا۔ مگر قرآن معنی اسلام نہیں بولتا بلکہ الاسلام بولتا ہے جو اس کی خاص اصطلاح ہے اس مخصوص اصطلاح ہی لفظ سے اس کی مراد خدا کے آگے جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کر لینا، اس کے مقابلے میں اپنی آزادی سے دستبردار ہو جانا، اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تسلیم و اطاعت اور سپرنگی و حوالگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانوناً طبیعت (LAW OF NATURE) کے آگے سپر ڈال دی جائے جیسا کہ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے تخیل یا اپنے مشاہدات و تجربیات سے خدا کی مرضی اور اس کے فرائض کا جو تصور بطور خود رائدہ کر لے اسی کی اطاعت کرنے لگے، جیسا کہ کچھ اور لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے خود اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کے لیے جس طریقے فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے اس کو وہ قبول کر لے اور اپنی آزادی فکر و عمل — یا بالفاظ صحیح تر اور گناہ نگر و عمل — چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر لے۔ اسی چیز کو قرآن الاسلام کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے یہ رشتیت کوئی جدید العہد مذہب نہیں ہے جس کی بنیاد سے ۱۳۶۳ برس پہلے عرب میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہو۔ بلکہ جس دور پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا اسی روز خدا نے انسان کو بنا دیا تھا کہ تیرے جیسے صرف یہ الاسلام ہی ایک صحیح طریقہ عمل ہے۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو غیر بھی خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے مامور ہوتے ہیں ان سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی الاسلام کی طرف رہی ہے۔ ان کی طرف یا لآخر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دعوت دی۔ یہ اور بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیروں کے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کر کے ایک نظام بیہودیت کے نام سے اور مسیح علیہ السلام کے پیروں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے، اور اسی طرح ہندوستان، ایران، چین اور دوسرے ممالک کے پیروں کی آنتوں کے مختلف مخلوط و مرکب نظامات دوسرے ناموں سے بنائے ہوں لیکن سوائے اور مسیح اور دوسرے تمام معروف و غیر معروف انبیاء علیہم السلام جس دین کی دعوت دینے آتے تھے وہ خالص اسلام تھا۔

یہاں بددعوت ترویج کیا ہوں کہ قرآن اپنے تمام جدید فتنوں کی خواہشات کے علی الذمہ والقرین کے لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا، بلکہ ان سے نام لے کر کے نام انسانوں کے لیے ان کی پوری زندگی کا نظام فکر و عمل مراد لیا ہے۔ حاشا کہ جسے ترک کی اجازت اور سپرنگی نہیں دینی۔ وہ کسی مرتبہ پر نہ ہو۔ آیات خدا اور نبی کے سوا وہ دینے جہاں ان باتوں کا اظہار کرتا تھا۔

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

## قرآن کا دعویٰ کیا ہے

اس تشریح کے بعد قرآن کا دعویٰ بالکل صاف اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے:

”نور انسان کے لیے خدا کے نزدیک حیرت ہی ایک صمیم طریق زندگی ہے کہ وہ خدا کے آگے تسلیم غم کرے اور فکر و عمل کی اس راہ پر چلے جس کی طرف خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے رہنمائی کی ہے۔“

یہ ہے قرآن کا دعویٰ۔ اس میں تحقیق کرنا ہے کہ آیا یہ دعویٰ قبول کیا جانا چاہیے؟ خود قرآن نے اپنے اس دعویٰ کی تائید میں جو دلائل قائم کیے ہیں، ان پر نوہم غور کریں گے۔ مگر کیوں نہ اس سے پہلے خود اپنی جگہ تلاش و تہمتس کے یہ دریافت کر لیں کہ آیا ہمارے لیے اس دعویٰ سے کوئی قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارہ کار بھی ہے؟

طریقہ زندگی کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لیے بہر حال ایک طریقہ زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ انسان دریا نہیں ہے جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے خود بخود ملتا ہے۔ انسان درخت نہیں ہے جس کے لیے تواریخ فطرت ایک راہ ملے کر دیتے ہیں۔ انسان برا جانور نہیں ہے جس کی رہنمائی کے لیے تنہا جبلت ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے میں تواریخ طبیعت کا حکم ہونے کے باوجود انسان زندگی کے بہت سے ایسے پہلو رکھتا ہے جن میں اسے کوئی نگانہ حارستہ نہیں ملتا کہ حیوانات کی طرح بے اختیار اس پر چلتا رہے۔ بلکہ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس کو فکر کی ایک راہ چاہیے جس پر وہ اپنے اور کائنات کے اُن بہت سے مسائل کو حل کرے جنہیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش تو کرتی ہے مگر ان کا کوئی حل غیر منتخب زبان میں نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیے جس پر وہ اُن معلومات کو منظم کرے جنہیں فطرت اس کے حواس کے ذریعے سے اس کے ذہن تک پہنچاتی تو ہے مگر انہیں بطور خود منظم کر کے اس کے حواس نہیں کر دیتی۔ اس کو نفسی برتاؤ کے لیے ایک راہ چاہیے جس پر وہ اپنی ذات کے بہت سے اُن مطالبات کو پورا کرے جن کے لیے فطرت تقاضا تو کرتی ہے مگر انہیں پورا کرنے کا کوئی متذبذب طریقہ معین کر کے نہیں دیتی۔ اس کو گھریلو زندگی کے لیے، خاندانی تعلقات کے لیے، معاشی معاملات کے لیے، ملکی انتظام کے لیے، بین الاقوامی ربط و تعلق کے لیے اور زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کے لیے بھی ایک راہ درکار ہے، جس پر وہ محض ایک شخص کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک جماعت، ایک قوم، ایک نسل کی حیثیت سے بھی چلے اور ان مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ فطرت اس کے مقصود و مطلوب ہیں مگر فطرت نے نہ تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے اور نہ ان تک پہنچنے کا ایک راستہ معین کر دیا ہے۔



## زندگی کا انقسام پیر پر ہونا

زندگی کے یہ مختلف پہلو جن میں کوئی ایک طرہی اختیار کرنا انسان کے لیے ناگزیر ہے، بجائے خود مستقل شے اور ایک دوسرے سے بے نیاز محکمے نہیں ہیں۔ اس بنا پر یہ ممکن نہیں ہے کہ ان مختلف شعبوں کے لیے انسان ایسی مختلف راہیں اختیار کر سکتا ہو جن کی سمتیں الگ الگ ہوں، جن کے زاویہ الگ ہوں، جن پر چلنے کے ڈھنگ اور انداز الگ ہوں جن کی راہ فوری کے مقتضیات الگ ہوں، اور جن کی منازل مقصود الگ ہوں۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی ایک ذرا سی دانشمندانہ کوشش ہی آدمی کو اس پر غور کرنے کے لیے کافی ہے کہ زندگی بحیثیت مجموعی ایک کُل ہے جس کا ہر جزو دوسرے جزو سے اور ہر پہلو دوسرے پہلو سے گہرا ربط رکھتا ہے، ایسا ربط جو توڑا نہیں جاسکتا۔ اس کا ہر جزو دوسرے جزو پر اثر ڈالتا ہے اور اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ ایک ہی روح تمام اہواز میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے اور وہ سب مل کر وہ چیز بناتے ہیں جسے انسانی زندگی کہا جاتا ہے۔ لہذا انی الواقع جو چیز انسان کو دکا رہے وہ زندگی کے تقاضا نہیں بلکہ مقصد ہے جس کے ضمن میں سارے چھوٹے بڑے مقاصد پوری موافقت کے ساتھ اپنی جگہ سے سکیں اور جس کے حصول کی کوشش میں وہ سب حاصل ہو جائیں۔ اس کو راستے نہیں بلکہ راستہ دکا رہے جس پر وہ اپنی پوری زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت، کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنے مقصود حیات کی طرف لے چلے۔ اس کو فکر، علم، ادب، آرٹ، تعلیم، مذہب، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون وغیرہ کے لیے الگ الگ نظامات نہیں بلکہ ایک جامع نظام دکا رہے جس میں یہ سب ہماری کے ساتھ سمونے جاسکیں، جس میں ان سب کے لیے ایک ہی مزاج اور ایک ہی طبیعت رکھنے والے مناسب اصول موجود ہوں، اور جس کی پیروی کر کے آدمی اور آدمیوں کا مجموعہ اور زمین پر اکل پڑی آدمیت اپنے بلند ترین مقصود تک پہنچ سکے۔ وہ جاہلیت کا تاریک دور تھا جب زندگی کو مستقل جہاگانہ شعبوں میں تقسیم کرنا ممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اب اگر کچھ لوگ اس طرز خیال کی بھل گفتگو کرنے والے موجود ہیں تو وہ بیچارے یا تو اخلاص کے ساتھ پرانے خیالات کی نقیاب میں اب تک سانس لے رہے ہیں اس لیے قابل رحم ہیں، یا پھر وہ ظالم حقیقت کو خوب جانتے ہیں مگر جان بوجھ کر یہ گفتگو صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ جس زمین کو وہ کسی انسانی آبادی میں رائج کرنا چاہتے ہیں اس کے اصولوں سے اختلاف رکھنے والوں کو تباہ یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ بنا جسے اس زمین کے تحت تمہیں زندگی کے فلاح خلائ شعبوں میں، جو بد قسمتی سے تم کو عزیز تر ہیں، پورا تحفظ حاصل ہے گا۔ حالانکہ یہ تحفظ عقلاً محال، فطرۃً منقطع، عملاً ناممکن ہے، اور اس طرح کی گفتگو کرنے

ایسی ہی دین تو سیت جن میں خدا اور کتاب اور رسالت سے بے تعلق ہو کر انسان زوری قائموں پر ایک ملکیت کے باشندوں کے لیے

وہ اسے غالباً خود بھی جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔ ہر دین غالب زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی رُوح اور اپنے مزاج کے مطابق  
لو حال کر ہی رہتا ہے۔ جس طرح ہر کاننگ ان تمام چیزوں کو تبدیل بہ ٹمک کر کے ہی رہتی ہے جو اس کے حدود میں  
داخل ہو جائیں۔

### زندگی کی جغرافیائی و نسلی تقسیم

پھر جس طرح یہ بات مہمل ہے کہ انسانی زندگی کو عیناً گانہ شعبوں میں تقسیم کر دیا جاسکے، اسی طرح بلکہ اس سے  
بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ اسے جغرافیائی حلقوں یا نسلی و اثروں میں تقسیم کیا جاسکے۔ انسان بلاشبہ زمین کے بہت سے  
حصوں میں پایا جاتا ہے جن کو دریاؤں نے، پہاڑوں نے، جنگلوں اور سمندروں نے یا مصنوعی سرحدوں نے تقسیم کر رکھا  
ہے۔ اور انسان کی بہت سی مختلف نسلیں اور قومیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں جن کے درمیان تاریخی، نفسیاتی اور دوسرے  
اسباب سے انسانیت کے نشو و ارتقاء نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں لیکن اس اختلاف کو سخت قرار دے کر  
جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہر نسل، ہر قوم، اور ہر جغرافیائی آبادی کے لیے دین یعنی نظام زندگی الگ ہونا چاہیے وہ سراسر  
ایک مہمل بات کہتا ہے۔ اُس کی محدود نگاہ منظر اور غرض کے اختلافات میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ اس ظاہری کثرت  
کے اندر جو ہر انسانیت کی وحدت کو وہ نہیں پاسکا۔ اگر فی الواقع یہ اختلافات اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنا پر  
دین الگ الگ ہونے چاہئیں تو نہیں کہوں گا کہ زیادہ سے زیادہ جو اختلافات ایک ملک اور دوسرے ملک، ایک  
نسل اور دوسری نسل کے درمیان آپہناتے ہیں، اُن سب کو جس قدر بالعموم کے ساتھ چاہیں غلبہ نہ کر لیں، اور پھر ان  
اختلافات کا خالص علمی جائزہ لیں جو عورت اور مرد میں پاتے جاتے ہیں، جو ہر انسان اور دوسرے انسان میں پاتے  
جاتے ہیں، جو ایک ہی ماں اور باپ کے دو بچوں میں پاتے جاتے ہیں۔ شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ دعویٰ کروں کہ  
علمی تحلیل و تجزیہ میں پہلی قسم کے اختلافات سے یہ دوسری قسم کے اختلافات بہ حال شدہ تر ہی نکلیں گے۔ پھر کیوں نہ  
کہہ دیجیے کہ ہر فرد کا نظام زندگی الگ ہونا چاہیے؟ مگر جب آپ انفرادی جنس، خانہ داری کثرتوں کے اندر وحدت  
کا ایک عنصر اور پائیدار عنصر ایسا پاتے ہیں جس کی بنیاد پر قوم، وطن یا نسل کا تصور قائم ہو سکتا ہے اور اس تصور کی بناء  
پر ایک قوم یا ایک ملک کی کثیر آبادی کے لیے ایک نظام زندگی ہونا ممکن خیال کیا جاتا ہے، تو آخر کس چیز نے آپ کو  
روک دیا ہے کہ قومی، نسلی، وطنی کثرتوں کے درمیان ایک بڑی اور بنیادی وحدت کا عنصر آپ نہیں پاسکتے جس پر  
انسانیت کا تصور قائم ہوا اور جس کی بنا پر تمام عالم انسانی کا ایک دین یا نظام زندگی ہونا ممکن خیال کیا جاسکے؟ کیا یہ

لہ اس مسئلے پر مفصل بحث کے لیے مستفت کی کتابت مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش۔ حصار اول و دوم کا مطالعہ مفید ہوگا۔ خصوصاً حصہ  
دوم میں بنیادی حقوق کی بحث۔ (در نہیں)

واقعہ نہیں ہے کہ تمام جغرافیائی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود اصل بنیادی امور میں سب انسان بالکل یکساں ہیں؛ کیا وہ قوانین طبعی یکساں نہیں ہیں جن کے تحت انسان دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے؟ کیا وہ نظام جسمانی یکساں نہیں ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، کیا وہ خصوصیات یکساں نہیں ہیں جن کی بنا پر انسان دوسری موجودات سے الگ ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے؟ کیا وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں نہیں ہیں جو ان کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں؟ کیا وہ قوتیں یکساں نہیں ہیں جن کے مجموعے کو ہم نفس انسانی کہتے ہیں؟ اور کیا بنیادی طور پر وہ تمام طبعی، نفسیاتی، تاریخی، تمدنی اور معاشرتی عوامل بھی یکساں نہیں ہیں جو انسانی زندگی میں کار فرما ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے کہ ان تمام امور میں سب انسانوں کے درمیان یکساں پائی جاتی ہے تو پھر یقیناً ان امور کو بھی جو انسان بحیثیت انسان کی صلاح کے لیے صحیح ہوں، عالمگیر ہونا چاہیے۔ ان کے قومی یا نسلی یا وطنی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قومیں اور نسلیں ان امور کو جسے تحت اپنی خصوصیات کا اظہار اور مزوی طور پر اپنے معاملات زندگی کا بندوبست مختلف طریقوں سے کر سکتی ہیں اور ان کو ایسا کرنا چاہیے۔ مگر انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے جس صحیح دین یا نظام زندگی کی ضرورت ہے وہ بہر حال ایک ہی ہونا چاہیے۔ عقل یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ جو چیز ایک قوم کے لیے حق ہو وہ دوسری قوم کے لیے باطل ہو جاتے اور جو ایک قوم کے لیے باطل ہو وہ دوسری قوم کے لیے حق ہو جاتے۔

### زندگی کی زمانی تقسیم

ان مہلات اور جدید زمانہ کے عالمانہ مہلات میں سے ایک اور بات، جو حقیقت کے اعتبار سے جہل نہیں ہے، مگر حیرت ہے کہ یقینیت کے پورے وثوق کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، انسانی زندگی کی زمانی تقسیم ہے یعنی کہا جاتا ہے کہ جو نظام زندگی ایک دور میں حق ہوتا ہے وہ دوسرے دور میں باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ زندگی کے مسائل و معاملات ہر دور میں بدل جاتے ہیں، اور نظام زندگی کا حق یا باطل ہونا سراسر ان مسائل و معاملات ہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ یہ بات اسی انسانی زندگی کے متعلق کہی جاتی ہے جس کے متعلق ساتھ ارتقائی گفتگو بھی کی جاتی ہے جس کی تاریخ میں کار فرما قوانین بھی نکاش کیے جاتے ہیں، جن کے گزشتہ تجربات سے حال کے لیے سبق اور مستقبل کے لیے احکام بھی مستنبط کیے جاتے ہیں، اور جس کے لیے "انسانی فطرت" نامی ایک چیز بھی ثابت کی جاتی ہے۔ ہمیں پوچھنا ہوں کیا آپ کے پاس کوئی ایسا آئمہ پیمائش ہے جس سے آپ نوع انسانی کی اس مسلسل تاریخی حرکت کے درمیان دور، بازمانے یا عہد کی واقعی حدیں بیان کر سکتے ہوں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ان حد بندیوں میں سے کسی ایک خط پر انگلی رکھ کر آپ کہہ سکتے ہوں کہ اس خط کے اُس پار جو مسائل زندگی تھے وہ اس پار اگر تبدیل ہو گئے، اور جو حالات اُس پار تھے وہ اس پار باقی نہیں رہے؟ اگر فی الواقع انسانی سرگزشت ایسے ہی الگ الگ زمانی ٹکڑوں میں منقسم ہے تب تو یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک ٹکڑا جو گزر چکا ہے وہ بعد ولسے ٹکڑے کے لیے

معرض ایک فطرت اور لایعنی چیز ہو گیا۔ اس کے گزرنے ہی وہ سب کچھ مٹا دینے ہو گیا جو انسان نے اس حشر و دہر میں کیا تھا اس زمانے میں جو تجربات انسان کو ہوتے وہ بعد والے زمانے کے لیے کوئی سبق اپنے اندر نہیں رکھتے کیونکہ وہ حالات و مسائل ہی تھا جو گئے جن میں انسان نے بعض طریقوں کا بعض اصولوں کا، بعض قدروں کے لیے سعی و جہد کا تجربہ کیا تھا۔ پھر یہ ارتقاء کی ننگی لکیریں؟ یہ تو ان میں نیابت کی تلاش کس لیے؟ یہ تاریخی استنباط کس بنا پر؟ جب آپ ارتقاء کا نام لیتے ہیں تو لے گا کہ یہ اس بات کو متغیر نہیں ہے کہ وہاں کوئی چیز ضرور ہے جو تمام تغیرات کا موضوع بنتی ہے اور ان تغیرات کے اندر اپنے آپ کو باقی رکھتے ہوئے یہ ہم حرکت کرتی ہے۔ جب آپ تو ان میں حیات پر بحث کرتے ہیں تو یہ اس بنا کو مستلزم ہے کہ ان ناپائیدار حالات میں، ان روان و دوان مظاہر میں، ان بننے اور گزرنے والی صورتوں میں کوئی پائیدار اور زندہ حقیقت بھی ہے جو اپنی ایک ذاتی فطرت اور اپنے کچھ مستقل قوانین بھی رکھتی ہے۔ جب آپ تاریخی استنباط کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ کے اس طول و عرض میں جو مسافر مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا آ رہا ہے، اور منزلوں پر سفر میں طے کرتا چلا جا رہا ہے، وہ خود اپنی کوئی شخصیت اور اپنا کوئی مستقل مزاج رکھتا ہے جس کے متعلق یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں مخصوص طور پر کام کرتا ہے، ایک وقت میں بعض چیزوں کو قبول کرتا ہے اور دوسرے وقت میں انہیں رد کر دیتا ہے اور بعض دوسری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت، یہ پائیدار موضوع تغیرات، یہ شاہراہ تاریخ کا مستقل مسافر وہی تو ہے جسے آپ غالباً "انسانیت" کہتے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ جب آپ راستے کی منزلوں اور ان میں پیش آنے والے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو شروع کرتے ہیں تو اس ننگی لکیر میں ایسے کھوٹے جاتے ہیں کہ خود مسافر آپ کو یاد نہیں رہتا؟ کیا یہ سچ ہے کہ سفر میں اور ان کے حالات اور ان کے مسائل بدل جانے سے مسافر اور اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابتدا سے آفرینش سے آج تک اس کی ساخت باکمل نہیں بدلی۔ اس کے عناصر ترکیبی وہی ہیں جو آب سے ہزاروں برس پہلے تھے۔ اس کا مزاج وہی ہے، اس کی فطرت کے تقاضے وہی ہیں، اس کی صفات و خصوصیات وہی ہیں، اس کے رجحانات و میلانات وہی ہیں، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں وہی ہیں، اس کی کمزوریاں اور قابلیتیں وہی ہیں، اس کے فعل و انفعالات اور تاثیر و تاثر کے قاعدے وہی ہیں، اس پر کار فرمائی کرنے والی قوتیں وہی ہیں، اور اس کا کائناتی ماحول بھی وہی ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی ابتداء سے آفرینش سے آج تک قدرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ کوئی شخص یہ دھڑکی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ تاریخ کے دوران میں حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل زندگی کے تغیر سے خود انسانیت بھی بدلتی چلی آتی ہے۔ یا وہ بنیادی چیزیں بھی متغیر ہوتی رہی ہیں جو انسانیت کے ساتھ وابستہ ہیں پھر جب حقیقت یہ ہے تو اس دعوے میں کیا وزن ہو سکتا ہے کہ انسان کے لیے جو چیزیں تریاق تھی وہ آج زہر ہے، جو چیزیں کل تھی وہ آج باطل ہے، جو چیزیں کل تھیں وہ آج رکھتی تھی وہ آج

بے قدر ہے۔

انسان کیسے طریق زندگی کا حاجت مند ہے؟

اصل یہ ہے کہ انسانی افراد اور جماعتوں نے تاریخ کے دوران میں نفس انسانیت کو اور اس سے تعلق رکھنے والی بنیادی چیزوں کو سمجھنے میں دھوکہ کھا کر اور بعض حقیقتوں کے اعتراف میں سبباً اور بعض کے اور اک میں تصور کر کے جو غلط نظام زندگی وقتاً فوقتاً اختیار کیے اور جنہیں انسانیت کبریٰ Humanity at Large نے تجربے کے بعد غلط پاکر دوسرے ایسے ہی نظامات کے لیے حکمِ عالی کرنے پر مجبور کر دیا، ان کی سرگزشت کے منہ پر سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ انسانیت کے لیے لازماً ہر دور میں ایک الگ نظام زندگی درکار ہے جو نہ اسی دور کے حالات و مسائل سے پیدا ہو اور نہ ہی کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ حالانکہ زیادہ صحت کے ساتھ اس سرگزشت سے اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کے زمانی اور دوری نظامات زندگی، یا باغالب دیگر موسمی حشرات الارض کو بار بار آزمانے اور ہر ایک کی ناکامی کے بعد اس کے دوسرے جانشین کا تجربہ کرنے میں انسانیت کبریٰ کا وقت ضائع ہوتا ہے، اس کی راداری جاتی ہے، اس کے نشو و نما اور اپنے ممالکِ مملوک کی طرف اس کے سفر میں سخت رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ وہ درحقیقت محتاج اور محنت محتاج ہے ایسے نظام زندگی کی جو خود اُس کو اور اُس سے تعلق رکھنے والی تمام حقیقتوں کو جان کر عالمگیر، دائمی اور پائیدار اصولوں پر قائم کیا جائے جسے کہ وہ حال و مستقبل کے تمام متغیر حالات سے بخیر ترین گزر سکے، ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کر سکے اور زندگی کے ماسے پر آفتاں و خیزاں نہیں بلکہ رواں اور رواں اپنی منترلی مقصود کی طرف بڑھ سکے۔

کیا انسان ایسا نظام خود بنا سکتا ہے؟

یہ ہے اس "دین" یا طریق زندگی یا نظام زندگی کی نوعیت جس کا انسان حاجت مند ہے۔ اب ہم دیکھنا چاہیے کہ اگر انسان خدا کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لیے اس نوعیت کا ایک دین بنا نا چاہے تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ نہیں آپ کے سامنے یہ سوال پیش نہ کروں گا کہ آیا انسان اب تک ایسا دین خود بنانے میں کامیاب ہوا ہے؟ کیونکہ اس کا جواب تو قطعاً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ بھی جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعویٰ کے ساتھ اپنے اپنے دین پیش کر رہے ہیں اور ان کے لیے ایک دوسرے سے ٹرسے مر رہے ہیں، یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جن کے لیے انسان من حیث الانسان ایک "الدین" کا محتاج ہے کسی کا دین نسلی و قومی ہے، کسی کا جغرافیائی، کسی کا طبعاتی، اور کسی کا دین پیدا ہی اُس دور کے تقاضوں سے بنا ہے جو ابھی کل ہی گزر چکا ہے، ربا وہ دور جو کل گئے والا ہے اُس کے حالات و مسائل کے متعلق کچھ پیشگی نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں بھی وہ کام دے سکے گا یا نہیں، کیونکہ جو دور اب گزر رہا ہے ابھی تو اُس کے

تاریخی تعاضول کا جائزہ لینا باقی ہے۔ اسی لیے میں سوال یہ نہیں کر رہا ہوں کہ انسان ایسا دین بنانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ کامیاب ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

یہ ایک جنابیت اہم سوال ہے جس سے سرسری طور پر بحث کیا مناسب نہیں ہے۔ یہ انسانی زندگی کے فیصلہ کن سوالات میں سے ایک ہے۔ اس لیے پہلے خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ چیز کیا ہے جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے، اور اس شخص کی قابلیتیں کیا ہیں جس کے متعلق یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ اس کو وضع کر سکتا ہے یا نہیں۔

### الذین کی نوعیت

انسان کے لیے جس الذین کی ضرورت میں نے ابھی ثابت کی ہے اس سے مراد کوئی ایسا تفصیلی ضابطہ نہیں ہے جس میں ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لیے تمام چھوٹے بڑے جزئیات تک ترتیب ہوں اور جس کی موجودگی میں انسان کا کام صرف اس کے مطابق عمل کرنا ہو۔ بلکہ دراصل اس سے مراد ایسے جمہ گیرانہ فی وابدی اصول ہیں جو تمام حالات میں انسان کی رہنمائی کر سکیں، اس کی فکر و نظر، سعی و جہد اور پیش قدمی کے لیے صحیح رُخ متعین کر سکیں اور اسے غلط تجربات میں وقت اور محنت اور قوت عنانے کرنے سے بچا سکیں۔

اس غرض کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم — قیاس و گمان نہیں بلکہ علم — ہو کہ اس کی اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔

پھر وہ اس بات کے جاننے کا — سمجھ بیٹھنے کا نہیں بلکہ جاننے کا — حاجت مند ہے کہ آیا زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے یا یہ پوری زندگی کا ایک ابتدائی حصہ ہے۔ آیا سفر بس پیدائش سے لے کر موت تک کی مسافت کا ہے یا یہ پورے سفر میں سے محض ایک مرحلہ ہے۔

پھر اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا مقصد زندگی اس کے لیے متعین ہو جو حقیقت کے اعتبار سے — ذکر محض خواہش کی بنا پر — واقعی حیات انسانی کا مقصد ہو، جس کے لیے دراصل انسان پیدا کیا گیا ہو، اور جس کے ساتھ ہر فرد ہر مجموعہ افراد اور بحیثیت کلی تمام انسانیت کے مقاصد تمام زمانوں میں بلا کسی قصور و فراغت کے ہم آہنگ ہو سکیں۔

پھر اس کو اخلاق کے ایسے پختہ اور جمہ گیر اصولوں کی ضرورت ہے جو اس کی فطرت کی تمام خصوصیات کے ساتھ مناسب بھی رکھتے ہوں، اور تمام ممکن حالات پر نظری و عملی حیثیت سے منطبق بھی ہو سکتے ہوں، تاکہ وہ انہی اصولوں کی بنیاد پر اپنی سیرت کی تعمیر کر سکے، انہی کی رہنمائی میں سفر زندگی کی ہر منزل پر پیش آنے والے مسائل کو حل کر سکے اور کبھی اس خطرے میں مبتلا نہ ہو کہ تعمیر پذیر حالات و مسائل کے ساتھ ساتھ اس کے اخلاقی

اصول ٹوٹتے اور بنتے چلے جاتیں اور وہ محض ایک بے اصولا، نرا ابن الوقت بن کر رہ جائے۔

پھر اس کو تمدن کے ایسے جامع اور وسیع اصولوں کی ضرورت ہے جو انسانی اجتماع کی حقیقت و نغایت اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھ کر بناتے جاتیں۔ جن میں اخلاط و نفس و بطور اور بے اعتدالی نہ ہو۔ جن میں تمام انسانوں کی مجموعی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو۔ جن کی پیروی کر کے ہر زمانے میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل، تعمیر اور ترقی کے لیے سعی کی جاسکے۔

پھر اس سے شخصی کردار اور اجتماعی رویے اور انفرادی و اجتماعی سعی و عمل کو صحیح سمت سفر کا پابند اور بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے جامع حدود کی ضرورت ہے جو شاہراہ زندگی پر نشانات راہ کا کام دیں اور ہر موڑ، ہر دو راہ سے، ہر خطرناک مرحلے پر اُسے آگاہ کر دیں کہ تیرا راستہ آدھرا نہیں ہے بلکہ اُدھرا ہے۔

پھر اس کو چند ایسے عملی ضابطوں کی ضرورت ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دائمی اور عالمگیر پیروی کے قابل ہوں اور انسانی زندگی کو اُس حقیقت نفس الامری، اُس مابعدی زندگی، اُس مقصد حیات، اُن اصول اخلاق اُن اصول تمدن اور اُن حدود عمل سے ہمیشہ وابستہ رکھیں جن کی تعیین اُس الدین میں کی گئی ہو۔

یہ ہے وہ چیز جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اب غور کیجئے۔ کیا انسان ایسے ذرائع رکھتا ہے جن سے وہ خود اپنے لیے ایک ایسا الدین وضع کر سکے؟

### انسانی ذرائع کا جائزہ

انسان کے پاس اپنا "دین" یا طریقی زندگی اخذ کرنے کے ذرائع چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ پہلا ذریعہ خواہش ہے۔ دوسرا ذریعہ عقل ہے، تیسرا ذریعہ مشاہدہ و تجربہ ہے۔ چوتھا ذریعہ کھلے تجربات کا تاریخی ریکارڈ ہے۔ غالباً ان کے بسوا کسی پانچویں ذریعہ کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔ ان چاروں ذرائع کا ہتھکنڈا مکمل جائزہ لے کر آپ دیکھ سکتے ہوں، دیکھیے۔ کیا یہ "الدین" کے ایجاد کرنے میں انسان کی مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے اپنی عمر کا متعدد حصہ اس کی تحقیق میں صرف کیا۔ ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ذرائع "الدین" کی ایجاد میں تو مدد نہیں دے سکتے، البتہ اگر کوئی غیر انسانی رہنما "الدین" کو پیش کر دے تو اسے سمجھنے، پرکھنے، پہچاننے اور اس کے مطابق زندگی کے تفصیلی نظام کو وقتاً فوقتاً مرتب کرتے رہنے میں ضرور مددگار بن سکتے ہیں۔

### خواہش

پہلے خواہش کو لیجئے۔ کیا یہ انسان کی رہنمائی سکتی ہے؟ اگرچہ یہ انسان کے اندر اسلی محرک عمل ہے۔ مگر اس کی عین فطرت میں جو کمزوریاں موجود ہیں ان کی بنا پر یہ رہنمائی کے قابل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تمہارا رہنمائی کرنا تو درگزر عقل اور علم کو بھی اکثر اس نے گمراہ کیا ہے۔ اس کو تربیت سے خواہ کتنا ہی روشن خیال بنا دیا جاتے، بہر حال آخری

فیصلہ جب کہی اس پر چھوڑا جائے گا یہ بڑا مبالغہ ہے اور ساری معاملات میں غیر مستقیم ہی فیصلہ کرنے کی ایک نگرانی کے اندر جو تعلق سے پاسے جاتے ہیں اس کو صحیح فیصلہ کرنے کے بجائے ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کرنے میں جسے مطلوب کسی نہ کسی طرح جاری اور باہمی حاصل ہو جائے یہ بجائے خود خواہشی انسانی کی طبیعت کو زوری ہے۔ لہذا خواہ ایک فرد کی خواہش ہو یا ایک ملت کی، یا وہ عوامل شامل عام و **General Will** اور جس کا رد سوسائٹی نہ کرے، یہ بحالی کی قسم کی انسانی خواہش میں بھی منفرد ہے۔ نتیجہ کہ ایک الذین کے وضع کرنے میں مددگار بن سکے بلکہ جہاں تک ممکن ہو **Ultimate Problem** (مشکل حتمی) انسانی کی عقلیت، اس کے مال اور اس کی غایت کا سلسلہ ہے۔ ان مسائل کو سوسائٹی اور کسی فرد کا رد نہیں سکتی۔

### عقل

پھر عقل کو سمجھیے۔ اس کی تمام بہترین صلاحیتیں مستقیم انسانی زندگی میں ان کو استعمال بھی ناممکن اور ان کی یہ بھی تسلیم کہ انسان کے اندر یہ بہت بڑی رہنما طاقت ہے لیکن قطعاً اس سوال کے کہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کس کی عقل وضع کرے گی، نزدیک یا مگر کی؟ تمام انسانوں کی؟ یا انسانوں کے کسی خاص گروہ کی؟ اس زمانہ کے لوگوں کی؟ یا کسی بھی زمانہ والوں کی؟ یا آئندہ آنے والوں کی؟ سوال صرف یہ ہے کہ ان کے خود عقل انسانی کے حدود کا جائزہ لینے کے بعد کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے وضع کرنے میں اس پر اتفاق کیا جاسکتا ہے؟ اس کے تمام فیصلے مختصر ہیں اس مواد پر جو خواہ اس کو فراہم کر کے دیں، وہ غلط مواد فراہم کر کے اس کے تو یہ فیصلہ کر دے گی، وہ ناقص مواد فراہم کر کے دیں گے تو یہ ناقص فیصلہ کر دے گی۔ اور جو اس کو فراہم کر کے نہیں دیں گے ان میں اگر یہ خود شناس سے لوگوں کو فیصلہ نہ کرے گی اور اگر بہر حال اس سے تو اندیشہ میں کوئی تیر چلائی رہے گی۔ یہ محدودیتیں جس نے پوری عقل کے ساتھ لگی ہوئی ہیں وہ آخر کس طرف ان کی اہل ہوسکتی ہیں کہ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کی تخلیق اسے دی جائے۔ اللہ تعالیٰ کے ان مسائل کا انحصار ان مسائل عالیہ کے حل پر ہے ان میں ذرا سرت سے کوئی مواد فراہم ہی نہیں کرتے پھر کیا ان مسائل کا فیصلہ عقلیت، افعال قیاسات اور تجربہ اور ہام سے کیا جائے گا؟ اللہ تعالیٰ کے لیے جن مستقل اخلاقی قدروں کا امتثال ہوگا، ان کے لیے جو اس بہت ہی ناقص مواد فراہم کرتے ہیں۔ پھر کیا عقل سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ان مسائل کو حل کرے گی؟ انی طرف اللہ تعالیٰ کے جو دوسرے اہم ترین فیصلے بیان کیے ہیں ان میں سے کسی ایک کو دیکھ کر اس سے باہل صحیح اور مکمل مواد حاصل نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر عقل ایک جامع و مکمل نظام بنائے۔ اور اس پر مزید یہ ہے کہ عقل کے ساتھ خواہش کا عنصر مستقل طور پر لگا ہوا ہے جو اسے فیصلہ دینے سے روکتا ہے اور اس کی رہنمائی



روی کو کچھ نہ کچھ میٹر حد کی طرف مائل کر کے ہی چھوڑنا ہے۔ لہذا اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ عقل انسانی حواس کے فراہم کردہ مواد کی ترتیب اور اس سے استدلال کرنے میں کوئی غلطی نہ کرے گی، تب بھی اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ آتا بل بوتہا نہیں رکھتی کہ اتنے بڑے کام کا بوجھ اس پر ڈالا جائے۔ یہ بوجھ اس پر ڈالنا اس پر بھی ظلم کرنا ہے اور خود اپنے اوپر بھی سائنس

اب تیسرے ذریعہ کو لیجیے۔ یعنی وہ علم جو مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس علم کی قدر قیمت کا اعتراف کرتے ہیں کسی طالب علم سے پیچھے نہیں ہوں اور نہ قدرہ برابر اس کی تحقیر کرنا پسند کرتا ہوں۔ لیکن اس کی محدودیتوں کو نظر انداز کر کے اسے وہ دست دینا جو فی الواقع اسے حاصل نہیں ہے، میرے نزدیک بے علمی ہے۔ ”علم انسانی“ کی حقیقت پر جس شخص کی بھی نظر ہوگی وہ اس بات کو ماننے سے انکار نہ کرے گا کہ وہاں تک مسائل عالیہ کا تعلق ہے، ان کی کتنے تک اس کی رہائی محال ہے۔ کیونکہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہی نہیں ہیں جن سے وہ اس تک پہنچ سکے۔ نہ وہ اس کا براہ راست مشاہدہ کر سکتا ہے اور نہ مشاہدہ تجربہ کے تحت آنے والی اشیاء سے استدلال کر کے اس کے متعلق ایسی راستے قائم کر سکتا ہے جس پر ”علم“ کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ لہذا ”الاقین“ وضع کرنے کے لیے جن مسائل کا حل معلوم کرنا سب سے پہلی ناگزیر ضرورت ہے وہ تو علم کی بستر سے باہر ہی ہیں۔ اس لیے سوال کہ اخلاقی قدیریں، تمدن کے اصول، اور بے راہ روی سے بچانے والے حدود و معین کرنے کا کام آیا علم کے حوالے کیا جا سکتا ہے یا نہیں، تو اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ کام کس شخص یا گروہ یا کس زمانہ کا علم انجام دے گا، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ علمی طور پر یہ کام انجام دینے کے لیے ناگزیر شرائط کیا ہیں۔ اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ اُن تمام قوانین فطرت کا علم ہو جن کے تحت انسان اس دنیا میں جی رہا ہے۔ اس کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ خود انسان کی اپنی زندگی سے جو علوم تعلق رکھتے ہیں وہ مکمل ہوں۔ اس کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے علوم، یعنی کائناتی اور انسانی علوم کی معلومات یکجا ہوں اور کوئی ذہن کامل ان کو صحیح ترتیب دے کر، اُن سے صحیح استدلال کر کے، انسان کے لیے اخلاقی قدروں کا، تمدن کے اصولوں کا، اور بے راہ روی سے بچانے والی حدود کا تعین کرے۔ یہ شرائط نہ اس وقت تک پوری ہوتی ہیں۔ نہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ پانچ ہزار برس بعد پوری ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ انسانیت کی وفات سے ایک دن پہلے یہ پوری ہو جائیں، مگر اُس وقت اس کا فائدہ ہی کیا ہوگا۔

تاریخ

آخر میں اُس ذریعہ علم کو لیجیے جسے ہم پچھلے انسانی تجربات کا تاریخی ریکارڈ یا انسانیت کا نامہ اعمال کہتے ہیں۔ اس کی اہمیت اور اس کے فائدوں سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں، اور خود کریں گے تو آپ بھی مانیں گے کہ ”الاقین“ وضع کرنے کا عظیم انسان کام انجام دینے کے لیے یہ بھی ناکافی ہے۔ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ یہ ریکارڈ ماضی محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سے حال کے لوگوں تک صحت اور جامعیت کے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ میں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس ریکارڈ کی مدد سے "الدین" وضع کرنے کے لیے انسانیت کا نمائندہ کس ذہن کو بنا یا جائے گا؟ ہیکل کے ذہن کو؟ ہارکس کے ذہن کو؟ ارنسٹ ہیکل کے ذہن کو؟ یا کسی اور ذہن کو؟ میں صحت یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ واقعی، حال یا مستقبل میں کس تاریخ تک کاریکارڈ ایک "الدین" وضع کرنے کے لیے کافی مواد فراہم کر سکے گا؟ اس تاریخ کے بعد پیدا ہونے والے خوش قسمت ہیں۔ باقی رہے اس سے پہلے گزر جانے والے تو ان کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

مائیوس کن نتیجہ

یہ مختصر اشارات جو میں نے کیے ہیں مجھے توقع ہے کہ میں نے ان میں کوئی علمی یا استدلالی غلطی نہیں کی ہے اور اگر انسان کے ذرائع کا یہ جائزہ جو میں نے لیا ہے، صحیح ہے تو پھر میں کوئی چیز اس تقیین تک پیش کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا کہ انسان اپنے لیے کوئی کچا پکا، فطرتی اور تعالیٰ "دین" تو وضع کر سکتا ہے، لیکن وہ جانتا ہے کہ "الدین" وضع کرے، تو یہ قطعی محال ہے۔ پہلے ہی محال تھا، آج بھی محال ہے، اور آئندہ کے لیے بھی اس کے امکان سے پوری مایوسی ہے۔

اب اگر کوئی خدا ریمانی کے لیے موجود نہیں ہے جیسا کہ منکرین خدا کا خیال ہے، تو انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ خود کشی کرے جس مسافر کے لیے نہ کوئی رہنا موجود ہو اور نہ جس کے اپنے پاس راستہ معلوم کرنے کے ذرائع موجود ہوں، اس کے لیے یاس اور کمال یاس کے سوا کچھ متقدر نہیں۔ اس کا کوئی پھر وہ اس کے برا آئینہ اور کیا مشورہ دے سکتا ہے کہ سر راہ ایک پتھر سے اپنی مشکل آسان کرے۔ اور اگر خدا اپنے لیکن رہنمائی کرنے والا خدا نہیں ہے، جیسا کہ بعض فلسفیوں اور سائنٹیفک طرز کے مشیتین خدا کا گمان ہے، تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک صورت حال ہے جس خدا نے موجودات عالم کے بقا و نشوونما کے لیے ہر اس چیز کی فراہمی کا انتظام کیا ہے جس کی ضرورت کا تصور کیا جاسکتا ہو، لیکن ایک نہیں کیا تو صورت انسان کی اس سب سے بڑی ضرورت کا انتظام جس کے بغیر پوری نوع کی زندگی غلط جوتی جاتی ہے، اس کی نیائی ہوتی دنیا میں رہنا ایک مصیبت ہے، ایسی نعمت مصیبت جس سے بڑھ کر کسی دوسری مصیبت کا تصور ممکن نہیں۔ آپ غریبوں اور مفلسوں، بیماروں اور زخمیوں، مظلوموں اور دکھی خاندانوں کی مصیبت پر کیا روتے ہیں، روئے اس پوری نوع کی مصیبت پر جو اس بچاؤ کی کے عالم میں چھوڑ دی گئی ہے کہ بار بار غلط تجربے کر کے ناکام ہوتی ہے، ٹھو کریں کھا کر گرتی ہے اور پھر اٹھ کر چلتی ہے تاکہ پھر ٹھو کر کھائے، ہر ٹھو کر پر ملک کے ملک اور قوموں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس غریب کو اپنے مقصد زندگی تک کی خبر نہیں ہے، کچھ نہیں جانتی کہ کابھی کے لیے سعی و عمل کرے اور کس وقت پر کرے۔ یہ سب کچھ وہ خدا دیکھ رہا ہے جو اسے زمین پر وجود میں لایا ہے، مگر وہ اس پیدا کرتے سے مطلب رکھتا ہے، رہنمائی کی پروا نہیں کرتا۔

### اُمّیہ کی ایک ہی کمرہ

اس تصور کے باہل برنگس قرآن ہمارے سامنے صورت حال کا ایک دوسرا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا محض پیدا ہی کر دینے والا نہیں ہے بلکہ پہنائی کرنے والا بھی ہے۔ اس نے موجودات عالم میں سے ہر چیز کو ڈھراہیت بخشی ہے جو اس کی لطافت کے لحاظ سے اس کے لیے ضروری ہے۔ اللّٰہی اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ حَافَظًا لِّشَرِّهِ هُدٰی۔ اگر اس کا ثبوت پابہ تو میں چھوٹی، جس محوہ نہیں کٹری کو چاہو پکڑ کر رکھو لو۔ جو خدا ان مخلوقات کی رہنمائی کر رہا ہے وہی خدا انسان کی بھی رہنمائی کرنے والا ہے۔ لہذا انسان کے لیے صحیح طریق کار یہ ہے کہ خود سری چھوڑ کر اس کے آگے ممبر تسلیم خم کر دے اور جس جامع اور مکمل نظام زندگی یا ”الذین“ کی پراہت اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجی ہے، اس کی سروی اختیار کر لے۔

دیکھیے ایک طرف تو وہ نتیجہ ہے جو انسان کی عقلوں اور اس کے ذرائع کا پلے لگانے کا نتیجہ ہے ہم کو حاصل ہوتا ہے، اور دوسری طرف قرآن کا یہ دعویٰ ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ یا تو اس دعوے کو قبول کریں، یا پھر اپنے آپ کو ایسی اور اس مایوسی کے حوالے کر دیں جس کے اندھیرے میں کہیں برائے نام بھی اُمّیہ کی کرن نظر نہیں آتی۔ واصل صورت حال یہ ہے ہی نہیں کہ ”الذین“ حاصل ہوتے کہ وہ پیسے موجود ہوں، اور سوال یہ ہو کہ ہم ان میں سے کس وسیلے سے مدد لیں۔ اصلی صورت حال یہ ہے کہ ”الذین“ جس وسیلے سے ہم کو مل سکتا ہے وہ صرف ایک ہے اور انتخاب کا سوال صرف اس امر میں ہے کہ آیا ہم اس تمنا وسیلے سے مدد لیں یا اس کی دستگیری کا فارغ اٹھانے کے بجائے تاریکی میں بھٹکنے پھرنے کو ترجیح دیں۔

### قرآن کے دلائل

یہاں تک جو استدلال میں نے کیا ہے وہ تو ہم کو محض اس سزا تک پہنچاتا ہے کہ ہماری فلاح کے لیے قرآن کے اس دعوے کو قبول کیے بغیر کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر کافر ترائی شدہ، ناپا مسلمان شولیکین قرآن اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ اعلیٰ و اشرف ہیں، کیونکہ وہ ہمیں با دل ناخراست مسلمان بننے کے بجائے برضا و رغبت مسلمان ہونے پر آمادہ کرنے ہیں۔ اس کی بہت سی دلیلوں میں سے چار سب سے زیادہ اہم اور میں اور انہی کو اس نے بار بار تکرار پیش کیا ہے۔

۱) انسان کے لیے اسلام ہی ایک صحیح طریق زندگی ہے، اس لیے کہ یہی حقیقت نفس الامری کے مطابق ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا رو بہ خلاف حقیقت ہے:

”کیا لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین پاتے ہیں  
علاوہ وہ سب چیزیں جو آسمان میں ہیں اور جو زمین میں  
ہیں چاروناچار اسی کے آگے تسلیم خم کیے ہوتے  
ہیں اور اسی کی طرف انہیں چٹ کر جاتا ہے۔“

أَفَلَيْدِينِ اللَّهِ يَتَّبِعُونَ وَإِلَّا فَتَمَنُونَهُمْ  
فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ كُلِّهَا وَالَّذِينَ  
يُؤْتُونَ

(آل عمران: آیت ۸۳)

(۲) انسان کے لیے یہی ایک صحیح طریق زندگی ہے، کیونکہ یہی حق ہے اور از رو سے انصاف اس کے سوا کوئی  
دوسرا وہ صحیح نہیں ہو سکتا۔

”حقیقت میں تمہارا رب، مالک و فرمانروا تو وہ ہے  
جس نے آسمان اور زمین کو تیار کیا اور زمینوں و بادوروں میں  
پیدا کیا پھر اپنے تخت سے نازل ہوا اور زمین پر جو کچھ  
رہتا ہے اس پر حکم دیتا ہے اور زمین کے موانع میں  
وہ زمین کے ساتھ ڈرنا ہے۔ سورج اور چاند اس کے  
سب سے پہلے کے تابع فرما دیے۔ زمین اس کی  
کی ہے اور وہ بھی اسی کا ٹرا کرتا، اللہ جسے وہ کائنات

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ  
وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ  
عَلَى الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۚ كَبِيرُ السَّمَاوَاتِ  
يُطَاوِعُ حَبَشًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ  
وَالنُّجُومَ مُتَخَفِينَ يَا مَعْرِبُ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ  
وَالْآلَاءِ وَبِزُكُوفِكُمُ الْعَلِيمُ

(الاعراف: آیت ۴)

کا رب ہے

(۳) انسان کے لیے یہی رستہ صحیح ہے، کیونکہ تمام تصفیقوں کا صحیح علم صرف خدا ہی کو ہے اور یہی نظام ہے  
وہی کر سکتا ہے۔

”و حقیقت اللہ سے زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی  
ہے اور نہ آسمان کی۔“  
”جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے ہی وہ جانتا ہے اور  
جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔  
اور لوگ اس کی مخلوقات ہیں، سے کسی چیز پر جاوی

إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي  
الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ - (آل عمران: آیت ۵)  
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ  
وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا  
شَاءَ - (البقرہ: آیت ۲۵۵)

نہیں ہو سکتے، بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہتا ہے۔

قُلْ إِنَّ هُدَىٰ اللَّهِ لَأَبْهَرُ مِنَ الضَّلَالِ (الانعام: ۱۰۱)

(۴) انسان کے لیے یہی ایک راہِ راست ہے، کیونکہ اس کے بغیر عدل ممکن نہیں۔ اس کے سوا اس راہ  
بھی انسان چلے گا وہ بالآخر ظلم کی طرف جاتے گی۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَقَدْ ظَلَمَ  
نَفْسَهُ - (الطلاق - ۱)  
بِئْرَاتِكِ تَمَرُكٍ بِمَا آتَاكَ اللَّهُ قَادِرِينَ  
هَمَّ الظَّالِمُونَ - (المائدہ - ۳۵)

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر مقول انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ کے آگے سر تسلیم خم کرے اور ہدایت کے لیے اسی کی طرف رجوع کرے۔

خدا کی ہدایت کے پرکھنے کا معیار

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لانا اس رصود پر پہنچ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اپنی تحقیق کے دوران خود میرے دل میں بھی پیدا ہو چکا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر انسان کو شخص کی بات مان لیں جو ایک دین ہمارے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کر دے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو آخر ہمارے پاس وہ کیا معیار ہے جس سے ہم انسانی ساخت کے دین اور خدائی ہدایت کے دین میں فرق کر سکیں؟ اس کا جواب اگرچہ بڑی مفصل تحقیقی بحث چاہتا ہے، مگر میں یہاں مختصر اشاروں میں وہ چار بڑے معیار بیان کروں گا جو انسانی فکر اور خدائی فکر کو تمیز کرتے ہیں۔

انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے۔ جو چیز خدا کی طرف سے ہوگی اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پاسکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو، یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جاسکے کہ اس کے مضمتف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اور جھل رہ گیا۔ مگر اس معیار تحقیق کو استعمال کرتے ہوئے یہ بات نہ بھول جاتیے کہ علم، اور علمی قیاس، اور نظریہ علمی میں بڑا فرق ہے۔ ایک وقت میں جو علمی قیاسات اور علمی نظریات دماغوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اکثر غلطی سے ان کو علم سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے غلط ہونے کا بھی اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا۔ تاہم یہ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے جو بالآخر "علم" ثابت ہوتے ہیں۔

انسانی فکر کی دوسری بڑی کمزوری نقطہ نظر کی نگلی ہے۔ اس کے برخلاف خدائی فکر میں وسیع ترین نقطہ نظر پایا جاتا ہے۔ جب آپ خدائی فکر سے نگلی ہوتی کسی چیز کو دیکھیں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے اس کا مستشف ازل سے ایک دیکھ رہا ہے، پوری کائنات کو دیکھ رہا ہے، تمام حقیقتوں کو ایک نگاہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں بڑے سے بڑے فلسفی اور مفکر کی فکر بھی ایک نپتے کی فکر محسوس ہوگی۔

انسانی فکر کا تیسرا اہم ماحصل یہ ہے کہ اس میں حکمت و دانش، جذبات و خواہشات کے ساتھ کہیں نہ کہیں سازباز اور مصلحت کرتی نظر آتی ہے۔ بخلاف اس کے خدائی قدر میں یہ لاگ حکمت اور فطرت و دانش مندی کی نشان دہی نمایاں ہوتی ہے کہ اس کے احکام میں کہیں آپ جذباتی جھکاؤ کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔

انسانی فکر کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ جو نظام زندگی وہ خود تصنیف کرے گا اس میں جانبداری، انسان اور انسان کے درمیان غیر عقلی امتیاز، اور غیر عقلی بنیادوں ہی پر ترجیح بعض علی بعض کا عنصر لازماً پایا جائے گا۔ کیونکہ ہر انسان کی کچھ ذاتی دلچسپیاں ہوتی ہیں جو بعض انسانوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور بعض کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتیں۔ بخلاف اس کے خدائی فکر سے نکلا ہوا نظام زندگی ایسے ہر عنصر سے بالکل پاک ہوگا۔

اس معیار پر آپ ہر اس نظام زندگی کو جانچ کر دیکھیے جو اپنے آپ کو خدا کی طرف سے "الذین" کہتا ہے۔ اگر وہ انسانی فکر کی ان تمام خصوصیات سے خالی ہو اور پھر جامعیت اور ہمہ گیری کی وہ شان بھی رکھتا ہو۔ اس سے پہلے میں نے "الذین" کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے بیان کی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر ایمان لانے میں تاخیر کریں۔

ایمان کے تقاضے

اب مجھے بنیادی سوالات میں سے آخری سوال پر کچھ گفتگو کرنی ہے، اور وہ یہ ہے کہ،

آئی جب قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کر لے اور اس "الذین" پر ایمان لے آئے جس کے منجانب اللہ ہونے کا اطمینان اسے حاصل ہو گیا ہو، تو اس تسلیم کرنے اور ایمان لانے کے مقتضیات کیا ہیں۔

میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے معنی جھک جانے، سپردال دینے، اپنے آپ کو سپرد کرنے کے ہیں۔ اس جھکاؤ، سپردگی اور سپراندازی کے ساتھ خود رانی، خود مختاری اور فکر و عمل کی آزادی ہرگز نہیں رہ سکتی۔ جس دین پر بھی آپ ایمان لائیں، آپ کو اپنی پوری شخصیت اس کے حوالے کر دینی ہوگی۔ اپنی کسی چیز کو بھی آپ اس کی پیروی سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ کے دل اور دماغ کا دین ہو۔ آپ کی آنکھ اور کان کا دین ہو۔ آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا دین ہو۔ آپ کے پیٹ اور دماغ کا دین ہو، آپ کے قلم اور زبان کا دین ہو، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتوں کا دین ہو، آپ کی سعی اور عمل کا دین ہو، آپ کی محبت اور نفرت کا دین ہو، آپ کی دوستی اور دشمنی کا دین ہو، دانش آپ کی شخصیت کا کوئی جز اور کوئی پہلو بھی اس دین سے خارج نہ ہو۔ اپنی کسی چیز کو جتنا اور جس حیثیت سے بھی آپ اس دین کے احاطہ سے باہر اور اس کی پیروی سے مستثنیٰ رکھیں گے، سمجھ لیجئے کہ اسی قدر آپ کے دعوئے ایمان میں جھوٹ شامل ہے، اور ہر راستی پسند انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کو جھوٹ سے پاک رکھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

پھر یہ بھی نہیں ارتداد میں حصہ کر چکا ہوں کہ انسانی زندگی ایک کل سہنہ جسے الگ الگ شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔  
 لہذا انسان کی زندگی زندگی کا ایک ہی دین ہونا چاہیے۔ دو روز اور تین تین دینوں کی بجائے وقت پروردی بجز اس کے کچھ نہیں  
 اور ایمان کے سزا اور ان ڈول اور عقلی فیصلے کے مندرجہ بالا کا ثبوت ہے جب فی الواقع کسی دین کے "الدین" ہونے  
 پر ایمان آپ حاصل کر لیں اور اس پر ایمان سے آئیں تو لازماً اس کو آپ کی زندگی کے تمام شعبوں کا دین ہونا چاہیے  
 اور جس حیثیت سے آپ کا دین ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہی آپ کے گھر کا دین بھی نہ ہو اور وہی آپ کی تربیت  
 اور تعلیم اور آپ کے مدرسے کا، آپ کے کاروبار اور کسب معاش کا، آپ غلبی زندگی اور قومی طور پر عمل کا،  
 کسب کے طریق اور سیاست کا اور آپ کے ادب اور آرٹس کا دین بھی نہ ہو۔ جس طرح یہ بات محال ہے کہ ایک ایک  
 کسب کا دین ہو مگر جب تفسیر کے ذمے میں بہت سے موٹی منظم ہوں تو سب مل کر وہ خود دین جاتیں،  
 اور پھر یہ دین بھی نہیں سے دماغ کو اپیل نہیں کرتی کہ انفرادی حیثیت سے تو ہم ایک دین کے پیرو ہوں۔ اگر  
 سب دین دینی منظم کریں تو اس منظم زندگی کا کوئی پہلو اس دین کی پیروی سے مستثنیٰ نہ رہ جائے۔

ان سب سے بڑھ کر ایمان کا اہم ترین نفاذنا یہ ہے کہ جس دین کے "الدین" ہونے پر آپ ایمان لائیں، اس  
 کی رنگین سے اپنے اچانکے نوع کو ہر ہند کرنے کی کوشش کریں اور آپ کی تمام سعی و جہد کا مرکز و محور یہ ہو کہ یہی  
 وہ دین ہے جو دنیا کا دین بن جاتے جس طرح غم کی فطرت بہت ہے کہ وہ غالب ہو کر رہنا چاہتا ہے، اسی طرح غم  
 کو چھوڑنے کی فطرت ہے کہ وہ غم کو چھوڑنے کے بعد باطن پر اسے غالب کرنے کی سعی کیے بغیر چھین نہیں لے سکتی۔  
 اسی طرح باطن ہر حرف زمین اور اس کے باشندوں پر چھایا ہوا ہے اور پھر یہ منظر اس کے اندر کوئی بے گلی  
 کوئی نہیں کہ اس طرح پیدا نہیں کرتا، اس کے دل میں اگر حق پرستی ہے تو سوتی ہوئی ہے۔ اسے ٹکڑی چاہیے کہ  
 یہ ٹکڑی ٹکڑی ہو کر حیرت کے سکرت میں تبدیل نہ ہو جائے۔

# اسلام اور جاہلیت کی کشمکش

دُنیا میں انسان کی زندگی کے لیے جو نظام نامہ بھی بنایا جائے گا اس کی ابتداء لامحدود العباد الطبعی (Metaphysical) یا اہلیاتی مسائل سے ہوگی۔ زندگی کی کوئی اسکیم بن نہیں سکتی جب تک کہ انسان کے متعلق اور اس کائنات کے متعلق، جس میں انسان رہتا ہے، ایک واضح اور متعین تصور نہ قائم کر لیا جلتے۔ یہ سوال کہ انسان کا تبار و بیباں کیا ہونا چاہیے اور کس طرح اُسے دُنیا میں کام کرنا چاہیے، دراصل اس سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے کہ انسان کیا ہے، اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے، اور اس کائنات کا نظام کس طرح کا ہے جس سے انسان کی زندگی کے ٹھنک کر سہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اس سوال کا جو حل بھی تجویز کیا جائے گا اُسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا۔ پھر اسی نظریہ اخلاقی کی نوعیت کے مطابق انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی۔ پھر اسی سانچے کے اندر انفرادی سیرت و کردار اور اجتماعی تعلقات و معاملات کے قوانین اپنی تفصیلی صورت میں اختیار کریں گے، اور آخر کار تمدن کی پوری عمارت انہی بنیادوں پر تعمیر ہوگی۔ دُنیا میں اس وقت تک نوع انسانی کے لیے جتنے ذریعہ مسکن بھی بنے ہیں، ان سب کو بہر حال اپنا ایک بنیادی فلسفہ اور ایک اساسی نظریہ اخلاق مرتب کرنا پڑا ہے، اور اصول سے لے کر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک میں ایک مسکن کو دوسرے مسکن سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہی فلسفہ اور یہی اخلاقی نقطہ نظر ہے۔ کیونکہ ہر دستور زندگی کا مزاج اسی چیز کی طبیعت کے مطابق بنتا ہے، اور یہی اس کے غالب ہیں روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

لہٰذا دین حق، اسلام کے بالمقابل جتنے بھی نظام کار فرما رہے ہیں یا اب ہیں، ان سب کے لیے جاہلیت کی اصطلاح بطور موازنہ استعمال ہوتی ہے۔ دین کی اساس "اعلم" (دعویٰ الہی) پر ہے اور جاہل نظاموں کی اساس ایسے مادہ الطبعی نظریات پر ہوتی ہے جو خیال و گمان سے گھڑے جاتے ہیں یا سوچے گئے بغیر اختیار کر لیے جاتے



## زندگی کے چار نظریے

جزئیات و فروع سے قطع نظر، اصولی حقیقت سے اگر دیکھا جائے تو انسان اور کائنات کے متعلق چار ہی مابعد الطبیسی نظریے قائم ہو سکتے ہیں اور دنیا میں جتنے دستور زندگی پائے جاتے ہیں انہوں نے انہی چار میں سے کسی ایک کو اختیار کیا ہے۔

ان میں سے پہلے نظریے کو ہم جاہلیتِ خالصہ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کا خلاصہ یہ ہے:

### ۱۔ جاہلیتِ خالصہ

کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی بنگاٹھ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی حکمت، کوئی مصلحت اور کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے۔ یونہی بن گیا ہے، یونہی چل رہا ہے اور یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی خدا نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو اس کے ہونے یا نہ ہونے کا انسان کی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو دوسری چیزوں کی طرح شاید اتفاقاً یا ہاں پیدا ہو گیا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ اس کو کس نے پیدا کیا اور کس لیے پیدا کیا۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لیے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے۔ کچھ قوی اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اور اپنے گرد و پیش کے ماحول پر بہت سا سامان پھیلا ہوا دیکھتا ہے جن پر یہ اپنے ان قوی اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشوں کی تکمیل کر سکتا ہے۔ لہذا اس کی زندگی کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی طبیعت و حیوانی کے مطالبات پورے کرے، اور اس کی انسانی استعدادوں کا مصرف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ان مطالبات کو پورا کرنے کے لیے بہتر سے بہتر ذرائع فراہم کرے۔

انسان سے مافوق کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود نہیں ہے جہاں سے اس کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہو۔ لہذا اس کو اپنے گرد و پیش کے آثار و احوال سے اور اپنی تاریخ کے تجربات سے خود ہی ایک قانون عمل اخذ کرنا چاہیے۔

بظاہر کوئی ایسی حکومت نظر نہیں آتی جس کے سامنے انسان جوابدہ ہو۔ اس لیے انسان بھلتے خود ایک غیر ذمہ دار رہتی ہے۔ اور اگر یہ جوابدہ ہے بھی تو آپ اپنے ہی سامنے ہے۔ یا پھر اس اقتدار کے سامنے جو خود انسان ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مشتمل ہو جاتے۔

اعمال کے نتائج جو کچھ بھی ہیں اسی ذمہ داری کی حد تک ہیں۔ اس کے مابعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ لہذا صبح اور غلط، مفید اور مضر، قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف انہی نتائج کے لحاظ سے کیا جاتے گا

جو دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

انسان جب جاہلیتِ محضہ کی حالت میں ہوتا ہے، یعنی جب اپنے محسوسات سے ماورا کسی حقیقت تک وہ نہیں پہنچتا یا بندگیِ نفس کی وجہ سے نہیں پہنچتا چاہتا، تو اس کے ذہن پر یہی نظریہ حاوی ہوتا ہے۔ دنیا پرستوں نے ہر زمانے میں یہی نظریہ اختیار کیا ہے۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر بادشاہوں نے، امیروں نے، درباریوں اور بارگاہِ حکومت نے، خوش حال لوگوں اور خوشحال کپتھے جان دینے والوں نے عموماً اسی نظریہ کو ترجیح دی ہے۔ اور جن قوموں کی تمدنی ترقی کے گیت تاریخ میں گاتے جاتے ہیں بالعموم ان سب کے تمدن کی جڑیں یہی نظریہ کام کرتا رہا۔ موجودہ مغربی تمدن کی بنیاد میں بھی یہی نظریہ کارفرما ہے۔ اگرچہ اہل مغرب سب کے سب خدا اور آخرت کے منکر نہیں ہیں۔ نہ علمی حیثیت سے سب مادہ پرستانہ اخلاق کے قائل ہیں، لیکن جو مدح ان کے پورے نظام تہذیبِ تمدن میں کام کر رہی ہے وہ اسی انکارِ خدا و آخرت اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق ہی کی رُو سے ہے اور وہ کچھ اس طرح ان کی زندگی میں پیوست ہو گئی ہے کہ جو لوگ علمی حیثیت سے خدا اور آخرت کے قائل ہیں اور اخلاق میں ایک غیر مادہ پرستانہ نقطہ نظر اختیار کرتے ہیں وہ بھی غیر شعوری طور پر اپنی واقعی زندگی میں دیرپے اور مادہ پرست ہی ہیں۔ کیونکہ ان کے علمی نظریہ کا ان کی عملی زندگی سے بافعل کوئی ربط قائم نہیں ہے۔ ایسی ہی کیفیت ان سے پہلے کے مشرقین اور خدا فراموش لوگوں کی بھی تھی۔ بغداد، دمشق، دہلی اور غرناطہ کے مشرقین مسلمان ہونے کی وجہ سے خدا اور آخرت کے منکر نہ تھے، مگر ان کی زندگی کا سارا پروگرام اس طرح بننا تھا کہ گویا نہ خدا ہے نہ آخرت، نہ کسی کو جواب دینا ہے، نہ کہیں سے ہدایت لینی ہے، جو کچھ میں جاری خواہشات ہیں، ان خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر قسم کے ذرائع اور ہر قسم کے طریقے اختیار کرنے میں ہم آزاد ہیں اور دنیا میں جینے کی جتنی مہلت ملتی ہے اس کا بہترین مصرف میں یہ ہے کہ

بابر یہ عیش کوش کہ عالم دو بارہ نیست

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے اس نظریہ کی عین فطرت یہی ہے کہ اس کی بنیاد پر ایک خاص مادہ پرستانہ نظام اخلاق بننا ہے۔ خواہ وہ کتابوں میں مدون ہو یا صرف ذہنیات ہی میں مرتب ہو کر رہ جائے۔ پھر اسی ذہنیت سے علوم و فنون اور انکار و آداب کی آبیاری ہوتی ہے اور پورے نظام تعلیم و تربیت میں انکار و اہت کی رُو سے سرایت کر جاتی ہے۔ پھر انفرادی سیرتیں اسی سانچے میں ڈھلتی ہیں۔ انسان اور انسان کے درمیان تعلقات و معاملات کی تمام صورتیں اسی نقشہ پر بنتی ہیں۔ اور قوانین کا نشوونما اسی ڈھنگ پر ہوتا ہے۔ پھر اس طرز کی سوسائٹی میں سطح پر وہ لوگ ابھر آتے ہیں جو سب سے زیادہ مکار، بددیانت، جھوٹے، وفا باز، سنگدل اور خبیث النفس ہوتے ہیں۔ تمام سوسائٹی کی سیادت و قیادت اور مہکت کی زمام کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ تہرے تہرے ہمارے

طرح ہر حساب سے بے خوف اور ہر موافقہ سے بے پروا، ہر خلقِ خدا پر ٹوٹ پڑتے ہیں میکیا ویلی (Machiavelli)



ثبوت Scientific Proof پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیالی آرائی پر اس کی بنا ہے، اس لیے مہجوم المہجور اور معتدل اشیاء کی طرف خداوندی والہنیت کو منسوب کرنے میں مشرکین کے درمیان نہ کبھی اتفاق ہو سکتا ہے، نہ کبھی جہا ہے۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر بھی چڑ گیا وہ خدا بنالی گئی۔ اور خداؤں کی فہرست ہمیشہ گھسٹی بڑھتی رہی۔ فرشتے، جن، ارواح، تیار سے، زندہ اور مردہ انسان، درخت، پہاڑ، جانور، دریا، زمین، آگ، سب دیر تا بنا طے گئے۔ بہت سے معانی مجرورہ (Abstract Ideas) مثلاً محبت، حسن، شہرت، قوت، خلیق، بیماری، جنگ، دلچسپی وغیرہ کو بھی خدائی کا مقام دیا گیا۔ طرح طرح کے خیالی سرگبات، مثلاً شیر انسان، ماہی انسان پتھر انسان، چار سرا، ہزار دستہ، خرطوم بینی وغیرہ بھی مشرکین کے مہجوروں میں جگہ پاتے رہے۔

پھر اس دیر بالاسکے گرو اور بام و خرافات (Mythology) کا ایک عجیب علم جوش رباتیا رہا ہے جس میں جبر جہلی قوم کی قوت داہم نے اپنی شادابی و نادرہ کاری کے وہ وہ دلچسپ نمونے فراہم کیے ہیں کہ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جن قوموں میں خدا وند اعلیٰ یعنی اللہ کا تصور نمایاں پایا گیا ہے، وہاں تو خدائی کا انتظام کچھ اس طرح کا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ بادشاہ ہے اور دوسرے خداؤں کے وزیر، درباری، معاصیب، عمدہ وار اور اہلکار ہیں۔ مگر انسان بادشاہ سلامت تک راہ نہیں پاسکتا، اس لیے سادے معاملات، ماتحت خداؤں ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ اور جن قوموں میں خدا وند اعلیٰ کا تصور بہت دُھندلا یا تقریباً منقور ہے وہاں ساری خدائی ارباب مشغرتین میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔

جاہلیتِ خالصہ کے بعد یہ دوسری قسم کی جاہلیت ہے جس میں انسان قدیم ترین زمانے سے آج تک بتلا جرتا رہا ہے، اور ہمیشہ گھٹیا درجہ کی رمانی حالت ہی میں یہ کیفیت رونما ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے اثر سے جہا لوگ اللہ واحد تھاہ کی خدائی کے قابل ہو گئے وہاں سے خداؤں کی دوسری اقسام کو رخصت ہو گئیں، گمراہیاد، اولیاء، شہداء، صالحین، مجازیب، اقطاب، ابدال، علماء، مشائخ اور ظل، انہوں کی خدائی پھر بھی کسی نہ کسی طرح عقائد میں اپنی جگہ نکالتی ہی رہی۔ جاہلی و مانعوں نے مشرکین کے خداؤں کو چھوڑ کر ان تک بندوں کو خدا بنا لیا جن کی ساری زندگیوں بندوں کی خدائی ختم کرنے اور صرف اللہ کی خدائی ثابت کرنے میں صرف ہلائی تھیں۔ ایک طرف مشرک کا نہ پوجا پاٹ کی جگہ فاتحہ، زیارت، نیاز نذر، عرض، صدقہ، پھر حواسے، نشان، غلم، لغزیبے اور اسی قسم کے دوسرے مذہبی اعمال کی ایک نئی شریعت تصنیف کر لی گئی۔ دوسری طرف کسی علمی ثبوت کے بغیر ان بزرگوں کی ولادت و وفات، ظہور و غیاب، کرامات و خوارق، اختیارات و تصرفات اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے تقرب کی کیفیات کے متعلق ایک پوری میتھارمی تیار ہو گئی جو بہت پرست مشرکین کی میتھارمی سے بہ طرح نکا کھا سکتی ہے۔ تیسری طرف تو کسٹل اور استمداد برومانی اور اکثر سب فیض وغیرہ ناموں کے خوشنامیوں میں وہ سب



باقی رہا یہ امر کہ وہاں سے اس کو کسی قسم کی اخلاقی ہدایت یا زندگی کا ضابطہ و قانون ملے تو اس کا کوئی امکان ہی نہیں کیونکہ وہاں کوئی واقعہ ہی خدا ہونے پر ہدایت اور قانون بھیجے نہیں جب ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو شرک انسان کا محالہ خود ہی ایک اخلاقی نظریہ بناتا ہے اور خود ہی اس نظریہ کی بنیاد پر ایک شریعت تصنیف کر لیتا ہے۔ اس طرح وہی جاہلیتِ محضہ برسرِ کار آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالص جاہلیت کے تمدن اور مشرکانہ تمدن میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں ہوتا کہ ایک جگہ جاہلیت کے ساتھ مندروں، پجاریوں اور عبادات کا سلسلہ ہوتا ہے اور دوسری جگہ نہیں ہوتا۔ اخلاق اور اعمال جیسے یہاں ہوتے ہیں ویسے ہی وہاں بھی ہوتے ہیں۔ یونانِ قدیم اور بت پرست روم کے اخلاقی مزاج اور موجودہ یورپ کے اخلاقی مزاج میں جو شبہات پائی جاتی ہے اس کا یہی سبب ہے۔

ثانیاً، علوم و فنون، فلسفہ و ادب اور سیاسیات و معاشیات وغیرہ کے لیے مشرکانہ نظریہ کوئی الگ مستقل بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ اس باب میں بھی مشرک انسان جاہلیتِ محضہ ہی کا رخ اختیار کرتا ہے اور مشرک سوسائٹی کا سارا ذہنی نشرو و نما اسی ڈسٹنگ پر ہوتا ہے جس پر خاص جاہلی سوسائٹی میں ہوا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مشرکین کی قوتِ داہمہ حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اس لیے ان کے (فکار میں خیالی آرائی) (Speculation) کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے، اور ملاحظہ ذرا عملی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اس لیے نوسے خیالی فلسفوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ البتہ جب یہ ملاحظہ خدا کے بغیر کائنات کے متعلقہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی استدلالی کھینچ مان بھی اتنی ہی غیر معقول ہوتی ہے جتنی مشرکین کی لیٹنارجی بہر حال علمی حیثیت سے مشرک اور جاہلیتِ خالصہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہوتا اور اس کا روشن ثبوت یہ ہے کہ موجودہ یورپ اپنے موجودہ نظریات میں قدیم یونان و روم سے اس طرح سلسلہ جوڑتا ہے کہ گویا یہ ٹیلی ہے اور وہ باپ۔

ثالثاً، مشرک سوسائٹی ان تمام تمدنی طریقوں کو قبول کرنے کے لیے پوری طرح مستعد رہتی ہے جن کو خاص جاہلی سوسائٹی اختیار کرتی ہے۔ اگرچہ سوسائٹی کی ترتیب و تعمیر میں مشرک اور جاہلیتِ خالصہ کے ڈسٹنگ ذرا ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مشرک کی مملکت میں بادشاہوں کو خدائی کا مقام دیا جاتا ہے، روحانی پیشواؤں اور مذہبی مہمنداؤں کا ایک طبقہ مخصوص امتیازات کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ شاہی خاندان اور مذہبی طبقے مل کر ایک ملی جھگت قائم کرتے ہیں، خاندانوں پر خاندانوں کے اور طبقوں پر طبقوں کے تفوق کا ایک مستقل نظریہ وضع کیا جاتا ہے، اور اس طرح

وہ غلطی ہے جس نے بندے اور خدا کے درمیان بہت سے چھپرے بڑے بڑے معبودوں اور خدائیوں کا ایک تہم خیر کھڑا کر دیا اور اس کے ساتھ ہنست گری (Prinathood) کا وہ نظام پیدا کیا جس کے توسط سے بغیر جاہلی مذاہب کے پیرو پیدا کش سے کے کموت تک اپنی کوئی مذہبی رسم بھی انجام نہیں دے سکتے۔ (موتوف) ۳۲

جاہل عوام پر مذہب کا جال پھیلانا نہ تسلط قائم کر لیا جاتا ہے۔ بخلاف اس کے خالص جاہلی سوسائٹی میں یہ خود بیاں نسل پرستی، قوم پرستی، قومی امپیریزیم، ڈکٹیٹر شپ، سرمایہ داری اور طبقاتی نزاع کی شکل اختیار کرتی ہیں لیکن جہاں تک رُوح اور جوہر کا تعلق ہے، انسان پر انسان کی خدائی تسلط کرنے، انسان کو انسان سے پھاڑنے اور انسانیت کو تقسیم کرنے، ایک ہی نوع کے افراد کو ایک دوسرے کے لیے صیاد بنانے میں دونوں ایک سطح پر ہیں۔

### ۳۔ جاہلیتِ راہبانہ

تیسرا ما بعد الطبعی نظریہ رہبانیت پرستی پر مبنی ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

یہ دنیا اور یہ جہانی وجود انسان کے لیے ایک دارالغذاب ہے۔ انسان کی رُوح اس نفسِ منحصری میں دراصل ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت رکھتی ہے۔ لذات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس جہانی تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں، اصل میں اس قید خانہ کے طرق و سلاسل ہیں۔ انسان اس دنیا اور اس کی چیزوں سے جتنا تعلق رکھے گا اتنا ہی گندگی سے آلودہ ہوگا اور اسی قدر مزید عذاب کا مستحق بن جائے گا۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ اس زندگی کے بھڑوں سے قطع تعلق کیا جائے، خواہشات کو مٹایا جائے، لذات سے کنارہ کشی کی جائے، جہانی ضروریات اور نفس کے مطالبات کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے، ان تمام محبتوں کو جو دنیوی اشیاء اور گشت و ٹھکان کی رشتہ داریوں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں دل سے نکال دیا جائے، اور اپنے اس دشمن یعنی نفسِ جوہم کو مجاہدت و ریاضات کے ذریعہ سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ رُوح پر اس کا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح رُوح ہلکی اور پاک بنا ہو جائے گی اور نجات کے بلند مقامات پر اُترنے کی طاقت حاصل کرے گی۔

یہ نظریہ بجائے خود غیر تمدنی (Anti Social) نظریہ ہے، مگر تمدن پر یہ متعدد طریقوں سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ایک خاص قسم کا نظامِ فلسفہ بنتا ہے جس کی مختلف شکلیں ویدانتزم، مانوہرت، انتریتا، New-Platonism، یوگ، تھلوث، مسیحی رہبانیت اور بکھ ازم وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اس فلسفہ کے ساتھ ایک ایسا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے جو ہمیشہ کم ایجابی (Positive) اور ہمیشہ زیادہ بلکہ تمام تر نسبی (Negative) نوعیت کا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مل جل کر تیسری چیز، عقائد، اخلاقیات، اور عملی زندگی میں نمود کرتی ہیں اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچتے ہیں وہاں افسوس اور کوہن کا کام کرتے ہیں۔

پہلی دونوں قسم کی جامعیتوں کے ساتھ اس تیسری قسم کی جامعیت کا تعاون عموماً تین صورتوں سے ہوتا ہے:

- 1۔ پیراہبانہ جامعیت انسانی جماعت کے نیک اور پاک بازا افراد کو دنیا کے کاروبار سے ہٹا کر گوشہ عزلت میں لے جاتی ہے اور بہترین قسم کے شریک افراد کے لیے میدانِ صاف کر دیتی ہے۔ بدکار لوگ خدا کی زمین کے متولی بن کر آزادانہ کے ساتھ فساد پھیلاتے ہیں اور نیک لوگ اپنی نجات کی نگرانی ٹھیساً کیے چلے جاتے ہیں۔

۲- اس جاہلیت کے اثرات جہاں تک عوام میں پہنچتے ہیں، وہ ان کے اندر غلط فہم کا صبر بردہ تحمل اور یا پورا نہ نقطہ نظر پیدا کر کے انہیں ظالموں کے لیے نرم ڈال کر بنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمشیر بادشاہ ائمراء اور مذہبی اقتدار رکھنے والے طبقے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی اشاعت میں خاص دلچسپی لیتے رہتے ہیں۔ اور یہ خوب آرام ست ان کی سرپرستی میں پھیلتا رہا ہے۔ تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ امپیریزم، سرمایہ داری اور یا پائیت سے اس راہبانہ فلسفہ و اخلاق کی کبھی ٹرائی ہوئی ہو۔

۳- جب یہ راہبانہ فلسفہ و اخلاق انسانی فطرت سے ٹکرت کھا جاتا ہے تو کتاب الفیصل کی تصنیف شروع ہو جاتی ہے۔ کہیں کفار سے کاغذیہ ایجاد ہوتا ہے تاکہ دل کھولی رنگاہ کیا جاسکے، اور حقیقت بھی ہاتھ سے نہ جاتے کہیں ہوں رانی کے لیے عشق مجازی کا جیلہ نکالا جاتا ہے تاکہ دل کی لگی ٹھیک بھی لی جاسکے اور تقدس بھی خون کا توں قائم رہے اور کہیں ترکیب دنیا کے پرور سے میں بادشاہوں اور رئیسوں سے ساتھ گانٹھ کی جاتی ہے اور روحانی امارت کا وہ ہال پھیلا جاتا ہے جس کی پذیرین مثالیں روم کے پاپاؤں اور مشرقی دنیا کے گندی نشینوں سے پیش کی ہیں۔

یہ تو اس جاہلیت کا معاملہ اپنی جہتوں ہوں کے ساتھ ہے۔ مگر انبیاء علیہم السلام کی امتوں میں جب یہ گس جاتی ہے تو کچھ اور ہی گل کھاتی ہے۔ خدا کے دین پر اس کی پہلی ضرب یہ ہوتی ہے کہ یہ دنیا کو دار العمل، دار الامتحان اور مزدتہ الآخرتہ کے بجائے دارالغائب اور مایا کے جال کی حیثیت سے آدمی کے سامنے پیش کرتی ہے۔ نقطہ نظر کے اس بنیادی تغیر کی وجہ سے آدمی یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ اس دنیا میں خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے ماسر ہے۔ وہ یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ میں یہاں کام کرنے اور دنیا کے معاملات کو چلانے نہیں آیا ہوں، بلکہ گندگی و نجاست میں پھینکا گیا ہوں جس سے مجھے بچنا اور دور بچانا چاہیے۔ میرے لیے صحیح پوزیشن یہ ہے کہ میں یہاں نان کو آپریٹر (Non-Co-operator) کی طرت رہوں اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے بجائے ان سے کنارہ کروں۔ اس تصور کے ساتھ آدمی دنیا اور اس کے معاملات پر سہمی ہوئی نگاہ ڈالنے لگتا ہے اور بار غلامت کو سنبھالنا تو کتنا بارتدین کو اپنے سر لیتے ہوئے ڈرتا ہے۔ اس کے لیے پورا نظام شریعت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبادات اور ادا مرد تو رہا ہی کا یہ مفہوم بالکل ماسر ہو جاتا ہے کہ یہ حیات دنیا کی اصلاح اور فرائض خلافت کی انجام دہی کے لیے تیار کرنے والی چیزیں ہیں۔ برعکس اس کے آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ عبادات اور چند خاص مذہبی اعمال اس گناہ زندگی کا کفارہ ہیں۔ انہی کو پورے انہماک سے ٹھیک ناپ نزل کے ساتھ انجام دیتے رہنا چاہیے تاکہ آخرت میں نجات حاصل ہو۔

اس ذہنییت نے انبیاء کی امتوں میں سے ایک گروہ کو مراقبہ و مراقبہ چلے گئی و ریاضت اور اذیت و طائفہ  
 اعزاب و اعمال، سیر مقامات اور حقیقت کی فلسفیانہ تعبیروں کے چکر میں ڈال دیا اور حقیقت و مراحل کے (انزیم)



میں نرائش سے بھی زیادہ مہنگے کے علائقہ البتہ کے اس کام سے فائل کر دیا جس کو باری کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام آئے تھے۔ اور دوسرے گروہ میں نقشہ، نقش فی الدین، غلغله، مرقا، جھوٹی چھٹی چیزوں کی ناپ تولی اور جزئیات کے ساتھ غیر معمولی اہتمام کی بیماری پیدا کر دی تھی کہ ان کے لیے خدا کا دین ایک ایسا نازک آگینہ ہو گیا جو ذرا ذرا سی باتوں سے ٹھیس کھا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لیے چاروں کا سارا وقت بس اسی دیکھ بھال کی نذر ہونے لگا کہ کہیں کچھ اُدب نہ ہو جائے اور یہ شیشے کا برتن جو سر پر رکھا ہے کھیل کھیل ہو کر نہ رہ جاسے۔ دین میں اتنی باریکیاں نکل آنے کے بعد ناگزیر ہے کہ جو وہ تنگ خیالی اور کم عقلی پیدا ہو۔ ایسے لوگوں میں کہاں بظاہر بنیت باقی رہ سکتی ہے کہ نگاہ جہاں میں سے انسانی زندگی کے بڑے بڑے مسائل پر نظر ڈالیں، دین کے عالمگیر اصول و کلیات پر گرفت حاصل کریں اور زمانہ کی ہر نئی گردش میں دنیا کی امانت و رہ نمائی کے لیے مستعد ہوں۔

#### ۴۔ اسلام

پروفیسر عبدالمطلبی نظریہ یہ ہے جسے انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے:

یہ سارا عالم بہت و بزرگ ہمارے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزم خود میں، واصل ایک بادشاہ کی سلطنت ہے، اسی نے اس کو بنایا، پھر وہی اس کا مالک بنے اور وہی اس کا واحد حاکم ہے۔ اس سلطنت میں کسی کا حکم نہیں چلتا، سب کے سب تابع فرمان ہیں اور اختیارات بالکل اسی ایک مالک و فرمانروا کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان اس سلطنت میں پیدا ہوا ہے یعنی رعیت ہونا یا نہ ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں ہے، بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان میں نہیں ہے۔

اس نظام حکومت کے اندر انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں، نہ نظر ڈال سکتی ہے۔ پیدا ہونے کی رعیت اور ایک بزرگ سلطنت ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے کوئی راستہ اس کے سوا نہیں ہے کہ جس طرح سلطنت کے تمام اجزاء بادشاہ کے امر کی اطاعت کر رہے ہیں اسی طرح یہ بھی کہے۔ یہ خود اپنے لیے طبعی زندگی و منت کرنے اور اپنی ڈیڑھی آپ تجویز کر لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ مالک، مالک کی طرف سے جو پرامن آئے اس کی پیروی کرے۔ اس ہدایت کے آنے کا ذریعہ وحی ہے، اور جن انسانوں کے پاس وہ آتی ہے وہ نبی ہیں۔

مگر انسان کی آزمائش کے لیے مالک نے یہ طبعی طریقہ اختیار کیا ہے کہ آپ بھی ٹھیک لگے اور اپنی سلطنت کا وہ ٹکڑا اندرونی انتظام بھی چھپا دیا، جس سے وہ تہہ پر اتر کر رہتا ہے۔ ظاہر میں سلطنت اس طرح چل رہی ہے کہ وہ اس کا کوئی حکم نظر آتا ہے نہ کار برد از دکھائی دیتے ہیں۔ انسان صرف ایک کارخانہ چلتا ہوا دیکھتا ہے، اس کے درمیان اپنے آپ کو موجود پاتا ہے، اور ظاہر میں اس سے کہیں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں کسی کا محکوم ہوں اور کسی کو مجھے

حساب دینا ہے۔ ایمان و شہود میں کوئی ایسی نشانی نمایاں نہیں ہوتی کہ اس پر فرما کر راستے عالم کی حاکمیت اور اپنی  
 مھکومت و مسکولیت و Responsibility کا حال غیر مستقیم طور پر کھل جائے، یہاں تک کہ اسے  
 ملنے بغیر چارہ نہ رہے۔ نبی بھی آتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ان کے اوپر دنیا تو آتی رہتی دکھائی دے یا کوئی ایسی مسریح  
 علامت ان کے ساتھ آتے ہیں جس کو دیکھ کر ان کی نبوت ماننے کے سوا چارہ نہ رہے پھر آدمی ایک حد کے اندر اپنے  
 آپ کو بالکل مختار پالتے۔ بنا وقت کرنا چاہے تو اس کی قدرت و سے دی جاتی ہے۔ ذرا آج ہی چھاپا دیکھتے ہیں  
 اور بڑی ہی ڈھیل دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ شہادت و عیبان کی آخری خدمت کو پہنچے تک کرتی رکاوٹ اسے پیش نہیں آتی  
 مالک کے سوا دوسروں کی بندگی کرنا چاہے تو اس سے بھی زبردستی اس کو نہیں روکا جاتا۔ پُرسی آزادی سے دی جاتی ہے  
 کہ جس جس کی بندگی، عبادت، اطاعت کرنا چاہے کرے۔ دونوں صورتوں یعنی لجاوت اور بندگی غیر کی صورتوں میں  
 رزق برابر ملے جاتا ہے، سامان زندگی، وسائل کار، اسباب عیش حسبِ حیثیت خوب دیتے جاتے ہیں، اور مرنے دم  
 تک دیتے جاتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی باطنی یا کسی بندہ غیر سے محض اس جرم کی پاداش میں اسباب دینا  
 روک لیے جاتیں۔ یہ سارا طریقہ کار روایتی صورت اس لیے ہے کہ خالق نے انسان کو عقل، تیز و استدلال، ارادہ و اختیار کی  
 جوتوں دی ہیں، اور اپنی بے شمار مخلوقات پر اس کو ایک طرح کے حاکمانہ تصرف کی جو قدرت بخشی ہے، اس میں وہ  
 اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اسی آزمائش کی تکمیل کے لیے حقیقت پر فیص کا پر وہ ڈال دیا گیا ہے تاکہ انسان کی عقل  
 کا امتحان ہو۔ انتخاب کی آزادی بخشی گئی ہے تاکہ اس امر کا امتحان ہو کہ آدمی حق کو جاننے کے بعد کسی مجبوری کے بغیر خود  
 اپنی رضا و رغبت سے اس کی پیروی کرتا ہے یا خواہشات کی غلامی اختیار کر کے اس سے منہ موڑ جاتا ہے۔ اسباب  
 زندگی کا سرمایہ، وسائل اور کام کا موقع نہ دیا جائے تو اس کی لیاقت و عدم لیاقت کا امتحان نہیں ہو سکتا۔

یہ دنیوی زندگی چونکہ آزمائش کی مہلت ہے اس لیے یہاں نہ حساب ہے نہ جزا نہ سزا۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے  
 وہ کسی عمل نیک کا انعام نہیں بلکہ امتحان کا سامان ہے، اور جو تکالیف، مصائب، شدائد وغیرہ پیش آتے ہیں وہ کسی  
 عمل بد کی سزا نہیں بلکہ زیادہ تر اسی قانونِ طبی کے تحت ہیں جس پر اس دنیا کا نظام قائم کیا گیا ہے، آپ سے آپ ظاہر  
 ہونے والے نتائج ہیں۔ اعمال کے اصلی حساب، جانچ پڑتال اور فیصلے کا وقت مہلت کی یہ زندگی ختم ہونے کے بعد  
 ہے، اور اسی کا نام آخرت ہے۔ لہذا دنیا میں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط نیک یا بد

سے اس کا مطلب نہیں ہے کہ اس دنیا میں قانونِ مکافات سرے سے کارفرما ہی نہیں بلکہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہاں  
 کی مکافات و موکر اور سچی اور مریخ نہیں ہے اور آزمائش کا عنصر سر دنیوی جزا اور سزا پر غالب ہے۔ اس لیے یہاں اعمال کے نتائج  
 ظاہر ہوتے ہیں ان کو اخلاقی حسن و قبح کا معیار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ (مذکورہ)

اور قابل اتقیا قابل ترکہ ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ اور یہ علم کہ آخرت میں کس طریقہ اور کس عمل کا نتیجہ اچھا اور کس کا بُرا ہوگا، صرف اُس وحی کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء پر نازل ہوتی ہے۔ جزئیات و تفصیلات سے قطع نظر فیصلہ کن بات جس پر آخرت کی صلاح یا خسران کا مدار ہے یہ ہے کہ اولاً انسان اپنی قوتِ نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے کوئی ہوتی ہدایت کے من جانب اللہ ہونے کو پہچانتا ہے یا نہیں۔ ثانیاً اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد وہ آنا دئی انتخاب رکھنے کے باوجود اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی ماکیت اور اس کے امرِ سرمدی کے آگے سر تسلیم خم کرتا ہے یا نہیں۔

یہ وہ نظریہ ہے جسے ابتدا سے انبیاءِ علیہم السلام پیش کرتے آئے ہیں۔ اس نظریہ کی بنیاد پر تمام واقعات عالم کی منحل توجیہ Explanation ہوتی ہے۔ کائنات کے تمام آثار Phenomena کی بظوری تمیزِ شرعی ہے۔ اور کسی مشاہدے یا تجربے سے یہ نظریہ ٹوٹتا نہیں۔ یہ ایک مستقل نظامِ فلسفہ پیدا کرتا ہے جو جاہلیت کے فلسفوں سے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ کائنات اور وجودِ انسانی کے متعلق معلوم ہونے والے ہر سے ذخیرے کو ایک دوسرے سے ڈھنگ پر ترتیب کرتا ہے جس کی ترتیب جاہلی عقوم کی ترتیب سے سراسر متضاد ہوتی ہے۔ ادب اور تہذیب Art and Literature کے نشوونما کا ایک الگ ماسترینا ہے جو جاہلی ادب و ہنر کے تمام راستوں سے متضاد ہوتا ہے۔ زندگی کے جملہ معاملات میں ایک خاص زاویہ نظر اور ایک خاص مقصد پیدا کرتا ہے جو جاہلی مقاصد و نقطہ نظر سے لڑتی لڑتی اور اپنے جوہر میں کسی طرح میل نہیں کھاتا۔ اخلاق کا ایک علیحدہ نظام بناتا ہے جس کو جاہلی اصلاحیات سے کوئی مماثلت نہیں ہوتی۔ پھر ان علمی و اخلاقی بنیادوں پر جس تہذیب کی عمارت اٹھتی ہے اُس کی نوعیت تمام جاہلی تہذیبوں کی نوعیت سے قطعاً مختلف ہوتی ہے، اور اس کو سنبھالنے کے لیے ایک اور ہی طریقہ کے نظامِ تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے اصول جاہلیت کے ہر نظامِ تعلیم و تربیت سے کامل تضاد کی نسبت رکھتے ہیں۔ فی الجملہ اس تہذیب کی رنگ اور ریشہ و ریشہ میں جو روحِ کام کرتی ہے وہ اللہ و امدادِ قہار کی ماکیت، آخرت کے اہمقا اور انسان کے معلوم و ذمہ دار ہونے کی روح ہے۔ بخلاف اس کے ہر جاہلی تہذیب کے پورے نظام میں انسان کی خود مختاری، بے تیدی و بے چہاری اور غیر ذمہ داری کی رُوح سراسر ایسے ہوتی ہے۔ اسی لیے انسانیت کا جو نمونہ انبیاءِ علیہم السلام کی قائم کی ہوئی تہذیب سے تیار ہوتا ہے، اس کے خودِ فعال اور رنگ دروغم جاہلی تہذیب کے بنائے ہوئے نمونے سے ہر جزو اور ہر پہلو میں جدا ہوتے ہیں۔

اس کے بعد فقہان کی تفصیلی صورت جو اس بنیاد پر بنتی ہے اس کا سارا نقشہ دنیا کے دوسرے نقشوں سے

دلا ہوا ہوتا ہے۔ طہارت، لباس، خوراک، طرز زندگی، آداب و اطوار شخصی کردار، کسبِ معاش، صرف دولت، ازدواجی زندگی، خاندانی زندگی، معاشرتی رسوم، مجلسی طریقے، انسان اور انسان کے تعلق کی مختلف شکلیں، بین دین کے معاملات، دولت کی تقسیم، مملکت کا انتظام، حکومت کی تشکیل، امیر کی حیثیت، شہزادی کا طریقہ، سولی سٹریس کی تنظیم، قانون کے اصول، تفصیلی ضوابط کا اصول سے استنباط، عدالت، پرمیس، اقتساب، مانگداری، فیڈبکس، انٹرنیٹ، Public Works، صنعت، تجارت، خبر رسائی، تعلیمات اور دوسرے تمام محکموں کی پالیسی، اخراج کی ترتیب و تنظیم، جنگ و صلح کے معاملات، بین الاقوامی تعلقات اور خارجی سیاست، غرض انسانی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بڑے سے بڑے معاملات تک اس تمدن کا طرز و طریقہ اپنی ایک مستقل نشان دکھاتا ہے اور ہر ہر چیز میں ایک واضح خط امتیاز اس کو دوسرے تمدنوں سے الگ کرتا ہے۔ اس کی ہر چیز میں اتول سے آفر تک ایک خاص نقطہ نظر، ایک خاص مفہم اور ایک خاص اخلاقی رویہ کارفرما ہوتا ہے جس کا براہ راست تعلق خدا کے واحد کی حاکمیت مطلقہ اور انسان کی محکومیت و مسکونیت اور دنیا کے بجائے آخرت کی مقصودیت سے بڑا ہوا ہوتا ہے۔

### انبیاء کا مشن

اسی تہذیب و تمدن کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے انبیاءِ عظیم السلام نے وہیے بھیجے گئے تھے۔  
 مہربانی تہذیب کو مستثنیٰ کر کے ہر وہ تہذیب جو دنیا کی زندگی کے متعلق ایک جامع نظریہ اور کاروبار دنیا کو چلانے کے لیے ایک بے گنہگار طریقہ رکھتی ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ جاہلیت کی تہذیب ہو یا اسلام کی، قطعاً اس بات کی طالب ہوتی ہے کہ حاکم نہ اختیارات پر قبضہ کرے، نیرام کار اپنے ہاتھ میں لے، اور زندگی کا نقشہ اپنے طرز پر بنائے۔ حکومت کے بغیر کسی ضابطہ و نظریہ کو پیش کرنا یا اس کا مقصد ہونا محض بے معنی ہے۔ راہب تو دنیا کے معاملات کو چلانا ہی نہیں چاہتا، بلکہ ایک خاص قسم کے "سلوک" سے اپنی خیالی نجات کی منزل تک دنیا کے باہر ہی باہر پہنچ جانے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ اس لیے اس کو حکومت کی حاجت نہ طلب۔ مگر جو دنیا کے معاملات ہی کو چلانے کا ایک خاص ڈھنگ لے کر آئے اور یہی ڈھنگ کی پیروی میں انسان کی فلاح و نجات کا مقصد ہو، اس کے لیے تو تجربہ اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ اقتدار کا کچھ لینا پر قبضہ کر کے کی کوشش کرے۔ کیونکہ جب تک وہ اپنے نقشے پر عمل درآمد کرے، حاکمیت حاصل نہ کرے، اس کا نقشہ واقعات کی دنیا میں قائم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کچھ چاروں ذہنوں میں بھی زیادہ عرصہ تک باقی نہیں رہ سکتا جس تہذیب کے ہاتھ میں نیرام کار ہوتی ہے دنیا کا سارا کاروبار اسی کے نقشہ پر چلتا ہے۔ وہی علوم و افکار اور تہذیب و آداب کی رہ نمائی کرتی ہے۔ وہی اخلاق کے سانچے بناتی ہے۔ وہی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی ہے۔ اسی کے قوانین پر سارا نظام تمدن مبنی ہوتا ہے۔ اور اسی کی پالیسی ہر شعبہ زندگی میں کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی میں کہیں بھی اسی تہذیب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی جو اپنی حکومت نہ رکھتی ہو۔ یہاں تک کہ جب ایک طویل مدت تک حکمران تہذیب

کا دور دورہ رہتا ہے تو غیر عکراں تہذیب عمل کی دنیا میں خارج از بحث ہو جاتی ہے۔ اُس کی طرف ہمدردانہ نقطہ نظر رکھنے والوں کو بھی اس امر میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ طریقہ دنیا کی زندگی میں چل سکتا ہے یا نہیں۔ اُس کے نام نہاد علم بردار اور اس کی لیڈر شپ کے بزرگ خود اراکین تک تہذیبِ مخالف سے مدارات (Compromise) اور آدھے پونے کا مشترک معاملہ کرنے پر اتر آتے ہیں۔ حالانکہ عکراں میں دو باہل مختلف الاصول تہذیبوں کے درمیان تقاسم و مصالحت قطنی غیر ممکن العمل چیز ہے۔ اور انسانی تمدن اس شرک کو برداشت نہیں کر سکتا۔ بشاکی کو ممکن العمل خیال کرنا عقل کی کمی پر دلالت کرتا ہے، اور اُس کے لیے راضی ہو جانا ایمان اور تہمت کی کمی پر۔

پس دنیا میں انبیاءِ علیہم السلام کے مشن کا منہلتے مقصود یہ رہا ہے کہ حکومتِ الہیہ قائم کر کے اُس پورے نظامِ زندگی کو نافذ کریں جو وہ خدا کی طرف سے لائے گئے تھے۔ وہ اہل جاہلیت کو برحق تو دینے کے لیے تیار تھے کہ اگر چاہیں تو اپنے جاہلی اعتقادات پر قائم رہیں اور جس حد کے اندر اُن کے عمل کا اثر انہی کی خوات تک محدود رہتا ہے اس میں اپنے جاہلی طریقوں پر چلتے رہیں۔ مگر وہ انہیں برحق دینے کے لیے تیار نہ تھے، اور فطرۃً نہ دے سکتے تھے، کہ اقتدار کی کئی چھان اُن کے ہاتھ میں رہیں اور وہ انسانی زندگی کے معاملات کو طاقت کے زور سے جاہلیت کے قوانین پر چلائیں۔ اسی وجہ سے تمام انبیاء نے سیاسی انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی بعض کی مسماعی حرفت زمین تیار کرنے کی حد تک رہی۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ۔ بعض نے انقلابی تحریک عملاً شروع کر دی مگر حکومتِ الہیہ قائم کرنے سے پہلے ہی ان کا کام ختم ہو گیا جیسے حضرت یسوعؑ۔ اور بعض نے اس تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیا جیسے حضرت یوسفؑ، حضرت موسیٰؑ اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ﷺ۔

لہٰذا مبرورہ زمانے میں بعض دیندار بزرگوں کی زبان سے یہ فقرہ اکثر سنتے ہیں آتا ہے کہ حکومت مقصود نہیں بلکہ موجود ہے۔ یہ بات جو حضرت فریڈ نے ہیں ان کے ذہن میں دواصل حکومت کے محض ایک انعام ہونے کا تصور ہے، اُس کے ڈیوٹی اور حکومت ہونے کا تصور نہیں ہے۔ اور نہیں جانتے کہ دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے جس حکومت کی ضرورت ہے اس کا قیام خدا کی شریعت میں مطلوب و مقصود ہے اور اس کے لیے جہاد کا فرض ہے۔

# دین کا قرآنی تصور

هُدًى مَكْرَمَةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا وَتُسَىٰ بِهِ كُتُبًا  
 وَالتَّوْحِيدَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ اٰبِلٰهِيْمَ  
 وَمُوسٰى وَعِيسٰى اَنْ اَقِيْمُوا السِّرٰتَ وَ  
 لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهٖ - (الشورى - آیت ۱۲۸)

اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا  
 حکم اس نے نوح کو دیا تھا۔ اور جسے دے کے محمدؐ اب ہاری  
 طرف ہم نے وہی کہہ دیا ہے۔ اور جس کی ہدایت  
 ہم ابراہیمؑ، موسیٰ اور عیسیٰ کو دے چکے ہیں، اس ناکیدہ کے

ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔

اس آیت میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کسی نئے مذہب کے بانی نہیں ہیں۔ نہ انبیاء  
 میں سے کوئی اپنے کسی الگ مذہب کا بانی گزرا ہے۔ بلکہ اللہ کی طرف سے ایک ہی دین ہے جسے شمرع سے تمام  
 انبیاء پیش کرتے چلے آ رہے ہیں اور اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی پیش کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے حضرت  
 نوح کا نام لیا گیا ہے جو طوفان کے بعد موجودہ نسل انسانی کے اولین پیغمبر تھے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا  
 گیا ہے جو آخری نبی ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم کا نام دیا گیا ہے جنہیں اہل عرب اپنا پیشوا مانتے تھے۔ اور آخر میں حضرت  
 موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا ذکر کیا گیا ہے، جن کی طرف یہودی اور عیسائی اپنے مذہب کو منسوب کرتے ہیں۔ اس سے  
 مقصود یہ نہیں ہے کہ انہی پانچ انبیاء کو اس دین کی ہدایت کی گئی تھی۔ بلکہ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاء  
 بھی آئے ہیں، سب ایک ہی دین کے آتے ہیں اور نوح کے طور پر ان پانچ جلیل القدر انبیاء کا نام لے دیا گیا ہے  
 جن سے دنیا کو معروف ترین آسمانی شریعتیں ملی ہیں۔

یہ آیت چونکہ دین اور اس کے مقصود پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس پر بظوری طرح  
 غور کر کے اسے سمجھا جائے۔

انغری تحقیق

کلام عرب میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے :

(۱) غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرمانروائی، دوسرے کو اطاعت پر مجبور کرنا، اُس پر اپنی قدرت کا سہرا  
(Sovereignty) استعمال کرنا، اُس کو اپنا غلام اور تابع افرینانا، مثلاً کہتے ہیں ذانِ اِنْسَانِ ؛  
ای ذمیرہ علی الطاعة یعنی لوگوں کو اطاعت پر مجبور کیا۔

ذُنُوبِهِمْ فِدَانُوا، ای قہر قہم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو مغلوب کیا اور وہ مطیع ہو گئے)۔ ذنُ  
القوم ای اذ لکم و استعبدکم یعنی میں نے اُس قوم کو مستر کر لیا اور غلام بنا لیا، دان انجیل اذا عذ افلان  
شخص عزت اور طاقت والا ہو گیا)۔ ذنُ الرجل، حصدہ علی حاکمہ، وہیں نے اس کو ایسے کام پر مجبور کیا جس کے  
یے وہ راضی نہ تھا، ذنُ فلان، اذا حمل علی مکروہ (فلان شخص اس کام کے سینے پر مجبور کیا گیا، ذنُ  
سند و مکنتہ (یعنی میں نے اس پر حکم چلایا اور فرمانروائی کی)۔ ذنُ القوم، ذنُ القوم سیاستہم  
میں نے قوم کی سیاست و حکمرانی فلان شخص کو دی۔ اسی معنی میں خطیبہ اپنی ماں کو خطاب کر کے کہتا ہے:

لَقَدْ كَذَّبْتَ اَمْرَ بَيْنِكَ حَتَّى  
تَرَ كَتَبَهُمْ اَذَى مِنَ السَّحَابِ

دو اپنے بچوں کے حالات کی خبر ان بنائی گئی تھی  
آخر کار تو نے انہیں اٹے سے بھی زیادہ باریک کے ٹھکرا

حدیث میں آتا ہے انکتس من ذانِ نفسہ و عمل لہا بعد الموت (یعنی عقلمند وہ ہے جس نے اپنے  
نفس کو مغلوب کر لیا اور وہ کام کیا جو اس کی آخرت کے لیے نافع ہو)۔ اسی معنی کے لحاظ سے وہ بیان اس کو کہتے ہیں  
جو کسی ملک یا قوم یا قبیلہ پر غالب و قاهر ہو اور اس پر فرمانروائی کرے۔ چنانچہ ایشیاء العوازی نبی صلی اللہ علیہ  
وسلم کو خطاب کر کے کہتا ہے یا سید الناس و دقان العرب۔ اور اسی لحاظ سے بدرین کے معنی غلام اور بندگی کے  
معنی لوٹدی، اور ابنِ بدرینہ کے معنی لوٹدی زاوہ کے آتے ہیں، جیسے (مظل کہتا ہے ربت و ربانی سچو ماہ ابن  
مدینہ)۔ اور قرآن میں ہے فَاذْا اِنْ كَذَّبْتُمْ خَيْرَ مَدِينِينَ تَرْجِعُونَهَا اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ یعنی اگر تم کسی  
کے مملوک، تابع، ماتحت نہیں ہو تو تم نے اسے کو موت سے بچا کیوں نہیں بیٹے؟ جان کر واپس کیوں نہیں چلا لیتے؟  
(۲) اطاعت، بندگی، خدمت، کسی کے لیے مستر ہو جانا، کسی کے تحت امر ہونا، کسی کے غلبہ و قہر سے وہ کہ

اس کے مقابلہ میں زمت قبول کر لینا۔ چنانچہ کہتے ہیں ذنہم فدا انوا ای قہر قہم فاطاعوا (یعنی میں نے ان کو  
مغلوب کر لیا اور وہ لوگ مطیع ہو گئے)۔ ذنُ الرجل ای خدمتہ (یعنی میں نے فلان شخص کی خدمت کی)۔  
حدیث میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا: اُرید من قدس کلمتہ تدین لہم بما العود، ای تلبیہم و تخضع  
لہم یعنی میں قریش کو ایک ایسے کلمہ کا پیرو بنانا چاہتا ہوں کہ اگر وہ اسے مان لیں تو تمام عرب ان کا تابع فرمان  
بن جاتے اور ان کے آگے جھک جاتے۔ اسی معنی کے لحاظ سے اطاعت شعار قوم کو قوم دین کہتے ہیں۔ اور اسی  
معنی میں دین کا لفظ حدیث خوارج میں استعمال کیا گیا ہے، یسر وین من الدین سرور السہم

من الوصیة -

۳) شریعت، قانون، طریقہ، کیش و ملت، رسم و عادت جیسا کہ ہے ہیں حازر ان ذلک دین و دینداری، یعنی یہ ہمیشہ سے میرا طریقہ رہا ہے، یعنی دان اذا اعتاد خبیثاً او شتاً۔ یعنی آدمی خواہ بڑے طریقہ کا پابند ہو یا بھلے طریقہ کا، دونوں صورتوں میں اس طریقہ کو جس کا وہ پابند ہے دین کہیں گے، حدیث میں ہے کانت قدیش ومن دان ببدینہم۔ قریش اور وہ لوگ جو ان کے مسلک کے پیرو تھے، اور حدیث میں ہے انہ علیہ السلام کان علی دین فوضہ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے اپنی قوم کے دین پر تھے، یعنی نکاح۔ نفاق، میراث، اور دوسرے تمدنی و معاشرتی امور میں انہی قاعدوں اور ضابطوں کے پابند تھے جو آپ کی قوم میں رائج تھے۔

(۴) جزا و عمل، بدلہ، مکافات، فیصلہ، محاسبہ۔ چنانچہ عربی میں مثل ہے کما تدبیر تذا ان۔ یعنی جیسا اثر کرے گا ویسا بھرنے کا۔ قرآن میں گفتار کا یہ قول نقل فرمایا گیا ہے ارنالکدنیون؟ کیا مرنے کے بعد ہم سے حساب لیا جائے والا ہے؟ اور نہیں بدلے والا ہے؟ عبداللہ بن عمر کی حدیث میں آتا ہے لا تسبوا السلطان فان کان لا یدفعوا اللہم۔ دیکھ کما یدنیون۔ اپنے حکمرانوں کو برا نہ کہو اور کہنا ناگزیر ہو تو یوں کہو خلیا جیسا یہ ہمارے ساتھ کر رہے ہیں ایسا ہی تو ان کے ساتھ کرنا۔ اسی معنی میں دریان یعنی قاضی و حاکم عدالت آتا ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ سے جب حضرت علیؑ کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کان دیان خذہ الامنہ بعد نبیسا۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ اس امت کے سب سے بڑے قاضی تھے۔

### جامع اصطلاح

انہی تصورات میں سے کبھی ایک کے لیے اور کبھی دوسرے کے لیے اہل عرب مختلف طور پر اس لفظ کو استعمال کرتے تھے مگر چونکہ ان چاروں امور کے متعلق عرب کے تصورات پوری طرح صاف نہ تھے اور کچھ بہت

لہٰذا اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خوراج دین یعنی ملت سے نکل جائیں گے کیونکہ حضرت علیؑ سے جب ان کے متعلق پوچھا گیا گفتار ہم؟ کیا یہ لوگ کافر ہیں؟ تو آپ نے فرمایا من الکفر فتوا کفری سے تو وہ بھاگے ہیں۔ پھر پوچھا گیا انہنا فحقون ہم؟ کیا یہ منافق ہیں؟ آپ نے فرمایا منافق تو خدا کے گمراہ ہیں اور ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ شب و روز اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اسی بنا پر یہ یقین ہوتا ہے کہ اس حدیث میں دین سے مراد اطاعت ایسر ہے۔ چنانچہ ابن اثیر نے نہایت ہی اس کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ ارا و بال دین الطاعة ای انہم غیر جود من لاطاعة الامام المقتدر الطاعة و یسخطون۔ منہا۔ یعنی حضرت علیؑ کا مطلب یہ تھا کہ وہ دین، یعنی اس نام

کی اطاعت سے نکل جائیں گے جس کی اطاعت فرض ہے۔ (جلد ۲ ص ۳۱-۳۲)



زیادہ بلند بھی نہ تھے، اس لیے اس لفظ کے استعمال میں ایہام پایا جانا تھا اور یہ کسی باقاعدہ نظام فکر کا اصطلاحی لفظ نہ بن سکا۔ قرآن آیا تو اس نے اس لفظ کو اپنے منشا کے لیے مناسب پاکر بالکل واضح اور متعین مفہومات کے لیے استعمال کیا اور اس کو اپنی مخصوص اصطلاح بنا لیا۔ قرآنی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام کی نمائندگی کرتا ہے۔

قرآنی مفہومات کے لحاظ سے دین کے معنی اُس طرز عمل اور اُس رویے کے ہیں جو کسی کی بالاتری تسلیم اور کسی کی اطاعت قبول کر کے انسان اختیار کرے۔ اور دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ کی بندگی کے ساتھ کسی دوسرے کی بندگی شامل نہ کرے، بلکہ اسی کی پرستش، اسی کی ہدایت کا اتباع اور اسی کے احکام و اوامر کی اطاعت کرے۔ اُسی کی فرمانبرداری پر عزت، ترقی، اور انعام کا اُمیدوار ہو۔ اور اُس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ "اسٹیٹ" کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔ لیکن ابھی اس کو دین کے پورے معنوی حدود پر حاوی ہونے کے لیے مزید وسعت درکار ہے۔

### ایک مثال

بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے، **بَلَّغْ جَمَاعًا مِّنْكَرَ نَجْوٰتِہٖمْ وَتَمٰنٰہَا جَاہِلِیَہٖ** انہوں نے یہ راستے قائم کر لی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام و ضوابط نہیں ہیں۔ بلکہ صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ کی عبادت بجالانا ہے، یا حد سے حد اُس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں مشترک رہے ہیں۔ لیکن یہ ایک بڑی سطحی راستے ہے جو سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کر لی گئی ہے۔ اور یہ ایسی خطرناک راستے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کر دی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی اُس تفریق تک جا پہنچے گی جس میں قنابلہ کو سینٹ پال نے دین بلا شریعت کا لفظ پیش کیا اور تیندنا مسیح علیہ السلام کی اُمت کو خراب کر دیا۔ اس لیے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے، اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اہمیت کو غیر مقصود باترات سمجھ کر نظر انداز کر دیں گے اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اخلاقی اصولوں کو لے کر ٹیڑھ جائیں گے۔ اس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم مہیاں دیا گیا ہے آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اخلاقی اصول ہی ہیں، یا شرعی احکام بھی؟ قرآن مجید کا جسب ہم تبلیغ کرتے ہیں تو اس میں جن چیزوں کو دین میں شمار کیا گیا ہے ان میں حسب ذیل چیزیں بھی جہیں ملتی ہیں:

(۱) وَمَا أَمُرُوا إِلَّا لِيعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُفَّاءَ وَكَيْفِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ۔  
 اور ان کو حکم نہیں دیا گیا مگر اس بات کا یکسو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی راستہ رہتے ہیں۔  
 (البینہ، آیت ۱۵)

اس سے معلوم ہوا کہ نماز اور زکوٰۃ اس دین میں شامل ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے احکام مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام پہلی شریعتوں میں نماز کی یہی شکل و ہیئت، یہی اس کے اجزاء، یہی اس کی رکعتیں، یہی اس کا قبلہ، یہی اس کے اوقات اور یہی اس کے دوسرے احکام رہتے ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ تمام شریعتوں میں یہی اس کا نصاب، یہی اس کی شرحیں، اور یہی اس کی تحصیل اور تقسیم کے احکام رہے ہیں۔ لیکن اختلاف شریعتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں کو دین میں شمار کر رہا ہے۔

(۲) حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَكُلُّ الْخَيْرِ نَرِيٍّ وَمَا أَهَلَ لِعَبْرِ اللَّهِ بِهِ وَ الْمُنْتَهَىٰ وَالْمُتَوَدَّىٰ وَالْمُتَرَدِّدُ وَالْمُتَلَبِّدُ وَمَا آخَلَ السَّبْعُ إِلَّا مَا ذُكِّرْتُمْ وَمَا ذُجِعَ عَلَى السَّيْبِ وَأَنْ تُقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِتْنَةٌ وَالْيَوْمَ نَبِّئِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ مَا كُنْتُمْ يَفْعَلُونَ فَمَنْ تَقْسَمُوا عَلَىٰ مَا لَا يَحِلُّ فَاغْلِبُوا فَكُلُوا مِنْهُ حَرَامًا وَمَا كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ

”تہا سے لیے حرام کیا گیا مردار اور خون اور سوراگشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ اور وہ جو ٹھنڈا کر یا چوٹ کھا کر یا طبعی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرنے والا ہو یا جسے کسی زندہ سے لے پھاڑا ہو، سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔ اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو نیز یہی تمہارا لیے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعہ سے اپنی نعمت معلوم کر رہے ہو سب کام غش ہیں۔ آج کا فروع کو تہا سے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے۔ لہذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تہا سے

(المائدہ، ۳۰)

یہ نکل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں بڑی کر دیں اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔  
 اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکام شریعت بھی دین ہی ہیں۔

(۳) قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ

”جنگ کرو ان لوگوں سے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان نہیں لائے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں

(التوبہ، ۲۹)

مانتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کے ساتھ عدل و عوام کے اُن احکام کو ماننا اور ان کی پابندی کرنا بھی

دین ہے جو اللہ و راس کے رسول کے دیتے ہیں

(۴) التَّائِبَةُ وَالذَّانِبُ مَا جُلِدُوا مَلَّ وَاجِدُوا  
 وَشَصَمًا مِائَةً جَلْدَةً وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا  
 تَرَافَقَ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُمْسِكُونَ بِأَنفُسِكُمْ  
 وَالْيَوْمِ الْآخِرِ - (النور: ۲۱)

مازنیہ عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو گز  
 ماروا اور ان پر تیس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے  
 معاملہ میں تم کو دامن گیر نہ ہو اگر تم اللہ اور روزِ آخر  
 پر ایمان رکھتے ہو۔

معلوم ہوا کہ فوجداری قانون بھی دین ہی ہے۔

یہ تو وہ چار نمونے ہیں جن میں شریعت کے احکام کو بالفاظِ صریح دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ  
 اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے بہتیم کی وحلی ہے (مثلاً زنا، سود خوری، قتل  
 متوسن، قسیم کا مال کھانا، باطل طریقوں سے لوگوں کے مال لینا، وغیرہ)، اور جن جرائم کو خدا کے عذاب کا موجب قرار دیا  
 گیا ہے، (مثلاً عملِ نوح اور دین دین میں قومِ شعیب کا سارو بیہوشی، ان کا شمار بھی لازماً دین میں ہونا چاہیے۔ اس لیے  
 کہ اگر دین جہنم اور عذاب الہی سے بچانے کے لیے نہیں آیا ہے تو اور کس چیز کے لیے آیا ہے؟ اسی طرح وہ احکام  
 شریعت بھی دین ہی کا حصہ بننے چاہیں جن کی خلاف ورزی کو خود فی النار کا موجب قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً میراث  
 کے احکام، جن کو بیان کرنے کے بعد آخر میں ارشاد ہوا ہے:-

وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَتَّقِ اللَّهَ  
 حَقَّ تَقَاتِهِ يَجْعَلْ اللَّهُ لَهُ مَخْرَجًا  
 وَمِنْ عَذَابٍ شَدِيدٍ - (النساء: ۱۳)

جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اور اللہ کی ضد  
 سے تجاوز کرے گا اللہ اس کو روزِ آخر میں نکلے گا،  
 جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے رُحمت ہوگی

عذاب ہے۔

اسی طرح جن چیزوں کی حرمت کا فیصلہ کیا گیا ہے، مثلاً جوڑے کی حرمت، جمہوری شہادت کی حرمت، ان کی حرمت  
 کو اگر اتنا مست دین میں شامل نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر ضروری احکام بھی شے دیتے ہیں  
 جن کا اجراء مقصود نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے، مثلاً روزہ اور حج، ان کی  
 اتنا مست کو بھی محض اس بہانے (تامت دین سے خارج نہیں کیا جاسکتا کہ رمضان کے ۳۰ روز سے تو پچھلی شریعتوں  
 میں نہ تھے، اور کبھی کبھی تو اس شریعت میں تھا جو اولادِ ابراہیم کی اسماعیلی شاخ کو ملی تھی۔

قانونِ ملکی اور دین

سورۃ یوسف کی آیت: مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ هِيَ تَأْمِنُ عَلَى رَأْسِهِ  
 Law of the Land

کہے یہ لفظ دین استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے معنی دین کی وسعت پوری طرح واضح کر دی ہے۔ اس سے ان لوگوں کے تصور دین کی جڑ کٹ جاتی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کو صرف عام مذہبی معنوں میں خدا سے واحد کی پوجا کرانے اور محض چند مذہبی مراسم و عقائد کی پابندی کر لینے تک محدود سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انسانی تمدن، سیاست، معیشت، عدالت، قانون اور ایسے ہی دوسرے ذہنی امور کا کوئی تعلق دین سے نہیں ہے، یا اگر ہے بھی تو ان اُمور کے بارے میں دین کی ہدایات محض انتہائی سفارشات ہیں جن پر اگر عمل ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ انسانوں کے اپنے بنائے ہوئے اصول و ضوابط قبول کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ سراسر گمراہانہ تصور دین، جس کا ایک مدت سے مسلمانوں میں چرچا ہے، جو بہت بڑی حد تک مسلمانوں کو اسلامی نظام زندگی کے پیام کی سچی سے غافل کرنے کا ذمہ دار ہے، جس کی بدولت مسلمان کفر و جاہلیت کے نظام زندگی پر نہ صرف راضی ہو جاتے بلکہ ایک نبی کی سنت سمجھ کر اس نظام کے پُرزے بننے اور اس کو خود چلانے کے لیے بھی آمادہ ہو گئے، اس آیت کی روش سے قطعاً غلط ثابت ہوتا ہے جس میں فوجداری قانون کو دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ صاف بتا رہا ہے کہ جس طرح نماز، روزہ اور حج دین ہے اسی طرح وہ قانون بھی دین ہے جس پر سوسائٹی کا نظام اور ملک کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ لہذا اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ اور وَمَنْ يَتَّبِعْ خَيْرَ الْاِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وغیرہ آیات میں جس دین کی اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے اس سے مراد صرف نماز، روزہ ہی نہیں ہے بلکہ اسلام کا اجتماعی نظام بھی ہے جس سے ہٹ کر کسی دوسرے نظام کی پیروی خدا کے جان ہرگز مقبول نہیں ہو سکتی۔

در اصل ساری غلط فہمی صرف اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ سورہ مائدہ کی آیت بِكُلِّ شَيْءٍ عَلَيْنَا مِثْقَلُ ذَرَّةٍ لَّيْسَ الْاِسْلَامُ الْاِمْتِنَانُ لَكُمْ بَلِ الْاِسْلَامُ الْاِذْقَانُ لَكُمْ اور اَمْتٌ لَّيْسَ الْاِسْلَامُ الْاِمْتِنَانُ لَكُمْ بَلِ الْاِسْلَامُ الْاِذْقَانُ لَكُمْ کے لیے ہم نے تم میں سے ہر امت کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کر دی" کا اٹا مطلب لے کر اسے یہ معنی پہنا دیتے گئے ہیں کہ شریعت چونکہ ہر امت کے لیے الگ تھی اور حکم صرف اُس دین کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیاء کے درمیان مشترک تھا، اس لیے اقامت دین کے حکم میں اقامت شریعت شامل نہیں ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سورہ مائدہ میں جس مقام پر یہ آیت آئی ہے اس کے پورے سیاق و سباق کو آیت ۴۴ سے آیت ۴۸ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی امت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اس امت کے لیے دین تھی، اور اس کے دور نبوت میں اسی کی اقامت مطلوب تھی۔ اور اب چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دور نبوت ہے اس لیے امت محمدیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اس دور کے لیے دین ہے اور اس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے۔ یہاں شریعتوں کا اختلاف تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر

نماز اور روزے کو دیکھیے۔ نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے۔ مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نذہ تھا اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزاء میں بھی فرق تھا۔ اسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا مگر ماہ رمضان کے روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو آقا صلی اللہ علیہ وسلم میں شامل تھا مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزے رکھنا آقا صلی اللہ علیہ وسلم سے خارج ہے۔ بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی امت کے لیے اُس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لیے جو قاعدے مقرر کیے گئے تھے انہی کے مطابق اُس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا۔ اور اب آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے شریعت مقرر نہیں ہوئی جو طریقہ رکھا گیا ہے ان کے مطابق انہیں ادا کیا جاسکتا ہے۔ انہی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکام شریعت کو بھی قیاس کر لیجیے۔

دین اپنا اقتدار چاہتا ہے

قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ یہ اپنے پیر قتل سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دین حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیے جان نثار دیں، اور یہ اُن کو انسانی زندگی کی اصلاح کا ایسا پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جاسکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کیے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ  
بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَادَ اللَّهُ

اور اے نبی! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اُس روشنی میں جو

اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

(النساء: ۱۰۵)

اس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے جو احکام دیتے گئے ہیں وہ صرف چنانچہ اپنے لیے ایک ایسی حکومت کا تصور دیتے ہیں جو ایک مترفعہ عدسے کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمہ لے (النور: ۶۰-۱۱۳)۔ اس کتاب میں سُوْد کو بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سُوْد خوردی جاری رکھنے والوں کے خلاف جو اعلان جنگ کیا گیا ہے (البقرہ: ۲۷۹) وہ اسی صورت میں رد عمل آسکتا ہے جب تک کہ سیاسی اور معاشی نظام ٹوٹی ہوئی طرح اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ اس کتاب میں قاتل سے قصاص لینے کا حکم (البقرہ: ۱۷۸)، چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (المائدہ: ۳۸)، زنا اور زناورثت پر حد جاری کرنے کا حکم (النور: ۲۳-۲۴) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ ان احکام کے ماننے والے لوگوں کو کفار کی پوسٹ اور عدالتوں کے ماتحت رہنا ہوگا۔ اس کتاب میں کفار سے قتال کا حکم (البقرہ: ۱۹۰-۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے

کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کر کے اس حکم کی تعمیل کریں گے۔ اس کتاب میں اہل کتاب سے جزیر لینے کا حکم (التوبہ - ۱۲۹) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے ان سے جزیر وصول کریں گے اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔ اور یہ معاملہ عرت مدنی سورتوں میں تک محدود نہیں ہے۔ کئی سورتوں میں بھی دیکھنا کہ غلامیہ یہ نظر آسکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیش نظر تھا وہ دین کے غلبہ و اقتدار کا تھا نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت یہاں اور اہل دین کے ذمی بن کر رہنے کا۔

حضور کے کارنامے سے استنباط

سب سے بڑھ کر جس چیز سے تعبیر کی یہ غلطی متصادم ہوتی ہے وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عظیم انسان کام ہے جو حضور نے ۲۳ سال کے نائن رسالت میں انجام دیا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ آپ نے تبلیغ اور تلواریوں سے پورے عرب کو متحرک کیا اور اس میں ایک مکمل حکومت کا نظام ایک مفصل شریعت کے ساتھ قائم کر دیا جو اعتقادات اور عبادات سے لے کر شخصی کردار، اجتماعی اخلاق، تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، سیاست اور صلح و جنگ تک زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی؟ اگر حضور کے اس پورے کام کو قیامت دین

جیسا ہے بن میں انسان کی حالتوں کا اور انہیں کے تحت زندگی بسر کرے، اس کی فرمایا برداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خماری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے مفہوم پر حاوی ہو۔ حسب ذیل آیات میں "دین" اسی اصطلاح کی حیثیت سے استعمال ہوا ہے۔

اہل کتاب میں جو لوگ نہ اللہ کو مانتے ہیں نہ نبی اس کو واحد  
مقتدر را علی تسلیم نہیں کرتے، نہ یومِ آخرت یعنی یومِ الحسام  
اور یومِ الجزاء کو مانتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے  
ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا تھا  
اور دین حق کو اپنا دین نہیں مانتے ان سے جنگ کرو

فَاَقْبِلُوا الدِّينَ لَا تَكُونُوا مِنَ الْمُكْفِرِينَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ  
الْآخِرِ وَلَا يُجِزُوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَ  
رَسُولُهُ وَلَا يَكْفُرُوا دِينَ الْحَقِّ مِنَ  
الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ  
عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ - (توبہ - آیت ۲۹)

یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں :-

اس آیت میں "دین حق" اصطلاحی لفظ ہے جس کے مفہوم کی تشریح واضح اصطلاح بل نشانہ نے پہلے تین فقروں  
میں خود ہی کر دی ہے۔ ان کے ہوسے ہی کو دین حق سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"فرعون نے کہا چھوڑ دیجئے، میں اس موی کو قتل ہی کیسے  
دیتا ہوں اور اب پتھر سے پہ اپنے زب کو بجھے خود  
ہے کہ کہیں یہ تمہارا دین بدل دے یا ملک میں فساد  
نکھر کر دے"

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذُرِّيَّتِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ  
لِيَدْعُنِي إِلَىٰ رَبِّهِ إِنَّي خِفْتُ أَنْ يُبَدِّلَ  
دِينَكُمْ وَأَنْ تُطَغَّرَ الْأَرْضُ مِنَ الْفَسَادِ -  
(الفرعون - آیت ۲۹)

قرآن میں فقہ فرعون و موسیٰ کی حقیقی تفصیلات آئی ہیں ان کو نظر میں رکھنے کے بعد اس امر میں کوئی شبہ نہیں رہتا  
کہ یہاں دین مجرور مذہب کے معنی میں نہیں آیا ہے بلکہ ریاست اور نظام تمدن کے معنی میں آیا ہے۔ فرعون کا کہنا  
یہ تھا کہ اگر موسیٰ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو اسٹیٹ بدل جائے گا، جو نظام زندگی اس وقت فرعون کی  
حاکمیت اور راجح الوقت قوانین و رسوم کی بنیادوں پر چل رہا ہے وہ جیسے اکھڑ جائے گا، اور اس کی جگہ باتو  
دوسرا نظام بالکل دوسری ہی بنیادوں پر قائم ہوگا، یا نہیں تو سروسے سے کرتی نظام قائم ہی نہ ہو سکے گا، بلکہ  
تمام ملک میں بد نظمی پھیل جائے گی۔

"اللہ کے نزدیک دین تو دراصل اسلام ہے"  
اور جو "اسلام" کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا  
اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا"  
وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو صیح و بھائی اور  
دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ اس کو پوری جنس دین  
پر غالب کر دے اگرچہ شرم کرنے والوں کو یہ کتنا  
ہی ناگوار ہو :-

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ (آل عمران - ۱۹)  
وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ  
عِنْدَهُ (آل عمران - ۸۵)  
هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ  
دِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ  
كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ - (التوبہ - ۳)

اور قرآن سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ نقتضہ باقی نہ رہے  
اور دین بالکلمۃ اللہ ہی کا ہو جائے۔“

”جب اللہ کی عداوت اور فتح نصیب ہو چکی اور تم نے  
دیکھ لیا کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو  
رہے ہیں تو اب اپنے رب کی حمد و ثنا اور اس کی تسبیح کرو  
اور اس سے درگزر کی درخواست کرو وہ ہر امانت  
کرنے والا ہے۔“

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ  
الَّذِينَ كَفَرُوا قُلْ إِنَّمَا نَحْنُ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ  
وَإِن كُنَّا لَنَدْرِكُهُمْ لَسَخَّطْنَا عَلَيْهِمُ الْعَذَابَ  
وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاوَاتِ مِّنَ الْغَيْبِ  
يَخْلَعُونَ حُلِيِّهِمْ مَا لَكُم مِّنَ اللَّهِ بِشَيْءٍ  
مَّخْفِيٍّ فَلْيَكْفُرُوا إِن كُمْ تُرِيدُونَ  
الْفِتْرَةَ قُلْ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذْ يَقُولُ لِلَّذِينَ  
كَانُوا يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ  
أَسْمِعُوا لَهُمْ لَيْسَ يَسْمَعُ لِيَوْمَ يُنْفَخُ  
الْحِجَابُ قُلْ هُوَ الَّذِي يُسْمِعُ الْغَيْبَ  
وَمَا يَشَاءُ لَهُ أَتَىٰ عَالَمِينَ (النور)

ان سب آیات میں دین سے پورا نظام زندگی اپنے تمام اعتقادی، نظری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں سمیت برابر ہے  
پہلے دو آیتوں میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کے لیے صحیح نظام زندگی صرف وہ ہے جو خود اللہ  
ہی کی اطاعت و بندگی (اسلام) پر مبنی ہو۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نظام جس کی بنیاد کسی دوسرے مفروضہ اقتدار  
کی اطاعت پر ہو، ملک کائنات کے بارے میں مقبول نہیں اور فطرۃ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ انسان جن کا مخلوق  
مملوک اور پروردہ ہے اور جس کے ملک میں رعیت کی حیثیت سے رہتا ہے، وہ تو کسی یہ نہیں مان سکتا کہ انسان  
خود اس کے سوا کسی دوسرے اقتدار کی بندگی و اطاعت میں زندگی گزارنے اور کسی دوسرے کی ہدایات پر چلنے کا  
حق رکھتا ہے۔

تیسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو اسی صحیح و برحق نظام زندگی، یعنی اسلام کے ساتھ بھیجا  
ہے اور اس کے مشن کی غایت یہ ہے کہ اس نظام کو تمام دوسرے نظاموں پر غالب کر کے رہے۔  
چوتھی آیت میں دین اسلام کے پیروؤں کو حکم دیا گیا ہے کہ دنیا سے لڑو اور اس وقت تک دم نہ لو جب تک  
نقتضہ یعنی ان نظامات کا وجود دنیا سے مٹ نہ جائے جن کی بنیاد خدا سے بغاوت پر قائم ہے اور پورا نظام اطاعت  
و بندگی اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے۔

پانچویں آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع پر خطاب کیا گیا ہے جب کہ ۲۳ سال کی مسلسل جدوجہد سے  
عرب میں انقلاب کی تکمیل ہو چکی تھی، اسلام اپنی پوری تفصیلی صورت میں ایک اعتقادی و فکری، اخلاقی و تعلیمی، تمدنی و  
معاشرتی اور معاشی و سیاسی نظام کی حیثیت سے عملاً قائم ہو گیا تھا، اور عرب کے مختلف گوشوں سے وفد پر وفد آکر  
اس نظام کے دائرے میں داخل ہونے لگے تھے۔ اس طرح جب وہ کام تکمیل کو پہنچ گیا جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو  
ماثور کیا گیا تھا، تو آپ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اس کارنامے کو اپنا کارنامہ سمجھ کر کہیں فخر نہ کرنے لگنا۔ نقص سے پاک  
یہ عیب ذات اور کامل ذات عزت تمہارے رب ہی کی ہے۔ لہذا اس کارِ عظیم کی انجام دہی پر اس کی تسبیح اور





مکتبہ  
الاحیاء  
والترغیب

۱۰

# مسئلہ معجزات

پیغمبروں نے جب کبھی اپنے آپ کو فرستادہ ربّ العلین کی حیثیت سے پیش کیا تو لوگوں نے ان سے یہی مطالبہ کیا کہ اگر تم واقعی ربّ العلین کے نام سے ہو تو تمہارے ہاتھوں سے کوئی ایسا واقعہ ظہور میں آتا چاہیے جو قرآن میں فطرت کی عام روش سے ہٹا ہوا ہو اور جس سے صحت ظاہر ہو رہا ہو کہ ربّ العلین نے تمہاری صداقت ثابت کرنے کے لیے اپنی براہ راست مداخلت سے یہ واقعہ نشانی کے طور پر صادر کیا ہے۔ اس مطالبہ کے جواب میں انبیاء علیہم السلام نے وہ نشانیوں دکھائی ہیں جن کو قرآن کی اصطلاح میں آیات اور تمکین کی اصطلاح میں معجزات کہا جاتا ہے۔

## تمکین معجزات کی الجھن

ایسے نشانات یا معجزات کہ جو لوگ قرآن میں فطرت کے تحت صادر ہونے والے عام واقعات قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ درحقیقت کتاب کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان ایک ایسا موقع اختیار کرتے ہیں جو کسی طرح معقول نہیں سمجھا سکتا۔ اس لیے کہ قرآن میں جگہ صریح طور پر خارق عادت واقعہ کا ذکر کر رہا ہو وہاں اسے سیاق و سباق کے بالکل خلاف ایک عادی واقعہ بنانے کی کوشش محض ایک بھونڈی سخن سازی ہے جس کی ضرورت صرف ان لوگوں کو پیش آتی ہے جو ایک طرف تو کسی ایسی کتاب پر ایمان نہیں لانا چاہتے جو خارق عادت واقعات کا ذکر کرتی ہو، اور دوسری طرف آباؤی مذہب کے پیدائشی معتقد ہونے کی وجہ سے اس کتاب کا انکار بھی نہیں کرنا چاہتے جوئی الواقع خارق عادت واقعات کا ذکر کرتی ہے۔

## اصل سوال

معجزات کے باب میں اصل فیصلہ کن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ تعالیٰ نظام کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد مطلق ہو چکا ہے اور اس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کسی موقع پر مداخلت نہیں کر سکتا یا وہ پہنچ اپنی سلطنت کی زمام تدبیر و انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور بہر آن اس کے احکام اس سلطنت میں نافذ ہوتے

ہیں اور اس کو ہر وقت اختیار حاصل ہے کہ اشیاء کی شکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جزئی طور پر یا کلی طور پر جیسا چاہے اور جب چاہے تغیر کر دے۔

دو نقطہ ہائے نظر

جو لوگ اس سوال کے جواب میں پہلی بات کے قائل ہیں ان کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے کیونکہ معجزہ ناسخ تصور خدا سے میل کھاتا ہے اور نہ تصور کائنات سے۔ لیکن ایسے لوگوں کے لیے مناسب یہی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر و تشریح کرنے کے بجائے اس کا صاف صاف انکار کر دیں۔ کیونکہ قرآن نے تو سارا زور یہ بیان ہی خدا کے مقدم الذکر تصور کا ابطال اور ٹوٹا کر تصور کائنات کا اثبات کرنے پر صرف کیا ہے بخلاف اس کے جو شخص قرآن کے دلائل سے مطمئن ہو کر دوسرے تصور کو قبول کرے اس کے لیے معجزے کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں رہتا بظاہر ہے کہ جب آپ کا عقیدہ ہی یہ ہوگا کہ مثلاً اتر رہے ہیں اس طرح پیدا ہوا کرتے ہیں اسی طرح وہ پیدا ہو سکتے ہیں، اُس کے سوا کسی دوسرے ڈھنگ پر کوئی اثر دیا پیدا کر دینا خدا کی قدرت سے بھی باہر ہے، تو آپ مجبور ہیں کہ ایسے شخص کے بیان کو قطعی طور پر چھٹلا دیں جو آپ کو خبر ہے رہا ہو کہ ایک لامٹی اتر رہے ہیں تبدیل ہوئی، اور پھر اتر رہے سے لامٹی بن گئی لیکن اس کے برعکس اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ بے جان مادے میں خدا کے حکم سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور خدا جس واقعے کو جیسی چاہے زندگی عطا کر سکتا ہے تو اُس کے حکم سے لامٹی کا اثر دیا جتنا آتا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اسی خدا کے حکم سے اندھے کے اندر بھرے ہوئے چند بے جان مادوں کا اثر دیا جانا غیر عجیب ہے مجبوراً فرق کہ ایک واقعہ ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے، اور دوسرا واقعہ صرف تین مرتبہ پیش آیا، ایک کو غیر عجیب اور دوسرے کو عجیب قرار دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔ ۵۷۷

## معجزات کے برحق ہونے کے دلائل

کہو میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ میں کتنے تھے تم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں تم سرسری بات سے بڑھ کر ان کی تعداد کے محلے میں لوگوں سے بحث نہ کرو، اور نہ ان کے متعلق کسی سے کچھ پوچھو۔

قُلْ رَبِّيَ اعْلَمُ بِعَدَدِ جَعْمٍ مَا يَعْلَمُ سَمْعًا  
اِلَّا قَلِيْلًا تَلْمِزًا لَّمَّا يَرٰ فِيْهِمْ اِلَّا مَسْرًا  
فَمَا هُمْ اِلَّا لَا تَسْقُبُ فِيْهِمْ اَحَدًا -  
دا کہتے۔ آیت ۲۳

مطلب یہ ہے کہ اصلی چیز ان کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اصل چیز وہ سنتی ہیں جو اس وقت سے ملتے ہیں۔ اس سے سنتی یہ بتا ہے کہ ایک پتے مومن کو کسی حال میں حق سے منہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مومن کا اعتماد اسباب دُنیا پر نہیں بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے اور حق پرستی کے

یہیے نظر ہر احوال میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہِ حق میں قدم اٹھا دینا چاہئے۔  
قانونِ فطرت اور خدا کا بالا تراستیار

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس "سادتِ جاریہ" کو لوگ "قانونِ فطرت" سمجھتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دنیا میں کچھ نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ درحقیقت اُس کا پابند نہیں ہے۔ وہ جب اور جہاں چاہے اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ اُس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو سو برس تک زندہ کرے اس طرح اٹھا جٹھا کر جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی گھڑا شکل، صورت، لباس، آئندہ سستی، غرض کسی چیز پر بھی اس طویل زمانے کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تمام اگلی پھلی نسلوں کو یکساں وقت زندہ کر کے اٹھا دینا جس کی خبر انبیاء اور کتبِ آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان کس طرح ہر زمانے میں اللہ کی نشانیوں کو اپنے لیے سرمہ چشمِ بصیرت بنانے کے بجائے اُنہی کو گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ ۱۰۱

### کائنات میں غیبی معمولی عجائبات

خدا کی اسس خدائی میں عجائبات کی کمی نہیں ہے۔ جس طرف بھی آدمی نگاہ ڈالے اس کی قدرت کے کرشمے غیبی معمولی واقعات کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ کچھ واقعات و حالات کا معمولاً ایک خاص صورت میں رونما ہوتے رہنا اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس معمول سے ہٹ کر کسی دوسری غیر معمولی صورت میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے مفروضات کو توڑنے کے لیے کائنات کے ہر گوشے میں لاکھوں مخلوقات کی ہر صنعت میں خلواتِ معمولی حالات و واقعات کی ایک طویل فہرست موجود ہے خصوصیت کے ساتھ جو شخص خدا کے قاورِ مطلق ہونے کا واضح تصور رکھتا ہو وہ تو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ کسی انسان کو ایک ہزار برس یا اس سے کم پیش عمر عطا کر دینا اس خدا کے لیے بھی ممکن نہیں ہے جو موت و حیات کا خالق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر خود چاہے تو ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر خدا چاہے تو جب تک وہ چاہے اُسے زندہ رکھ سکتا ہے۔ ۱۰۲

۱۰۱ اصحابِ کہف کا جو معجزہ اللہ تعالیٰ نے اس لیے رکھا تھا کہ لوگ اس سے آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اسی نشان کو انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ نے انہیں اپنے کچھ اور ولی پوجنے کے لیے عطا کر دیئے۔ (دارالمؤقت)

# انبیاء سابقہ کے معجزات پر ایک نظر

## حضرت صالح کی اُونٹنی کا معجزہ

وَإِلَى ثَمُودَ آتَيْنَاهُمْ مِطْرًا فَقَالُوا قَالِ لِقَوْمِ  
 اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَهِ غَيْرُهُ قَدْ  
 جَاءتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَعْدِهِمْ نَارَةٌ  
 آتَتْكُمْ آيَةٌ فَلَقَوْهَا تَاكُلُ فِي أَرْضِ  
 آلِثَمُودَ وَلَا تَمْسُوهَا يُسَوِّمُ فَيَأْخُذْكُمْ  
 عَذَابٌ أَلِيمٌ (اعراف: ۱۶۳)

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔  
 اس نے کہا: اے برا اور ان قوم! اللہ کی بندگی کرو  
 اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تمہارے پاس  
 تمہارے رب کی کھلی دلیل آئی ہے۔ یہ اللہ کی اُونٹنی  
 تمہارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے لہذا اسے  
 چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں چرتی پھرے۔ اس کو کسی

بڑے ادا سے سے ہاتھ نہ لگانا ورنہ ایک دردناک عذاب تمہیں آئے گا۔

ظاہر عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے فقرے میں اللہ کی جس کھلی دلیل کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اس سے  
 مراد یہی اُونٹنی ہے جسے اس دوسرے فقرے میں "نشانی" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورہ شعراء رکوع ۱۷ میں  
 تصریح ہے کہ ثمود والوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالح سے مطالبہ کیا تھا، جو ان کے ماضور من اللہ ہونے  
 پر کھلی دلیل ہو، اور اسی کے جواب میں حضرت صالح نے اُونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت  
 ہوتی ہے کہ اُونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہوا تھا اور یہی اسی نوعیت کے معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاء  
 نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبہ پر پیش کیے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اُونٹنی کی معجزانہ پیدائش پر  
 دلیل ہے کہ حضرت صالح نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اس اُونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی  
 متعلق ہے۔ یہ آزادانہ تمہاری زمینوں میں چرتی پھرے گی۔ ایک دن یہ ایل پانی پیے گی اور دوسرے دن پوری  
 قوم کے جانور پھیں گے اور اگر تم نے اس کو ہاتھ نہ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے اس  
 نشان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جاسکتی تھی جس کا بغیر مولیٰ ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔ پھر یہ بات

کہ ایک کافی مدت تک یہ لوگ اس کے چرتے پھرتے کو اور اس بات کو کہ ایک دن تھا وہ پانی پیے اور دوسرے دن ان سب کے جانور ہیں، بادل ناخواستہ برواشت کرتے رہے اور آخر ٹپکے نشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا، ورنہ اسے کہ حضرت صالح کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انہیں کوئی خوف تھا۔ اس حقیقت پر فریڈیل ہے کہ وہ اس اوٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دھناتی پھرتی ہے۔ قرآن اس امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ اوٹنی کیسی تھی، اور کس طرح وجود میں آئی کسی صحیح حدیث میں بھی اس کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے ان روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو مفسرین نے اس کی کیفیت پر ایش کے متعلق نقل کی ہیں لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر جوئے کی حیثیت رکھتی تھی، قرآن سے ثابت ہے۔ ۱۸۸ھ

### احیائے موتی کا معجزہ

”یا پھر مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو، جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی بھینٹوں پر اندھی گری ٹری تھی۔ اس نے کہا یہ آبادی، جو بلاک ہو چکی ہے اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟ اس پر اللہ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برین تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا: تینا تو موتی مدت پڑے رہے ہو؟ اس نے کہا: ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔ فرمایا: تم سو برین اسی حالت میں گزر چکے ہو۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھو کہ اس کا بچر تک بوسیدہ ہو رہا ہے اور یہ تم نے اس لیے کیا ہے کہ تم نہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہو۔ پھر دیکھو کہ بڑوں کے اس بچر کو ہم کس طرح اٹھا کر گشت پست اس پر چڑھاتے ہیں۔ اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے باطل نمایاں ہو گئی، تو اس نے کہا: میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔“

یہ ایک غیر ضروری بحث ہے کہ وہ شخص کون تھا اور وہ بستی کون سی تھی۔ اصل مدعا جس کے لیے یہاں یہ نوکر لایا گیا ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ جس نے اللہ کو اپنا مولیٰ بنا لیا تھا اسے اللہ نے کس طرح روشنی عطا کی۔ شخص اور مقام محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

وزنوں کی تعین کا نہ ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہ اس کا کوئی فائدہ۔ البتہ بعد کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن سنا کا یہ ذکر ہے، وہ ضرور کوئی نبی ہوں گے۔

اس سوال کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بزرگ حیات بعد الموت کے منکر تھے۔ یا انہیں اس میں شک تھا، بلکہ دراصل وہ حقیقت کا عینی مشاہدہ چاہتے تھے، جیسا کہ انبیاء کو کرایا جانا رہا ہے۔ ایک ایسے شخص کا زندہ ہٹ کر آنا جسے دنیا سو برس پہلے مردہ سمجھ چکی تھی خود اس کو اپنے ہم عصروں میں ایک جتنی جاگتی نشانی بنا دینے کے لیے کافی تھا۔ ۱۷۹ھ

### حضرت ایوبؑ کے لیے حتمی تشفی

وَإِذْ ذَكَرْنَا عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ  
 أَلَيْسَ مِنِّي الشَّيْطَانُ يَتَّصِبُ وَعْدَابِي ۗ  
 أَلَمْ أَكُفَّ بِبِرِّكَ ۗ هَذَا مُعْتَسِلٌ بَادِرٌ ذَا  
 شَرَابٍ ۗ (قصہ - ۲۱-۲۲)

مگر ہمارے بندے ایوبؑ کا ذکر کرو جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے سخت تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔ (تم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مار، یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے زمین میں پاؤں مارتے ہی ایک چشمہ نکل آیا جس کا پانی پینا اور اس میں غسل کرنا حضرت ایوبؑ کے مرض کا علاج تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت ایوبؑ کسی سخت جلدی مرض میں مبتلا تھے۔ بائبل کا بیان بھی یہی ہے کہ مہر سے پاؤں تک ان کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔ ۱۷۹ھ

### معجزات حضرت ابراہیمؑ

چار پرندوں کو زندہ کرنے کا واقعہ  
 وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ لِي  
 الْوَقْفَ لَقَالَ أَوْلَمْ تُؤْمِنْ بِمَا قَالَتِ  
 الْمَلَائِكَةُ قَالَتْ إِذْ لَوْ أَنَّ مِنَ  
 الطَّيْرِ قَعْرَةٌ مِّنْكَ لَآتَيْنَاكَ  
 سَعْيًا ۗ وَاعْلَمَنَّ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ  
 حَكِيمٌ (البقرہ - ۲۶۰)

اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے، جب ابراہیمؑ نے کہا تھا کہ میرے مالک! مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرنا ہے۔ فرمایا کیا تو ایمان نہیں رکھتا، اُس نے عرض کیا ایمان تو رکھتا ہوں مگر دل کا اطمینان درکار ہے فرمایا اچھا تو چار پرندوں سے اور ان کو اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک جڑ ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکارو نیز سے پاس و دُرسے







بنا قرآن پاک کہتا ہے کہ قَلَمًا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبِينًا قَالُوا هَذَا إِسْحَارٌ شَيْئٌ وَعَجْزٌ وَإِنَّا لَنَنظُرُونَ  
 اَلَّذِينَ هُمْ يَدْعُونَ قُلُوا (النمل - آیات ۱۳۰-۱۳۱) یعنی "جب ہماری نشانیاں ان کی نگاہوں کے سامنے آئیں تو انہوں نے کہا  
 کہ یہ تو کھلا جادو ہے، حالانکہ ان کے دل اندر سے قابل ہو چکے تھے مگر انہوں نے محض غلظ اور سرکشی کی راہ سے ان کا انکار کیا" <sup>۱۳۰</sup>  
 طوفان سے مراد غالباً بارش کا طوفان ہے جس میں اولے بھی برسے تھے۔ اگرچہ طوفان دوسری چیزوں کا بھی  
 ہو سکتا ہے۔ مگر بائبل میں شمالہ باری کے طوفان کا یہی ذکر ہے اس لیے ہم اسی معنی کو ترجیح دیتے ہیں۔ <sup>۱۳۱</sup>  
 اصل میں نفل قتل استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں۔ جُود، چھوٹی کھسی، چھوٹی ٹڈی، چھرا، سرسری وغیرہ۔  
 غالباً یہ جامع لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ بیک وقت جوڑوں اور چھروں نے آدمیوں پر اور سرسریوں نے گھن  
 کے کیڑوں نے غلہ کے ذخیروں پر حملہ کیا ہوگا۔ (تقابل کے لیے ملاحظہ ہو بائبل کی کتاب خروج، باب ۲۴ تا ۲۷) <sup>۱۳۲</sup>

## ۹ نشانیاں

وَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى تِسْعَ آيَاتٍ	ہم نے موسیٰ کو نو نشانیاں عطا کی تھیں جو صریح طور پر کھانی
تَيَسَّيْتُمْ فَسَخَّرْنَا بِرِيسِ آسَافِ بْنِ فِرْعَوْنَ لَكُمُ	دسے رہی تھیں۔ اب یہ تم خردی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب
الْبَحْرَيْنِ لَمَّا كَانَا فِي الْبَحْرِ فَأَنْجَيْنَاهُ لِيُخَاطِبَهُمُ الْكُفْرَانَ	وہ سامنے آئیں تو فرعون نے یہی کہا تھا تاکہ "اُسے موسیٰ
فَكَرِهْتُمُوهُ فَسَخَّرْنَا بِرِيسِ آسَافِ بْنِ فِرْعَوْنَ لَكُمُ	میں سمجھنا ہوں کہ تو ضرور ایک خرد زہ آدمی ہے" موسیٰ
الْبَحْرَيْنِ لَمَّا كَانَا فِي الْبَحْرِ فَأَنْجَيْنَاهُ لِيُخَاطِبَهُمُ الْكُفْرَانَ	نے اس کے جواب میں کہا: "تو خوب جانتا ہے کہ یہ بیعت
فَكَرِهْتُمُوهُ فَسَخَّرْنَا بِرِيسِ آسَافِ بْنِ فِرْعَوْنَ لَكُمُ	افرد نشانیاں ریش السموات والارض کے سوا کسی نے

نازل نہیں کی ہیں، اور یہ خیال یہ ہے کہ اُسے فرعون تو ضرور ایک شامت زہ آدمی ہے" <sup>۱۳۱</sup>

وہ نو نشانیاں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس سے پہلے سورہ اعراف میں گزر چکی ہیں یعنی عصابو اثر دبا بن جاتا تھا۔  
 یہ مریضا، جو نفل سے نکلتے ہی سورج کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ جادو گروں کے جادو کو برسر عام شکست دینا۔ ایک اعلان  
 کے مطابق سارے ملک میں قحط برپا ہو جانا۔ اور پھر کچے بعد دیگرے طوفان۔ ٹڈی دل، سرسری، عینڈکوں اور غول  
 کی بلاؤں کا نازل ہونا۔ <sup>۱۳۲</sup>

حضرت موسیٰ نے فرعون کی بات کا جو جواب دیا اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی ملک میں قحط آ جانا، یا لاکھوں مربع  
 میل زمین پر پھیلے ہوئے علاقوں میں بیڈگروں کا ایک بلا کی طرح نکلنا، یا تمام ملک کے غلے کے گرواموں میں گھن لگ جانا  
 اور ایسے ہی دوسرے عام مصائب کسی جادوگر کے جادو، یا کسی انسانی طاقت کے کرتب سے رونما نہیں ہو سکتے۔ پھر جبکہ  
 ہر بلا کے نازل سے پہلے حضرت موسیٰ فرعون کو نوٹس دے دیتے تھے کہ اگر تو اپنی ہٹ سے باز نہ آیا تو یہ بلا تیری سلطنت  
 پر مسلط کی جائے گی اور ٹھیک ان کے بیان کے مطابق وہی بلا پوری سلطنت پر نازل ہو جاتی تھی، تو اس صورت میں صرف

ایک دیوانہ یا ایک سخت بہت و حرم آدمی ہی بیکہہ سکتا تھا کہ ان بلائوں کا نردول ربُّ السموات والارض کے سوا کسی اور کی کارستانی کا نتیجہ ہے، ہلہ  
عصا سے بجر کا پھٹنا

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ إِذْ آنَسَ  
بِعِبَادِي أَنَّهُمْ ظَرَبُوا فِي الْبَحْرِ  
يَخَابًا لَا تَخَوُّ كَذَّبُوا وَلَا تَخْتَشِي ۝  
(ظہ - آیت ۷۷)

تمہے نے موسیٰ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں  
کو لے کر چل پڑا اور ان کے لیے سمندر میں سے سوکھی ٹرک  
بنائے، تمہجے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ  
(سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے، ڈر گئے)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر ظہر ایک رات مقرر فرمادی جس میں تمام نبی اسرائیل اور غیر اسرائیلی  
مسلمانوں کو رجن کے لیے میرے بندوں کا جامع لفظ استعمال کیا گیا ہے، مصر کے ہر جتے سے ہجرت کے لیے نکل  
پڑنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک خانقہ کی صورت میں روانہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں نہ  
سویڈ موجود تھی نہ بحر احمر سے بحر روم و میڈیٹیرینین آنگ کا پورا اعلانہ کھلا ہوا تھا مگر اس علاقے کے نام راستوں  
پر فوجی چھاؤنیاں تھیں جن سے غیرت نہیں گزرا جاسکتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ نے بحر احمر کی طرف جانے والا راستہ  
انتخاب کیا، ان کا خیال یہ تھا کہ سمندر کے کنارے کنارے چل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف نکل جائیں لیکن اوجرت  
فرعون ایک لشکر عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اُس موقع پر آپہنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا، سورا  
شعراہ میں بیان ہوا ہے کہ جابرین کا قافلہ لشکر فرعون اور سمندر کے درمیان بانٹل گھر چکا تھا عین اُس وقت اللہ تعالیٰ نے  
حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اَصْرِبْ تَعَصَاكَ الْجُودُ، اپنا عصا سمندر پر مار۔ فَأَنْشَقُّ فَمَا كَانَ كَلْفٌ فَرَقَ كَمَا لَطَوْدٌ الْعَلِيمِ،  
فوراً سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک بڑے ٹیپے کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اور بیچ میں حدت ہی نہیں کہ قافلے کے  
گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا، بلکہ بیچ کا یہ حصہ اوپر کی آبت سے طاقی ٹنک ہو کر سوکھی ٹرک کی طرح بن گیا، یہ  
صاف اور صریح معجزے کا بیان ہے، اور اس سے ان لوگوں کے بیان کی عقلی مراضع ہو جاتی ہے، جو کہتے ہیں کہ ہر  
کے طوفان یا جوار بھانے کی وجہ سے سمندر پھٹ گیا تھا۔ اس طرح جو پانی ٹپتا ہے وہ دونوں طرف ٹیلوں کی صورت  
میں کھڑا نہیں ہو جاتا، اور نہ بیچ کا حصہ سوکھ کر ٹرک کی طرح بن جاتا ہے۔ ۱۵۸

فَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنِ اصْرِبْ تَعَصَاكَ  
الْبَحْرَ طَفَا نَشَقُّ فَمَا كَانَ كَلْفٌ فَرَقَ كَمَا لَطَوْدٌ  
الْعَلِيمِ، وَالشُّرَادُ: آیت ۶۳

تم نے موسیٰ کو وحی کے ذریعہ سے حکم دیا کہ مار پنا  
عصا سمندر پر، یگانگ سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر  
ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔

اسل الفاظ میں کما لَطَوْدٌ الْعَلِيمِ۔ لٹوڑی زبان میں کہتے ہی بڑے پہاڑ کو میں۔ لسان العرب میں ہے الْعَلِيمُ

الجبل العظیم۔ اس کے لیے پھر عظیم کی صفت لائنہ کے معنی یہ ہوتے کہ پانی دونوں طرف بہت اونچے پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا تھا پھر جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ یہ کام ایک طرف بنی اسرائیل کے پورے قافلے کو گزارنے کے لیے کیا گیا تھا اور دوسری طرف اس سے مقصد فرعون کے لشکر کو غرق کرنا تھا تو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پانی ان بہت بلند پہاڑوں کی شکل میں اتنی دیر تک کھڑا رہا کہ ہزاروں لاکھوں بنی اسرائیل کا مہاجر قافلہ اس میں گزر بھی گیا اور پھر فرعون کا پورا لشکر اس کے درمیان پہنچ بھی گیا۔ ظاہر ہے کہ عام قانونِ فطرت کے تحت جو طوفانی ہوائیں چلتی ہیں۔ وہ خود کہیں ہی نند و تیز ہوں ان کے اثر سے کبھی سمندر کا پانی اس طرح عالی شان پہاڑوں کی طرح اتنی دیر کھڑا نہیں رہا کرتا۔ اس پر فرید سورہ طہ کا یہ بیان ہے کہ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ إِنَّكَ أَنْتَ الْبَصِيرُ إِنَّكَ أَنْتَ الْبَصِيرُ ان کے لیے سمندر میں ٹوکھا راستہ بنا دے اس کے معنی یہ ہیں کہ سمندر پر عسا مارنے سے صرف آٹا ہی نہیں ہوا کہ سمندر کا پانی ہٹ کر دونوں طرف پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا، بلکہ بچ میں جو راستہ نکلا وہ خشک بھی ہو گیا، کوئی کچھ ایسی نہ رہی جو چلنے میں مانع ہوتی۔ یہ صرف ایک معجزے کا بیان ہے اور اس سے ان لوگوں کے خیال کی غلطی بالکل واضح ہو جاتی ہے جو اس واقعے کی تعبیر عام قوانینِ فطرت کے تحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۱۵۹

### من وسلوی کا نزول

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْكُتُبَ وَالْحِكْمَ (۸۰۰)

بائبل کا بیان ہے کہ مصر کے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل دشتِ سین میں ایلم اور سینا کے درمیان گزر رہے تھے اور خدا کے فریضے ختم ہو کر فاتحوں کی نوبت آگئی تھی، اس وقت من وسلوی کا نزول شروع ہوا اور غلظت کے آباد علاقے میں پہنچنے تک پورے چالیس سال یہ سلسلہ جاری رہا و خروج، باب ۱۶، آیت ۱۱، آیت ۴-۵۔

”اور توں ہوا کہ شام کو انہی میں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اسی پڑی ہوئی تھی اور جب وہ اسی سو گھر گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی چھوٹی جیسے پائے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے، بنی اسرائیل اس کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے من؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے وہ کیا ہے“ (باب ۱۶ آیت ۱۳-۱۵)۔

”اور بنی اسرائیل نے اس کا نام من رکھا اور وہ دھیسے کے بیج کی طرح سفید اور اس کا مزہ شہد کے سینے جوتے ہوئے کی طرح تھا“ (آیت ۳۱)۔

گنتی میں اس کی فرید تشریح یہ ملتی ہے:

”لوگ ادھر ادھر جا کر اسے جمع کرتے اور اسے چمکیں میں پیتے یا اوکھلی میں کوٹ پیتے تھے پھر اسے ہانڈیوں

میں اُبال کر روٹیاں بندتے تھے۔ اس کا ترہ تازہ تیل کا سا تھا۔ اور رات کو جب لشکر گاہ میں اوس پڑتی تو اس

کے ساتھ من بھی گرتا تھا (باب ۱۱- آیت ۸-۹)۔

یہ بھی ایک معجزہ تھا۔ کیونکہ چالیس برس بعد جب بنی اسرائیل کے بیٹے خوراک کے فطری ذرائع بہم پہنچ گئے تو یہ سلسلہ بند کر دیا گیا۔ اب نہ اس علاقے میں شیروں کی وہ کثرت ہے، نہ من ہی کہیں پایا جاتا ہے۔ تلاش و جستجو کرنے والوں نے اُن علاقوں کو چھان مارا ہے۔ جہاں بائبل کے بیان کے مطابق بنی اسرائیل نے چالیس سال تک درخت تور دی کی تھی۔ من اُن کو کہیں نہ ملا۔ البتہ کاروباری لوگ خریداروں کو بیوقوف بنانے کے لیے من کا علوہ ضروریہ پھرتے ہیں۔

## معجزات حضرت سلیمانؑ

پزندوں کی بولسوں کا علم

اور اُس نے کہا "گوگو! ہمیں پزندوں کی بولیاں سکھائی

وَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ عَلِّمْنَا مَنَظِقَ

الطَّيْرِ

(الزلزلہ - آیت ۱۶)

گنتی ہیں؟

بائبل اس ذکر سے خالی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کو پزندوں اور جانوروں کی بولسوں کا علم دیا گیا تھا لیکن بنی اسرائیل

کی روایات میں اس کی صراحت موجود ہے۔ (جوش انسائیکلو پیڈیا - جلد ۱۱ ص ۴۳۹) ۱۱۱۱

ان کے لیے جنوں کا سُخّر ہونا

"سلیمانؑ کے لیے جن اور انسانوں اور پزندوں کے سُخّر جمع

کیے گئے تھے جو پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے؟

وَجُمِعَتْ رِجَالُهُمْ جُجُودًا مِنْ الْجِنِّ وَ

الْإِنْسِ وَالطَّيْرِ ذَمَّحَ يُورِثُونَ - (الزلزلہ ۱۱)

مکہ سب کا تخت اُٹا فانا لایا جانا

"سلیمانؑ نے کہا "اے اہل و عیال اور قوم میں سے کون اس کا

تخت میرے پاس لائے، قبل اس کے کہ وہ لوگ

مطمین ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟ جن میں سے

ایک نبی رسل نے عرض کیا میں اسے حاضر کروں گا

قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اُٹھیں، میں اس کی

حافظت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں؟ جس شخص کے

پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا میں آپ کی جگہ

بھینکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں؟ جو نبی کہتا تھا

قَالَ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَيُّكُمْ يَأْتِينِي بِعَرْشِي

قَبْلَ أَنْ يَأْتُونِي مُسْلِمِينَ ۚ قَالَ عِفْرُونُ

بِئْسَ الْيَحْيَ أَتَانَا بَيْتِكَ بِهِ قِيلَ أَنْ تَقُومَ مِنْ

مَقَامِكَ ۚ وَإِنِّي أَخَذْتُ لِعَرُوسِي ۚ أَمِينٌ ۚ قَالَ

الَّذِي عِنْدَهُ عِلْمٌ مِمَّنْ أَلْكِنَبُ أَأَنَا بَيْتِكَ بِهِ

قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَنَّكَ إِيَّاكَ طَرَفًا ۚ فَلَمَّا رَأَى

مُسْتَقْرَرًا عِنْدَهُ قَالَ هَذَا مِنْ فَتْرِ

رَبِّي ۚ وَقِيلَ

(الزلزلہ - آیت ۲۰)

نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہنزا دیکھا وہ پکار اٹھا یہ میرے رب کا فضل ہے ۵

## دوسرے انبیاء کے چند اور معجزات

### قصہ یونس کے معجزاتی پہلو

اور یونس یونس بھی رسولوں میں سے تھا یا دیکھو جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا پھر ترعانہ ناری میں شریک ہوا اور اس میں مات کھائی آنر کا مچھلی نے اسے بل لیا اور وہ ملاحت زدہ تھا اب اگر وہ تیسرے کونے والوں میں سے نہ ہوتا تو روز نیا مت تک اس مچھلی کے پیٹ میں رہتا آنر کا رہنے اسے تیری ستیم حالت میں ایک چھیل زمین پر پھینک دیا اور اس پر ایک بیدار و تخت اٹھا دیا ۵

وَإِنَّ يُونُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ إِذِ اتَّقَىٰ إِلَىٰ الْفُلِّ الْمَشْهُوتِ ۖ فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ ۖ فَالْتَقَمَهُ الْحُوتُ وَهُوَ مُلِيمٌ ۖ فَكَلَّمْنَا تَهُ كَإِنْ كَانَ مِنَ الْمُسْتَجِيبِينَ ۖ كَلِمَاتٍ فِي بَلَدِهِ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۖ فَجَعَلْنَاهُ بِالْعَرَبِ أَرْدُ ۖ وَهُوَ سَعِيدٌ ۖ وَانْتَبَهْنَا عَلَيْهِ لَنَخْبَرَهُ مِنَ الْمُقْبِلِينَ ۖ (الشعشعہ: ۱۰۳-۱۰۶)

### حضرت زکریا کے پیسے سن رسیدہ بیوی سے اولاد

تو مجھے اپنے فتنل خاص سے ایک وارث عطا کرے جو میرا وارث بھی ہو اور آل یعقوب کی سیرا بھی پائے اور اسے پروردگار اس کو ایک پسندیدہ انسان بنا ۵ و جواب دیا گیا: اے زکریا، ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جن کا نام کسی ہوگا ہم نے اس نام کا کر لی آوی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا: سو گیا پروردگار بھلا پرے یاں کیسے بنیا ہوگا جبکہ میری بیوی بالجمہ سے اور میں بوڑھا ہو کر سوکھ چکا ہوں ۵ جواب ملا: ایسا ہی ہوگا تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے۔

فَقَبَلْنَا مِن لَّدُنكَ رِيسًا نَبِيًّا وَبَرِيًّا وَنَالِ يَعْقُوبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۖ يَكْرِيًّا ۖ إِنَّا نَنْبِتُ لَكَ عُشْبًا ۖ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُتَكَلِّمِينَ ۖ وَجَعَلْنَا لَهُ مِنْ تَحْتِ سِتْرِهِ فَإِذْ يَكُونُ فِي غُلْفٍ وَكَانَتِ آمْرًا ۖ قِيًّا ۖ وَتَدَا ۖ يَكْفُكَ مِنَ الْكَبِيرِ ۖ سِتْرِيًّا ۖ قَالَ كَذَا يَكْفُكَ ۖ قَالَ رَبِّكَ هُوَ عَلَىٰ هَيْئٍ ۖ وَ قَدْ خَلَقْتَنكَ مِن قَبْلُ ۖ وَكَانَ تَكْ شَيْئًا ۖ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۖ قَالَ آيَتُكَ إِلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۖ (مریم: ۶-۱۰)

آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جبکہ تو کوئی چیز نہ تھا: زکریا نے کہا: پروردگار، میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے: فرمایا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو پہر تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے ۵

## معجزاتِ حضرتِ عیسیٰ

حضرت عیسیٰ کا بے باپ پیدا کیا جانا

اور ابن مریم اور اور اس کی ماں کو ہم نے ایک نشان بنایا  
اور ان کو ایک سطح مرفوع پر رکھا جو اطمینان کی جگہ تھی اور  
پیشے اس میں جاری تھے

فَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ ذُرِّيَّةً ۙ اٰیَةً ۙ وَ  
اٰوَيْنَاهُمَا اِلٰی رَبْوَةٍ ذَاتِ جُدَارٍ  
مَّعْبُورٍ ۝ (المؤمنون - آیت ۵۰)

یہ نہیں فرمایا کہ ایک نشانی ابن مریم تھے اور ایک نشانی خود مریم۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ابن مریم اور اس کی ماں  
کو دو نشانیاں بنایا۔ بلکہ فرمایا یہ ہے کہ دونوں مل کر ایک نشانی بناتے تھے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا  
ہے کہ باپ کے بغیر ابن مریم کا پیدا ہونا اور مرد کی صحبت کے بغیر مریم کا حاملہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو ان دونوں کو  
ایک نشانی بناتی ہے ۲۲

اور اسے محمد! اس کتاب میں مریم کا حال بیان کرو؛  
جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گونہ  
نشین ہو گئی تھی۔ اور پوچھ ڈال کر ان سے چھپ چھپی  
تھی۔ اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی مرضی  
کو ایسی فرشتے کو بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک  
پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ مریم پکاکت مل  
اٹھی کہ ”اگر تو کوئی نسا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے  
رحمن کی پناہ مانگتی ہوں۔“ اس نے کہا ”میں تو تیرے سے  
کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک  
پاکیزہ لڑکا دوں۔“ مریم نے کہا ”میرے ہاں کیسے لڑکا  
ہوگا جبکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں ہے۔ اور  
میں کوئی بدکار عورت نہیں ہوں۔“ فرشتے نے کہا ”ایسا  
ہی ہوگا، تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے  
بہت آسان ہے۔ اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ اس  
لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں اور اپنی

وَ اِذْ كُوْنِي اِلَيْكَ مَرْجُومًا ۙ اِذَا نْتَبِهَتْ  
مِنْ اَهْلِهَا مَمَّا تَرَ بِآيَاتِنَا فَاتَّخَذَتْ مِنْ  
دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۗ فَاسْرَسْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا  
فَمَثَّلْنَا لَهَا بُشْرًا سُوًْٓٔا ۗ قَالَتْ اِنِّیْ  
اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ ۙ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ۝  
قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلٌ رَّبِّكَ ۗ لَا هَبْ اِلَيْكَ  
عُلْمًا ۙ اِنْ كُنْتَ اِنِّیْ یَكُوْنُ فِیْ عِلْمِ رَبِّ  
كَ ۗ فَتَسْتَسْمِیْ ۗ كَسْرًا ۗ كَعْرٰكُ ۗ بَعِيًّا ۗ قَالَ  
كَذٰلِكَ ۗ قَالَ رَبِّكِ هُوَ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ  
بِجَعْلِكَ ۗ اٰیةٌ لِلنَّاسِ وَرَحْمَةٌ ۗ مِّنَّا ۗ وَ  
كَانَ اَمْرًا مَّحْضًا ۗ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَهَتْ  
بِهٖ ۗ مَكَانًا قَبِئًْا ۗ فَاجَاءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰی  
بِجُذُمِ الضُّلَّةِ ۗ قَالَتْ یٰمَنْتَنِیْ مِنْ قَبْلِ  
هٰذَا ۗ وَ كُنْتُ لَمْسًا مَّحْسَبًا ۝

مریم: آیات ۱۷ تا ۲۳



سے ایک رحمت، اور یہ کام ہو کر رہتا ہے۔ مریم کو اس بچے کا حمل ہو گیا اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے ایک ٹوڈے کے مقام پر چلی گئی۔ پھر زچگی کی تکلیف نے اسے ایک گھڑی کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔ وہ کہنے لگی "کاش میں اس سے پہلے ہی مرجاتی اور میرا نام نشان نہ رہتا۔"

دور کے مقام سے مراد بیت لحم ہے۔ حضرت مریم کا اپنے اعتدالات سے نکل کر وہاں جانا ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھر نے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو بیت المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقت ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ جانتے اعتدالات پر بیٹھی رہیں اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان و اسے ہی نہیں، قوم کے دو سرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچارہ ہی اس شدید آزار میں مبتلا ہونے کے بعد غاموشی کے ساتھ اپنے اعتدالات کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تڑپتی رہیں۔ یہ واقعہ جیسے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور شرمال، سب کو چھوڑ کر وہ زچگی کے لیے ایک دور (ماز مقام پر چلی جائیں)۔ ۶۳۔

ان الفاظ سے اس پریشانی کا انداز کیا جاسکتا ہے جس میں حضرت مریم اس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ درود نہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے بلکہ یہ فکر ان کو کھاتے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزار میں انہیں ڈالا ہے، اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا۔ اب اس بچے کو کہاں سے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا تم نہ کہو اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ حضرت مریم نے یہ الفاظ کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی ٹپے اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہوتا۔ ۶۴۔

نوزائیدہ بچے کا گہوارے میں کلام کرنا

فَاَنكَرَتْ بَدَتْهَا مَقَامًا حَمِيمًا لَقَانِي الْيَوْمَ  
 لَمَّا جِئْتُ سَيِّئًا فَرِيًّا يَا خَتَّ هُرُونَ  
 مَا كَانَتْ اَبْوَابُ جَمَاعَتِنَا سَوِيًّا وَمَا كَانَتْ  
 اُمَّكَ بَعِيًّا (مریم - ۲۸)

"پس جب وہ بچے کو گود میں لیے تو ہم کے پاس آئیں تو لوگوں نے پوچھا اسے مریم یہ چیز کہاں سے لے آئی، اسے لاروں کی بہن، نہ تو تیرا باپ کوئی ہے نہ تو تیری ماں ہی کوئی بڑا عورت تھی۔"

جو لوگ حضرت عیسیٰ کی معجزانہ پیدائش کے منکر ہیں وہ آفراس بات کی کیا مستقول توجیہ کہتے ہیں کہ سزا مریم کے بچے سے ہوتے آئے پر قوم کیوں چڑھا آئی اور ان برطن اور ملامت کی بڑبڑائش نے کیوں کی ہے؟ ۶۵۔  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ قَالُوا كَيْفَ نُنَكِّمُهُ  
مريم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ لوگوں نے کہا ہم  
اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک  
بچہ ہے۔ (مریم - ۲۹)

قرآن کی معنوی تشریح کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے۔ یعنی ان کے نزدیک یہ گنگو حضرت عیسیٰ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی اور بنی اسرائیل کے بڑے بڑوں نے کہا کہ بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا۔ مگر جو شخص موقع و محل اور سیاق و سباق پر کچھ غور کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ محض ایک اہل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے۔ اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے وہ لوگ آئے تھے وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں سورہ آل عمران کی آیت ۴۶ اور سورہ مائدہ کی آیت ۱۰ دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے یہ کلام جوانی میں نہیں بلکہ گہوارے میں ایک نوزائیدہ بچے کی حیثیت ہی سے کیا تھا۔ پہلی آیت میں فرشتہ حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰ سے فرماتا ہے کہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرنا تھا اور جوانی میں بھی۔ ﷻ

قَالَ رَبِّي عَبْدُ اللَّهِ اشْتَبِي الْكُتُبَ وَ  
بچہ بول اٹھا "میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے  
کتاب دی، اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا جہاں بھی  
میں رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا  
جب تک میں زندہ رہوں، اور اپنی والدہ کا حق  
ادا کرنے والا بنایا، اور مجھ کو جبار اور شقی نہیں  
بجھائے جباراً شقیّاً۔

مریم - ۳۰-۳۱-۳۲

یہ نہیں فرمایا کہ والدین کا حق ادا کرنے والا۔ صرف والدہ کا حق ادا کرنے والا فرمایا ہے۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ کا باپ کوئی نہ تھا اور اسی کی ایک صریح دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہر جگہ اُن کو عیسیٰ بن مریم کہا گیا ہے۔ ﷻ

وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ  
"سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مرے  
وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا۔ (مریم - ۳۳)

یہ ہے وہ شافی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں نبی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نبی اسرائیل کو لڑکا  
محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

سلسلہ بکر واریوں پر غیر ناک نفاذ دینے سے پہلے ان پر نجات تمام کرنا چاہتا تھا اس کے لیے اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زائدہ و فائدہ لڑکی کو جو بیٹا المقدس میں مشغول اور حضرت زکریا کے زیر تربیت تھی، دشمنی کی حالت میں حاضر کر دیا تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آتے تو ساری قوم میں یہ جان برپا ہو جائے اور لوگوں کی قریبات یک نعت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں جب ایک عجم حضرت مریم پر لوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود ہوں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی قبول کرنے کے بجائے اسے عجم بنا کر صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے تو پھر اس کو ایسی غیر ناک نفاذی جائے جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ ۱۶۵

### قرآن کے ذکر کردہ دوسرے معجزات

<p>اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو          اُس نے کہا: "میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے          پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے          پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناؤں گا اور اس میں کچھ          مانا ہوں، وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں          اللہ کے حکم سے ماوراء اہلسدس اور کورسی کو اچھا کرتا          ہوں اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا          ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گروں میں ذخیرہ</p>	<p>وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ          بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ إِلَىٰ أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ          كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا          بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ          وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ مِمَّنْ          تَأْتُونَ وَمَا تَدْرَهُونَ فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّا          فِي ذَٰلِكَ لَآيَةٌ لِّكُلِّ مُمْتِنِينَ ۝          ذال عمران ۱۶۹</p>
--	---

کر کے رکھتے ہوئے ہیں تمہارے لیے کافی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔"

### حضور اور معجزات

#### قرآن ہی کو دلیل نبوت بنا یا گیا

<p>"آئے نبی، جب تم ان لوگوں کے سامنے کوئی نشانی          دینی معجزہ پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ تم نے اپنے          لیے کوئی نشانی کیوں نہ انتخاب کر لی؟ ان سے کہو          میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے</p>	<p>وَإِذْ لَمْ نَكُنْ لَكُمْ بآيَةٍ قَالُوا تَوَلَّوْا          اجْتَبَيْنَاهَا قُلُوبَنَا إِنَّمَا سَمِعْتُمْ مَا يُوحَىٰ إِيَّا          مِنْ رَبِّي ۗ هٰذَا يَكْفُرُونَ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ          هُدًىٰ وَرَحْمَةً لِّعِوَاظِ الَّذِينَ هُمْ مُؤْمِنُونَ ۝</p>
--	--

(الاعراف آیت ۲۰۳) رب نے میری طرف بھیجی ہے۔ یہ بصیرت کی روشنیوں

ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان کے لیے جو اُسے قبول کریں :  
گفتار کے اس سوال میں ایک صریح طعن کا اندازہ پایا جاتا تھا یعنی ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ میں جس طرح تم  
نہی بن بیٹھے ہو اسی طرح کوئی معجزہ بھی پہنانتا کر اپنے لیے بنا لاتے ہوتے لیکن آگے ملاحظہ ہو کہ اس طعن کا جواب کس  
شان سے دیا جاتا ہے۔

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ میرا منصب یہ نہیں ہے کہ میں چیز کی مانگ ہو یا جس کی میں خود ضرورت محسوس  
کروں اسے خود ایجاد یا تصنیف کر کے پیش کر دوں۔ میں تو ایک رسول ہوں، اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس  
نے مجھے بھیجا ہے اُس کی ہدایت پر عمل کروں۔ معجزے کے بجائے میرے بھیجنے والے نے جو چیز میرے پاس بھیجی ہے وہ  
یہ قرآن ہے۔ اس کے اندر بصیرت افزا روشنیاں موجود ہیں، اور اس کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مان لیتے  
ہیں، ان کو زندگی کا سیدھا راستہ مل جاتا ہے، اور ان کے اخلاقِ حسنة میں رحمتِ الہی کے آثار صاف نمودار ہوتے دیکھے جاتے ہیں۔  
بطور خود معجزات دکھانے پر حضور قادر نہیں تھے

”تاہم اگر داسے نبی ان لوگوں کی لیے ذی تم سے ہوتا  
نہیں ہوتی تو اگر تم میں کچھ ذور ہے تو زمین میں کوئی  
شجر و درخت و یا آسمان میں میرھی لگاؤ اور ان کے  
پاس کوئی نشانی لانے کی کوشش کرو“

وَإِنْ كَانَتْ لَكُمُ الْكَيْدَاتُ أَنْ  
اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْزِلُوا فِي الْأَرْضِ  
أَوْ السَّمَاءِ فَمَا يَسْخَرُونَ مِنْكُمْ بَلْ لَمْ  
يَكُنْ لَهُمْ لَكُمْ كَيْدٌ وَلَا  
(الانعام - ۱۳۵)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیب دیکھتے کہ اس قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدتیں گزر گئی ہیں اور کسی طرح پر راستی پر نہیں  
آتی تو یہاں اوقات آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کاش کوئی نشانی خدا کی طرف سے ایسی ظاہر ہو جس سے  
ان لوگوں کا کفر ٹوٹے اور یہ میری صداقت تسلیم کریں۔ آپ کی اسی خواہش کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے مطلب  
یہ ہے کہ بے صبری سے کام نہ لو۔ جس ڈھنگ اور جس ترتیب و تدبیر سے ہم اس کام کو چلو رہے ہیں اسی پر ہر کے  
ساتھ چلے جاؤ۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا ہم خود نہ لے سکتے تھے؟ مگر ہم چاہتے ہیں کہ جس حکمرانی و اخلاقی انقلاب اور  
جس ترتیبِ صالحہ کی تعمیر کے کام پر تم ہمارے کیے گئے ہو تم کا میابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں ہے تاہم  
اگر لوگوں کے موجودہ مجبور اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تمہیں گمان ہے کہ اس مجبور کو توڑنے کے  
لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرنا ہی ضروری ہے، تو خود زور لگاؤ اور تمہارا کچھ بس چلنا ہو تو زمین میں گھس کر یا آسمان پر  
چڑھ کر کوئی ایسا معجزہ لانے کی کوشش کرو جسے تم سمجھو کہ یہ یہ تصدیق کو زمین میں تبدیل کر دینے کے لیے کافی ہوگا مگر ہم  
سے امید نہ رکھو کہ تم تمہاری یہ خواہش پوری کریں گے، کیونکہ ہماری ایک ہی امید ہے اس تدبیر کے لیے کوئی حکم نہیں ہے۔

## حضورِ کاتب سے بڑا معجزہ قرآن

”وہ کہتے ہیں کہ یہ شخص اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی و معجزہ اکیوں نہیں لانا۔ اور کیا ان کے پاس اگلے صیغوں کی تمام تعلیمات کا بیان واضح نہیں لگتا“

وَقَالُوا لَوْلَا يَا رَبَّنَا يَا رَبَّنَا يَا رَبَّنَا  
أَوَلَمْ نَأْتِهِم بِبَيِّنَاتٍ مَّا فِي الصُّحُفِ الْأُولَى  
(رُطْبَةُ - ۱۳۳)

یعنی کیا یہ کوئی کم معجزہ ہے کہ انہی میں سے ایک اتنی شخص نے وہ کتاب پیش کی ہے جس میں شروع سے اب تک کی تمام کتبِ آسمانی کے مضامین اور تعلیمات کا عطر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسان کی ہدایت اور بچائی کے لیے ان کتابوں میں جو کچھ تھا وہ سب صرف یہ کہ اس میں جمع کر دیا گیا ہے، بلکہ اس کو کھول کر ایسا واضح کر دیا گیا ہے کہ صحرا نشین بزدل تک اس کو سمجھ کر فاترہ اٹھا سکتے ہیں۔ اعلیٰ

”اے نبی! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔ دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے، اور ہماری آیات کا انکار نہیں کرتے مگر وہ جو ظالم ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہ آناؤ گتیں اس شخص پر نشانیاں (یعنی معجزات)، اس کے رب کی طرف سے؟ کہو، نشانیاں تو اس کے پاس ہیں اور میں صرف خبر دیا کرنے والا ہوں کھول کھول کر اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ  
قِي لَّا تَخْطُوهُ بِمِثْلِكِ إِذَا لَأْسٌ ثَابِتٌ  
الْمُبْطِلُونَ ه بَلْ هُوَ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٌ فِي  
صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ ط وَ مَّا  
يُحْجَدُ يَا بَيْنَنَا إِلَّا الظَّالِمُونَ ه وَقَالُوا  
لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ ط  
قُلْ إِنَّمَا الْأَيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ط وَإِنَّمَا  
أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ه أَوَلَمْ يَكْفِيهِمْ أَنَا  
أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَى عَلَيْهِمْ ط  
إِن فِي ذَلِكَ لَوَحْيَةً وَ ذِكْرًا لِّمَنْ  
يَقُومُ يُؤْمِنُونَ ه (العنکبوت، ۵۰ تا ۵۱)

ہے؛ و حقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں؛

ان آیات میں استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان پڑھتے تھے۔ آپ کے اہل وطن اور شہر دار اور برادری کے لوگ، جن کے درمیان روز پیدائش سے سن کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔ اس امر واقعہ کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کتبِ آسمانی کی تعلیمات و انبیاء سابقین کے حالات، مذاہب و اذیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ، اور تمدن و اخلاق و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے

علم کا اظہار اس اُمّی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اُس کو وحی کے سوا کسی دوسرے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے کسی اسے کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو اہل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد ہو بھی سکتی تھی کہ یہ علم وحی سے نہیں بلکہ اُخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس کی اُبتیت نے تو کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔ اب خالص سہٹِ عمری کے سوا اس کی غیرت کا انکار کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہے جسے کسی وجہ میں بھی معقول کہا جاسکتا ہو۔ ۱۶۲

اُمّی ہونے کے باوجود تم پر قرآن جیسی کتاب کا نازل ہونا کیا بھائے خود انشاؤرا معجزہ نہیں ہے کہ تمہاری رسالت پر یقین لانے کے لیے یہ کافی ہو گیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے اُن کے لیے وہ معجزے تھے، مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے، تمہیں آئے دن پڑھ کر سنا یا جاتا ہے، تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔ ۱۶۳

حضور کو جتنی معجزہ کے بجائے عقلی معجزہ دینے کی وجہ

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُبُوْتًا يَدَّ اِلَيْبَاۗءِ  
اَذْقَلْعَلْتُمْ يَدَّ الْاَمْرٰٓضِ اَوْ تَخْلَعْتُمْ يَدَّ  
السُّوْتٰى ۙ (الزّٰمہ - ۳۱)

۱۰ اور کیا ہو جانا اگر کوئی ایسا قرآن اُتار دیا جاتا جس  
کے زور سے پہاڑ چلنے لگتے یا زمین شقی ہو جاتی، یا  
مردے قبروں سے نکل کر بولنے لگتے؟

اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ اس میں خطاب کفار سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے ہے۔ مسلمان جب کفار کی طرف سے بار بار نشانی کا مطالبہ سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بھڑپنی پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کو ایسی نشانی دکھا دی جاتی جس سے یہ لوگ قائل ہو جاتے پھر جب وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طرح کی کسی نشانی کے نکلنے کی وجہ سے کفار کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے متعلق لوگوں کے دلوں میں شبہات پھیلانے کا موقع مل گیا ہے تو ان کی یہ بے چینی اور بھی بڑھ جاتی تھی۔ اس پر مسلمانوں سے فرمایا جا رہا ہے کہ اگر قرآن کی کسی سورۃ کے ساتھ ایسی اور ایسی نشانیاں نکالیں کہ وہی جاتیں تو کیا واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ ایمان لے آتے؟ کیا تمہیں ان کے یہ غرض گمانی ہے کہ یہ قبول حق کے لیے بالکل تیار بیٹھے ہیں، صرف ایک نشانی کے ظہور کی کسر ہے؟ جن لوگوں کو قرآن کی تعلیم میں، کائنات کے آثار میں، نبی کی پاکیزہ زندگی میں، صحابہ کرام کے انقلابِ حیات میں نور حق نظر نہ آیا ہو کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ پہاڑوں کے چلنے اور زمین کے پھٹنے اور مردوں کے قبروں سے نکل آئے میں کوئی روشنی پائیں گے؟

۱۱ اہلِ جنت سے مراد یہ نہیں ہے کہ حضور سے معجزات صادر نہیں ہوتے جس طرح سے معجزات وقتاً فوقتاً صادر ہوتے، مگر وہ  
۱۲ طہرہ و دلیلِ نبوت تمہارے ایمان سے مالا مال کرنے کا ذریعہ نہیں ہے، ان سے صرف اہل ایمان کا ایمان نشوونما پاتا رہا۔ (مترجمین،  
محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ)

اِنَّ نَاشَا نَنْزِلَ عَلَیْهِمْ مِنَ الشَّعَرِ اَوْ اَمِیْقًا  
 فَظَلَّتْ اَعْتًا فَصَحَّةً نَمَا خَضِعِیْنَ -  
 ”ہم جاہیں تو آسمان سے ایسی نشانی نازل کر سکتے ہیں کہ  
 ان کی گزریں اُس کے آگے جھک جائیں“  
 (اشعار، آیت ۴)

یہ کوئی ایسی نشانی نازل کر دینا جو تمام کفار کو ایمان و اطاعت کی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دے، اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ کام اس کی قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا جبری ایمان اس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل و مغز دست کام لے کر ان آیات کی مدد سے حق کو پہچانیں جو کتاب الہی میں پیش کی گئی ہیں۔ جو تمام آفاق میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ جو خدا کی اپنی ہستی میں پائی جاتی ہیں پھر جب ان کا دل گواہی دے کہ واقعی حق وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا ہے اور اس کے خلاف جو جو عقیدے اور طریقے رائج ہیں وہ باطل ہیں، تو جان بوجھ کر باطل کو چھوڑیں اور حق کو اختیار کریں۔ یہی اختیار ہی ایمان، اور ترک باطل اور متابع حق وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ صحیح اور غلط جس راہ پر بھی وہ جانا چاہے جاسکے۔ اسی وجہ سے اُس نے انسان کے اندر خیر و شر کے دونوں رجحانات رکھ دیئے ہیں۔ خیر اور تقویٰ کی دونوں راہیں اس کے آگے کھول دی ہیں شیطان کو بچانے کی آزادی عطا کی ہے۔ نبوت اور وحی اور دعوت خیر کا سلسلہ راہِ راست دکھانے کے لیے قائم کیا ہے۔ اور انسان کو انتخابِ راہ کے لیے ساری مناسب حال صلاحیتیں دے کر اس امتحان کے مقام پر رکھا کر دیا ہے کہ وہ کفر و فسق کا راستہ اختیار کرے یا راستہ اطاعت کا۔ اس امتحان کا سارا مسد بہی ثروت ہو جلتے اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی تدبیر اختیار فرماتے جو انسان کو ایمان و اطاعت پر مجبور کر دینے والی ہو۔ جبری ایمان ہی مطلوب ہوتا تو نشانیاں نازل کر کے مجبور کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ انسان کو ایسی قدرت اور ساخت پر پیدا فرما سکتا تھا جس میں کفر، نافرمانی، اور بدی کا کوئی امکان ہی نہ ہوتا، بلکہ فرشتوں کی طرح انسان بھی پیدا تھی فرمانبردار مہربان۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف متعدد مواقع پر قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا: وَكُوِّنَا مِنْ تَرْتِيبِكَ لَا مَنَّ فِي الْاٰمِنِيْنَ كُلُّهُمْ جَبِيْعًا اَفَاَنْتَ مُكْتَوِبَةٌ اِخْتٰی يَكُوْنُوْنَ اَمْوَالٌ مِّنْ دَرِيْنٍ اٰیٰت ۹۹” اگر تمہارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اب کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دے؟ اور وَكُوِّنَا مِنْ تَرْتِيبِكَ لَجَعَلْنَا النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَاَلَا بِنُؤُوْنٍ مُّخْلِیْعِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلَئِكَ حَلْفُكُمْ رُبُوْد۔ آیت ۱۱۹” اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی اُمت بنا سکتا تھا۔ اور وہ تو مختلف راہوں پر ہی چلتے رہیں گے۔ اور بے راہ رویوں سے، صرف وہی چھین گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی لیے تو اس نے ان کو پیدا کیا تھا“

”اور کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے  
کتنی کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا  
کی ہیں؟ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے، مگر ان میں سے  
اکثر لوگ ایمان لاتے دیکھتے نہیں ہیں۔“

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمَا أَنْزَلْنَا فِيهَا  
مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَثِيرٍ مِمَّا هُنَّ فِي ذَٰلِكَ لَا يَذَّكَّرُونَ  
وَمَا كُنَّا أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ۔  
(سورہ اشعر او آیات ۷-۹)

یعنی جس وقت کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، آنکھیں کھول کر ذرا اس میں  
ہی کی روئیدگی دیکھ لے۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ نظام کائنات کی جو حقیقت (توحید اللہ، انبیاء علیہم السلام پیش کرتے  
ہیں وہ صحیح ہے یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مشرکین یا منکرین خدا بیان کرتے ہیں زمین سے اگنے والی انواع و اقسام کی چیزیں  
جس کثرت سے آگ رہی ہیں، پھر ان کے خواص و صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی ان گنت ضرورتوں میں جو صریح  
مناسبت پائی جاتی ہے، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی  
حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت، کسی خالق کے منصوبہ تخلیق کے بغیر میں کیونہی آپ سے آپ ہو  
رہا ہے، یا اس سارے منصوبے کو بنانے اور چلانے والا کرتی ایک خدا نہیں ہے بلکہ بہت سے خداؤں کی تعبیر  
نے زمین اور آسمان اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی اور ان درمیان سے پیدا ہونے والی نباتات  
اور بے حد و حساب مختلف انواع جانداروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل  
انسان تو اگر کسی ہنٹ دھری اور پچی تعصب میں مبتلا نہیں ہے، اس منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھے گا کہ یقیناً  
یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کسی معجزے کی  
ضرورت ہے جسے دیکھ کر بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آ سکتا ہو۔



# ایک عظیم حسی مجبزه

[ کتاب کا یہ حصہ ہمارے نقشے کے مطابق معجزات کی اصولی بحث سے متعلق ہے، اس میں واقعاتی حقیقت سے حضرت کے مختلف معجزات شامل نہیں کیے گئے، بلکہ وہ کتاب کے واقعاتی مباحث میں اپنی اپنی جگہ مذکور ہیں یہاں صرف شق القمر کے بہت بڑے معجزے کو بطور مثال سلسلہ بحث میں شامل کیا گیا ہے۔  
 انبیائے ماضی کے معجزات اس بحث میں بعض اٹھارے کے ثبوت کے لیے بیان ہوئے ہیں، یہاں کو پیش کر کے اس سے اصولی نتائج نکالے گئے ہیں۔ - مثنیین ]

”قیامت کی گھڑی قریب آگئی اور چاند چھٹ گیا۔  
 ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ عوام کوئی نشانی دیکھیں،  
 منہ مڑھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو چلنا ہوا ہوا  
 ہے۔ انہوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشات نفس  
 کی پیروی کی“

اِقْرَبْتِ السَّاعَةَ وَالشَّقَّ الْقَرِيبَ  
 وَان يَدْرُوا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا  
 سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۚ وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا  
 اَهْوَاؤَهُمْ وَكُلَّ امْرٍ مُّسْتَقِرٍّ ۝

(القمر۔ آیات ۳۱ تا ۳۴)

## شق القمر سے متعلق روایات

حقیقت یہ ہے کہ شق القمر کا واقعہ قرآن کے صریح الفاظ سے ثابت ہے اور حدیث کی روایات پر اس کا انحصار نہیں ہے۔ البتہ روایات سے اس کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں اور تپہ چلتا ہے کہ یہ کب اور کیسے پیش آیا تھا۔ یہ روایات بخاری، مسلم، ترمذی، احمد، ابوعمران، ابوداؤد طیالسی، عبد الرزاق، ابن جریر، بیہقی، طبرانی، ابن مردودہ اور ابو نعیم صنفی نے بکثرت سندوں کے ساتھ حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عدی بن زیدؓ، حضرت انس بن مالکؓ، اور حضرت جبرینؓ سے نقل کی ہیں۔ ان میں سے تین بزرگ، یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت عدی بن زیدؓ اور حضرت جبرینؓ سے نقل کیے گئے ہیں کہ وہ اس واقعہ کے عینی شاہد ہیں۔ اور وہ بزرگ ایسے ہیں جو اس کے

یعنی شاہ نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ ان میں سے ایک (یعنی عبداللہ بن عباس) کی پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے، اور دوسرے (یعنی انس بن مالک)، اُس وقت بچے تھے لیکن چونکہ یہ دونوں حضرات صحابی ہیں اس لیے ظاہر ہے کہ انہوں نے ایسے سن رسیدہ صحابیوں سے سن کر ہی اسے روایت کیا ہوگا جو اس واقعہ کا براہ راست علم رکھتے تھے۔

### روایات کا ماحصل

تمام روایات کو جمع کرنے سے اس کی جو تفصیلات معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ ہجرت سے تقریباً ۱۰ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ قمری جبینے کی چودھویں شب تھی۔ چاند ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ یکایک وہ چٹنا اور اس کا ایک ٹکڑا سامنے کی پہاڑی کے ایک طرف اور دوسرا ٹکڑا دوسری طرف نظر آیا۔ یہ کیفیت بس ایک ہی لحظہ رہی اور پھر دونوں ٹکڑے باہم جڑ گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت منیٰ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا دیکھو اور گواہ رہو۔ گفتار نے کہا تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر جانور کو دیا تھا اس لیے ہماری آنکھوں نے دھوکا کھایا۔ دوسرے لوگ بولے کہ تمہارے ہم پر جانور کو دے سکتے تھے، تمام لوگوں پر تو نہیں کر سکتے تھے۔ باہر کے لوگوں کو آنے دو۔ ان سے پوچھیں گے کہ یہ واقعہ انہوں نے بھی دیکھا ہے یا نہیں۔ باہر سے جب کچھ لوگ آئے تو انہوں نے شہادت دی کہ وہ بھی یہ منظر دیکھ چکے ہیں۔

بعض روایات جو حضرت انس سے مروی ہیں ان کی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ نشق القمر کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو مرتبہ پیش آیا تھا لیکن اول تو صحابہ میں سے کسی اور نے یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ دوسرے خود حضرت انس کی بھی بعض روایات میں مرتبہ (دو مرتبہ) کے الفاظ ہیں اور بعض میں مرتبہ (دو مرتبہ) کے الفاظ تیسرے یہ کہ قرآن مجید صرف ایک ہی الشقاق کا ذکر کرتا ہے۔ اس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا۔ رہے وہ نقشے جو عوام میں مشہور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگل سے چاند کی طرف اشارہ کیا اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا، اور یہ کہ چاند کا ایک ٹکڑا حضور کے گریبان میں داخل ہو کر آپ کی آستین سے نکل گیا، تو یہ بالکل ہی بے اصل ہیں۔

### واقعہ کی حقیقی نوعیت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کی حقیقی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا جو گفتار تک کے مطالب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک عادیہ تھا جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اُس کی طرف توجہ صرف اس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکان قیامت اور قرب قیامت کی ایک نشانی ہے؟ علماء اسلام کا ایک گروہ اسے حضور کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ گفتار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا لیکن اس رائے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے جو حضرت انس سے مروی ہیں۔ اُن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ فتح الباری

میں ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ قسم تینوں طریقوں سے منقول ہوا ہے ان میں سے کسی میں بھی حضرت انسؓ کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شوق القہر کا واقعہ مشرکین کے مطالعہ پر ہوا تھا کہ وہ اب انشعاق القہر۔ ایک روایت ابو نعیم اصفہانی نے دلائل النبوة میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اس مضمون کی نقل کی ہے۔ مگر اس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے قبلی روایات کتب حدیث میں ابن عباسؓ سے منقول ہوئی ہیں ان میں سے کسی میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انسؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ، دونوں اس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بخلاف اس کے جو صحابہ اُس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت خذیجہ حضرت جُبَیر بن مُطِیم، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ان میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکین کو نئے حضورؐ کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالعہ کیا تھا اور اس پر شوق القہر کا معجزہ ان کو دکھایا گیا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن مجید خود بھی اس واقعہ کو رسالت محمدیؐ کی نہیں بلکہ قریب قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ البتہ یہ اس لحاظ سے حضورؐ کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپؐ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ ان کی تصدیق کر رہا تھا۔

### اقرانسات اور جوابات

مترجمین اس پر دو طرح کے اقرانسات کرتے ہیں، اول تو ان کے نزدیک ایسا ہوتا ممکن ہی نہیں ہے کہ چاند جیسے عظیم کرے کے دو ٹکڑے پھٹ کر الگ ہو جائیں اور سینکڑوں میل کے فاصلے تک ایک دوسرے سے دور ہونے کے بعد پھر باہم جڑ جائیں۔ دوسرے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ایسا ہوتا تو یہ واقعہ دنیا بھر میں شہور ہو جاتا، تاریخوں میں اس کا ذکر آتا۔ اور علم نجوم کی کتابوں میں اسے بیان کیا جاتا لیکن درحقیقت یہ دونوں اعتراض بے بنیاد ہیں۔ ہاں تک اس کے امکان کی بحث ہے، قدیم زمانے میں تو شاید وہ چل بھی سکتی تھی، لیکن موجود زمانے میں سیاروں کی ساخت کے متعلق انسان کو جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی بنا پر یہ بات بالکل ممکن ہے کہ ایک گڑھ اپنے اندر کی آتش نشانی کے باعث پھٹ جائے اور اس زبردست انفجار سے اس کے ٹکڑے دور تک چلے جائیں، اور پھر اپنے مرکز کی مقناطیسی طاقت کے سبب وہ ایک دوسرے سے آئیں۔ یہاں دوسرا اعتراض تو یہ اس لیے ہے کہ یہ واقعہ اچانک بس ایک لمحہ کے لیے پیش آیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ اس خاص لمحے میں دنیا بھر کی نگاہیں چاند کی طرف لگی ہوتی ہوں۔ اس سے کوئی دھماکا نہیں ہوا تھا کہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف مستطفت ہوتی۔ پہلے سے کوئی اطلاع اس کی نہ تھی کہ لوگ اس کے منتظر ہو کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوتے پوری دُورے زمین پر اُسے دیکھا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ بلکہ صرف عرب اور اس کے مشرقی جانب کے ممالک ہی میں اُس وقت چاند نکلا ہوا تھا۔ تاریخ نگاری کا ذوق اور فن بھی اُس وقت تک آتا تھی یا فخر نہ تھا کہ مشرقی

ممالک میں جن لوگوں نے اسے دیکھا ہوتا وہ اسے شہرت کر لیتے اور کسی مؤرخ کے پاس یہ شہادتیں بھی جمع نہیں ہوتی  
 وہ تو تاریخ کی کسی کتاب میں ان کو درج کر لیتا تاہم بالابا کہ تاریخوں میں اس کا ذکر آیا ہے کہ اسے ملات عدنان  
 ایک راجہ نے یہ منظر دیکھا تھا۔ یہیں علم نجوم کی کتابیں اور اختران کو ان میں لکھا گیا تھا کہ حضرت اسے ملات میں  
 حضور ہی تھا جسے کہنا نہ سکی تھا اور اس کی گروہوں کے راستے، اور اس کے ظہور و غور و سب کے اوقات میں اس  
 سے کہ آن ذوق واقع ہوا ہوتا۔ یہ صورت چوکہ پیش نہیں آئی اور اس لیے قہیم زمانے کے اہل نجوم کی توجہ اس کی طرف  
 مشغول نہیں ہوئی۔ اس زمانے میں وضع گاہیں اس حد تک ترقی یافتہ نہیں کہ افلاک میں کبھی آسنے والے ہر  
 واقعہ کا تو اس میں پیشی اور اس کو رکھا اور یہ تصور ہو کہ مستقبل میں ہے۔

باقی نہیں چھوڑی مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵۵ (آیت الکرسی) ملاحظہ ہو:

وَاللَّهُ تَعَالَى السَّمَوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ -  
 (۲۲) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ  
 وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا  
 شَاءَ -

۵ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے  
 جو اللہ کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے  
 جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے  
 اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اُس سے بھی وہ واقف ہے  
 اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز اُن کی گرفت اور ک  
 میں نہیں آسکتی اب یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی اُن کو دیتا ہے

### خدا کے ہاں کسی کا زور نہیں چلتا

پہلے حصہ میں ان مشرکین کے خیالات کا ابطال کیا گیا ہے جو بزرگ انسانوں یا فرشتوں یا دوسری بستیوں کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ خدا کے ہاں ان کا بڑا زور چلتا ہے، جس بات پر وہ اثر چاہیں وہ منوا کر چھوڑتے ہیں، اور جو کام چاہیں خدا سے لے سکتے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ زور چلانا تو درکنار کوئی بڑے سے بڑا میخبر اور کوئی مقرب ترین فرشتہ اُس بادشاہِ ارض و سما کے دربار میں بلا اجازت زبان تک کھولنے کی جرأت نہیں رکھتا۔

دوسرے حصہ میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے اس سے شرک کی بنیادوں پر ایک اور ضرب لگتی ہے۔ پہلے حصے میں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود حاکمیت اور اس کے مطلق اختیارات کا تصور پیش کر کے یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی حکومت میں نہ تو کوئی بلا استقلال شریک ہے اور نہ کسی کا اس کے ہاں ایسا زور چلتا ہے کہ وہ اپنی سفارشوں سے اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ اب ایک دوسری حقیقت سے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کوئی دوسرا اُس کے کام میں دخل لے ایسے سکتا ہے جبکہ کسی دوسرے کے پاس وہ علم ہی نہیں ہے جس سے وہ نظام کائنات اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکتا ہو۔ انسان ہوں، یا جن، یا فرشتے یا دوسری مخلوقات، سب کا علم ناقص اور محدود ہے، کائنات کی تمام حقیقتوں پر کسی کی نظر بھی محیط نہیں ہے پھر اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے جز میں بھی کسی بندے کی آزادانہ مداخلت یا اُل سفارش چل سکے تو سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے۔ نظام عالم تو رہا درکنار بندے تو خود اپنی ذاتی مصلحتوں کو بھی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ ان کی مصلحتوں کو بھی خداوندِ عالم ہی پوری طرح جانتا ہے، اور ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اُس خدا کی ہدایت و رہنمائی پر اعتماد کریں جو علم کا اصلی سرچشمہ ہے۔

مستحق عذاب لوگوں کے لیے کوئی سفارشی نہیں

سورۃ الانعام میں ارشاد ہے:

وَمَا تَرَىٰ مَعَكُمْ شُفَعَاءَ الَّذِينَ

اور اب تم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشوں کو بھی

نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم کہتے تھے کہ تمہارے کام  
بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے  
سب رابطے ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے کم ہو گئے  
جن کا تم زعم رکھتے تھے؟

رَعْنَمُ أَنْصَرَفِيكُمْ شُرَكَاءُ لَقَدْ تَقَطَّعَ  
بَيْنَكُمْ وَحَدَلَّ عَنْكُمْ مَا كُنْتُمْ تَدْعُونَ  
(الانعام: آیت ۴۹)

دوسرے تمام پر اسی سورہ میں یوں ارشاد ہے:-

اُسے محکمہ تم اس علم وحی کے ذریعہ سے ان لوگوں کو  
نصیحت کرو جو اس بات کا غوث رکھتے ہیں کہ اپنے  
رب کے سامنے کبھی اس حال میں پیش کیے جائیں گے کہ  
اُس کے سوا وہاں کوئی (ایسا ذی اقتدار) نہ ہوگا جو  
اُن کا حامی و مددگار ہو یا ان کی سفارش کرے، شاید کہ اس نصیحت سے متنبہ ہو کر وہ خدا ترسی کی روش

وَ اَنْذَرِيهِ الَّذِينَ يَخْفَوْنَ  
اَنْ يَّجْعَلُوْا اِلٰى رَبِّهِمْ كَيْسًا لَّيْسَ لَهُمْ فِيْهِ  
وَلٰ اَشْفِيْعُ لَكُمْ يَوْمَئِذٍ -  
(الانعام: آیت ۵۱)

اختیار کر لیں؟

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں ایسے مدبوس ہیں کہ انہیں نہ موت کی فکر ہے نہ یہ خیال ہے کہ کبھی ہمیں اپنے  
نہ ان کو بھی نہ لگنا ہے، ان پر تو یہ نصیحت ہرگز کارگر نہ ہوگی۔ اسی طرح ان لوگوں پر بھی اس کا کچھ اثر نہ ہوگا جو اس دنیا  
بہر دست پرچی رہے ہیں کہ دنیا میں ہم جو چاہیں کر لیں، آخرت میں ہمارا بال تک بچا نہ ہوگا کیونکہ ہم غلام کے دامن گرفتہ  
ہیں یا غلام ہماری سفارش کر دے گا، یا غلام ہمارے لیے تقارہ بن چکا ہے۔ -

سورہ اعراف میں ارشاد ہے:

وآخرت میں یہ لوگ کہیں گے، پھر کیا اب ہمیں کچھ  
سفارشی عین گے جو ہمارے حق میں سفارش کریں؟ یا  
ہمیں دوبارہ واپس ہی بھیج دیا جائے تاکہ جو کچھ ہم

قَدَلْنَا مِنْ شِعَارٍ فَيَشْفَعُوا لَنَا  
اَوْ نَدُوْا فَنَعْمَلْ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ -  
(آیت ۵۳)

پہلے کرتے تھے اس کے بجائے اب دوسرے طریقے پر کام کر کے دکھائیں؟

سورہ یونس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مگر تو شفاعت (سفارش) کہنے والا نہیں ہے الایک  
اس کی اجازت کے بعد شفاعت کرے یہی اللہ  
تمہارا رب ہے، لہذا تم اسی کی عبادت کرو پھر

مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ اِثْمِهِ  
ذَابَكُمْ اللهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ط اَخْلَا  
تَذَكَّرُوْا -  
(آیت ۵۴)

کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟

مزید اسی سورہ کی آیت ۸ میں ارشاد ہے:

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ وَآيَاتُ اللَّهِ كُنْ هُمْ لَدَيْهِ مُذْعَبُونَ اللَّهُ بِمَا لَا نِعْمُوا فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مُبْتَلُونَ وَمَا يَنْتَظِرُونَ إِلَّا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ (آیت ۱۸)

”یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کر رہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں آئے محمد ان سے کہو کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جیسے وہ نہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں پاک ہے وہ اور بالا و بزرگ ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں“

کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ منی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ سب کچھ موجود ہے اللہ کے علم میں ہے۔ پس سفارشیوں کے معدوم ہونے کے لیے یہ ایک نہایت لطیف انداز بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین یا آسمان میں کوئی اس کے حضور تمہاری سفارش کرنے والا ہے، پھر یہ تم کن سفارشیوں کی اس کو خبر دے رہے ہو۔

سورۃ المؤمن میں ارشاد ہے:

مَا لِلْمُؤْمِنِينَ مِنْ حَكِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ (آیت ۱۸)

ظالموں کا نہ کوئی مشفق دوست ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔

یہ بات برسبیل تشہل کفار کے عقیدہ شفاعت کی تردید کرتے ہوئے فرمائی گئی ہے حقیقت میں تو وہاں ظالموں کا کوئی شفیع سرے سے ہوگا ہی نہیں، کیونکہ شفاعت کی اجازت اگر مل بھی سکتی ہے تو اللہ کے نیک بندوں کو مل سکتی ہے اور اللہ کے نیک بندے کسی کا قرون اور شرکوں اور فتنوں اور فجار کے دوست نہیں ہو سکتے کہ وہ انہیں بچانے کے لیے سفارش کا خیال ہی کریں۔ لیکن چونکہ کفار و مشرکین اور گمراہ لوگوں کا بالعموم یہ عقیدہ رہا ہے اور آج بھی ہے کہ ہم بن بزرگوں کے واسطے گرفتار ہیں وہ کبھی ہمیں دوزخ میں نہ جانے دیں گے، بلکہ اڑ کر گھڑنے ہو جائیں اور تختوں پر چھوڑیں گے، اس لیے فرمایا گیا کہ وہاں ایسا شفیع کوئی بھی نہ ہوگا جس کی بات مانی جائے اور میں کہ سفارش اللہ کو لازماً قبول ہی کرنی پڑے۔

سفارش کے لیے پروا نہ اٹھانے کی ضروری ہے

سورۃ مریم میں اس طرح ارشاد ہوا ہے:

لَا يَلِيكَ لَكُمُونَ إِشْرَاعًا إِلَّا مَنْ أَخَذَ عِنْدَ الرَّحْمَنِ عَهْدًا -

”اُس وقت لوگ کوئی سفارش لائے پر قادر نہ ہوں گے۔ بجز اُس کے جس نے رحمان کے حضور سے پرہیز

(آیت ۸۷) حاصل کر لیا جو:

ایک مطلب تو اس کا یہ ہے کہ سفارش اسی کے حق میں ہوگی جس نے پروانہ حاصل کیا جو، اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہی سفارش کر سکے گا جسے پروانہ ملا ہو۔ آیت کے الفاظ ایسے ہیں جو دونوں پہلوؤں پر یکساں روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ بات کہ سفارش صرف اسی کے حق میں ہو سکے گی جس نے رخصت سے پروانہ حاصل کر لیا جو، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے دنیا میں ایمان لا کر اور یہ اسے کچھ تعلق جو رکھا ہے آپ کو خدا کے عفو و درگزر کا مستحق بنا لیا ہو، اسی کے حق میں سفارش کا امکان ہے۔ اور یہ بات کہ سفارش وہی کر سکے گا جس کو پروانہ ملا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے جن جن کو اپنا شفیع اور سفارشی بھولیا ہے وہ سفارشیں کرنے کے مجاز نہ ہونگے، بلکہ خدا خود جس کو اجازت دے گا وہی شفاعت کے لیے زبان کھول سکے گا۔ ۱۸۳

مَؤْرَةٌ ظَهْرٌ فِيهِ

يَوْمَ تَبْدَأُ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ

أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا.

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا. (آیات ۱۰۰-۱۱۰)

”اُس روز شفاعت کا رگزن ہوگی الّا یہ کہ کسی کو

رحمان اس کی اجازت دے اور اس کی بات مستنا

پسند کرے۔ وہ لوگوں کا اکل پھیل سب حال جانتا

ہے۔ دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں ہے“

لہ اس فقرے کا تفسیر ہے کہ شفاعت خدا کے قانون جتنا و سزا اور رضا بظہر مغفرت کے تحت آتی ہے اور شفاعت سے بہرہ ور ہونے کے لیے ضروری ہے کہ بندہ خدا کے سامنے عفو و درگزر کا مستحق بن کے پیش ہو۔ مثلاً خدا کے قانون مغفرت کا ایک کلیہ اصول توبہ میں بیان ہوا ہے کہ توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو اطمینان سے ساری عمر گنہگار رہے اور گنہگار کے چکر میں پڑنے پڑے گزار دیں، بلکہ توبہ صرف ایسے لوگوں کے لیے جو گناہ سرزد ہو جائے پر پشیمان ہوں۔ بلکہ فوری طور پر دین قریب پشیمان ہوں۔ توبہ کریں، اور ترک گنہگار کے اپنی اصلاح کے لیے کوشاں بنو۔ ظاہر بات ہے کہ شفاعت کا استحقاق انہی بندوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو کلیہ توبہ کا صحیح تقاضا پورا کرتے ہوں۔ اسی طرح دوسرے موقع پر استحقاق مغفرت پانے والوں کے لیے یہ تعریف بتائی گئی ہے کہ وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور کھلی کھلی بُرائیوں سے پرہیز کرتے ہیں، اور اگر ان سے غلطیاں سرزد ہوتی بھی ہیں تو ناراضگی میں چھوٹی چھوٹی نغزوں کی سزا تک۔ اس سے ایک آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ مغفرت اور شفاعت کا مستحق بن سکے گا یا نہیں۔ عذراہ بریں اعادیت میں حضور نے متعدد اعمال کے متعلق خود واضح فرمایا ہے کہ میں ان کے لیے سفارش نہیں کروں گا۔ (مترجمین)



پہلی آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اوپر کیا گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ "اُس روز شفاعت کا اگر نہ ہوگی آلا یہ کہ کسی کے حق میں رحمن اس کی اجازت دے اور اس کے لیے بات سننے پر راضی ہو" انفاظ ایسے جامع ہیں جو دونوں مضمونوں پر حاوی ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قیامت کے روز کسی کو دم مارنے تک کی جرأت نہ ہوگی، لہذا کوئی سفارش کے لیے بطور خود زبان کھول سکے سفارش وہی کر سکے گا جسے اللہ تعالیٰ بولنے کی اجازت دے اور اسی کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے بانگاہ الہی سے سفارش کرنے کی اجازت ملی جاتے۔ یہ دونوں باتیں قرآن میں متعدد مقامات پر کھول کر تباہی گئی ہیں۔ ایک طرف فرمایا من ذالذی یستغف عندنا الا باذنہ، کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کر سکے؟ (آیت ۲۵۵) اور یوم یقوم الروح والملكۃ صفا لا یشکلون الا من اذن له الرحمن وقال عسا ابا سالتما۔ آیت ۳۸ "وہ دن جبکہ روح اور ملائکہ سب صاف بستہ کھڑے ہوں گے اور اب بات نہ کریں گے، امرت وہی بول سکے گا جسے رحمن اجازت دے اور جو ٹھیک بات کہے"

دوسری طرف ارشاد ہوا ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ وھم من خشیئہ مُشْفِقُونَ "وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر رحمن راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں" (آیت ۲۸) اور کرمین ملک فی الشکل لا تعنی شفاعتہم شیئا الا من بعد ان یتأذن اللہ لمن یشاء ویرضیٰ "کتھے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس صورت کے کہ اللہ سے اجازت لینے کے بعد کی جاتے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش مٹنا چاہے اور پسند کرے" (آیت ۱۲۶)

### شفاعت پابندی کی وجہ

غلط کی آیت میں یہ وجہ بتائی گئی ہے کہ شفاعت پر یہ پابندی کیوں ہے۔ فرشتے ہوں یا انبیاء یا اولیاء، کسی کو بھی یہ معلوم نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا کہ کس کا ریکارڈ کیسا ہے، کون دُنیا میں کیا کرتا رہا ہے، اور اللہ کی عدالت میں کس سیرت و کردار اور کسی کسی ذمہ داریوں کے بارے میں کیا ہے۔ اس کے برعکس اللہ کو ہر ایک کے پچھلے کارناموں اور کرداروں کا بھی علم ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اب اُس کا موقع کیا ہے، نیک ہے تو کیا نیک ہے اور مجرم ہے تو کس وجہ سے کجا مجرم ہے، معافی کے قابل ہے یا نہیں، پوری سزا کا مستحق ہے یا تخفیف اور رعایت بھی اس کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ ایسی حالت میں یہ کیوں صحیح ہو سکتا ہے کہ ملائکہ اور انبیاء اور سفارشات کی گھلی چھٹی دے دی جاتے اور ہر ایک جن کے

لہ دوسرے نفلوں میں شفاعت بھی دراصل ایک طرح کی شہادت ہے کہ کوئی شخص جس کا نامہ اعمال پیش ہو رہا ہے فی الجملہ کس قسم کا

آدی تھا؟۔ قابل عذاب یا قابل مغفرت۔ (مرتبین)

حق بھی جو تمہاری پابت کر دے ایک معمولی افسر اپنے ذرا سے ٹکے میں اگر اپنے ہر دوست یا عزیز کی سفارشیں سننے لگے تو چار دن میں سارے ٹکے کا ستیاناس کر کے مکہ دے گا پھر بھلا زمین و آسمان کے فرمانروا سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے ہاں سفارشوں کا بازار گرم ہوگا اور ہر بزرگ جا جا کر جس کو چاہیں گے بخشوا لیں گے، درآخالیکہ ان میں سے کسی بزرگ کو بھی یہ معلوم نہیں ہے کہ جن لوگوں کی سفارش وہ کر رہے ہیں ان کے نامہ اعمال کیسے ہیں۔ دنیا میں جو افسر کچھ بھی احساسِ فترت داری رکھتا ہے اس کی روش یہ ہوتی ہے کہ اگر اس کا کوئی دوست اس کے کسی قصور و ارتعاست کی سفارش لے کر جا رہا ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ آپ کو خبر نہیں ہے کہ یہ شخص کتنا کام چور، نا فرض شناس، رشوت خور اور خلقِ خدا کو تنگ کرنے والا ہے۔ میں اس کے کرتوتوں سے واقف ہوں، اس لیے آپ براہِ کرم مجھ سے اس کی سفارش نہ فرمائیں بلکہ اسی چھوٹی سی مثال پر قیاس کر کے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں شفاعت کے متعلق جو قاعدہ بیان کیا گیا ہے وہ کس قدر صحیح ہستی اور مبنی بر انصاف ہے۔ خدا کے ہاں شفاعت کا دروازہ بند نہ ہوگا۔ نیک بندے جو دنیا میں خلقِ خدا کے ساتھ بڑی کاہنہ و کفر کے عادی تھے، انہیں آخرت میں بھی جبروی کا حق ادا کرنے کا موقع دیا جائے گا لیکن وہ سفارش کرنے سے پہلے اجازت طلب کریں گے، اور جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انہیں برائے کی اجازت دے گا صورتِ اسی کے حق میں وہ سفارش کر سکیں گے۔ پھر سفارش کے لیے بھی شرط یہ ہوگی کہ وہ مناسب اور مبنی بر حق ہو جیسا کہ **وَقَالَ صَدَقَ ابْنُ دَاوُدَ** بات ٹھیک کہے گا ارشادِ ربّانی صاف بتا رہا ہے۔ بونگی سفارشیں کرنے کی وہاں اجازت نہ ہوگی کہ ایک شخص دنیا میں سینکڑوں ہزاروں بندگانِ خدا کے حقوق مار آیا ہو اور کوئی بزرگ اٹھ کر سفارش کر دین کہ حضور اسے انعام سے سرفراز فرمائیں **۱۸۴**

سورۃ النبا میں ارشاد ہے:

يَوْمَ نَقُومُ الدُّمُومَ وَالْمَلٰئِكَةُ صَفًّا  
لَّا يَتَكَلَّمُونَ اِلَّا مَن اٰذَنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ  
عصم روز رُوح اور ملائکہ صف بستہ کھڑے ہوں گے  
کوئی نہ بولے گا سوائے اس کے جسے رحمن اجازت

سے حضور نے بار بار اپنے ننانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ تم میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے، ان کو اس حوض سے بنا دیا جائے گا اور اس پر انہیں نہ آنے دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کی نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا پھر میں بھی ان کو رفع کروں گا اور کہوں گا کہ دورِ ربوبہ میں منعمون بھی بکثرت روایات میں بیان ہوا ہے (مؤلف، حوالہ بخاری، کتاب الرقاق، کتاب الفتن، کتاب الطہارۃ، کتاب النضال، مسند احمد، روایات ابن مسعود و ابو ہریرہ ابن ماجہ، کتاب النبی، ۱۸۵) بلکہ انا انبیاء اپنے مجرم و منحوت پیروکاروں کے خلاف سزاؤں ہی کی سفارش کریں گے جیسا کہ قرآن میں ایک گروہ کے متعلق حضور کا یہ بیان سننے لایا گیا ہے کہ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَاعْبُدُوا اللَّهَ فَمَا كَانَ لَهُمْ جُودًا**

وَقَالَ صَوَابًا (آیت ۳۸) دے اور جو ٹھیک بات کہے

بولنے سے مراد شفاعت ہے اور فرمایا گیا ہے کہ وہ صرف دو شرطوں کے ساتھ ممکن ہوگی۔ ایک شرط یہ کہ جس شخص کو جس گنہگار کے حق میں شفاعت کی اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گی صرف وہی شخص اسی کے حق میں شفاعت کر سکے گا۔ دوسری شرط یہ کہ شفاعت کرنے والا بجا اور درست بات کہے مگر جانوریت کی سفارش نہ کرے۔ اور جس کے معاملہ میں وہ سفارش کر رہا ہو وہ دنیا میں کم از کم کلمہ حق کا قائل رہا ہو یعنی جس گناہ گار ہو۔ کافر نہ ہو۔<sup>۱۸۶</sup>

مشرکین کے مزخومہ سفارشی

سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ  
وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُمْ  
لِمَنْ خَشِيَته مُشْفِقُونَ

جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور  
جو کچھ ان سے اوچھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔  
وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے جس کے حق  
میں سفارش سنتے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے

(آیت ۳۸)

خوف سے ڈرے رہتے ہیں۔

مشرکین زنتوں کو دوجوہ سے مہیو و بنا تے تھے۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک وہ خدا کی اولاد تھے، دوسرے یہ کہ وہ ان کی پرستش (خوشامد) کر کے انہیں خدا کے ہاں اپنا شفیع (سفارشی) بنا جاتے تھے۔ وَيَقُولُونَ هُوَ ابْنُ مَرْيَمَ عِنْدَ اللَّهِ (یونس آیت ۱۸) اور مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ (الزمر آیت ۳)۔ ان آیات میں دونوں وجوہ کی تردید کر دی گئی ہے۔

اس جگہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن بالعموم شفاعت کے مشرک کا نہ عقیدے کی تردید کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ جنہیں تم شفیع قرار دیتے ہو وہ ظلم غیب نہیں رکھتے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو ان کے سامنے ہیں اور ان باتوں کو بھی جو ان سے اوچھل ہیں۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ انہوں کو سفارش کرنے کا مطلق اور غیر مشروط اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ ہر شخص کے اگلے پچھلے اور پوشیدہ مظاہر حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء و صالحین ہر ایک کا اختیار شفاعت لازماً اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی کے حق میں شفاعت کی اجازت دے۔ بطور خود ہر کس و ناکس کی شفاعت کر دینے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ اور جب شفاعت سننا یا نہ سننا اور اُسے قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اللہ کی مرضی پر موقوف ہے تو ایسے بے اختیار شفیع اس قابل کب ہو سکتے ہیں کہ ان کے آگے سر نیاز تو جھکا یا جاتے اور درست سوال دراز کیا جاتے۔<sup>۱۸۷</sup>

سورۃ سبأ میں ارشاد ہے:

وَمَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِندَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ ۗ  
 اور اللہ کے حضور کوئی شفاعت بھی کسی کے لیے نفع نہیں ہو سکتی، بلکہ اس شخص کے جس کے لیے اللہ نے سفارش کی اجازت دیا ہو۔

یعنی کسی کا خود مالک ہونا یا حکیت میں شریک ہونا یا مددگار خدا ہونا تو درکنار رساری کائنات میں کوئی ایسی ہستی تک نہیں پائی باقی جو اللہ تعالیٰ کے حضور کی کے حق میں بطور خود سفارش کر سکے، تم لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہو کہ خدا کے کچھ پیارے ایسے ہیں، یا اللہ کی خدائی میں کچھ بندے ایسے زور آور ہیں کہ وہ آڑ بٹھیں تو خدا کو ان کی سفارش ماننی ہی پڑے گی۔ حالانکہ وہ باں حال یہ ہے کہ اجازت سے بغیر کوئی زبان کھولنے کی برأت نہیں کر سکتا جس کو اجازت ملے گی صرف وہی کچھ عرض کر سکے گا اور جس کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت ملے گی اسی کے حق میں عرض معروض کی جا سکے گی۔

پھر آگے جلی کر اسی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

حَتَّىٰ إِذَا فُزِعَ عَنْ قُلُوبِهِمْ قُلُوبًا مَّا ذَا قَالُوا لَوْلَا قَالُوا الْحَقُّ وَهُمْ الْعَبِلُ الْكَلْبِيُّ  
 حتیٰ کہ جب لوگوں کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوگی تو وہ (سفارش کرنے والوں سے) پوچھیں گے کہ تہا سے رب نے کیا جواب دیا۔ وہ کہیں گے کہ ٹھیک جواب ملا ہے۔ اور وہ بڑبگ و برتر ہے۔

سبا۔ آیت ۲۳

یہاں اُس وقت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جب قیامت کے روز کوئی سفارش کرنے والا کسی کے حق میں سفارش کی اجازت طلب کرے گا۔ اس نقشے میں یہ کیفیت ہمارے سامنے آتی ہے کہ طلب اجازت کی درخواست بھیجنے کے بعد نافع اور مشغوع دونوں نہایت بے چینی کے عالم میں ڈرتے اور کانپتے ہوتے جواب کے منتظر کھڑے ہیں۔ آخر کار جب اُپر سے اجازت آجاتی ہے اور نافع کے پیر سے مشغوع بجا ناپ جاتا ہے کہ معاملہ کچھ اطمینان بخش ہے تو اس کی جان میں جان آتی ہے اور وہ آگے بڑھ کر نافع سے پوچھتا ہے کیا جواب آیا؟ نافع جواب دیتا ہے کہ ٹھیک ہے اجازت مل گئی ہے۔

اس بیان سے جو بات فرمیں نشین کرنی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ نادانوں اور جس بڑے دربار کی شان یہ ہے اُس کے متعلق تم کس خیال عام میں پڑے ہوئے ہو کہ وہاں کوئی اپنے زور سے تم کو بچھوڑے گا یا کسی کی یہ مجال ہوگی کہ وہاں

لہ قیامت میں انبیاء کے عاجزانہ انما ز شفاعت کا نقشہ سورہ مائدہ کے آخری رکوع میں کھینچا گیا ہے اور دیکھا جا گیا ہے کہ حضرت یحییٰ اپنے پیروں کی کس انداز سے سفارش کریں گے۔ چنانچہ وہ سوالات کے جواب میں شہادت دیں گے اور پھر کہیں گے کہ ان عَدَيْتُمْ نَفْسَكُمْ عِبَادَتِي وَاِنْ تَسْتَعِزُّنَّ لَمَنْ قَائِلُكُمْ اَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ اس لیکن جملے کے پہلے حصے میں بھی سفارش کا لہجہ چھلکا ہے۔ مگر انداز پُر زور ماننے اور تقاضے کا نہیں۔

پہلے کو بھیجے جاتے اور اللہ سے کہئے کہ یہ تو میرے متوسل ہیں انہیں تو بخشا ہی پڑے گا۔ ۱۵۹

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ مِیْنِ اَرْشَادِ بَارِئِیْ هِیْ:

یَوْمَ لَا یُنْفِیْ سَوِیٌّ عَنْ قَوْلِیْ شَیْئًا  
وَلَا هُمْ یُنصَرُونَ - اِلَّا مَنْ رَحِمَ اللّٰهُ  
اِنَّهُ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ

وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب کے  
کچھ بھی کام نہ آسکے گا، اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد  
پہنچے گی سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم کرے،

الرحمان - (۳۴: ۴۱) و در بردست اور رحیم ہے۔

ان فقرہوں میں بتایا گیا ہے کہ فیصلے کے دن جو عدالت قائم ہوگی اس کا کیا رنگ ہوگا کسی کی مدد یا حمایت دیاں  
کسی مجرم کو نہ پھڑکائے گی نہ اس کی سزا کم ہی کرے گی۔ یہی اختیارات اس سزا کے حقیقی کے ہاتھ میں ہوں گے جس کے فیصلے کو  
نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی اور جس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا بل بوتہا کسی میں نہیں ہے۔ یہ بالکل اُس کے  
اپنے اختیارِ مبنی پر موقوف ہوگا کہ کسی پر رحم فرما کر اس کو سزا نہ دے یا کم سزا دے، اور تعقیقت میں اُس کی شان ہی  
ہے کہ انصاف کرنے میں بے رحمی سے نہیں بلکہ رحم ہی سے کام لے۔ لیکن جس مقدمے میں جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہ پورا  
بے کم و کاست نافذ ہوگا۔ عدالتِ الہی کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد آگے کے چند فقرہوں میں بتایا گیا ہے کہ اس عدالت  
میں جو لوگ مجرم ثابت ہوں گے ان کا انجام کیا ہوگا اور جن لوگوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ دُنیائے  
فدائے ذکرِ نافرمانیوں سے پرہیز کرتے رہے تھے ان کو کن انعامات سے سرفراز کیا جائے گا۔ ۱۵۹

بیٹے کے لیے حضرت نوح کی دعا کی مثال

سُورَةُ بُرُؤِّ مِیْنِ حَضْرَتِ اِبْرٰہِیْمَ كَ تَفْسِہٖ اٰیٰت ۶۹ تا ۷۶، کے مخاطب قریش کے لوگ ہیں جو حضرت ابراہیم  
کی اولاد ہونے کی وجہ سے تمام عرب کے پیر زادے، کعبۃ اللہ کے مجاور اور مذہبی و اخلاقی اور سیاسی و تمدنی  
پیشواؤں کے مالک بنے ہوئے تھے اور اس گھنٹہ میں مبتلا تھے کہ ہم پر خدا کا غضب کیسے نازل ہو سکتا ہے جبکہ ہم خدا  
کے اُس پیارے بندے کی اولاد ہیں اور وہ خدا کے دربار میں ہماری سفارش کرنے کو موجود ہے۔ اس پندارِ غلط کو  
توڑنے کے لیے پچھ تو انہیں یہ منظر دکھایا گیا کہ حضرت نوح جیسا عظیم الشان پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے جگر گوشے  
کو ڈوبتے دیکھ رہا ہے اور تڑپ کر خدا سے دعا کرتا ہے کہ اس کے بیٹے کو بچالیا جائے۔ مگر صرف یہی نہیں کہ اس  
کی سفارش بیٹے کے کچھ کام نہیں آتی، بلکہ اس سفارش پر باپ کو اٹنی ڈانٹ سننی پڑتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا  
منظر خود حضرت ابراہیم کا دکھایا جاتا ہے کہ ایک طرف تو ان پر بے پایاں سناہات ہیں اور نہایت پیار کے انداز  
میں ان کا ذکر ہو رہا ہے، مگر دوسری طرف جب وہی ابراہیم خلیل السامی کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں تو ان کے  
۱۵۹ ابرو الخلق کے باوجود اللہ تعالیٰ مجرم قوم (قوم نوح) کے معاملے میں ان کی سفارش کو رد کر دیتا ہے۔ ۱۵۹

پھر اسی سورۃ ہود میں آگے چل کر فرمایا:

يَوْمَ يَأْتُكَ أَنْ تَعْلَمَ نَفْسٌ إِلَّا بِأَذْنِهِ  
 رَبُّهُ - آیت ۱۰۵

جب وہ (قیامت کا دن) آئے گا تو کسی کو بات کرنے  
 کی مجال نہ ہوگی الا یہ کہ خدا کی اجازت سے کچھ عرض کرے

یعنی یہ بے وقوف لوگ اپنی جگہ اس بھر دینے میں ہیں کہ فلاں حضرت ہماری سفارش کر کے ہمیں بچالیں گے، فلاں بزرگ  
 آکر بیٹھ جائیں گے اور اپنے ایک ایک تمتریل کو بخشو اسے بغیر نہ مانیں گے، فلاں صاحب جو اللہ میاں کے پیٹے ہیں جنت کے  
 رستے میں چل بیٹھیں گے اور اپنے واسن گرفتوں کی بخشش کا پروانہ لے کر بیٹھیں گے۔ حالانکہ انہوں نے اور چلنا کیا، اس پر جلال عدالت  
 میں تو کسی بڑے سے بڑے انسان اور کسی معزز سے معزز فرشتے کو بھی مجال دم زدن تک نہ ہوگی اور اگر کوئی کچھ کہے گا تو  
 اس وقت جبکہ احکم الحاکمین خود اسے کچھ عرض کرنے کی اجازت دے دیتے۔ ۱۹۲ھ

ذیوی زندگی میں خدا کے ہاں سفارش کا مشرکانہ تصور  
 سورہ النحل میں ارشاد ہے:

أَيُّهَا الْبَاطِلُ يُشْرِكُونَ وَيَبْعَثُونَ اللَّهُ هُمْ  
 يَكْتُمُونَ - (آیت ۱۷۲)

پھر کیا یہ لوگ (یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی)  
 باطل کو مانتے ہیں اور اللہ کے احسان کا انکار کرتے ہیں

اگرچہ مشرکین تک اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمیں اللہ کی دی ہوئی ہیں، اور ان نعمتوں پر اللہ کا احسان  
 ماننے سے بھی انہیں انکار نہ تھا، لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر یہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ وہ  
 ان بہت ہی سستیوں کا شکر یہ بھی زبان اور لعل سے ادا کرتے تھے جن کو انہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اس  
 نعمت بخشی میں ذلیل اور جسد وار ٹھہرا رکھا تھا۔ اسی چیز کو قرآن اللہ کے احسان کا انکار قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات  
 بطور ایک قاعدہ کلیہ کے پیش کی گئی ہے کہ محسن کے احسان کا شکر یہ غیر محسن کو ادا کرنا اور اصل محسن کے احسان کا انکار  
 کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا  
 کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فلاں شخص کے طفیل یا فلاں کی رعایت سے، یا فلاں کی سفارش  
 سے، یا فلاں کی مدد و خلعت سے کیا ہے، یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے۔

یہ دونوں اصولی باتیں سراسر انصاف اور عقل عام کے مطابق ہیں۔ یہ شخص خود یا اپنی ناقص ان کی مقورتیت سمجھ سکتا ہے  
 فرض کیجیے کہ آپ ایک حاجت مند آدمی پر رحم کیا کر اس کی مدد کرتے ہیں اور وہ اسی وقت اٹھ کر آپ کے سامنے ایک دوسرا

لے پس جو لوگ یہ سمجھتے ہوئے غیر اللہ کے آستانوں پر نہیں اور نیازیں پڑھا رہے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں بڑا اثر و رسوخ رکھتے ہیں اور ان کی سفارش  
 کے بھروسے پر اپنا نامہ اعمال مباح کیے جا رہے ہیں، ان کو وہاں سخت مایوسی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ۱۹۲ھ  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

آدمی کا شکر یہ دہا کر دیتا ہے جس کا اس اندام میں کوئی دخل نہ تھا۔ آپ چاہتے ہیں اپنی فراخ دلی کی بنا پر اس کی اس بیوقوفی کو نظر انداز کر دیں اور آئندہ بھی اپنی امداد کا سلسلہ جاری رکھیں، مگر اپنے دل میں یہ ضرور سمجھیں گے کہ یہ ایک نہایت پائیز اور اسان فراموش آدمی ہے۔ پھر اگر دریافت کرنے پر آپ کو معلوم ہو کہ اس شخص نے یہ حرکت اس خیال کی بنا پر کی تھی کہ آپ نے اس کی جو کچھ بھی مدد کی ہے وہ اپنی نیک دلی اور فیاضی کی وجہ سے نہیں کی بلکہ اس دوسرے شخص کی خاطر کی ہے، اور آئندہ آپ کے واقعہ نہ تھا، تو آپ لا محالہ اسے اپنی قوم میں نہیں گے۔ اس کی اس بیوقوفی کا صریح مطلب آپ کے نزدیک یہ ہوگا کہ وہ آپ سے خدمت بدگمان ہے اور آپ کے متعلق یہ راستے رکھتا ہے کہ آپ کوئی رحیم اور شفیع انسان نہیں ہیں بلکہ محض ایک دوست نواز اور یار باش آدمی ہیں، پس ہندسے دوستوں کے نوشل سے کوئی اسے تو آپ اس کی مدد ان دوستوں کی بنا کر دیتے ہیں ورنہ آپ کے ہاتھ سے کسی کو کچھ نہیں حاصل نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۴

سورہ نمل ہی میں دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

يَعْرِضُونَ نِعْمَتَنَا: لَنْ نَنْسَاهُمْ اَوْ نَكْفُرْهُمْ - آیت ۸۳

میں اللہ کے احسان کو بچا پانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں بیشتر لوگ ایسے ہیں جو حق ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

انکار سے مراد وہی طرز عمل ہے جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ گفتار کہ اس بات کے منکر نہ تھے کہ ہمارے احسانات اللہ نے ان پر کیے ہیں مگر ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ نے یہ احسانات ان کے بزرگوں اور دیوتاؤں کی مداخلت سے کیے ہیں، اور اسی بنا پر وہ ان احسانات کا شکر یہ اللہ کے ساتھ بلکہ کچھ اللہ سے بھی بڑھ کر ان متوسط ہستیوں کو ادا کرتے تھے۔ اسی حرکت کو اللہ تعالیٰ انکارِ نعمت اور اسان فراموشی اور کفران سے تعبیر کرتا ہے۔ ۱۹۵

سورہ الحج میں ارشاد گرامی ہے:

اِنَّنَا لَنَصْنَعُنَّهَا مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا  
 قَوْمٍ النَّاسِ اِنَّنَا لَسَمِيعٌ بَصِيْرٌ  
 يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَاَخْلَفْتُمْ  
 وَاِلٰى اَنْدُبِ تَرْجَعِ الْاُمُوْرُ -

حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے فرامین کی ترسیل کے لیے ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی۔ وہ سب اور بصیرت اور جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوچھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ اور ہمارے معاملات اسی کی طرف جوں جوں جتے ہیں۔

(آیت ۵۵-۵۶)

مطلب یہ ہے کہ مشرکین نے مخلوقات میں سے جن جن ہستیوں کو مدبوہ و بنایا ہے ان میں افضل ترین مخلوق یا ملائکہ میں یا انبیاء اور ان کی شہیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے احکام پہنچانے کا ذریعہ ہیں جن کو اس نے

اس خدمت کے لیے چن لیا ہے محض یہ فضیلت اُن کو خدا یا خدا فی میں اللہ کا شریک تو نہیں بنا دیتی۔ رہا یہ فقرہ کہ جو کچھ ان کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوچھل ہے اُس سے بھی وہ واقف ہے تو یہ قرآن مجید میں بالعموم شفاعت کے فشرکاتہ عقیدے کی تردید کے لیے آیا کرتا ہے۔ لہذا اس مقام پر پچھلے فقرے کے بعد اسے ارشاد فرماتے کا مطلب یہ ہوا کہ ملائکہ اور انبیاء و صحابہ کو بذاتِ خود حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر یہی اللہ کے ہاں سفارشی سمجھ کر بھی اگر تم پوجتے ہو تو یہ غلط ہے۔ کیونکہ سب کچھ دیکھنے اور سننے والا اللہ تعالیٰ ہے، ہر شخص کے ظاہر و مخفی حالات وی جانتا ہے، دُنیا کے کھلے اور چھپے مصالِح سے بھی وہی واقف ہے۔ ملائکہ اور انبیاء ہیست کسی مخلوق کو بھی شکم معلوم نہیں ہے کہ کس وقت کیا کرنا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں ہے۔ لہذا اللہ نے اپنی مغرب ترین مخلوق کو بھی یہ حق نہیں آیا ہے کہ وہ اس کے اذن کے بغیر جو سفارشی پائیں گز نہیں اور ان کی سفارشی قبول ہو جائے۔ ۱۹۶

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ فِي ارشاد ہے:

أَوَلَمْ نَخْلُقْكُمْ مِنْ مَّاءٍ مَّسْجُومٍ	تو کیا اس خدا کو چھوڑ کر ان لوگوں نے دوسروں کو
ثُمَّ نَبَّيْتُمُوهَا رَبَّاءُ وَنَسَبًا	تشیع بنا کر کیا ہے؟ ان سے کہو، کیا وہ شفاعت
لَهُمْ لِيُحْيُوا فِيهَا نُفُوسَهُمْ	کریں گے تو وہ ان کے اختیار میں کچھ نہ ہو اور وہ
وَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ - قُلْ بَشِّرِ الشَّاعِدَةَ جَمِيعًا	بگھٹتا بھی نہ ہوں، کہہو شفاعت ساری کی ساری
بِأَنَّكُمْ كُنتُمْ فِيهَا رُجُومًا	اللہ کے اختیار میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی

بادشاہی کا وہی مالک ہے۔ پھر اسی کی طرف تم پھرتے رہتے رہے ہو۔"

یعنی ایک تو ان لوگوں نے اپنے طور پر خود ہی یہ فرض کر لیا کہ کچھ بستیاں اللہ کے ہاں بڑی زور آور ہیں جن کی سفارشی کسی طرح مل نہیں سکتی حالانکہ کسی کا یہ زور نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دستور میں خود سفارشی بن کر ہی اٹھ سکے، گناہ کی اپنی سفارشی منوا لینے کی طاقت بھی اس میں ہو۔ پھر ان کے سفارشی ہونے پر نہ کوئی وسیلہ، نہ اللہ تعالیٰ نے کبھی یہ فرمایا کہ ان کو میرے ہاں یہ مرتبہ حاصل ہے اور نہ تو ان بستیوں نے کبھی یہ دعویٰ کیا کہ جو ہے تو میرے گناہوں سے میرا کام ہوا دیا کریں گے اس پر مزید حماقت، ان لوگوں کی یہ ہے کہ اسلئے مالک کو چھوڑ کر ان فرضی سفارشیوں ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور ان کی ساری نیاز مندیاں اُنہی کے لیے وقف ہیں۔ ۱۹۷

سُورَةُ الْجُثَمِ فِي ارشاد باری ہے:

وَأَلَمْ يَكُنْ مِنْ مَدِينَةٍ مَّسْجُومَةٍ	آسمانوں میں کتنے ہی فرشتے موجود ہیں، اُن کی
وَلَا تَعْبُرُ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا هُدًى	شفاعت کچھ بھی کام نہیں آسکتی جیسے تک کہ



بَعْدَ أَنْ يَأْذَنَ اللَّهُ لِنَبِيٍّ وَمُرْسَلٍ - اور اس کو پسند کرنے کے حق میں اس کی اجازت نہ دے جس کے لیے وہ کوئی عرضداشت سننا چاہے (آیت ۲۶)

یعنی تمام فرشتے علیٰ کرم بھی اگر کسی کی شفاعت کریں تو وہ اس کے حق میں نافع نہیں ہو سکتی کجا کہ تمہارے ان بناوٹی مہبودوں کی شفاعت کسی کی بگڑی بنا سکے۔ خدائی کے اختیارات سارے کے سارے بالکل اللہ کے ہاتھ میں ہیں فرشتے بھی اس کے حضور کسی کی سنارش کرنے کی اس وقت تک جسارت نہیں کر سکتے جب تک وہ انہیں اس کی اجازت نہ دے اور کسی کے حق میں ان کی سفارش سننے پر راضی نہ ہو۔ ۱۹۸ھ

اللہ کے فیصلے کو کوئی ٹال نہیں سکتا

سورۃ الرعد میں اس طرح ارشاد ہے:

وَإِذَا أَرَادَ اللَّهُ بِقَوْمٍ سُوءًا فَلَا مَرَدَ لَهُ - وَمَا لَهُمْ مِنْ دُونِهِ مِنْ دَالٍ - (آیت ۱۱)

اور جب اللہ کسی قوم کی شامت لے گا تو وہ نہ ٹال سکتا ہے اور نہ ہی اس کو روک سکتا ہے۔ اور وہ کسی کے سامنے نہیں ٹال سکتا نہ اللہ کے مقابلے میں اسی قوم کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔

یعنی اس غلط فہمی میں بھی نہ رہو کہ اللہ کے ہاں کوئی پیر یا فقیر یا کوئی اگلا پھیل بزرگ یا کوئی جن یا فرشتہ ایسا زور آور ہے کہ تم خواہ کچھ بھی کرنے رہو وہ تمہاری نذروں اور نیازوں کی رشوت لے کر تمہیں ہمارے ٹرے اعمال کی پاداش سے بچائے گا۔ ۱۹۹ھ

شفاعت کے دروازے کی بندش

إِسْتَعْفِرْ لَهُمْ أَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ إِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِينَ مَرَّةً فَلَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ - ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَفَرُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ - (سورۃ توبہ - آیت ۸۰)

اُسے نبی! تم خواہ ایسے لوگوں (یعنی منافقین) کے لیے معافی کی درخواست کرو، یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی انہیں معاف کر دینے کی درخواست کرو گے تو اللہ انہیں ہرگز معاف نہ کرے گا۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے اور اللہ نافرمان لوگوں کو راہ نجات نہیں دکھاتا۔

اُسے نبی! تم چاہے ان (منافقین) کے لیے مغفرت کی دعا کرو یا نہ کرو، ان کے لیے کیا ہے اللہ ہرگز انہیں معاف نہ کرے گا، اللہ نافرمان لوگوں کو

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ أَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ لَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَهُمْ، إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ -

دالنافقون آیت ۱۹ ہرگز ہدایت نہیں دیتا :

یہ بات سورہ توبہ میں جو سورہ منافقون کے تین سال بعد نازل ہوتی ہے، اور زیادہ تاکید کے ساتھ فرما دی گئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے منافقین کے متعلق فرمایا کہ تم پیالے ان کے لیے استغفار کرو یا نہ کرو، اگر تم ستر مرتبہ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرو گے تو اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کفر کیا ہے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا (التوبہ آیت ۸۰)

آگے پہل کر پھر فرمایا "اگر ان میں سے کوئی مر جاتے تو اس کی نماز جنازہ کبھی نہ پڑھنا اور نہ ان کی قبر پر کھرسے ہونا۔ ان لوگوں نے اللہ اور اس رسول سے کفر کیا ہے اور یہ فاسق ہوتے کی حالت میں مرتے ہیں۔ (التوبہ آیت ۸۱)

اس آیت میں دو مضمون بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ دعائے مغفرت صرف ہدایت یافتہ لوگوں ہی سے ہی میں مفید ہو سکتی ہے۔ جو شخص ہدایت سے پھر گیا ہو اور جس نے اطاعت کے بجائے فسق و نافرمانی کی راہ اختیار کر لی ہو۔ اس کے لیے کوئی عام آدمی تو درکنار خود اللہ کا رسول بھی مغفرت کی دعا کرے تو اسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے یہ کہ ایسے لوگوں کو ہدایت بخشنا اللہ کا طریقہ نہیں ہے جو اس کی ہدایت کے طالب نہ ہوں۔ اگر ایک بندہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے منہ موڑ رہا ہو، بلکہ ہدایت کی طرف اسے بلایا جائے تو سر تھک کر غور کے ساتھ اس دعوت کو رو کر دے تو اللہ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے اپنی ہدایت لیے پھرے اور خوشامد کر کے اسے راہ ہدایت پر لائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحقیقت شافع روزِ محشر

اسلامی عقیدہ شفاعت تو قرآن و حدیث کی رو سے یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی عدالت میں شفاعت صرف وہ کر سکے گا جس کو اللہ اجازت دے اور صرف اسی شخص کے حق میں کر سکے گا جس کے لیے اللہ اجازت دے۔  
ملاحظہ ہو: **يَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ اللَّهُ وَرَحِمَ وَرَجِي لَهُ فَوَلا**  
**مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ**

لے قرآن کی آیات سے اور ایسی ہی بعض دوسری آیات سے ایک اہم حقیقت کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضور کی زبان سے یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ قیامت میں کیسے لوگوں کے لیے اور کیسے اعمال کے ترجمین کے لیے کوئی شافع کا ذکر نہ ہوگی مستعدا حدیث اس بارے میں قطع ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں شفاعت کے اس مردود تصور کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی جس سے مرتد ہر لوگ و ہر تے سے ترک عبادت کر دینے ہیں احکام دین کی اطاعت سے بے نیاز رہتے ہیں اور جن پسند گناہ میں گنہ گار رہتے ہیں۔  
محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ



شیرازی

۱۱

# حضور کی چند اہم پیشین گوئیاں

از یاد علیہم السلام کی طرف سے ایسی پیشین گوئیاں سنا رہے ہیں جو بالکل سچی ثابت ہوتی ہیں۔ سالانہ کبھی کبھی ایسی اوقات ان کے پورا ہونے کا وقت خاصی دیر سے آتا ہے اور لگاتار ہر چودہ سال تک یہ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ کوئی پیشین گوئی پوری ہو سکے گی۔ سچی پیشین گوئیاں علامتِ نبوت ہیں۔ ان میں سے ایک علامت سے ان میں متحرقاتی پہلو پایا جاتا ہے۔ نجومیوں اور خال گیریوں کی طرح بائبلوں کا معاملہ یہ ہے کہ ان میں کچھ چیزیں سچی اور کبھی کبھی کسی موقع پر پوری ہو جاتی ہیں، لیکن انبیاء کی پیشین گوئیاں چونکہ عظیم الٰہی پر مبنی ہوتی ہیں اس لیے وہ بالکل خاطر ہوتی ہیں۔

حضور کی پیشین گوئیاں ایک وہ ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے، دوسری وہ ہیں جو احادیث صحیحہ میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے جس تعداد سے کہ ہم حساب نہ تو اعداد کی تحریروں سے برآمد کر سکتے ہیں، یہاں تک جا کر دی گئی ہیں۔

درمقدمہ

# قرآن کی پیشین گوئیاں

## رؤس مستقبل

وَلَا خَيْرَ لَكُمْ فِي الْاُولَىٰ - اور تیسرا تمہارے لیے بعد کا دور پہلے دور سے بہتر ہے

(الشمیٰ آیت ۴)

یہ جو صحابی اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی حالت میں دی تھی جبکہ چند مہینے بھر آدمی آپ کے ساتھ تھے، ساری قوم آپ کی مخالفت تھی، بظاہر کامیابی کے آثار دور دور کہیں نظر نہ آتے تھے۔ اسلام کی شمع مکہ ہی میں ٹٹنار ہی تھی اور اسے نبی دینے کے لیے ہر طرف سے خان اٹھ رہے تھے۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ ابتدائی دور کی مشکلات سے آپ نے نڈا پریشان نہ ہوں، ہر بعد کا دور پہلے دور سے آپ کے لیے بہتر ثابت ہو گا۔ آپ کی قوت، آپ کی عزت و شوکت اور آپ کی قدر و منزلت برابر بڑھتی چلی جائے گی اور آپ کا فتنہ و اثر پھیلتا چلا جائے گا۔ پھر یہ وعدہ سرت و نہایتی تک محدود نہیں ہے، اس میں یہ وعدہ بھی شامل ہے کہ آخرت میں جو مرتبہ آپ کو ملے گا وہ اُس مرتبے سے بھی بڑھا جائے گا۔ ہر گاہ جو دنیا میں آپ کو حاصل ہو گا۔ لہذا انی نے اوسط میں اور ذہنی نے دلائل میں ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ حضور نے فرمایا میرے سگے تمام کامیابیاں پیش کی گئیں جو میرے بعد میری امت کو حاصل ہونے والی ہیں۔ اس پر مجھے بڑا خوشی ہوئی تب اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ آخرت تمہارے لیے دنیا سے بھی بہتر ہے۔

## غلبہ دین کی پیشین گوئی

وَلَسَوْتُ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ - اور تم قریب تمہارا رب تم کو اٹھا دے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔

(الشمیٰ آیت ۵)

یعنی اگرچہ دینے میں کچھ دیر تو لگے گی، لیکن وہ وقت دور نہیں ہے جب تم پر تمہارے رب کی عطا و بخشش کی وہ بارش ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔ یہ وعدہ حضور کی زندگی ہی میں اس طرح پورا ہوا کہ سارا ملک عرب جنوب کے ساحل سے لے کر شمال میں سلطنت روم کی شامی اور سلطنت فارس کی عراقی سرحدوں تک، اور مشرق میں خلیج فارس سے لے کر

مغرب میں بکرا حمر تک آپ کے زیر نگیں ہو گیا۔ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ سرزمین ایک قانون اور رضا بلکہ کی تاج ہو گئی۔ جو طاقت بھی اس سے ٹکرانی وہ پاش پاش ہو کر رہ گئی، کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رس رسول اللہ سے وہ پورا ملک غزنی اٹھا جس میں نشر کن اور اہل کتاب اپنے جھوٹے کلمے بلند رکھنے کے لیے آخری دم تک اٹھیں چوٹی کا زور لگا چکے تھے، لوگوں کے صفت سربہ اطاعت میں نہیں جھک گئے بلکہ ان کے دل بھی مستحضر ہو گئے اور عساکر، اخلاق اور اعمال میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا۔ پوری تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی کہ ایک جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم صرت ۲۳ سال کے اندر اتنی بدل گئی ہو۔ اس کے بعد حضور کی برپا کی ہوئی تحریک اس طاقت کے ساتھ اٹھی کہ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ایک بڑے حصے پر وہ چھا گئی اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے اثرات پھیل گئے یہ کچھ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو دنیا میں دیا اور آخرت میں جو کچھ دے گا اس کی عظمت کا تصور بھی کوئی نہیں کر سکتا۔

یہ اللہ کی قدرت، حکمت کا کرشمہ ہے کہ ایک ناتراشیدہ آئی قوم میں اس نے ایسا عظیم نبی پیدا کیا جس کی تعلیم و ہدایت اس درجہ انقلاب انگیز ہے، اور پھر ایسے عالمگیر اہل اصولوں کی حامل ہے جن پر تمام نوع انسانی مل کر ایک امت بن سکتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ ان اصولوں سے رہنمائی حاصل کر سکتی ہے۔ کوئی بناوٹی انسان خواہ کتنی ہی کوشش کر لیتا، یہ مقام و مرتبہ کبھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ عرب جیسی سپانہ قوم تو درکنار، دنیا کی کسی بڑی سے بڑی قوم کا کوئی ذہن سے ذہین آدمی بھی اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کی اس طرح مشکل طور پر کاپیٹ دے، اور پھر ایسے جامع اصولی دنیا کو دے دے جس پر ساری نوع انسانی ایک امت بن کر ایک دین اور ایک تہذیب کا عالمگیر و ہمہ گیر نظام ابد تک چلانے کے قابل ہو جائے۔ یہ ایک معجزہ ہے جو اللہ کی قدرت سے رونما ہوا ہے، اور اللہ ہی نے اپنی حکمت کی بنا پر جس شخص، جس ملک، اور جس قوم کو چاہا ہے اس کے لیے انتخاب کیا ہے۔ اس پر اگر کسی بے وقوف کا دل دکھتا ہے تو دکھتا رہے۔

بہتر دور کی یقین دہانی

نورۃ النبی کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نسلی دینا ہے اور مقصد اس پریشانی کو دور کرنا ہے جو نزل وحی کا سلسلہ ترک جانے سے آپ کو لاحق ہو گئی تھی۔ سب سے پہلے روز بروز روشن اور سکون شب کی تم کھا کر آپ کو اطمینان دلا گیا ہے کہ آپ کے رب نے آپ کو ہرگز نہیں چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوئے۔ اس کے بعد آپ کو خوشخبری دی گئی ہے کہ دعوت اسلامی کے ابتدائی دور میں میں شدید مشغلت سے آپ کو سابقہ پیش آ رہا ہے یہ بھونپنے والوں کی بات ہے۔ آپ کے لیے ہر بعد کا دور پیلے دور سے بہتر ہو جا چلا جائے گا اور کچھ زیادہ دیر نہ گزے گی کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی عطاء و بخشش کی ایسی بارش کرے گا جس سے آپ خوش ہو جائیں گے۔ یہ قرآن کی ان صریح پیشین گوئیوں میں سے ایک ہے جو بعد میں صرت پوری ہوئی، حالانکہ جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس

وقت کہیں فوراً دوزخ تک بھی اس کے آثار نظر نہ آتے تھے کہ تو میں جو یہ یار مددگار انسان پوری قوم کی جاہلیت کے مقابلے میں برسرِ بیکار ہو گیا ہے اسے اتنی حیرت انگیز کامیابی نصیب ہوگی۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ تمہیں یہ پریشانی کیسے لاحق ہوئی کہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا ہے اور ہم تم سے ناراض ہو گئے ہیں ہم تو تمہارے روزِ بیدارنش سے مسلسل تم پر مہربانیاں کرتے چلے آ رہے ہیں تم تمہیں پیدا ہوئے تھے، ہم نے تمہاری پرورش اور خیر گیری کا بہترین انتظام کر دیا۔ تم ناواقف راہ تھے، ہم نے تمہیں راستہ بتایا تم ناوار تھے، ہم نے تمہیں مالدار بنا دیا۔ یہ ساری باتیں صاف بتا رہی ہیں کہ تم ابتداء سے ہمارے منسلک نظر ہو اور ہمارا فضل و کرم مستعمل طور پر تمہارے شاملی مال ہے۔ ۱۰۰

### بوجھ آثار نے کا مفہوم

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۗ وَوَضَعْنَا  
عَنكَ وِزْرَكَ ۗ الَّذِي أَنْقَضَ ضَمْرَكَ ۗ  
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۗ وَوَضَعْنَا  
عَنكَ وِزْرَكَ ۗ الَّذِي أَنْقَضَ ضَمْرَكَ ۗ  
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۗ وَوَضَعْنَا  
عَنكَ وِزْرَكَ ۗ الَّذِي أَنْقَضَ ضَمْرَكَ ۗ  
اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۗ وَوَضَعْنَا  
عَنكَ وِزْرَكَ ۗ الَّذِي أَنْقَضَ ضَمْرَكَ ۗ

مفسرین میں سے بعض نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ نبوت سے پہلے ایام جاہلیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ قصور ایسے ہو گئے تھے جن کی فکر آپ کو سخت گراں گزر رہی تھی اور یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کو مطمئن کر دیا کہ آپ کے وہ قصور ہم نے معاف کر دیے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ معنی لینا سخت غلطی ہے۔ اول تو لفظِ وِزْر کے معنی لازماً گناہ ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ لفظ بھاری بوجھ کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس کو خواہ مخواہ بڑے معنی میں لیا جائے۔ دوسرے حضور کی نبوت سے پہلے کی زندگی بھی اس قدر پاکیزہ تھی کہ قرآن میں مخالفین کے سامنے اُس کو ایک چیلنج کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتار کو مخاطب کر کے یہ کہا گیا کہ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۗ میں اس قرآن کو پیش کرنے سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، اونس، آیت ۱۶۔ اور حضور اس کو وار کے آدمی بھی نہ سمجھتے کہ لوگوں سے چھپ کر آپ نے کوئی گناہ کیا ہو۔ معاذ اللہ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ تو اس سے ناواقف نہ ہو سکتا تھا کہ جڑتوں کوئی چھپا ہوا داغ اپنے دامن پر لیے ہوئے ہوتا اُس سے خلقِ خدا کے سامنے بر ملا وہ بات کہلوانا جو سورۃ یونس کی مذکورہ بالا آیت میں اُس نے کہلوائی ہے پس درحقیقت اس آیت میں وِزْر کے صحیح معنی بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد سنج و غم اور فکر و پریشانی کا بوجھ ہے، وہ جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپ کی حساس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپ کے سامنے نبوت پڑے جا رہے تھے۔ شرک اور مشرکانہ اوہام و رسوم کا بازار گرم تھا، اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی معاشرت میں نلگم اور معاملات میں نسا و عام تھا۔ ذرا آوروں کی



زیرِ قیوں سے بے زور پس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سو سو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی منبوط جتنا ہو۔ یہ حالت دیکھ کر آپ کراہتے تھے مگر اس بگاڑ کو دور کرنے کی کوئی سوت آپ کو نظر نہ آتی تھی یہی فکر آپ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارگراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپ کے اوپر سے اتار دیا اور نبوت کے منصب پر سرفراز ہوتے ہی آپ کو معلوم ہو گیا کہ توحید اور آخرت اور رسالت پر ایمان ہی وہ شاہ کلید ہے جس سے انسانی زندگی کے ہر بگاڑ کا نفل کھولا جاسکتا ہے اور زندگی کے ہر مہلک میں اصلاح کا راستہ صاف کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس دہمائی نے آپ کے ذہن کا سارا بوجھ ہٹا کر دیا اور آپ پوری طرح مطلق ہو گئے کہ اس ذریعہ سے آپ نہ صرف عرب بلکہ پوری نوبع انسانی کو ان خرابیوں سے نکال سکتے ہیں جن میں اُس وقت عرب سے باہر کئی بھی ساری دنیا مبتلا تھی۔

### رفع ذکر

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ۔ (الم نشرح: ۱۳) اور تباری خاطر تباریہ ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔

یہ بات اُس زمانہ میں فرمائی گئی تھی جب کوئی شخص یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ جس فردِ فرید کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہیں اور وہ بھی صرف شہر مکہ تک محدود ہیں اُس کا آوازہ دنیا بھر میں کیسے بلند ہوگا اور کسی ناموری اس کو حاصل ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان حالات میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خوشخبری سنائی اور پھر عجیب طریقہ سے اس کو پورا کیا۔ سب سے پہلے آپ کے رفع ذکر کا کام اُس نے خود آپ کے دشمنوں سے لیا۔ کفار مکہ نے آپ کو نرک دینے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ حج کے موقع پر حیب تمام عرب سے لوگ کچھ کچھ کر ان کے شہر میں آتے تھے، اُس زمانہ میں کفار کے دُور حاجیوں کے ایک ایک ڈیرے پر جاتے اور لوگوں کو خبردار کرتے کہ یہاں ایک خطرناک شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم، نامی ہے جو لوگوں پر ایسا جادو کرتا ہے کہ باپ بیٹے بھائی بھائی اور شوہر اور بیوی میں جدائی پڑ جاتی ہے۔ اس لیے ذرا اُس سے بچ کر رہنا یہی باتیں وہ ان سب لوگوں سے بھی کہتے تھے جو حج کے سوا دوسرے دنوں میں زیارت یا کسی کاروبار کے سلسلے میں آتے تھے اس طرح اگرچہ وہ حضور کو بدنام کر رہے تھے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے گوشے گوشے میں آپ کا نام پہنچ گیا اور مکہ کے گوشہ گنہمی سے نکال کر خود دشمنوں نے آپ کو تمام تنگ کے قبائل سے مُتعارف کر دیا۔ اس کے بعد یہ بالکل فطری امر تھا کہ لوگ یہ معلوم کریں کہ وہ شخص ہے کون؟ کیا کہتا ہے؟ کیا آدی ہے؟ اُس کے جادو سے متاثر ہونے والے کون لوگ ہیں اور ان پر اس کے جادو کا اثر کیا اثر پڑا ہے؟ کفار مکہ کا پراپیگنڈا جتنا جتنا بڑھتا چلا گیا، لوگوں میں یہ شہ جو بھی بڑھتی چلی گئی۔ پھر حیب اس شہ جو کے نتیجے میں لوگوں کو آپ کے اُتلاق اور آپ کی سیرت و کردار کا

سال معلوم ہوا، سب لوگوں نے قرآن سنا اور انہیں پتہ چلا کہ وہ تعینات کیا ہیں جو آپ پیش فرما رہے ہیں، اور سب دیکھنے والوں نے یہ دیکھا کہ جس پیغمبر کو یاد دیا گیا بارہا ہے اس سے متاثر ہونے والوں کی زندگیوں عرب کے عام لوگوں کی زندگیوں سے کس قدر عظمت ہو گئی ہیں، تو وہی بڑی نیک نامی سے بدنامی شروع ہو گئی، حتیٰ کہ ہجرت کا زمانہ آئے تک نسبت یہ پہنچ گئی کہ دورِ فزویک کے عرب قبائل میں تباہی کوئی قبیلہ ایسا رہ گیا ہو جس میں کسی نہ کسی شخص یا قبیلے نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، اور جس میں کچھ نہ کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کی دعوت سے بددروئی و دلچسپی رکھنے والے پیدا نہ ہو گئے ہوں۔ یہ حضور کے رفیق ذکر کا پہلا مرحلہ تھا۔ اس کے بعد ہجرت سے دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا جس میں ایک طرف منافقین، یہود اور تمام عرب کے اکابر مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرنے میں سرگرم تھے، اور دوسری طرف مدینہ طیبہ کی اسلامی ریاست خدا پرستی و خدا ترسی، زبردستی، ظہار، اطلاق، جس میں معاشرت، عدل و انصاف انسانی مساوات، مالداروں کی فیاضی، غریبوں کی خبرگیری، عہد و پیمانہ کی پاسداری اور معاملات میں راست بازی کا وہ عملی نمونہ پیش کر رہی تھی جو لوگوں کے دلوں کو متحرک کرنا چاہا بارہا تھا۔ دشمنوں نے جنگ کے فوراً بعد سے حضور کے اس برہمنے ہوئے اثر کو نشانے کی کوشش کی، مگر آپ کی قیادت میں اہل ایمان کی جو جماعت تیار ہوئی تھی اس نے اپنے قلم و ضبط، اپنی شجاعت، اپنی سوت سے بے خوفی، اور حالت جنگ تک میں اخلاقی خدو دکھائی پابندی سے اپنی بڑی اس طرح ثابت کر دی کہ سارے عرب نے ان کا لوہا مان لیا۔ دس سال کے اندر حضور کا رفیع ذکر اس طرح ہوا کہ وہی ملک جس میں آپ کو بدنام کرنے کے لیے مخالفین نے اپنا سارا زور لگا دیا تھا، اس کا گوشہ گوشہ آشکارا شدہ گداؤں، رسواؤں، انٹیو کی حد سے گرنے لگا تھا پھر تیسرے مرحلے کا افتتاح خلافت راشدہ کے دور سے ہوا جب آپ کا نام مبارک تمام روئے زمین میں بلند ہونا شروع ہو گیا۔ یہ مسئلہ آج تک بڑھتا ہی جا رہا ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک بڑھتا ہی چلا جائے گا دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں مسلمانوں کی کوئی بستی موجود ہو اور دن میں پانچ مرتبہ اذان میں باواز بلند محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان ہو رہا ہو، نمازوں میں حضور پروردگار کا ذکر ہو، جمعہ کے خطبوں میں آپ کا ذکر نہ کیا جا رہا ہو، اور سال کے بارہ مہینوں میں سے کوئی دن اور دن کے ۲۴ گھنٹوں میں سے کوئی وقت ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی جگہ حضور کا ذکر مبارک نہ ہو رہا ہو۔ یہ قرآن کی سداقت کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جس وقت نبوت کے ابتدائی دور میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، اس وقت کوئی شخص بھی یہ اندازہ نہ کر سکتا تھا کہ یہ رفیع ذکر اس شان سے اور اتنے بڑے پیمانہ پر ہو گا۔

حدیث میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جبریلؑ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا میرا رب اور آپ کا رب پوچھتا ہے کہ میں نے کس طرح تمہارا رفیع ذکر کیا، میں نے عرض کیا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کا انشاؤ ہے کہ جب میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا بھی ذکر کیا جائے گا۔"



یہ دونوں معنی مراد میں پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین عرب، نصاریٰ، یہود، مجوس، سب کے مذہب کو غلط سمجھتے تھے، اور اس ضیقیت پر ہی مصلحین نے جو عرب کے بعض قاصدین تو حید میں پائی جاتی تھی، کیونکہ یہ ایک منہم عقیدہ تھا جس میں راہِ راست کی کوئی تفصیل نہ ملتی تھی لیکن آپ کو چونکہ خود یہ معلوم نہ تھا کہ راہِ راست کیا ہے، اس لیے آپ سخت ذہنی غلجوان میں مبتلا تھے۔ نبوت عطا کر کے اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس غلجوان کو دور کر دیا اور وہ راہِ راست کھول کر آپ کے سامنے رکھ دی جس سے آپ کو کالی اطمینان قلب حاصل گیا۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت عطا کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ حوصلہ و بہت، وہ اؤلا العزیز اور وہ وسعت قلب عطا فرمادی جو اس منصبِ عظیم کی ذمہ داریاں نبھانے کے لیے درکار تھی۔ آپ اُس وسیع علم کے حامل ہو گئے جو آپ کے سوا کسی انسان کے ذہن میں سما نہ سکتا تھا۔ آپ کو وہ حکمت نصیب ہو گئی جو بچے سے بچے لگا کر کو دور کرنے اور سنوارنے کی اہلیت رکھتی تھی۔ آپ اس قابل ہو گئے کہ جاہلیت میں مستغرق اور جہالت کے اعتبار سے انتہائی اکثر معاشرے میں کسی سرور سامان اور ظاہر کسی اُشتیت پناہ طاقت کی مدد کے بغیر کھڑے ہو جاتیں اسلام کے علمبردار بن کر مخالفت اور دشمنی کے کسی بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے سے نہ ہچکچاتی ہیں۔ اس راہ میں جو عمومی تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آئیں، ان کو صبر کے ساتھ برداشت کر لیں اور کوئی طاقت آپ کو آپ کے موقف سے نہ جٹائے۔ یہ شرح صدر کی ہمیش بہادری جب اللہ نے آپ کو عطا کر دی ہے تو آپ ان مشکلات پر دل گرفتہ کیوں ہوتے ہیں جو آغا نہ کار کے اس مرحلے میں پیش آ رہی ہیں؟

بعض مفسرین نے شرح صدر کو شوق صدر کے معنوں میں لیا ہے۔ اور اس آیت کو اس معجزہ شوق صدر کا ثبوت قرار دیا ہے جو احادیث کی روشنی میں بیان ہوا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معجزہ کے ثبوت کا دار و مدار احادیث کی روایات ہی پر ہے۔ قرآن سے اس کو ثابت کرنے کی کوشش صحیح نہیں ہے۔ عربی زبان کے لحاظ سے شرح صدر کو کسی طرح بھی شوق صدر کے معنوں میں نہیں لیا جاسکتا۔ علامہ آلوسی رُوح المعانی میں فرماتے ہیں: حَمَلُ الشَّوْحِ فِي الْبَيْتِ عَلَى الشِّقِّ الْمَعْنَى صَبْرًا عِنْدَ الْمُتَعَبِينَ مُتَعَبِينَ کے نزدیک اس آیت میں شرح کو شوق پر محمول کرنا ایک کمزوری بات ہے۔

بشارتِ کوثر

نبوت کے ابتدائی دور میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدید ترین مشکلات سے گزر رہے تھے، پوری قوم دشمنی پر تکی ہوئی تھی، فراموشوں کے پہاڑ راستے میں حامل تھے، مخالفت کا طوفان ہر طرف برپا تھا، اور حضور اور آپ کے چند مٹھی بھر ساتھیوں کو دور و نزدیک کہیں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے تھے، اُس وقت آپ کو تسلی لینے اور آپ کی ہمت بندھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات نازل فرمائیں۔ سورہ صغریٰ میں فرمایا: وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَىٰ۔ وَكَسَوْنَا كُعُوبَكَ بِرَبِّكَ فَتَوَضَّعْ۔ اور قیامتاً تمہارے لیے بعد کا دور (یعنی ہر بعد کا دور)

پہلے دور سے بہتر ہے اور عنقریب تمہارا رب تمہیں وہ کچھ دے گا جس سے تم خوش ہو جاؤ گے اور اللہ تشریح میں فرمایا کہ دَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ اور ہم نے تمہارا آواز بلند کر دیا یعنی دشمن تمہیں ملک بھر میں بنام کرتے پھر رہے ہیں مگر ہم نے اُن کے علی الرغم تمہارا نام روشن کرنے اور تمہیں ناموری عطا کرنے کا سامان کر دیا ہے اور قَاتِ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے، یقیناً تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے یعنی اس وقت حالات کی سختیوں سے پریشان نہ ہو عنقریب مصائب کا دور ختم ہونے والا ہے اور کامیابیوں کا دور آنے ہی والا ہے۔

ایسے ہی حالات تھے جن میں سورہ کوثر نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے حضور کو تسلی بھی دی اور آپ کے مخالفین کے تباہ و برباد ہونے کی پیشین گوئی بھی فرمائی قریش کے کفار کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری قوم سے کٹ گئے ہیں اور ان کی حیثیت ایک بے کس اور بے یار و مددگار انسان کی سی ہو گئی ہے عکرمہ کی روایت ہے کہ جب حضور نبی بنائے گئے اور آپ نے قریش کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قریش کے لوگ کہنے لگے مَبْنُو مُحَمَّدًا مِتْنَا رَابِعًا خَيْرًا یعنی محمد اپنی قوم سے کٹ کر ایسے ہو گئے ہیں جیسے کوئی درخت اپنی جڑ سے کٹ گیا ہو اور متفق یہی ہو کہ کچھ مدت بعد وہ شوکھ کر بیوی نہ خاک ہو جائے گا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ مکہ کے سردار عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا "اجی چھوڑو انہیں وہ تو ایک اہل بڑھڑکے آدمی ہیں، ان کی کوئی اولاد ذرینہ نہیں۔" صحابہ نے کہا کہ ان کا نام لہو بھی نہیں ہو گا۔ ثمر بن علقمہ کا بیان ہے کہ عقبہ بن ابی معیط بھی ایسی ہی باتیں حضور کے متعلق کہا کرتا تھا (ابن جریر)۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ لوگ ایک دفعہ کعب بن اشرف مدینہ کا یہودی سردار آئے تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا: اَلَا تَوَدَّى اِلَى هَذَا النَّبِيِّ الْمُنْتَبِئِ مِنْ قَوْمِهِ يُوْعَدُ اَنْهُ خَيْرٌ مِّنَّا وَحَسْبُ اَهْلٍ اَلْحَيْجِ وَ اَهْلُ الْمَسَدِ اَتَقُوْا اَهْلُ الْاِسْقَابِ "بجلا دیکھو تو سہی اس لڑکے کو جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے اور جھٹا ہے کہ یہ ہم سے بہتر ہے حالانکہ ہم حج اور مسافرت اور سقاہت کے منتظم ہیں (بزار)۔ اس واقعہ کے متعلق عکرمہ کی روایت یہ ہے کہ قریش والوں نے حضور کے لیے الصَّنْبُوْرَ الْمُنْتَبِئِ مِنْ قَوْمِهِ کے الفاظ استعمال کیے تھے، یعنی "مذکورہ بے یار و مددگار اور بے اولاد آدمی جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے" (ابن جریر)۔ ابن سعد اور ابن عساکر کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے صاحبزادے قاسم تھے، اُن سے چھوٹی حضرت زینب تھیں ان سے چھوٹے حضرت عبداللہ تھے، پھر علی المرتضیٰ بن صاحبزادیاں ام کلثوم، فاطمہ اور زقیہ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسم کا انتقال ہوا، پھر حضرت عبداللہ نے وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا: ان کی نسل ختم ہو گئی اب وہ اہل بڑھڑکے (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی)۔ بعض روایات میں یہ اضافہ ہے کہ عاص نے کہا اِنَّ مُحَمَّدًا اَبْنَاؤُ

لَا يَنْبَغُ لَكَ يَوْمَ مَقَامِهِ بَعْدَهُ - فَإِذَا آمَاتِ (انقطع ذكره) واسترحمته يعني محمد ابراہیم، ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے جو ان کا قائم مقام بنے، جب وہ مرجاتیں گے تو ان کا نام دنیا سے مٹ جائے گا اور ان سے تیار اچھا پھوٹ جائے گا، عبد بن محمد نے ابن عباس کی جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کے صاحبزادے عبد اللہ کی وفات پر ابو جہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ شمر بن عطیہ سے ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضور کے اس غم پر خوشی مناتے ہوئے ایسے ہی مکینہ بن کا مظاہرہ عقبہ بن ابی معیط نے کیا تھا، عطا کہتے ہیں جب حضور کے دوسرے صاحبزادے کا انتقال ہوا تو حضور کا اپنا چچا ابوہبیب (جس کا گھر بالکل حضور کے گھر سے متصل تھا) دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور ان کو یہ خوشخبری دی کہ **يَبْتَغِي خَيْرًا لِّلْبَيْتَةِ** کہ آج رات محمد کا ولد ہو گئے یا ان کی جڑ کٹ گئی۔

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورہ کوثر حضور پر نازل کی گئی۔ قریش اس لیے آپ سے بگڑے تھے کہ آپ صرف اللہ ہی کی بندگی و عبادت کرتے تھے، اور ان کے شرک کو آپ نے علانیہ رد کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے پوری قوم میں جو مرتبہ و مقام آپ کو نبوت سے پہلے حاصل تھا وہ آپ سے چھین لیا گیا تھا۔ اور آپ گویا برادری سے کاٹ پھینکے گئے تھے۔ آپ کے چند مٹھی بھر ساتھی بھی سب بے یار و مددگار تھے، اور مارے کھد پڑے جا رہے تھے۔ اس پر مزید آپ پر ایک کے بعد ایک بیٹے کی وفات سے غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس موقع پر عزیزوں، رشتہ داروں، قبیلہ اور برادری کے لوگوں اور مہایوں کی طرف سے ہمدردی و تعزیت کے بجائے وہ خوشیاں مناتی جا رہی تھیں۔ اور وہ باتیں بناتی جا رہی تھیں جو ایک ایسے شریعت انسان کے لیے دل توڑ دینے والی تھیں جس نے اپنی اولاد کو ہمیشہ نیک سلوک کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس مختصر ترین سورت کے ایک فقرے میں وہ خوشخبری دی جس سے بڑی خوشخبری دینا کے کسی انسان کو کبھی نہیں دی گئی اور ساتھ ساتھ یہ فیصلہ بھی سنایا کہ آپ کی مخالفت کرنے والوں ہی کی جڑ کٹ جائے گی۔

لفظ ابراہیم سے ہے جس کے معنی کاٹنے کے ہیں، مگر محاورہ میں یہ بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ حدیث میں نماز کی اس رکعت کو جس کے ساتھ کوئی دوسری رکعت نہ پڑھی جائے ابراہیم کہا گیا ہے۔ یعنی پہلی رکعت۔ ایک اور حدیث میں ہے کل امر ذی بال لا یبدأ فیہ بحمد اللہ فصوابہ ہر وہ کام جو کوئی اہمیت رکھتا ہو، اللہ کی حمد کے بغیر شروع کیا جائے تو وہ ابراہیم ہے۔ یعنی اس کی جڑ کٹی ہوئی ہے۔ اسے کوئی استحکام نصیب نہیں ہے، یا اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ نامراد آدمی کو بھی ابراہیم کہتے ہیں۔ ذرائع و وسائل سے محروم ہو جانے والا بھی ابراہیم کہلاتا ہے۔ جس شخص کے لیے کسی خیر اور بھلائی کی توقع باقی نہ رہی ہو اور جس کی کامیابی کی سب امیدیں منقطع ہو گئی ہوں وہ بھی ابراہیم ہے جو آدمی اپنے کنبے برادری اور احوال و انصار سے کٹ کر اکیلا رہ گیا ہو وہ بھی ابراہیم

ہے جس آدمی کی کوئی اولاد نہ رہے نہ ہو یا مر گئی ہو اس کے لیے بھی اہتر کا لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے اس کا کوئی نام لپراتا نہیں تھا اور فرار کے بعد وہ اپنے نام و نشان ہو جاتا ہے قریب قریب ان سب معنوں میں کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہتر کہتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی اہتر تم نہیں ہو بلکہ تمہارے بی دشمن اہتر ہیں۔ یہ شخص کوئی جہاں جلد نہ تھا بلکہ سخت یہ قرآن کی ٹہری اہم پیشین گوئی تھی جو صرف بحرف صحیح ثابت ہوئی جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس وقت تو لوگ حضور ہی کو اہتر سمجھ رہے تھے اور کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار کیسے اہتر ہو جائیں گے جو نہ صرف مکہ میں بلکہ پورے ملک عرب میں نامور تھے، کامیاب تھے، مال و دولت اور اولاد ہی کی نعمتیں نہیں رکھتے تھے بلکہ سارے ملک میں جگہ جگہ ان کے احوان و انصار موجود تھے، تجارت کے اجارہ دار تھے، اور حج کے عظیم ہونے کی وجہ سے تمام قبائل عرب سے ان کے وسیع تعلقات تھے لیکن چند سال نہ گزرے تھے کہ حالات بالکل الٹ گئے۔ یا تو وہ وقت تھا کہ غزوہ اہزاب وسطہ ہجری، کے موقع پر قریش ہجرت سے عرب اور یہودی قبائل کو لے کر مدینہ پر چڑھ آئے تھے، اور غنیمتوں کو حضور جو کر، شہر کے گرد خندق کھود کر مدافعت کرنی پڑی تھی، یا تین ہی سال بعد وہ وقت آیا کہ ستم میں جب آپ نے مکہ پر چڑھائی کی تو قریش کا کوئی حامی و مددگار نہ تھا۔ اور انہیں بے بسی کے ساتھ ہتھیار ڈال دینے پڑے اس کے بعد ایک سال کے اندر پورا ملک عرب حضور کے ہاتھ میں تھا، ملک کے گوشے گوشے سے قبائل کے وفد آکر بیعت کر رہے تھے۔ اور آپ کے دشمن بالکل بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے تھے۔ پھر وہ ایسے بے نام و نشان ہوئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی، تو ان میں سے کوئی آج یہ نہیں جانتا کہ وہ ابو جہل یا البرہہ یا عاص بن حائل یا عقیلہ بن ابی معیط وغیرہ اعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے، اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے، اس کے بھائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر کج دینا بھریں، دُور دیکھا جا رہا ہے، کروڑوں مسلمانوں کو آپ سے نسبت پر منحوس ہے۔ لاکھوں انسان آپ ہی سے نہیں بلکہ آپ کے خاندان اور آپ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے انصاف کو باعثِ عز و شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سید ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے، کوئی صدیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زبیری اور کوئی انصاری، مگر نام کو بھی کوئی ابو جہل یا البرہہ نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اہتر حضور نہیں بلکہ آپ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔ ﷻ

لہ آیت میں بقول شافی استسما ہوا ہے إِنَّ شَابِكَ هُوَ الْأَبْتَمُ شَمْنٌ سے ہے جس کے معنی ایسے بغض اور عداوت کے ہیں جس کی بنا پر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ سلوک کرنے لگے قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے وَلَا يَجْعَلْ مَثَلَكُمْ شَمَانٌ تُعْمِ عَلَى الْأَعْدَاءِ نُوا "اور لے مسلمانوں کسی گروہ کی عداوت نہیں اس تریاقتی پر آمادہ نہ کرنے پائے کہ تم انصاف نہ کرو پھر اس شامانہ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی اور عداوت میں ایسا ہو گیا ہو کہ آپ کو عیب لگاتا ہو، آپ کے خلاف بدگوئی کرتا ہو، آپ کی ترمیمی کرتا ہو، اور آپ پر طرح طرح کی باتیں چھانٹ کر اپنے دل کا ناز نکالتا ہو۔ ﷻ

## بشارتِ کوثر کا اخروی پہلو

حوضِ کوثر کے متعلق حضور نے جو کچھ فرمایا وہ یہ ہے:

(۱) یہ حوضِ قیامت کے روز آپ کو عطا ہوگا۔ اور اُس نعمتِ وقت میں، جبکہ ہر ایک (عطش، العطش، العطش کہ رہا ہوگا۔ آپ کی اُمت آپ کے پاس اُس پر حاضر ہوگی اور اس سے سیراب ہوگی، آپ اس پر سب سے پہلے پہنچے ہوئے ہوں گے۔ اور اُس کے وسط میں تشریف فرما ہوں گے۔ آپ کا ارشاد ہے: هُوَ حَوْضٌ تَرُدُّ عَلَيْهِ اُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ وہ ایک حوض ہے جس پر میری اُمت قیامت کے روز وارد ہوگی۔“ (مسلم کتاب الصلوٰۃ۔ ابوداؤد، کتاب السنن) انا فرطكم على الحوض میں تم سب سے پہلے اس پر پہنچا ہوا ہوں گا“ (بخاری، کتاب الرقاق اور کتاب الفتن، مسلم کتاب الفضائل اور کتاب السلہارۃ۔ ابن ماجہ، کتاب المناقب اور کتاب الزہد، مسند احمد، مرویات عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن جبلی و ابوہریرہ) انا فرطکم و انا شہید علیکم۔ وانی و اللہ لا اظن انی حوضی الا ان میں تم سے آگے پہنچنے والا ہوں، اور تم پر گواہی دوں گا اور خدا کی قسم میں اپنے حوض کو اس وقت دیکھ رہا ہوں“ (بخاری کتاب الجنائز، کتاب الغازی، کتاب الرقاق)۔

انصار کو مخاطب کرتے ہوئے ایک موقع پر آپ نے فرمایا انکم ستلقون بعدی اثناء فاسمہوا حتی یکتونی علی الحوض میرے بعد تم کو خود غرضیوں اور قریباً نواز یوں سے پالاڑے گا۔ اس پر صبر کرنا یہاں تک کہ مجھ سے آکر حوض پر ملو۔ (بخاری کتاب مناقب الانصار و کتاب المغازی، مسلم کتاب الامارۃ ترمذی کتاب الفتن) انا یوم القیامۃ عند عقدر الحوض میں قیامت کے روز حوض کے وسط کے پاس ہوں گا“ (مسلم، کتاب الفضائل)۔ حضرت ابوہریرہ اسلی سے پوچھا گیا کہ کیا آپ نے حوض کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے؟ انہوں نے کہا ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں، چار نہیں، پانچ نہیں، بار بار سنا ہے، جو اس کو جھٹلائے اللہ سے اس کا پانی پینا نصیب نہ کرے (ابوداؤد، کتاب السنن)۔

عبداللہ بن زیاد حوض کے بارے میں روایات کو جھوٹ سمجھتا تھا، حتیٰ کہ اُس نے ابوہریرہ اسلی، براد بن عازبہ اور عائشہ بن عمرو کی سب روایات کو جھٹلایا، آخر کار ابوہریرہ ایک تحریر نکال کر لائے جو انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے سن کر نقل کی تھی اور اس میں حضور کا یہ ارشاد درج تھا کہ وہ الا ان موعدا کبر حوضی۔ خود ابوہریرہ اور زہاری ملاقات کی بلکہ میرا حوض ہے“ (مسند احمد، مرویات عبداللہ بن عمرو بن عاص)۔

(۲) اس حوض کی وسعت مختلف روایات میں مختلف بیان کی گئی ہے مگر کثیر روایات میں یہ ہے کہ وہ ایلہ (اسرائیل) کی موجودہ بندرگاہ ایلات، سے یمن کے صنعاء تک، یا ایلہ سے حدائق تک، یا عمان سے عدن تک طویل ہوگا اور اس کی چوڑائی تین ہونگی جتنا ایلہ سے جعفر بن عبدہ اور ابن کعب کے درمیان ایک تمام تک کا فاصلہ ہے۔ (بخاری کتاب الجنائز)۔



ابوداؤد الطیالسی، حدیث نمبر ۹۹۵۔ مُسند احمد، مرویات ابوبکر صدیق و عبداللہ بن عمر۔ مُسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔ ترمذی، ابراب صغیر القیامتہ۔ ابن ماجہ، کتاب التَّوْحُود۔

اس سے گمان ہوتا ہے کہ قیامت کے روز موجودہ بحرِ احمری کو حوضِ کوثر میں تبدیل کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(۳) اس حوض کے متعلق حضور نے بتایا ہے کہ اس میں جنت کی نہر کوثر (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے) سے پانی لاکر ڈالا جائے گا۔ یُشْخَبُ فِيهِ مِيزَابَانِ مِنَ الْجَنَّةِ، اور دوسری روایت میں ہے یُغْتَابُ فِيهِ مِيزَابَانِ يُمِدَّانِهِ مِنَ الْجَنَّةِ یعنی اس میں جنت سے دو نالیاں لاکر ڈالی جائیں گی جو اسے پانی بہم پہنچائیں گی (مُسلم، کتاب الفضائل)۔ ایک اور روایت میں ہے یُفْتَحُ نَهْرٌ مِنَ الْمَكَوْثَرِ إِلَى الْحَوْضِ، جنت کی نہر کوثر سے ایک نہر اس حوض کی طرف کھول دی جائے گی۔ (مُسنَد احمد، مرویات عبداللہ بن مسعود)۔

(۴) اس کی کیفیت حضور نے یہ بیان فرمائی ہے کہ اس کا پانی دُودھ سے (اور بعض روایات میں ہے پانی سے) اور بعض میں برص سے، زیادہ سفید، برص سے زیادہ مُضْطَرَّ، شہد سے زیادہ بیٹھا ہوگا، اس کی تہ کی مٹی مُشْک سے زیادہ خوشبو دار ہوگی۔ اس پر لٹنے کوڑے رکھے ہونگے جتنے آسمان میں تارے ہیں۔ جو اس کا پانی پی لے گا اسے پھر کبھی پیاس نہ لگے گی۔ اور جو اس سے محروم رہ گیا وہ پھر کبھی سیراب نہ ہوگا۔ یہ باتیں حضور سے نقلی اختلاف کے ساتھ کثرتِ احادیث میں منقول ہوئی ہیں دربخاری، کتاب الرِّقَاقِ، مُسلم، کتاب الطہارۃ و کتاب الفضائل۔

مُسنَد احمد، مرویات ابن مسعود، ابن عمر و عبداللہ بن عمر و ابن عباس۔ ترمذی، ابراب صغیر القیامتہ۔ ابن ماجہ، کتاب التَّوْحُود۔

ابوداؤد الطیالسی، حدیث ۹۹۵، ۲۱۲۵۔

(۵) اس کے بارے میں حضور نے بار بار اپنے زمانے کے لوگوں کو خبردار کیا کہ میرے بعد تم میں سے جو لوگ بھی میرے طریقے کو بدلیں گے، اُن کو اس حوض سے جہاد یا ہلے گا اور اس پر انہیں نہ کُتے دیا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے اصحاب ہیں تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا ہے۔ پھر میں بھی ان کو دفع کروں گا اور کہوں گا کہ دُور رہو۔ یہ مضمون بھی کثرتِ روایات میں بیان ہوا ہے دربخاری، کتاب الرِّقَاقِ، کتاب الرِّقَاقِ، مُسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب الفضائل، مُسنَد احمد، مرویات ابن مسعود و ابو ہریرہ۔ (ابن ماجہ، کتاب التَّوْحُود)۔

ابن ماجہ نے اس سلسلے میں جو حدیث نقل کی ہے وہ بڑے ہی دردناک الفاظ میں ہے اس میں حضور فرماتے ہیں

الَا وَانِي فَسَطَكُم عَلَى الْحَوْضِ وَأَكَاثَرِكُمُ الْأَمَمُ فَلَا تَسْوَدُهُ وَجْهِي، الْإِذَا نِي مُسْتَنْقِذٌ أَنَا سَأُوْ

مُسْتَنْقِذٌ أَنَا سَيِّئٌ فَاقُولِ يَا رَبِّ أَصْحَابِي، قَبِيضٌ أَنْكَ لَا تَدْرِي مَا أَحَدُكُمْ بَعْدَكَ يَتَّبِعُ وَارْتَبَهُ

میں تم سے آگے حوض پر پہنچا ہوا ہوگا اور تمہارے ذریعے سے دوسری امتوں کے مقابلہ میں اپنی اُمت کی کثرت۔

پر فخر کروں گا۔ اُس وقت میرا منہ کالا نہ کروانا۔ خبردار رہو کچھ لوگوں کو نہیں ٹھہراؤں گا۔ اور کچھ لوگ مجھ سے ٹھہرائے جائیں گے۔ میں کہوں گا کہ اُسے پروردگار پر تو میرے صحابی ہیں وہ فرماتے کا تم نہیں جانتے انہوں نے تمہارے بعد کیا نزلے کام کیسے ہیں؟ ابن ماجہ کی روایت ہے کہ یہ الفاظ حضور نے عرفات کے خطبے میں فرماتے تھے۔

(۴) اسی طرح حضور نے اپنے دور کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو بھی خبردار کیا ہے کہ ان میں سے جو بھی میرے طریقے سے ہٹ کر چلیں گے، لوہا اس میں رت و بدل کریں گے انہیں اس حوض سے بٹا دیا جائے گا۔ میں کہوں گا اُسے میرے رب یہ تو میرے ہیں، میری امت کے لوگ ہیں، جو اب ملے گا آپ کو معلوم نہیں کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا تغیرات کیسے اور اُسے ہی پھرتے چلے گئے۔ پھر نہیں بھی ان کو دفع کروں گا اور حوض پر نہ آنے دوں گا۔ اس مضمون کی بہت سی روایات احادیث میں ہیں بخاری کتاب المسافاة، کتاب الترقاق، کتاب الفتن، مسلم، کتاب الطہارۃ، کتاب السلوۃ، کتاب الفضائل۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد، مسند احمد، مرویات ابن عباسؓ۔

اس حوض کی روایات ۵ سے زیادہ صحابہ سے مروی ہیں۔ اور سلف نے بالعموم اس سے مراد حوض کوثر کہا ہے۔ امام بخاری نے کتاب الترقاق کے آخری باب کا عنوان ہی یہ بیان کیا ہے: باب فی الحوض وقول اللہ انا اعطیناکم اُنکوثر۔ اور حضرت انسؓ کی ایک روایت میں تو تصریح ہے کہ حضور نے کوثر کے متعلق فرمایا: **هُوَ حَوْضٌ تَرَدُّدٌ عَلَیْهِ اُمَّتٌ** وہ ایک حوض ہے جس پر میری امت وارد ہوگی۔

جنت میں کوثر نامی بحرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کی جائے گی اس کا ذکر بھی بکثرت روایات میں آیا ہے۔ حضرت انسؓ سے بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جن میں وہ فرماتے ہیں: **داور بعض روایات میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں کہ معراج کے موقع پر حضور کو نبوت کی سیر کرائی گئی۔ اور اس موقع پر آپ نے ایک نہر دیکھی جس کے کناروں پر اندر سے ترشے ہوئے موتیوں یا ہیروں کے تپتے بنے ہوئے تھے، اس کی تہ کی مٹی مشکب اذفر کی تھی۔ حضور نے جبریلؑ سے یا اُس فرشتے سے جس نے آپ کو سیر کرائی تھی پوچھا، یہ کیا ہے؟ اُس نے جواب دیا یہ نہر کوثر ہے جو آپ کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے (مسند احمد، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، ابوداؤد علیسی، ابن جریر)۔**

حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے کہ حضور سے پوچھا گیا (یا ایک شخص نے پوچھا) کوثر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں عطا کی ہے۔ اس کی مٹی مشکب ہے، اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مسند احمد، ترمذی، ابن جریر، مسند احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ حضور نے نہر کوثر کی یہ صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا، اس کی تہ میں لکڑیوں کے بجائے موتی پڑے ہوئے ہیں)۔ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور نے ارشاد فرمایا کہ کوثر جنت میں ایک نہر ہے جس کے کنارے سوئے کے ہیں۔ وہ موتیوں اور ہیروں پر بہ رہی ہے (یعنی

گنگریوں کی جگہ اس کی تہ میں یہ جواہر ٹپسے ہوتے ہیں۔ اس کی ٹیٹھک سے زیادہ خوشبودار ہے، اس کا پانی ڈونڈے سے (یا برف سے) نو بارہ سفید ہے، برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا ہے (مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ ابن ابی حاتم، دارمی، ابو داؤد طیالسی، ابن المنذر، ابن مرقؤویہ، ابن ابی شیبہ)۔ اُسامہ بن زید کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حضرت حمزہؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ وہ گھر پر نہ تھے۔ ان کی اہلیہ نے حضورؐ کی تواضع کی، اور دوران گفتگو عرض کیا کہ میرے شوہر نے مجھے بتایا ہے کہ آپؐ کو حُبّت میں ایک نہر عطا کی گئی ہے جس کا نام کوثر ہے آپؐ نے فرمایا۔ ہاں، اور اس کی زمین یا قوت درمیان اور زبرد اور موتیوں کی ہے (ابن جریر ابن عروذیہ، اس کی سند اگرچہ ضعیف ہے مگر اس مضمون کی کثیر التعداد روایات کا موجود ہونا اس کو تقویت پہنچاتا ہے)۔ ان مرفوع روایات کے علاوہ صحابہؓ اور تابعین کے کثرت اقوال احادیث میں نقل ہوئے ہیں جن میں وہ کوثر سے مراد حُبّت کی یہ نہر سمجھتے ہیں اور اس کی وہی صفات بیان کرتے ہیں جو اُردو پگڑی میں۔ مثال کے طور پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عائشہؓ، مجاہد اور ابوالعالیہ کے اقوال، مسند احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابن مرقؤویہ، ابن جریر اور ابن ابی شیبہ وغیرہ محدثین کی کتابوں میں موجود ہیں۔ ۲۱۳ھ

### ابو لہب کا انجام بد

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ (الغلب-۱) "ٹوٹ گئے ابو لہب کے ہاتھ اور نامراد ہو گیا وہ"

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ کے معنی بعض مفسرین نے "ٹوٹ جائیں ابو لہب کے ہاتھ" بیان کیے ہیں اور وَتَبَّ کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "وہ ہلاک ہو جائے" یا "وہ ہلاک ہو گیا"۔ لیکن درحقیقت یہ کوئی کوستا نہیں ہے جو اُس کو دیا گیا ہو، بلکہ ایک پیشین گوئی ہے جس میں آئندہ پیش آنے والی بات کو ماضی کے صیغوں میں بیان کیا گیا ہے، اگر اس کا ہونا ایسا یقینی ہے جیسے وہ ہو چکی، اور فی الواقع آخر کار وہی کچھ ہوا جو اس سورہ میں چند سال پہلے بیان کیا جا چکا تھا۔ ہاتھ ٹوٹنے سے مراد ظاہر ہے کہ جسمانی ہاتھ ٹوٹنا نہیں ہے، بلکہ کسی شخص کا اپنے اُس مقصد میں قطعی ناکام ہو جانا ہے جس کے لیے اس نے اپنا پورا زور لگا دیا ہو۔ اور ابو لہب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو ترک دینے کے لیے واقعی اپنا پورا زور لگا دیا تھا۔ لیکن اس سورہ کے نزول پر سات آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ جنگ بدر میں قریش کے اکثر مشیر وہ بڑے بڑے سردار مارے گئے جو اسلام کی دشمنی میں ابو لہب کے ساتھی تھے۔ مکہ میں جب اُن کی کئی خبر پہنچی تو اُس کو اتنا رنج ہوا کہ وہ سات دن سے زیادہ زمرہ نہرہ سکا پھر اس کی موت ہی نہایت عبرتناک تھی جسے

خَدَسَهُ (Malignant Pustule) کی بیماری ہو گئی جس کی وجہ سے اس کے گھر والوں نے اُسے

چھوڑ دیا، کیونکہ انہیں چھوت گھنے کا ڈر تھا۔ مرنے کے بعد بھی تین روز تک کوئی اُس کے پاس نہ آیا، یہاں تک کہ اُس کی لاش شتر کی اور اُس کی بُر پھیلنے لگی۔ آخر کار حسب لوگوں نے اس کے بیٹوں کو ملنے دینے شروع کیے تو ایک روایت

یہ ہے کہ انہوں نے کچھ سبھیوں کو اُحمرت دے کر اس کی لاش اٹھوائی اور انہی مزدوروں نے اس کو دفن کیا اور بڑی روایت یہ ہے کہ انہوں نے ایک گڑھا کھدوایا اور لکڑیوں سے اس کی لاش کو دھکیل کر اس میں پھینکا اور اوپر سے مٹی پتھر ڈال کر اسے ڈھانک دیا۔ اس کی مزید اور مکمل شکست اس طرز ہوئی کہ جس دین کی راہ روکنے کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا، اسی دین کو اُس کی اولاد نے قبول کیا۔ سب سے پہلے اس کی بیٹی ذرہ ہجرت کو کے مقد سے مدینے پہنچی اور اسلام لائیں۔ پھر فتح مکہ کے موقع پر اس کے دونوں بیٹے عُشْبہ اور مُغْتِشِب، حضرت عباس کی وساطت سے حضور کے سامنے پیش ہوئے اور ایمان لاکر انہوں نے آپ کے دست مبارک پر بیعت کی۔

اہل مکہ کے لیے نبی کو نکلنے کی سزا

وَإِنْ كَانُوا لَيَسْتَفْرِؤْكَ مِنَ الْأَرْضِ  
لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَا يُلْبِثُونَ خَلْفَكَ  
إِلَّا قَلِيلًا (بنی اسرائیل - آیت ۷۲)

۲۔ اور یہ لوگ اس بات پر تلے رہے ہیں کہ تمہارے قدم  
اس سرزمین سے اٹھا دیں اور نہ ہی وہاں سے نکال  
باسر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارا بعد یہ

خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھہریں گے۔

یہ صریح پیشین گوئی اگرچہ اُس وقت ایک دھکی نظر آتی تھی مگر دس گیارہ سال کے اندر ہی حرمِ بھرت سچی ثابت ہو گئی۔ اس شورہ کے نزول پر ایک سال گزرا تھا کہ کفارِ مکہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ اور اس پر وہ سال سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ آپ فاتح کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اور پھر دو سال کے اندر اندر سرزمینِ حبشہ مشرکین کے وجود سے پاک کر دی گئی۔ پھر جو بھی اس ملک میں رہا مسلمان بن کر رہا، مشرک بن کر وہاں ٹھہر نہ سکا۔

جمہیت قریش کی ہزیمت

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ  
عَنْفَرِيْبٍ يَهْتَاجُ شَكْسَتَ كَمَا جَاءَ كَاهِرِيْبٍ سَبِيْعِيْبٍ  
پھیر کر بھاگتے نظر آئیں گے۔  
(القدر - آیت ۴۵)

یہ صریح پیشین گوئی ہے جو ہجرت سے پانچ سال پہلے کر دی گئی تھی کہ قریش کی جمہیت، جس کی طاقت کا ہمیں بُرا نرگم تھا، عنقریب مسلمانوں سے شکست کھا جائے گی۔ اُس وقت کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ مستقبل قریب میں یہ انقلاب کیسے ہوگا۔ مسلمانوں کی بے بسی کا حال یہ تھا کہ ان میں سے ایک گروہ ملکِ حجاز کو حبش میں پناہ گزیں ہو چکا تھا اور باقی ماندہ اہل ایمان شعیب اہل طالب میں محصور تھے جنہیں قریش کے متقاطعہ اور مٹھا سرہنے ٹھوکوں مار دیا تھا۔ اس حالت میں کون یہ سمجھ سکتا تھا کہ سات ہی برس کے اندر نقشہ بدل جانے والا ہے حضرت عبداللہ بن عباس کے شاگردِ بکرہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے جب سورۃ قمر کی یہ آیت نازل ہوئی تو میں حیران تھا

کہ آخر یہ کوئی جمعیت ہے جو شکست کھائے گی۔ مگر جب جنگ بدر میں کفار شکست کھا کر بھاگ رہے تھے اُس وقت میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زورہ پینے ہوئے آگے کی طرف جمعیت رہے ہیں اور آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں کہ نَسِيحَتُمْ الْجَنَّةُ وَكَيْفَ تَوْنُ الدُّبُورِ تَبِ سِرِّي سَجْدِي أَيْ يَا كَرِيهُنَّ وَهِيَ وَهِيَ سِرِّيَّتِي جِسْمِي كَيْفَ تَوْنُ الدُّبُورِ تَبِ سِرِّي سَجْدِي - (ابن جریر - ابن ابی حاتم)۔

مرکہ مفتوح ہوگا

قِرَاءَةُ حُجْرَةَ تَانَصْرُ الْعَدِيْبُونَ (اشھد ۱۱، ۱۲) "ہمارا لشکر ہی غالب ہو کر رہے گا"

یعنی کچھ زیادہ مدت نہ گزرے گی کہ اپنی شکست اور تمہاری فتح کو یہ لوگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ یہ بات جس طرح فرمائی گئی تھی اسی طرح پوری ہوئی۔ ان آیات کے نزول پر مشکل ۱۴-۱۵ سال گزرے تھے کہ کفار مکہ نے اپنی آنکھوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتمہ داخل اپنے شہر میں دیکھ لیا اور پھر اس کے چند سال بعد اپنی لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اسلام نہ صرف عرب پر بلکہ روم و ایران کی عظیم سلطنتوں پر بھی غالب آگیا۔

حُجْرَةَ مَا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ "یہ تو جنتوں میں سے ایک چھوٹا سا جہاد ہے جو اسی جگہ

(معنی - آیت ۱۱) شکست کھائے والا ہے"

"اسی جگہ" کا اشارہ مکہ معظمہ کی طرف ہے، یعنی جہاں یہ لوگ یہ باتیں بنا رہے ہیں اسی جگہ ایک دن یہ شکست کھانے والے ہیں اور یہیں وہ وقت آنے والا ہے جب یہ منہ لٹکائے اسی شخص کے سامنے کھڑے ہوں گے جسے آج یہ حقیر سمجھ کر نبی تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں۔

قرآنی دعوت چھانکے رہے گی

خُزْمَ السَّجْدَةِ فِي ارْتَادِ كَرَامِي هِيَ:

سَمِعُوا نَصْرَهُ الْبَيْتَانِ فِي الْأَفَاقِ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ

حَتَّىٰ يَتَّبِعَنَّهُمْ لَعْنَةُ اللَّهِ -

(آیت ۵۲) کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے"

یعنی عنقریب یہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اس قرآن کی دعوت تمام گرد و پیش کے ممالک پر چھا گئی ہے اور یہ خود اس کے آگے سرنگوں ہیں۔ اُس وقت انہیں تپہ چل جائے گا کہ جو کچھ آج ان سے کہا جا رہا ہے اور یہ مان کر نہیں شے رہے ہیں وہ سراسر حق تھا۔

بعض لوگوں نے اس مفہوم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ محض کسی دعوت کا غالب آجانا اور ٹرے سے ٹرے علالتے فتح کر لینا تو اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہے، باطل دعوتیں بھی چھا جاتی ہیں اور ان کے پیروں کی ملک پر حاکم فتح کرتے

چلے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک سطحی اعتراض ہے جو ٹور سے معاملے پر غور کیے بغیر کر دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور  
 خلفائے راشدین کے دور میں جو ہجرت انگیز فتوحات اسلام کو نصیب ہوئیں وہ محض اس معنی میں اللہ کی نشانیاں نہ  
 تھیں کہ اہل ایمان ملک پر ملک فتح کرتے چلے گئے، بلکہ اس سنی میں تھیں کہ یہ فتح ممالک و دنیا کی دوسری فتوحات  
 کی طرح نہیں تھی جو ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کو دوسروں کی جان و مال کا مالک بنا دیتی ہیں اور خدا  
 کی زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ اس کے برعکس یہ فتح اپنے چکر میں ایک عظیم انسان، اندھی، اخلاقی، ذہنی و فکری تہذیب  
 و سیاسی اور تمدنی و معاشی انقلاب لے کر آئی تھی جس کے اثرات جہاں جہاں بھی پہنچے، انسان کے بہترین جوہر نکلتے  
 چلے گئے اور بدترین اوصاف دبتے چلے گئے۔ دنیا جن فضائل کو صرف تارک الدنیا درویشوں اور گوشے میں بیٹھ کر اللہ  
 اللہ کرنے والوں کے اندھی دیکھنے کی امید رکھتی تھی اور کبھی یہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کاروبار دنیا چلانے والوں میں بھی وہ  
 پائے جاسکتے ہیں، اس انقلاب نے وہ فضائل اخلاق فرما کر لوگوں کی سیاست میں، انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والوں  
 کی عدالت میں، حوجوں کی قیادت کرنے والے سپہ سالاروں کی جنگ اور فتوحات میں، ٹیکس وصول کرنے والوں کی  
 تھیلہ سازی میں، اور ٹور سے ٹورے کاروبار چلانے والوں کی تجارت میں جلوہ گر کر کے دکھا دیئے۔ اس نے اپنے پیدا کردہ  
 معاشرے میں عام انسان کو اخلاقی اور کردار اور طہارت و نظافت کے اعتبار سے آٹا اور چاٹھا یا کہ دوسرے  
 معاشروں کے چیدہ لوگ بھی ان کی سطح سے فروتر نظر آنے لگے۔ اس نے اوہام و خرافات کے چکر سے نکال کر انسان کو  
 علمی تحقیق اور عقلی طرز فکر و عمل کی سعادت شہسوار پر ڈال دیا۔ اس نے اجتماعی زندگی کے ان امراض کا علاج کیا جن کے  
 علاج کی فکر تک سے دوسرے نظام خالی تھے، یا اگر انہوں نے اس کی فکر کی بھی تو ان امراض کے علاج میں کامیاب نہ ہو  
 سکے، مثلاً رنگ و نسل اور وطن و زبان کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق، ایک ہی معاشرے میں طبقات کی تقسیم اور ان کے  
 درمیان اوپر نیچے کا امتیاز اور بھڑت چھات، قانونی حقوق اور عملی معاشرت میں مساوات کا فقدان، عورتوں کی  
 پستی اور زیادتی حقوق تک سے محرومی، جرائم کی کثرت، شراب اور نشہ آور چیزوں کا عام رواج، حکومت کا تنقید و  
 مصلحت سے بالاتر رہنا، عوام کا بنیادی حقوق تک سے محروم ہونا، بین الاقوامی تعلقات میں معاہدات کی بے اثرائی  
 جنگ میں دشمنانہ حرکات، اور ایسے ہی دوسرے امراض۔ سب سے بڑھ کر خود عرب کی سر زمین میں اس انقلاب نے  
 دیکھتے دیکھتے طوائف الملوکی کی جگہ نظم، خنزیری و بدامنی کی جگہ امن، فسق و فجور کی جگہ تقویٰ و طہارت، ظلم و بے انصافی  
 کی جگہ عدل، گندگی اور ناشائستگی کی جگہ پاکیزگی اور تہذیب، جہالت کی جگہ علم اور نسل و نسل چلنے والی عدالتوں کی  
 جگہ اذیت و محبت پیدا کر دی، اور جس قوم کے لوگ اپنے قبیلے کی سرداری سے بڑھ کر کسی چیز کا خواب تک نہ  
 دیکھ سکتے تھے انہیں دنیا کا امام بنا دیا۔ یہ تھیں وہ نشانیاں جو اسی نسل نے اپنی آنکھوں سے دیکھیں جسے مخاطب کر کے  
 نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ یہ آیت سنائی تھی۔ اور اس کے بعد سے آج تک اللہ تعالیٰ ان نشانوں کو بار بار دکھانے

جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زرداں کے زور پر بھی امتلاقی کی جس بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی گرو گو کہی وہ لوگ بھی نہ پہنچ سکے جو تہذیب و تراثنگی کے علمبردار بننے پھرتے ہیں۔ یورپ کی قوموں نے افریقہ، امریکہ، ایشیا اور خود یورپ میں مغلوب قوموں کے ساتھ بڑا ظالمانہ سلوک کیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کے کسی دور میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں پیش کی جاسکتی۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے جس نے مسلمانوں میں اتنی انسانیت پیدا کر دی ہے کہ وہ کبھی غلبہ پا کر اتنے ظالم نہ بن سکے جتنے غیر مسلم تاریخ کے ہر دور میں ظالم پائے گئے ہیں اور آج تک پائے جا رہے ہیں۔ کوئی آنکھیں رکھتا ہو تو خود دیکھ لے کہ اسپین میں جب مسلمان صدیوں حکمران رہے اس وقت عیسائیوں کے ساتھ ان کا کیا سلوک تھا اور جب عیسائی وہاں غالب آئے تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ ہندوستان میں آٹھ سو برس کے طویل زمانہ حکومت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کیا برتاؤ کیا اور اب ہندو غالب آ جانے کے بعد ان کے ساتھ کیا برتاؤ کر رہے ہیں۔ یہودیوں کے ساتھ کھیلے تیرہ سو برس میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا اور اب فلسطین میں مسلمانوں کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہے۔ ۱۹۱۹ء

آنحضرت کے لیے تزئینہ بلند

إِنَّ الَّذِي خَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ  
 كَمَا آتَىٰ، يَقِينٌ جَانِدٌ جَسَّ لِي قُرْآنَ تَمَّ بِرَفْعِ  
 كَمَا آتَىٰ، وَهُوَ تَمَّ بِرَفْعِ الْقُرْآنِ كَمَا آتَىٰ  
 كَمَا آتَىٰ، وَهُوَ تَمَّ بِرَفْعِ الْقُرْآنِ كَمَا آتَىٰ

(التقصص - آیت ۸۵) والا ہے

اصل الفاظ میں لَوَّادُكَ إِلَىٰ مَعَادٍ "توہیں ایک معاد کی طرف پھیرنے والا ہے" معاد کے لغوی معنی ہیں وہ مقام جس کی طرف آخر کار آدمی کو ٹھننا ہوا اور اسے نکرہ استعمال کرنے سے اس میں خود بخود یہ مفہوم پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ مقام ثبری شان اور عظمت کا مقام ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد جنت لی ہے۔ لیکن اسے صرف جنت کے ساتھ مخصوص کر دینے کی کوئی مقول وجہ نہیں ہے۔ کیوں نہ اسے ویسا ہی عام رکھا جائے جیسا خود اللہ تعالیٰ نے بتا فرمایا ہے تاکہ یہ وعدہ دنیا اور آخرت دونوں سے متعلق ہو جائے۔ سیاقی عبارت کا اقتضاء بھی یہ ہے کہ اسے آخرت ہی میں نہیں اس دنیا میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخر کار ثبری شان و عظمت عطا کرنے کا وعدہ سمجھا جائے۔ کفار مکہ کے جس قول پر آیت ۵۷ سے لے کر یہاں تک مسلسل گفتگو چلی آ رہی ہے، اُس میں انہوں نے کہا تھا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبنا چاہتے ہو۔ اگر تم تمہارا ساتھ دین اور اس دین کو اختیار کر میں تو عرب کی سرزمین میں ہمارا جینا مشکل ہو جائے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے کہ اے نبی، جس خدائے اس قرآن کی تم برداری کا بازم پر ڈالا ہے وہ تمہیں برباد کرنے والا نہیں ہے، بلکہ تم کو اس مرتبے پر پہنچانے والا ہے جس کا دستر بھی یہ لوگ آج نہیں کر سکتے۔ اور نبی الواقع اللہ تعالیٰ نے چند ہی سال بعد حضور کو اس دنیا میں، انہی لوگوں کی آنکھوں کے سامنے تمام ملک عرب پر ایسا مشکل اقتدار عطا کر کے دکھایا کہ آپ کی فراست کرنے والی کوئی طاقت نہ ہو

نہ ٹھیک اور آپ کے دین کے سوا کسی دین کے لیے وہاں گنجائش نہ رہی۔ عرب کی تاریخ میں اس سے پہلے کوئی نظیر اس کی موجود نہ تھی کہ پورے جزیرہ العرب پر کسی ایک شخص کی ایسی بے غل و غش بادشاہی قائم ہوگئی ہو کہ ملک بھر میں کوئی اس کا تبرعاً باقی نہ رہا ہو، کسی میں اس کے حکم سے سرتابی کا یا راندہ ہو، اور لوگ صرف سیاسی طور پر ہی اس کے معلقہ گوش نہ ہوتے ہوں بلکہ سارے دینوں کو ٹھاکر اسی ایک شخص نے سب کو اپنے دین کا پیرو بھی بنایا ہو۔

آنحضرت کے لیے مقام محمود

عَسَىٰ أَنْ يَبْعَثَنَّ رَبُّكَ مَعًا  
مَنْ يَشَاءُ - (بنی اسرائیل - آیت ۷۹) کر دے :-  
”بمید نہیں کہ تمہارا رب تمہیں مقام محمود پر فائز

یعنی دنیا اور آخرت میں تم کو ایسے مرتبے پر پہنچا دے جہاں تم مسرور و خلائق ہو کر رہو۔ ہر طرف سے تم پر مدح و ستائش کی بارش ہو۔ اور تمہاری بستی ایک قابل تعریف بستی بن کر رہے۔ آج تمہارے مخالفین تمہاری نواضع گالیوں اور ملامتوں سے کر رہے ہیں اور ملک بھر میں تم کو بدنام کرنے کے لیے انہوں نے جھوٹے الزامات کا ایک طوفان برپا کر رکھا ہے۔ مگر وہ وقت دور نہیں ہے جبکہ دنیا تمہاری تعریفوں سے گونج اٹھے گی اور آخرت میں بھی تم ساری خلق کے محمود ہو کر رہو گے۔ قیامت کے روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام شفاعت پر کھڑا ہونا بھی اسی مرتبہ محمودیت کا ایک حصہ ہے۔

شکست خوردہ روم کے لیے فتح کی خبر

جو پیشین گوئی سورہ روم کی ابتدائی آیات میں کی گئی ہے وہ قرآن مجید کے کلام الہی ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول برحق ہونے کی نمایاں ترین شہادتوں میں سے ایک ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تاریخی واقعات پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جائے جو ان آیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے ۹ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ قیصر روم ماریس (Maurice) کے خلاف بغاوت ہوئی اور ایک شخص فوکاس (Phocas) تخت سلطنت پر قابض ہو گیا۔ اس شخص نے پہلے قیصر کی آنکھوں کے سامنے اس کے پانچ بیٹوں کو قتل کر دیا، پھر خود قیصر کو قتل کر کے باپ بیٹوں کے سر تسلطی میں بیٹھ کر حکم لگوا دیئے، اور اس کے چند روز بعد اس کی بیوی اور تین لڑکیوں کو بھی مروا ڈالا۔ اس واقعہ سے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو روم پر حملہ آور ہونے کے لیے بہترین اخلاقی بہانہ مل گیا۔ قیصر ماریس اس کا من تھا۔ اسی کی مدد سے پرویز کو ایران کا تخت نصیب ہوا تھا۔ اسے وہ اپنا باپ کہتا تھا۔ اس باپ اس نے اعلان کیا کہ میں خاصب فوکاس سے اس ظلم کا بدلہ لوں گا جو اس نے میرے مجازی باپ اور اس کی اولاد پر ڈھایا ہے۔

سلسلہ میں اس نے سلطنت روم کے خلاف جنگ کا آغاز کیا اور چند سال کے اندر وہ فوکاس کی فرعون کیسے درپے



شکتیں دیتا ہوا ایک طرف ایشیائے کوچک میں ایڈریا (موجودہ اورنا) تک اور دوسری طرف شام میں حلب اور انطاکیہ تک پہنچ گیا۔ روم کے اعیان سلطنت یہ دیکھ کر کہ فوکاس تک کو نہیں بچا سکتا، افریقیہ کے گورنر سے مدد کے طالب ہوئے اس نے اپنے بیٹے ہرنقل (Heraclius) کو ایک طاقتور شہرے کے ساتھ قسطنطنیہ بھیج دیا۔ اس کے پہنچتے ہی فوکاس معزول کر دیا گیا، اس کی جگہ ہرنقل قیصر بنا دیا گیا اور اس نے برسرِ اقتدار آکر فوکاس کے ساتھ دہری کچھ کیا جو اس نے ماہیں کے ساتھ کیا تھا۔ یہ مسئلہ کا واقعہ ہے اور یہ وہی سال ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب رسالت پر سرفراز ہوئے تھے۔

خسر و پرویز نے جن اخلاقی بہانے کو بنیاد بنا کر جنگ چھیڑی تھی، فوکاس کے عزل اور ہرنقل کے بعد وہ ختم ہو چکا تھا اگر واقعی اس کی جنگ کا مقصد فاسب فوکاس سے اس کے ظلم کا بدلہ لینا ہوتا تو اس کے مارے جانے کے بعد اس کو سنتے قیصر کے ساتھ صلح کر لینی چاہیے تھی۔ مگر اس نے پھر بھی جنگ جاری رکھی، اور اب اس نے جنگ کو محرومیت اور معیشت کی فزونی جنگ کا رنگ دے دیا۔ جیسا تہوں کے جن طرفوں کو سرکاری کلیسا نے ٹھکر فرار دے کر ساہا سال سے تختہ نشین ستر بنا رکھا تھا یعنی نسطوری اور یعقوبی وغیرہ، ان کی ساری ہمدردیاں بھی مجوسی حملہ آوروں کے ساتھ ہو گئیں اور ہرنقل نے بھی مجوسیوں کا ساتھ دیا تھی کہ خسر و پرویز کی فوج میں بھرتی ہونے والے یہودیوں کی تعداد ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی۔ ہرنقل اگر اس سیلاب کو نزدیک رکھا، تخت نشین ہوتے ہی پہلی اطلاع جو اسے مشرق سے ملی وہ انطاکیہ پر ایرانی قبضے کی تھی۔ اس کے بعد ۶۲۸ء میں دمشق فتح ہوا۔ پھر ۶۳۴ء میں بیت المقدس پر قبضہ کر کے ایرانیوں نے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھادی۔ ۹۰ ہزار عیسائی اس شہر میں قتل کیے گئے۔ ان کا سب سے زیادہ مقدس کلیسا کنیت القیامہ (Holy Sepulchre) برابر کر دیا گیا۔ اصلی صلیب جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اسی پر مسیح نے جان دی تھی، مجوسیوں نے چھین کر مدائن پہنچا دی۔ لاش پادری زکریا کو بھی وہ پکڑے گئے اور شہر کے تمام بڑے بڑے گرجوں کو انہوں نے مسمار کر دیا۔ اس فتح کا نشہ جس بُری طرح خسر و پرویز پر چسڑھا تھا اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو اس نے بیت المقدس سے ہرنقل کو لکھا تھا۔ اس میں وہ کہتا ہے:

”سب خداؤں سے بڑے خدا، تمام روتے زمین کے مالک خسر و کی طرف سے اس کے کینہ اور کینہ“

بندے ہرنقل کے نام

”گو کہتا ہے کہ تجھے اپنے رب پر بھروسہ ہے، کیوں نہ تیرے رب نے یہ دشمن کو میرے ہاتھ سے بچا دیا“

لایا

اس فتح کے بعد ایک سال کے اندر اندر ایرانی فوجیں اردن، فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا کے پورے علاقے پر قابض ہو کر حدود مصر تک پہنچ گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مغرب میں ایک اور اس سے بدرجہا زیادہ تاریخی اہمیت رکھنے

والی جنگ برپا تھی۔ یہاں توحید کے علمبردار سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں، اور شرک کے پیروکار سردارانِ قریش کی رہنمائی میں ایک دوسرے سے برسرجنگ تھے، اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ سلسلۃ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنا گھرا بچھوڑ کر حبش کی عیسائی سلطنت میں راجعہ روم کی حلیف تھی، اپنا یعنی ٹبری۔ اُس وقت سلطنتِ روم پر ایران کے غلبے کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ مکتے کے مشرکین اس پر نہیں بجا رہے تھے اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ دیکھو ایران کے آتش پرست فتح پا رہے ہیں اور رومی و برسات کے ماننے والے عیسائی شکست پر شکست کھاتے چلے جا رہے ہیں اسی طرح ہم عرب کے بت پرست بھی نہیں اور تمہارے وہیں کو شاکر رکھ دیں گے۔

ان حالات میں قرآن مجید کی یہ سورتہ نازل ہوئی اور اس میں یہ پیشین گوئی کی گئی کہ "قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں، مگر اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر ہی وہ غالب آجائیں گے اور وہ دن وہ ہو گا جب اللہ کی دی ہوئی فتح سے اہل ایمان خوش ہو رہے ہوں گے۔" اس میں ایک کے بجائے دو پیشین گوئیاں تھیں۔ ایک یہ کہ رومیوں کو غلبہ نصیب ہو گا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کو بھی اسی زمانے میں فتح حاصل ہوگی۔ بلا ہر دور و دور تک اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں سے کوئی ایک پیشین گوئی بھی چند سال کے اندر اندر پوری ہو جائے گی۔ ایک طرف منی بھر مسلمان تھے جو مکتے میں مارے اور کھڈیڑے جا رہے تھے اور اس پیشین گوئی کے بعد بھی اٹھ سال تک ان کے لیے غلبہ و فتح کا کوئی امکان کسی کو نظر نہ آتا تھا۔ دوسری طرف روم کی مغلوبیت روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ سلسلۃ تک پورا مصر ایران کے قبضہ میں چلا گیا اور مجوسی فوجوں نے طرابلس کے قریب پہنچ کر اپنے جھنڈے کاڑھ دیئے۔ ایشیا کے کچھک میں ایرانی فوجیں رومیوں کو مارتی دیا تھی باسفورس کے کنارے تک پہنچ گئیں اور سلسلۃ میں انہوں نے عین قسطنطنیہ کے سامنے قلعہ دن (Chalcedon) موجودہ قانسٹی کوئی، پر قبضہ کر لیا۔ قیصر نے خسرو کے پاس ایچی بھیج کر نہایت عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ہر تمہیت پر صلح کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اس نے جواب دیا کہ "اب میں قیصر کو اُس وقت تک امان نہ دوں گا جب تک وہ پانچ بھیرے سامنے حاضر نہ ہو اور اپنے خدائے مسلوب کو چھوڑ کر خداوندِ آتش کی بندگی نہ اختیار کرے۔" آخر کار قیصر اس حد تک شکست خوردہ ہو گیا کہ اُس نے قسطنطنیہ چھوڑ کر قرطاجنہ (Carthage) موجودہ ٹیونس) منتقل ہو جانے کا ارادہ کر لیا۔ غرض انگریز مورخ گین کے بقول، قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کے بعد بھی سات اٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہ کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی، بلکہ غلبہ تو درکنار اس وقت تو کسی کو یہ اُمید بھی نہ تھی کہ اب یہ سلطنت زندہ رہ جاتے گی۔

Gibbon, Decline & Fall of the Roman

Empire, Vol. II P. 788 Modern Library, New York

قرآن کی یہ آیات جب نازل ہوئیں تو کفار مکہ نے ان کا خوب مذاق اڑایا اور ابی بن خلف نے حضرت ابو بکرؓ سے شرط بندی کر لی کہ اگر تین سال کے اندر مدینہ غالب آگئے تو دس اونٹ تین ڈول گاوردس اونٹ تم کو دینے ہوں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شرط کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا کہ قرآن میں فَاِتَّعِمُوا بَنِي نَجْرَانَ مِنَ الْغُلَامِ اَسْتَسْتَجِبْ لَكُمْ اور عربی زبان میں بضع کا اطلاق دس سے کم پر ہوتا ہے، اس لیے دس سال کے اندر کی شرط کرو اور اونٹوں کی تعداد بڑھا کر سو کر دو۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ نے آئی سے پھر بات کی اور نئے سرے سے یہ شرط طے ہوئی کہ دس سال کے اندر فریقین میں سے جس کی بات غلط ثابت ہوگی وہ سوا اونٹ دیگا۔

۶۲۲ء میں ابو حنیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے اور اُدھر تفسیر شریف نقل خاموشی کے ساتھ قسطنطنیہ سے بحر اسود کے راستے طرابلس کی طرف روانہ ہوا جہاں اُس نے ایران پر کشت کی طرف سے حملہ کرنے کی تیاری کی۔ اس جوانی حملے کی تیاری کے لیے قیصر نے کلیسا سے روپیہ مانگا اور یہی کلیسا کے اُسقف اعظم سر جیوس (Serjius) نے سبھت کو مجسبت سے بچانے کے لیے گرجا اول کے نذرانوں کی جمع شدہ دولت سُو پر قرض دی۔ بیزنٹل نے اپنا حملہ ۶۲۳ء میں ارمینیا سے شروع کیا اور دوسرے سال ۶۲۴ء میں اس نے افریسیان میں گھس کر زرخشت کے مقام پر آتش اُرمیاء کو تباہ کر دیا اور ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ وہی سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر پہلی مرتبہ مشرکین کے مقابلے میں فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔ اس طرح وہ دونوں پیشین گوئیاں جو سورۃ روم میں کی گئی تھیں، دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے بیک وقت پوری ہو گئیں۔

پھر روم کی فوجیں ایرانیوں کو مسلسل و باقی چلی گئیں نینوی کی فیصلہ کن لڑائی (۶۲۷ء) میں انہوں نے سلطنت ایران کی کمر توڑ دی۔ اس کے بعد شاہان ایران کی تیام گاہ دستگرد (دسکرتہ الملک) کو تباہ کر دیا گیا اور آگے بڑھ کر بیزنٹل کے لشکر عین کلیفون (Ctealphon) کے سامنے پہنچ گئے جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ۶۲۷ء میں خسرو پرویز کے خلاف گھر میں بغاوت رونما ہوئی، وہ قید کیا گیا، اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے اٹھارہ بچے قتل کر دیئے گئے، اور چند روز بعد وہ خود قید کی تختیوں سے ہلاک ہو گیا۔ یہی سال تھا جس میں صلح حدیبیہ واقع ہوئی جسے قرآن مجید عظیم کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہی سال تھا جس میں خسرو پرویز کے بیٹے قباد ثانی نے نام نہاد رومی مقبرضات سے دست بردار ہو کر اور اصلی صلیب واپس کر کے روم سے صلح کر لی۔ ۶۲۷ء میں قیصر "مقدس صلیب" اس کی جگہ رکھنے کے لیے خود بیت المقدس گیا، اور اسی سال نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمرۃ القضاء کرنے کے لیے ہجرت کے بعد پہلی مرتبہ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔

اس کے بعد کسی کے لیے بھی اس امر میں شبہ کی گنجائش ہی نہ رہی کہ قرآن کی پیشین گوئی بالکل سچی تھی عرب کی بکثرت محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

مشرکین اس پر ایمان لے آئے۔ اپنی بن خلائق کے وارثوں کو شرط ہار کر شرط کے اونٹ حضرت ابوبکرؓ کے حوالے کرنے پڑے۔ وہ انہیں لے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپؐ نے حکم دیا کہ انہیں صدقہ کر دیا جائے۔ کیونکہ شرط اُس وقت ہوتی تھی جب شریعت میں تجسس کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا۔ مگر اب حرمت کا حکم آچکا تھا۔ اس لیے عربی کافروں سے شرط کا مال توڑ لینے کی اجازت دے دی گئی، مگر ہدایت کی گئی کہ اُسے محمدؐ استقبال کرنے کے بجائے صدقہ کر دیا جائے۔ ۲۲۲ھ

وَيَوْمَئِذٍ يُفِرُّهُ الْمُؤْمِنُونَ بِمَنْصَرٍ  
اللہ - (الرُّوم - آیت ۴)

”اور وہ دن وہ ہو گا جبکہ اللہ کی شہادت ہوئی فتح پر مسلمان  
خوشیاں منائیں گے“

ابن عباسؓ، ابوسعید خدریؓ، سفیان ثوریؓ، سعدی وغیرہ حضرات کا بیان ہے کہ ایرانیوں پر یومئذ کی فتح اور جنگ بدر میں مشرکین پر مسلمانوں کی فتح کا زمانہ ایک ہی تھا۔ اس لیے مسلمانوں کو دو بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ یہی بات ایران اور روم کی تاریخوں سے بھی ثابت ہے۔ سن ۶۱۰ء ہی وہ سال ہے جس میں جنگ بدر ہوئی، اور یہی وہ سال ہے جس میں قیصر روم نے زرتشت کا مولود تباہ کیا اور ایران کے سب سے بڑے آتش کدے کو سار کر دیا۔ ۲۲۳ھ

فَالْيَوْمَ مَنَعْنَاكَ بِيَدِنَا أَنْ تَكُونَ مِنَّا  
خَدَعَكَ آيَةً

”اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد  
کی نسلوں کے لیے نشان عبرت رہے“

آج تک وہ مقام جزیرہ سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے۔ جہاں فرعون کی لاش تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کو موجود زمانے میں جبل فرعون کہتے ہیں، اور اسی کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی نے حمام فرعون کے نام سے موسوم کر رکھا ہے۔ اس کی جائے وقوعہ ابو زعیمہ سے چند میل اوپر شمال کی جانب ہے اور علاقے کے باشندے اسی جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی ملی تھی۔

اگر یہ درجہ والا وہی فرعون منقرض ہے جس کو زمانہ حال کی تحقیق نے فرعون موسیٰ قرار دیا ہے تو اس کی لاش آج تک

یہ قرآن کی بنیاد پر عظیم پیشین گوئی ہے جو حضورؐ کی نبوت اور قرآن کی صداقت کی ایک واضح دلیل ہے جس نے مشرکین میں یہ پیشین گوئی سنانے آئی تھی اس وقت تک۔ نہ اٹھ مہر کی قبروں اور نقوشوں کا حال منکشف نہیں ہوا تھا۔ ابراہامولہؑ میں داخل ہونے اور ذرا عہد کے مقبروں اور ماہونوں کو کھودنے کا کام زمانہ حال میں ہوا ہے۔ سن ۱۹۰۰ء سے پہلے یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ دو برسوں کے فرعون غرق کی لاش محفوظ ہے یا نہیں۔ نین ہزار سال سے زیادہ پرانے واقعہ کے متعلق حالیہ اکتشاف نے قرآن کے محتاج اللہ ہونے کی ایک دلیل منکدریں کے لیے فراہم کر دی ہے۔

قابرہ کے بجانب خانے میں موجود ہے۔ سترہویں سرگرائفٹن ایٹم سمند نے اس کی می پر سے جب پٹیاں کھولی تھیں اس کی لاش پر ناک کی ایک تریجی ہوتی پائی گئی تھی، جو کھاری پانی میں اس کی برفانی کی ایک کھلی علامت تھی۔

وَإِن كُنْتُمْ فِي شَكٍّ مِنْ أَشْيَاءِ عَنِ الْيَتِيمِ الْغَدِيَّةِ - یعنی ہم تو سبق آموز اور عبرت انگیز نشانات رکھائے ہی جائیں گے اگرچہ اکثر انسانوں کا حال یہ ہے کہ کسی بُری سے بُری عبرت ناک نشانی کو دیکھ کر بھی ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔  
یا جوج ماجوج کی عالمگیر لوش

یا جوج سے مراد روس اور شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تانازی، منگولی، ہن اور سینھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں اور قدیم زمانے سے متحدہ ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے حملوں سے بچنے کے لیے قفقاز کے جنوبی علاقے میں درند اور دریاں کے استحکامات تعمیر کیے گئے ہیں کیونکہ ان کے سیلاب وقتاً فوقتاً اٹھ کر ایشیا اور یورپ، دونوں طرف رخ کرتے رہے ہیں۔ بائبل کی کتاب پیدائش (باب ۱۰) میں ان کو حضرت نوح کے بیٹے یا نٹ کی نسل میں شمار کیا گیا ہے، اور یہی بیان سلطان مؤرخین کا بھی ہے۔ حزقی ایل کے صحیفے (باب ۳۸ و ۳۹) میں ان کا علاقہ روس اور توبل (موجودہ توبا سک) اور مسک (موجودہ ماسکو) بتایا گیا ہے۔ اسرائیلی مؤرخ یوسفوس ان سے عراقی سینھین قوم لیتا ہے جس کا علاقہ بحر اسود کے شمال اور شرق میں واقع تھا۔ جیروم کے بیان کے مطابق ماجوج کاشیا کے شمال میں بحر خزر کے قریب آباد تھے۔ ۲۲۵

ان کے کھول دینے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے کہ جیسے کوئی شکاری دزدہ ایک پلہ سے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ وعدہ حق پورا ہونے کا وقت قریب آگے گا۔" کا اشارہ صاف طور پر اس طرف ہے کہ یا جوج ماجوج کی یہ عالمگیر لوش آخری زمانہ میں ہوگی اور اس کے بعد جلد ہی ہی قیامت آجائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد اس معنی کو اور زیادہ کھول دیتا ہے جو مسلم نے خذیفہ بن اسید انفاری کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک تم اس سے پہلے اس علاقے میں نہ دیکھ لو: دھواں، دجال، وابت الارض مغرب سے سورج کا طلوع عیسیٰ ابن مریم کا نزول، ماجوج و ماجوج کی لوش اور زمین بڑے خسرت زمین کا دھنسا یا ر Land Slide، ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں، پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اٹھے گی جو لوگوں کو مشرق کی طرف بانٹے گی (یعنی یمن اس کے بعد قیامت آجائے گی) ایک اور حدیث میں یا جوج ماجوج کی لوش کا ذکر کر کے حضور نے فرمایا اس وقت قیامت اس قدر قریب ہوگی جیسے پورے پٹیوں کی حاملہ کہ نہیں کہہ سکتے کب وہ تجربہ منوسے، رات کو یادن کو رنا حاصل المسلم لایداری اہلبا منتفی انھوہم بوندھا لبلا و نفاہا) لیکن قرآن مجید اور حدیث میں یا جوج ماجوج کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ متشریح نہیں ہوتا کہ یہ دونوں متحد ہوں گے اور مل کر دنیا پر ٹوٹ پڑیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ قیامت کے قریب

زمانے میں یہ دونوں آپس ہی میں لڑ جائیں اور پھر ان کی لڑائی ایک عالمگیر فساد کی موجب بن جائے۔ ۲۱۶ھ  
 یہودی کی وقت و مسکنت

صُرِّيتَ عَلَيْكُمُ الدِّينَةُ وَالْمَكَّةُ كَيْفَ بَارَسَ فِي مِيرَاثِ عَقِيدِهِ هَبْ كَيْفَ تَقِيَامَتُ هَبْ۔ اس میں غلطیوں کی موجودہ اسرائیلی حکومت بن جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اول تو آیت تمام یہودی ملت کے بارے میں عیسیتِ مجموعی ایک حکم لگاتی ہے، اس کے ایک ایک فرد پر یا افراد کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ اس کیفیت کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہونے کے بعد سے قیامت تک ان پر زمین حیاتِ المجموع دُنیا بھر میں طاری رہے گی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس طویل مدت کے دوران میں کبھی کسی مختصر مدت کے لیے بھی زمین کے کسی گوشے میں انہیں قوت و اقتدار نصیب نہ ہو۔ دراصل اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہودی قوم کی اُس تاریخ سے واقف ہونا ضروری ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے آج تک گزری ہے۔ اُس تاریخ کو، اور ان کی موجودہ حالت کو جو عیسیتِ مجموعی دُنیا میں آج بھی پائی جاتی ہے، بغور دیکھا جائے تو قرآن مجید کے ان ارشادات کی پوری تفسیق ہو جاتی ہے:

وَ اِذْ تَاَذَنَ رَبُّكَ لِيَمْعَنَنَّ عَلَيْكُمُ  
 اِلٰهُ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْا سُوْا  
 الْعٰذَابِ۔ (الاعراف ۱۶۷)

اور جب اعلان کر دیا تیرے رب نے کہ وہ قیامت  
 تک ان پر کسی نہ کسی ایسے شخص کو مسلط کرنا چاہے گا  
 جو ان کو سخت عذاب دے گا۔

صُرِّيتَ عَلَيْكُمُ الدِّينَةُ اَيْنَ مَا تَقِفُوْا  
 اِلَّا يَجْبَلِ مِنَ اللّٰهِ وَجْبَلٍ مِّنَ النَّاسِ۔  
 دال عمران ۱۱۳

ان پر دینتِ تعویب دی گئی جہاں بھی وہ پائے  
 جائیں بجز اس کے کہ کہیں ان کو اللہ کی طرف سے  
 اور انسانوں کی طرف سے تحفظ کی ضمانت مل جائے۔

پوری تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً دُنیا کے کسی گوشے میں کوئی نہ کوئی طاقت ایسی اٹھتی رہی ہے جو یہودیوں کو خوب مارنی کھڑتی رہی۔ اور جہاں کہیں بھی وہ پھیرتا رہے ہیں اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ اللہ کے دین سے ہونے والے واقعے کی بنا پر کسی دوسرے ہی انسانی گروہ کی حمایت میں آجانے کی وجہ سے رہے ہیں۔ موجودہ یہودی ریاست بھی برطانیہ اور امریکہ کی حمایت ہی میں قائم ہوئی ہے اور باقی ہے یہ حمایت جس وقت بھی چٹے گی اس ریاست کا شرف دُنیا دیکھ لے گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو فنا نہیں کرنا چاہتا بلکہ نمونہ عبرت بنا کر باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس پر مسلسل عذاب کا کوڑا برتا رہتا تو یہ کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کے باقی رہنے کا یہ انتظام کر دیا ہے کہ کہیں وہ پھٹی جاتی ہے تو کہیں اسے پناہ بھی مل جاتی ہے۔ اس طرح یہ طوفانی ہزاروں

برس سے لایسیت فیما ولایحییٰ مسدق اس دُنیا میں سے جاری ہے۔ ۲۱۶ھ

# حدیث میں پیشین گوئیاں

## کامل امن کا دور

حضرت خیابنہ کہتے ہیں کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے سلسے میں تشریف فرما تھے۔ میں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: "یا رسول اللہ! اب تو ظلم کی حد ہو گئی ہے، آپ خدا سے دعا نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپ کا چہرہ مبارک تہمتا اٹھا اور آپ نے فرمایا، تم سے پہلے جو اہل ایمان تھے ان پر اس سے زیادہ مظالم ہو چکے ہیں۔ ان کی ہڈیوں پر لوہے کی گنگھیاں گسی جاتی تھیں، ان کے سروں پر رکھ کر آگ سے چلانے جاتے تھے، پھر بھی وہ اپنے دین سے نہ پھرے تھے۔ یقین جانو کہ اللہ اس کام کو پورا کر کے رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا کہ ایک آدمی صنعا سے سفر موت تک بنے کھٹکے سفر کرے گا اور اللہ کے سوا اس کو کسی کا خوف نہ ہوگا۔

مگر تم لوگ جلد باری کو تے ہو (بخاری) - ۵۴۴۸

## عرب و عجم پر غلبہ کی شرط

ابو طالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا اور آپ سے کہا: "کھتیجی، یہ تو باری قوم کے لوگ میرے پاس آئے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تم ایک نصفانہ بات پر ان سے اتفاق کر لو تا کہ تمہارا اور ان کا جھگڑا ختم ہو جائے۔" پھر انہوں نے وہ بات حضور کو بتائی جو سرداران قریش نے ان سے کہی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: "چچا جان، میں تو ان کے سامنے ایک ایسا کلمہ پیش کرتا ہوں جسے اگر یہاں میں تو عرب ان کا تائب فرمان اور عجم ان کا باجگزار ہو جائے۔"

حضور کے اس ارشاد کو مختلف راویوں نے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔ ایک روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: اريدهم على كلمة واحدة يقولون نعم لمدى لهم بالعرب. وثو ذى ايهم دينا الاحكام جزية. دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں: ادعوهم لى ان يتكلموا بكلمة تدبر. نعم بها العرب ويسلكون بها المعجم. ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ابو طالب کے بجانب قریش کے لوگوں کو خطاب کر کے

فرمایا "کلمۃ واحده تعطونہا تمکنون بها العرب و تدین لکم بها العجم۔ اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں "ڈراہیتم ان اعطیتکم کلمۃ تکلمتم بها ملکتم بها العرب و دانتم لکم بها العجم۔ ان نطنی اختلافات کے باوجود تو سب کا یکساں ہے یعنی حضور نے ان سے کہا کہ اگر میں ایک ایسا کلمہ تمہارے سامنے پیش کروں جسے قبول کر کے تم عرب و عجم کے مالک ہو جاؤ گے تو بتاؤ کہ یہ زیادہ بہتر بات ہے یا وہ جسے تم انصاف کی بات کہہ کر میرے سامنے پیش کر رہے ہو؟ تمہاری بھلائی اس کلمے کو مان لینے میں ہے یا اس میں کہ جس حالت میں تم چلے ہو اسی میں تم کو پٹا رہنے دوں اور بس اپنی جگہ آپ ہی اپنے خدا کی عبادت کرتا رہوں؟ اللہ

### قریش کا سیاسی اقتدار

آپ نے پیش گوئی کر دی تھی کہ جب تک قریش اپنے اخلاق بلند رکھیں گے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی علمبریاری کرتے رہیں گے، اور ان میں دو آدمی بھی مروان کا پانے جاتیں گے ریاست انہی کو حاصل رہے گی۔

حضور کا یہ اندازہ اس قدر صحیح تھا کہ تاریخ آپ کے بعد صدیوں تک اس کی صحت کا ثبوت دیتی رہی ہے قریش کے قبیلے کی زبردست مردم خیزی کا حال یہ تھا کہ خلافت راشدہ کے دور میں چاروں خلیفہ اسی نے فراہم کیے اور معلوم ہے کہ ان چاروں کی نگرانی کوئی آدمی فی الواقع اس وقت عرب میں نہ تھا۔ پھر اسی قبیلے نے عظیم الشان اموی سلطنت قائم کی، اسی نے عباسی سلطنت کو جنم دیا۔ اسی نے اسپین میں ایک زبردست حکومت کھڑی کر دی۔ اور اسی نے مصر میں دولت فاطمیہ کی تاسیس کی۔ ۲۳۰ھ

### بہا و جاری رہے گا

"میری امت میں بہا و قیامت تک جاری رہے گا اور نہ کسی عادل کا عدل اسے ختم کر سکے گا، نہ کسی ظالم کا ظلم۔"

یہی اسپرٹ ہمیشہ تجدید اسلام کی تحریکوں کی محرک رہی ہے، اور اسی نے صالحین کو ماحول کی خوفناکیوں کے

آگے جھک جانے سے روکا ہے۔ ۲۳۱ھ

### مسلمانوں کا بگاڑ یہود و نصاریٰ کی طرح کا ہوگا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں میں سے ایک پیشین گوئی جو حدیث میں حضور نے فرمائی ہے، یہ ہے کہ مسلمان آخر کار یہود و نصاریٰ کے نقش قدم پر چل پڑیں گے اور جہاں جہاں انہوں نے قدم رکھا ہے یہ بھی قدم رکھیں گے حتیٰ کہ اگر ان میں کسی نے اپنی ماں سے زنا کی تو مسلمانوں میں بھی کوئی شخص اٹھے گا جو اس فعل کا ارتکاب کرے گا۔ ۲۳۲ھ

یہ ناضل مؤرخ نے حضور کے ارشاد کو ایک دوسری روایت سے اخذ کر کے یوں ذکر کیا ہے:

"آپ نے فرمایا ہے کہ تم بھی آخر کار کھلی آنتوں ہی کی روش پر چل کر رہو گے حتیٰ کہ اگر وہ کسی گورہ کے بیٹے میں تو تم



## ہمت کی تاریخ یا بعد کا خاکہ

اگرچہ یہ پیشین گوئیاں مسلم، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک وغیرہ کتابوں میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں مگر یہاں اس روایت کا نقل کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا جو امام شافعی نے موافقات میں اور مولانا اسماعیل شہید نے منسب ہمت میں نقل کی ہے:

”تمہارے دین کی ابتداء نبوت اور رحمت سے ہے اور وہ تمہارے درمیان رہے گی جیت تک اللہ جل جلالہ پھر اللہ جل جلالہ اس کو اٹھالے گا پھر نبوت کے طریقہ پر نکلتا ہمت ہوگی جیت تک اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا۔ پھر بادشاہی ہوگی اور جیت تک اللہ چاہے گا رہے گی پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا۔“

پھر صبر کی فرمائروائی ہوگی اور وہ بھی جیت تک اللہ چاہے گا رہے گی۔ پھر اللہ اسے بھی اٹھالے گا۔

پھر وہی خلافت بلاقبلی نبوت ہوگی جو لوگوں کے درمیان نبی کی سنت کے مطابق عمل کرنے کی اور اسلام زمین میں پائوں جہاتے گا۔ اس حکومت سے آسمان والے بھی خوش ہونگے اور زمین والے بھی۔ آسمان والے کہوں کر انبی پرکتوں کی بارش کرے گا اور زمین

ان اول دینکم نبوة ورحمة و تکون فیکم ما شاء الله ان تکون ثم یدفعها الله جل جلاله ثم تکون خلافة علی صہاج النبوة ما شاء الله ان تکون ثم یدفعها الله جل جلاله ثم تکون ملکا عاضا فیکون ما شاء الله ان یکون ثم یدفعه الله جل جلاله۔ ثم تکون ملکا جہویة فتکون ما شاء الله ان تکون ثم یدفعها الله جل جلاله۔

ثم تکون خلافة علی صہاج النبوة تعمل فی الناس بسنته الذی ویبقی الاسلام بجزانہ فی الارض بیوضی عنہا ساکن السماء وساکن الارض لا تدع السماء من قعر الا صیبتہ مداداً ولا

۳۲ بھی اسی میں گھسورگے صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا یہود و نصاریٰ مراد ہیں؟ آپ نے فرمایا اور کون؟

نبی اکرم کا یہ ارشاد محض ایک تاریخ نہ تھا بلکہ اللہ کی ہی ہوتی بصیرت سے آپ یہ جانتے تھے کہ انبیاء کی امتوں میں لگا کر کن کن راستوں سے آیا اور کن کن شکلوں میں ظہور کرتا رہا ہے۔

۳۳  
۳۴  
۳۵  
۳۶  
۳۷  
۳۸  
۳۹  
۴۰  
۴۱  
۴۲  
۴۳  
۴۴  
۴۵  
۴۶  
۴۷  
۴۸  
۴۹  
۵۰  
۵۱  
۵۲  
۵۳  
۵۴  
۵۵  
۵۶  
۵۷  
۵۸  
۵۹  
۶۰  
۶۱  
۶۲  
۶۳  
۶۴  
۶۵  
۶۶  
۶۷  
۶۸  
۶۹  
۷۰  
۷۱  
۷۲  
۷۳  
۷۴  
۷۵  
۷۶  
۷۷  
۷۸  
۷۹  
۸۰  
۸۱  
۸۲  
۸۳  
۸۴  
۸۵  
۸۶  
۸۷  
۸۸  
۸۹  
۹۰  
۹۱  
۹۲  
۹۳  
۹۴  
۹۵  
۹۶  
۹۷  
۹۸  
۹۹  
۱۰۰  
۱۰۱  
۱۰۲  
۱۰۳  
۱۰۴  
۱۰۵  
۱۰۶  
۱۰۷  
۱۰۸  
۱۰۹  
۱۱۰  
۱۱۱  
۱۱۲  
۱۱۳  
۱۱۴  
۱۱۵  
۱۱۶  
۱۱۷  
۱۱۸  
۱۱۹  
۱۲۰  
۱۲۱  
۱۲۲  
۱۲۳  
۱۲۴  
۱۲۵  
۱۲۶  
۱۲۷  
۱۲۸  
۱۲۹  
۱۳۰  
۱۳۱  
۱۳۲  
۱۳۳  
۱۳۴  
۱۳۵  
۱۳۶  
۱۳۷  
۱۳۸  
۱۳۹  
۱۴۰  
۱۴۱  
۱۴۲  
۱۴۳  
۱۴۴  
۱۴۵  
۱۴۶  
۱۴۷  
۱۴۸  
۱۴۹  
۱۵۰  
۱۵۱  
۱۵۲  
۱۵۳  
۱۵۴  
۱۵۵  
۱۵۶  
۱۵۷  
۱۵۸  
۱۵۹  
۱۶۰  
۱۶۱  
۱۶۲  
۱۶۳  
۱۶۴  
۱۶۵  
۱۶۶  
۱۶۷  
۱۶۸  
۱۶۹  
۱۷۰  
۱۷۱  
۱۷۲  
۱۷۳  
۱۷۴  
۱۷۵  
۱۷۶  
۱۷۷  
۱۷۸  
۱۷۹  
۱۸۰  
۱۸۱  
۱۸۲  
۱۸۳  
۱۸۴  
۱۸۵  
۱۸۶  
۱۸۷  
۱۸۸  
۱۸۹  
۱۹۰  
۱۹۱  
۱۹۲  
۱۹۳  
۱۹۴  
۱۹۵  
۱۹۶  
۱۹۷  
۱۹۸  
۱۹۹  
۲۰۰  
۲۰۱  
۲۰۲  
۲۰۳  
۲۰۴  
۲۰۵  
۲۰۶  
۲۰۷  
۲۰۸  
۲۰۹  
۲۱۰  
۲۱۱  
۲۱۲  
۲۱۳  
۲۱۴  
۲۱۵  
۲۱۶  
۲۱۷  
۲۱۸  
۲۱۹  
۲۲۰  
۲۲۱  
۲۲۲  
۲۲۳  
۲۲۴  
۲۲۵  
۲۲۶  
۲۲۷  
۲۲۸  
۲۲۹  
۲۳۰  
۲۳۱  
۲۳۲  
۲۳۳  
۲۳۴  
۲۳۵  
۲۳۶  
۲۳۷  
۲۳۸  
۲۳۹  
۲۴۰  
۲۴۱  
۲۴۲  
۲۴۳  
۲۴۴  
۲۴۵  
۲۴۶  
۲۴۷  
۲۴۸  
۲۴۹  
۲۵۰  
۲۵۱  
۲۵۲  
۲۵۳  
۲۵۴  
۲۵۵  
۲۵۶  
۲۵۷  
۲۵۸  
۲۵۹  
۲۶۰  
۲۶۱  
۲۶۲  
۲۶۳  
۲۶۴  
۲۶۵  
۲۶۶  
۲۶۷  
۲۶۸  
۲۶۹  
۲۷۰  
۲۷۱  
۲۷۲  
۲۷۳  
۲۷۴  
۲۷۵  
۲۷۶  
۲۷۷  
۲۷۸  
۲۷۹  
۲۸۰  
۲۸۱  
۲۸۲  
۲۸۳  
۲۸۴  
۲۸۵  
۲۸۶  
۲۸۷  
۲۸۸  
۲۸۹  
۲۹۰  
۲۹۱  
۲۹۲  
۲۹۳  
۲۹۴  
۲۹۵  
۲۹۶  
۲۹۷  
۲۹۸  
۲۹۹  
۳۰۰  
۳۰۱  
۳۰۲  
۳۰۳  
۳۰۴  
۳۰۵  
۳۰۶  
۳۰۷  
۳۰۸  
۳۰۹  
۳۱۰  
۳۱۱  
۳۱۲  
۳۱۳  
۳۱۴  
۳۱۵  
۳۱۶  
۳۱۷  
۳۱۸  
۳۱۹  
۳۲۰  
۳۲۱  
۳۲۲  
۳۲۳  
۳۲۴  
۳۲۵  
۳۲۶  
۳۲۷  
۳۲۸  
۳۲۹  
۳۳۰  
۳۳۱  
۳۳۲  
۳۳۳  
۳۳۴  
۳۳۵  
۳۳۶  
۳۳۷  
۳۳۸  
۳۳۹  
۳۴۰  
۳۴۱  
۳۴۲  
۳۴۳  
۳۴۴  
۳۴۵  
۳۴۶  
۳۴۷  
۳۴۸  
۳۴۹  
۳۵۰  
۳۵۱  
۳۵۲  
۳۵۳  
۳۵۴  
۳۵۵  
۳۵۶  
۳۵۷  
۳۵۸  
۳۵۹  
۳۶۰  
۳۶۱  
۳۶۲  
۳۶۳  
۳۶۴  
۳۶۵  
۳۶۶  
۳۶۷  
۳۶۸  
۳۶۹  
۳۷۰  
۳۷۱  
۳۷۲  
۳۷۳  
۳۷۴  
۳۷۵  
۳۷۶  
۳۷۷  
۳۷۸  
۳۷۹  
۳۸۰  
۳۸۱  
۳۸۲  
۳۸۳  
۳۸۴  
۳۸۵  
۳۸۶  
۳۸۷  
۳۸۸  
۳۸۹  
۳۹۰  
۳۹۱  
۳۹۲  
۳۹۳  
۳۹۴  
۳۹۵  
۳۹۶  
۳۹۷  
۳۹۸  
۳۹۹  
۴۰۰  
۴۰۱  
۴۰۲  
۴۰۳  
۴۰۴  
۴۰۵  
۴۰۶  
۴۰۷  
۴۰۸  
۴۰۹  
۴۱۰  
۴۱۱  
۴۱۲  
۴۱۳  
۴۱۴  
۴۱۵  
۴۱۶  
۴۱۷  
۴۱۸  
۴۱۹  
۴۲۰  
۴۲۱  
۴۲۲  
۴۲۳  
۴۲۴  
۴۲۵  
۴۲۶  
۴۲۷  
۴۲۸  
۴۲۹  
۴۳۰  
۴۳۱  
۴۳۲  
۴۳۳  
۴۳۴  
۴۳۵  
۴۳۶  
۴۳۷  
۴۳۸  
۴۳۹  
۴۴۰  
۴۴۱  
۴۴۲  
۴۴۳  
۴۴۴  
۴۴۵  
۴۴۶  
۴۴۷  
۴۴۸  
۴۴۹  
۴۵۰  
۴۵۱  
۴۵۲  
۴۵۳  
۴۵۴  
۴۵۵  
۴۵۶  
۴۵۷  
۴۵۸  
۴۵۹  
۴۶۰  
۴۶۱  
۴۶۲  
۴۶۳  
۴۶۴  
۴۶۵  
۴۶۶  
۴۶۷  
۴۶۸  
۴۶۹  
۴۷۰  
۴۷۱  
۴۷۲  
۴۷۳  
۴۷۴  
۴۷۵  
۴۷۶  
۴۷۷  
۴۷۸  
۴۷۹  
۴۸۰  
۴۸۱  
۴۸۲  
۴۸۳  
۴۸۴  
۴۸۵  
۴۸۶  
۴۸۷  
۴۸۸  
۴۸۹  
۴۹۰  
۴۹۱  
۴۹۲  
۴۹۳  
۴۹۴  
۴۹۵  
۴۹۶  
۴۹۷  
۴۹۸  
۴۹۹  
۵۰۰  
۵۰۱  
۵۰۲  
۵۰۳  
۵۰۴  
۵۰۵  
۵۰۶  
۵۰۷  
۵۰۸  
۵۰۹  
۵۱۰  
۵۱۱  
۵۱۲  
۵۱۳  
۵۱۴  
۵۱۵  
۵۱۶  
۵۱۷  
۵۱۸  
۵۱۹  
۵۲۰  
۵۲۱  
۵۲۲  
۵۲۳  
۵۲۴  
۵۲۵  
۵۲۶  
۵۲۷  
۵۲۸  
۵۲۹  
۵۳۰  
۵۳۱  
۵۳۲  
۵۳۳  
۵۳۴  
۵۳۵  
۵۳۶  
۵۳۷  
۵۳۸  
۵۳۹  
۵۴۰  
۵۴۱  
۵۴۲  
۵۴۳  
۵۴۴  
۵۴۵  
۵۴۶  
۵۴۷  
۵۴۸  
۵۴۹  
۵۵۰  
۵۵۱  
۵۵۲  
۵۵۳  
۵۵۴  
۵۵۵  
۵۵۶  
۵۵۷  
۵۵۸  
۵۵۹  
۵۶۰  
۵۶۱  
۵۶۲  
۵۶۳  
۵۶۴  
۵۶۵  
۵۶۶  
۵۶۷  
۵۶۸  
۵۶۹  
۵۷۰  
۵۷۱  
۵۷۲  
۵۷۳  
۵۷۴  
۵۷۵  
۵۷۶  
۵۷۷  
۵۷۸  
۵۷۹  
۵۸۰  
۵۸۱  
۵۸۲  
۵۸۳  
۵۸۴  
۵۸۵  
۵۸۶  
۵۸۷  
۵۸۸  
۵۸۹  
۵۹۰  
۵۹۱  
۵۹۲  
۵۹۳  
۵۹۴  
۵۹۵  
۵۹۶  
۵۹۷  
۵۹۸  
۵۹۹  
۶۰۰  
۶۰۱  
۶۰۲  
۶۰۳  
۶۰۴  
۶۰۵  
۶۰۶  
۶۰۷  
۶۰۸  
۶۰۹  
۶۱۰  
۶۱۱  
۶۱۲  
۶۱۳  
۶۱۴  
۶۱۵  
۶۱۶  
۶۱۷  
۶۱۸  
۶۱۹  
۶۲۰  
۶۲۱  
۶۲۲  
۶۲۳  
۶۲۴  
۶۲۵  
۶۲۶  
۶۲۷  
۶۲۸  
۶۲۹  
۶۳۰  
۶۳۱  
۶۳۲  
۶۳۳  
۶۳۴  
۶۳۵  
۶۳۶  
۶۳۷  
۶۳۸  
۶۳۹  
۶۴۰  
۶۴۱  
۶۴۲  
۶۴۳  
۶۴۴  
۶۴۵  
۶۴۶  
۶۴۷  
۶۴۸  
۶۴۹  
۶۵۰  
۶۵۱  
۶۵۲  
۶۵۳  
۶۵۴  
۶۵۵  
۶۵۶  
۶۵۷  
۶۵۸  
۶۵۹  
۶۶۰  
۶۶۱  
۶۶۲  
۶۶۳  
۶۶۴  
۶۶۵  
۶۶۶  
۶۶۷  
۶۶۸  
۶۶۹  
۶۷۰  
۶۷۱  
۶۷۲  
۶۷۳  
۶۷۴  
۶۷۵  
۶۷۶  
۶۷۷  
۶۷۸  
۶۷۹  
۶۸۰  
۶۸۱  
۶۸۲  
۶۸۳  
۶۸۴  
۶۸۵  
۶۸۶  
۶۸۷  
۶۸۸  
۶۸۹  
۶۹۰  
۶۹۱  
۶۹۲  
۶۹۳  
۶۹۴  
۶۹۵  
۶۹۶  
۶۹۷  
۶۹۸  
۶۹۹  
۷۰۰  
۷۰۱  
۷۰۲  
۷۰۳  
۷۰۴  
۷۰۵  
۷۰۶  
۷۰۷  
۷۰۸  
۷۰۹  
۷۱۰  
۷۱۱  
۷۱۲  
۷۱۳  
۷۱۴  
۷۱۵  
۷۱۶  
۷۱۷  
۷۱۸  
۷۱۹  
۷۲۰  
۷۲۱  
۷۲۲  
۷۲۳  
۷۲۴  
۷۲۵  
۷۲۶  
۷۲۷  
۷۲۸  
۷۲۹  
۷۳۰  
۷۳۱  
۷۳۲  
۷۳۳  
۷۳۴  
۷۳۵  
۷۳۶  
۷۳۷  
۷۳۸  
۷۳۹  
۷۴۰  
۷۴۱  
۷۴۲  
۷۴۳  
۷۴۴  
۷۴۵  
۷۴۶  
۷۴۷  
۷۴۸  
۷۴۹  
۷۵۰  
۷۵۱  
۷۵۲  
۷۵۳  
۷۵۴  
۷۵۵  
۷۵۶  
۷۵۷  
۷۵۸  
۷۵۹  
۷۶۰  
۷۶۱  
۷۶۲  
۷۶۳  
۷۶۴  
۷۶۵  
۷۶۶  
۷۶۷  
۷۶۸  
۷۶۹  
۷۷۰  
۷۷۱  
۷۷۲  
۷۷۳  
۷۷۴  
۷۷۵  
۷۷۶  
۷۷۷  
۷۷۸  
۷۷۹  
۷۸۰  
۷۸۱  
۷۸۲  
۷۸۳  
۷۸۴  
۷۸۵  
۷۸۶  
۷۸۷  
۷۸۸  
۷۸۹  
۷۹۰  
۷۹۱  
۷۹۲  
۷۹۳  
۷۹۴  
۷۹۵  
۷۹۶  
۷۹۷  
۷۹۸  
۷۹۹  
۸۰۰  
۸۰۱  
۸۰۲  
۸۰۳  
۸۰۴  
۸۰۵  
۸۰۶  
۸۰۷  
۸۰۸  
۸۰۹  
۸۱۰  
۸۱۱  
۸۱۲  
۸۱۳  
۸۱۴  
۸۱۵  
۸۱۶  
۸۱۷  
۸۱۸  
۸۱۹  
۸۲۰  
۸۲۱  
۸۲۲  
۸۲۳  
۸۲۴  
۸۲۵  
۸۲۶  
۸۲۷  
۸۲۸  
۸۲۹  
۸۳۰  
۸۳۱  
۸۳۲  
۸۳۳  
۸۳۴  
۸۳۵  
۸۳۶  
۸۳۷  
۸۳۸  
۸۳۹  
۸۴۰  
۸۴۱  
۸۴۲  
۸۴۳  
۸۴۴  
۸۴۵  
۸۴۶  
۸۴۷  
۸۴۸  
۸۴۹  
۸۵۰  
۸۵۱  
۸۵۲  
۸۵۳  
۸۵۴  
۸۵۵  
۸۵۶  
۸۵۷  
۸۵۸  
۸۵۹  
۸۶۰  
۸۶۱  
۸۶۲  
۸۶۳  
۸۶۴  
۸۶۵  
۸۶۶  
۸۶۷  
۸۶۸  
۸۶۹  
۸۷۰  
۸۷۱  
۸۷۲  
۸۷۳  
۸۷۴  
۸۷۵  
۸۷۶  
۸۷۷  
۸۷۸  
۸۷۹  
۸۸۰  
۸۸۱  
۸۸۲  
۸۸۳  
۸۸۴  
۸۸۵  
۸۸۶  
۸۸۷  
۸۸۸  
۸۸۹  
۸۹۰  
۸۹۱  
۸۹۲  
۸۹۳  
۸۹۴  
۸۹۵  
۸۹۶  
۸۹۷  
۸۹۸  
۸۹۹  
۹۰۰  
۹۰۱  
۹۰۲  
۹۰۳  
۹۰۴  
۹۰۵  
۹۰۶  
۹۰۷  
۹۰۸  
۹۰۹  
۹۱۰  
۹۱۱  
۹۱۲  
۹۱۳  
۹۱۴  
۹۱۵  
۹۱۶  
۹۱۷  
۹۱۸  
۹۱۹  
۹۲۰  
۹۲۱  
۹۲۲  
۹۲۳  
۹۲۴  
۹۲۵  
۹۲۶  
۹۲۷  
۹۲۸  
۹۲۹  
۹۳۰  
۹۳۱  
۹۳۲  
۹۳۳  
۹۳۴  
۹۳۵  
۹۳۶  
۹۳۷  
۹۳۸  
۹۳۹  
۹۴۰  
۹۴۱  
۹۴۲  
۹۴۳  
۹۴۴  
۹۴۵  
۹۴۶  
۹۴۷  
۹۴۸  
۹۴۹  
۹۵۰  
۹۵۱  
۹۵۲  
۹۵۳  
۹۵۴  
۹۵۵  
۹۵۶  
۹۵۷  
۹۵۸  
۹۵۹  
۹۶۰  
۹۶۱  
۹۶۲  
۹۶۳  
۹۶۴  
۹۶۵  
۹۶۶  
۹۶۷  
۹۶۸  
۹۶۹  
۹۷۰  
۹۷۱  
۹۷۲  
۹۷۳  
۹۷۴  
۹۷۵  
۹۷۶  
۹۷۷  
۹۷۸  
۹۷۹  
۹۸۰  
۹۸۱  
۹۸۲  
۹۸۳  
۹۸۴  
۹۸۵  
۹۸۶  
۹۸۷  
۹۸۸  
۹۸۹  
۹۹۰  
۹۹۱  
۹۹۲  
۹۹۳  
۹۹۴  
۹۹۵  
۹۹۶  
۹۹۷  
۹۹۸  
۹۹۹  
۱۰۰۰

تہم الامراض من مياتھا و بوجانھا شيئاً اپنے پیٹ کے سارے ترانے اگل سٹے گی :-

الا اخرجتہ -

میں نہیں کہہ سکتا کہ استاد کے اعتبار سے اس روایت کا کیا مرتبہ ہے مگر معنی یہ ان تمام روایات سے مطابقت رکھتی ہے جو اس معنی میں وارد ہوئی ہیں۔ اس میں تاریخ کے پانچ مسئلوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن میں سے تین گزر چکے ہیں اور جو تھا اب گزر رہا ہے۔ آخر میں جس پانچویں مرحلہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ تمام قرآن بتا رہے ہیں کہ انسانی تاریخ تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انسانی ساخت کے سارے ازم "آزمائے جاچکے ہیں اور تیری طرح ناکام ہوتے ہیں۔ آدمی کے لیے اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تھک جا کر اسلام کی طرف رجوع کرے۔

أمرار و حکام کا بگاڑ

"میرے بعد کچھ لوگ نگران ہونے والے ہیں جو ان کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کا مدد کرے، وہ مجھ سے نہیں اور میں اُس سے نہیں۔" "منقریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہوں گے جن کے ہاتھ میں تمہاری روزی ہوگی۔ وہ تم سے بات کریں گے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو بڑے کام کریں گے۔ وہ تم سے اُس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی بُرائیوں کی تعریفیہ اور ان کے جھوٹ کی تعسفیہ نہ کرو پس تم ان کے سامنے حق پیش کر دو جب تک وہ اسے گوارا کریں۔ پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔"

أنتد متكون بعدى امرار من صدقتم  
يكد بهمرو اعانهم على ظلمهم فليس منى  
ولست جنه رسائى كتاب البعير بارى  
سيكون عليكم امة يلكون اذوا قلم  
يخذونكم فيكذبونكم ويعملون فيسيئون  
العمل لا يرضون متكم حتى لا تحببوا  
قبليهم وتسدوا قلوبهم فاعطوهم  
المعنى ما ركنوا يد فاذا اتجاؤا فمن قتل  
على ذلك فهو شهيد -

دکتر انعام، ج ۶، ص ۲۲۷

سلسلہ تجدید دین

شرع حدیث من یتجدد لہا دیننا

یہی وہ چیز ہے جس کی خبر خیر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُس حدیث میں دی ہے جو ابو داؤد میں تفرق

البربریہ سے مروی ہے کہ :

اللہ ہر مسدی کے سر پر اس اُمت کے لیے ایسے لوگ اگلاتا ہے گا جو اس کے لیے دین کو زندہ کریں گے۔

إن اللہ بیعت لہذا بالامۃ علی راس کل مائة سنة من یتجدد لہا دینہا۔

مگر اس حدیث سے بعض لوگوں نے تجدید اور تجدیدین کا بالکل ہی ایک غلط تصور اخذ کر لیا۔ انہوں نے علیؑ راؤس نکلی جانتے سے صدی کا آغاز یا اختتام مراد سے لیا اور ہن شیخوۃ فہما کا مطلب یہ سمجھا کہ اس سے مراد لازماً کوئی ایک شخص ہے۔ اس بنا پر انہوں نے تلاش کرنا شروع کر دیا کہ اسلام کی کھپلی تاریخوں میں کون کون ایسے اشخاص ملنے ہیں جو ایک ایک صدی کے آغاز یا اختتام پر پیدا ہوئے یا مرے ہوں اور انہوں نے تجدید کا کام بھی کیا ہو۔

حالانکہ نہ راؤس سے مراد ملت اور نہ من کا مفہوم فرد و احد تک محدود ہے۔ راؤس کے معنی سر کے ہیں اور صدی کے سر پر کسی شخص کے اٹھانے کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے علوم، افکار اور رفتار عمل پر نمایاں اثر ڈالے گا۔ اور من کا لفظ عربی زبان میں واحد جمع دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لیے من سے مراد ایک شخص بھی ہو سکتا ہے، بہت سے اشخاص بھی ہو سکتے ہیں، اور پورے پورے ادارے اور گروہ بھی ہو سکتے ہیں۔ حضورؐ نے جو خبر دی ہے اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ انشاء اللہ اسلامی تاریخ کی کوئی صدی ایسے لوگوں سے خالی نہ گزرے گی جو طوفانِ جاہلیت کے مقابلے میں اٹھیں گے اور اسلام کو اس کی اصلی زوج اور صورت میں از سر نو قائم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

ضروری نہیں کہ ایک صدی کا مجدد ایک ہی شخص ہو۔ ایک صدی میں متعدد اشخاص اور گروہ یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام دنیا سے اسلام کے لیے ایک ہی مجدد ہو۔ ایک وقت میں بہت سے ملکوں میں بہت سے آدمی تجدید دین کے لیے سعی کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ شخص جو اس سلسلے کی کوئی خدمت انجام دے "مجدد" کے خطاب سے نوازا جائے یہ خطاب تو صرف ایسے اشخاص ہی کو دیا جا سکتا ہے جنہوں نے تجدید دین کے لیے کوئی بہت بڑا اور نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو۔

مسلمانوں میں تفرقہ کا ظہور

ایک حدیث میں ہے کہ عنقریب میری امت ۲۰ فرقوں میں بٹ جائے گی جن میں سے صرف ایک ناجی ہوگا، وہ جو میری اور میرے اصحاب کی پیروی کرے گا۔

احادیث میں مسلمانوں کے اندر بہت سے فرقے پیدا ہونے کی خبر دی گئی ہے جس سے مقصود اہل ایمان کو تشویر پر مشتمل کرنا، اور ان سے بچنے کے لیے تاکید کرنا تھا۔

## ظہورِ قہدی کے متعلق پیشین گوئیاں

ظہورِ قہدی کے متعلق جو روایات ہیں، ان کے متعلق ناقدین حدیث نے اس قدر سخت تنقید کی ہے کہ ایک گروہ سرے سے اس بات کا قائل ہی نہیں رہا ہے کہ امام قہدی کا ظہور ہوگا۔ انشاء اللہ اہل ایمان کی تنقید سے بھی محذور ہوا ہے کہ ان احادیث کے اکثر زعماء شیعہ ہیں تاریخ سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ برگروہ نے سیاسی و مذہبی اغراض کے لیے ان احادیث کو استعمال کیا ہے، اور انہیں کسی آدمی پر ان مندرجہ علامات کو حیاں کرنے کی کوشش کی ہے۔

## روایات میں صحیح اور وضعی مختصر

ان وجہ سے ہیں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ نفس ظہورِ ہندی کی خبر کی حد تک تو یہ روایات صحیح ہیں لیکن تفصیل علامات کا بیشتر بیان غالباً وضعی ہے، اور اہلِ غرض نے شاید بعد میں ان چیزوں کا اصل ارشادِ نبوی پر اضا نہ کیا ہے۔ مختلف زمانوں میں جن لوگوں نے ہندی مورخوں کو دیکھے وہ اس کے بھونٹے دوسے کیسے ہیں ان کے لٹریچر میں بھی آپ دیکھیں گے کہ ان کی ساری تفسیر پر داری کے لیے مواد انہی روایات سے ہی ہم پہنچا ہے۔

### حضور کی پیشین گوئیوں کا انداز

میں نے جہاں تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں پر غور کیا ہے۔ ان کا انداز یہ نہیں ہوتا کہ کسی آنے والی چیز کی علامات و تفصیلات اس طریقے سے کبھی آپ نے بیان کی ہوں جس طرح ظہورِ ہندی کی امارت میں پائی جاتی ہیں۔ آپ بڑی بڑی اسٹوری علامت تو ضرور بیان فرما دیا کرتے تھے لیکن جزئی تفصیلات بیان کرنا آپ کا طریقہ نہ تھا۔ ۲۳۹

### متعلقہ روایات کی تولیدگی

لیکن جو لوگ ان روایات کو جمع کر کے ان کا باہمی مقابلہ کرتے ہیں اور ان میں بکثرت تعارضات پاتے ہیں، نیز ان کے سامنے نبیِ فاطمہ اور سنی عباس اور سنی اہمیت کی کشمکش کی پوری تاریخ ہے، اور وہ صریح طور پر دیکھتے ہیں کہ اس کشمکش کے فرقیوں میں سے ہر ایک کے حق میں متعدد روایات موجود ہیں، اور راویوں میں سے بھی اکثر وہ بیشتر وہ لوگ ہیں جن کا ایک نہ ایک فریق سے کھلا ہوا تعلق تھا، ان کے لیے یہ بہت مشکل ہے کہ ان روایات کی ساری تفصیلات کو صحیح تسلیم کر لیں جو احادیث میں منقول ہیں۔ مثلاً ان میں سے بعض میں روایات السوڈ

لہ اول تو خود لفظ "ہندی" پر غور کرنا چاہیے جو حدیث میں استعمال کیا گیا ہے۔ حضور نے ہندی کا لفظ استعمال فرمایا ہے جس کے معنی ہدایت یا نکتہ کے ہیں "ہندی" کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ ہندی ہر وہ سردار، لیڈر اور امیر ہو سکتا ہے جو راہِ راست پر ہو۔ "الہندی" زیادہ سے زیادہ خصوصیت کے لیے استعمال ہوگا جس سے آنے والے کسی خاص امتیازی نشان کا اظہار مقصود ہے اور وہ امتیازی نشان حدیث میں اس طرح بیان کر دی گئی ہے کہ آنے والا خلافتِ علیٰ سہابج النبوة کا نظام درم بریم ہو جائے اور ظلم و جور سے زمین کے پھر جانے کے بعد از سر نو خلافت کو سہابج نبوت پر قائم کر لگا اور زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ بس یہی چیز ہے جس کی وجہ سے اس کو خمس و نماز کو نئے کے لیے "ہندی" پر ال داخل کیا گیا ہے لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ ہندی کے نام سے زمین کوئی خاص خاتم کیا گیا ہے جس پر ایمان لانا اور جس کی معرفت حاصل کرنا ویسا ہی ضروری ہو جیسا انبیاء پر ایمان لانا، اور اس کی اطاعت بھی شرط نجات اور شرطِ اسلام و ایمان ہو۔ نیز اس خیال کے لیے بھی حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہندی کوئی نامِ معصوم ہوگا جو اصل پر حضور سے غیر امتیاز کا نتیجہ ایک نام سے کسی شخص سے جس کی کوئی سند کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔ ۲۴۰

یعنی کالے جھنڈوں کا ذکر ہے، اور تاریخ سے معلوم ہے کہ کالے جھنڈے بنی عباس کا شعار تھے نیز یہ بھی تاریخ سے معلوم ہے کہ اس قسم کی احادیث کو پیش کر کے غلیف مہدی عباسی کو مہدی موعود ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

## تجدیدِ کامل کا مقام

تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی تجدیدِ کامل پیدا نہیں ہوئی ہے۔ قریب تھا کہ عمر بن عبد العزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے، مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد یقیناً تجدید پیدا ہوتے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ تجدیدِ کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے، اور دنیا کے حالات کی رفتار متعاضی سے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو، خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام الامام المہدی ہوگا جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔

آج کل لوگ نادانی کی وجہ سے اس نام کو شن کرناک بھجوں چڑھاتے ہیں۔ ان کو شکایت ہے کہ کسی آنے والے مردِ کامل کے انتظار نے جاہل مسلمانوں کے قواستے عمل کو سرد کر دیا ہے، اس لیے ان کی راستے یہ ہے کہ جس حقیقت کا غلط مفہوم لے کر جاہل لوگ بے عمل ہو جاتیں وہ سرے سے حقیقت ہی نہ ہونی چاہیے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ تمام مذہبی قوموں میں کسی "مرد سے از غیب" کی آمد کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ لہذا یہ محض ایک وہم ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح پھیلے انبیاء سے بھی اگر اپنی قوموں کو یہ خوش خبری دی ہو کہ نیا انسان کی ذہنی زندگی ختم ہونے سے پہلے ایک دفعہ اسلام ماری دنیا کا وہی سینے گا اور انسان کے بنائے ہوئے سارے "ازموں" کی ناکامی کے بعد آخر کار تباہیوں کا مارا ہوا انسان اس "ازم" کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوگا جسے خدا نے بنایا ہے، اور یہ نعمت انسان کو ایک ایسے عظیم اقتان لیڈر کی بدولت نصیب ہوگی جو انبیاء کے طریقہ پر کام کر کے اسلام کو اس کی صحیح صورت میں پوری طرح نافذ کر دے گا، تو آخر اس میں وہم کی کون سی بات ہے؟ بہت ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے کلام سے نکل کر یہ چیز دنیا کی دوسری قوموں میں بھی پھیلی ہو اور حیات نے اس کی روح نکال کر اہم کے بناو سے اس کے گر و پیٹ دیتے ہوں

## مہدی کے متعلق مروجہ تصور

مسلمانوں میں جو لوگ الامام المہدی کی آمد کے قائل ہیں وہ بھی ان تجدیدین سے جو اس کے قائل نہیں ہیں، اپنی غلط فہمیوں میں کچھ نیچے نہیں ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع و قطع کے آدمی ہوں گے۔ تبیح ہاتھ میں لیے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے سے برآمد ہوں گے۔ آتے ہی انا المہدی

اعلان کریں گے۔ علماء اور شایخ کتابیں لے کر آئیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی ساخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انہیں شناخت کر لیں گے، پھر سمیٹ ہوگی اور اعلان جہاد کر دیا جائے گا چلے کھینچے ہوئے درویش اور سب پڑانے طرز کے "بقیۃ السلف" ان کے جھنڈے تلے جمع ہوں گے۔ تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لیے برائے نام چلائی پڑے گی، اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تقرب سے ہوگا۔ چھوٹوں اور ذلیلوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے جس کا فریضہ پورا کریں گے ٹرپ کر لے ہوش ہو جائے گا اور محض بددعا کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیتھرس پڑ جائیں گے۔

**ہندی کے متعلق مولیت کا اندازہ**

عقیدہ ظہور ہندی کے متعلق نام لوگوں کے تصورات کچھ اسی قسم کے ہیں۔ مگر میں جو کچھ سمجھا ہوں اس سے بھرپور معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ آف والا اپنے زمانہ میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علم و تجربہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل پر وہ خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی ریاست سیاسی تدبیر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سنگہ جادے گا اور اپنے جہد کے تمام عہدوں سے بڑھ کر جدید ثابت ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی "جذباتوں" کے خلاف مولوی اور شومنی صاحبان ہی سب سے پہلے شور مچیں برپا کریں گے پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا کہ اس کی علامتوں سے اس کو ناٹ لیا جائے، نیز میں یہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ اپنے ہندی ہونے کا اعلان کرے گا۔ بلکہ شاید اسے خود بھی اپنے ہندی موعود ہونے کی خبر ہوگی اور اس کی موت کے بعد اس کے کارناموں سے دنیا کو معلوم ہوگا کہ یہی تھا وہ خلافت کو منہاج النبوة پر قائم کرنے والا جس کی آمد کا مقررہ سنایا گیا تھا۔

### عہدویت و دعویٰ کرنے کی چیز نہیں

جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، نبی کے سوا کسی کا یہ منصب نہیں ہے کہ دوسرے سے کام کا آغاز کرے اور نہ نبی کے سوا کسی کو قضیاتی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس خدمت پر مامور ہوا ہے۔ عہدویت و دعویٰ کرنے کی چیز نہیں، کر کے دکھانے کی چیز ہے۔ اس قسم کے دعوے جو لوگ کرتے ہیں اور جو ان پر ایمان لاتے ہیں، میرے نزدیک دونوں اپنے علم کی کمی اور ذہن کی پستی کا ثبوت دیتے ہیں۔

### ہندی کے کام کی نوعیت

ہندی کے کام کی نوعیت کا جو تصور میرے ذہن میں ہے وہ بھی ان حضرات کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ مجھے اس کا مفہوم کراہت، ذوات، کثرت و الہامات، اور پتوں اور تجاہدوں کی کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انقلابی لیڈر کو دنیا میں جس طرح شدید جدوجہد اور کشمکش کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے انہی مرحلوں سے ہندی کو بھی گزرنا ہوگا۔ وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہب نکلا

( School of Thought )

بیدار کرے گا۔ ذہنیاتوں کو بولے گا، ایک زبردست تحریک اٹھائے گا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور سیاسی بھی، جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی، مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دیگا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی فوری رُوح کا فرمایا ہوگی اور دوسری طرف سائنٹفک ترقی اور کمال پر پہنچ جائے گی جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے "اس کی حکومت سے آسمان والے بھی راضی ہوں گے اور زمین والے بھی، آسمان دل کھول کر اپنی برکتوں کی بارش کرے گا، اور زمین اپنے پیٹ کے سارے خزانے اگل دے گی"۔

اگر یہ توقع صحیح ہے کہ ایک وقت میں اسلام تمام دُنیا کے افکار، تمدن اور سیاست پر چھا جانے والا ہے تو ایسے عظیم الشان لیڈر کی پیدائش بھی یقینی ہے جس کی ہمہ گیر و پُر زور قیادت میں یہ انقلاب رُونا ہوگا جن لوگوں کو ایسے لیڈر کے ظہور کا خیال سن کر حیرت ہوتی ہے مجھے ان کی عقل پر حیرت ہوتی ہے جب خدا کی اس خدائی میں یمن اور ہندو جیسے ائمہ ضلالت کا ظہور ہو سکتا ہے تو آخر ایک امام ہدایت ہی کا ظہور کیوں مستبعد ہو؟ ۱۹۹۷

## مسیح علیہ السلام کی آمدِ ثانی کے متعلق حضور کی پیشین گوئیاں

متعلقہ احادیث

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور آریں گے تمہارے درمیان ابن مریمؑ حاکم عادل بن کرے پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور تشریح کو ہلاک کر دیں گے اور

(۱) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذی نسى بید ۴  
لیوشکون ان ینزل فی کھ ابن مریم حکماً  
عدلاً فی کسر الصلیب و یقتل الخنزیر  
و یبغض الحزب و یضیق المسال حق لا یقبلہ

۱۔ صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہو جائے گی۔ عیسوی کی فوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ) کو صلیب پر لعنت کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا اور دنیا کی آمتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے صرف عقیدے کو لے کر خدا کی فوری شریعت رو کر دی تھی کہ شہزادہ کو مہلک کر لیا جو تمام دنیا کی شریعتوں میں حرام رہا ہے پس جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آکر وہ اعلان کر دیں گے کہ میں خدا کا بیٹا ہوں، نہیں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بناؤ عیسائی عقیدے کے ایسے سرے سے کوئی بنیادی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ میں نے تو نبی اپنے پیروؤں کے لیے سزا صاف کیا تھا اور ان کو شہادت کی پابندی سے آزاد کر دیا تھا، تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

جنگ کا خاتمہ کر دیں گے اور دوسری روایت میں حربہ کے بجائے جزیرہ کا لفظ ہے یعنی جزیرہ ختم کر دیں گے، اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا اور رعالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک نذاکے حضورؐ ایک مسجد کر لینا و نیا د ما فیہا سے بہتر ہوگا :

احد حتى تكون المسجدة الواحدة خيرا من الدنيا وما فيها (بخاری کتاب عادیث الانبیاء باب نزول عیسیٰ بن مریم وسلم، باب بیان نزول عیسیٰ - ترمذی، ابواب الفتن، باب فی نزول عیسیٰ بن مریم مرویات ابی ہریرہ)۔

(۲۲) ایک اور روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ لا تقوم الساعة حتى ينزل عيسى ابن مريم ... قیامت قائم نہ ہوگی جب تک نازل نہ ہو لیں عیسیٰ ابن مریم ... اور اس کے بعد وہی مضمون ہے جو اوپر کی حدیث میں بیان ہوا ہے (بخاری، کتاب المظالم، باب سر السلیب - ابن ماجہ، کتاب الفتن باب فتنۃ الرجال)

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیسے ہو گئے تم جبکہ تمہارے درمیان ابن مریمؑ آئیں گے اور تمہارا امام اُس وقت خود تم میں سے ہوگا :

(۳) عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال کیف اتم اذا نزل ابن مریم فیکم واما مکم منکم (بخاری، کتاب عادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ وسلم، بیان نزول عیسیٰ بن مریم، مرویات ابی ہریرہ)۔

”حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عیسیٰ ابن مریمؑ نازل ہو گئے پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور سلیب کو ٹھادیں گے اور ان کے عیسے نماز جمع کی بنائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا اور وہ حجاج ساقط کر دیں گے اور زحام کے مقام

(۴) عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ينزل عيسى ابن مریم فيقتل الخنزير ويحو الصليب ويجمع المصلوة ويعطي المال حتى لا يقبل و يهجع الخواجر وينزل الروحاء فيجمعونها او يعتمروا ويجمعونها (مسند احمد، مسند ترمذی)

سے دوسرے انظار میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت قتل کے اختلافات ختم ہو کر سب لوگ ایک امت اسلام میں شامل ہو جائیں گے اور اس طرح جنگ ہوگی اور نہ کسی پر چیز یہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر آگے عادیث نمبر ۲۱، ۲۲، ۲۳ اور ۲۴ میں ملے یعنی نماز میں حضرت عیسیٰؑ امامت نہیں کرائیں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہوگا اسی کے پیچھے وہ غناؤں پر نہیں گئے۔

تک مدینہ سے ۲۰ میل کے فاصلے پر ایک مقام۔



پر فریاد کریں گے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، باوجود  
 کو جمع کریں گے۔ راوی کو شک ہے کہ حضور نے ان  
 میں سے کونسی بات فرمائی تھی؟

ابن ہریرہ سے منقول کتاب الحج۔ باب جواز التمتع فی الحج  
 والعمرة۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے (دجال کے  
 خروج کا ذکر کرنے کے بعد حضور نے فرمایا) اس اثناء  
 میں کہ مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے  
 صفیں بانڈھ رہے ہوں گے اور نماز کے لیے کبیرا قیامت  
 کی جا چکی ہوگی کہ علی بن مرجم نازل ہو جائیں گے اور  
 نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے۔ اور اللہ کا  
 دشمن یعنی دجال، ان کو دیکھتے ہی اس طرح گھٹنے گئے گا  
 جیسے ٹک پالی میں گھٹاتا ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو  
 گرا لیا جائے گا اور اللہ اس کو ان کے ہاتھ سے قتل کرنے کا اور وہ اپنے

(۵) عن ابی ہریرۃ (بعد ذکر خروج الدجال)  
 فیہا ہم یعدون للقتال یسترون العسوف  
 اذا اقیمت الصلوۃ فیقول عیسیٰ ابن مریم  
 فاعلموا انما اعدوا اللہ یدوب کما  
 یدوب الملح فی الماء فلو ترکہ لانذاب  
 حتی یصلک وکن یقتلہ اللہ بیدۃ  
 فیرضہم وہ فی حدیثہم (مشکوٰۃ کتاب الفتن)  
 باب المہاجم بچوانہ مسلم۔

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 فرمایا میرے اور ان یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان  
 کوئی ٹھنڈی نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ اترنے والے ہیں۔ پس  
 جب تم ان کو دیکھو تو پہچان لینا، وہ ایک میانہ قد آدمی  
 ہیں۔ رنگ مائل بشرخی و سفیدی ہے، دوزر درنگ  
 کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر کے بال بے  
 ہوں گے گریبا اب ان سے پانی پینے والا ہے، حالانکہ  
 وہ بھیگے ہوئے نہ ہوں گے، وہ اسلام پر لوگوں سے  
 جنگ کریں گے، صلیب کو پاش پاش کر دیں گے۔  
 خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیرہ ختم کر دیں گے، اور اللہ

اُس کے حال ہی پر چھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گھل کر مر جائے۔ مگر اللہ اس کو ان کے ہاتھ سے قتل کرنے کا اور وہ اپنے  
 تیرے میں اُس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔  
 (۶) عن ابی ہریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم  
 قال لیس بینی و بینہ نبی (یعنی عیسیٰ) وائتہ  
 نازل فاذا را ستموہ فاعرضوہ و جمل مردوخ  
 الی الحمرۃ و المیاض بین محرتین کانت  
 رأسہ یقطر و ان لم یصبہ بلل فیقاتل  
 الناس علی الاسلام فیدقی الصلیب و  
 یقتل الخنزیر و یمنع الجزیۃ و یصل اللہ  
 فی زمانہ الملک کلھا الا الاسلام و یصلک للسیو  
 الدجال فیہ کث فی الارض الاربعم سنۃ تم  
 یتقی فیہ علی المسلمون۔ (البرقۃ)

لہذا واضح رہے کہ اس زمانے میں جن صاحب کرامت مسیح قرار دیا گیا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں نہ حج کیا اور نہ عمرہ۔  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کتاب اعلام ابی خرفی الدجال - محمد احمد مروی  
 ابو ہریرہؓ -  
 وہ پچیس سال ٹھہریں گے پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور دشمنان ان کی ناز جنازہ پڑھیں گے۔

(۷) عن جابر بن عبد اللہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم... فیقول عیسیٰ بن مریم علیہ السلام فیقول امیرہم تعال فصل فیقول لا انا بعدنکم ہلی یعنی اسماء تکرمۃ اللہ ہذا الامۃ وسلم بیات نزول عیسیٰ ابن مریم محمد احمد بسند مرویات جابر بن عبد اللہ -

حضرت جابر عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ... پھر عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ کیسے، آپ نماز پڑھائیے، مگر وہ کہیں گے کہ نہیں، تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو۔ یہ وہ اس عرثت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اس امت کو دی ہے۔

(۸) عن جابر بن عبد اللہ (فی قصۃ ابن صیار) فقال عمر بن الخطاب ان ذن لی فاقتلہ یا رسول اللہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تکون حور فکنت صابحہ، ان صاحبۃ عیسیٰ بن مریم علیہ الصلوۃ والسلام، وان لا یکن فلیس ذک ان تقتلہ یا تجلا من اهل العهد (مسکوٰۃ - کتاب الفتن باب قصۃ ابن صیار، بحوالہ شرح السنۃ لبعوی)۔

”جابر بن عبد اللہ (قصہ ابن صیار کے سلسلہ میں) روایت کرتے ہیں کہ پھر عمر بن خطاب نے عرض کیا، یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسے قتل کر دوں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (عیسیٰ) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو۔ بلکہ اسے تو عیسیٰ ابن مریم ہی قتل کریں گے۔ اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمیں اہل عہد یعنی زمینوں میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔“

(۹) عن جابر بن عبد اللہ (فی قصۃ الدجال) فاذا ہر لبعیسی بن مریم علیہ السلام فقال العلوۃ فیقال لہ تقدّم یا روح اللہ فیقولہ یتقدّم اما حکم فیصل بلکہ - فاذا صلی صلوۃ الصبح خرجوا الیہ قال فخبین یوی

”جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ دجال کا قصہ بیان کرنے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس وقت تک ایک عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام مسلمانوں کے درمیان آجائیں گے۔ پھر نماز ظہر کی ہوگی اور ان سے کہا جائے گا کہ اسے روح اللہ آگے بڑھیے، مگر وہ

یعنی تمہارا امیر خود تم ہی میں سے ہونا چاہیے۔



صلی اللہ علیہ وسلم یخرج الذجال فی اربعین  
فی بکث اربعین دلا ادری اربعین یوماً او  
اربعین شهراً اور اربعین عاماً، فیبیشا اللہ  
عیسیٰ ابن مریم کا نہ صرف ابن مسعود فی طلبہ  
فیہ لکنہ ثور نیگت اناس سیم سنین  
لیس بین اربعین عدوۃ وکلمہ وکلمہ الذجال،

علیہ وسلم نے فرمایا: ذجال میری امت میں سے ہے گا اور  
چالیس دن نہیں جاتا چالیس دن یا چالیس مہینے یا  
چالیس سال، سچے کا پھر اللہ عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا  
ان کا علیہ ٹرورہ بن مسعود و ایک صحابی اسے شاہد ہوگا  
وہ اس کا بیچا گیری گے اور اسے ہلاک کر دیں گے پھر  
ساتھ سال تک لوگ اس حالت میں رہیں گے کہ وہ  
آدمیوں کے درمیان بھی حد اوتار نہ ہوگی

(۱۲) عن حدیثہ بن ابید الغفاری قال اطلعہ  
اللیق صلی اللہ علیہ وسلم علینا ونحن  
ننذ اکر فقال ما تذکرون قالوا مذکور  
الساعة قال انما ان تقوم حتی نزل قبلها  
عشر آیات فذکر المغانق والذجال و  
الذابۃ وطلوع الشمس من مغربها و  
نزول عیسیٰ ابن مریم ویا جوج وما جوج  
وثلثۃ خسوف، خسف بالمشرق وخصف  
بالمغرب، وخصف بجزیرۃ العرب والحد  
فذلك ما یرتد عن الیمن لظہور الغمام  
الی شہرہم وکتاب الفتن والشرک الساقط  
البر واولۃ کتاب الملکم، باب الاراض الساقطہ۔

۱۲ حدیث میں ابید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی صلی  
اللہ علیہ وسلم ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم  
انہیں میں بات چیت کر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا  
بات چیت چھوڑی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا ہاں  
تیا مت کا ذکر کر رہے تھے فرمایا وہ بزرگ قائم  
نہ ہوگی جب تک اس سے پہلے دن نشانیوں ظاہر نہ  
ہو جائیں۔ پھر آپ نے وہ دن نشانیوں بتائیں:  
۱) دھواں اڑنا، ذوالی، ۳) رات بے ستاروں، ۴) شہر  
کا مغرب سے طلوع ہونا، ۵) عیسیٰ ابن مریم کا نزول  
۶) یا جوج ما جوج، ۷) آئین ٹہرے مسقط، ایک شہر  
میں ۸) اور مغرب میں ۹) قبیلہ جزیرۃ العرب  
میں، ۱۰) سب سے آخر میں ایک زبردست آگ

جو زمین سے اٹھے گی اور لوگوں کو کلمتی ہوئی عسکر کی طرف سے جائے گی

۱۳ عن ثوبان مؤلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
وسلم من التہی مسل اللہ علیہ وسلم

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ثوبان  
روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا: میری امت

سے یہ حضرت عیسا اللہ بن مریم کا اپنا قول ہے

سے زمین میں دھس جائے گا and slide



اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔

عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔۔۔ اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام فجر کی نماز کے وقت اتر آئیں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ اے روح اللہ! آپ نماز پڑھتے۔ وہ جواب دیں گے کہ اس امت کے لوگ غیبی ایک دوسرے پر امیر ہیں یہ مسلمانوں کا امیر آگے بڑھ کر نماز پڑھتے گا پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسیٰ اپنا حربہ لے کر وہاں کی طرف چلیں گے۔ وہ جب ان کو دیکھے گا تو اس طرف گھٹنے کا بیسے لپیٹے گا پھر وہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے حربے سے اس کو ہلاک کر دیں گے اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگیں گے مگر کہیں انہیں چھپنے کو جگہ نہ ملے گی حتیٰ کہ روزت پکاریں گے اے مومن، یہ کافر وہاں موجود ہے اور تیرے پکار رہے ہیں کہ اے مومن، یہ کافر وہاں موجود ہے۔

سنو بن عبد شیبہ ایک طویل حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، پھر صبح کے وقت مسلمانوں کے درمیان عیسیٰ ابن مریم آجائیں گے اور اللہ وہاں اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا ایسا کہ کبھی اور ایسے اور وہ خون کی ٹپیں پکارا نہیں گی کہ اے مومن، یہ کافر میرے پیچھے چھپا ہوا ہے، آ اور اسے قتل کر۔

عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری

(۱۶) عن عثمان بن ابی العاص قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول۔۔۔ وینزل عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام عند صلوة الفجر فیقول لہ امیرہم یا روح اللہ تقدم، صلی، تیقول ہذا الامتہ بعضهم امراء علی بعض فیتقدم امیرہم فیصلی: فاذا افضی صلوتہ اخذ عیسیٰ حربتہ فیذهب نحو الدجال فاذا براء الدجال ذاب كما ینوب الرصاص فیتم حربتہ بین شد وینتہ فیتخذ وینہزم اصحابہ لیس یومض شیعہ یواری منهم احدا حتی ان الشجر لیقول یا مومن ہذا کافر ویقول الحجر یا مومن ہذا کافر (مسند احمد - طبرانی - حاکم)۔

(۱۷) عن سمرقہ بن جندب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی حدیث طویل، فیصبح فیہم عیسیٰ ابن مریم فیہزمہ اللہ وحبوکہ حتی ان احبہم الحائط واصل الشجر لینادی یا مومن ہذا کافر لیتنونی فتعال قتله۔ (مسند احمد، حاکم)۔

(۱۸) عن عمران بن حصین عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا تزال طائفة من امتی علی الحق ظاہرین علی من نواہم



اختصار کے ساتھ آئی ہے۔ اور حافظ ابن کثیر نے فتح الباری جلد ۵ ص ۵۰ میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔ اور صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے اور بڑا بڑا گناہوں کا اور مسلمان غالب ہوں گے۔

یہ جملہ ۲۱ روایات ہیں جو صحاح میں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے علاوہ دوسری بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے لیکن طویل کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا ہے بلکہ صرف وہ روایتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

### ثبیل مسیح کا تصور باطل ہے

جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی مسیح موعود یا "ثبیل مسیح" یا "برہنہ مسیح" کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ نہ ان میں اس امر کی گنجائش ہے کہ کوئی شخص اس زمانے میں کسی ان کے چہرے اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعویٰ کر دے کہ میں ہی وہ مسیح ہوں جس کے آنے کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں ان عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں جو آپ سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریم کے بطون سے پیدا ہوئے تھے۔

## دجال اور اس کا ظہور

### ظہور دجال کے زمانہ کا عہد تہذیبی

دجال کے متعلق جتنی احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، ان کے مضمون پر مجموعی نظر ڈالنے سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ حضور کو اللہ کی طرف سے اس معاملہ میں جو علم بلا تھا وہ صرف اس حد تک تھا کہ ایک بڑا دجال ظاہر ہونے والا ہے، اس کی یہ اور یہ صفات ہوں گی، اور وہ ان خصوصیات کا حامل ہوگا۔ لیکن یہ آپ کو نہیں بتایا گیا کہ وہ کب ظاہر ہوگا، کہاں ظاہر ہوگا، اور یہ کہ آیا وہ آپ کے عہد میں پیدا ہو چکا ہے یا آپ کے بعد کسی بعد زمانہ میں پیدا ہونے والا ہے۔

### حضور کے مختلف قیاسات

ان امور کے متعلق جو مختلف باتیں حضور سے احادیث میں منقول ہیں ان کا اختلاف مضمون خود بھی یہ ظاہر کرتا ہے اور حضور کے طرز کلام سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ آپ نے برہنہ سے وہی نہیں بلکہ برہنہ سے ظن و قیاس اور اشارہ فرمائی ہیں کبھی آپ نے یہ خیال ظاہر فرمایا کہ دجال خراسان سے اٹھے گا، کبھی یہ کہ اصغیان سے اور کبھی یہ کہ شام و عراق کے درمیانی علاقہ سے۔ پھر کبھی آپ نے ابن صمیاء نامی اُس یہودی بچے پر جو مدینہ میں (۲ یا ۳ برس) پیدا ہوا تھا یہ



شہ کیا کہ شاید یہی دجال ہو اور آخری روایت یہ ہے کہ سلسلہ میں جب فلسطین کے ایک عیسائی راہب (تمیم داری) نے آکر اسلام قبول کیا اور آپ کو یہ قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ سمندر میں (غالباً بحیرہ روم یا بحیرہ عرب) میں سفر کرنے ہوئے ایک غیر آباد جزیرے میں پہنچے اور ان کی ملاقات ایک عجیب شخص سے ہوئی اور اس نے انہیں بتایا کہ وہ خود ہی دجال ہے، تو آپ نے ان کے بیان کو بھی غلط باور کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، البتہ اس پر اپنے شک کا اظہار فرمایا کہ اس بیان کی رو سے دجال بحیرہ روم یا بحر عرب میں ہے مگر میں خیال کرتا ہوں کہ وہ مشرق سے ظاہر ہوگا۔

حضور کے ارشادات کے دو اجزاء

ان مختلف روایات پر جو شخص بھی مجموعی نظر ڈالے گا وہ اگر علم حدیث اور اصول دین سے کچھ بھی واقف ہو تو اسے یہ سمجھنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اس معاملہ میں حضور کے ارشادات دو اجزاء پر مشتمل ہیں:-

جزو اول یہ کہ دجال آئے گا، ان صفات کا حامل ہوگا اور یہ نقتیہ برپا کرے گا۔ یہ بالکل یقینی خبریں ہیں جو آپ نے اللہ کی طرف سے دی ہیں۔ ان میں کوئی روایت دوسری روایت سے مختلف نہیں ہے۔

### جزو دوم کی جداگانہ حیثیت

جزو دوم یہ کہ دجال کب اور کہاں ظاہر ہوگا اور وہ کون شخص ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ روایات مختلف ہیں بلکہ اکثر روایات میں شک اور شبہ اور گمان پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی مروی ہیں۔ مثلاً ابن صیاد کے متعلق آپ کا حضرت عمر سے یہ فرمانا کہ "اگر دجال بھی ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو۔ اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو تمہیں ایک مٹاپہ کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں ہے" یا مثلاً ایک حدیث میں آپ کا یہ ارشاد کہ "اگر وہ میری زندگی میں آ گیا تو میں محبت سے اس کا مقابلہ کروں گا ورنہ میرے بعد میرا رب تو ہر مومن کا حامی و ناصر ہے ہی"۔

اس دوسرے جز کی ذہنی اور اصولی حیثیت ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہے اور نہیں ہو سکتی جو پہلے جز کی ہے جو شخص اس کی بھی تمام تفصیلات کو اسلامی عقائد میں شمار کرتا ہے وہ غلطی کرتا ہے بلکہ اس کے برہتے کی صحت کا دعویٰ کرنا بھی درست نہیں ہے۔ ابن صیاد پر آپ کو شبہ ہوا تھا کہ شاید وہی دجال ہو، اور حضرت عمر نے تو قسم بھی کھائی تھی کہ یہی دجال ہے، مگر بعد میں تو وہ مسلمان ہوا، خزین میں رہا، حالت اسلام میں مرا اور اس کی نماز بخارہ مسلمانوں نے پڑھی۔ اب اس کی کیا گنجائش باقی رہ گئی کہ آج تک ابن صیاد پر دجال ہونے کا شبہ کیا جاتا رہے؟ تمیم داری کے بیان کو اس وقت تقریباً صحیح سمجھا گیا تھا، مگر کیا سارے تیرہ سو مرتب تک بھی اس شخص کا ظاہر نہ ہونا جسے حضرت تمیم نے جزیرے میں عبوس دیکھا تھا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس نے اپنے دجال ہونے کی جو خبر حضرت تمیم کو دی تھی وہ صحیح نہ تھی؟ حضور کو اپنے زمانہ میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپ کے عہد ہی میں ظاہر ہو جائے یا آپ کے بعد کسی قریبی زمانہ میں ظاہر ہو۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ سارے تیرہ سو مرتب گزار چکے ہیں اور ابھی تک دجال

نہیں آیا ہے؟ اب ان چیزوں کو اس طرح نقل و روایت کیے جانا کہ گویا یہ بھی اسلامی عقائد ہیں، نہ تو اسلام کی صحیح فہم کی ہے اور نہ اسے حدیث ہی کا صحیح فہم کہا جاسکتا ہے جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اس قسم کے معاملات میں اگر کوئی بات نبی کے قیاس یا گمان یا اندیشے کے مطابق ظاہر نہ ہو تو یہ اس کے منسوب نبوت میں ہرگز قاریج نہیں ہے۔ نہ اس سے عصمت انبیاء کے عقیدے پر کوئی حرف آتا ہے اور نہ ایسی چیزوں پر ایمان لانے کے لیے شریعت نے ہم کو مکلف کیا ہے۔ اس اصول حقیقت کو تا پیر نخل والی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود واضح فرماتے ہیں۔ ۲۴۲

حضور کی اپنی تصریحات سے رہنمائی

یہ امر کہ حضور کی کون سی بات عن یا ذاتی راستے پر مبنی ہے اور کون سی اللہ تعالیٰ کے وسیعے ہوئے علم پر اس کا اظہار یا اوقات حضور کی اپنی تصریحات سے ہو جاتا ہے، اور سب اوقات و دوسرے قرائن اس پر دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً یہی احادیث جو رجال کے متعلق وارد ہوئی ہیں، ان میں یہ بات حضور کی اپنی ہی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے کہ آپ کو اس کے مقام، زمانے اور شخصیت کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم نہیں دیا گیا تھا۔ ابن صبیاد کے متعلق آپ کو اتنا قوی شبہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے آپ کی موجودگی میں قسم کھا کر اسے رجال قرار دیا اور آپ نے اس کی تردید نہ کی، مگر جب انہوں نے اس کے قتل کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: ان یکنہ فلوں تسلط علیہ وان لہ یکنہ فلا خیرونک فی تسلطہ؟ اگر یہ وہی ہے تو تم اس پر قابو نہ پاسکو گے اور اگر یہ وہ نہیں ہے تو اس کے قتل میں تمہارے لیے کوئی بھلائی نہیں! (مسلم، تکرارین جتیاں)۔ ایک اور حدیث میں حضور نے رجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ان یجوج وانا فیکم فانا ججیعہ دونکم وان یجوج ولست فیکم فاصروا حججہ فغضہ واللہ یغنی علی کل مسئلہ! اگر وہ میری موجودگی میں نکلے تو تمہاری طرف سے میں اس کا مقابلہ کروں گا، اور اگر وہ ایسے زمانے میں نکلے جب میں تمہارے درمیان موجود نہ ہوں تو ہر آدمی اپنی طرف سے خود ہی اس کا مقابلہ کرے اور اللہ میرے پیچھے ہر مسلم کا مددگار ہے! (مسلم، ذکر الرجال) تبیم دارنی نے اپنے ایک بکری سفر میں رجال سے اپنی ملاقات کا نعتہ جب آپ کو سنایا تو اس کی بھی آپ نے تصدیق یا کذب نہیں فرمائی بلکہ یہ فرمایا کہ اعجبینی حدیث تسمیم اللہ وانفق الذی کنت احدنا لکھ فتنہ، مجھے تبیم کا بیان پسند آیا، وہ موافقت رکھتا ہے اس بات سے جو میں و رجال کے متعلق تم سے بیان کرتا تھا، پھر آپ نے اس پر مزید اضافہ کرتے ہوئے فرمایا الا انہ فی بحر الشام او بحر الیمین، لابل من قبیل المشرق، مگر وہ بحر شام یا بحرین میں ہے نہیں بلکہ مشرق کی جانب ہے! (مسلم، قصۃ الجتاسہ) یہ سب روایات اپنا مفہوم خود واضح کر رہی ہیں۔ ۲۴۵

حضرت تلمذین یا مشرک کے قتل کی پیش گوئی

حضرت تلمذ کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابہ میں مشہور و معروف تھا، اور بہت سے صحابیوں نے اس کو حضور کی زبان مبارک سے سنا تھا کہ فقتلک الغنثۃ الباعثیۃ (تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا)، جسے احمد بخاری

مسلم، ترمذی، نسائی، طبرانی، بیہقی، مسند ابوداؤد طیالسی وغیرہ کتب حدیث میں حضرات ابوسعید خدری، ابو قتادہ انصاری، ابراہیم سلمہ، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، ابوجہر زہری، عثمان بن عفان، خذیفہ، ابوراتب انصاری، ابورافع خزیمہ بن ثابت، عمرو بن العاص، ابوالیسر عماد بن یاسر رضی اللہ عنہم اور متعدد دوسرے صحابہؓ سے اس ضمنوں کی روایات منقول ہوئی ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں بھی یہ حدیث کئی سندوں سے نقل کی ہے۔

ابن عبدالبر الاستیعیاب میں لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تواتر آثار یہ بات منقول ہے کہ عماد بن یاسر کو باغی گروہ قتل کرے گا اور یہ صحیح ترین احادیث میں سے ہے۔ ۲۳۶ھ

### قرب قیامت کی دس نشانیاں

مسلم میں خذیفہ بن اسید الغفاری کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ دھواں۔ دجال۔ وابت الارض۔ مغرب سے سورج کا طلوع۔ عیسیٰ بن مریم کا نزول۔ یا خروج ماجوج کی یورش اور زمین بڑے خسوف (زمین کا وھٹنا یا Land Slide) ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں پھرتے ہوئے آخر میں زمین سے ایک سخت آگ اٹھے گی جو لوگوں کو عشر کی طرف ہانکے گی (یعنی بس اس کے بعد قیامت آجائے گی)۔ ایک اور حدیث میں یا خروج و ماجوج کی یورش کا ذکر کر کے حضور نے فرمایا اس وقت قیامت اس قدر قریب ہوگی جیسے پر سے پتھریں کی خاطر، کہ نہیں کہہ سکتے کب وہ پھر جن سے، رات کو یادن کو، کالجاسل الطم لا یددی اہلبا حقی تھوہم یولدھا لیلًا اونصارًا۔ ۲۳۶ھ

# باب ۱۲

قرآن اور حضور کے متعلق

مستشرقین کی علمی خیانتیں

[ اسلام، قرآن اور سیرت نبوی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مستشرقین نے جو کام کیا ہے اس میں بے شمار فضولیات اور نامقول باتیں ملتے آتی ہیں، جنہیں تحقیق کے نور بصورت نام سے علمی حقائق کی حیثیت دے کر پھیلا یا گیا ہے۔ ان نام نہاد حقائق کے دائرے میں — ویسے میسر جیسے متعصب محققین سے لے کر انگری و ہٹ جیسے مستقل فرائض اہل قلم تک — ایسی ایسی مضحکہ انگیز باتیں اسلام اور نبی اکرم کے متعلق پائی جاتی ہیں کہ جن سے آگاہ ہو جانے والے منصف فرائض قارئین کی نگاہ میں مستشرقین کے سارے علمی کارناموں کی وقعت ختم ہو جاتی ہے۔ ان شاندار علمی تحقیقی کارناموں کا ایک مقصد تو ٹرورب صلیبیہ کی پیدا کردہ ذہنیت کے تحت عیسائیوں کے جہانِ افکار کو اسلام کی طینت سے محفوظ کرنے کے لیے تعصبات کی دیواریں اٹھانا ہے۔ ان کا دوسرا مقصد اسلام نا آشنا مسلمانوں کو اسلام کے متعلق مفادوں اور شبہات میں ڈالنا بھی ہے۔ بایں ہر مستشرقین ہمارے جدید طبقوں کے لیے ایک صدی کے متعلق اسلام اور سابقہ سیرت بنے ہوئے ہیں، اور اسلام نا آشنا مسلمان ان کی تحریروں کو پڑھ کر ایسے ایسے شکوک میں مبتلا ہوتے ہیں اور ایسے ایسے اعتراضات اپنے ہی دین کے خلاف خود اٹھانے میں کو ہر شہ سائے حقیت کے لیے حیرت و حیرت کا مقام پیدا ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں مشورہ مواد کے فاضل مؤلف نے بحیثیت محکم اسلام علمی دائرے میں اسلامی علوم و معارف کی تجدید کا جو وسیع کام کیا ہے، اس میں جا بجا مستشرقین کی نگہ آفرینوں سے تعرض کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ حقائق کو مسخ کرنے والے ان محققین کا طلسم توڑنے بغیر مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو اسلام کی حقیقت کے مرہونے تک پہنچانا ممکن نہیں۔

چنانچہ سیرت نبوی اکرم کے سلسلے میں اپنی جن تحریروں میں فاضل مؤلف نے مستشرقین کی مغالطہ انگیزوں سے تعرض کیا ہے ان میں سے جن تک ہمارے نگاہ پہنچ سکی ہے، ان کے ضروری اقتباسات اس باب میں پیش کیے گئے ہیں۔ اس باب کے مواد کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین یہ ملحوظ رکھیں کہ مستشرقین نے اسلام اور نبی اسلام کو سمجھنے

میں جو ظہیان کن ہیں اور طریقی اور سب کا استیضایا جیسا ہے شریعت نے نہیں کیا ایک کلمہ خود مستثنیٰ نہیں ہے اور اسے کام کو ضروری بنا کر کسی مستثنیٰ کتاب یا مقام کے کہ وہ دین نہیں لگائی۔ صرف ضروری نکاحات پر کسی موقع بھرت لگائی گئی ہے۔ بہت بات سے مشمول مستثنیٰ مقیم کے کہ وہ کسی شکار اور مضافات کے جو ابات مختلف ایسا ہیں شامل ہیں، اگرچہ وہ نفسیوں کے تصور سے دور ہی نہیں کیے گئے۔

یہاں یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ اس باب کے حوالہ کے بارے میں یہ مسئلہ جو اب سے ہے انہیں کتاب یا کتاب اسے کتابت کے کہ جس جتنے ہیں کہ تمام پر لکھا ہوا ہے۔ خود رو بھرت کے بعد کیم نے اسے ہی بنیادی مباحث میں بھیج دی ہے، کیونکہ جہاں اس جیسے کے دور میں نہ دینا ہیں کہ یہ اہمیت ہے کہ بہت بات کر سکتے ہیں کہ یہ ان کا مطالعہ ضروری ہے، وہاں مستثنیٰ مقیم کے باب کا مطالعہ بعض ایسی نکاح و اولاد کو دیکھ کر ہے جو بہت پریمی کے نہیں ہیں بلکہ ہوا ہیں۔

اس باب کی فصل آٹھ بڑی مختصر ہے، مگر آٹھ آٹھ آٹھ جانتی ہیں۔ ایک چند صدیوں عہدت کریم نے مستقل فصل اس لیے ضروری ہے کہ فاضل مشرکت کا یہ نقطہ نظر قابل ملاحظہ ہے۔ اور یہ ہیں۔ [

# مشترقین کا مشمول طریق کار

یہ پیشیت لوگ مسلم نام سے جو عقیدت رکھتے ہیں، اُس میں پہلے اپنی نگہ بند سے طے کر لیتے ہیں کہ قرآن کون سا ل  
 مشمول من القرآن ہے، اور کہاں تک کہیں سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچا، اور وہی ہے کہ جو کچھ عربوں نے لکھا  
 و کلمہ ہے اس میں پیشی کیا ہے، یہ ظاہر ظلال مثلاً، اللہ سے پڑھتے صرفاً میں اور صلوات میں ہے۔ اس طرز تحقیقی میں  
 یہ لوگ اس تصور سے شرمی کہ ساتھ کہیں مان کر زمین اور آسمان کے تقابل کے لئے لکھتے ہیں کہ یہ لکھتے ہیں کہ  
 آدمی کو مجھ پر کہنا پڑتا ہے کہ اگر اسی کا نام ہی تحقیق ہے تو لافست ہے اس علم پر اور اس تحقیق پر ا

## بھیرازاہب کا افسانہ

جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آتے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پیرانے لوگوں کی کھکی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کرنا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنانی جاتی ہیں۔ اسے ٹھہرا ان سے کہو کہ اسے نازل کیا ہے؟

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِن هَذَا إِلَّا فُكٌّ  
افْتَرَيْنَاهُ وَآيَاتُهُ عَلَىٰ قَوْمٍ  
كَافِرِينَ فَتَعَدَّ جَاءُوا مُطِئَةً  
وَرُؤُوسَهُمْ وَقَالُوا  
أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ  
اَلَمْ نَكْتَبَ لَكَ فِي الْقُرْآنِ  
عَلَيْهِمْ بُكُورًا وَأَصِيلًا  
هَٰ تِلْكَ آيَاتُ  
الَّذِينَ يَكْفُرُونَ  
فِي الشَّمْسِ وَ  
الْقَمَرِ  
إِنَّهُ كَانَ عَشُورًا  
رَحِيمًا

(الفرقان، آیت ۴۰-۵۰)

اُس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا فسور و ریم ہے؟  
یہ وہی اعتراض ہے جو اس زمانے کے مستشرقین مغرب تو ان مجید کے غلط پیش کرتے ہیں۔

فسور کی قوم نے اعتراض کیوں نہ اٹھایا؟

لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں بھیرازاہب سے جب ملے تھے اس وقت یہ سارے مسلمان تم نے سیکھ لیے تھے۔ اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تم جانتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے اس زمانے میں تم نے عیسائی راہبوں اور یہودی نبیوں سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ اس لیے کہ ان سارے سفروں کا حال ان کو معلوم تھا۔ یہ سفر اکیسے نہیں ہوتے تھے ان کے اپنے قافلوں کے ساتھ ہوتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں کسی سے کچھ سیکھ آنے کا الزام ہم نکالیں گے تو ہمارے اپنے ہی شہر میں سینکڑوں زبانیں ہم کو بھٹلا دیں گی۔ اس کے علاوہ تمکے کا ہر عام آدمی پوچھے گا کہ اگر یہ معلومات اس شخص کو بارہنیرا برس کی عمر میں بھیرازاہب سے حاصل ہو گئی تھیں، تو آخر یہ شخص کہیں باہر تو نہیں رہتا



تھا، ہمارے ہی درمیان رہنا ہوتا تھا، کیا وجہ ہے کہ چالیس برس کی عمر تک اس کا یہ سادہ علم چھپا رہا اور کبھی ایک لفظ بھی اس کی زبان سے ایسا نہ نکلا جو اس علم کی غمازی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ کفار مکہ نے اتنا سفید جھوٹ بوٹنے کی جرأت نہ کی اور اسے بعد کے زیادہ بے حیا لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔  
**کفار مکہ کا اعتراض کیا تھا؟**

وہ جو بات کہتے تھے وہ نبوت سے پہلے کے متعلق نہیں بلکہ دعوتِ نبوت کے زمانے کے متعلق تھی ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص ان پڑھ ہے، خود مطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا، چالیس برس کی عمر تک ان میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا جو آج اس کی زبان سے نکل رہی ہیں، اب آخر یہ معلومات کہاں سے رہی ہیں؟ ان کا سر تھپہ لاجمالہ کچھ لگھے لوگوں کی کتابیں ہیں جن کے اقتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کر لئے جاتے ہیں، انہیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے اور پھر انہیں یاد کر کے ہمیں دن کو سناتا رہتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہل کتاب تھے، پڑھے لکھے تھے اور مکہ میں رہتے تھے۔ یعنی عداس (مخربطیب بن عبدالعزیز) کا آزاد کردہ غلام، یسار (علاد بن الحضرمی) کا آزاد کردہ غلام، اور خبیر (عامر بن ربیعہ) کا آزاد کردہ غلام۔

بظاہر ثباتِ ذہنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وحی کے دعوت کو روک دینے کے لیے نبی کے ماخذِ علم کی نشاندہی کر دینے سے بڑھ کر اور کونسا اعتراض ذہنی ہو سکتا ہے۔ مگر آدمی پہلی ہی نظر میں یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ جواب میں سرے سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی۔ بلکہ صرف یہ کہہ کر بات ختم کر دی گئی کہ تم صداقت پر ظلم کر رہے ہو، صریح بے انصافی کی بات کہہ رہے ہو، سخت جھوٹ کا طوفان اٹھا رہے ہو، یہ تو اس خدا کا کلام ہے جو آسمان و زمین کے بھید جانتا ہے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ سخت مخالفت کے ماحول میں ایسا زور دار اعتراض پیش کیا جائے، اور اس کو یوں خنارت سے روک دیا جائے؟ کیا واقعی یہ ایسا ہی پوچھ اور بچے ذہن اعتراض تھا کہ اس کے جواب میں بس "جھوٹ اور ظلم" کہہ دینا کافی تھا؟ آخر وجہ کیا ہے کہ اس مختصر سے جواب کے بعد نہ عوام نے کسی تفصیلی اور واضح جواب کا مطالبہ کیا اور نہ نئے نئے ایمان لانے والوں کے دلوں میں کوئی شک پیدا ہوا اور نہ مخالفین ہی میں سے کسی کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ دیکھو، ہمارے اس ذہنی اعتراض کا جواب بن نہیں پڑ رہا ہے اور محض جھوٹ اور ظلم کہہ کر بات ٹالی جا رہی ہے؟

اس گٹھی کا حل ہمیں اسی ماحول سے مل جاتا ہے جس میں مخالفین اسلام نے یہ اعتراض کیا تھا۔ اس حل کو پانچ کے لیے مزید ذیل کی تفسیحات قائم کی ہیں :-

پہلی تیق

وہ ظالم سردار جو ایک ایک مسلمان کو مارنے کو بٹتے اور ننگ کرتے پھر رہے تھے، ان کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن جن لوگوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ پھانی کتابوں کے ترجمے کر کے محمد کو یاد کرایا کرتے ہیں، ان کے گھروں پر اور خربزنی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر پر پھیلے مارتے اور وہ سارا ذخیرہ برآمد کر کے پبلک کے سامنے لاد رکھتے جو ان کے زعم میں اس کام کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ وہ عین اُس وقت چھاپا مار سکتے تھے جب کہ یہ کام کیا جا رہا ہو اور ایک جمع کو دکھا سکتے تھے کہ نو دیکھو، یہ نبوت کی تیاریاں جو رہتی ہیں، بلال کو سنتی ریت پر گھسیٹنے والوں کے لیے ایسا کرنے میں کوئی آئین و مشابطہ مانع نہ تھا۔ اور ایسا کہہ کے وہ ہمیشہ کے لیے نبوت محمدی کے "خطرے" کو ٹٹا سکتے تھے مگر وہ بس زبانی اعتراض ہی کرتے رہے اور ایک دن بھی یہ فیصلہ کن قدم اٹھا کر انہوں نے نہ دکھایا۔

دوسری تیق

ان لوگوں کے نام وہ اس سلسلے میں تھے وہ کہیں باہر کے نہ تھے۔ اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ ان کی قابلیتیں کبھی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ ہر شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا تھا، یہ دیکھ سکتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ کس پائے کی ہے، کس شان کی زبان ہے، کس مرتبے کا ادب ہے، کیا زور کلام ہے، کیسے بلند خیالات اور مضامین ہیں، اور وہ کس درجے کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمد ان سے یہ سب کچھ حاصل کر کے لارچہ ہیں۔ اسی وجہ سے کسی نہ بھی اس اعتراض کو کوئی وزن نہ دیا۔ ہر شخص سمجھتا تھا کہ ان باتوں سے بس دل کے جلے پھوپھے چھوڑنے جا رہے ہیں ورنہ اس قول میں کسی شبہ کے قابل بھی جان نہیں ہے۔ جو لوگ ان اشخاص سے واقف نہ تھے وہ بھی آخر اتنی ذرا سی بات تو مزہ چرچ سکتے تھے کہ اگر یہ لوگ ایسی ہی قابلیت رکھتے تھے تو آخر انہوں نے خود اپنا چراغ کیوں نہ بجایا؟ ایک دوسرے شخص کے چراغ کو تریل ہٹا کرنے کی انہیں ضرورت کیا پڑی تھی؟ اور وہ بھی پچھلے پچھلے کہ اس کام کی شہرت کا ذرا سا حقدہ بھی ان کو نہ ملے۔

تیسری تیق

وہ سب اشخاص جن کا نام اس سلسلے میں لیا جا رہا تھا، بیرونی ممالک سے آئے تھے جو تھے غلام تھے جن کو ان کے مالکوں نے آزاد کر دیا تھا۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کوئی شخص بھی کسی طاقتور قبیلے کی حمایت کے بغیر نہ جی سکتا تھا۔ آزاد ہو جانے پر بھی غلام اپنے سابق مالکوں کے بولاد (یعنی سرپرستی) میں رہتے تھے اور ان کی حمایت ہی معاشرے میں ان کے لیے زندگی کا سہارا ہوتی تھی۔ اب یہ ظاہر بات تھی کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کی بدولت معاذ اللہ ایک جھوٹی نبوت کی دکان چلا رہے تھے تو یہ لوگ کسی شخص اور نیک جنتی کے ساتھ تو اس سازش میں آپ کے شریک نہ ہو سکتے تھے۔ آخر کار ایسے شخص کے وہ غمخیز رفیق کار اور ریتے عقیدت مند کیسے ہو سکتے تھے جو رات کو انہی سے کچھ نہیں

سختا ہو اور دن کو دنیا بھر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کرنا ہو کہ یہ خدا کی طرف سے مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے؛ اس لیے ان کی شرکت کسی لاپچ اور کسی غرض ہی کی بنا پر ہو سکتی تھی۔ مگر کون صاحب عقل و ہوش آدمی یہ باور کر سکتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے سر پر ستروں کو ناراض کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس سازش میں شریک ہو گئے؟ آخر کیا لاپچ ہو سکتا تھا جس کی بنا پر وہ ساری قوم کے مضرب اور ملعون اور ساری قوم کی دشمنی کے ہرٹ آدمی کے ساتھ مل جاتے اور اپنے سر پر ستروں سے کٹ جانے کے نقصان کو ایسے مصیبت زدہ آدمی سے حاصل ہونے والے کسی فائدے کی اتیہ پر گھارا کر لیتے؟ پھر یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ ان کے سر پر ستروں کو یہ موقع تو آخر حاصل ہی تھا کہ ان کو کٹ کر ان سے سازش کا اقبال کرالیں۔ اس موقع سے انہوں نے کیوں نہ فائدہ اٹھایا اور کیوں نہ ساری قوم کے سامنے خود انہی سے یہ اقرار کر دیا کہ ہم سے یہ سیکھ کر یہ ہرت کی دکان چمکانی جا رہی ہے؟

چوتھی توقع

سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے اور اس ضرب اشل عقیدت میں شامل ہوئے جو صحابہ کرام نے آنحضرت کی ذات اقدس سے رکھتے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ بناوٹی اور سازشی نبوت پر خود ہی لوگ ایمان لائیں اور گہری عقیدت کے ساتھ ایمان میں جنوں کے بنانے کی سازش میں خود حصہ لیا ہو؟ اور باغرض اگر یہ ممکن ہی تو ان لوگوں کو اہل ایمان کی جماعت میں کوئی نمایاں مرتبہ تو ملا ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نبوت کا کاروبار تو چلے خدا میں اور پیار اور جبر کے بل بوتے پر اور نبی کے دست راست بنیں ابوبکر اور عمر اور ابو عبیدہ؟

اسی طرح یہ بات بھی بڑی تعجب انگیز تھی کہ اگر چند آدمیوں کی مدد سے راتوں کو بیٹھ بیٹھ کر نبوت کے اس کاروبار کا مواد تیار کیا جا رہا تھا تو وہ زید بن حارثہ، علی بن ابی طالب، ابوبکر صدیق اور دوسرے لوگوں سے کس طرح چھپ سکتا تھا جو شب و روز محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لگے رہتے تھے؟

اس الزام میں راستے نام بھی کوئی شائبہ صداقت ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ یہ لوگ اس قدر خلوص کے ساتھ حضور پر ایمان لائے اور آپ کی حمایت میں ہر طرح کے خطرات اور نقصانات برداشت کرتے؟

یہ وجہ تھی جن کی بنا پر ہر شخص نے اسے کی نگاہ میں یہ اعتراض آپ ہی بے وزن تھا۔ اس لیے قرآن میں اس کو کسی وزنی اعتراض کی حیثیت سے جواب دینے کی خاطر نقل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بتانے کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو، حق کی دشمنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے ہیں اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پراتر آتے ہیں۔

# قرآن کے تین قصص کی بحث

مفسرین نے قرآن کے تین قصص کو بھی اپنی تحقیق کے خواد پر چڑھایا ہے، اور ان کے متعلق بھی یہ الزام لگایا ہے کہ نبی اکرمؐ نے یہ قصص دوسرے آخذ سے مستعار لے کر اپنی طرف سے پیش کر دیئے۔ مفسرین کے الزام و اعتراض کو بیان کرنے سے پہلے لازم ہے کہ خود ان قصص کو سامنے رکھا جائے۔ ورنہ آنے والی بحث کو کچھ میں ذلت پیش آئے گی۔ (مترجم)

## (۱) حضرت موسیٰ کا سفر بجن الجسرین

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقُنْتَهُ لَا آسِرُكَ  
حَتَّىٰ آتِيَنَّكَ بِجَمْعٍ بَعِيرٍ أَوْ آصْحَابِي  
عُقُبًا۔ (الکہف: آیت ۶۰)

ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ کو پیش آیا تھا جبکہ  
موسیٰ نے اپنے خاوم سے کہا تھا کہ میں اپنا سفر ختم  
نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم

پر نہ پہنچ جاؤں، ورنہ میں ایک نہایت بڑا زکم پلٹا ہی رہوں گا۔

اس مرحلے پر یہ قصہ سننے سے متصور و کفار اور مومنین دونوں کو ایک اہم حقیقت پر متنبہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظاہر بین نگاہ دنیا میں بظاہر جو کچھ ہوتے دکھتی ہے اس سے بالکل غلط نتائج اخذ کر لیتی ہے، کیونکہ اس کے سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ عظمتیں ہیں جو ہمیں ملحوظ رکھ کر وہ کام کرتا ہے۔ ظالموں کا پھلنا پھولنا اور بے گناہوں کا تکلیفوں میں مبتلا ہونا، منافقوں پر انعامات کی بارش اور فریب داروں پر مصائب کا ہجوم، بدکاروں کا عیش ازہ نیکوکاروں کی بربطی، یہ وہ مناظر ہیں جو آتے دن انسانوں کے سامنے آتے رہتے ہیں، اور محض اس لیے کہ لوگ ان کی گتہ کر نہیں سکتے، ان سے عام طور پر ذہنوں میں الجھنیں، بلکہ غلط فہمیاں تک پیدا ہو جاتی ہیں۔ کافر اور ظالم ان کی یہ نظیر نکالتے ہیں کہ دنیا اندھیر نگری ہے، کوئی اس کا راجہ نہیں، اور ہے تو جو پٹ ہے۔ یہاں جس کا جو جی چاہے کرتا رہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔ مومن اس غر سے کہ واقعات کو دیکھ کر دل شکستہ ہوتے ہیں اور سب اوقات سخت

آرزو مندوں کے موافق پران کے ایمان تک متزلزل ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کارخانہ مشینیت کا پردہ اٹھا کر دیا اس کی ایک بھٹک دکھائی تھی تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ یہاں شب و روز کچھ ہو رہا ہے کیونکہ اور کئی مصلحتوں سے ہو رہا ہے اور کس طرف واقعات کا غالب لگنا ہلن ہے مختلف ہوتا ہے

### قصہ کی تفصیلات

حضرت موسیٰ کو یہ واقعہ کب اور کہاں پیش آیا، اس کی کوئی تفسیر قرآن نے نہیں کی ہے۔ حدیث میں کوئی ایک روایت میں مذکور ہے کہ وہ ابن عباس کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب فرعون کی بلائنگ بعد حضرت موسیٰ نے مصر میں دم کرایا کیا تھا لیکن ابن عباس جو فرمی روایات بخاری اور دوسری کتب حدیث میں منقول ہیں وہ سب اس بیان کی تائید نہیں کرتیں اور نہ کسی دوسرے جیسے ہی ثابت ہو سکتا کہ فرعون کی بلائنگ کے بعد حضرت موسیٰ کو کبھی مصر میں رہنے سے پہلے قرآن اس کی نصیحت کرتا ہے کہ مصر سے فرعون کے بعد ان کا سارا تانا سبنا اور تیرہیں گزرا۔ اس لئے یہ روایت تو قابل قبول نہیں ہے۔ البتہ ہم خود ان قصے کی تفصیلات پر غور کرتے ہیں تو دو باتیں صحت سمجھیں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مشاہدات حضرت موسیٰ کو ان کی ہجرت کے ابتدائی دور میں کر لئے گئے ہوں گے، کیونکہ آغاز ہجرت ہی میں انبیاء علیہم السلام کو اس طرح کی تعلیم و تربیت دیکھا کرتے تھے اور دوسرے یہ کہ حضرت موسیٰ کو ان مشاہدات کی ضرورت اس نسل میں پیش آئی ہوگی جبکہ مصر میں بنی اسرائیل کو بھی اسی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آ رہا تھا جس سے مسلمان مگر مغلوبہ میں دوچار تھے۔ ان دو وجوہ سے ہمارا قیاس یہ ہے کہ درالعلم عند اللہ کہ اس واقعہ کا تعلق اس دور سے ہے جبکہ مصر میں بنی اسرائیل پر فرعون کے مظالم کا سلسلہ جاری تھا اور سردار بن فرعون کی طرف فرعون اور اس کے درباری بھی مذاہب میں تائید و تہنیت کر رہے تھے کہ وہ پیر کوئی نہیں ہے جو اس سے باز نہیں کرنے والا ہو اور کئے کے مظلوم مسلمانوں کی طرح مسر کے مظلوم مسلمان بھی بے چین ہو رہے ہیں پونچھ رہے تھے کہ خدا یا ان ظالموں پر لعنات کی اور ہم پر مصائب کی بیبارش کب تک ہوتی کہ خود حضرت موسیٰ یہ پکار اٹھے تھے کہ رَبَّنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْغَنِيُّ فَرْعَوْنُ وَوَصَلَاةَ نَبِيَّتِكَ وَأَمْوَلاَ فِي الْخَيْبِ وَالَّذِي يَأْتِيكَ بِصَلَاةٍ أَعْنُ تَبِيَّتِكَ ۝ اسے پروردگار، تو نے فرعون اور اس کے درباریوں کو دنیا کی زندگی میں بڑی شان و شوکت اور مال و دولت سے رکھی ہے، اسے پروردگار، کیا یہ اس لئے ہے کہ وہ دنیا کو تیرے راستے سے بھٹکا دیں؟

اگر ہمارا یہ قیاس درست ہو تو پھر یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ غالباً حضرت موسیٰ کا یہ سفر سوڈان کی جانب تھا اور مجمع البحرین سے مراد وہ مقام ہے جہاں موجودہ شہر خرطوم کے قریب دریائے نیل کی دو بڑی شاخیں بحر احمر ہیں اور البحر الاوسط آکر ملتی ہیں۔

### مطلوبہ کا بیان

بائیل اس واقعے کے باب میں بالکل خاموش ہے۔ البتہ طور میں اس کا ذکر موجود ہے، مگر وہ اسے حضرت محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

موسیٰ کے بجائے ہتی یوحنا بن لادی کی طرف منسوب کرتی ہے اور اس کا بیان ہے کہ ہتی مذکور کو یہ واقعہ حضرت الیاس کے ساتھ پیش آیا تھا جو دنیا سے زندہ اٹھائے جانے کے بعد فرشتوں میں شامل کر لیے گئے ہیں اور دنیا کے انتظام پر مامور ہیں۔

(The Talmud Selections, By H. Polano. PP. 313 - 16)

ممکن ہے کہ خروج سے پہلے کے بہت سے واقعات کی طرح یہ واقعہ بھی بنی اسرائیل کے ہاں اپنی صحیح صورت میں محفوظ نہ رہا ہو اور صدیوں بعد انہوں نے قصے کی کڑیاں کہیں سے کہیں لے جا کر چڑھادی جو تو علمود کی اسی روایت سے منشاثر ہو کر مسلمانوں میں بعض لوگوں نے یہ کہہ دیا کہ قرآن میں اس مقام پر موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ نہیں بلکہ کوئی اور موسیٰ ہیں۔ لیکن نہ تو علمود کی یہ روایت لازماً صحیح تاریخ قرار دی جاسکتی ہے، نہ ہمارے لیے یہ گمان کرنے کی کوئی مقبول وجہ ہے کہ قرآن میں کسی اور مجہول الحال موسیٰ کا ذکر اس طریقہ سے کیا گیا ہوگا، اور پھر جبکہ مستبر انا دیث میں حضرت ابی بن کعب کی یہ روایت موجود ہے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قصے کی تشریح فرماتے ہوئے موسیٰ سے مراد حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو بتایا ہے تو کسی مسلمان کے لیے علمود کا بیان لائق التفات نہیں۔

مستشرقین مغرب نے اپنے معمول کے مطابق قرآن مجید کے اس قصے کے بھی ماخذ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے اور تین قصوں پر انگلی رکھ دی ہے کہ یہ ہیں وہ مقامات جہاں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل کر کے یہ قصہ بنایا اور پھر دعویٰ کر دیا کہ یہ تو میرے اور پر بذریعہ وحی نازل ہوا ہے۔ ایک داستان نکلا میش، دوسرے سکندر نامہ شرمانی اور تیسرے وہ پہلوی روایات جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔

مستشرقین پر جرح کے لیے چار سوال

ان کی اس متعصبانہ اقرار پر داندی کا پردہ بالکل چاک ہو جائے اگر کوئی طالب علم ان سے صرف چار باتوں کا جواب طلب کرے :

(۱) اول یہ کہ آپ کے پاس وہ کیا دلیل ہے جس کی بنا پر آپ دو چار قدیم کتابوں میں قرآن کے کسی بیان سے بتا جلتا مضمون پا کر یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ قرآن کا بیان لازماً انہی کتابوں سے ماخوذ ہے ؟

(۲) دوسرے یہ کہ مختلف زبانوں کی تین کتابوں کو آپ لوگوں نے قرآن مجید کے قصوں اور دوسرے بیانات کی ماخذ قرار دیا ہے اگر ان کی فہرست بتائی جاسے تو اچھے خاصے ایک کتب خانے کی فہرست بن جائے کیا ایسا کوئی کتب خانہ منگے میں اس وقت موجود تھا ؟ اور کیا مختلف زبانوں کے مترجمین بیٹھے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے ؟ اگر ایسا نہیں ہے اور آپ کا سارا انحصار ان دو تین سفروں پر ہے

بونی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے کئی سال پہلے عرب سے باہر کیے تھے، تو سوال یہ ہے کہ آفران تجارتی سفروں میں آنحضرتؐ کتنے کتب خانے نقل یا حفظ کر لاتے تھے؟ اور اعلانِ نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی آنحضرتؐ کی ایسی معلومات کا کوئی نشان آپؐ کی بات چیت میں نہ پائے جانے کی کیا معقول وجہ ہے؟

(۳) تیسرے یہ کہ کفار مکہ اور یہودی اور نصرانی، سب آپؐ ہی لوگوں کی طرح اس تلاش میں تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ مضامین کہاں سے لاتے ہیں۔ کیا آپؐ بنا سکتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے معاصرین کو اس سرتے کا پتہ نہ پھینے کی کیا وجہ ہے؟ انہیں تو بار بار بتحدی کی جا رہی تھی کہ یہ قرآن مُنزل من اللہ ہے، وحی کے سوا اس کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ اگر تم اسے بشر کا کلام کہتے ہو تو ثابت کرو کہ بشر ایسا کلام کہہ سکتا ہے۔ اس چیلنج نے آنحضرتؐ کے معاصرین کو اسلام کی کڑوڑ کر رکھ دی، مگر وہ ایک ماخذ کی بھی نشان دہی نہ کر سکے جس سے قرآن کے ماخذ ہونے کا کوئی معقول آدمی یقین تو درکنار شک ہی کر سکتا ہو۔ سوال یہ ہے کہ معاصرین اس سوا غرضانی میں ناکام کیوں ہوئے اور پھر بارہ مہینوں کے بعد آج مسلمانین کو اس میں کیسے کامیابی نصیب ہو رہی ہے؟

(۴) آخری اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس بات کا امکان تو بہر حال ہے نا کہ قرآن مُنزل من اللہ ہو اور وہ پچھلی تاریخ کے انہی واقعات کی صحیح خبریں دے رہا ہو جو دوسرے لوگوں تک صدیوں کے دوران میں زبانی روایات سے نسخ ہوتی جھوٹی پہنچی ہوں اور افسانوں میں جگہ پانگتی ہوں۔ اس امکان کو کس معقول دلیل کی بنا پر بالکل ہی خارج از بحث کر دیا گیا؟ اور کیوں صرف اسی ایک امکان کو بناتے بحث و تحقیق بنا لیا گیا کہ قرآن ان قصوں ہی سے ماخذ ہو جو لوگوں کے پاس زبانی روایات اور افسانوں کی شکل میں موجود تھے؟ کیا مذہبی تعصب اور عناد کے سوا اس ترجیح کی کوئی دوسری وجہ بیان کی جا سکتی ہے؟

ان سوالات پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس نتیجے تک پہنچے بغیر نہ رہ سکے گا کہ مستشرقین نے ”علم“ کے نام سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ حقیقت کسی سنجیدہ طالب علم کے لیے قابلِ التفات نہیں ہے۔

## (۲) فرعون کا ارادہ قتلِ موسیٰ

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ ۚ  
 لَيْدُوعِ رَبِّكَ - (المومن - آیت ۲۶) میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور یہ پکار دوں گے اپنے رب کو۔

اس آیت سے آیت ۵ تک جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ تاریخ نبی اسرائیل کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے جسے خود نبی اسرائیل بالکل فراموش کر گئے ہیں۔ بائبل اور تلمود دونوں اس کے ذکر سے خالی ہیں اور دوسری اسرائیلی روایات

میں بھی اس کا کوئی نام و نشان نہیں پایا جاتا صرف قرآن مجید ہی کے ذریعے دنیا کو یہ معلوم ہوا ہے کہ فرعون اور موسیٰ کی کشمکش کے دور میں ایک وقت پر واقعہ بھی پیش آیا تھا۔

دعوت حق کے نقطہ نظر سے قصے کی اہمیت

اس قصے کو جو شخص بھی پڑھے گا، بشرطیکہ وہ اسلام اور قرآن کے خلاف تعصب میں اندھا نہ ہو چکا ہو، وہ یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے گا کہ دعوت حق کے نقطہ نظر سے یہ قصہ بڑی قدر قیمت رکھتا ہے۔ اور بجا ہے خود یہ بات بعید از عقل و قیاس بھی نہیں ہے کہ حضرت موسیٰ کی شخصیت، ان کی تبلیغ اور ان کے ہاتھوں ظہور پذیر ہونے والے حیرت انگیز معجزات نے، تاثر ہو کر خود فرعون کے ایمان سلطنت میں سے کوئی شخص دل ہی دل میں ایمان لے آیا ہو اور فرعون کو ان کے قتل پر کاواہ دیکھ کر وہ مضطرب نہ کر سکا ہو لیکن مغربی مستشرقین علم و تحقیق کے لیے چورسے، غوروں کے باوجود تعصب میں اندھے ہو کر جس طرح قرآن کی روشن صداقتوں پر چاک ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اسی کا اندازہ اس بات سے ہر سکتا ہے کہ انساٹیکلر پبلیک اوت اسلام میں مضمون موسیٰ کا تعصب اس قصے کے متعلق کھٹا ہے۔

قرآن کی یہ کہانی کہ فرعون کے دربار میں ایک مومن موسیٰ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے، پوری طرح واضح نہیں ہے (سورہ ۲۰ - آیت ۲۸)۔ کیا ہمیں اس کا تقابل اس قصے سے کرنا چاہیے جو ہنگامہ میں بیان ہوا ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ تھرونے فرعون کے دربار میں مضمون سے کام لینے کا مشورہ دیا تھا؟

### مذہبان تحقیق کی شبہ انگیزی

گویا ان مذہبان تحقیق کے ہاں یہ بات تو طے شدہ ہے کہ قرآن کی ہر بات میں ضرور کیرٹے ہر ڈالنے ہیں۔ اب اگر اس کے کسی بیان پر حوت زنی کی کوئی بنیاد نہیں ملتی تو کم از کم یہی شہ شہ چھوڑ دیا جائے کہ یہ قصہ پوری طرح واضح نہیں ہے۔ اور چلتے چلتے یہ تک بھی پڑھنے والوں کے دل میں ڈال دیا جائے کہ ہنگامہ میں تھرونے کا جو قصہ حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے کا بیان ہوا ہے وہ کہیں سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا ہوگا اور اسے لاکر یہاں اس شکل میں بیان کر دیا ہوگا۔ یہ ہے علمی تحقیق کا وہ انداز جو ان لوگوں نے اسلام اور قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں اختیار کر رکھا ہے۔ ۱۵۰

### (۳) قصۃ اصحاب کہف

غار میں مدت قیام پر اعتراض

بعض مستشرقین نے اس قصے کو قصۃ اصحاب کہف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن ان کے قیام غار کی مدت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے۔ لیکن اسی سورہ کے حاشیہ ۲۵ میں ہم نے وضاحت کر دی ہے کہ



آیت ۲۵ میں اصحابِ کہف کے فارغین قیام کی مدت ۳ سو اور ۴ سو نو سال کی جو بیان کی گئی ہے یہ ہمارے خیال میں دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قرار، اس پر دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے (آیت ۲۶) میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ تم کہو، اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے۔ اگر ۳۰۹ کی تعداد اللہ نے خود بیان فرمائی ہوتی تو اس کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی یہی تاویل اختیار فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے بلکہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے۔

**گنہگار کی جہارت**

سُمرانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جنوی اختلافات بھی ہیں جن کو دنیا دینا کر گنہگار نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جہالت کا الزام لگایا ہے۔ حالانکہ جس روایت کے انحصار پر وہ آئی بڑی جہارت کر رہا ہے اس کے متعلق وہ خود جانتا ہے کہ وہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے کھی ہے۔ اور انہی مدت کے اندر ثبانی روایات کے ایک ایک سے دوسرے تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح کی ایک روایت کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ عورت بکرت صحیح ہے اور اس سے کسی جرم میں اختلاف ہونا لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے، عورت ان ہنٹ دھرم لوگوں کو زہیم دیتا ہے جو غریب تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

### عیسائی نوشتوں سے شہادت

اس قصبے کی قدیم ترین شہادت شام کے ایک عیسائی پوری تیس سوری کے مواعد میں پائی گئی ہے جو سُمرانی زبان میں لکھے گئے تھے، یہ شخص اصحابِ کہف کی وفات کے پندرہ سال بعد ۳۳ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے عسکر کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعد مرتب کیے تھے۔ ان مواعد میں وہ اس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے یہی سُمرانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دور کے مفسرین کو پہنچی جسے ابن جریر طبری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے، اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں برٹانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور نقل سے شائع ہوئے۔ گین نے اپنی کتاب تاریخ زوال و سقوط دولت روم کے باب ۲۳ میں "سات سونے والوں" (Seven Sleepers) کے عنوان کے تحت ان کا ذکر سے اس قصبے کا جو خلاصہ دیا ہے وہ ہمارے مفسرین کی روایات سے اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصبے قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحابِ کہف فارغین پناہ گزین ہوئے تھے ہمارے مفسرین اس کا نام ڈیسیوس یا دقینوس یا دقینوس بتاتے ہیں اور گین کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈیسیس Decius تھا جس نے ۲۵۴ء سے ۲۵۷ء تک سلطنت روم پر فرما کر وائی کی ہے اور مسیح علیہ السلام کے

پیروں پر ظلم و ستم کرنے کے معاملہ میں جس کا عہد بیت بنام ہے جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسرین انفسس یا افسوس لکھتے ہیں اور گین اس کا نام انفسس (Ephesus) بتاتا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈ راج موجودہ ترکی کے شہر از میر (مزمرا) سے ۳۰-۳۵ میل بجانب جنوب پائے جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ ص ۱) پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحاب کہف جاگے اس کا نام ہمارے مفسرین تھیڈوسی لکھتے ہیں اور گین کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیڈوسی (Theodosius) انانی کے زمانے میں پیش آیا جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد ۳۸۰ء سے ۳۹۵ء تک روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحاب کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا اس کا نام ہمارے مفسرین جملیا بتاتے ہیں اور گین اسے جمبلین (Jamblichus) لکھتا ہے۔

دوسرے روایات میں کیسانی

تھے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں کیسی ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈیسیس کے زمانے میں مسیح علیہ السلام کے پیروں پر سخت ظلم و ستم ہو رہے تھے، یہ سانسہ نوجوان ایک فارسی جا بیٹھے تھے پھر قیصر تھیڈوسی کی سلطنت کے (۳۹۵ء سے ۴۵۰ء) تقریباً ۵۵ یا ۶۰ سال (۴۵۰ء میں) یہ لوگ بیدار ہوئے جبکہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیروی چکی تھی۔ اسی حساب سے فارسی ان کے رہنے کی مدت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔ ۲۵۰ء

جلد اول ————— حصہ ۲

بِئْسَتْ سَيِّئَاتُ الَّذِينَ يَحْكُمُونَ بِأَهْوَاءِهِمْ وَلَا يَرْغَبُونَ بِتُوبَتِهِمْ ذَٰلِكَ يَسْتَكْبِرُونَ

۱: اقوامِ ماضیہ

باب ۱۳

سابق امتوں کی تباہی

اور ان کے آثار

# ابتدائیہ

تواریخ انسانی کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کہ دنیا کو محض ایک تاشا گاہ، محض ایک خانہ فیما بعض، ایک عیشی، لہو بھوکہ عینے والی، اور انبیاء کی بتائی ہوئی حقیقت سے مُنہ مڑ کر باطلی نظریات پر کام کرنے والی توہین پسند ورسپہ کس انجام سے دوچار ہوتی رہی ہیں ۱۵۷

آثار قدیمہ کا مشاہدہ انہوں نے (یعنی مُعذّب دنیا شدہ اقوام نے) محض ایک تاشائی کی سیئت سن کیا ان سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ اس سے حارم ہوا کہ آخرت کے قائل کی نگاہ اور اس کے مُنہ کی نگاہ میں وقتاً برفراقی ہوا ہے ایک تاشا دیکھتا ہے، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ تاریخ مُرتب کرتا ہے۔ دوسرا انہی چیزوں سے اخلاقی سبق نیتا ہے اور زندگی سے ماوراء حقیقتوں تک رسائی حاصل کرتا ہے ۱۵۸

جو لوگ بھی انسانوں کی اصلاح کے لیے اٹھائے گئے وہ سب ان کی اپنی ہی بسنیوں کے سپنے والے تھے۔ عیسیٰ، ابراہیم اور نوح علیہم السلام آخر کون تھے۔ اب تم خود ہی دیکھ لو کہ جن قوموں نے ان لوگوں کی وعرتِ اصلاح کو قبول نہ کیا اور اپنے بے بنیاد و تخیلات اور اپنی بے لگام خواہشات کے پیچھے چلتی رہیں ان کا انجام کیا ہوا تم خود اپنے تجارتی سفروں میں عاود، نمود، تدین اور قوم لوط وغیرہ کے تباہ شدہ علاقوں سے گذرتے رہتے ہو کیا وہاں تمہیں کوئی سبق نہیں ملا۔ یہ انجام جو انہوں نے دنیا ہی میں دیکھا ہی تو خبر دے رہا ہے کہ عاقبت میں وہ اس سے بدتر انجام دیکھیں گے۔ اور یہ کہ جن لوگوں نے دنیا میں اپنی اصلاح کرنی وہ عرتِ دنیا ہی میں اچھے نہ رہے آخرت میں ان کا انجام اس سے بھی زیادہ بہتر ہوگا ۱۵۹

جن قوموں نے بھی انبیاء علیہم السلام کی بات نہ مانی اور اپنی زندگی کا پورا رویہ توحید، رسالت، اور آخرت کے انکار پر قائم کیا وہ آخر کار ہلاکت کی مستحق ہو کر رہیں تاریخ کا یہ مسلسل تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کا قانون، اخلاق جو انبیاء کے ذریعہ سے دیا گیا، اور اس کے مطابق انسانی اعمال کی باڈی پریس جو آخرت میں ہونی ہے، مرا سر جتی برکتیت ہے، کیونکہ جس قوم نے بھی اس قانون سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھتے ہوئے دنیا میں اپنا

رویت متین کیا ہے وہ آخر کار سیدھی تباہی کی طرف گئی ہے۔ ۲۵۵

پچھلی انسانی تاریخ میں عینی قویں بھی تباہ ہوتی ہیں ان سب کو جس چیز نے گرایا وہ یہ تھی کہ جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کیا تو وہ خوشحالی کے لمحے میں مست ہو کر زمین میں فساد برپا کرنے لگیں اور ان کا اجتماعی ضمیر اس درجہ بگڑ گیا کہ یا تو ان کے اندر ایسے نیک لوگ باقی رہے ہی نہیں جو ان کو بُرائیوں سے روکتے یا اگر کچھ لوگ ایسے نکلے بھی تو وہ اتنے کم تھے اور ان کی آواز اتنی کمزور تھی کہ ان کے روکنے سے فساد نہ ترک سکا۔ یہی چیز ہے جس کی بدولت آخر کار یہ قومیں اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہوئیں۔ ۲۵۶

طالب حق لوگوں کے ایسے تو خدا کی زمین پر سہرط نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوتی ہیں جنہیں دیکھ کر وہ حقیقت کو پہچان سکتے ہیں، لیکن سہٹ دھرم لوگ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے ہیں نہ آفاق کی نشانیاں دیکھ کر اور نہ انبیاء کے معجزات دیکھ کر۔ وہ تو ہمیشہ اس وقت تک اپنی مخالفت پر جمے رہتے ہیں جب تک خدا کے عذاب نے اگر ان کو گرفت میں نہیں لے لیا ہے۔ اسی مناسبت سے سورہ شعراء میں تاریخ کی سات قزوں کے حالات پیش کیے گئے ہیں جنہوں نے اسی سہٹ دھرمی سے کام لیا تھا جس سے کفار کفر کا کام لے رہے تھے۔ اور اس تاریخی بیان کے ضمن میں چند باتیں ذہن نشین کرائی گئی ہیں۔

اول یہ کہ نشانیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو خدا کی زمین پر سہرط پھیلی ہوئی ہیں۔ جنہیں دیکھ کر ہر صاحب عقل آدمی تحقیق کر سکتا ہے کہ نبی جس چیز کی طرف بلا رہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔ دوسری قسم کی نشانیاں وہ ہیں جو فرعون اور اس کی قوم نے دیکھیں، قوم نوح نے دیکھیں، عاد اور ثمود نے دیکھیں، قوم لوط اور اصحابِ اٹیکرنے دیکھیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا خود کفار کا اپنا کام ہے کہ وہ کس قسم کی نشانی دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوم یہ کہ ہر زمانے میں کفار کی ذہنیت ایک سی رہی ہے، ان کی تجنّس ایک ہی طرح کی تھیں۔ ان کے اعتراضات یکساں تھے۔ ایمان نہ لانے کے لیے ان کے چیلے اور بہانے یکساں تھے اور آخر کار انجام بھی یکساں ہی تھا، اس کے برعکس ہر زمانے میں انبیاء کی تعلیم ایک تھی۔ ان کی سیرت و اخلاق کا رنگ ایک تھا۔ اپنے مخالفوں کے مقابلے میں ان کی دلیل و محبت کا انداز ایک تھا اور ان سب کے ساتھ اللہ کی رحمت کا معاملہ بھی ایک تھا۔ یہ دونوں نمونے تاریخ میں موجود ہیں۔ ۲۵۷

پچھلی قوموں کو اپنے اپنے زمانے میں کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا، مگر انہوں نے آخر کار ظلم و بناوٹ کی روش اختیار کی اور جو انبیاء ان کو راہِ راست دکھانے کے لیے بھیجے گئے تھے ان کی بات انہوں نے نہ مانی۔ اس لیے وہ ہمارے امتحان میں ناکام ہوئیں اور میدان سے ہٹا دی گئیں۔ اب اسے اہل عرب تمہاری باری آتی ہے تمہیں ان کی جگہ کام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ تم اس امتحان گاہ میں کھڑے ہو جس سے تمہارے پیش رو ناکام ہو کر نکالے

۳۹۳

ہاں ہے نہیں۔ اگر تو تم نہیں جانتے کہ تمہارا اہل تشیع کبھی وہی ہو جو ان کا ہونا تو اس موقع سے جو تمہیں دیا جا رہا ہے یہ صحیح ثابت  
انہی کو دیکھو تو تمہاری کہنا ہی ہے۔ سنیوں کو ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرو جو ان کی کتابوں کی موجودگی کے

## قوم نوح

قرآن کے اشارات اور بائبل کی تصریحات سے یہ بات مستحق ہوجاتی ہے کہ حضرت نوح کی قوم اُس سرزمین میں رہتی تھی جس کو آج ہم عراق کے نام سے جانتے ہیں۔ بائبل کے آثار قدیمہ میں بائبل سے قدیم تر جو کتابت ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور تورات میں بیان ہوا ہے اور اس کی جگہ و وقوع موبیل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔ پھر جو روایات کردستان اور آرمینیا میں قدیم ترین زمانے سے منسلک ہیں اُن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے اس پاس، اور آرمینیا کی سرحد پر کوہ ارا راط کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مخالف آثار کی نشاندہی اب بھی کی جاتی ہے اور چھوٹا سا کعبہ باشدول میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنا حضرت نوح نے ڈالی تھی۔

ایک بڑے طوفان کا تاریخ بھی ریکارڈ

حضرت نوح کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم تحریریں بھی ملتی ہیں اور اس کے علاوہ براہ، ملایا، جزائر شرق الہند، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اُس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسل آدم کسی ایک ہی خطہ زمین میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیائے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اسی وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہی طوفان کی نشان دہی کرتی ہیں، اگرچہ مژدہ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انہوں نے فراموش کر دیں اور اصل واقعہ پر ہر ایک نے اپنے تخیل کے مطابق افسانوں کا ایک بھاری بھاری بچھاڑا۔ ۲۵۹

بخودی پہاڑوں پر حضرت نوح کی کشتی ٹھہری تھی، کردستان کے علاقہ میں جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرقی جانب واقع ہے۔ بائبل میں اس کشتی کے ٹھہرنے کی جگہ ارا راط بتائی گئی ہے جو آرمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے اور ایک

سلسلہ کو ہستان کا نام ہی سلسلہ کو ہستان کے معنی میں ہیں کہ ارار اور کہتے ہیں وہ آری ہستان کی سطح و قطن سے ترسین ہو کہ جنوب میں کہ ہستان تک پہنچتا ہے اور جبل الجودی اسی سلسلے کا ایک پہاڑ ہے جو آج بھی جو دی ہی کے نام سے مشہور ہے۔ قدیم تاریخوں میں کشتی کے ٹھہرنے کی یہی جگہ بتائی گئی ہے۔ چنانچہ مسیح سے دو صدیوں پہلے بابل کے ایک مذہبی پیشوا بیروسیس (Berossus) نے پُرانی کلدانی روایات کی بنا پر اپنا ایک کتاب کی جو تاریخ لکھی ہے ۳۱ میں وہ کشتی نوح کے ٹھہرنے کا مقام جو دی ہی بتاتا ہے۔ از سطر کا شاگرد ایدنیوس

(Abydenus) بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کرتا ہے، نیز وہ اپنے زمانہ کا حال بیان کرتا ہے کہ عراق میں بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جنہیں وہ گھول گھول کر سیاروں کو پلاتے ہیں۔  
**قوم نوح کا بگاڑ**

حضرت نوح اور ان کی قوم کا جو حال قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ تعالیٰ کے وجود کی منکر تھی، نہ ان سے ناواقف تھی، نہ اُسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا، بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہو گئی تھی شریک کی گمراہی تھی، یعنی اُس نے اللہ کے ساتھ دوسری جہتوں کو ہندائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دیا تھا۔ پھر اس دنیاوی گمراہی سے، جسے خدا نے بیان اس قوم میں ڈونا ہو گئیں۔ جو خود ماننے معبود ہندائی میں شریک ٹھہرا، جسے گھنٹے تھے، ان کی غلامی کرانے سے یہ قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن گیا، ان سے ان دنوں میں تو پچھلے کی تقسیم پیدا کر دی، اتنا ہی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فستی و فجوریت، انسانیت کی بُری کھلی کر دیں۔

### حضرت نوح کی مساعی اصلاح

ق مَكَوَدُ ا مَكَوَدُ ا كَبِيْرًا - (نوح - ۲۲) ان لوگوں نے بڑھیا مری مکر کا بال بھپلا رکھا ہے ۱۱

مکر سے مراد ان سربراہوں اور پیشواؤں کے وہ فریب ہیں جن سے وہ اپنی قوم کے عوام کو حضرت نوح کی نجات کے خلاف بہکانے کی کوشش کرتے تھے مثلاً وہ کہتے تھے کہ لوگوں تمہیں ایسا ایک آدمی ہے، ایک مان لیا جاسے کہ اس پر ہندائی طریقہ سے وحی آئی ہے، اور عزت، مہر و ۶۳ - ۲۴) نوح کی پیروی نہ کرنا اور اذول سے بے سوچے سمجھے قبول کر لی ہے، اگر اس کی بات میں کوئی دربان ہوتا تو قوم کے اگلا اس پر ایمان لائے (نوح - ۲۴) خدا کو اگر بھیجا ہوتا تو کوئی فرشتہ بھیجا (المؤمن - ۲۳) - اگر شمس خدا کا بھیجا ہوتا تو اس کے پاس نہانے ہوتے، اس کو علم غیب حاصل ہوتا اور یہ فرشتوں کی طرح تمام انسانی حاجات سے بے نیاز ہوتا (نوح - ۳۱) - تو ان اور ان کے پیروؤں میں آخر کو کسی کراست نظر آتی ہے جس کی بنا پر ان کی فضیلت مان لی جائے (نوح - ۳۴) یہ شمس



در اصل تم پر اپنی سروراری جمانا چاہتا ہے (المومنون ۲۲)۔ اس شخص پر کسی جن کا سایہ ہے جس نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے  
(المومنون ۲۵) ۱۳۱

حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو دیکھنے کے لیے ایک زمانہ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ گوشہ نشین  
کی مگر عاتقہ اتناں کو ان لوگوں نے اپنے کر کے جال میں ایسا پھانس رکھا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کا گرو نہ ہوئی۔ آخر کار  
حضرت نوح نے خدا سے دعا کی کہ ان کافروں میں سے ایک کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑا کیوں کہ اگر تو نے ان میں سے  
کسی کو بھی چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور نیک حرام ہی پیدا  
ہوگا۔ ۱۳۲

غزائب

حضرت نوح کی دعا دربارِ بندگی میں مقبول ہوئی اور اس قوم کو غزائبِ الہی نے آن لیا قرآن کے صریح الفاظ  
سے سمجھ میں آتا ہے کہ طوفان کی ابتداء ایک خاص قوم سے ہوئی جس کے نیچے سے پانی کا چھوڑ پڑا، پھر ایک  
طرف آسمان سے مرسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اور دوسری طرف زمین میں جگہ جگہ سے چشمے پھوٹنے لگے۔ سورۃ ہود میں  
صرف نوح کے اہل گھر نے کا ذکر ہے اور آگے چل کر بارش کی طرف بھی اشارہ ہے مگر سورۃ نوح میں اس کی تفصیل دی

۱۳ اشارہ ہے حضرت نوح کی اس دعا کی صورت جو ایک تدریجی دراز تک اپنی قوم کی اصلاح کے لیے مسلسل گوشہ نشین  
کرتے رہنے کے بعد آخر کار نیک آگراہوں نے مانگی کہ انہی کو معلقوں پر دروہ گار میں مغلوب ہو گیا ہوں میری مدد  
کو پہنچا تمہو آیت ۱۰۔ اور رَبِّ لَا تَذَرْنِي مَعَ الْكٰفِرِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ يَوْمَ الْحِسَابِ۔ پر دروہ گار زمین پر ایک کائنات شدہ بھی نہ چھوڑ۔  
(نوح - آیت ۱۰)

۱۳۱ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس طویل گفتگو کا ذکر کیا گیا ہے جو حضرت نوح کی دعوت اور ان کی قوم کے اصرار علیٰ انکسار کے  
درمیان صدیوں برابر ہی سورۃ حکمت میں بتایا گیا ہے کہ اس گفتگو کا زمانہ ساٹھ سو سو برس تک متدرج رہا ہے۔ فَابْتَدَأَ  
اَلَّتْ سِنِّيْهِ اِلَّا حَتْمِيْبِيْنَ نَامَا (آیت ۱۴)۔ حضرت نوح نے اس زمانہ میں اُپشت و اُپشت ان کے اجتماعی دروہل کو تہذیب کر  
نہ صرف یہ اندازہ فرمایا کہ ان کے اندر ظہورِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے بلکہ یہ راستے بھی قائم کر لی کہ آئندہ ان  
کی نسلوں سے بھی نیک اور ایماندار آدمیوں کے اٹھنے کی توقع نہیں ہے اِنَّكَ اِنْ تَذَرْتَهُمْ يَتَّبِعُوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلْبُدُوْا  
اِلَّا قَابِلًا اَلْمَا (دوح - آیت ۲۰)۔ اسے رب اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے  
جو بھی پیدا ہوگا فاجر اور نیک نہ ہوگا۔ خود اللہ تعالیٰ نے ہی حضرت نوح کی اس راستے کو درست قرار دیا اور اپنے علم کامل  
شامل کی بنا پر فرمایا اِنَّ يَتَّبِعُوْنَكَ اِلَّا مَن تَدَا اَمَن فَلَآ تَتَّقِيْهُمْ يَمَّا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ (مجادلہ آیت ۱۳۶)۔ تیری قوم میں سے  
جو ایمان لائے وہ لائے اب کوئی ایمان لانے والا نہیں ہے لہذا اب ان کے کٹوتوں پر غم نہ کرنا چھوڑے۔ ۱۳۲

گنتی ہے کہ فَفَجَعَلْنَا الْاَيَاتِ السَّمَاوِيَّاتِ مَنَظْمًا مِّنْ مَّوَجٍّ وَجُجُونََا الْاَرْضِ مَنَظْمًا مِّنْ مَّوَجٍّ فَالْتَقَى الْمَاءُ عَلَىٰ اَمْرٍ قَدَرٍ مِّنْ يَمِينِ  
 آسمان کے دروازے کھول دیتے جن سے لگانا بارش برسنے لگی اور زمین کو بھاڑ دیا کہ ہر طرف چشے ہی چشے پھوٹ نکلے  
 اور یہ دونوں طرح کے پانی اس کام کو پورا کرنے کے لیے مل گئے جو منقذ کر دیا گیا تھا۔ نیز نزلتِ ثور پر امتِ لام داخل  
 کرنے کی وجہ یہ سمجھیں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص ثور کو اس کام کی ابتدا کے لیے نامزد فرمایا تھا جو آٹا  
 پاتے ہی ٹھیک اپنے وقت پر ابل پیرا اور بعد میں طوفانِ عالم کی حیثیت سے معروف ہو گیا۔

### کیا طوفانِ عالمگیر تھا؟

یہ طوفانِ عالمگیر تھا یا اس خاص علاقے میں آیا تھا جہاں حضرت نوحؑ کی قوم آباد تھی؟ یہ ایک ایسا سوال ہے  
 جس کا فیصلہ آج تک نہیں ہوا۔ اسرائیلی روایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے کہ یہ طوفانِ تمام روستے زمین پر آیا تھا  
 (پیدائش ۱۸۱-۲۲۱)۔ مگر قرآن میں یہ بات کہیں نہیں کہی گئی ہے۔ قرآن کے اشارات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے  
 کہ بعد کی انسانی نسلیں انہی لوگوں کی اولاد سے ہیں جو طوفانِ نوحؑ سے بچے گئے تھے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں  
 آتا کہ طوفانِ تمام روستے زمین پر آیا ہو کیونکہ یہ بات اس طرح بھی صحیح ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک نبی آدمؑ کی آبادی  
 اسی نقطہ تک محدود رہی جو جہاں طوفان آیا تھا اور طوفان کے بعد نسلیں پیدا ہوئی ہوں وہ بندریک تمام دنیا میں پھیل  
 گئی ہوں۔ اس نظریہ کی تائید و چیتروں سے ہوتی ہے ایک یہ کہ وہ جگہ و فرات کی سرزمین میں تو ایک زبردست طوفان  
 کا ثبوت تاریخی روایات سے، آٹا بقدر سے اور طبقات الارض سے ملتا ہے، لیکن روستے زمین کے تمام خطوں میں  
 ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا جس سے کسی عالمگیر طوفان کا یقین کیا جاسکے۔ دوسرے یہ کہ روستے زمین کی اکثر بیشتر قوموں  
 میں ایک طوفانِ عظیم کی روایات قدیم زمانے سے مشہور ہیں، حتیٰ کہ آسٹریلیا، امریکہ اور نیوگنی میں دور دورا  
 علاقوں کی پرانی روایات میں بھی اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا جاسکتا ہے کہ کسی وقت ان سب قوموں کے  
 آباء و اجداد ایک ہی خطہ میں آباد ہو گئے جہاں یہ طوفان آیا تھا۔ اور پھر جب ان کی نسلیں زمین کے مختلف حصوں میں  
 پھیلیں تو یہ روایات ان کے ساتھ گئیں۔ ۲۶۵

### کشتی نوحؑ ایک نشانِ عبرت بن گئی

وَجَعَلْنَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ (العنکبوت ۱۵)

اور اسے دنیا والوں کے لیے ایک نشانِ عبرت

بنا کر رکھ دیا۔

اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہولناک عقوبت کو یا اس ظہیم نشانِ واقعہ کو بعد والوں کے لیے  
 نشانِ عبرت بنا دیا گیا لیکن یہاں اور سورہ قمر آیت ۱۱۵ میں یہ بات جس نظریہ سے بیان فرمائی گئی ہے اس سے تباہ  
 یہی ہوتا ہے کہ وہ نشانِ عبرت خود وہ کشتی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر بندوں موجود رہی اور بعد کی نسلوں کو سزا دیتی رہی

کہ اس سوزیر میں بھی ایسا طوفان آیا تو انھیں کئی دیو لہت کیشتی پہاڑ پر چلا گیا ہے۔ سوزیرہ لڑکی کی آیت کی تفسیر میں ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ بھی پہاڑ سے اتر کر ان کے خلاف سے گئے ہیں تو انہوں نے کہہ کر جو چوڑی پیرا اور ایک روایت کی رو سے باقری ماہی کشتی کے قریب اس کشتی کو دکھلا دیا ہے۔ سوچو وہ نہایت ہی کبھی وقتاً فوقتاً یہ اظہار عات اختیارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتی کو رخ توڑنا شروع کرنے کے لیے مہارت بھیجی تو ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہازوں کو شہانِ اولیاء پرست گزرتے ہیں تو ایک چوڑی پیرا انہوں نے ایسی چیز دکھائی ہے جو کشتی سے مٹا رہتا ہے۔

اسم بخاری، ابن ابی عاصم، عبد الرحمن بن اسحاق اور ابن جریر نے فتاویٰ میں یہ روایت نقل کی ہے کہ مسلمانوں کو فتح حراق و الخیر سے کہنے کے زمانے میں یہ کشتی جو وہی پیرا اور ایک روایت کے مطابق باقری ماہی کشتی کے درمیان تھی اور ابتدائی ذور کے اہل اسٹار نے اس کو دکھائی تھی۔

## قوم عاد

### وجہ تسمیہ

یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے انسانے اہل عرب میں زبان زرد عام تھے۔ نتیجہً ان کے نام سے واقعہ تھا۔ ان کی شوکت و جہت غلبہ مثل تھی۔ پھر دنیا سے ان کا نام و نشان تک مٹ جانا بھی ضرب المثل ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عربی زبان میں ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ کی عادات کہتے ہیں جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے افتادہ پڑی ہوئی ہو اسے عادی الارض کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں ہم کو بڑی کثرت سے اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ عرب کے ماہرین انساب بھی اپنے ملک کی معدوم شدہ قوموں میں سب سے پہلے اسی قوم کا نام لیتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بنی قریظ بن شیبان کے ایک صاحب آئے جو عاد کے علاقے کے رہنے والے تھے اور انہوں نے وہ قصے حضور کو سنائے جو اس قوم کے متعلق قدیم زمانوں سے ان کے علاقہ کے لوگوں میں نقل ہوتے چلے آ رہے تھے۔

### قوم عاد کا مسکن

قرآن کی رو سے اس قوم کا اصل مسکن استقامت کا علاقہ تھا جو حجاز، یمن اور یامامہ کے درمیان واقع ہے۔ یہیں سے پھیل کر ان لوگوں نے یمن کے مغربی سواحل سے عراق تک اپنی طاقت کا سکہ رواں کر دیا تھا۔ تاریخی حقیقت سے اس قوم کے آثار دنیا سے تقریباً ناپید ہو چکے ہیں لیکن جنوبی عرب میں کہیں کہیں کچھ پرانے کھنڈر موجود ہیں جنہیں عاد کی طرقت نسبت دی جاتی ہے۔ ایک مقام پر حضرت ابو علیہ السلام کی قبر بھی مشہور ہے۔ ۸۳۷ء میں ایک گناریزیری افسر James R. Wellsted کو جنس عرب میں ایک پُرانا کتبہ مل گیا جس میں حضرت ابو علیہ السلام

لما اختلفت جمع کل جمع ہے اور اس کے لغوی معنی ہیں ریت کے ٹپے لپے لپے جو بلند ہی میں پہاڑوں کی سدا کو نہ پہنچے ہوں، لیکن اصطلاحاً یہ صحرائے عرب (الربع الخالی) کے جنوبی مغربی حصے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔ (مؤلف)

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کا ذکر موجود ہے اور عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کی تہذیب ہے جو شہریت پر قائم ہوئے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ عادی کا علاقہ عثمان سے ہیں تک پھیلا ہوا تھا اور قرآن مجید میں بتایا ہے کہ ان کا اصل وطن الاقصاف تھا جہاں سے نکل کر وہ گروہ پیش کے محکم میں پھیلے اور کمزور قوموں پر چڑھ گئے۔ آج کے زمانے تک بھی جنوبی عرب کے باشندوں میں یہی بات مشہور ہے کہ عادی اسی علاقے میں آباد تھے جو شہر مکه سے تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر شمال کی جانب منعموت میں ایک مقام ہے جہاں لوگوں نے حضرت ہمود کا مزار بنا رکھا ہے اور وہ قبر ہمود کے نام ہی سے مشہور ہے۔ ہر سال ۵ شعبان کو وہاں غوس ہوتا ہے اور عرب کے مختلف ممالکوں سے ہزاروں آدمی وہاں جمع ہوتے ہیں یہ قبر اگرچہ تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے لیکن اس کا وہاں بنایا جانا اور جنوبی عرب کے لوگوں کا کثرت سے اس کی طرف رجوع کرنا کم از کم اس بات کا ثبوت ضروری ہے کہ مقامی روایات اسی علاقے کو قوم عادی کا علاقہ قرار دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ منعموت میں متحدہ نمبر ۱ (Ruins) ایسے ہیں جن کو مقامی باشندے آج تک دار عادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

### مسکن عادی کی موجودہ حالت

الاقصاف کی موجودہ حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ یہی وہاں ایک نامزد تمدن رکھنے والی طاقتور قوم آباد ہوگی۔ اغلب یہ ہے کہ ہزاروں برس پہلے یہ ایک شاہیاب علاقہ ہوگا اور بعد میں آب و ہوا کی تبدیلی نے اسے ریگزار بنا دیا ہوگا۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک قی و ذوق ریگستان ہے جس کے اندرونی حصوں میں جانے کی بھی کوئی ہمت نہیں رکھتا۔ ۱۳۳۰ء میں بویریا کا ایک فوجی آدمی اس کے جنوبی کنارے پر پہنچ گیا تھا وہ کہتا ہے کہ منعموت کی شمالی سطح مرتفع پر سے کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو یہ صحرا ایک ہزار فحیٹ، نشیب میں نظر آتا ہے۔ اس میں جگہ جگہ ایسے سفید قطے ہیں جن میں کوئی چیز گر جائے تو وہ ریت میں نرق ہوتی چلی جاتی ہے اور بالکل بوسیدہ ہو جاتی ہے۔ عرب کے بدو اس علاقے سے بہت ڈرتے ہیں اور کسی قیمت پر وہاں جانے کے لیے راضی نہیں ہوتے۔ ایک موقع پر جب بدو اسے وہاں لے جانے پر راضی نہ ہوئے تو وہ اکیلا وہاں گیا۔ اس کا بیٹا ہے کہ یہاں کی ریت بالکل باریک سفوف کی طرح ہے جس نے ڈور سے ایک شاقول اس میں پھینکا تو وہ ۵ منٹ کے اندر اس میں نرق ہو گیا اور اسی وقت اس ڈور کا سر اگل گیا جس کے ساتھ وہ بندھا ہوا تھا۔ ۱۹۱۵ء

استفسار معلومات کے لیے ملاحظہ ہوں۔

1. Arabia and The Isles, Harold Ingrams, London. 1946
2. The unveiling of Arabia, R. H. Kirnan, London. 1937
3. The Empty Quarter, Philby, London. 1933



العجماء۔ (التغیر۔ آیت ۶-۷)

عاد و ارم کے ساتھ ۶

اس مادی اور جسمانی زور آوری نے ان کو سخت تکلیف دیا اور پاتا تھا اور انہیں اپنی طاقت کا بڑا دکھنہ تھا۔

قَامَا عَادًا فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِ  
 الْحَقِ وَقَالُوا مَا أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً  
 جسے عاد اور انہوں نے زمین میں حق کی راہ سے  
 بہت کو تکلیف کی روش اختیار کی اور کہنے لگے کہ کون

رحمہ السجدہ۔ آیت ۱۹

ان کا سیاسی نظام سپر پڑے بڑے جباروں کے ہاتھ میں تھا بن کے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا۔

وَاسْتَعْتَبُوا مَصْرُوعًا جَبَّارًا ظَلِيمًا (تغیر آیت ۱۵)  
 اور انہوں نے بہر جبار دشمن حق کے حکم کی پیروی کی۔  
 مذہبی حیثیت سے یہ اللہ تعالیٰ کے منکر نہ تھے بلکہ شرک میں مبتلا تھے۔ ان کو اس بات سے انکار تھا کہ تبدلی

عرفت اللہ کی ہوتی چاہیے۔

قَالُوا أَرْجَلُنَا لِتَعْبُدَ اللَّهُ وَوَحْدَهُ لَا  
 نَعْبُدُ مَا كَانُ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا۔ (الاعراف آیت ۷۴)

انہوں نے رجموں سے کہا کیا تو ہمارے پاس اس لیے  
 آیا ہے کہ ہم صرف ایک اللہ کی بندگی کریں اور ان کو  
 چھوڑیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے تھے

### ان پر نزول عذاب کی وجہ

قدیم قوم عاد کی تباہی و بربادی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ اللہ کو ان کے ساتھ کوئی دشمنی تھی اور وہ چاہتا تھا  
 کہ انہیں تباہ کر دے، بلکہ وراثت انہوں نے خود ہی اپنے لیے وہ طرز زندگی پسند کیا جو انہیں بربادی کی طرف لے جانے والا  
 تھا۔ اللہ نے تو انہیں سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا پورا موقع دیا۔ ان کی قبائش کے لیے رسول بھیجے، رسولوں کے ذریعہ  
 سے ان کو غلط روی کے بڑے نتائج سے آگاہ کیا اور انہیں کھول کھول کر نہایت واضح طریقے سے بتا دیا کہ ان کے  
 لیے فلاح کا راستہ کونسا ہے اور ہلاکت و بربادی کا کونسا۔ مگر حیب انہوں نے اصلاح حال کے کسی موقع سے فائدہ  
 نہ اٹھایا اور ہلاکت کی راہ چلنے ہی پر اصرار کیا تو لامحالہ ان کا وہ انجام ہونا ہی تھا جو بالآخر ہو کر رہا۔

عذاب کے بارے میں قرآنی تسہیحات

قَدْ رَسَلْنَا عَلَيْهِمْ رُسُلًا صَوِّرُوا فِي آيَاتِنَا  
 نَجَاتٍ لِيُنذِرَهُمْ عَذَابَ الْآخِرَةِ نَجِي  
 الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ (دم السجدہ آیت ۱۶)  
 آخر کار ہم نے چند نوحوں و نوروں میں سخت لٹوغانی ہوا  
 ان پر بھیج دی تاکہ انہیں دنیاوی کی زندگی میں نجات  
 و رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں۔

قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس عذاب کی تفصیل آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہوا مسلسل سات سات رات اور  
 آٹھ دن تک چلتی رہی۔ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے بڑے بڑے

والحاقہ آیت ، جس چیز پر سے بھی یہ ہوا گزر گئی اس کو بوسیدہ کر کے رکھ دیا (الذاریات : ۴۲) ، جس وقت یہ ہوا آ رہی تھی اس وقت غبار کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے کہ خوب گھٹا گھر کر آئی ہے ، بارش ہوگی اور سڑکے انسانوں میں پانی پڑ جائے گا مگر وہ آئی تو اس طرف آئی کہ اس نے ان کے پورے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ مِرْيَاجًا صَوَّجًا بِأَبْيِ جُيُومٍ  
 تَحْسَبُهُمْ جُيُومًا نَارًا كَأَنَّ النَّاسَ كَالْعِهْرِ أَعْمَارًا  
 نَحْلُ مَتَّعِيهِمْ  
 ان پڑھیج دی جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک  
 سنی غلی جیسے وہ جڑ سے اٹھنے سے بوسے کھجور کے تنے پر

یعنی ایک ایسے دن جس کی نمونہ کئی روز تک مسلسل جاری رہی۔ سورہ طہم السجدہ آیت ۶ میں ہی آیات تھخات کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اور سورہ الحاقہ آیت ۷ میں فرمایا گیا ہے کہ ہوا کا یہ طوفان مسلسل سات رات اور آٹھ دن جاری رہا۔

مشہور یہ ہے کہ جس دن یہ عذاب شروع ہوا وہ بڑھ کا دن تھا۔ اسی سے لوگوں میں یہ خیال پھیل گیا کہ بڑھ کا دن منحوس ہے اور کوئی کام اس دن شروع نہ کرنا چاہیے بعض نہایت ضعیف احادیث بھی اس سلسلے میں نقل کی گئی ہیں جن سے اسی دن کی نحوست کا عقیدہ عوام کے ذہن میں بچھڑ گیا ہے مثلاً ابن مردودہ اور سلیب بغدادی کی یہ روایت کہ آھوا اربعاء فی الشھر یوم نحس مستحکم (یعنی کا آٹری بڑھ منحوس ہے جس کی نحوست مسلسل جاری رہتی ہے)۔ ابن جوزی اسے موضوع کہتے ہیں۔ ابن رجب نے کہا ہے کہ یہ ہمیشہ صحیح نہیں ہے۔ حافظ سخاوی کہتے ہیں کہ حنفیہ طریقوں سے یہ منقول ہوئی ہے وہ سب واری ہیں۔ اسی طرف طبرانی کی اس روایت کو بھی محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے کہ یوم الاربعاء یوم نحس مستحکم (بڑھ کا دن پیچم نحوست کا دن ہے)۔ بعض اور روایات میں یہ باتیں بھی مروی ہیں کہ بڑھ کو سفر نہ کیا جائے۔ بن دین نہ کیا جائے ، نام نہ کہو اسے یا میں ، مریض کی عیادت نہ کی جائے ، اور یہ کہ خیرام اور برص اسی روز شروع ہوتے ہیں مگر یہ تمام روایات ضعیف ہیں اور ان پر کسی عقیدے کی بنائیں کبھی جاسکتی۔ مختلف مناوی کہتے ہیں فوق الاربعاء علی جمعة اظہی یوم ورضن اعتقاد المتبحرین حداد شدید التحريم اذا الزیام کلھا یتد تعالی لا تنفع ولا تفسد بدعت۔ بدعتی کے خیال سے بڑھ کے دن کو منحوس سمجھ کر چھوڑنا اور نحوسیوں کے سے اعتقاد اس باب میں کھنا حرام ، سخت حرام ہے۔ کیونکہ سارے دن اللہ کے ہیں ، کوئی دن عذاب خود نہ نفع پہنچانے والا ہے نہ نقصان بخلا آگے کہتے ہیں سارے دن کیساں ہیں ، بڑھ کی کوئی نحوسی نہیں۔ سات دن میں کوئی گھڑی ایسی نہیں ہے جو کسی کے لیے اچھو اور کسی کے لیے بڑی نہ ہو۔ سر وقت اللہ تعالیٰ کسی کے لیے موافق اور کسی کے لیے ناموافق حالت پیدا کرتا رہتا ہے۔



# قوم ثمود

## تعارف

یہ عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو عباد کے بعد سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے اس کے نقشے اہل عرب میں زبانِ زورِ عام تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں کثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ اسیریا کے کتبائے اور یونان، اسکندریہ اور روم کے قدیم مؤرخین اور ذراغیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ بیتِ علیہ السلام کا پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے۔ پانچ رومی مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن فوج میں خبری ہوسے اور خطیبوں کے علماء لیسے جن سے ان کی دشمنی تھی

## قوم ثمود کا مسکن

اس قوم کا مسکن شمالی مندی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی الجبیر کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانہ میں مدینہ اور تبرک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک اسٹیشن پر ثابت ہے۔ مدائن صالح کہتے ہیں یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانہ میں حجر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جن کو ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا۔ اسیٹان شہر نموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی منافقے ان آثارِ قدیمہ کے درمیان سے گزرا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک کے موقع پر حبیب اور حرسے گزرے تو آیت نے مسلمانوں کو یہ آثارِ عبرت دکھائے اور وہ سبق دیا جو آثارِ قدیمہ سے ہر سائب سبیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے۔ ایک جگہ آپ نے ایک کنوئیں کی نشاندہی کر کے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح کی اڈنی باقی پتی تھی اور مسلمانوں کو ہدایت کی کسوٹی اسی کنوئیں سے

۱۔ حجاز کے شمالی حصہ میں رابغ سے عنتہ تک اور مدینہ و یسیر سے نیما اور تبرک تک کا سارا علاقہ آج بھی ثمود کے آثار سے بھرا ہوا ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانہ میں یہ آثار موجودہ حالت سے کچھ زیادہ ہی نمایاں ہوں گے۔ (مؤلف)

پانی لینا، پانی کنوؤں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درے کو دکھا کر آپ نے فرمایا کہ اسی درے سے وہ آؤٹھی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ چنانچہ وہ مقام آج بھی کجج القاد کے نام سے مشہور ہے۔

آثار محمود

یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عباد کے بعد تمہیں اس کا نشان بنایا اور تم کو زمین میں رہنے کے لئے بھیجا کہ آج تم اس کے عمارتوں میں عالی شان محل بناتے اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔

وَإِذْ شَاؤْنَا إِذْ جَعَلْنَاكُمْ خُلَفَاءَ مِنْ أَعْدَائِكُمْ فِي الْأَرْضِ لَلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكٰفِرِينَ  
سُحُوبًا مَّصُورًا وَتَجْعَلُونَ الْجِبَالَ سُوحًا  
(الاعراف - ۷۴)

شہر کی یہ صنعت دکھ تراشتی، ویسی ہی تھی جیسی ہندوستان میں ایلوہ اور بعض دوسرے مقامات پر پانی جاتی ہے یعنی وہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بناتے تھے۔ مدائن صالح میں اب تک ان کی یہ عمارتیں چوٹی کی ٹوں موجود ہیں اور ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم نے انجینئری میں کتنی برکت اگیز ترقی کی تھی۔

حجر قوم محمود کا مرکزی شہر تھا اور اس کے کھنڈر مدینہ کے شمال مغرب میں موجودہ شہر العلا سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ مدینہ سے بنو ک جلتے ہوئے یہ مقام شاہ راہ عام پر ملتا ہے۔ اور قافلے اس وادی میں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے مطابق کوئی یہاں قیام نہیں کرتا۔

آٹھویں صدی ہجری میں ابن بطوطہ حج کو جاتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں ٹرننگ سنگ کے پہاڑوں میں قوم محمود کی عمارتیں موجود ہیں جو انہوں نے چٹانوں کو تراش تراش کر ان کے اندر بنائی تھیں ان کے نقش و نگار اس وقت تک ایسے تازہ ہیں جیسے آج بناتے گئے ہیں۔ ان مکانات میں اب بھی ٹری گلی انسانی پتھریاں پڑی ہوئی ملتی ہیں۔

ماوی ترقی اور اخلاقی رکاوٹ

اس قوم کے متعلق قرآن مجید میں مختلف مقامات (مثلاً الاعراف آیات ۷۳ تا ۷۹۔ ہود آیات ۶۱ تا ۶۸۔ الحجر آیات ۸۰ تا ۸۶)

۱۔ نذرہ بنو ک کے موقع پر محمود کے ان کھنڈروں میں جو مسلمان میر کرنے پھر رہے تھے ان کو آپ نے جمع کیا اور ان کے سامنے ایک ٹھنڈا دیا جس میں محمود کے انجام پر عبرت دلائی اور فرمایا کہ یہ اسی قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا لہذا یہاں ایسے بلے گز رہاؤ۔ یہ سیرگاہ نہیں ہے بلکہ دوسرے کا مقام ہے۔



تم یہ جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کی طرف سے  
بھیجا گیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا ہم اس چیز  
پر ایمان رکھتے ہیں جس کو رس کر دینے والے ہیں  
ان منکرین نے کہا جس چیز پر تم ایمان لاتے ہو اس  
کے ہم کافر ہیں۔

قَالُوا إِنَّا بِنَمَا أُرْسِلَ بِهِ الْمُرْسَلُونَ، قَالَ  
الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنَّا بِهِ  
كَافِرُونَ۔

الاعراف۔ آیات ۷۵-۷۶

دوسرے مقام پر قوم صالح کے سرداروں کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ آتے صالح کے آوہ عذاب ہم پر جس کی  
تو میں دھمکی دیتا ہے، اگر واقعی رسولوں میں سے ہے (الاعراف آیت ۷۷)  
معجزہ کا مطالبہ

ہم اونٹنی کو ان کے لیے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں،  
اب صبر کے ساتھ دیکھ کہ ان کا کیا انجام ہوتا ہے  
ان کو خدا سے کہ پانی ان کے اور اونٹنی کے درمیان  
تقسیم ہوگا اور ہر ایک اپنی باری کے دن پانی پرائے گا۔

إِنَّا مُوسِعُونَ الْفِتْنَةَ لَكُمْ فَارْتَبِعُوا  
وَأَطِيعُوا أَمْرًا مِّنْ أَمَانَةٍ لِّقَوْمٍ  
كَلِمَاتٍ يَّخْتَصِمُونَ۔ (النمر ۲۷-۲۸)

یہ تشریح ہے اس ارشاد کی کہ ہم اونٹنی کو ان کے لیے فتنہ بنا کر بھیج رہے ہیں۔ وہ فتنہ یہ تھا کہ یکایک ایک  
اونٹنی لاکر ان کے سامنے کھڑی کر دی گئی اور ان سے کہہ دیا گیا کہ ایک دن یہ اسی پانی پیتے گی اور دوسرے دن تم  
سب لوگ اپنے لیے اور اپنے جانوروں کے لیے پانی لے سکو گے۔ اس کی باری کے دن تم میں سے کوئی شخص  
کسی چشمے اور کنوئیں پر نہ خود پانی لینے کے لیے آئے، اور نہ اپنے جانوروں کو پلانے کے لیے لائے۔ یہ پہلی اس  
شخص کی طرف سے دیا گیا تھا جس کے متعلق وہ خود کہتے تھے کہ یہ کوئی لاؤشکر نہیں رکھتا، نہ کوئی بڑا ستھان اس کی  
پشت پر ہے۔

فیصلہ کن نشانی

سورہ شعراء آیات ۵۴ تا ۵۶ میں تصریح ہے کہ تم دو دلوں نے خود ایک ایسی نشانی کا حضرت صالح سے  
مطالبہ کیا تھا جو ان کے ماموں من اللہ ہونے پر کھلی دلیل ہو اور اسی کے جواب میں حضرت صالح نے اونٹنی کو پیش کیا  
تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور معجزے کے طور پر ہوا تھا اور یہ اسی نوعیت کے  
معجزات میں سے تھا جو بعض انبیاء نے اپنی نبوت کے ثبوت میں منکرین کے مطالبہ پر پیش کیے ہیں نیز یہ بات ہی اس

ایسی بات سورہ اعراف میں ارشاد ہوئی ہے۔ آیت ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳

اُدٹنی کی معجزانہ پیدائش پر دلیل ہے کہ حسرت ساری نے اسے پیش کر کے منکرین کو دھمکی دی کہ بس اب اس اُدٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی متعلق ہے یہ آزاوانہ تمہاری زمینوں میں جتنی پھرے گی ایک دن یہ اکیلی پانی پیسے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پھین گے اور اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکا یک تم پر خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی پیڑائش کی جا سکتی تھی جس کا خیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہوا پھر یہ بات کہ ایک کافی مدت تک یہ لوگ اس کے آزاوانہ چرتے پھرتے کو اور اس بات کو کہ ایک دن وہ تنہا پانی پیسے اور دوسرے دن ان سب کے جانور پھینیں۔ باول ان خواہستہ برداشت کیتے رہتے۔ اور آخر ٹرے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا۔ درآئیں لیکن نہتہ سارح کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انہیں کوئی خوف ہوتا۔ اس حقیقت پر مزید دلیل یہ ہے کہ وہ لوگ اس اُدٹنی سے خوف زدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی زور ہے جس کے بل پر وہ ہمارے درمیان دندناتی پھرتی ہے۔

### اُدٹنی کا قتل

فوتوروا ان قد وخذوا ما اُمروا بھیکہ  
 انہوں نے اُدٹنی کو قتل کر ڈالا اور اپنے رب کے حکم  
 الا عزت لنا  
 کی نافرمانی کی۔

کافی مدت تک یہ اُدٹنی ہماری قوم کے لیے ایک مسئلہ ہی رہی لوگ اس پردوں میں اُدٹنتے رہتے، ہنوسے ہوتے رہتے، اور آخر کار ایک من چلے سوار نے اس کام کا بیڑا اٹھا یا کہ وہ قوم کو اس بلا سے نجات دلانے کا شورہ شمس میں اُس شخص کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ اذ انبعث اشعاہنا جبکہ اٹھا اس قوم کا سب سے زیادہ ہتھی آدمی اور سورہ قمر میں فرمایا گیا ہے فَاذْوَاصِحَابِهِمْ فَتَعَالَىٰ فَعَفُوْا انہوں نے اپنے رفیق سے اپیل کی۔ آخر کار وہ یہ کام اپنے ذمے لے کر اٹھا اور اس نے اُدٹنی کی کوہیں کاٹ ڈالیں۔ اگرچہ اُدٹنی کو مارا ایک شخص نے تھا جبکہ سورہ قمر اور سورہ شمس میں ارشاد ہوا ہے لیکن چونکہ پوری قوم اس مجرم کی پشت پر تھی اور وہ واسطی اس مجرم میں پوری قوم کی مرضی کا آکر کاربند تھا اس لیے الزم پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے۔

سورہ قرآن میں امر کی کوئی تصریح نہیں کرتا کہ یہ کون کونسی تھی اور کس طرح وہ بدیہی تھی کسی صحیح حدیث میں بھی اس کی کیفیت بیان نہیں کی گئی ہے۔ اس لیے ان روایات کو تسلیم کرنا کچھ ضروری نہیں جو منسخرین نے اس کی کیفیت پیدائش سے متعلق نقل کی ہیں لیکن یہ بات کہ وہ کسی نہ کسی طور پر معجزے کی حیثیت رکھتی تھی قرآن سے ثابت ہے۔ عہد ہر وہ گناہ بد قوم کی خواہش کے مطابق کیا جائے یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور بہت بے درگی حاصل ہو ایک توئی گناہ ہے۔ خواہ اس کا ارتکاب کرنے والا ایک فرد یا عددی ہو حرف سب نہیں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ جو گناہ قوم کے درمیان علی الامان



کنجلی ہوئی لاشیں پڑی تھیں جیسے باڑے کی باڑھیں لگی ہوئی جھاڑیاں جانوروں کی آمد و رفت سے پامال ہو کر رہ گئی ہوں نہ ان کے سنگین قفسر انہیں اس آفت سے بچاسکے نہ پہاڑوں میں کھودے ہوئے غارے۔

اہل ایمان کو بچا لیا گیا

فَلَمَّا جَاءَ آمْرُنَا جَعَلْنَا طَلْحًا وَالزَّيْنَبَ  
 اِمْنًا مَعَدَّةً لِمَنْ مَنَّا وَمِنَ بَنِي  
 يَسْرِبَاطٍ - ر مجود، آیت ۶۶

آخر کار جب ہمارے قبیلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رمت سے صلح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لاتے تھے بچا لیا اور اسٹن کی رسوائی سے ان کو محفوظ رکھا۔

جزیرہ غماتے سینا میں جو روایات مشہور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ثمود پر عذاب آیا تو حضرت صالح ہجرت کر کے وہاں چلے گئے تھے۔ چنانچہ حضرت ثمودی دالے پہاڑ کے قریب ہی ایک پہاڑی کا نام نبی صالح ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی جگہ آنجناب کی ہاتے قیام تھی۔ ۲۹۳

ثمود کا تمدنی عروج اور اس کے آثار

جس طرح عمار کے تمدن کی نمایاں ترین خصوصیت یہ تھی کہ وہ اونچے اونچے ستونوں والی عمارتیں بناتے تھے، اسی طرح ثمود کے تمدن کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت، جس کی بنا پر وہ قدیم زمانے کی قوموں میں مشہور تھے یہ تھی کہ وہ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان کے اندر عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ سورہ فہیر میں جس طرح عاد کو ذات اعمام رستوں والے، کالقب دیا گیا ہے اسی طرح ثمود کا ذکر اس سوا سے کیا گیا ہے کہ اَلَّذِينَ جَاءُوا النُّصْرَ يَأْتُوا دِبْرًا وَهِيَ غَابِرَةٌ وَرُءُوسُهَا فِي الْمَدَائِنِ۔ اس کے علاوہ قرآن میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ اپنے ہاں میدانی علاقوں میں بھی بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے تھے۔ تَتَخَذُونَ مِنْ نُصْرَتِنَا حُتُوتًا۔ (الاعراف۔ آیت ۴۴) اور ان کی تعمیرات کی غرض و غایت کیا تھی؟ قرآن اس پر اظہارِ فکر سے روشنی ڈالتا ہے، یعنی یہ سب کچھ اپنی بڑائی، اپنی دولت و قدرت اور اپنے کمالات فن کی نمائش کے لیے تھا، کوئی حقیقی ضرورت ان کے لیے داخلی نہ تھی۔ ایک بگڑے ہوئے تمدن کی شان یہی ہوتی ہے۔ ایک طرف معاشرے کے غریب لوگ سر چھپانے تک کو ڈسنگ کی جگہ نہیں پاتے۔ دوسری طرف اُمراء اور اہل ثروت رہنے کیلئے جب ضرورت سے زیادہ محل بنا سکتے ہیں تو بلا ضرورت نمائشی یا دکاریں تعمیر کرنے لگتے ہیں۔

ثمود کی ان ہمارے لوگوں میں سے کچھ اب بھی باقی ہیں جنہیں دسمبر ۱۹۵۹ء میں میں نے خود دیکھا ہے۔ مغرب کے

صفحات ہیں ان کی کچھ تصویریں دی جا رہی ہیں۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ اور نبوک کے درمیان حجاز کے مشہور تمام اقدار سے جس کو عہد نبوی میں دادی انقری کہا جاتا تھا، چند میل کے فاصلے پر بجانب شمال واقع ہے۔ آٹھ بھی اس جگہ کو مقامی باشندے اٹھرا اور مدائن صالح کے ناموں ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اس علاقے میں اقلہ نواب بھی ایک نہایت سرسبز و شاداب وادی ہے جس میں کثرت سے چشے اور باغات ہیں مگر الحج کے گرد و پیش بڑی سخت پائی جاتی ہے۔ آبادی ہر اسے نام ہے۔ روئیدگی بہت کم ہے۔ چند کنوئیں ہیں انہی میں سے ایک کنوئیں کے متعلق مقامی آبادی میں یہ روایت پائی آرہی ہے کہ حضرت صالح کی اذنی اسی سے پانی پیتی تھی۔ اب وہ ترکی عہد کی ایک ویران چھوٹی سی خوب چوکی کے اندر پایا جاتا ہے اور بالکل خشک پڑا ہے اس کی تصویر دی جا رہی ہے) اس علاقے میں جب ہم داخل ہوئے تو اقلہ کے قریب پہنچتے ہی سہلرت ہمیں ایسے پہاڑ نظر آئے جو بال کھیل کھیل ہو گئے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ کسی سخت ہولناک زلزلے نے انہیں سطح زمین سے چوٹی تک بھونڈ کر قاش قاش کر رکھا ہے (ان پہاڑوں کی بھی کچھ تصویریں متقابل کے صفحات پر دی جا رہی ہیں)۔ اسی طرح کے پہاڑ ہمیں مشرق کی طرف اقلہ سے خیر جاتے ہوئے تقریباً ۵ میل تک اور شمال کی طرف ریاست اردن کے حدود میں ۳۰-۴۰ میل اندر تک ملتے چلے گئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تین چار سو میل لمبا اور ۱۰۰ میل چوڑا ایک علاقہ تھا جسے ایک زلزلہ و عظیم نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ نمودی جو عمارتیں ہم نے انجھ میں دیکھی تھیں، اسی طرف کی چند عمارتیں ہم کو ضلع عقبہ کے کنارے مدین کے مقام پر اور اردن کی ریاست میں پترا (Petra) کے مقام پر بھی ملیں۔ خصوصیت کے ساتھ پترا میں نمودی عمارت اور نیپلیوں کی بنائی ہوئی عمارت پہلو پہلو موجود ہیں اور ان کی تراش خراش اور طرز تعمیر میں اتنا نمایاں فرق ہے کہ ہر شخص ایک نظر دیکھ کر ہی سمجھ سکتا ہے کہ دونوں نہ ایک زمانے کی ہیں اور نہ یہ ایک ہی قوم کا طرز تعمیر ہے۔

انگریز مستشرق ڈاؤنی (Daughy) قرآن کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے انجھ کی عمارت کے متعلق یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ نمودی نہیں بلکہ نیپلیوں کی بنائی ہوئی عمارت ہیں لیکن دونوں کی عمارت کا فرق اس قدر واضح ہے کہ ایک اندھا ہی انہیں ایک قوم کی عمارت کہہ سکتا ہے۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ پہاڑ تراش کر ان کے اندر عمارتیں بنانے کا فن نمود سے شروع ہوا، اس کے ہزاروں سال بعد نیپلیوں نے دوسری اور پہلی صدی قبل مسیح میں اسے عروج پر پہنچایا اور پھر امپوریا میں جس کے نام پترا سے تقریباً سات سو برس بعد کے ہیں، یہ فن اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ ۲۹۲



## قوم ابراہیم علیہ السلام

حضرت نوح کے بعد حضرت ابراہیم پیغمبر نبی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالمگیر دعوت پھیلانے کے لیے مشرق کی تھما۔ انہوں نے اپنے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت گاہگ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے فیلسفہ مقرر کیے۔ مشرق اُردوں میں اپنے بھتیجے حضرت کوثر کو، شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحاق کو اور اندلس میں عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے نکلے ہیں وہ گھر تعمیر کیا۔ نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے یہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔ ۴۶۶

مولد ابراہیم علیہ السلام

جدید تاریخی تحقیقات کے سلسلہ میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہو گیا ہے جہاں حضرت ابراہیم پیدا ہوئے تھے بلکہ دور ابراہیمی میں اس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑی ہے۔ سر لیونارڈ وولی

( Sir Leonard Woolley ) نے اپنی کتاب ( Abraham, London, 1935 )

میں اس تحقیقات کے جو نتائج ناسخ کیے ہیں ان کا خلاصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

### شہر اُرد کے متعلق تاریخی و تمدنی معلومات

اندازہ کیا گیا ہے کہ سن ۲۳ قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ میں، جسے اب عام طور پر مختصین حضرت ابراہیم کے ظہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں، شہر اُرد کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی اور بعد نہیں کہ پانچ لاکھ ہو گیا۔ شہر اُرد و تجارتی مرکز تھا۔ ایک طرف پامیر اور بلخ کی طرف تک سے وہاں مال آتا تھا اور دوسری طرف اناطولیہ تک سے اس کے تجارتی تعلقات تھے۔ جس ریاست کا یہ سرد مقام تھا اس کے حدود موجودہ حکومت عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھے۔ ملک کی آبادی بیشتر صنعت و تجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو عمر ریاست آٹا پر قدیم کے کنڈرٹوں میں دستیاب ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطہ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت

لگانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سُودِ خواری کثرت سے پھیلنے لگی تھی۔ بھنت کار و دباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو تنگ کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آپس میں بہت متعصب بنائیاں ہوتی تھیں۔ اپنے خداؤں سے ان کی دعائیں زیادہ تر دراز می عمر، خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی۔

(۱) غمیلو۔ یہ اونچے طبقے کے لوگ تھے، جن میں چجاری، حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔  
(۲) مشکینو۔ یہ تچار، اہل صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔

(۳) اردو۔ یعنی غلام

ان میں سے پہلے طبقہ یعنی غمیلو کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوجداری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے اور ان کی جان و مال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

یہ شہر اور یہ معاشرہ تھا جس میں حضرت ابراہیمؑ نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا اور ان کے خاندان کا جو مال ہمیں ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غمیلو طبقہ کے ایک فرد تھے اور ان کا باپ ریاست کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا۔ ان کے ہاں سلطنت کے سب سے بڑے عہدے (Chief Officer of the State) کا منصب رکھتا تھا۔

صنعت، معاہدہ اور مذہبی مراسم

اُن کے کعبات میں تقریباً ۱۵ ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ خدا ہوتا تھا جو ربّ اللہ، مہادیو یا رئیس الالہہ سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ اُن کا ربّ الہیہ "نار" (چاند دیوتا) تھا اور اسی مناسبت سے ہند کے لوگوں نے اس شہر کا نام "قمریہ" بھی رکھا ہے۔ دوسرا بڑا شہر کرسنہ تھا جو بعد میں اُن کے بجائے مرکزِ سلطنت ہوا۔ اس کا ربّ الہیہ "شاش" (سورج دیوتا) تھا۔ ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے اور کم تر زمین سے غائب کیے گئے تھے اور لوگ اپنی مختلف فروری ضروریات اُن سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی اور زمینی دیوتاؤں کی شبیہیں بتوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں اور تمام مراسمِ عبادت انہی کے آگے بجالاتے تھے۔ "نار" کا ربّ اُن میں سب سے اونچی پجاری پر ایک عالی شان عبادت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب "نار" کی بیوی "ن گل" کا معبد تھا۔ "نار" کے معبد کی شان ایک شاہی محل سرا کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ایک پجاریں جا کر اس کی دلہن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر رقص تھیں اور ان کی حیثیت دیوراسیوں (Allegious Prostitutes) کی سی تھی۔

وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو "خدا" کے نام پر اپنی بھارت قربان کر دے۔ کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو "براہ خدا" میں کسی اجنبی کے حوالہ کرنا عورت کے لیے ذریعہ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں کہ اس مذہبی فحشہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پنجابی حضرات ہی ہوتے تھے۔

### نثار دیوتا کا مقام

نثار محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ ملک کا سب سے بڑا زمیندار، سب سے بڑا تاجر، سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغ، مکانات، اور زمینیں اس مندر کے لیے وقف تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی کے علاوہ کسان، زمیندار، تجارتی سب سے ہر قسم کے خلق، رُودھ، سونا، کپڑا اور دوسری چیزیں تاکہ مندر میں نذر بھی کرتے تھے۔ تجارتی کاروبار بھی بہت بڑے پیمانے پر مندر کی طرف سے جڑا تھا۔ یہ سب کام دیوتا کی نیابت میں پنجابی ہی انجام دیتے تھے پھر ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی مندر ہی میں تھی۔ پنجابی اس کے جج تھے اور ان کے فیصلے "خدا" کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ خود شاہی خاندان کی حاکمیت بھی نثار ہی سے ماخوذ تھی۔ اصل بادشاہ نثار تھا اور فرما دیتے ملک اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ اس تعلق سے بادشاہ خود بھی معبودوں میں شامل ہو جاتا تھا اور خداؤں کے مانند اس کی پرستش کی جاتی تھی۔

### نرودی سلطنت کا آغاز، عروج اور خاتمہ

آرکا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیم کے زمانہ میں حکمران تھا اس کے یانی اول کا نام نرود تھا جس نے ۱۳۰۰ برس قبل مسیح ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے محدود مملکت مشرق میں شوسہ سے لے کر مغرب میں لبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اسی سے اس خاندان کو "نرود" کا نام ملا جو عربی میں جا کر نرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان پر مسلسل تباہی نازل ہوئی شروع ہوتی پہلے عیلامیوں نے آرکا شاہ کیا اور نرود کو نثار کے بت سمیت کپڑے گئے۔ پھر کرتھہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت آرکا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی نسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور کرتھہ اور نرودوں اس کے زیرِ حکم ہو گئے۔ ان تباہیوں نے نثار کے ساتھ آرڈ کے لوگوں کا عقیدہ مندر لٹل کر دیا کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

### تعلیم ابراہیمی کے اثرات بعد کے ادوار میں

تعلیم کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ بعد کے ادوار میں حضرت ابراہیم کی تعلیمات کا اثر اس ملک کے لوگوں نے کہاں تک قبول کیا۔ لیکن ۱۹۱۰ء قبل مسیح میں بابل کے بادشاہ جمبولی دابیل کے اُمراہیل نے جو قومیں تہذیب کیے تھے وہ شہادت دیتے ہیں کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کی تہذیب میں مشکوٰۃ نبوت سے حاصل کی ہوئی مشاکلا

کسی حد تک ضرور کار فرما تھی۔ ان قوانین کا مفصل کتبہ سنہ ۱۹۰۲ء بعد مسیح میں ایک فرانسیسی مفقش آثار قدیمہ کو ملا اور اس کا انگریزی ترجمہ C. H. W. John کے نام سے شائع کیا۔ اس ضابطہ قوانین کے بہت سے اصول اور فروع موسوی شریعت سے مشابہت رکھتے ہیں۔

### مکمل مشرکانہ نظام تمدن

یہ اب تک کی اثری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدہ اور میت پرستانہ عبادت کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری معاشی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدے پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت ابراہیم تو سید کی جو دعوت لے کر آئے تھے اس کا اثر صرف تموں کی پرستش ہی پر نہ پڑتا تھا بلکہ شاہی خاندان کی معبودیت اور حاکمیت، پجاریوں اور اونچے طبقوں کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی حیثیت، اور پورے ملک کی اجتماعی زندگی اس کی زد میں آئی جاتی تھی۔ ان کی دعوت کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ نیچے سے اوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت اُدھیڑ ڈالی جائے اور اسے از سر نو تجدید اللہ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔ اسی لیے ابراہیم علیہ السلام کی آواز بلند ہوتے ہی عوام اور خواص، پجاری اور فرود سب کے سب بیک وقت اس کو دبانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ۲۹۵

### فرودمی نظام شرک کا جائزہ

قدیم ترین زمانے سے آج تک تمام مشرک سوسائٹیوں کی یہ مشترک خصوصیت رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو رب الارباب اور خدائے مذاہب کا کی حیثیت سے تو مانتے ہیں، مگر صرف اسی کو رب اور تہا اسی کو خدا اور معبود نہیں مانتے۔

خدائی کو مشرکین نے ہمیشہ دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک فرق الفطری (supernatural) خدائی جو سلسلہ اسباب پر حکمران ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارواح اور فرشتوں اور جنوں اور سیاروں اور دوسری بہت سی ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں، ان سے دعائیں مانگتے ہیں، ان کے سامنے مراسم پرستش بجالانے ہیں اور ان کے آستالوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری تمدنی اور سیاسی معاملات کی خدائی (یعنی حاکمیت) جو قوانین جاسا مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعت امر کی مستحق ہو، اور جسے دنیوی معاملات میں فرمان روائی کے مطلق اختیارات حاصل ہوں۔ اس دوسری قسم کی خدائی کو دنیا کے تمام مشرکین نے قریب قریب ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب

کر کے، یا اس کے ساتھ شاہی خاندانوں اور مذہبی پروہتوں اور سوسائٹی کے اگلے پھلے بڑوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اکثر شاہی خاندان اسی دوسرے معنی میں خدائی کے تدعی ہوئے ہیں۔ اور اسے منظم کرنے کے لیے انہوں نے مہم پہلے معنی والے خدافوں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور مذہبی طبقے اس معاملے میں ان کے ساتھ شریک سازش رہے ہیں۔

نرود کا دعویٰ خدائی بھی اسی دوسری قسم کا تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسباب عالم کے پورے سلسلے پر اس کی حکومت چل رہی ہے۔ بلکہ اسے دعویٰ ان امر کا تھا کہ اس ملک عراق کا اور اس کے باشندوں کا ساکم مطلق میں بٹوں، میری زبان قانون ہے، میرے اوپر کوئی بالاتر اقتدار نہیں ہے جس کے سامنے میں جواب دہ ہوں، اور عراق کا ہر وہ باشندہ باغی و فدا رہے جو اس حیثیت سے مجھے اپنا رب نہ مانے یا میرے سوا کسی کو گورب تسلیم کرے۔

### حضرت ابراہیم کی دعوت توحید کی سیاسی نرود

ابراہیم علیہ السلام نے جب کہا کہ میں صرف ایک رب العالمین ہی کو خدا اور معبود اور رب مانتا ہوں اور اس کے سوا سب کی خدائی اور ربوبیت کا قطعی طور پر منکر ہوں، تو سوال صرف یہی پیدا نہیں ہوا کہ قومی مذہب اور مذہبی معبودوں کے بارے میں ان کا یہ نیا عقیدہ کہاں تک قابل برداشت ہے، بلکہ یہ سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا کہ قومی ریاست اور اس کے مرکزی اقتدار پر اس عقیدے کی جو نہ دھڑکتی ہے اسے کیونکر نظر انداز کیا جاسکتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم جرم بغاوت کے الزام میں نرود کے سامنے پیش کیے گئے۔

### حضرت ابراہیم کا اتمام حجت

اس وقت جب نرود سے ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا "زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے" حضرت ابراہیم نے کہا "اچھا اللہ تعالیٰ کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا" یہ سن کر وہ منکر حق ششدر رہ گیا۔

اگرچہ حضرت ابراہیم کے پہلے فقرے ہی سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا، تاہم نرود اس کا جواب ڈھٹائی سے دے گیا۔ لیکن دوسرے فقرے کے بعد اس کے لیے فریڈوشانی سے کچھ کہتے مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اسی خدا کے زیر نسران ہیں، جس کو ابراہیم نے رب مانا ہے پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا ہے مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے آئی تعاب ہو رہی تھی اس کو تسلیم کر لینے کے معنی اپنی مطلق العنان فرمانروائی سے دست بردار ہونا

کے تھے، جس کے لیے اس کے نفس کا طاغوت تیار نہ تھا۔ لہذا وہ صدمت شدت سے ہی ہمو کر رہ گیا، خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا۔ اگر اس طاغوت کے بجائے اس نے خدا کو اپنا ولی و مددگار بنایا ہوتا، تو اس کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی اس تبلیغ کے بعد راہِ راست نکل جاتی۔

نارِ نمرود اور گلزارِ خلیلؑ

تلمود کا بیان ہے کہ اس کے بعد بادشاہ کے حکم سے حضرت ابراہیمؑ قید کر دیئے گئے۔ دس روز تک وہ جیل میں رہے پھر بادشاہ کی کونسل نے ان کو زندہ جلا دینے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۶ھ

قرآن مجید کی روش سے بھی انہوں نے واقعی اپنے اس فیصلے پر عمل کیا اور جب آگ کا اڈا تیار کر کے انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو اس میں پھینکا تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیمؑ کے لیے ٹھنڈی ہو جائے اور یسے ضرر بن کر رہ جائے۔ ۱۹۷ھ

قومِ ابراہیمؑ دنیا سے مٹ گئی اور ایسی مٹی کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا، اس میں سے اگر کسی کو بقا نصیب ہو تو صرف ابراہیمؑ علیہ السلام اور ان کے مبارک فرزندوں راسماعیلؑ و اسحاقؑ کی اولاد ہی کو نصیب ہوئی۔  
قرآن میں اگرچہ اس عذاب کا ذکر نہیں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیمؑ کے نکل جانے کے بعد ان کی قوم پر آیا، لیکن اس

۱۹۸ھ۔ العنکبوت ۶۴۔ العنکبوت : ۹۴-۹۵۔ (ترجمہ)

نہ حضرت ابراہیمؑ کے آگ میں پھینکے جانے کے واقعہ کے متعلق قرآن کے حسبِ ذیل مقامات دیکھئے چاہئیں :- الانبیاء، آیت ۵۱۔  
تلم یہ بھی صریح طور پر ان معجزات میں سے ایک ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان معجزات کی اس بیسے نامیسی کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے لیے بھی نظامِ عالم کے معمولی (Routines) سے ہٹ کر کوئی غیر معمولی کام کرنا ممکن نہیں ہے تو آخر وہ خدا کو ملتے ہی کی رحمت کیوں اٹھاتا ہے؟ اور اگر وہ اس طرح کی تاویلیں اس لیے کرتا ہے کہ جدید زمانے کے نام نہاد عقیدت پرست ایسی باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ زندہ خدا تیرے اوپر یہ فرض کس نے عائد کیا تھا کہ تو کسی نہ کسی طرح انہیں منوا کر ہی چھوڑ؟ جو شخص قرآن کو جیسا کہ وہ ہے، ملتے کے لیے تیار نہیں ہے، اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسے منوانے کی خاطر قرآن کو اس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا جبکہ قرآن کے الفاظ و قیام قدم پر اس کے معنی کی فراہمیت کر رہے ہوں، آخر کس قسم کی تبلیغِ سبت اور کون محقول آدمی اسے جانتا سمجھ سکتا ہے؟ ۱۹۹ھ

تلم بعد تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو مخاطب کر کے یہ اعلان فرمایا کہ اِنِّیْ جَعَلْتُکَ اِلٰہًا لِّمَنْ اَرَادَ الْاٰتَمَہُ الْاٰتَمَہُ  
یعنی ہم نے تمہیں ساری انسانیت کی امامت کا منصب سونپا۔ چنانچہ آج دنیا کے تمام زندہ البہامی سلسلہ مذاہب کے پیرو  
مسلمانوں کے علاوہ یہودی اور نصرانی حضرت ابراہیمؑ سے کیساں وابستگی رکھتے ہیں۔ (ترجمہ)

کا شمار منتخب قوموں ہی میں کیا گیا ہے۔ ۷۹۹

بابل کے وہ حکمران اور پندت اور پروست جنہوں نے ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو نپچا دکھانا چاہا تھا اور اس کے وہ مشرک باشندے جنہوں نے آنکھیں بند کر کے ان ظالموں کی پیروی کی تھی، وہ تو دنیا سے مٹ گئے اور ایسے مٹے کہ آج دنیا میں کہیں ان کا نام و نشان تک باقی نہیں، مگر وہ شخص جسے اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے جرم میں ان لوگوں نے جلا کر خاک کر دیا چاہا تھا، اور جسے آخر کار بے سرو سامانی کے عالم میں وطن سے نکل جانا پڑا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے یہ سرفرازی عطا فرمائی کہ چار ہزار برس سے دنیا میں اس کا نام روشن ہے اور قیامت تک رہے گا۔ دنیا کے تمام مسلمان، عیسائی اور یہودی اس خلیل رب العالمین کو بالاتفاق اپنا پیشوا مانتے ہیں۔ دنیا کو ان چالیس صدیوں میں جو کچھ بھی بدایت کی روشنی میسر آئی ہے اسی ایک انسان اور اس کی پاکیزہ اولاد کی بدولت میسر آئی ہے۔ آخرت میں جو اجر عظیم اس کو ملے گا وہ تو ملے گا ہی، مگر اس دنیا میں بھی اس نے وہ عزت پائی جو حصول دنیا کے پیچھے جان کھپانے والوں میں سے کسی کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔

### تلمود کا بیان

حضرت ابراہیم کی زندگی کے اس اہم واقعے کا بائبل میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے عراقی دور کا کوئی واقعہ بھی اس کتاب میں جگہ نہیں پاسکا ہے۔ فرود سے ان کی مذہب، باپ اور قوم سے ان کی کشمکش، ہجرت کے خلاف ان کی جدوجہد، آگ میں ڈالے جانے کا قصہ اور بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا، ان میں سے ہر چیز بائبل کی کتاب "پیدائش" کے مصنف کی نگاہ میں ناقابل التفات تھی۔ وہ صرف ان کی ہجرت کا ذکر کرتا ہے مگر وہ بھی اس انداز سے کہ جیسے ایک خاندان تلاش معاش میں ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو رہا ہے۔ قرآن اور بائبل کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اختلاف یہ ہے کہ قرآن کے بیان کی روش سے حضرت ابراہیم کا مشرک باپ ان پر ظلم کرنے میں پیش پیش تھا، اور بائبل کہتی ہے کہ ان کا باپ خود اپنے بیٹوں، پوتوں اور بیہودوں کو لے کر حاران میں جا بسا، پیدائش، باب ۱۱-آیات ۲۲ تا ۳۲۔ اس کے بعد یکایک خدا حضرت ابراہیم سے کہتا ہے کہ تو حاران کو چھوڑ کر کنعان میں جا کر بس جا اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام نرانا کروں گا، سو تو باعث برکت ہو، جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے" (پیدائش، باب ۱۲ آیت ۱-۳)۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک حضرت ابراہیم پر یہ نظر عنایت کیوں ہو گئی۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ الَّذِي قَدَّمَ قَوْمَ لُوطٍ وَ قَوْمَ عَادٍ وَ قَوْمَ ثَمُودَ وَ قَوْمَ إِبْرَاهِيمَ وَ أَحْضَبَ مَدْيَنَ وَ الْمَوْتَقِدَاتِ (التورہ آیت)

تلمود میں البتہ سیرت ابراہیمی کے عراقی دور کی وہ بیشتر تفصیلات ملتی ہیں جو قرآن کے مختلف مقامات پر بیان ہوتی ہیں، مگر دونوں کا تقابل کرنے سے نہ صرف یہ کہ قصے کے اہم اجزاء میں تین تفاوت نظر آتا ہے بلکہ ایک شخص صریح طور پر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تلمود کا بیان بکثرت بے جوڑ اور خلاف قیاس باتوں سے بھرا پڑا ہے اور اس کے برعکس قرآن بالکل متعین صورت میں حضرت ابراہیم کے اجسام و احوال و واقعات زندگی کو پیش کرتا ہے جن میں کوئی لغو بات آنے نہیں پائی ہے۔ تو ضیح مدعا کے لیے ہم یہاں تلمود کی داستان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ ان لوگوں کی غلطی پوری طرح کھل جائے جو قرآن کو بائبل اور یہودی لٹریچر کا خوشہ چین قرار دیتے ہیں۔

تلمود کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش کے روز نجومیوں نے آسمان پر ایک علامت دیکھ کر فرود کو مشورہ دیا تھا کہ تارح کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے اسے قتل کر دے۔ چنانچہ وہ ان کے قتل کے پلے ہوا۔ مگر تارح نے اپنے ایک غلام کا بچہ ان کے بدلے میں دے کر انہیں بچالیا۔ اس کے بعد تارح نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک غار میں سے جا کر چھپا دیا جہاں ۱۰ سال تک وہ رہے۔ گیارہویں سال حضرت ابراہیم کو تارح نے حضرت نوح کے پاس پہنچا دیا اور ۲۹ سال تک وہ حضرت نوح اور ان کے بیٹے سام کی تربیت میں رہے۔ اسی زمانے میں حضرت ابراہیم نے اپنی سگی بھتیجی سارہ سے نکاح کر لیا جو عمر میں ان سے ۲۲ سال چھوٹی تھیں۔ بائبل اس کی تصریح نہیں کرتی کہ سارہ حضرت ابراہیم کی بھتیجی تھیں۔ نیز وہ دونوں کے درمیان عمر کا فرق صرف دو سال بتاتی ہے۔ (پیدائش، باب ۱۱، آیت ۲۹۔ اور باب ۱۷، آیت ۱۷)

پھر تلمود کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم پچاس سال کی عمر میں حضرت نوح کا گھر چھوڑ کر اپنے باپ کے ہاں آگئے۔ یہاں انہوں نے دیکھا کہ باپ بنت پرست ہے اور گھر میں سال کے بارہ مہینوں کے حساب سے ۱۲ بت رکھے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو باپ کو سمجھانے کی کوشش کی، اور جب اس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو ایک روز موقع پا کر اس گھر بلونت خانے کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ تارح نے آکر اپنے خداؤں کا یہ حال جو دیکھا تو سیدھا فرود کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ ۵۰ برس پہلے میرے ہاں جو لڑکا پیدا ہوا تھا آج اس نے میرے گھر میں یہ حرکت کی ہے۔ آپ اس کا فیصلہ کیجیے فرود نے بلا کر حضرت ابراہیم سے باز پرس کی۔ انہوں نے سخت جوابات دیئے۔ فرود نے ان کو تو فوراً جیل بھیج دیا اور پھر معاملہ اپنی کونسل میں پیش کیا تاکہ صلاح مشورے سے اس مقدمے کا فیصلہ کیا جائے۔ کونسل کے ارکان نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ آگ کا ایک بڑا الاؤ تیار کر لیا گیا اور حضرت ابراہیم اس میں پھینک دیئے گئے۔ حضرت ابراہیم کے ساتھ ان کے بھائی اور نضر حاران کو بھی پھینکا گیا، کیونکہ فرود نے تارح سے جب پوچھا کہ تیرے اس بیٹے کو تو میں پیدائش ہی کے روز قتل کرنا چاہتا تھا، تو نے اس وقت اسے بچا کر دو سہرا بچہ کیوں اس کے بدلے قتل کر لیا، تو اس نے کہا



کہ میں نے حاربان کے کہنے سے یہ حرکت کی تھی، اس لیے خود اس فعل کے ترکیب کو تو چھوڑ دیا گیا اور مشورہ دینے والے کو حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ آگ میں پھینکا گیا۔ آگ میں گرتے ہی حاربان فریاد اٹھانے لگا کہ کوئلہ ہو گیا مگر حضرت ابراہیمؑ کو لوگوں نے دیکھا کہ اندراطمینان سے ٹہل رہے ہیں۔ غرود کو اس معاملے کی اطلاع دی گئی۔ اس نے آگ سے خود اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ لیا تو پکار کر کہا: "آسمانی خدا کے بندے سے، آگ سے نکل آ اور میرے سامنے کھڑا ہو جائے"

حضرت ابراہیمؑ باہر آگئے۔ غرود ان کا معتقد ہو گیا اور اس نے بہت سے قیمتی نذرانے ان کو دے کر رخصت کر دیا۔

اس کے بعد تلکورد کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ دو سال تک وہاں رہے۔ پھر غرود نے ایک ڈراوٹا خواب دیکھا اور اس کے نجومیوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ ابراہیمؑ تیری سلطنت کی تباہی کا موجب بنے گا، اسے قتل کرادے۔ اس نے ان کے قتل کے لیے آدمی بھیجے، مگر حضرت ابراہیمؑ کو خود غرود ہی کے عطا کیے ہوئے غلام البعزر نے قتل از وقت اس منصوبے کی اطلاع دے دی اور حضرت ابراہیمؑ نے بھاگ کر حضرت نوحؑ کے پاس پناہ لی۔ وہاں تارح آکر ان سے تحقیق طور پر پتہ چلا اور آخر باپ بیٹوں کی یہ صلاح ہوئی کہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ حضرت نوحؑ اور سام نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ تارح اپنے بیٹے ابراہیمؑ اور پوتے لوطؑ اور بیٹی اور بہوسارہ کو لے کر اُسے حاربان چلا گیا۔ (تفسیر تلمود از ایچ پولانو لندن صفحہ ۳۲ تا ۳۴)

کیا اس داستان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ قرآن کا ماخذ ہو سکتی ہے ہاں

## قوم لوطؑ

بائبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے دو بھائی تھے۔ نورا اور جاران۔ حضرت لوطؑ حاران کے بیٹے تھے (پیدائش باب ۱۱ آیت ۲۶)۔ سورہ عنکبوت آیت ۲۶ میں حضرت ابراہیمؑ کا جو تذکرہ آیا ہے اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قوم میں سے صرف ایک حضرت لوطؑ ہی ان پر ایمان لائے تھے۔ حضرت لوطؑ علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام، فلسطین و مصر میں گشت گشا کہ دعوتِ ذوالین کا تجربہ حاصل کرتے رہے پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر فخر فرما ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے جو قوم لوطؑ کے نام سے مشہور ہوئی ہے۔ اہل سدوم کو ان کی قوم اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ شاید ان کا نسبتہ داری کا تعلق اس قوم سے ہوگا۔

### قوم لوطؑ کا علاقہ

یہ قوم اُس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل شرقِ اردن (Trans Jordan) کہا جاتا ہے اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس قوم کے صدر مقام "سدوم" بتایا گیا ہے جو بحیرہ مردار کے قریب کسی بگڑ واقع تھا۔ ٹمڈ میں لکھا ہے کہ سدوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پرستی طاری ہونے لگتی تھی۔ مگر آج اس قوم کا نام و نشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی منقین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرہ مردار (Dead Sea) ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے جسے آج تک بکر لوطؑ کہا جاتا ہے۔

لے یہودیوں کی تعریف کر وہ بائبل میں حضرت لوطؑ کی سیرت پر جہاں اور بہت سے سیاہ و سبب ناسٹے گئے ہیں وہاں ایک دھبہ پر بھی ہے کہ وہ حضرت ابراہیمؑ سے لڑکر سدوم کے علاقے میں پھلے گئے تھے (پیدائش، باب ۱۳، آیت ۱۲)۔ مگر قرآن اس غلط بیانی کی تردید کرتا ہے۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اللہ نے انہیں رسول بنا کر اُس قوم کی طرف بھیجا تھا۔

حجرت سے شام اور عراق سے مہر جلتے ہوئے یہ تباہ شدہ علاقہ راستے میں پڑتا ہے اور عموماً قافلوں کے لوگ تباہی کے ان آثار کو دیکھتے ہیں جو اس پڑے علاقے میں آج تک نمایاں ہیں۔ یہ علاقہ بحرِ لوط (بحرِ مردار) کے مشرق اور جنوب میں واقع ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کے جنوبی حصے کے متعلق جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ یہاں اس درجہ دیرانی پانی جاتی ہے جس کی نظیر دوسرے زمین پر کہیں اور نہیں دیکھی گئی۔

**قوم لوط کا بگاڑ**

کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جلتے ہو اور تمہاری بیویوں میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے اُسے چھوڑ دیتے ہو بلکہ تم لوگ تو اس سے ہی گزر گئے۔

(۱) اَتَاكُتُونَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعُلَاقِبِیْنَ وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ مِنْكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ ظَالِمُونَ۔  
(الشعراء - آیت ۱۶۶)

کیا تم وہ بے حیائی کا کام کرتے ہو جو دنیا کی مخلوق میں سے کسی نے تم سے پہلے نہیں کیا۔ کیا تمہارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو اور رہبری کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں بڑے کام کرتے ہو۔

(۲) اِنَّكُمْ لَتَاكُتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِنَ الْعَالَمِیْنَ۔ رَا الْعَكْبُوْنَ اٰیةً  
(۳) اِنَّكُمْ لَتَاكُتُونَ الرِّجَالَ وَ تَقْطَعُوْنَ السَّیْبِیْنَ وَ تَاكُتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمْ الْمُنَكَرِ۔  
(العنكبوت - آیت ۲۹)

یعنی ان سے شہوت رانی کرتے ہو، جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے اِنَّكُمْ لَتَاكُتُونَ الرِّجَالَ سَهْوًا مُّعَیْنِ ذُوْنِ الشَّوَابِ۔ تم عواضِ نفس پوری کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر مردوں کے پاس جاتے ہو اور اوپر سے غضب یہ ہے کہ یہ (فحش کام چھپ کر بھی نہیں کرتے بلکہ علانیہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے اس کا ارتکاب کرتے ہو۔ یہی بات سورہ نمل میں فرمائی ہے اَتَاكُتُونَ الْفَاحِشَةَ وَ اَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ کیا تم ایسے بگڑ گئے ہو کہ دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے فحش کاری کرتے ہو۔

وہ قابلِ نفرت فعل جس کی بدولت قوم لوط نے شہرتِ دوام حاصل کی ہے، اس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز نہیں آتے، لیکن یہ فحشیتِ لُذُنِیَّہ کو حاصل ہے کہ اس کے فلاسفہ نے اس گناہ کو جرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس کے بعد جو کسریاتی رہ گئی تھی اُسے موجودہ یورپ اور امریکہ نے پورا کیا کہ علانیہ اس کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا گیا یہاں تک کہ ایک ملک (جرمنی) کی پارلیمنٹ نے اسے باقاعدہ جائز ٹھہرا دیا اور بعض اور مغربی ممالک میں بھی اب اسے قانوناً جائز کر دیا گیا ہے۔ لہذا حالانکہ یہ بالکل ایک صریح حقیقت ہے کہ مباشرت ہم جنس قطعی طور پر ذنبِ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذوی حیات

الوارع میں نرمی و مہارت کا فرق محض نناشل اور نفاستے نوع کے لیے رکھا ہے اور نوع انسانی کے اندر اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل کر ایک خاندان و جہود میں لائیں اور اس سے تمدن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کے لیے مرد اور عورت دو الگ صنفیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کے لیے صنعتی کشش پیدا کی گئی ہے۔ ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصد و وجوہیت کے لیے عین مناسب بنائی گئی ہے۔ اور ان کے جذب و اخذ اب میں وہ لذت رکھی گئی ہے جو فطرت کے نشا کو پورا کرتے کے لیے بیک وقت داعی و محرک بھی ہے اور اس خدمت کا سلسلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس اسکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذت حاصل کرتا ہے وہ ایک ہی وقت میں متعدد جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔ اولاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں غلغلہ عظیم برپا کرتا ہے جس سے دونوں کے جسم، نفس اور اخلاق پر نہایت بُرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ثانیاً وہ فطرت کے ساتھ غداری اور خیانت کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ فطرت نے جس لذت کو نوع اور تمدن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا، اور جس کے حصول کو فرائض اور ذمہ داریوں اور حقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا، وہ اسے کسی خدمت کی بجا آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر خریدتا ہے۔ ثالثاً، وہ انسانی اجتماع کے ساتھ کھل بددیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے فائدہ کے لیے ہوتے تمدنی اداروں سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، مگر حیب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے بجائے اپنی قوتوں کو پوری خود غرضی کے ساتھ ایسے طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدن و اخلاق کے لیے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مضرت رسان ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خدمت کے لیے ناپا بل بنا رہا ہے، اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی نارہن میں مبتلا کرتا ہے۔ اور کم از کم دو عورتوں کے لیے بھی منفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کے دروازے کھول دیتا ہے۔

۱۴۱ وَكَلَّمَا جَاءَتْ رُسُلُنَا لَوْطًا سِيقِي مَرِيحَهُمْ  
 وَصَاقَ بِحُجْرَتِهِمَا وَقَالَ هَذَا يَوْمُكُمْ  
 عَجِيبٌ ۚ وَجَاءُوا قَوْمَهُ يُهْرَعُونَ  
 إِلَيْهِ وَيَوْمَ قَبْلُ كَانُوا يَعْجُونَ السَّيِّئَاتِ  
 قَالَ لِقَوْمِهِ هَؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطَهَرُكُمْ  
 فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْذَلُوا فِي حَسْبِيَ النَّبِيُّ  
 مِنْكُمْ مَرَجِلٌ فَشِيدُوا - قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتُمْ

اور جب ہمارے فرشتے لوٹ کے پاس پہنچے تو ان کی  
 آمد سے وہ بہت گھبرایا اور دل تنگ ہوا اور کہنے  
 لگا کہ آج تیری مصیبت کا دن ہے۔ ان بہانوں  
 کا آنا تھا کہ، اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے  
 گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی  
 بدکاروں کے جوگہ تھے۔ لوٹتے ان سے کہا تھا جو  
 یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لیے پاکیزہ

عَانَا فِي بَدَنِكَ مِمَّا حَقَّ وَ إِيَّاكَ نَتَعَلَّمُ  
 ہاں کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہانوں کے  
 معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا  
 آدمی نہیں؟ (انہوں نے جواب دیا: نھیں وہ معلوم

ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔  
 اس قصے کی جو تفصیلات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں ان کے خواستے کلام سے یہ بات صاف تشریح ہوتی  
 ہے کہ یہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے ہاں پہنچے تھے اور حضرت لوطؑ اس بات سے بے خبر  
 تھے کہ یہ فرشتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان مہانوں کی آمد سے آپ کو سخت پریشانی و دل نگی لاتی ہوئی۔ اپنی قوم  
 کو جانتے تھے کہ وہ کیسی بد کردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت لوطؑ کا اشارہ قوم کی لڑکیوں کی طرف ہو کیونکہ نبی اپنی قوم کے لیے ہنتر نہ باپ ہوتا  
 ہے اور قوم کی لڑکیاں اس کی نگاہ میں اپنی بیٹیوں کی طرح ہوتی ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کا اشارہ  
 خود اپنی صاحبزادیوں کی طرف ہو۔ بہر حال دونوں صورتوں میں یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ حضرت  
 لوطؑ نے ان سے زنا کرنے کے لیے کہا ہو گا۔ یہ تمہارے لیے پاکیزہ ترین کا فقرہ ایسا غلط مفہوم لینے کی  
 کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ حضرت لوطؑ کا غنا صاف طور پر یہ تھا کہ اپنی شہوت نفس کو اس فطری اور جائز طریقے سے  
 پورا کرو جو اللہ نے مقرر کیا ہے اور اس کے لیے عزتوں کی کمی نہیں ہے۔

یہ فقرہ (وَلَا تُخْذَوْنَ فِي سَبِيحِي) ان لوگوں کے نفس کی پوری تصویر کھینچ دیتا ہے کہ وہ خیانت میں کس قدر  
 ڈوب گئے تھے۔ بات صرف اس حد تک ہی نہیں تھی کہ وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندی فلتان  
 فطرت راہ پر چل پڑے تھے، بلکہ فطرت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اب اسی گندی  
 راہ ہی میں تھی۔ ان کے نفس میں اب طلب اُس گندگی ہی کی رہ گئی تھی اور وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ کے متعلق  
 یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے کہ یہ راستہ تو ہمارے لیے بنا ہی نہیں ہے۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے  
 بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے جس سے فرد کو کسی مرتبے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس شخص کا معاملہ تو بہت ہلکا ہے جو  
 محض نفس کی کمزوری کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو جاتا ہو مگر حلال کو چاہنے کے قابل اور حرام کو بچنے کے قابل  
 چیز سمجھتا ہو۔ ایسا شخص کبھی سدھر بھی سکتا ہے، اور نہ سدھرے تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے  
 کہ وہ ایک بگڑا ہوا انسان ہے۔ مگر جب کسی شخص کی ساری رغبت صرف حرام ہی میں ہو اور وہ سمجھے کہ حلال  
 اس کے لیے ہے ہی نہیں تو اس کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جاسکتا۔ وہ دراصل ایک گندا کیرا ہے جو غلاظت  
 ہی میں پرورش پاتا ہے اور طبیعت سے اس کے مزاج کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ ایسے کیرے اگر کسی صفائی پسند

انسان کے گھر میں پیدا ہو جائیں تو وہ پہلی فرصت میں قبائل ڈال کر ان کے وجود سے اپنے گھر کو پاک کر دیتا ہے پھر بھلا خدا اپنی زمین پر ان گندے کیڑوں کے اجتماع کو کب تک گزارا کر سکتا تھا۔ ۱۵۰

۱۵۰. وَجَاءَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ يَسْتَبْشِرُونَ - قَالَ  
 إِنَّ هُوَ لَأَرْضِينِي فَمَا لِنَفْسِنَا أَنْ نَكْفُرَ  
 اللَّهُ فَلَا تُخْفُونَ عَلَيْنَا أَوْلَىٰ لَنَا بِمَا  
 كُنَّا نَعْمَدُ - قَالَ هُوَ لَأَرْضِينِي إِنَّ  
 كُنْتُمْ فَاعِلِينَ -

اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بیتاب ہو کر  
 لوط کے گھر چڑھ آئے۔ لوط نے کہا "بھائیو یہ جیسے  
 مہمان ہیں، میری فضیلت نہ کرو، اللہ سے ڈرو مجھے  
 مسوا نہ کرو۔ وہ بوسے کیا ہم بارہا نہیں منع نہیں  
 کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو؟ لوط نے  
 عاجز ہو کر کہا "اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ میری

(الحجر آیات ۷۶ تا ۷۷)

بیٹیاں موجود ہیں"

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس قوم کی بد اخلاقی کس حد کو پہنچ چکی تھی۔ بستی کے ایک شخص کے ہاں چند  
 خوبصورت مہانوں کا آجانا اس بات کے لیے کافی تھا کہ اس کے گھر پر اوباشوں کا ایک مجرم اُمڈ آئے اور غلامیہ  
 وہ اس سے مطالبہ کریں کہ اپنے مہانوں کو بد کاری کے لیے ہمارے حوالے کر دے۔ ان کی پوری آباری میں  
 کوئی ایسا عنصر باقی نہ رہا تھا جو ان حرکات کے خلاف آواز اٹھاتا، اور نہ ان کی قوم میں کوئی اخلاقی جس باقی رہ  
 گئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں کو علی الاعلان یہ زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس ہوتی۔ حضرت لوط جیسے  
 مقدس انسان اور معلم اخلاق کے گھر پر بھی جب بد معاشوں کا حملہ اس لیے باکی کے ساتھ ہو سکتا تھا تو اندازہ  
 کیا جاسکتا ہے کہ عام انسانوں کے ساتھ ان بستیوں میں کیا کچھ ہو رہا ہوگا؟ ۱۵۱

تعمود کا بیان

تعمود میں اس قوم کے جو حالات، کچھ ہیں ان کا خلاصہ ہم یہاں دیتے ہیں جن سے کچھ زیادہ تفصیل کے ساتھ  
 معلوم ہوگا کہ یہ قوم اخلاقی فساد کی کس انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عیلامی مسافر ان  
 کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں شام ہو گئی اور اسے مجبوراً ان کے شہر سدوم میں ٹھہرنا پڑا۔ اس کے ساتھ  
 اپنا زادراہ تھا کسی سے اُس نے میزبانی کی درخواست نہ کی۔ بس ایک درخت کے نیچے اتر گیا۔ مگر ایک مٹی  
 اہرار کے ساتھ اٹھا کر اسے اپنے گھر لے گیا۔ رات اسے اپنے ہاں رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا  
 اُس کے زین اور مال تجارت سمیت اُڑا دیا۔ اُس نے شور مچایا، مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سنی۔ بلکہ بستی کے لوگوں  
 نے اس کا رہا سہا مال بھی لوٹ کر اُسے نکال باہر کیا۔

ایک مرتبہ حضرت سارہ (حضرت ابراہیم کی بیوی) نے حضرت لوط کے گھر والوں کی خیریت دریافت کرنے



یا بیماری مرضی کے خلاف کام کیا ہے۔ وہ ہماری بستیوں سے نکالا گیا ہے۔ اب اگر تو یہ باتیں کرے گا تو نیرا حشر بھی ایسا ہی ہوگا۔

سورۃ اعراف اور سورۃ نمل میں بیان ہوا ہے کہ حضرت نُوحُ کو یہ نوٹس دینے سے پہلے اس شہر پر قوم کے لوگ آپس میں بیٹے کر چکے تھے کہ اَخْرَجُوا آلَ نُوحٍ مِّنْ قَرْيِهِمْ لِئَمْ يَبْعَثُوا فِيهِمْ نَارًا سَاقِطَةً مِن سَمَوَاتِهَا سِغَابًا وَاسْتِزْجَارًا يُبْرَأُونَ۔ یعنی نُوحُ اور اس کے خاندان والوں اور ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کرو۔ یہ لوگ بڑے پاکباز بنتے ہیں، ان صالحین کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔ فرشتوں کی آمد

وَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا ابْتَدَأُوا بِالْحَيْثُورِ الْكَافِرِ بَصِيرًا لِّئَلْ يَسْتَرْشِدَ الْمُتَّبِعُونَ لِيُنذِرَ لِقَوْمِهِمْ الَّذِي هُوَ أُمَّةٌ مِّمَّنْ أُنذِرُوا لِئَلْ يُذَكَّرُوا۔  
اور جب ہمارے فرشتوں سے ابراہیم کے پاس بشارت کے کر سنیے تو انہوں نے اس سے کہا ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں اس کے لوگ محنت ظالم ہو چکے ہیں۔  
(العنکبوت - ۱۲)

جو فرشتے قوم نُوحُ پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے وہ پہلے حضرت ابراہیم کے پاس حاضر ہوئے اور انہوں نے آنجناب کو حضرت اسمعیٰ کی اور ان کے بعد حضرت یعقوب کی پیدائش کی بشارت دی پھر یہ بتایا کہ ہمیں قوم نُوحُ کو تباہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

قَالَ إِنِّي نَارًا مِّنْ لَّوْحٍ نُّوحًا۔ (العنکبوت ۱۲) ابراہیم نے کہا: "وہاں تو نُوحُ موجود ہے۔"

سب سے پہلے تو حضرت ابراہیم فرشتوں کو انسانی شکل میں دیکھ کر ہی گھبرا گئے، کیونکہ اس شکل میں فرشتوں کا آنا کسی خطرناک مہم کا پیش خیمہ ہوتا کرتا ہے۔ پھر جب انہوں نے آپ کو بشارت دی اور آپ کی گھبراہٹ دودھ ہو گئی اور آپ کو معلوم ہوا کہ مہم قوم نُوحُ کی طرف جا رہی ہے تو آپ اس قوم کے لیے بڑے اصرار کے ساتھ حکم کی درخواست کرنے لگے (فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ الرَّوْعُ وَجَاءَتْهُ الْبَشْرَىٰ إِنجَادًا كَفَىٰ فِي قَوْمِ لُوطٍ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَتَّاعًا مُّنبِتًا) مگر یہ درخواست قبول نہ ہوئی اور فرمایا گیا کہ اس معاملہ میں اب کچھ نہ کہو، تمہارے رب کا فیصلہ ہو چکا ہے اور یہ عذاب اب طے نہ والا نہیں ہے (وَلَا تَنْفَعُكُمْ آلُكُمْ وَلَا أَبْنَاءُكُمْ لِكُلِّ قَوْمٍ عَذَابٌ عَظِيمٌ مَّذْذُودٌ)۔ اس جواب سے جب حضرت ابراہیم کو یہ امید باقی نہ رہی کہ قوم نُوحُ کی مہلت میں کوئی اضافہ ہو سکے گا تب انہیں حضرت نُوحُ کی فکر لاحق ہوئی اور انہوں نے وہ بات عرض کی جو یہاں نقل کی گئی ہے کہ وہاں تو نُوحُ موجود ہے، یعنی یہ عذاب اگر نُوحُ کی موجودگی میں نازل ہوا تو وہ اور ان کے اہل و عیال اس سے

لے کسی قوم کے بگاڑ کی یہ آخری حد ہوتی ہے کہ وہ داعیانِ اصلاح کی بات قبول نہ کرنے سے لگے بڑھ کر ان کی معاذ بن جاتی ہے



کیسے محفوظ رہیں گے۔ ۳۱۳

فَالْوَأْتُنَّ أَعْلَمَ مِمَّنَّ فِيهِمَا  
لِنَعْتَبِئَنَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا أَمَّا أَتَتْكَ  
مِنَ الْعَجَائِبِ - (العنکبوت: ۱۳۲)

انہوں نے کہا ”ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون  
کون ہے ہم اسے اور اس کی بیوی کے سوا اس  
کے باقی سب گھروالوں کو بچالیں گے“ اس کی بیوی  
پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی۔

اس عورت کے متعلق سورہ تحریم (آیت ۱۰) میں بتایا گیا ہے کہ یہ حضرت لوط کی وفادار نہ تھی۔ اسی وجہ سے  
اس کے حق میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وہ بھی ایک نبی کی بیوی ہونے کے باوجود عذاب میں مبتلا کر دی جائے۔ اغلب یہ ہے  
کہ حضرت لوط ہجرت کے بعد بے اُردن کے علاقے میں آکر آباد ہوئے ہوں گے تو انہوں نے اسی قوم میں شادی  
کر لی ہوگی لیکن ان کی صحبت میں ایک عمر گزار دینے کے بعد بھی یہ عورت ایمان نہ لائی اور اس کی ہمدردیاں اور  
دوسپایاں اپنی قوم ہی کے ساتھ وابستہ رہیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رشتہ داریاں اور برادریاں کوئی چیز نہیں ہیں  
ہر شخص کے ساتھ معاملہ اس کے اپنے ایمان و اخلاق کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس لیے پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے لیے  
کچھ بھی نافع نہ ہو سکا اور اس کا انجام اپنے شوہر کے ساتھ ہونے کے بجائے اپنی اس قوم کے ساتھ ہوتا جس کے  
ساتھ اس نے اپنا دین و اخلاق وابستہ کر رکھا تھا۔ ۳۱۴

### حضرت لوط کی پریشانی

وَلَمَّا آتَتْ جَاءَتْ وَرَسُولَنَا لُوطًا بِسَجَاةٍ  
بِهِمْ ذَصَاتِي بِهِمْ ذَمْرًا - (العنکبوت: ۱۳۳)

پھر جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے  
تو ان کی آمد پر وہ سخت پریشان اور دل تنگ ہوا۔

اس پریشانی اور دل تنگی کی وجہ یہ تھی کہ فرسے بہت غریب و سبورت لوخیز لڑکوں کی شکل میں آتے تھے حضرت  
لوط اپنی قوم کے اخلاق سے واقف تھے، اس لیے ان کے آتے ہی وہ پریشان ہو گئے کہ میں اپنے ان مہانوں کو  
ٹھیکراؤں تو اس بدکردار قوم سے ان کو بچانا مشکل ہے، اور نہ ٹھیکراؤں تو یہ بڑی بے مروتی ہے جسے شرافت گوارا  
نہیں کرتی۔ مزید برآں یہ اندیشہ بھی ہے کہ اگر میں ان بسا قروں کو اپنی پناہ میں نہ لوں گا تو رات انہیں کہیں اور  
گزارنی پڑے گی اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ گویا میں نے خود انہیں بھڑوں کے حوالہ کیا ہے۔ ۳۱۵

سورہ ہود میں بیان ہوا ہے کہ جب لوگ حضرت لوط کے گھر میں گھسے چلے آ رہے تھے اور آپ نے  
محسوس کیا کہ اب آپ کسی طرح بھی اپنے مہانوں کو ان سے نہیں بچا سکتے تو آپ پریشان ہو کر چیخ اٹھے کہ لَوْ  
أَنَّ لِي بَكْرَةٌ أَفَادِحِي إِلَى رَبِّكَ شَدِيدًا كَأَشْكَاشِ مِيرَسِي بِأَسْتَبْرَأَ مِنْكُمْ كَرْدِيْنِي كِي طَاقَتِ هَوْتِي يَا  
كُي زُوْرًا وَرَكِي حَمَايَتِي فِي بَاكِنَا نَا اس وقت فرشتوں نے کہا لُوطُ إِنَّا دَرَسْنَا رَدِّيكَ كَنَّا بِيْئُوْنَا أَدِيْكَ

”اے لوٹو، ہم تمہارے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں یہ قوم تکبر پر گز نہیں پہنچ سکتے۔“

وَقَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَخْذَرْ (آیت ۳۳) ”انہوں نے کہا“ نہ ڈرو اور نہ ڈرنے کو۔“

یعنی ہمارے معاملہ میں نہ اس بات سے ڈرو کہ یہ لوگ ہمارا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ اس بات سے کیے فکر مند ہو کہ ہمیں ان سے کیسے بچا جائے۔ یہی موقع تھا جب فرشتوں نے حضرت لوط پر یہ راز فاش کیا کہ وہ انسان نہیں بلکہ فرشتے ہیں جنہیں اس قوم پر عذاب نازل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ۳۴۔

لوط علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات قرآن مجید میں بیان ہوتی ہیں ان کے خواستے کلام سے یہ بات صاف ترشح ہوتی ہے کہ فرشتے خواہ صورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط کے ہالی پہنچے تھے اور حضرت لوط اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ فرشتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان مہانوں کی آمد سے آپ کو سخت پریشانی و دل تنگی لاحق ہوئی۔ اپنی قوم کو جانتے تھے کہ وہ کسی بد کردار اور کتنی بے حیا ہو چکی ہے۔

ان مہانوں کا آنا تھا کہ اس قوم کے لوگ نیلے اختیار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بد کاریوں کے شوگر تھے۔ لوط نے ان سے کہا، بھائیو! یہ میری بیٹیاں موجود ہیں، یہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہانوں کے معاملہ میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھلا آدمی نہیں ہے؟ انہوں نے جواب دیا مجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔ (ہمد۔ آیت ۷۸-۷۹) ۳۵۔

وَلَقَدْ رَاوْهُمُ مِّنْ جَبَلٍ يُشْرِبُ يَصْرِبُهُ فَمُخَصَّصًا  
أَعْيُنُهُمْ فَوَاقُوا عَذَابِي وَنُذُرِي۔

پھر انہوں نے اسے اپنے مہانوں کی حفاظت سے  
باز رکھنے کی کوشش کی۔ آخر کار ہم نے ان کی آنکھیں  
موند دیں کہ چھو اب میرے عذاب اور میری  
(العنقر: ۳۷)

تنبیہات کا مزا۔

حضرت لوط نے ان کی بے انتہا منت سماجت کی کہ وہ اس ذلیل حرکت سے باز رہیں مگر وہ نہ مانے اور گھر میں گھس کر زبردستی مہانوں کو نکال لینے کی کوشش کی۔ اس آخری مرحلے پر یکایک ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں۔ پھر فرشتوں نے حضرت لوط سے کہا کہ وہ اور ان کے گھر والے صبح ہونے سے پہلے اس بستنی سے نکل جائیں، اور ان کے نکلتے ہی اس قوم پر ایک ہولناک عذاب نازل ہو گیا۔ بائبل میں یہ واقعہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں ”تیب وہ اس مرد یعنی لوط پر پل پڑے اور نزدیک آئے تاکہ کوڑ لٹا دیاں لیکن ان مردوں یعنی فرشتوں نے اپنے ہاتھ بڑھا کر لوط کو اپنے پاس گھر میں کھینچ لیا اور دروازہ بند کر دیا اور ان مردوں کو جو گھر کے دروازے پر تھے، کیا چھوٹے کیا بڑے اندھا کر دیا، سو وہ دروازہ

وَهُوَ يُدْرَسُ وَهُوَ يُدْرَسُ تَهَكُّمٌ كَتَمَ: بِرَأْسِ، ۱۵: ۹ - (۱۱)

قَالُوا إِنَّا سُلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ خَجَرِينَ.  
لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَابًا مِّنَ السَّمَاءِ  
عِنْدَ رَبِّكَ فَتَكُنُ كَصَدِيدٍ.  
وَالذَّارِيَاتُ ۲۳-۲۴

یعنی ایک ایک پتھر پر آپ کے رب کی طرف سے نشان لگا دیا گیا ہے کہ اُسے کس مجرم کی سرکوبی کرنی ہے۔  
**نزول عذاب**

فَلَمَّا سَاءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَلَىٰ مَنَّا سِجَابًا  
وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِم مَّحَارِبًا مِّنَ السَّمَاءِ  
فَنَسُوهُم مِّنْهُم مِّنْهُمْ.  
وَمَا هِيَ مِنَ الظَّالِمِينَ  
بَبَعِيدٍ.  
(مجموعہ ۲۰-۸۲)

پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آپہنچا تو ہم نے  
اس سستی کو تھپٹ کر دیا اور اس پر کچی ہوئی مٹی کے  
پتھر بنا کر توڑ برسائے جن میں سے ہر پتھر تیرے  
رب کے ہاں نشان زدہ تھا اور ظالموں سے بہتر  
کچھ دور نہیں ہے۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَطَرًا كَسَاءً مَّسْكُورًا  
الْمُنذَرِينَ.  
(الشعراء - آیت: ۱۶۳)

اور ہم نے ان پر برساتی ایک برسات ڈبری ہی برسی  
بارش تھی جو ان کو راستے جانے والوں پر نازل ہوئی۔

غالباً یہ عذاب ایک سخت زلزلے اور آتش فشاںی انفجار کی شکل میں آیا تھا۔ زلزلے نے ان کی بستریوں کو  
تلی پٹ کیا اور آتش فشاں مادے کے پھٹنے سے ان کے اوپر زور کا پتھر اور مٹی کے پتھروں سے مل کر  
شاید وہ پتھر مٹی سے جو آتش فشاں علاقے میں زیر زمین حرارت اور لاوے کے اثر سے پتھر کی شکل اختیار کرتی  
ہے۔ آج تک بحر لوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس انفجار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔  
فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ يَتِيمٍ  
أُتْمَلَىٰ فِيهَا  
(الذَّارِيَاتُ ۳۰) گھر نہ پایا۔

اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی  
گھر نہ پایا۔

پوری قوم میں اور اس کے پڑوسے علاقے میں صرف ایک گھر تھا جس میں ایمان و اسلام کی روشنی پائی  
تھی، اور وہ تنہا حضرت لوط کا گھر تھا۔ باقی پوری قوم فسق و فجور میں ڈوبی ہوئی تھی اور اس کا  
سارا ملک گندگی سے بھرپور ہو چکا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس ایک گھر کے لوگوں کو بچا کر نکال لیا اور اس  
جگہ بعد اس ملک پر وہ تھا ہی نازل کی جس سے اس بدکار قوم کا کوئی فرد بچ کر نہ جا سکا۔

لے اللہ تعالیٰ کا قانون نکالتا، اس وقت تک کسی قوم کی کامل تباہی کا فیصلہ نہیں کرتا جب تک اس میں کچھ قابل نجا

## بائبل میں اس عذاب کی تفصیلات

بائبل کے بیانات، قدیم یونانی اور لاطینی تحریروں، جدید زمانے کی طبقات الارضی تحقیقات اور آثار قدیمہ کے مشاہدات سے اس عذاب کی تفصیلات پر جو روشنی پڑتی ہے اس کا خلاصہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

بجیرہ مُردار (Dead Sea) کے جنوب اور مشرق میں جو علاقہ آج انتہائی ویران اور سنسان حالت میں پڑا ہوا ہے۔ اس میں بکثرت پُرانی بستیوں کے کھنڈروں کی موجودگی پتہ دیتی ہے کہ یہ کسی زمانہ میں نہایت آباد علاقہ رہا تھا۔ آج وہاں سینکڑوں برباد شدہ قروں کے آثار ملتے ہیں، حالانکہ اب یہ علاقہ آتشاواہ نہیں ہے کہ اتنی آبادی کا بوجھ سہا سکتے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ اس علاقے کی آبادی و خوشحالی کا دور سن ۳۰۰ قبل مسیح سے متعلقہ قبل مسیح تک رہا ہے اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق تخریب کا اندازہ یہ ہے کہ وہ دو ہزار برس قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں گزرے ہیں۔ اس لحاظ سے آثار کی شہادت اس کی تائید کرتی ہے کہ یہ علاقہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بھتیجے حضرت لوطؑ کے عہد ہی میں برباد ہوا ہے۔

اس علاقے کا سب سے زیادہ آباد اور سرسبز و شاداب حصہ وہ تھا جسے بائبل میں سدیم کی وادی کہا گیا ہے جس کے متعلق بائبل کا بیان ہے کہ ”وہ اس سے پیشتر کہ خداوند نے سدوم اور عمورہ کو تباہ کیا، خداوند کے باغ عدن اور مصر کے مانند خوب سیراب تھی“ (پیدائش باب ۱۳، آیت ۱۰)۔ موجودہ زمانے کے محققین کی عام رائے یہ ہے کہ وہ وادی اب بجیرہ مُردار کے اندر غرق ہے اور یہ راستے مختلف آثار کی شہادتوں سے قائم کی گئی ہے۔

قدیم زمانہ میں بجیرہ مُردار جنوب کی طرف آنا وسیع نہ تھا جتنا اب ہے مشرق اُردن کے موجودہ شہر الکراک کے سامنے مغرب کی جانب اس بجیرے میں جو ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا ”الکسان“ پایا جاتا ہے، قدیم زمانے میں بس یہی پانی کی آخری سرحد تھی۔ اس کے نیچے کا حصہ جہاں اب پانی پھیل گیا ہے جسے ملحدہ نقشے میں ہم نے

بھلائی موجود رہے۔ بڑے لوگوں کی اکثریت کے مقابلے میں اگر ایک قلیل عنصر بھی ایسا پایا جاتا ہو جو بے پروا نہ ہو سکے اور نیکی کے راستے کی طرف بلانے کے لیے کوشاں ہو تو اللہ تعالیٰ اسے کام کرنے کا موقع دیتا ہے۔ مگر جب حالت یہ ہو جاتی ہے کہ کسی قوم کے اندر رائے میں ٹک کے برابر بھی خیر باقی نہ رہے تو ایسی صورت میں اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو وہاں تک انسان اس کی بستیوں میں برائی کے خلاف لڑتے لڑتے تھک کر عاجز آچکے ہوں انہیں وہ اپنی قدرت سے کسی نہ کسی طرح بچا کر نکال دیتا ہے اور باقی لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرتا ہے جو ہر شہنشاہ ملک اپنے شہر کے پھلوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔

اڑی ٹیڑوں سے نمایاں کیا ہے، پہلے ایک سرسبز وادی کی شکل میں آباد تھا اور یہی وہ وادی تھی جس میں قوم لوط کے بڑے بڑے شہر سدوم، عمورہ، انبہ، صنوتیم اور مشغرف واقع تھے۔ دو ہزار برس قبل مسیح کے آگے کا زمانہ میں ایک زبردست زلزلے کی وجہ سے یہ وادی بھٹ کر دب گئی اور بحیرہ مردار کا پانی اس کے اوپر چھا گیا۔ آج بھی یہ ٹیڑے کا سب سے زیادہ اُتھلا حصہ ہے مگر ڈوبی عمد میں یہ اتنا اُتھلا تھا کہ لوگ انسان سے چل کر مغربی ساحل تک پانی میں سے گزر جاتے تھے۔ اس وقت تک جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈوبے ہوئے جنگلات صاف نظر آتے ہیں، بلکہ یہ شبہ بھی کیا جاتا ہے کہ پانی میں کچھ عمارت بھی ڈوبی ہوئی ہیں۔

بائبل اور قدیم گویانی و لاطینی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں جگہ جگہ نقطہ پٹرول، اور اسفلٹ کے گڑھے تھے اور بعض بعض جگہ زمین سے آتش گیر گیس بھی نکلتی تھی۔ اب بھی وہاں زیر زمین پٹرول اور گیسوں کا پتہ چلتا ہے۔ طبقات الارضی مشاہدات سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زلزلے کے شدید جھٹکوں کے ساتھ پٹرول، گیس اور اسفلٹ زمین سے نکل کر بڑک اُٹھے اور سارا علاقہ بھک سے اُڑ گیا۔ بائبل کا بیان ہے کہ اس تباہی کی اطلاع پاکر حضرت ابراہیم جب حبرون سے اس وادی کا حال دیکھنے آتے تو زمین سے دھواں اس طرح اُٹھ رہا تھا جیسے بھٹی کا دھواں ہوتا ہے۔ (سپیدائش باب ۱۹ - آیت ۲۸) ۱۲۱

وَلَقَدْ تَوَكَّنَا مِنهَا آيَةً مُّبِينَةً  
اور ہم نے اس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ہے

اس کھلی نشانی سے مراد ہے بحیرہ مردار جسے بحر لوط بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر تکرار کہہ کر خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اس ظالم قوم پر اس کے کڑوں کی بدولت جو عذاب آیا تھا اس کی ایک نشانی آج بھی شاہراہ عام پر موجود ہے جسے تم تمام کی طرف اپنے تجاسق سفر میں جاتے ہوئے شب و روز دیکھتے ہو۔

وَاللَّيْلِ بِسَبِيلِ مَعْيِمِ رَا حَمْرٍ اَوْرَقًا لَكُمْ لَتَسْمُرُنَّ عَلَيْكُمْ مُضِيِّينَ وَيَا ثِيْلُ الرَّسْمٰتِ

حالیہ اکتشافات

موجودہ زمانے میں یہ بات قریب قریب یقین کے ساتھ تسلیم کی جا رہی ہے کہ بحیرہ مردار کا جنوبی حصہ ایک ہولناک زلزلے کی وجہ سے زمین میں دھنس جانے کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اسی دھنسے ہوئے حصے میں قوم لوط کا مرکزی شہر سدوم (Sodom) واقع تھا۔ اس حصے میں پانی کے نیچے کچھ ڈوبی ہوئی کتبوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ حال میں جدید آلاتِ غوطہ زنی کی مدد سے یہ کوشش شروع ہوئی ہے کہ کچھ لوگ نیچے جا کر ان آثار کی جستجو کریں۔ لیکن ابھی تک ان کوششوں کے نتائج سامنے نہیں آتے ہیں۔ ۱۲۵

وَلَقَدْ تَوَكَّنَا فِيْمَا آيَةً لِلَّذِيْنَ يَخْفَوْنَ  
اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی ان

الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ۔ وَالذَّرِيَاثِ (۱۲۵)  
لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو روزِ اکِ اِذَا بَدَأُتِ السَّمَاءُ كَدُّنِ الْجِبَالِ ذُرَّاتٍ

اس نشان سے سوراخ کھینچو سوراخ Dead Sea ہے جس کا جنوبی علاقہ آج بھی ایک عظیم نشان

تباہی کے آثار مشہور کر رہا ہے۔ ماہرین آثار و قدیمہ کا اندازہ ہے کہ قوم لوز کے بڑے شہر ٹھکانا شہد بزرگ نے سے زمین کے اندر دفن کئے تھے اور ان کے اُوپر کھینچو سوراخ کا پانی پھیل گیا تھا، کیونکہ اس جزیرے کا وہ حصہ جو انسان نامی چھوٹے سے جزیرہ نما کے جنوب میں واقع ہے، وہاں طور پر ابد کی پہلا وافر عظیم تولا ہے اور قدیم کھینچو سوراخ کے چوٹا سا اس جزیرہ نما کے نشان کہ نظر آتے ہیں وہ جنوب میں پاسے جانے والے آج سے بہت مختلف ہیں۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جنوب کا حصہ پہلے اس جزیرے کی سطح سے بلند تھا، بعد میں کسی وقت وہنس کس اس کے نیچے چلا گیا۔ اس کے دھسنے کا زمانہ بھی دو تزار برس قبل مسیح کے آگے جگہ معلوم ہوتا ہے اور یہی تاریخی طور پر حضرت ابراہیم اور حضرت لوط کا زمانہ ہے۔ چنانچہ میں آثار و قدیمہ کن تلاش کرنے والی ایک امریکی بحالمت کو اٹلسان پر ایک بہت بڑا جزیرہ نام ملا ہے جس میں نہیں خرابی سے زیادہ قبریں ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قریب میں کوئی بڑا شہر ضرور آباد ہو گا۔ اگر کسی ایسے شہر کے آثار، اس میں کہیں سوراخ نہیں ہیں جس سے متصل آٹا برا آقبرستان میں سکتا ہو۔ اس سے بھی یہ نتیجہ نصرت پاتا ہے کہ جس شہر کا یہ نشان نکلا وہ کھینچو سے غرق ہو چکا ہے۔ خیر سے کے جنوب میں جو علاقہ ہے اس میں اب بھی بہت بڑے تباہی کے آثار موجود ہیں اور زمین میں گندھاک، مال، تاکرول اور قدرتی گیس کے آتے نشان پاسے جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ کسی وقت پتلیوں کے گرنے سے یا زلزلوں کے لالوں سے یہاں ایک عظیم کھپ چری ہوگی۔

## قوم سبا

### قوم سبا کا علاقہ

سبا جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی، جس کا دار الحکومت ماریب، موجودہ یمن کے دار السلطنت صنعاء سے ۵۵ میل بجانب شمال مشرق واقع تھا۔ اس کا زمانہ عروج یمن کی سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً سنہ ۴۰۰ ق م سے شروع ہوا اور ایک ہزار سال تک یہ عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ پھر سنہ ۶۰۰ ق م میں جنوبی عرب کی دوسری مشہور قوم حمیر نے اس کی جگہ لے لی۔ عرب میں یمن اور حضر موت اور افریقیہ میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔

### مشہور عظیم قوم

مشرقی افریقیہ، ہندوستان، مشرقی ایشیا اور خود عرب کی صبی تجارت مصر و شام اور یونان و روم کے ساتھ ہوتی تھی وہ زیادہ تر انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وجہ سے یہ قوم قدیم زمانہ میں اپنی دولت کے لیے نہایت مشہور تھی بلکہ یونانی مورخین نو اسے دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم کہتے ہیں۔ تجارت کے علاوہ ان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظام آبپاشی قائم کر رکھا تھا جس سے ان کا پورا علاقہ جنت بنا ہوا تھا۔ ان کے ملک کی اس غیر معمولی سرسبزی و شادابی کا ذکر یونانی مؤرخین نے بھی کیا ہے اور سورہ سبا کے دوسرے رکوع میں قرآن مجید بھی اس کی طرف اشارہ کرتا ہے: **السنہ** **”تایخ کی رو سے ” سبا“ جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ امام احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن عبد البر اور ترمذی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں حسب ذیل قبیلے پیدا ہوئے اکندہ، حمیر، آزد، اشعرین، مذحج، انمار (جس کی دو شاخیں ہیں، خثعم اور یثعلب)، عالمہ، غدام، نخم اور عثمان۔**

ہست قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا۔ مسئلہ قبل مسیح میں اُس کے کہتا ہے اس

ذکر سلووم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور آشور (اسیریا) کے کتیبات میں اور اسی طرح بائبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو زبور، ۷۲: ۱۵، ۱۰۶: ۶، ۲۰: ۶، حتیٰ ایل، ۱۲: ۲۲-۳۸، ۱۲: ۱۳-۱۹۔ یونان و روم کے مورخین و جغرافیہ نویس تھیوفراستس (۲۸۵ء قبل مسیح) کے وقت سے مسیح کے بعد کی کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کا وطن عرب کا جنوبی مغربی گوشہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔

### سبا کی مذہبی تاریخ

آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمان (۹۶۵ء - ۹۲۶ء ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہو گئی تھی۔ لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک و بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے الملقہ (چاندیوتا)، عنترہ (زہرہ)، فانتیم اور ذات بعد ان (سورج دیوی)، ہولس، حرتم یا حریت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ الملقہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حق دار قرار دیتے تھے۔ یمن میں بکثرت کتیبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں اور خصوصاً الملقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر اہم واقعہ پر ان کے شکر یہ ادا کیے جاتے تھے۔

لہٰذا قرآن مجید (نمل آیت ۲۴) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کو جب بُدھ نے اس قوم کا حال سنا یا اس وقت یہ آفتاب کی عبادت کرتی تھی۔ عرب کی قدیم روایات سے بھی اس کا یہی مذہب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابن اسحاق علامتے انساب کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ سبا کی قوم دراصل ایک مورث اعلیٰ کی طرف منسوب ہے جس کا نام عبس رہندہ آفتاب یا سورج کا رہتا ہے اور لقب سبا تھا۔ بنی اسرائیل کی روایات بھی اسی کی تائید کرتی ہیں۔ ان میں بیان کیا ہے کہ بُدھ جب حضرت سلیمان کا خط لکھ کر پہنچا تو سب سوسوچ وینا کی پریش کے بیجا ہی بُدھ نے اسے ہی میں دیکھ کر اسے چمکے یا۔

علم تاریخ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قدیم زمانے سے قوم سبا میں ایک عنصر الیا موجود تھا جو دوسرے مسبووں کو ماننے کے بجائے خدا سے واحد کو بانٹا تھا۔ موجودہ زمانے کی اثری تحقیقات کے سلسلے میں یمن کے کھنڈروں سے جو کتب ملے ہیں ان میں سے بعض اس دلیل منصر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ سنہ ۱۹۵۵ء ق م کے لگ بھگ



آثار قدیمہ کی عددی تحقیقات کے سلسلے میں یمن سے تقریباً ۳ ہزار کتبات فراہم ہوتے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ عربی روایات اور مذہبی و لسانی تواریخ کی فراہم کردہ معلومات کو اگر جمع کر لیا جائے تو اپنی ناصحی تفصیل کے ساتھ اس کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ ان معلومات کی روست اس کی تاریخ کے اہم ادوار حسب ذیل ہیں۔

### سنہ ۲۵۰ ق م سے پہلے کا دور

اس زمانے میں عرب سببا کا لقب کثرت سے لیا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لفظ مقرب کا اہم معنی تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ بادشاہ انسانوں اور خداؤں کے درمیان اپنے آپ کو واسطہ قرار دیتے تھے، یا دوسرے الفاظ میں یہ کاہن بادشاہ (Priest Kings) تھے۔ اس زمانے میں ان کا پایہ تخت ہمدان تھا جس کے کھنڈر آج بھی مارب سے مغرب کی جانب ایک دن کی راہ پر پائے جاتے ہیں اور خرمیر کے نام سے مشہور ہیں۔ اس دور میں مارب کے مشہور بند کی بنا رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

### سنہ ۲۵۰ ق م سے ۱۰۰ ق م تک کا دور

اس دور میں سببا کے بادشاہوں نے کثرت سے لقب چھوڑ کر تک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور سیکولرزم کا رنگ غالب ہو گیا۔ اس زمانے میں عرب سببانے ہمدان کو چھوڑ کر مارب کو اپنا دار السلطنت بنایا اور اسے غیر معمولی ترقی دی۔ یہ مقام سنہ ۳۹۰۰ فیٹ کی بلندی پر صنعاء سے ۶۰ میل جنوب مشرقی واقع ہے اور آج تک اس کے کھنڈر شہادت

زمانے کے بعض کتبات بتاتے ہیں کہ مملکت سببا کے متعدد مقامات پر ایسی عبادت گاہیں بنی ہوئی تھیں جو ذمسموی یا ذمسمادی یعنی رب السماء کی عبادت کے لیے مخصوص تھیں۔ بعض مقامات پر اس معبود کا نام مکن ذمسموی رو بادشاہ جو آسمانوں کا مالک ہے، لکھا ہے۔ یہ عنصر سلسلہ صدیوں تک یمن میں موجود رہا۔ چنانچہ سنہ ۳۶۵ کے ایک کتبے میں یمنی اللہ ذمسموی کے نام سے ایک عبادت گاہ کی تعمیر کا ذکر ملتا ہے۔ پھر سنہ ۳۶۵ کے ایک کتبے میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں یعنی وردا اللطن بعل سمین و ارضین (یعنی اس خدا کی مدد اور نائید سے جو آسمانوں اور زمین کا مالک ہے)۔ اسی زمانے کے ایک اور کتبے میں یمن کی تاریخ سنہ ۳۵۵ کے ہے، اسی خدا کے لیے رحمان کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ ہیں بردا۔ رحمن یعنی رحمان کی مدد سے، ۳۲۹

دے رہے ہیں کہ یہ کبھی ایک بڑی ممتاز قوم کا مرکز تھا۔

۳۳۰ ق م سے ۳۳۰ تک کا دور

اس زمانے میں سبکی مملکت پر خمیر کا قبیلہ غالب ہو گیا جو قوم سبکی کا ایک قبیلہ تھا اور تعداد میں وہ تمام قبائل سے بڑھا ہوا تھا۔ اس دور میں مارب کو اجازت کر زیدان پایہ تخت بنایا گیا جو قبیلہ خمیر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل موجودہ شہر بریم کے قریب ایک مدور پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں اور اس کے قریب علاقہ میں ایک چھوٹا سا قبیلہ خمیر کے نام سے آباد ہے جسے دیکھ کر کوئی شخص تصور تک نہیں کر سکتا کہ یہ اسی قوم کی یادگار ہے جس کے ڈنگے بھی دنیا بھر میں بکتے تھے۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصہ کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ مینت اورینٹا کا استعمال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ مین اس پورے علاقہ کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوبی مغربی کونے پر عیسیر سے عدن تک اور باب المندب سے حفر موت تک واقع ہے۔ یہی دور ہے جس میں سبکیوں کا زوال شروع ہوا۔

۳۳۰ کے بعد سے آغاز اسلام تک کا دور

یہ قوم سبکی تباہی کا دور ہے۔ اس دور میں ان کے ہاں مسلسل خانہ جنگیاں ہوتی ہیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوتی۔ تجارت بر باد ہوتی۔ زراعت نے دم توڑا اور آخر کار آزادی تک ختم ہو گئی۔ پہلے زیدانیوں، خمیریوں اور ہندرانوں کی باہمی نزاعات سے فائدہ اٹھا کر ۳۳۰ سے ۳۳۰ تک میں پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی تو بحال ہو گئی مگر مارب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے یہاں تک کہ آخر کار ۳۳۰ یا ۳۳۰ میں بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر سورہ نبا میں آیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد اترتہ بند کے زلزلے تک اس بند کی مسلسل مرمتیں ہوتی رہیں، لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ ہو سکی اور نہ آب پاشی اور زراعت کا وہ نظام جو وہم برہم ہو چکا تھا، دوبارہ بحال ہو سکا۔

۳۳۰ ق م ایسی منتشر ہوئی کہ اس کی پرانگی ضرب المثل ہو گئی۔ آج بھی اہل عرب اگر کسی گروہ کے انتشار کا ذکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں تفوتوا ایدی سیاہ وہ تو ایسے پرانہ ہو گئے جیسے سبکی قوم پرانہ ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب زوال نعمت کا دور شروع ہوا تو سبکی قبیلے اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ عتبانہ نے اُردن اور شام کا رخ کیا۔ اوس و خزرج کے قبیلے یثرب میں جا بسے۔ خزاعہ نے جدتہ کے قریب تنہا تہ کے علاقہ میں سکونت اختیار کی۔ اُردن کا قبیلہ عمان میں جا کر آباد ہوا۔ عثم اور جذام اور کندہ بھی نکلنے پر مجبور ہوئے۔ حتیٰ کہ "سبا" نام کی کوئی قوم ہی مینا میں باقی نہ رہی۔ صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔

سنہ ۲۷۰ء میں یمن کے بیوردی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم و ستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں اصحاب الاخذود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہو گئی اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد یمن کے حبشی و انہرے ابرہہ نے کعبہ کی مرکزیت کو ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی حبشی اثر میں لانے کے لیے سنہ ۶۰۰ء یا سنہ ۶۱۰ء میں انبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے چند روز قبل، مکہ منظرہ پر حملہ کیا اور اس کی پورے فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب الفضل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر کار سنہ ۶۱۰ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا اور اس کا خاتمہ اُس وقت ہوا جب سنہ ۶۱۰ء میں ایرانی گوزر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

### قوم سبا کا مادی عروج

قوم سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا۔ ایک زراعت، دوسرے تجارت۔ زراعت کو انہوں نے آب پاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعہ سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظام آب پاشی بائبل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ اُن کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نلے بہ نکلتے تھے۔ انہی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انہوں نے تالاب بنائے تھے اور ان سے نہریں نکالی نکالی کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف ایک باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ اس نظام آب پاشی کا سب سے بڑا مخزن آب وہ تالاب تھا جو شہر یارب کے قریب کوہ بلق کی درمیانی وادی پر باندھ کر تیار کیا گیا تھا۔ مگر جب اللہ کی نظر عنایت ان سے پھر گئی تو پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں یہ عظیم انسان بند ٹوٹ گیا اور اسی سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند ٹوڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ ملک کا پورا نظام آب پاشی تباہ ہو کر رہ گیا۔ پھر کوئی اسے بحال نہ کر سکا۔

تجارت کے لیے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافیائی مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کے بندرگاہوں میں چین کا شیش، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مسالے، ہندوستان کے کپڑے اور تلوانینا مشرقی افریقہ کے زنگی غلام، بندر، خمر، مرن کے پر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچانے سے جہاں سے روم و یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عود، عنبر، مشک، موم، قمر، قمر، قصب، الذریرہ، سلجہ اور دوسری ان خوشبودار

لہ قرآن میں اس تباہ کن عذاب کا واضح طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔

پہنچنے کی بڑی پیداوار تھی جنہیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے۔ ایک بحری دوسرا تری۔ بحری تجارت کا اجارہ ہزار سال تک انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھا کیونکہ بحر احمر کی موسمی ہواؤں، زیر آب چٹانوں اور لنگر اندازی کے مقامات کا ماز یہی لوگ جانتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سفر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ کرتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچا کرتے تھے۔ تری راستے عدن اور حضرموت سے یارب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جدہ، یریب، الخلاء، یمنک اور ایلہ سے گزرتی ہوئی پٹرا تک پہنچتی تھی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرٹ اور دوسرا راستہ شام کی طرٹ جاتا تھا۔ اس تری راستے پر جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حد و شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں اور شب و روز ان کے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نوآبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و تمیری زبان کے کتیات مل رہے ہیں۔

تجارتی زوال کا آغاز

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ شرق وسط میں جب یونانیوں اور پھر رومیوں کی طاقتور سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہوا کہ غربت ماجرا انہی اجارہ داری کے باعث مشرق کے اموال تجارت کی من مانی قیمتیں وصول کر رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہم خود اس میدان میں آگے بڑھ کر اس تجارت پر قبضہ کر لیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلے مصر کے یونانی الاصل فرماں روا بطلمیوس ثانی (۳۰-۱۰۰ء) نے اس قدیم نہر کو پھر سے کھولا جو ۱۷ سو برس پہلے فرعون سوسو سنیر نے دریائے نیل کو بحر احمر سے ملائے کے لیے کھدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعہ سے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحر احمر میں داخل ہوا لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ کارگر نہ ہو سکی پھر جب مصر پر روم کا قبضہ ہوا تو رومی زیادہ طاقتور تجارتی بیڑا بحر احمر میں لے آئے، اور اس کی پشت پر انہوں نے ایک جنگی بیڑا لاکر ڈال دیا۔ اس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رومیوں نے جگہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کیں، ان میں جہازوں کی ہر ضرورت فراہم کرنے کا انتظام کیا، اور جہاں ممکن ہوا وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دیے، حتیٰ کہ ایک وقت وہ آگیا کہ عدن پر رومیوں کا فوجی تسلط قائم ہو گیا۔ اس سلسلے میں رومی اور حبشی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم ساز باز بھی کر لیا جس کی بدولت بالآخر اس قوم کی آزادی تک ختم ہو گئی۔

بحری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد صرف تری تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی تھی۔ مگر بہت سے اسباب

نے رفتہ رفتہ اس کی کمر بھی توڑ دی۔ پہلے ٹیپٹیوں نے پیرا سے اعلیٰ تک بالائی حجاز اور اردن کی تمام نو آبادیوں سے  
 سبائیوں کو نکال یا سر کیا۔ پھر ستلہ میں رومیوں نے وسطی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام و اردن  
 کے تمام علاقے ان کے منسوب ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی متحدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں  
 کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں عدالت  
 کرتے رہے، یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔

### عذار کے پہلے کا مسرفانہ تمدن

اس فرقہ اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی غرور سے سرگرا کر لیا اس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے  
 پھر کوئی منسوب قوم کبھی سر نہیں نکال سکی۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افسانے سن کر یمن و  
 روم و ان کے ممالک میں پانی بھرا آتا تھا۔ اشرافیوں کا ہاتھ ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے بزن استعمال کرتے  
 ہیں اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت، سونے چاندی اور جواہر  
 کا کام بنا ہوا ہوتا ہے۔ چینی کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف ہی چلی جا رہی ہے۔ یہ اس  
 وقت دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم ہیں اور ان کا سرسبز و شاداب ملک باغات، کھیتوں اور مویشی  
 سے بھرا ہوا ہے۔ آرٹھی میڈوزس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلاسنے کی لکڑی کے  
 بجائے دائی چینی، ہندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مؤرخین روایت  
 کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب سواحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی بپٹیں پہنچتی  
 ہیں۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندو کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت Skyscraper  
 تعمیر کی جو قصر عثمان کے نام سے حدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مؤرخین کا بیان  
 ہے کہ اس کی ۲ منزلیں تھیں اور ہر منزل ۳۶ فٹ بلند تھی۔

یہ سب کچھ اس اسی وقت تک رہا جب تک اللہ کا فضل ان کے شامل حال رہا۔ آخر کار جب انہوں  
 نے کفر ان نعمت کی حد کر دی تو رتبہ قدیر کی نظر عنایت ہمیشہ کے لیے ان سے پھر گئی اور ان کا نام نشان  
 تک باقی نہ رہا۔ اے



دیا فوت نے مجھ ابلہدان میں لفظ ایک کے تحت بتایا ہے کہ یہ تنجوک کا پرانا نام ہے اور اہل تنجوک میں خادم طہر پر یہ بات مشہور ہے کہ یہی جگہ کسی زمانے میں ایک تھی۔

دونوں قبیلوں کے لیے مشترک نہیں کیوں؟

اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ کے لیے ایک ہی پیغمبر مبعوث کیے جانے کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دونوں ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے اور ان کے علاقے بھی بالکل ایک دوسرے سے متصل تھے، بلکہ بعد نہیں کہ بعض علاقوں میں یہ ساتھ ساتھ آباد رہیں اور آپس کے شادی بیاہ سے ان کا معاشرہ بھی باہم گھل مل گیا ہو۔ اس کے علاوہ بنی قطن کی ان شاخوں کا ہمیشہ بھی تجارت تھا اور دونوں میں ایک ہی طرح کی تجارتی بے ایمانیاں اور مذہبی و اخلاقی جہاریاں پائی جاتی تھیں۔ بائبل کی ابتدائی کتابوں میں جگہ جگہ یہ ذکر فرما ہے کہ یہ لوگ قبل غور کی پستش کرتے تھے اور بنی اسرائیل جب مصر سے نکل کر ان کے علاقے میں آئے تو ان کے اندر بھی انہوں نے شرک اور زنا کاری کی وبا پھیلا دی (گنتی باب ۲۵ آیت ۱-۵)۔ باب ۳۱ آیت ۱۶-۱۷)۔ پھر یہ لوگ بین الاقوامی تجارت کی ان دو بڑی شاہراہوں پر آباد ہو گئے جو چین سے شام اور خلیج فارس سے مصر کی طرف جاتی تھیں۔ ان شاہراہوں پر واقع ہونے کی وجہ سے انہوں نے بڑے پیمانے پر زہری کا سلسلہ چلا رکھا تھا۔ دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خراج لیے بغیر نہ گزرنے دیتے تھے اور بین الاقوامی تجارت پر خود قابض رہنے کی خاطر انہوں نے راستوں کا امن خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ قرآن مجید میں ان کی اس پوزیشن کو یوں بیان کیا گیا ہے: **وَإِنَّمَا لَبِئْسَ بِيَدِهِم دُونُوا** یعنی قوم لوط اور اصحاب الایکہ کھلی شاہراہ پر آباد ہو گئے اور ان کی راہزنی کا ذکر سورہ اعراف میں اس طرح کیا گیا ہے **وَلَا تَقْعُدُوا بِكُنُوفِكُمْ صَوِّفًا تَتَرَبَّصُّونَ** اور ہر راستے پر لوگوں کو ڈرانے نہ بیٹھو یہی اسباب تھے جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں قبیلوں کے لیے ایک ہی پیغمبر بھیجا اور ان کو ایک ہی طرح کی تعلیم دی۔

اہل مدین کے متعلق مزید تفصیل

مدین کا اصل علاقہ حجاز کے شمال مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر احمر اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا، اگرچہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارتی پیشہ قوم تھی قدیم زمانہ میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے کنارے میں سے گذر اور فیروز ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی، اور ایک

لہ چونکہ یہ نسبتاً بڑا قبیلہ تھا اور حضرت ثعلیب علیہ السلام کو قرآن سننے ان کے ساتھ زیادہ قریبی نسبت دی (اخاھم)

اس لیے اس کے متعلق کچھ زیادہ تفصیل دی گئی ہے (اہل مدین)

دوسری تجارتی شاہ راہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی، اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں تھیں یہی بنا پر عرب کا تجزیہ تخریب سے واقف تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی، کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوتے رات دن اس کے آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔

اہل مدین کے متعلق ایک اور ضروری بات جس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے، یہ ہے کہ یہ لوگ اصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے نبیان کی طرف منسوب ہیں جو ان کی تیسری جوی قطوڑا کے بطن سے تھے۔ قدیم زمانہ کے قاعدے کے مطابق جو لوگ کسی بڑے آدمی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے وہ رفتہ رفتہ اسی کی آل اولاد میں شمار ہو کر بنی قنان کہلانے لگتے تھے۔ اسی قاعدے پر عرب کی آبادی کا بڑا حصہ بنی اسماعیل کہلایا۔ اور اولاد بیت و سب کے ہاتھ پر مشرق باسلام ہونے والے لوگ سب کے سب بنی اسرائیل کے جامع نام کے تحت کھپ گئے۔ اسی طرح مدین کے علاقے کی ساری آبادی بھی جو نبیان بن ابراہیم علیہ السلام کے زیر اثر آئی، بنی یزید کہلاتی اور ان کے ملک کا نام بنی یزید یا یزیدیاں ہو گیا۔ اس تاریخی حقیقت کو جان لینے کے بعد یہ گمان کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی کہ اس قوم کو دین حق کی آواز پہلی مرتبہ حضرت شعیب ہی کے ذریعے سے پہنچی تھی۔ حقیقت بنی اسرائیل کی طرح ابتداء وہ بھی مسلمان ہی تھے اور شعیب علیہ السلام کے ظہور کے وقت ان کی حالت ایک بگڑی ہوئی مسلمان قوم کی سی تھی جیسی ظہور ثمودی علیہ السلام کے وقت بنی اسرائیل کی حالت تھی حضرت ابراہیم کے بعد چھ سات سو برس تک مشرک اور بد اخلاق قوموں کے درمیان رہتے رہتے یہ لوگ شرک بھی سیکھ گئے تھے اور بد اخلاقیوں میں بھی مبتلا ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود ایمان کا دعویٰ اور اس پر فخر برقرار تھا۔

### دعوت اصلاح کا رد عمل

وَ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ لَبِئْسَ مَا كُنْتُمْ تَشْعِبُونَ  
 اِس قوم کے سرداروں نے جو اس کی بات اسنے سے انکار کر چکے تھے، آپس میں کہا اگر تم نے شعیب کی پیروی کر لی تو برباد ہو جاؤ گے۔

(الاعراف - آیت ۹۰)

حضرت شعیب کی دعوت اصلاح کے جواب میں مدین کے سردار اور لیڈر کہتے تھے اسی بات کا اپنی قوم کو بھی یقین دلانے تھے کہ شعیب جس یاغاری اور استیلائی کی دعوت سے رہا ہے اور اخلاق و دیانت کے بنی مستغل اصولوں کی پابندی کرنا پابستہ، لگژن کو مان لیا جاتے تو ہم تباہ ہو جائیں گے ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے اگر ہم بالکل ہی سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں۔ اور ہم جو دنیا کی سب سے بڑی تجارتی شاہ راہوں کے چوراہے



پر بستے ہیں اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدن سلطنتوں کی سرحد پر آباد ہیں اگر ہم قافلوں کو چھڑتا بند کر دیں تو انکی بے ضرر اور پُر امن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہیں اپنی موجودہ جغرافیائی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو جائیں گے اور اس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی یہ بات صرف قوم شعیب کے سرداروں ہی تک محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق اور راستی اور دیانت کی روش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے ذمہ داریوں کی صورت میں اور بد اخلاقی کے بغیر نہیں چل سکتے۔ ہر جگہ دعوتِ حق کے مقابلہ میں جو زبردست غدراوتیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر توبہ کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے گی تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ ۳۳۳

### اہل مدین پر عذاب

اہل مدین پر عذاب رخص (سہوناک) دھمکے اور لڑنے کی صورت میں آیا۔ ان کی یہ تباہی مدت دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضرب المثل رہی ہے۔ چنانچہ زبور و انجیل میں ایک جگہ آتا ہے کہ "آسے خدا اعلانِ ظلمتوں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے، لہذا تم ان کے ساتھ وہی کرو جو تم نے مدیان کے ساتھ کیا" (۸۳-۹۶) اور تیسعیاہ نبی ایک جگہ نبی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آشور والوں سے نہ ڈرو، اگرچہ وہ تمہارے لیے مصیبتوں کی طرح ظالم بنے بارہے ہیں لیکن کچھ دیر نہ گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسانے لگا اور ان کا وہی حشر ہوگا جو مدیان کا ہوا۔ تیسعیاہ ۱۰: ۳۱-۳۶ ۳۳۵

### اصحابِ الایکیم پر عذاب

انہوں نے اسے جھٹلایا، آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آگیا۔ اور وہ بڑے ہی خوفناک دن کا عذاب تھا۔

فَلَمَّا بَرَأْنَا مَا نَزَّلْنَا عَلَيْهِ مِنَ الْقُرْآنِ  
رَأَاهُ كَأَن يَنْزِلُ السَّمَاءَ كَاسِجٍ مِّنَ الْغَمَامِ  
وَكَلَّمَ اللَّهُ النَّبِيَّ إِذْ يَقُولُ لِغَمَامِهِ  
رَبِّ انزله ۱۸۹

ان پر نازل ہونے والے عذاب کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چونکہ آسمانی عذاب مانگا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھا یا رہا جب تک اہل عذاب نے ان کو باطل تباہ نہ کر دیا۔ قرآن سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحابِ مدین کے عذاب کی کیفیت اصحابِ الایکیم کے

عذرا بہ سے مختلف نہ تھی۔ یہ یہودیوں کی پہلی کتاب ہے پھر تری ولہے عذرا بہ سے پہلے کہ پھر ہے۔ اور ان پر عذرا بہ ایک  
 دھماکے اور زلزلے کی شکل میں آیا **فَأَصْبَحُوا فِي ذَا بَعْثٍ جَسَدِيٍّ** اور **فَأَصْبَحُوا**  
**الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّالِحِينَ فَاصْبِحُوا فِي ذَا بَعْثٍ جَسَدِيٍّ** اور ان دونوں کو ملا کر ایک وراثت بنانے  
 کی کوشش درست نہیں ہے۔ بعض مفسرین نے عذرا بہ یوم القتلہ کی کچھ اور صحاحات بیان کی ہیں۔ مگر میں نہیں سمجھتا  
 کہ ان کی صحاحات کا نام نہ لیا جائے۔ اس جزیرے حضرت عبد اللہ بن عباس کا یہ قول کیا ہے کہ من حدّ ثلث من  
**الْعَدَمِ مَعَاذِ ابْنِ بَدْرِ الْعَلَلَةِ فَكَيْفَ بَدْرٌ عَلَامِيٌّ** سے جو کہی تم سے بیان کرے کہ یوم القتلہ کا عذرا بہ کیا تھا  
 اس کو درست نہ سمجھو، **یوم القتلہ**

# قوم یونس

حضرت یونسؑ کے حالاتِ زندگی  
یونس علیہ السلام (جن کا نام بابل میں یوناہ ہے اور جن کا زمانہ سن ۸۶۰ء قبل مسیح کے درمیان بتایا جاتا ہے)، اگرچہ اسرائیلی نبی تھے، مگر ان کو آشور (اسیریا) والوں کی ہدایت کے لیے عراق بھیجا گیا تھا، اور اسی بنا پر آشوریوں کو یہاں قوم یونس کہا گیا ہے۔ اس قوم کا مرکز اُس زمانہ میں نینوی کا مشہور شہر تھا جس کے وسیع کھنڈرات آج تک دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ شہر موصل کے عین مقابل پاتے جاتے ہیں۔ اور اسی علاقے میں "یونس نبی" کے نام سے ایک مقام بھی موجود ہے۔ اس قوم کے خروج کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا دارالسلطنت نینوی تقریباً ۶۰ میل کے فاصلے میں پھیلا ہوا تھا۔

## قرآن اور بابل میں مذکورہ یونس

قرآن میں اس قصہ کی طرف اشارات کیے گئے ہیں، کئی تفصیل نہیں دی گئی۔ اس لیے یونس کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ قوم کون تھی اور جس کی بنا پر خدا کے اس قانون سے مستثنیٰ کی گئی کہ عذاب کا نیکو بندے کے بعد کسی کا ایمان اُس کے لیے نافع نہیں ہوتا۔ بابل میں یوناہ کے نام سے جو مختصر سا صحیفہ ہے اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ چنداں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو وہ آسانی صحیفہ ہے نہ خود یونس علیہ السلام کا اپنا لکھا ہوا ہے۔ بلکہ ان کے چار پانچ سو برس بعد کسی نامعلوم شخص نے اسے تاریخ یونس کے طور پر لکھ کر مجموعہ

لے قرآن میں کہیں ان کا نام لیا گیا ہے اور کہیں "ذوالنون" اور "صاحب الخوت" یعنی مچھلی وانے کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مچھلی والا کہیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ وہ مچھلیاں کھرتے پانچتے تھے، بلکہ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ کے (نون سے ایک مچھلی نے ان کو نکل لیا تھا جیسا کہ سورۃ سافات آیت ۴۲ میں بیان ہوا ہے) (تفسیر القرآن جلد سوم - الانبیاء، حاشیہ ۸۲)

تہ ملاحظہ ہو سورۃ یونس آیت ۹۸ - سورۃ انبیاء آیات ۸۴ - ۸۸ - السافات آیات ۱۳۹ - ۱۴۸ - انفولہ ۴۸ - ۵۰

سب مقدمہ میں شامل کر دیا ہے دوسرے اس میں بعض صریح ٹیبلت بھی پاتے جاتے ہیں جو ماننے کے قابل نہیں ہیں تاہم قرآن کے اشارات اور صحیفہ یونس کی تفصیلات پر غور کرنے سے وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو مشرکین قرآن نے بیان کی ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام چونکہ عذاب کی اطلاع دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر اپنا منقرہ چھوڑ گئے تھے، اس لیے جب آثار عذاب دیکھ کر آشوریوں نے توبہ و استغفار کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا۔

قرآن مجید میں عذابی و مشور کے جو اصول و کلیات بیان کیے گئے ہیں ان میں ایک مستقل دفعہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو اس وقت تک عذاب نہیں دیتا جب تک اس پر اپنی رحمت پوری نہیں کر دیتا۔ پس جب نبی نے اس قوم کی مہلت کے آخری لمحے تک نصیحت کا سلسلہ جاری نہ رکھا اور اللہ کے مقرر کردہ وقت سے پہلے بطور خود ہی ہجرت کر گیا تو اللہ تعالیٰ کے انصاف نے اس کی قوم کو عذاب دینا گوارا نہ کیا، کیونکہ اس پر تمام رحمت کی قانونی شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں۔

### قوم یونس کی آخری تباہی

جب یہ قوم ایمان لے آئی تو اس کی مہلت عمر میں اضافہ کر دیا گیا بعد میں اس نے پھر خیالِ عمل کی گراہیاں اختیار کرنی شروع کر دیں۔ ناحوم نبی (سنہ ۶۹۵ قبل مسیح) نے اسے متنبہ کیا، مگر کوئی اثر نہ ہوا پھر یونس نبی (سنہ ۶۲۹ قبل مسیح) نے اس کو آخری تنبیہ کی۔ وہ بھی کارگر نہ ہوئی۔ آخر کار سلطنتِ قوم کے گت گت زلزلے میں اللہ تعالیٰ نے میڈیا والوں کو اس پر مسلط کر دیا۔ میڈیا کا بادشاہ بابل والوں کی مدد سے آشور کے علاقے پر چڑھ آیا۔ آشوری فوج سکست کھا کر مینوئی میں محصور ہو گئی۔ کچھ مدت تک اس نے سخت مقابلہ کیا پھر وجہ کی طغیانی نے نصیب شہر توڑ دی اور حملہ آور اندر گھس گئے۔ پورا شہر جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ گرد و پیش کے علاقے کا بھی یہی منظر ہوا۔ آشور کا بادشاہ خود اپنے محل میں آگ کا جلا کر بل مارا اور اس کے ساتھ ہی آشوری سلطنت اور تہذیب بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ زمانہ حال میں آثار قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوتی ہیں، ان میں آشورنگ کے نشانات کثرت سے پاتے جاتے ہیں ۳۳۸

یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے قبل اس کے کہ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم آتا اور ان کے لیے اپنی ڈیوٹی چھوڑنا جائز ہوتا ۳۳۸

۳۳۸ اس مسئلے پر مفصل بحث فقیر القرآن، جلد چہارم، تفسیر سورہ صافات، حاشیہ ۸۵ میں کی گئی ہے جس میں مفسرین کے تمام اعتراضات کا جواب دے دیا گیا ہے۔  
محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

# بنی اسرائیل

## نسل ابراہیمی کی دو شاخیں

حضرت ابراہیم کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں: ایک حضرت اسماعیل کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا۔ اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیل کی اولاد نہ تھے وہ بھی چونکہ ان کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے، اس لیے وہ اپنا سلسلہ انہی سے جوڑتے تھے۔ دوسرے حضرت اسحاق کی اولاد جن میں حضرت یعقوب، یوسف، موسیٰ، داؤد، سلیمان، یحییٰ، عیسیٰ اور بہت سے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوب کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا، انہوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کر دی، یا وہ نسلاً تو ان سے الگ رہے۔ مگر مذہباً ان کے تابع رہے۔ اس شاخ میں جب پستی و منزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا ۳۳۹ھ

سورۃ المائدہ کی آیت ۲۰ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس عظمت گذشتہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے کسی زمانہ میں ان کو حاصل تھی۔ ایک طرف حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف جیسے جلیل القدر پیغمبران کی قوم میں پیدا ہوتے اور دوسری طرف حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں اودان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ قدرت دراز تک یہی اس زمانہ کی جذبہ دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے۔ اور انہی کا سکہ مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰ سے شروع کرتے ہیں لیکن قرآن اس مقام پر تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانہ عروج حضرت موسیٰ سے پہلے گزر چکا تھا جسے خود حضرت موسیٰ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ ۳۳۰ھ

## فلسطین میں بدترین شرک کا دور

حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین میں داخل ہوئے تو یہاں مختلف قومیں آباد تھیں جتنی اموری، کنعانی، فریزی، عری، ایروسی، فلسطینی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین قسم کا شرک پایا جاتا تھا۔ ان کے سب سے بڑے معبود کا نام ایل تھا جسے دیوتاؤں کا باپ کہتے تھے اور اسے عمرًا سائنڈ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اس کی بیوی کا نام عشیہ تھا اور اس سے خداؤں اور خدا نیوں کی ایک پوری نسل چلی تھی جن کی تعداد شتر تک پہنچ گئی تھی۔ ان کی اولاد میں سب سے زیادہ زبردست فعل تھا جس کو بارش اور روئیدگی کا خدا اور زمین و آسمان کا مالک سمجھا جاتا تھا شمالی علاقوں میں اس کی بیوی زانات کہلاتی تھی اور فلسطین میں عشتارات۔ یہ دونوں عورتیں عشق اور افزائش نسل کی پرہا تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی دیوتا موت کا مالک تھا۔ کسی دیوی کے قبضے میں صحت تھی کسی دیوتا کو وبا اور غم طمانے کے اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ اور یوں ساری خدائی بہت سے معبودوں میں بٹ گئی تھی۔ ان دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف ایسے ایسے ذلیل اوصاف و اعمال منسوب تھے کہ اخلاقی حیثیت سے انتہائی بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ شتر عورتوں کو پسند نہ کریں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسی کینہ ہستوں کو خدا بنا لیں اور ان کی پرستش کریں وہ اخلاقی کی ذلیل ترین پستیوں میں گرنے سے کیسے بچ سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے جو حالات آثارِ قدیمہ کی کہداتوں سے دریافت ہوئے ہیں وہ شدید اخلاقی گراؤ کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے ہاں بچوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ ان کے معاہدہ زنا کاری کے اڈے بنے ہوتے تھے۔ عورتوں کو دیوتاوں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھنا اور ان سے بدکاریاں کرنا عبادت کے اجزاء میں داخل تھا۔ اور اسی طرح کی اور بہت سی بد اخلاقیوں ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔

## بنی اسرائیل میں بگاڑ کا سبب

تورات میں حضرت موسیٰ کے ذریعے سے بنی اسرائیل کو جو ہدایات دی گئی تھیں ان میں صاف صاف کہہ دیا گیا تھا کہ تم ان قوموں کو ہٹا کر کے ان کے قبضے سے فلسطین کی سرزمین چھین لینا اور ان کے ساتھ رہنے بسنے اور ان کی اخلاقی و اعتقادی خرابیوں میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرنا۔

لیکن بنی اسرائیل جب فلسطین میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھول گئے۔ انہوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔ اس تفرقہ کی وجہ سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقتور نہ ہو سکا کہ اپنے علاقے کو شتر کین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ آخر کار انہیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں بسیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے مفتوح علاقوں میں جگہ جگہ ان مشرک قوموں کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں بھی موجود رہیں جن کو بنی اسرائیل

مستحضر کر کے اسی بات کی شکایت زبور میں کی گئی ہے۔

نتیجہ یہ

اس کا پہلا نمیانہ تو بنی اسرائیل کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قوموں کے ذریعے سے ان کے اندر شرک گھس آیا اور اس کے ساتھ تدریج دوسری اخلاقی گندگیاں بھی راہ پانے لگیں۔ چنانچہ اس کی شکایت بائبل کی کتاب نضاۃ میں یوں کی گئی ہے:

اور بنی اسرائیل نے خداوند کے آگے بدی کی اور تعلیم کی پرستش کرنے لگے اور انہوں نے خداوند اپنے باپ دادا کے خدا کو جو انہیں تک مہر سے نکال لایا تھا چھوڑ دیا اور دوسرے معبودوں کی جو ان کے گروا گرو کی قوموں کے دیوتاؤں میں سے تھے پر وی کرنے اور ان کو سجدہ کرنے لگے اور خداوند کو غصہ دلایا۔ وہ خداوند کو چھوڑ کر

تعل اور عشتارات کی پرستش کرنے لگے اور خداوند کا قہر اسرائیل پر پھڑکا۔ (باب ۲۔ آیت ۱۱-۱۳)

اس کے بعد دوسرا نمیانہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انہوں نے چھوڑ دی تھیں، انہوں نے اور فلسطینیوں نے، جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پچھ درپچھ حملے کر کے فلسطین کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا جی کہ ان سے خداوند کے عہد کا صندوق (تابوت سکینہ) تک چھین لیا۔ آخر کار بنی اسرائیل کو ایک فرمانروا کے تخت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی درخواست پر حضرت موسیٰ بنی نے مسئلہ قبل مسیح میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا (اس کی تفصیل سورہ بقرہ رکوع ۲۲ میں بیان ہوتی ہے)۔

دورِ خمر و فلاح

اس متحدہ سلطنت کے تین فرمانروا ہوتے۔ طالوت و سلیمان و داؤد علیہ السلام

۹۶۵ء تا ۹۲۶ء مسلمان م۔ ۱۔ ان فرمانرواؤں نے اس کا

یہ شکایت حضرت داؤد کی زبان سے نقل ادا ہوئی ہے

”انہوں نے ان قوموں کو بگاڑ دیا جیسا خداوند نے ان کو حکم دیا تھا بلکہ ان قوموں کے ساتھ مل گئے اور ان کے سے کام لیکر گئے اور ان کے تمول کی پرستش کرنے لگے جو ان کے لیے پھندا بن گئے بلکہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو شیاطین کے لیے قربان کیا اور معصوموں کا، یعنی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کا خون بہایا۔ اس لیے نضاۃ کا قہر اپنے لوگوں پر پھڑکا اور اسے اپنی میراث سے نفرت ہو گئی۔ اور اس نے ان کو قوموں کے قبضے میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمران بن گئے“

(زبور، باب ۶-۱۰۔ آیات ۳۴-۳۱)

محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

کو مکمل کیا ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔ صرف شمالی ساحل پر فقیہوں کی اور جنوبی مغربی ساحل پر فلسطینیوں کی ریاستیں باقی رہ گئیں جنہیں مغرورہ کیا جاسکا اور محض باجگزار بنانے پر اکتفا کیا گیا۔  
دورِ فساد و ہجران

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر یونیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑکر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور مشرقی اردن میں سلطنت اسرائیل جس کا پایہ تخت آخر کار سامریہ قرار پایا۔ اور جنوبی فلسطین اور اردوم کے علاقے میں سلطنت یہودیتہ جس کا پایہ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش اول روز سے شروع ہو گئی اور آخر تک رہی

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمساہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور یہ حالت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب اس ریاست کے فرمانروا انخی اب نے صیدا کی مشرک شہزادی ایزبل سے شادی کر لی۔ اس وقت حکومت کی طاقت اور ذرائع متحرک اور بد اخلاقیوں سیلاب کی طرح اسرائیلیوں میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ حضرت الیاس، اور حضرت ایسح علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی مگر یہ قوم جس نثرل کی طرف جاری تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب آشوریوں کی شکل میں دولت اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر آشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے۔ اس دور میں عاموں نے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قبل مسیح، اور پھر ہویس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قبل مسیح، نے اٹھ کر اسرائیلیوں کو پے درپے تنبیہات کیں مگر جس غفلت کے نشے میں وہ سرشار تھے وہ تنبیہ کی نثرشی سے اور زیادہ تیز ہو گیا۔ یہاں تک کہ عاموس نبی کو شاہ اسرائیل نے ملک سے نکل جانے اور دولت سامریہ کے حدود میں نبوت بند کر دینے کا نوٹس دے دیا۔ اس کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ خدا کا عذاب اسرائیلی سلطنت اور اس کے باشندوں پر ٹوٹ پڑا۔ ۷۲۰ قبل مسیح میں آشور کے سخت گیر فرماں روا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا، ہزار ہا اسرائیلی تہ تیغ کیے گئے، ۲۶ ہزار سے زیادہ بااثر اسرائیلیوں کو ملک سے نکال کر آشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں بٹھرتھ کر دیا گیا۔ اور دوسرے علاقوں سے لاکھ غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیر کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی، وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی مشرک اور بد اخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔ مگر نسبتاً اس کا اعتقادی اور اخلاقی زوال دولت اسرائیل کی نسبت سمست رفتار تھا۔ اس لیے اس کو مہلت بھی کچھ زیادہ دی گئی۔ اگرچہ



دولت اسرائیل کی طرح اس پر بھی اشوریوں نے پے درپے حملے کیے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، اس کے پائینے کا محاصرہ کیا، لیکن یہ ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہو سکی۔ بلکہ صرف باج گزار بن کر رہ گئی۔ پھر جب حضرت یسٰیٰ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی اور بدانتظامیوں سے باز نہ آئے تو ۵۹۷ء میں بابل کے بادشاہ نبخت نصر نے یروشلم سمیت پوری دولت یہودیہ کو مستخر کر لیا اور یہودیہ کا بادشاہ اس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بد اعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی ختم نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے بھجانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلتے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر ۵۸۶ء قبل مسیح میں نبخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ، بجادی۔ یروشلم اور پہلی سلیمانی کو اس طرح پوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ ٹھیک نہ رہی، یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تشریف کر دیا اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے وہ بھی ہمہایہ قوموں کے ہاتھوں بڑی طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔

### بابل کی اسیری کے زمانے میں نبی اسرائیل کا کردار

”اور گئے ان چیزوں کی پیروی کرنے، جو شیاطین شیطان کی سلطنت کا نام سے کریش کیا کرتے تھے، حالانکہ شیطان نے کبھی کفر نہیں کیا، کفر کے ترکہ تھے وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو عبادت و گری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اس چیز کے جو بابل میں وہ فرشتوں، ابروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی، حالانکہ وہ فرشتے، جب کبھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے تو پہلے صاف طور پر تنبیہ کر دیا کرتے تھے کہ دیکھو، ہم محض ایک آزمائش ہیں، تو کفر میں مبتلا نہ ہو، پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے، جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذن الہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے، مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے، جو خود ان کو کبھی نفع بخش

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مِثْقَلِ ذَرَّةٍ مِّنَ الْحَدِيثِ وَكَانَ كَثِيرٌ مَّا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ الْيَهُودَ وَمَا أُنزِلَ تِلْكَ الْكَلِمَاتِ الْيَهُودِيَّةِ وَمَا أُوتِيَ إِلَّا مَا أُوْتِيَ بِلِسَانِ فَتَنَةٍ فَلَا تَكْفُرُوا بِمَا لَكُمْ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَرُجُوعِهِ وَمَا هُمْ بِضَآئِرِينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيُعَلِّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ وَلِيُسْئِرَ مَا نُزِّلَ إِلَيْكَ لَعَلَّكُمْ تَكْفُرُونَ

(البقرہ ۱۰۲)

نہیں بلکہ نقصان دہ تھی اور انہیں خراب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں کتنی بُری متاع تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، کاش انہیں معلوم ہوتا!

شیاطین سے مراد شیاطین جن اور شیاطین انس دونوں ہو سکتے ہیں اور دونوں ہی یہاں مراد ہیں جب جی اسرائیل میں اخلاقی و مادی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، بکثرت، افلاس اور ذلت و پستی نے ان کے اندر کوئی بندہ جو صلگی اور اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی تو ان کی توجہات جاؤ توڑنے اور طلسمات و عملیات اور تعویذ گندوں کی طرف مبذول ہونے لگیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی منصفیت اور جدوجہد کے بغیر محض پھونکوں اور سنتروں کے زور پر سارے کام بن جایا کریں۔ اس وقت شیاطین نے ان کو بہکانا شروع کیا کہ سلیمان علیہ السلام کی علیم الشان سلطنت اور ان کی حیرت انگیز طاقتیں تو سب کچھ چند نقوش اور سنتروں کا نتیجہ تھیں، اور وہ ہم تمہیں بتائے دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے اور پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعی حق کی آواز انہوں نے سن کر دی۔

اس آیت کی تاویل میں مختلف اقوال ہیں، مگر جو کچھ میں نے سمجھا ہے، وہ یہ ہے کہ جن زمانے میں نبی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے بھیجا ہوگا جس طرح قوم لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے، اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور قیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازار ساعری میں اپنی دوکان لگائی گئی ہوگی۔ اور دوسری طرف وہ اتمامِ حجت کے لیے ہر ایک کو خبردار بھی کر دیتے ہو گئے کہ دیکھو تم بہتار لیے آزمائش کی حیثیت رکھتے ہیں، تم اپنی عاقبت خراب نہ کرو مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویذات پر ٹوٹے پڑتے ہو گئے۔

فرشتوں کے انسانی شکل میں آکر کام کرنے پر کسی کو حیرت نہ ہو۔ وہ سلطنتِ الہی کے کارپرداز ہیں۔ اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں جس وقت جو صورت اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ہمیں کیا خیر کہ اس وقت بھی ہمارے گرد و پیش کتنے فرشتے انسانی شکل میں آکر کام کر جاتے ہو گئے۔ رہا فرشتوں کا ایک ایسی چیز سمجھانا جو بجا تے خود بُری تھی، تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے پولیس کے بے وردی سپاہی کسی رشوت خور حاکم کو نشان زدہ سکے اور لوٹ لے جا کر رشوت کے طور پر دیتے ہیں تاکہ اُسے عین حالتِ ارتکابِ جرم میں پکڑیں اور اس کے لیے بنے گناہی کے عُذر کی گنجائش باقی نہ رہنے دیں۔

اس مثنوی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بہوی کو اس سے توڑ کر اپنے اور عائشہ کرے۔ یہ اخلاقی زوال کا وہ انتہائی درجہ تھا

جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا مرتبہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرانی عورتوں سے آنکھ لڑانا ہو جائے اور کسی منگولہ عورت کو اس کے شوہر سے توڑ کر اپنا کر لینے کو وہ اپنی سب سے بڑی فتح سمجھنے لگیں۔

ازدواجی تعلق و حقیقت انسانی تمدن کی جڑ ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے انسانی تمدن کی درستی کا اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدن کی خرابی کا مدار ہے۔ لہذا وہ شخص بدترین مفسد ہے جو اس درخت کی جڑ پر ہمیشہ چلاتا ہو جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری سوسائٹی کا قیام منحصر ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اطمین اپنے مرکز سے زمین کے ہر گوشے میں اپنے ایمینٹ روانہ کرتا ہے۔ پھر وہ بھینٹ واپس آ کر اپنی اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فتنہ برپا کیا، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شرک کر لیا، مگر اطمین ہر ایک سے کہتا جاتا ہے کہ تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جذباتی شمال آیا ہوں۔ یہ سن کر اطمین اس کو گلے سے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو کام کر کے آیا ہے۔ اس حدیث پر غور کرنے سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی آزمائش کو جو فرشتے بھیجے گئے تھے انہیں کیوں حکم دیا گیا کہ عورت اور مرد کے درمیان جذباتی ڈالنے کا عمل ان کے سامنے پیش کریں۔ دراصل یہی ایک ایسا پیمانہ تھا جس سے ان کے اخلاقی زوال کو ٹھیک ٹھیک ناپا جاسکتا تھا۔

### دور تجدید و احیاء

جہاں تک سامریہ اور اسرائیل کے لوگوں کا تعلق ہے وہ تو اخلاقی و اعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اٹھے۔ مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیہ ایسا موجود تھا جو خیر برپا قائم اور خیر کی دعوت لینے والا تھا۔ اُس نے اُن لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے بچے رہ گئے تھے۔ اور اُن لوگوں کو بھی توبہ و نابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلا وطن کر دیئے گئے تھے۔ آخر کار رحمتِ الہی اُن کی مددگار ہوئی۔ بابل کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ۵۳۹ ق م قبل مسیح میں ایرانی فاتح سائرس دھرمس یا خسرو نے بابل کو فتح کیا اور اس کے دور سے ہی سال اس نے فرمان جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے۔ چنانچہ اس کے بعد یہودیوں کے قافلے پر قافلے یہودیہ کی طرف جانے شروع ہو گئے جن کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ سائرس نے یہودیوں کو پہلی سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی اجازت بھی دی۔ مگر ایک عرصے تک ہمسایہ قومیں جو اس علاقہ میں آباد ہو گئی تھیں، مزاحمت کرتی رہیں۔ آخر دارلوس (دارالاولیٰ) نے ۵۲۰ ق م میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے

پوتے زرو بابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے بھی نبی، مذکر یاہوی اور سردار کاہن شیوع کی نگرانی میں سینچل مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا پھر مشرق میں ایک جلاوطن گروہ کے ساتھ حضرت عزیر (مزارا) یہودیہ پہنچے اور شاہ ایران انہیں شستا دارا کا سرنریا اور شیرمنے ایک فرمان کی رو سے ان کو مجاز کیا کہ:

”تو اپنے خدا کی اُس دانش کے مطابق جو تجھ کو عنایت ہوئی، مامکوں اور قاضیوں کو مقرر کرنا کہ دریا پار کے سب لوگوں کا جو تیرے خدا کی شریعت کو مانتے ہیں انصاف کریں، اور تم اُس کو جو نہ جانتا ہو سکا تو، اور جو کوئی تیرے خدا کی شریعت پر اور بادشاہ کے فرمان پر عمل نہ کرے اس کو بلا توقف قانونی سزا دی جاسے، خواہ موت ہو، یا جلا وطنی، یا مال کی ضبطی، یا قید“

عزرا۔ باب ۷ آیت ۲۵-۲۶

اس فرمان سے فائدہ اٹھا کر حضرت عزیر نے دین موسوی کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انہوں نے یہودی قوم کے تمام اہل خیر و صلاح کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائبل کی کتب خمسہ کو جن میں توراہ تھی، مرتب کر کے شائع کیا۔ یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا۔ قوانین شریعت کو نافذ کر کے اُن اعتقادی اور اخلاقی بُرائیوں کو دور کرنا شروع کیا جو بنی اسرائیل کے اندر غیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں۔ اُن تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلوائی جن سے یہودیوں نے بیاہ کر رکھے تھے۔ اور بنی اسرائیل سے از سر نو بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا یثاق لیا۔

۳۳۰ ق م قبل مسیح میں نحمیاہ کے زیر قیادت ایک اور جلاوطن گروہ یہودیہ واپس آیا اور شاہ ایران نے نحمیاہ کو یروشلم کا حاکم مقرر کر کے اس امر کی اجازت دی کہ وہ اس کی شہر نیا تعمیر کرے۔ اس طرح ڈیڑھ سو سال بعد بیت المقدس پھر آباد ہوا اور یہودی مذہب و تہذیب کا مرکز بن گیا۔ مگر شمالی فلسطین اور سامریہ کے اسرائیلیوں نے حضرت عزیر کی اصلاح و تجدید سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ بلکہ بیت المقدس کے مقابلہ میں اپنا ایک مذہبی مرکز کوہ جزیم پر تعمیر کر کے اس کو قبلہ اہل کتاب بنانے کی کوشش کی۔ اس طرح یہودیوں اور سامریوں کے درمیان بجد اور زیادہ بڑھ گیا۔

یونانی تسلط اور اس کے خلافت کشمکش

ایرانی سلطنت کے زوال اور سکندر اعظم کی فتوحات اور پھر ایرانیوں کے عروج سے یہودیوں کو کچھ مدت کے لیے ایک سخت دھکا لگا۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت جن تین سلطنتوں میں تقسیم ہوئی تھی ان میں سے شام کا علاقہ اس سلطنت کے حصے میں آیا جس کا پایہ تخت انطاکیہ تھا۔ اور اس کے فرمانروا انٹیوکس تاس نے ۱۹۵ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یہ یونانی فاتح، جو مذہباً مشرک اور اخلاقاً اہمیت پسند تھے، یہودی مذہب

ہندیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی زیادہ سے یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کر دیا اور خود یہودیوں میں سے ایک اچھا خاصا عنصر ان کا آڈ کاربن کیا۔ اس خارجی مداخلت نے یہودی قوم میں تفرقہ ڈال دیا۔ ایک گروہ نے یونانی لباس، یونانی زبان، یونانی طرز معاشرت اور یونانی کھیلوں کو اپنایا اور دوسرا گروہ اپنی تہذیب پر سختی کے ساتھ قائم رہا۔ مسئلہ قیام میں ایشیوکس چہارم جس کا لقب ایپوٹامیس (یعنی مظہر خدا) تھا جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری بابرانہ طاقت سے کام لے کر یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ اس نے بیت المقدس کے پھل میں زبردستی بہت رکھوا سنے اور یہودیوں کو مجبور کیا کہ ان کو سجدہ کریں۔ اس نے قربان گاہ پر قربانی بند کرادی۔ اس نے یہودیوں کو گمشدگانہ قربان گاہوں پر قربانیاں کرنے کا حکم دیا، اس نے ان سب لوگوں کے لیے سزا سے موت تجزیہ کی جو اپنے گھروں میں تورات کا نسخہ رکھیں۔ یا سبت کے احکام پر عمل کریں۔ یا اپنے پھل کے حقنے کر لیں۔ مگر یہودی اس جبر سے مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک بڑی تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس کشمکش میں یونانیہیت زدہ یہودیوں کی ساری ہمدردیاں یونانیوں کے ساتھ تھیں۔ اور انہوں نے عملاً مکابی بغاوت کو کچلنے میں انطاکیہ کے ظالموں کا پورا ساتھ دیا۔ لیکن عام یہودیوں میں حضرت عزیر کی بچوں کی روح دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکابیوں کے ساتھ ہر گئے اور آخر کار انہوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزاد دینی ریاست قائم کر لی جو مسئلہ قیام تک قائم رہی۔ اس ریاست کے حدود پھیل کر رفتہ رفتہ اس پورے رقبے پر حاوی ہو گئے جو کبھی یہودیہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے زیر نگین تھے بلکہ فلسطین کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آ گیا جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی مستحضر ہوا تھا۔

### دوسرا دورِ فساد

مکابیوں کی تحریک جن اخلاقی و دینی روح کے ساتھ اٹھی تھی، وہ تند مزاج بنا ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ خاص دنیا پرستی اور بے روح ظاہر داری نے لے لی۔ آخر کار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے خود رومی فاتح یوسی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ یوسی مسئلہ قیام میں اس ملک کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے بیت المقدس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا لیکن رومی فاتحین کی مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوح علاقوں پر براہ راست اپنا نظم و نسق قائم کرنے کی بسبب نظامی حکمرانوں کے ذریعے سے بالواسطہ اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے فلسطین میں اپنے زیر سایہ ایک ویسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر مسئلہ قیام میں ایک ہوشیار یہودی ہیرو نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرو دوانظم کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی فرماندہانی یورے فلسطین اور شرقی اردن پر ستمہ سے ستمہ قبل مسیح تک رہی۔ اس نے ایک طرف

نہرہی پیشواؤں کی سرپرستی کہہ کے یہودیوں کو خوش رکھا اور دوسری طرف نہرہی تہذیب کو فروغ دے کر اور  
 رومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے فیصلہ کی بھی خوشنودی حاصل کی اس زمانے میں یہودیوں  
 کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے نہوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

ہیرود کے بعد اس کی ریاست تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

اس کا ایک بیٹا اریلاؤس سامریہ، یہودیت اور شمالی اڈومیا کا فرمانروا ہوا، مگر سلسلہ میں فیصلہ آگسٹس نے  
 اس کو معزول کر کے اس کی پوری ریاست اپنے گورنر کے ماتحت کر دی اور سلسلہ تک یہی انتظام قائم رہا۔ یہی تھا  
 تھا جب حضرت مسیح علیہ السلام نبی اسرائیل کی اصلاح کے لیے آئے اور یہودیوں کے تمام مذہبی پیشواؤں نے  
 مل کر ان کی مخالفت کی اور رومی گورنر پونٹس پیلاطس سے ان کو سزائے موت دلوانے کی کوشش کی۔

ہیرود کا دوسرا بیٹا ہیرودائیٹس پاس شمالی فلسطین کے علاقہ گلیل اور شرق اردن کا مالک ہوا اور یہی وہ  
 شخص ہے جس نے ایک رفاہ کی فرمائش پر حضرت یحییٰ علیہ السلام کا سر قلم کر کے اس کی نذر کیا۔

اس کا تیسرا بیٹا قلیپ، کوہ زعمون سے دریائے یرموک تک کے علاقے کا مالک ہوا اور یہ اپنے باپ  
 اور بھائیوں سے بھی بڑھ کر رومی دیوانی تہذیب میں غرق تھا۔ اس کے علاقے میں کسی کلمہ خیر کے پھینے کی اتنی  
 گنجائش بھی نہ تھی جتنی فلسطین کے دوسرے علاقوں میں تھی۔

سلسلہ میں ہیرود اعظم کے پوتے ہیروداگرنیا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرمانروا بنا دیا  
 جن پر ہیرود اعظم اپنے زمانے میں حکمران تھا۔ اس شخص نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السلام کے پیروں  
 پر مظالم کی انتہا کر دی اور اپنا پورا زور خدا ترسی اور اصلاح اخلاقی کی اس تحریک کو کچلنے میں صرف کر ڈالا جو  
 عواریوں کی رہنمائی میں چل رہی تھی۔

اس دور میں عام یہودیوں اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی جو حالت تھی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے  
 ان نقیبوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مسیح نے اپنے خطبوں میں ان پر کی ہیں۔ یہ سب خطبے اناجیل اربعہ میں موجود  
 ہیں۔ پھر اس کا اندازہ کرنے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس قوم کی آنکھوں کے سامنے یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکیزہ  
 انسان کا سر قلم کیا گیا، مگر ایک آواز بھی اس ظلمِ عظیم کے خلاف نہ اٹھی اور پوری قوم کے مذہبی پیشواؤں نے مسیح  
 کے لیے سزائے موت کا مطالبہ کیا مگر فنوٹرس سے راستباز انسانوں کے سوا کوئی نہ تھا جو اس بدبختی پر ماتم  
 کرتا۔ جدید ہے کہ جب پونٹس پیلاطس نے ان شامت زدہ لوگوں سے پوچھا کہ آج تمہاری عید کا دن ہے اور  
 قاعدے کے مطابق میں سزائے موت کے مستحق مجرموں میں سے ایک کو چھوڑ دینے کا مجاز ہوں، تاؤ ایسوج کو  
 چھوڑوں یا براباؤ کو کہہ تو ان کے پورے مجمع نے بیک آواز کہا کہ براباؤ کو چھوڑ دے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ

کی طرف سے آخری حجت تھی جو اس قوم پر ظالم کی گئی۔

## تازیانہ مشیت

اس پر پھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی اور ۶۳۷ء اور ۶۳۸ء کے درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی، یہود اگرتا نانی اور رومی پروکیور مشیر غورین وڈوٹا اس بغاوت کو فرو کرنے میں ناکام ہوئے۔ آخر کار رومی سلطنت نے ایک سخت قومی کارروائی سے اس بغاوت کو کچل دیا اور سن ۶۳۷ء میں ٹیس نے بزدل شمشیر روٹلم کو قلعہ کر لیا۔ اس موقع پر قتل عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار آدمی مارے گئے۔ ۶۷ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بناتے گئے، ہزار ہا آدمی پکڑ پکڑ کر مصری کانوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیئے گئے، ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایسی تھپڑوں اور کلوریموں میں ان کو جنگلی جانوروں سے پھردانے یا شمشیر زخموں کے کھیل کا تختہ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ تمام دراز قامت اور خیمیں لڑکیاں فاتحین کے لیے چن لی گئیں، اور بدوشلم کے شہر اور بیکل کو مسمار کر کے یہود خاک کر دیا گیا اس کے بعد فلسطین سے یہودی اثر و اقتدار ایسا ٹٹا کہ دو ہزار برس تک اس کو پھر سر اٹھانے کا موقع نہ ملا اور یہوشلم کا بیکل مقدس پھر کبھی تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں قیصر پیڈریان نے اس شہر کو دوبارہ آباد کیا، مگر اب اس کا نام ایلیا تھا اور اس میں مدتہائے دراز تک یہودیوں کو داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔

## آخری امام حجت

چونکہ نبی اسرائیل صدیوں سے مسلسل نافرمانیاں کر رہے تھے، بار بار کی تہیہوں اور فہمائشوں کے باوجود ان کی قومی روش بگڑتی ہی چلی جا رہی تھی، پے در پے کئی انبیاء کو قتل کر چکے تھے اور ہر اس بندہ صالح کے خون پیام سے ہو جاتے تھے جو نیکی اور راستی کی طرف انہیں دعوت دیتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کرنے اور انہیں ایک آخری موقع دینے کے لیے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جیسے دو عظیم القدر پیغمبروں کو بیک وقت مبعوث کیا جن کے ساتھ مامورین اللہ ہونے کی ایسی کھلی نشانیاں تھیں کہ ان سے انکار صرف وہی لوگ کر سکتے تھے جو حق و صداقت سے انتہا درجہ کا عناد رکھتے ہوں اور حق کے مقابلہ میں جن کی جبارت، وبے باکی حد کو پہنچ چکی ہو۔ مگر نبی اسرائیل نے اس آخری موقع کو بھی ہاتھ سے کھو دیا اور پھر آٹھویں صدی کے ان دونوں پیغمبروں کی دعوت رو کر دی، بلکہ ان کے ایک رفیق نے علی الاعلان حضرت یحییٰ جیسے بلند پایہ انسان کا سر ایک زقاصد کی فرمائش پر قلم کر دیا، اور ان کے علماء و فقہاء نے سازش کر کے حضرت عیسیٰ کو رومی سلطنت سے سزا سے موت دلوانے کی کوشش کی۔ اس کے بعد نبی اسرائیل کی فہمائش پر مزید وقت

اور نبوتِ مرت کرنا باطل قبول تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو واپس بلا لیا اور قیامت تک کے بیٹے بنی اسرائیل پر ذلت کی زندگی کا فیصلہ لکھ دیا۔

حضرت یحییٰ اور ان سے بنی اسرائیل کا سلوک

حضرت یحییٰ کے جو حالات مختلف انجیلوں میں بکھرے ہوئے ہیں انہیں جمع کر کے ہم یہاں ان کی سیرتِ پاک کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔

لوقا کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰؑ سے ۶ مہینے بڑے تھے۔ ان کی والدہ اور حضرت عیسیٰ کی والدہ آپس میں قریبی رشتہ دائیں۔ تقریباً ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبوت کے منصب پر عملاً مامور ہوئے اور یوحنا کی روایت کے مطابق انہوں نے شرقِ اُردن کے علاقے میں دعوتِ الٰہی اللہ کا کام شروع کیا۔ وہ کہتے تھے:

”میں بیابان میں ایک پکارنے والے کی آواز ہوں کہ تم خداوند کی راہ کو سیدھا کرو۔“

مقرئ کا بیان ہے کہ وہ لوگوں سے گناہوں کی توبہ کراتے تھے اور توبہ کرنے والوں کو بپتسمہ دیتے تھے یعنی توبہ کے بعد غسل کراتے تھے۔ تاکہ توح اور جہیم دونوں پاک ہو جائیں۔ یہودیہ اور یروشلم کے بکثرت لوگ ان کے متفقہ ہو گئے تھے اور ان کے پاس جا کر بپتسمہ لیتے تھے (مقرئ: ۱-۲۵)۔ اسی بنا پر ان کا نام یوحنا بپتسمہ دینے والا، مشہور ہو گیا تھا۔ عام طور پر بنی اسرائیل ان کی نبوت تسلیم کر چکے تھے۔

John The Baptist

(متی: ۲۶: ۲۶) مسیح علیہ السلام کا قول تھا کہ ”جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں ہوا“ (متی: ۱۱: ۱۱)

وہ اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا ٹپکا کمر سے باندھے رہتے تھے اور ان کی خوراک ٹڈیاں اور خشکی شہد تھا (متی: ۳: ۴)۔ اس فقیرانہ زندگی کے ساتھ وہ منادی کرتے پھرتے تھے کہ ”توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہی قریب آگئی ہے“ (متی: ۳: ۲) یعنی مسیح علیہ السلام کی دعوتِ نبوت کا آغاز ہونے والا ہے۔ اسی بنا پر ان کو عموماً حضرت مسیح کا ”ابا“ کہا جاتا ہے، اور یہی بات ان کے متعلق قرآن میں کہی گئی ہے کہ:

”مُصَدِّقًا لِّبِكَلِمَاتِهِ مِنَ اللَّهِ دَالَ عَمْرَانَ“

وہ لوگوں کو روزے اور نماز کی تلقین کرتے تھے (متی: ۹: ۱۴)۔ لوقا: ۵: ۳۳۔ لوقا: ۱۱: ۱۱

وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ ”جس کے پاس دو کرتے ہوں وہ اس کو جس کے پاس نہ ہو بانٹ دے اور جس کے پاس کھانا ہو وہ بھی ایسا ہی کرے“۔ محسوس لینے والوں نے پوچھا کہ اُستاد، ہم کیا کریں تو انہوں نے فرمایا:

”جو تمہارے لیے مقرر ہے اس سے زیادہ نہ لینا“۔ سپاہیوں نے پوچھا ہمارے لیے کیا ہدایت ہے؟ فرمایا:



”نہ کسی پر ظلم کرو اور نہ ناحق کسی سے کچھ لو اور اپنی تنخواہ پر کفایت کرو“ (توقاف ۳: ۱۰-۱۲)

بنی اسرائیل کے بگڑے ہوئے علماء، فریسی اور حدوتی ان کے پاس بتیسرا بیٹے آئے تو ڈانٹ کر فرمایا  
 ”اے سانپ کے پھو اقم کو کس نے جباویا کر آئے والے غضب سے بھاگو؟۔۔۔ اپنے دلوں میں یہ کہتے خیال  
 نہ کرو کہ ابراہام ہمارا باپ ہے۔۔۔۔۔ اب درختوں کی جڑوں پر کھلنا ڈال رکھا ہوا ہے، پس جو درخت  
 اچھا پھل نہیں لاتا وہ کاٹا اور آگ میں ڈالا جاتا ہے“ (متی ۳: ۷-۱۰)

ان کے عہد کا یہودی فرمانروا، ہیرود انٹیپی پاس، جس کی ریاست میں وہ دعوتِ حق کی خدمت انجام  
 دیتے تھے، سرتا پا رومی تہذیب میں غرق تھا اور اس کی وجہ سے سارے ملک میں فسق و فجور پھیل رہا تھا اس  
 نے خود اپنے بھائی فلپ کی بیوی ہیرودیاں کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا جس پر تھی نے اس پر ہیرود کو ملاست  
 کی اور اس کی فاسقانہ حرکات کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس جرم میں ہیرود نے ان کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔  
 تاہم وہ ان کو ایک مقدس اور راستباز آدمی جان کر ان کا احترام بھی کرتا تھا اور پبلک میں ان کے غیر معمولی  
 اثر سے ڈرتا بھی تھا۔ لیکن ہیرودیاں یہ سمجھتی تھی کہ یہی علیہ السلام جو اخلاقی رُوح قوم میں چھونک رہے ہیں  
 وہ لوگوں کی نگاہ میں اُس جیسی عورتوں کو ذلیل کیے دے رہی ہے۔ اس لیے وہ ان کی جان کے درپے ہو  
 گئی۔ آخر کار ہیرود کی سالگرہ کے جشن میں اس نے وہ موقع پایا جس کی وہ ناک میں تھی جشن کے دربار میں اس کی  
 بیٹی نے خوب رقص کیا۔ جس پر خوش ہو کر ہیرود نے کہا مانگ کیا مانگتی ہے۔ بیٹی نے اپنی فاحشہ ماں سے پوچھا کیا مانگوں  
 ماں نے کہا کہ بھئی کا سر مانگ لے۔ چنانچہ اس نے ہیرود کے سامنے ہاتھ باندھ کر عرض کیا مجھے یوحنا بتیسرا دینے  
 والے کا سر ایک تھال میں رکھو اگر ابھی منگو رہیجیے۔ ہیرود یہ سن کر بہت ننگین ہوا۔ مگر محبوبہ کی بیٹی کا تقاضا  
 کیسے رد کر سکتا تھا۔ اُس نے فوراً قید خانے سے یہی علیہ السلام کا سر منگو کر لیا اور ایک تھال میں رکھوا کر  
 رقاصہ کی نذر کر دیا۔ (متی ۱۴: ۱۳-۱۲، مرقس ۶: ۱۷-۱۶، توقاف ۳: ۱۹-۱۸) (۲۰۰۰ء)

### حضرت عیسیٰ اور ان سے بنی اسرائیل کا سلوک

وَ اذْکُرْ فِی الْکِتَابِ مَوْعِظَہٗمْ اِذَا نَتَّبَعَتْ  
 مِنْ اٰھْلِہَا مَکَانَ شَوْقِیًّا۔ فَاتَّخَذَتْ مِنْ  
 دُوْنِہُمْ حِجَابًا۔  
 اور اے محمد، اس کتاب میں مرثیہ کا حال بیان کرو،  
 جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب  
 گزرتی تھیں ہو گئی اور پردہ ڈال کر ان سے چھپ  
 بیٹھی تھی۔

سورۃ آل عمران میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مرثیہ کی والدہ نے اپنی مانی ہوتی نذر کے مطابق ان کو  
 بیٹ اللہ میں عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا اور حضرت زکریا نے ان کی حفاظت و کفالت اپنے ذمے

لے لی تھی۔ وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریم بیت المقدس کی ایک محراب میں مضمت ہو گئی تھیں اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب جس میں حضرت مریم مضمت تھیں بیت المقدس کے شرقی حصے میں واقع تھی اور انہوں نے مضمتیوں کے عام طریقے کے مطابق ایک پردہ لٹکا کر اپنے آپ کو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائبل کی موافقت کی خاطر مکانات شرقیہ سے مراد ناصرہ لیا ہے انہوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ یروشلم کے شمال میں ہے نہ کہ مشرق میں۔

قَارِسْنَا اِلَيْهَا رُوحًا فَتَمَثَّلَ لَهَا  
بَشَرًا سَوِيًّا۔ قَالَتْ اِنِّي اَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ  
مِنْكَ اِنَّ كُنْتَ تَعِيًّا۔ قَالَ اِنَّمَا اَنَا  
رَسُوْلٌ رَبِّكَ لِاَهْبَ لَكَ عَلَمًا  
زَكِيًّا۔ قَالَتْ اَنۡفِي يَكُوْنُ لِي عَلَمٌ وَّكَمْ  
يَمُنُّنِيۦ بَشَرًا وَّكَمْ اَنتَ بَعِيًّا۔ قَالَ  
كٰذٰبٌۭ قَالِ رَبِّكَ هُوَ عَلٰى هٰتِهٖۤ اَوْ  
لِيَجْعَلَۤ اِلَيْهِۦ اللَّائِيۦنَ وَرِجْمَةًۭ مِّنَّا  
وَكَانَ اٰمُرًا مَّقْضِيًّا۔ (مریم ۷: ۲۱)

اس حالت میں ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو  
یعنی فرشتے کو، بھیجا اور وہ اس کے سامنے ایک  
پورے انسان کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ مریم تکلیف  
بول اٹھی کہ اگر تو کوئی خدا ترن آدمی ہے تو میں  
تجھ سے رحمن کی پناہ مانگتی ہوں۔ اس نے کہا  
”میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے  
بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔“  
مریم نے کہا ”میرے ہاں کیسے لڑکا ہوگا جبکہ  
مجھے کسی بشر نے چھوہا تک نہیں ہے اور میں کوئی  
بدکار عورت نہیں ہوں۔“ فرشتے نے کہا ”ایسا ہی ہوگا انیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کہنا میرے لیے  
بہت آسان ہے اور تم یہ اس لیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بناؤ اور  
اپنی طرف سے ایک رحمت۔ اور یہ کام ہو کر رہنا ہے۔“

حضرت مریم کے استعجاب پر فرشتے کا یہ کہنا کہ ”ایسا ہی ہوگا“ ہرگز اس معنی میں نہیں ہو سکتا کہ بشر چھوہ کو  
چھوہے گا اور اس سے تیرے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، بلکہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تیرے ہاں لڑکا ہوگا  
باوجود اس کے کہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوہا ہے۔ انہی الفاظ میں حضرت زکریا کا استعجاب نقل ہو چکا ہے  
اور وہاں بھی فرشتے نے یہی جواب دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مطلب اس کا وہاں ہے وہی یہاں بھی ہے۔  
اسی طرح سورہ طہ آیات ۲۸-۳۰ میں جب فرشتہ حضرت ابراہیم کو بیٹے کی بشارت دیتا ہے اور  
حضرت سارہ کہتی ہیں کہ مجھ بوزرعی بانجھ کے ہاں بیٹا کیسے ہوگا تو فرشتہ ان کو جواب دیتا ہے کہ کذا یدک ایسا  
ہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد بڑھاپے اور بانجھ پن کے باوجود ان کے ہاں اولاد ہونا ہے۔ علاوہ بریں  
اگر کذا یدک کا مطلب یہ لے لیا جائے کہ بشر تجھے چھوہے گا اور تیرے ہاں اسی طرح لڑکا ہوگا جیسے نیا بھر

لی عورتوں کے ہاں ہوا کرنا ہے، تو پھر بعد کے دونوں فقرے بالکل بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے کہ تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے، اور یہ کہ ہم اس لڑکے کو ایک نشانی بنا چاہتے ہیں۔ نشانی کا غلط یہاں صریح معجزے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اسی معنی پر یہ فقرہ بھی دلالت کرتا ہے کہ "ایسا کرنا میرے لیے بہت آسان ہے" لہذا اس اثر اور کامطلب بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ ہم اس لڑکے کی ذات ہی کو ایک معجزے کی حیثیت سے بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ بعد کی تفصیلات اس بات کی خود تصریح کر رہی ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات کو کس طرح معجزہ بنا کر پیش کیا گیا ہے:

میریم کو اس بچے کا عمل رہ گیا اور وہ اس حمل کو ایسے  
 ہوسے ایک دوسرے مقام پر چلی گئی پھر چلی کی تعریف  
 نے اسے ایک بچہ کے درخت کے نیچے پہنچا دیا۔  
 وہ کہنے لگی "کاش میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور  
 میرا نام نشان نہ رہتا۔ فرشتے نے پانچویں سے اس  
 کو پکار کر کہا "نعم نہ کر، تیرے رب سے تیرے  
 نیچے ایک چشمہ رواں کر دیا ہے، اور تو ذرا اس  
 درخت کے تنے کو ہلانے سے اور تیرا بازو کھولیں  
 ٹھیک پڑیں گی۔ پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں  
 ٹھنڈی کر پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس  
 سے کہہ دے کہ میں نے زمین کے لیے روزے کی نذر  
 مانی ہے اس لیے آج میں کسی سے نہ بولوں گی۔  
 پھر وہ اس بچے کو ایسے ہوسے اپنی قوم میں آئی۔  
 لوگ کہنے لگے "میریم! یہ تو تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔"

تَحْمَلْتُهُ فَأَنْتَبَذْتِ بِهٖ مَكَانًا  
 قَعِيْبًا فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَى جِذْعِ النَّخْلَةِ  
 فَأَلَمَتْ يَلِيْمَتِي مِمَّا قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ  
 نَسِيًّا مَّسِيًّا - فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَّا  
 تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبِّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا وَ  
 هَوِّنِي إِلَيْكَ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ فَسَلِّطْ  
 عَليْكَ رُطْبًا جَنِيًّا - فَكُلِي وَاشْرَبِي  
 وَرَقِي عَيْبًا فَمَا تَدْرِي مِنَ الْبَشَرِ  
 أَحَدًا فَصَوَّبِي إِيَّيْ تَدْرِي بِلَوْحِيْنَ  
 ضُورًا فَلَمَّا أَكَلَمَهُ الْيَوْمَ انْحَسِبُ -  
 كَأَنَّكَ بِهٖ قَوْمًا تَحْمِلُوْهُ فَأَلُوْا مِنْكُمْ  
 لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا - يَا حَتَّ هٰرُونَ  
 مَا كَانَ أَبُوكَ امْرَأَ سَوْءٍ وَمَا كَانَتْ  
 أُمُّكَ بَعِيًّا - (دعوت ۲۸: ۲۸)

اسے ہارون کی بہن، نہ تیرا باپ کوئی بڑا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بے کار عورت تھی؟  
 دوسرے مقام سے مراد بیت لحم ہے۔ حضرت مریم کا اپنے اعتکاف سے نکل کر دیاں جانا ایک فطری امر  
 تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ جو نسبت المقدس میں خدا کی عبادت کے  
 لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جاسٹے اعتکاف پر بیٹھی رہیں اور

ان کا عمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا تو خاندان واسے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزار و آفت میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اتھکاف کا تجربہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جیتے تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بڑنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے لہذا وہ شادی شدہ ہوتیں اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور کسراں سب کو چھوڑ بھاڑ کر وہ زہنگی کے لیے تین تہا ایک دور دراز مقام پر چلی جاتیں۔

ان الفاظ سے اس پریشانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جس میں حضرت مریم اُس وقت مبتلا تھیں۔ موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ درِ روزہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے، بلکہ یہ فکر ان کو کھاتے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس غلط باک آزمائش میں انہیں ڈالا ہے اس سے کس طرح بغیر سیتہ عہدہ برآ ہوں۔ عمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپایا۔ اب اس بچے کو کہاں لے جائیں۔ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا "نعم نہ کر" اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریم نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو تو وہ چاہتے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے اسے رنج و غم کبھی لاحق نہیں ہوا کرتا۔

مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں مجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی پیدائش پر جو کوئی بھی متوجہ نہ ہو اس کا جواب اب ہمارے ذمے ہے۔ دراصل رہے کہ نبی اسرائیل میں چھپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ بھی رائج تھا۔ یہ الفاظ بھی صاف تباہی ہیں کہ حضرت مریم کو اصل پریشانی کیا تھی۔ نیز یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں پہلوئی کا بچہ اگر دنیا کے معروف طریقہ پر پیدا ہوتا تو آخر اسے چھپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟

ان الفاظ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں ظاہری معنی میں لیا جاسکے۔ اور یہ سمجھا جائے کہ حضرت مریم کا کوئی بھائی، ہارون نامی ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی محاورے کے مطابق اُخت ہارون کے معنی "ہارون کے خاندان کی لڑکی" کیے جاتے ہیں کیونکہ عربی میں یہ ایک معروف طرزِ بیان ہے مثلاً قبیلہ مضر کے آدمی کو یا اخا مضر (اسے مضر کے بھائی) اور قبیلہ سہان کے آدمی کو یا اخا سہان (اسے سہان کے بھائی) کہا کر پکارتے ہیں۔ پہلے معنی کے متن میں دلیلِ ترجیح یہ ہے کہ بعض روایات میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معنی منقول ہوتے ہیں۔ اور دوسرے معنی کی تائید میں دلیل یہ ہے کہ موقع و محل اس معنی کا تقاضا کرتا ہے کیونکہ اس واقعہ سے قوم میں جو بیجاں برپا ہوا تھا اس کی وجہ بظاہر یہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہارون نامی ایک

گناہ منہص کی کنواری بہن گو وہیں توجہ ایسے ہوتے آئی تھی، بلکہ جس چیز نے لوگوں کا ایک عجم حضرت مریم کے گرد جمع کر دیا تھا وہ یہی ہو سکتی تھی کہ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے، خاندانہ ہارون کی ایک لڑکی اس حالت میں پائی گئی۔ اگرچہ ایک حدیث مرفوعہ کی موجودگی میں کوئی دوسری تاویل اصولاً قابل لحاظ نہیں ہو سکتی، لیکن مسلم، نسائی، ترمذی وغیرہ میں یہ حدیث جن الفاظ میں نقل ہوئی ہے اس سے یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ان الفاظ کے معنی "ہارون کی بہن" ہی ہیں، مغیرہ ہی شعبہ کی روایت میں جو کچھ بیان ہوا ہے وہ یہ ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے حضرت مغیرہ کے سامنے یہ اعتراض پیش کیا کہ قرآن میں حضرت مریم کو ہارون کی بہن کہا گیا ہے حالانکہ حضرت ہارون ان سے سینکڑوں برس پہلے گزر چکے تھے۔ حضرت مغیرہ ان کے اس اعتراض کا کوئی جواب نہ دے سکے اور انہوں نے اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ ماہر اعراب کیا۔ اس پر حضور نے فرمایا کہ "تم نے یہ جواب کیوں نہ دے دیا کہ بنی اسرائیل اپنے نام انبیاء اور صلحاء کے نام پر رکھتے تھے؟" حضور کے اس ارشاد سے صحت یہ بات نکلتی ہے کہ لا جواب ہونے کے بجائے یہ جواب دے کر اعتراض رفع کیا جاسکتا تھا۔

مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا  
 "ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا  
 ہوا ایک بچہ ہے؟" پھر بول اٹھا "میں اللہ کا  
 بندہ ہوں۔ اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا  
 اور بابرکت کیا جہاں بھی رہوں، اور نماز اور زکوٰۃ  
 کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں  
 اور انہی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، اور  
 مجھ کو جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر  
 جبکہ میں پیدا ہوا اور جبکہ میں مردی اور جبکہ  
 زندہ کر کے اٹھایا جاؤں۔ یہ ہے عیسیٰ ابن مریم  
 اور یہ ہے اس کے بارے میں وہ سچی بات جس

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ فَأَلَمْنَا كَيْفَ نَكَلِمُهُ  
 مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا - قَالَ إِنِّي  
 عَبْدُ اللَّهِ الَّذِي أَنْكَسَبَ وَجَعَلَنِي  
 نَبِيًّا - وَجَعَلَنِي مُبْرَكًا آيِنَ مَا كُنْتُ وَ  
 أَحْسَنًا بِالْمَوْلُودِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ  
 حَيًّا وَبَوًّا بِوَالِدِي وَكَعْمًا يَجْعَلُنِي  
 جَبَّارًا شَقِيًّا وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ  
 وَيَوْمَ أُمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا -  
 ذَلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ  
 الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ -

(مریم - آیات ۴۹ تا ۵۳)

میں لوگ شک کر رہے ہیں۔

یہ ہے وہ "نشانی" جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی۔  
 اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے ان پر رحمت تمام کرنا  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ



## اصحاب الرس

ان کا ذکر پہلے سورۃ فرقان آیت ۳۸ میں کیا گیا ہے اور اس کے بعد سورۃ ق آیت ۱۲ میں دوبارہ ان کا ذکر آیا ہے۔ مگر دونوں جگہ انبیاء کو جھٹلانے والی قوموں کے سلسلے میں صرف ان کا نام ہی لیا گیا ہے کوئی تفصیل ان کے قصے کی بیان نہیں کی گئی ہے۔

عرب کی روایات میں الرس کے نام سے دو مقام معروف ہیں ایک نجد میں، دوسرا شمالی حجاز میں ان میں نجد کا الرس زیادہ مشہور ہے اور اشعار جاہلیت میں زیادہ تر اسی کا ذکر ملتا ہے۔ اب یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اصحاب الرس ان دونوں میں سے کس جگہ کے رہنے والے تھے۔ ان کے قصے کی بھی کوئی قابلِ اعتماد تفصیل کسی روایت میں نہیں ملتی۔ زیادہ سے زیادہ بس اتنی بات صحت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ کوئی ایسی قوم تھی جس نے اپنے نبی کو کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ لیکن قرآن مجید میں جس طرح ان کی طرف محض ایک اشارہ کر کے چھوڑ دیا گیا ہے اس سے خیال ہوتا ہے کہ نزول قرآن کے زمانے میں اہل عرب بالعموم اس قوم اور اس کے قصے سے واقف تھے اور بعد میں یہ روایات تاریخ میں محفوظ نہ رہ سکیں۔

۱۔ اصحاب الرس کے متعلق تحقیق نہ ہو سکا کہ کون لوگ تھے مفسرین نے مختلف روایات بیان کی ہیں مگر ان میں سے کوئی چیز قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ یہی ہے کہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اپنے پیغمبر کو کنوئیں میں پھینک یا لٹکا کر مارا تھا۔ عربی زبان میں پرنے کنوئیں یا اندھے کنوئیں کو کہتے ہیں۔ (تفسیر القرآن جلد سوم، الفرقان ما شیعہ ۵۲)

جلد اول \_\_\_\_\_ حصہ ۳

بعثت سے پہلے کا ماحول

ب : مروجہ مذاہب

باب ۱۴

مشکرین



# پوری انسانی دنیا پر ایک اجمالی نظر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اسلام کی دعوت پر مامور ہوئے تو دنیا میں بہت سے اخلاقی، تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل حل طلب تھے۔ رومی اور ایرانی امپیریزم بھی موجود تھا۔ طبقاتی امتیازات بھی تھے۔ نابلت معاشی (انتفاع) Economic Exploitation، بھی ہو رہا تھا اور اخلاقی جرائم بھی پھیلے ہوئے تھے۔ خود آپ کے اپنے ملک میں بہت سے پیچیدہ مسائل موجود تھے۔ ساری قوم جہالت، اخلاقی پستی، افلاس، اطوائف الملوک اور فساد جنگلی میں مبتلا تھی۔ بینک مشرقی اور جنوبی عرب کے تمام ساحلی علاقے، عراق، شام، زرخیز صوبے سیت، ایرانی تسلط میں تھے۔ شمال میں حجاز کی سرحد تک رومی تسلط پہنچ چکا تھا۔ خود حجاز میں یہودی سرمایہ داروں کے بڑے بڑے گروہ بنے ہوئے تھے اور انہوں نے عربوں کو اپنی شوخ نواری کے جال میں بھانس رکھا تھا۔ مغربی ساحل کے عین مقابل حبش کی عیسائی حکومت موجود تھی جو چند ہی سال پہلے تک پرہیزگاری اور عین تھی۔ اس کے ہم مذہب اور اس سے یکساں گونہ معاشی و سیاسی تعلق رکھنے والوں کا ایک جتھا خود حجاز اور یمن کے درمیان بحر ان کے مقام پر موجود تھا۔ ۱۹۵۹ء

روم، یونان اور ہند

روم کے کورنلیوسیم و Colosseum کے افسانے اب تک تاریخ کے صفحات میں موجود ہیں جس میں ہزار ہا انسان شمشیر زنی و Gladiatory ہسکے کالائت اور رومی امر اور کے شوق تماشائی تذر ہو گئے۔ مہانوں کی تفریح کے لیے یاد دستوں کی تواسیع کے لیے غلاموں کو درندوں سے پھیرا دینا، یا جانوروں کی طرح ذبح کر دینا، یا ان کے جلنے کا تماشادیکھنا، یورپ اور ایشیا کے اکثر ممالک میں کوئی معیوب کام نہ تھا۔ قیدیوں اور غلاموں کو مختلف طریقوں سے عذاب دے دے کر مار ڈالنا اس عہد کا عام دستور تھا۔ باہل و خوںخوار امر اور سے گزر کر یونان و روما کے بڑے بڑے حکما و فلاسفہ کے اجتہادات میں بھی انسانی جانوں کو بے قصور ہلاک کرنے کی بہت سی دھسیانہ صورتیں جائز تھیں۔

اسطو۔ اعلاطوں جیسے اسانڈہ اخلاق ماں کو یہ اختیار دینے میں کوئی قرانی نہ پاتے تھے کہ وہ اپنے ہم کے ایک حصہ یعنی جنین کو الگ کر دے۔ چنانچہ یونان و روم میں اسقاطِ حمل کوئی ناجائز فعل نہ تھا۔ باپ کو اپنی اولاد کے قتل کا پورا حق تھا اور رومی مقبولوں کو اپنے قانون کی اس خصوصیت پر فخر تھا کہ اس میں اولاد پر باپ کے اختیارات اس قدر غیر محدود ہیں جتنا رومیوں میں۔ اس کے نزدیک خودکشی کوئی بڑی چیز نہ تھی، بلکہ ایک ایسی عزت کی بات تھی کہ لوگ جلتے کر کے ان میں خودکشیاں کیا کرتے تھے۔ حد یہ ہے کہ افلاطون جیسا حکیم بھی اسے کوئی بڑی معصیت نہ سمجھتا تھا۔ شوہر کے لیے اپنی بیوی کا قتل بالکل ایسا تھا جیسے وہ اپنے کسی پالتو جانور کو ذبح کر دے، اس لیے قانون یونان میں اس کی کوئی سزا نہ تھی۔ جو رکھشاکا گہوارہ ہندوستان ان سب سے بڑھا ہوا تھا۔ یہاں مردہ شوہر کی لاش پر زندہ بیوہ کو جلا دینا ایک جائز فعل تھا دیکھنے والا کہہ سکتا ہے کہ عورتیں شوہر کی چٹا میں جلائی نہ جاتی تھیں بلکہ خود جلتی تھیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مختلف طریقوں سے سوسائٹی کا دباؤ ہی ان کو یہ ہولناک خودکشی کرنے پر مجبور کرتا تھا، اور مذہباً اس کی تاکید تھی۔ شوہر کی جان کی کوئی قیمت نہ تھی اور صرف اس بنا پر کہ وہ غریب برہمن کے پاؤں سے پیدا ہوا ہے، اس کا خون برہمن کے لیے حلال تھا۔ وید کی آواز سن لینا شوہر کے لیے اتنا بڑا گناہ تھا کہ اس کے کان میں گچلا ہوا سیریسہ ڈال کر اسے مار ڈالنا نہ صرف جائز تھا بلکہ ضروری تھا۔ جل پر وہاں کی رسم عام تھی جس کے مطابق ماں باپ اپنے پہلے بچہ کو دریائے گنگا کی نذر کر دیتے تھے اور اس قسادت کو اپنے بے شوق جب سعادت سمجھتے تھے۔

### شُرک کا عالمگیر روگ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم توحید کی دعوت لے کر اٹھے اُس وقت دنیا کے مذہبی تصورات کیا تھے۔ بت پرست مشرکین اُن خداؤں کو پوج رہے تھے جو کٹڑی، پتھر، سونے، چاندی وغیرہ مختلف چیزوں کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ شکل، صورت اور جسم رکھتے تھے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی باقاعدہ نسل چلتی تھی۔ کوئی دیوی بے شوہر نہ تھی اور کوئی دیوتا بے زوجہ نہ تھا۔ ان کو کھانے پینے کی ضرورت بھی لاتی ہوئی تھی اور اُن کے پرستار اُن کے لیے اس کا انتظام کرتے تھے۔ مشرکین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل تھی کہ خدا انسانی شکل میں ظہور کرتا ہے اور کچھ لوگ اس کے آثار ہوتے ہیں۔ عیسائی اگرچہ ایک خدا کو ماننے کے مدعی تھے، مگر اُن کا خدا بھی تم از کم ایک بنیا تو رکھتا ہی تھا۔ اور باپ بیٹے کے ساتھ خدائی میں رُوح القدس کو بھی حصہ دار ہونے کا شرف حاصل تھا حتیٰ کہ خدا کی ماں بھی ہوتی تھی اور اُس کی ساس بھی۔ یہودی بھی ایک خدا کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر اُن کا خدا بھی مادیت اور جسمانیت اور دوسری انسانی صفات سے خالی نہ تھا۔ وہ ٹھہرتا تھا۔ انسانی شکل

میں نمودار بننا تھا۔ اپنے کسی بندے سے کشتی بھی ڈھلے تھی اور ایک عدد بیٹے و تئریہ کا باپ بھی تھا۔ ان نئی  
 گروہوں کے علاوہ جوس آتش پرست تھے اور صابی ستارہ پرست۔ ایشیہ  
 انسانیت کی باطل تقسیموں کا فتنہ

قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے  
 چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں  
 کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدا آتش کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں کہیں  
 ان کی بنا ایک خاندان، قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے، اور کہیں ایک جغرافیائی خطے میں یا ایک خاص رنگ  
 والی یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہونا یا پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تیز تاہم ہونگی  
 ہے وہ صرف اس حد تک محدود نہیں رہی ہے کہ جنہیں اس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو ان کے ساتھ غیروں  
 کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اس تیز نے غیروں کے ساتھ نفرت، عناد و تہمت و  
 تبدیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں۔ مذہب ایجاد کیے گئے  
 ہیں۔ قوانین بنائے گئے ہیں۔ اخلاقی اصول وضع کئے گئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں نے اس کو اپنا مستقل مسلک  
 بنا کر صدیوں اس پر عمل کیا ہے۔ یہودیوں نے اسی بنا پر نبی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق قرار دیا اور اپنے مذہبی  
 احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبہ کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے مان تو ان آئیم  
 کو اسی تیز نے جنم دیا جس کی دھوسے برہمنوں کی بڑی قائم کی گئی، اونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان  
 بیچ اور ناپاک ٹھہراتے گئے، اور شوڈروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کاسے اور گورے  
 کی تیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی  
 ضرورت نہیں، آج اس بیویں صدی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے  
 بڑا عظیم امریکہ میں گھسی کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا  
 تسلط قائم کر کے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا اس کی تیز بھی یہی تصور کار فرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے مفاد  
 سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال اور آبرو ان پر مباح ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان کو تو میں غلام  
 بنائیں اور ضرورت پڑے تو صفحہ سستی سے مٹا دیں مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں  
 کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے اس کی بدترین مثالیں زمانہ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور  
 آج دیکھی جا رہی ہیں خصوصیت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفہ تسلیم اور نازک نسل کی بڑی کا تصور  
 پچھلی جنگ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی باسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ  
 وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

# مشرکین عرب کا مذہب اور معاشرتی رسوم و اطوار

## مشرکین عرب کا معاشرہ ایک نظر میں

اس تاریک دور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تصرف اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا جو ممالک اس زمانے کے میان تمدن کے لحاظ سے تمدن تھے ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد ایران، روم اور مصر کے ملکوں میں علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی۔ مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگراؤں اور سون پرہیزوں کی راہ طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے اور صرف اموال کا تبادلہ کر کے واپس آجاتے تھے۔ علم و تہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ ان کے ملک میں نہ کوئی مدرس تھا، نہ کتب خانہ تھا، نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، نہ علوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنہیں کچھ کھنسا پڑھنا آتا تھا۔ مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ اس زمانہ کے علوم و فنون سے آشنا ہوتے، ان کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی باقاعدہ زبان ضرور تھی جس میں بلذخیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا۔ مگر ان کے لٹریچر کے جو کچھ باقیات ہم تک پہنچے ہیں ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کس قدر محدود تھیں، تہذیب و تمدن میں ان کا درجہ کس قدر نسبت تھا، ان پر ابوام کا کس قدر غلبہ تھا، ان کے خیالات اور ان کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی، ان کے انفرادی تصورات کتنے بھدے تھے۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ کوئی ضابطہ اور قانون نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا، اور ہر قبیلہ کے قانون کی پیروی کی جاتی تھی۔ جس کا جس پر بس چلتا اسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قابض ہو جاتا۔ یہ بات ایک عرب بدوی کے فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اس کے قبیلہ کا نہیں ہے اسے آخر وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اس کے مال پر کیوں نہ متصرف ہو جاسے؟

اخلاق و تہذیب و شائستگی کے جو کچھ بھی تصورات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت نارسا تھے۔

تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً نا آشنا تھے۔ ان کی زندگی نہایت گندی تھی۔ ان کے طریقے و شیائے تھے۔ زنا، جوا، شراب، بچوری، ہرنرہ اور نقل و خونریزی ان کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف برہمنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عورتیں تک سنگی ہو کر کہیہ کا طوائف کرتی تھیں۔ وہ اپنی رز کیوں کو اپنے ہاتھ سے ترارہ دفن کر دیتے تھے محسن اس باہلانہ خیال بنا پر کہ کوئی ان کا دغا و نہبے۔ وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی مائوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انہیں کلمے اور لباس اور عمارت کے معمولی آداب تک معلوم نہ تھے۔

مذہب کے باب میں وہ ان تمام جہالتوں اور ضلالتوں کے حصہ دار تھے جن میں اُس زمانہ کی دنیا مبتلا تھی۔ بت پرستی، ارواح پرستی، کواکب پرستی، غرض ایک نہ کی پرستش کے سوا اس وقت دنیا میں مٹنی پرستی پانی جاتی ہیں وہ سب ان میں رائج تھیں۔ انیسویں قیام اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم ان کے پاس نہ تھا۔ وہ آقا ضرور جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل ان کے باپ ہیں۔ مگر یہ نہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عار اور نمود کے تشبہ بھی ان میں مشہور تھے مگر ان کی جو روایتیں عرب کے مؤرخین نے نقل کی ہیں ان کو پڑھنا جانتے۔ کہیں آپ کو صالح اور یحییٰ کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ ان کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے انیسویں قیام کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں۔ مگر وہ جیسی کچھ تھیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر ان اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو حضرت اسلام نے نقل کی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل عرب اور خود بنی اسرائیل جن انبیاء سے واقف تھے وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق ان لوگوں کا تصور کس قدر گھٹیا درجہ کا تھا۔

### حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل کی پیروی کا زعم

زمانہ باہلیت کے عرب اپنے آپ کو حضرت ابراہیم و اسمعیل کا پیرو کہتے اور سمجھتے تھے اور اس بنا پر ان کا خیال یہ تھا کہ جس مذہب کا وہ اتباع کر رہے ہیں وہ خدا کا پسندیدہ مذہب ہی ہے۔ لیکن جو دین ان لوگوں نے حضرت ابراہیم و اسمعیل سے سیکھا تھا اس کے اندر بعد کی صدیوں میں مذہبی پیشوا، قبائل کے سردار، خاندانوں کے بڑے بوڑھے اور محنت لوگ طرح طرح کے عقائد اور اعمال اور رسوم کا اضافہ کرتے چلے گئے جنہیں آٹھ والی نسلوں نے اصل مذہب کا جز سمجھا اور عقیدت مندی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ چونکہ روایات میں یا تاریخ میں یا کسی کتاب میں ایسا کوئی ریکارڈ محفوظ نہ تھا جس سے معلوم ہوتا کہ اصل مذہب کیا تھا اور بعد میں

لے عربوں کے مذہبی حالات پر ایک مستقل فصل آگے آرہی ہے۔ اُمّیں؛

کیا چیزیں کس زمانہ میں کس نے کس طرح اضافہ کیں، اس وجہ سے اہل عرب کے لیے ان کا پورا ذہن مشتتب ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کسی چیز کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ اس اصل دین کا جز ہے جو خدا کی طرف سے آیا تھا اور یہی جانتے تھے کہ یہ بدعات اور غلط رسوم ہیں جو بعد میں لوگوں نے بڑھا دیں۔ ۳۵۰ھ

## مشرکین عرب کے چند مشہور ترین بُت

لات

اس کا استخوان طاقت میں تھا اور نبی تعظیم اس کے اس حد تک معتقد تھے کہ جب اُبڑ بہہ ہاتھوں کی فروغ لے کر خانہ کعبہ کو توڑنے کے لیے تکر پر چڑھائی کرنے جا رہا تھا اس وقت ان لوگوں نے محض اپنے اس معبود کے آستانے کو بچانے کی خاطر اس ظالم کو تھکے کارا سنبھالتے کے لیے بذریعہ فراہم کیے تاکہ وہ لات کو ہاتھ نہ لگا سکتے، حالانکہ تمام اہل عرب کی طرح نصیب کے لوگ بھی یہانتے تھے کہ کعبہ اللہ کا گھر ہے۔ لات کے معنی میں اہل علم نے درمیان اختلاف ہے۔ ابن جریر طبری کی تفسیر یہ ہے کہ یہ اللہ کی تائید ہے یعنی اصل میں یہ لفظ اللہ تھا جسے اللات کہ دیا گیا۔ زعمری کے نزدیک یہ کوای یکووی سے مشتق ہے جس کے معنی ٹرنے اور کسی کی طرف بھگنے کے ہیں۔ چونکہ مشرکین عبادت کے لیے اس کی طرف رجوع کرنے اور اس کے آگے بھگتے اور اس کا طواف کرتے تھے اس لیے اس کو لات کہا جانے لگا۔ ابن عباس اس کو لات بتشہید نام پڑھتے ہیں اور اسے لَت بِلَت سے مشتق قرار دیتے ہیں جن کے معنی مٹنے اور تھیرنے کے ہیں۔ اُن کا اور مجاہد کا بیان ہے کہ یہ دراصل ایک شمس تھا جو طاقت کے قریب ایک چٹان پر رہتا تھا اور جگتے لیے ہانے والوں کو سٹو پلاتا اور کھانے کھلاتا تھا بسبب وہ مر گیا تو لوگوں نے اسی چٹان پر اُس کا استخوان بنایا اور اُس کی عبادت کرنے لگے۔ لکھنات کی یہ تشریح ابن عباس اور مجاہد جیسے بزرگوں سے مروی ہونے کے باوجود دو وجوہ سے قابل قبول نہیں ہے۔ ایک یہ کہ قرآن میں اسے لات کہا گیا ہے نہ کہ لات۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید ان تینوں کو دیویاں بنا رہا ہے، اور اس روایت کی رو سے لات مرد تھا نہ کہ عورت۔

عزری

عزرت سے ہے اور اس کے معنی عزت دالی کے ہیں۔ یہ قریش کی خاص دیوی تھی اور اس کا استخوان گداؤ

لہ عربوں کے عقائد اور رسوم میں سے جن چند باتوں کو قرآن نے صحیح یا غلط قرار دیا ہے، ہم صرف ان کے متعلق

تعمق طرز پر جانتے ہیں کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ دُرُتیب

خائف کے درمیان داؤی ٹنڈہ میں حُرّاض کے مقام پر واقع تھاجی ہاشم کے عیسیٰ بنی شیبان کے لوگ اس کے مجاور تھے۔ قریش اور دوسرے قبائل کے لوگ اس کی زیارت کرتے اور اس پر نذرین چڑھاتے اور اس کے لیے قربانیاں کرتے تھے۔ کعبہ کی طرف اس کی طرف بھی ہجری کے جانور لے جاتے اور تمام بتوں سے بڑھ کر اس کی عزت کی جاتی تھی۔ ابن ہشام کی روایت ہے کہ ابو اخیخہ جب مرنے لگا تو ابو لہب اس کی عیادت کے لیے گیا۔ دیکھا کہ وہ رو رہا ہے۔ ابو لہب نے کہا کیوں روتے ہو ابو اخیخہ؟ کیا موت سے ڈرتے ہو، حالانکہ وہ سب ہی کراتی ہے۔ اس نے کہا خدا کی قسم میں موت سے ڈر کر نہیں روتا، بلکہ مجھے یہ غم کھاتے جا رہا ہے کہ میرے بعد عمرتی کی پوجا کیسے ہوگی؟ ابو لہب بولا، اُس کی پوجا نہ تمہاری زندگی میں تمہاری خاطر ہوتی تھی اور نہ تمہارے بعد اُسے چھوڑا جائے گا۔ ابو اخیخہ نے کہا اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرے بعد کوئی میری جگہ سنبھالنے والا ہے۔

### مناة

اس کا استھان مکہ اور مدینہ کے درمیان بحر احمر کے کنارے قدید کے مقام پر تھا اور خاص طور پر بنی خزاعہ اور اوس اور خزرج کے لوگ اس کے بہت معتقد تھے۔ اس کا حج اور طواف کیا جاتا اور اس پر نذر کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ زمانہ حج میں جب حج طواف بیت اللہ اور عرفات اور منی سے فارغ ہو جاتے تو وہیں سے مناة کی زیارت کے لیے بیک بیک کی سدا میں بلند کر دی جاتیں اور جو لوگ اس دوسرے حج کی نیت کر لیتے وہ صفا اور مرقہ کے درمیان سعی نہ کرتے تھے۔ ۳۵۵

## قوم نوح کے اصنام

قوم نوح کے معبودوں میں سے سورۃ نوح میں صرف اُن معبودوں کے نام لیے گئے ہیں جنہیں بعد میں اہل عرب نے بھی پوجنا شروع کر دیا تھا اور آغازا اسلام کے وقت عرب میں جگہ جگہ ان کے مندر بنے ہوئے تھے۔ بعید نہیں کہ طوفان میں جو لوگ بچ گئے تھے ان کی زبان سے بعد کی نسلوں نے قوم نوح کے قدیم معبودوں کا ذکر سنا ہو اور جب ان سرگوان کی اولاد میں جاہلیت پھیلی تو انہی معبودوں کے بت بنا کر انہوں نے پھر انہیں پوجنا شروع کر دیا ہو۔

داؤد

قبیلہ قضاعہ کی شاخ بنی کلب بن زبیرہ کا معبود تھا جس کا استھان انہوں نے قنوزہ الجندل میں بنا رکھا تھا۔ عرب کے قدیم کتبات میں اس کا نام قذم ائم دو با پور، کھا ہوا ائم ہے۔ کلیبی کا بیان ہے کہ اس کا

بہت ایک نہایت عظیم الجثہ مرد کی شکل کا بنا ہوا تھا۔ قریش کے لوگ بھی اس کو معبود مانتے تھے اور اس کا نام ان کے ہاں وڈ تھا۔ اسی کے نام پر تاریخ میں ایک شخص کا نام عبیدوڈ ملتا ہے۔

(۲) سواح

قبیلہ نذیل کی دیوی تھی اور اس کا بت عورت کی شکل کا بنایا گیا تھا۔ عبیدوڈ کے قریب رباط کے مقام پر اس کا مندر واقع تھا۔

(۳) میخوش

قبیلہ نذیل کی شاخ انعم اور قبیلہ نذیح کی بعض شاخوں کا معبود تھا۔ نذیح والوں نے یمن اور حجاز کے درمیان قریش کے مقام پر اس کا بت نصب کر رکھا تھا جس کی شکل شیر کی تھی۔ قریش کے لوگوں میں بھی بعض کا نام عبیدوڈ تھا۔

(۴) یحوق

یمن کے علاقہ حیران میں قبیلہ تہران کی شاخ خیوان کا معبود تھا اور اس کا بت گھوڑے کی شکل کا تھا۔

(۵) نسور

یمن کے علاقے میں قبیلہ نمیر کی شاخ آل ذوالنظار کا معبود تھا اور بلخج کے مقام پر اس کا بت نصب تھا جس کی شکل گدھ کی تھی۔ سبا کے قدیم کتبوں میں اس کا نام نسور لکھا ہوا ملتا ہے۔ اس کے مندر کو وہ لوگ بیت نسور، اور اس کے پجاریوں کو اہل نسور کہتے تھے۔ قدیم مندروں کے پورا آثار عرب اور اس کے متصل علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان میں سے بہت سے مندروں کے دروازوں پر گدھ کی تصویر بنی ہوئی ہوتی ہے۔

مشہور بت بعل

آنذ عتق بعلًا وندون احسن۔ وحضرت الیاس نے کہا، یا قوم بعل کو پکارتے ہو اور  
الحنا یقین۔ واللہفت۔ ۱۲۵۔ احسن الحانین کو پھوڑ دیتے تھے۔

بعل کے لغوی معنی آقا، سردار اور مالک کے ہیں۔ شومر کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا تھا اور متحدہ قحطان پر خود قرآن مجید میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ بقرہ آیت ۲۲۸، سورہ نساء آیت ۱۱، سورہ ہود آیت ۷۲، اور سورہ محمد آیت ۳۱ میں۔ لیکن قدیم زمانے کی سامی اقوام اس لفظ کو الایانہ اور اوند کے معنی میں استعمال کرتی تھیں اور انہوں نے ایک خاص دیوتا کو بعل کے نام سے موسوم کر رکھا تھا جس کو بت کے ساتھ گنجان کی فنیقی قوم Phoenicians کا سب سے بڑا دیوتا بعل تھا اور اس کی دیوی عسارات Ashtoreth ان کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ مختصراً کے درمیان اس امر



میں اختلاف ہے کہ آیا بعل سے نر اور سورج ہے یا مشتری، اور عتارات سے مراد چاند ہے یا زہرہ۔ بہر حال یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ بابل سے لے کر مصر تک پورے مشرق وسطیٰ میں بعل پرستی پھیلی ہوئی تھی، اور خصوصاً لبنان اور شام و فلسطین کی مشرک اقوام بڑی طرح اس میں مبتلا تھیں۔ بنی اسرائیل جب مصر سے نکلنے کے بعد فلسطین اور شرقی اردن میں آکر آباد ہوئے اور کوراث کے سخت انتہائی احکام کی خلاف ورزی کر کے انہوں نے ان مشرک قوموں کے ساتھ شادی بیاہ اور معاشرت کے تعلقات قائم کرنے شروع کر دیئے تو ان کے اندر بھی یہ مرض پھیلنے لگا۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ اول حضرت یوشع بن نون کی وفات کے بعد ہی بنی اسرائیل میں یہ اخلاقی و دینی زوال رونما ہونا شروع ہو گیا تھا۔

”اور بنی اسرائیل نے خدا کے آگے بدی کی اور تعلیم کی پرستش کرنے لگے۔۔۔ اور وہ خداوند کو چھوڑ کر بعل اور عتارات کی پرستش کرنے لگے۔“ (قضایہ، ۲: ۱۱-۱۳)

”سو بنی اسرائیل کنعانیوں اور عیبیوں اور آموریوں اور قبرزیوں اور عورتوں اور یوسویوں کے درمیان بس گئے اور ان کی بیٹیوں سے آپ نکاح کرنے اور اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو دینے اور ان کے دیوتاؤں کی پرستش کرنے لگے۔“ (قضایہ، ۲: ۵-۶)

اُس زمانہ میں بعل پرستی اسرائیلیوں میں اس قدر گھس چکی تھی کہ بائبل کے بیان کے مطابق ان کی ایک بستی میں علانیہ بعل کا مذبح بنا ہوا تھا جس پر قربانیاں کی جاتی تھیں۔ ایک خدا پرست اسرائیلی اس حالت کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے رات کے وقت چھپکے سے یہ مذبح توڑ دیا۔ دوسرے دن ایک مجمع کثیر اکٹھا ہو گیا اور وہ اس شخص کے قتل کا مطالبہ کرنے لگا جس نے شرک کے اس اوٹے کو توڑا تھا۔ اس صورت حال کو آخر کار حضرت سموئیل، طاوتہ، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام نے ختم کیا اور نہ صرف بنی اسرائیل کی اصلاح کی بلکہ اپنی مملکت میں بالعموم شرک و بت پرستی کو دبا دیا۔ لیکن حضرت سلیمان کی وفات کے بعد یہ فتنہ پھرا بھرا اور خاص طور پر شمالی فلسطین کی اسرائیلی ریاست بعل پرستی کے میلاب میں بگئی۔ ۲۵۴۔ بت پرستی کے ساتھ خدا کا برتر تصور۔

مشرکین عرب اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ زمین و آسمان کا خالق اللہ ہے۔ وہی دن نکالتا اور رات لاتا ہے اور اسی نے آفتاب و ماہتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ یہ کلام لات یا بعل یا عزیٰ یا کسی اور دیوتا کے ہیں۔ ۲۵۵۔

قرآن میں جگہ جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے بارے میں مشرکین عرب کا عقیدہ کیا تھا۔ مثال کے طور پر سورہ زخرف میں ہے: ”اگر تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا ہے تو یہ غرور کہیں گے کہ انہیں نے

رایت ۱۸۷۔ سورہ عنکبوت میں ہے: اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے اور چاند اور سورج کو کس نے منسخر کر رکھا ہے تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے ۔۔۔ اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمان پانی برمایا اور اس کے ذریعہ سے مژدہ پڑی نبوی زمین کو سلا اٹھایا تو یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ (آیات ۱۸۷ تا ۱۸۹)

سورہ مومنون میں ہے: ان سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ یہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ کی ۔۔۔ ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ یہ ضرور کہیں گے اللہ ۔۔۔ ان سے کہو، بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے؟ اور کون ہے جو پناہ دینا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ یہ ضرور جواب دیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ (آیات ۸۴ تا ۸۹)۔

سورہ یونس میں ہے: ان سے پوچھو، کون تم کو آمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ یہ سماعت اور بینائی کی نعمتیں جو تمہیں حاصل ہیں، کس کے اختیار میں ہیں؟ اور کون زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے؟ اور کون اس فظیح عالم کی تدبیر کر رہا ہے؟ یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ (آیت ۱۳۱)۔ اسی سورہ یونس میں ایک اور جگہ ہے: جب تم لوگ کشتیوں پر سوار ہو کر بادِ موزون پر فرماؤ اور شاداں سفر کو رہتے ہوئے ہو اور پھر کھلیک یا وِخالف کا زور ہوتا ہے اور بہر طرف سے موجوں کے تھپڑے لگتے ہیں اور مسافر سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے، اس وقت سب اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اس بلا سے نجات دے دی تو ہم نیکو گزار بندے بنیں گے مگر جب وہ ان کو بچا لیتا ہے تو پھر وہی لوگ حق سے منحرف ہو کر زمین میں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ (آیات ۲۲-۲۳)۔ یہی بات سورہ نبی اسرائیل میں یوں دہرائی گئی ہے: جب سمندر میں تم پر ٹھیسرت آتی ہے تو اس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے ہو وہ سب گم ہو جاتے ہیں، مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو۔ (آیت ۶۷)۔

اموال میں خدا کے ساتھ تمہارے ساتھ ساتھ

وہ اس بات کے نزدیک ہے کہ زمین اللہ کی ہے اور کھیتیاں قریب آگاتا ہے، ان جانوروں کا خالق بھی اللہ ہی ہے جن سے وہ اپنی زندگی میں خدمت لیتے ہیں لیکن ان کا لشکر یہ تھا کہ ان پر اللہ کا فضل ان دیویوں اور دیوتاؤں اور فرشتوں اور جنات اور آسمانی ستاروں اور بزرگانِ سلطنت کی اور راج کے طفیل و برکت سے ہے جو ان پر نظر کر رہے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو تیسے نکالتے تھے۔ ایک حصہ اللہ کے نام کا، اس لشکر میں کہ اس نے یہ کھیت اور جانور انہیں بخشے، اور دوسرا حصہ اپنے تعبید یا ناندان کے سرپرست معبودوں کی نذر دینا، تاکہ ان کی مہربانیاں ان کے شامل حال رہیں۔ (تفسیر)

## خدا پر نبوتوں کو ترجیح

لیکن اوہ خدا کے نام سے جو حصہ نکالتے تھے اس میں بھی طرح طرح کی جاہانزیاں کر کے کمی کرتے رہتے تھے اور ہر صورت سے اپنے خود ساختہ شرمکویں کا حصہ بڑھانے کی کوشش کرتے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جو دلچسپی انہیں اپنے ان شرمکویں سے ہے وہ خدا سے نہیں ہے۔ مثلاً جو غلہ یا چھل وغیرہ خدا کے نام پر نکالے جاتے ان میں سے اگر کچھ گر جاتا تو وہ شرمکویں کے حصہ میں شامل کر دیا جاتا تھا اور اگر شرمکویں کے حصے میں سے گرتا یا خدا کے حصے میں مل جاتا تو اسے انہی کے حصہ میں داپس کیا جاتا۔ کھیت کا ہر حصہ شرمکویں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا تھا اگر اس میں سے پانی اُس حصہ کی طرح پھوٹ بہتا جو خدا کی نذر کے لیے مختص ہوتا تھا تو اس کی ساری پیداوار شرمکویں کے حصہ میں داخل کر دی جاتی تھی۔ لیکن اگر اس کے برعکس صورت پیش آئی تو خدا کے حصہ میں کوئی اضافہ نہ کیا جاتا۔ اگر کسی نلنگہ سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا غلہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آ جاتی تو خدا کا حصہ کھالیتے تھے مگر شرمکویں کے حصہ کو ہاتھ لگانے ہوتے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلاناہل نہ ہو جائے۔ اگر کسی وجہ سے شرمکویں کے حصہ میں کچھ کمی آ جاتی تو وہ خدا کے حصہ سے پوری کی جاتی تھی لیکن خدا کے حصہ میں کمی ہوتی تو شرمکویں کے حصہ میں سے ایک حصہ بھی اس میں نہ ڈالا جاتا۔ اس طرز عمل پر کوئی نکتہ بینی کرتا تو جواب میں طرح طرح کی دلفریب توجیہیں کی جاتی تھیں۔ مثلاً کہتے تھے کہ خدا تو غنی ہے اس کے حصہ میں کچھ کم بھی ہو جائے تو اسے کیا پروا ہو سکتی ہے۔ وہ ہمارے شرمکب تو یہ بند سے ہیں۔ خدا کی طرح غنی نہیں ہیں اس لیے ذرا سی کمی بیشی پر بھی ان کے ہاں گرفت ہو جاتی ہے۔

ان تو جہات کی اصل بڑ کیا تھی اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ جہلاتے عرب اپنے مال میں سے جو حصہ خدا کے لیے نکالتے تھے وہ فقیروں، مسکینوں، مسافروں اور یتیموں وغیرہ کی مدد میں صرف کیا جاتا تھا۔ اور جو حصہ شرمکویں کی نذر و نیاز کے لیے نکالتے تھے وہ یا تو براہ راست مذہبی طبقوں کے پیٹ میں جاتا تھا یا آستانوں پر پڑھاؤ سے کی صورت میں پیش کیا جاتا اور اس طرح بالواسطہ مجاوروں اور پونا بیرون تک پہنچا جاتا تھا۔ اسی لیے ان کے خود غرض مذہبی پیشواؤں سے صدیوں کی مسلسل تعلیق سے ان جاہلوں کے دل میں یہ بات بٹھاتی تھی کہ خدا کے حصہ میں کمی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں مگر خدا کے پیاروں کے حصہ میں کمی نہ ہونی چاہیے بلکہ حتی الامکان کچھ بیشی ہی ہوتی رہے تو بہتر ہے۔

## شرمکین کی اصل گمراہی کیا تھی

اگرچہ شرمکین مگر اس بات سے انکار نہیں کرتے تھے کہ یہ ساری نعمتیں اللہ کی دی ہوئی ہیں اور ان نعمتوں پر اللہ کا احسان ماننے سے بھی انہیں انکار نہ تھا۔ لیکن جو غلطی وہ کرتے تھے وہ یہ تھی

کہ ان نعمتوں پر اللہ کا شکر تیار اور کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اُن بہت سی ہستیوں کا شکر تیار بھی زبان اور عمل سے ادا کرتے تھے جن کو انہوں نے بلا کسی ثبوت اور بلا کسی سند کے اس نعمت بخشی میں داخل اور حصہ دار ٹھہرا رکھا ہے۔

اسی چیز کو قرآن اللہ کے احسان کا انکار قرار دیتا ہے۔ قرآن میں یہ بات بطور ایک قاعدہ کلیہ کو پیش کرتی ہے کہ محسن کے احسان کا شکر تیار بغیر محسن کو ادا کرنا دراصل محسن کے احسان کا انکار کرنا ہے۔ اسی طرح قرآن یہ بات بھی اصول کے طور پر بیان کرتا ہے کہ محسن کے متعلق بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یہ گمان کر لینا کہ اس نے خود اپنے فضل و کرم سے یہ احسان نہیں کیا ہے بلکہ فلاں شخص کے طفیل، یا فلاں کی رعایت سے، یا فلاں کی سفارش سے، یا فلاں کی مداخلت سے کیا ہے۔ یہ بھی دراصل اس کے احسان کا انکار ہی ہے۔  
اپنے معبودوں کے متعلق اہل عرب کے تصورات

اہل عرب اگرچہ شرک میں مبتلا تھے اور سخت تعصب کی حد تک مبتلا تھے، مگر درحقیقت اس کی جڑیں اوپر کی سطح ہی تک محدود تھیں۔ کچھ گہری اتری ہوئی نہ تھیں، اور دنیا میں کسی بھی شرک کی جڑیں انسانی فطرت میں گہری اتری ہوتی نہیں جوتیں۔ اس کے برعکس خالص خدا پرستی کی غلطی ان کے ذہن کی گہرائیوں میں بچی جوتی موجود تھی جس کو ابھارنے کے لیے اوپر کی سطح کو پس زدن اور سے کھڑچ دینے کی ضرورت تھی۔

جاہلیت کی تاریخ کے متعدد واقعات ان دونوں باتوں کی شہادت دیتے ہیں۔ مثلاً اترہ کے حملے کے موقع پر قریش کا بچہ بچہ یہ جانتا تھا کہ اس بلا کو وہ تبت نہیں مال سکتے جو نائے کعبہ میں رکھے ہوتے ہیں بلکہ صرف اللہ تعالیٰ ہی مال سکتا ہے جس کا یہ گم ہے۔ آج تک وہ اشعار اور قصائد محفوظ ہیں جو اسباب الفیل کی تباہی پر ہم عصر شعرا نے کہے تھے۔ اُن کا لفظ لفظ گواہی دیتا ہے کہ وہ لوگ اس واقعہ کو محض اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شکر سمجھتے تھے اور اس امکا ادنیٰ سا گمان بھی نہ رکھتے تھے کہ اس میں اُن کے معبودوں کا کوئی دخل ہے اسی موقع پر شرک کا یہ بدترین کرشمہ بھی قریش اور تمام مشرکین عرب کے سامنے آیا تھا کہ اترہ بچے کی طرف جاتے ہوئے طاقت کے قریب پہنچا تو اہل طاقت نے اس اندیشے سے کہ یہ کہیں اُن کے معبودوں کی طرف سے مندر کو بھی نہ گرا دے اپنی خدمات کچھ کو منہدم کرنے کے لیے اُس کے آگے پیش کر دیں اور اپنے بترتے اس کے ساتھ کوڑیے تاکہ وہ پہاڑی راستوں سے اس کے لشکر کو خیریت مکہ تک پہنچا دیں۔ اس واقعہ کی تلخ یاد دہتوں تک قریش کو شافی رہی اور سالہا سال تک وہ اس شخص کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے جو طاقت کے بترتے کا سردار تھا۔ علاوہ بریں قریش اور دوسرے اہل عرب اپنے دین کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے، اپنے بہت سے مذہبی اور معاشرتی مراسم اور رسوم و مناسک حج کو دین ابراہیم ہی کے اذکار و قرار دیتے تھے،

اور یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم خالص خدا پرست تھے، بتوں کی پرستش انہوں نے کبھی نہیں کی۔ ان کے ہاں کی روایات میں یہ تفصیلات بھی محفوظ تھیں کہ نبی پرستی ان کے ہاں کب سے رائج ہوئی اور کون سا نبی کہاں سے اکون لایا؟

اپنے معبودوں کی ہمیشی کچھ عزت ایک عام عرب کے دل میں تھی اس کا اعجاز اس کی باسکتا کعبہ بھی اس کی دعاؤں اور ثناؤں کے خلاف کئی واقعہ ظہور میں آجانا تو بسا اوقات وہ معبود صاحب کی توہین بھی کر ڈالتا تھا اور اس کی نذر و نیاز سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ ایک عرب اپنے باپ کے قاتل سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ذوالفصل نامی نبی کے آستانے پر جا کر اس نے فال کھلائی۔ جواب نکلا یہ کام نہ کیا جائے۔ اس پر عرب طیش میں آگیا کہنے لگا:

لَوْ كُنْتُ يَا ذَا الْخَلْعِ الْمَوْثُورَا  
مِثْلِي وَكَانَ شَيْخُكَ الْمَقْبُورَا  
لَهَذَا نَشَأَ عَنْ قَتْلِ الْعِدَا نَا زُورَا

یعنی اے ذوالخلع! اگر میری جگہ تو ہوتا اور میرا باپ مارا گیا ہوتا تو ہرگز تو رہ جھوٹی بات نہ کہتا کہ ظالموں سے بدلہ نہ لیا جاتے۔

ایک اور عرب صاحب اپنے اونٹوں کا گلہ اپنے معبود دست نامی کے آستانے پر لے گئے تاکہ ان کے لیے برکت حاصل کریں۔ یہ ایک لباڑہ نگاہت تھا جس پر قرطبانیوں کا خن تھرا ہوا تھا۔ اونٹ اسے دیکھ کر بھڑک گئے اور ہر طرف بھاگ نکلے۔ عرب اپنے اونٹوں کو اس طرح منتشر ہوتے دیکھ کر غصے میں آگیا نبی پر پتھر مارتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ "خدا تیرا ستیا ماں کرے۔ میں آیا تھا برکت لینے کے لیے اور تو نے میرے رہے ہے اونٹ بھی بھگا دیتے۔"

منقہ وبت ایسے تھے جن کی اصلیت کے متعلق نہایت گندے قصے مشہور تھے مثلاً اساف اور ناکہ جن کے مجھے صفا اور مردہ پیر رکھے ہوئے تھے، ان کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ دونوں دراصل ایک عورت اور ایک مرد تھے جنہوں نے خانہ کعبہ میں زنا کا ارتکاب کیا تھا اور خدا نے ان کو پتھر بنا دیا۔ یہ تحقیقت جن معبودوں کی ہر ظاہر ہے کہ ان کی کوئی حقیقی عزت تو عابدوں کے دلوں میں نہیں ہو سکتی۔

لہذا ان مختلف پہلوؤں کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات باسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ خالص خدا پرستی کی ایک گہری قدر منزلت تو دلوں میں موجود تھی مگر ایک طرف یا بلانہ تداومت پرستی نے اس کو دبا رکھا تھا اور دوسری طرف قریش کے پروہت اس کے خلاف تعسبات بھڑکانے رہتے تھے کیونکہ بتوں کی عقیدت ختم ہونے سے ان کو اندیشہ تھا کہ

## صحابینِ سلف کے ثبوت

عرب کے معتقد قبائل، ہرمیہ، غسان، کلب، تغلب، قضاہ، کنانہ، خزیمہ، کعبہ، کندہ وغیرہ میں کثرت سے عیسائی اور یہودی پائے جاتے تھے۔ اور یہ دونوں مذاہب بڑی طرح انبیاء، اولیاء اور شہداء کی پرستش سے آلودہ تھے۔ پھر مشرکین عرب کے اکثر نہیں تو بہت سے معبود وہ گزرے ہوئے انسان ہی تھے جنہیں اجداد کی نسلوں نے خدا بنا لیا تھا۔ بخاری میں ابن عباس کی روایت ہے کہ وہ، شواہ، یغوث، یحییٰ، نسر یہ سب صحابین کے نام ہیں جنہیں بعد کے لوگ بت بنا بیٹھے۔ حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ اساتذہ و ثالمہ دونوں انسان تھے۔ اسی طرح کی روایات لات اور مناتہ اور عزیٰ کے بارے میں بھی موجود ہیں اور مشرکین کا یہ عقیدہ بھی روایات میں آیا ہے کہ لات اور عزیٰ اللہ کے ایسے پیارے تھے کہ اللہ میاں جاڑا لات کے ہاں اور عزیٰ عزیٰ کے ہاں بسر کرتے تھے۔ (سبحانہ و تعالیٰ عما یصفون) ۱۶۵

## اصحابِ قبور کی پرستش

سورہ نمل آیت ۲۱ میں خاص طور پر جن بناوٹی معبودوں کی تردید کی گئی ہے وہ فرشتے، یاجن یا شیاطین، یا کھڑی پتھر کی مورتیاں نہیں ہیں، بلکہ اصحابِ قبور ہیں۔ اس لیے کہ فرشتے اور شیاطین تو زندہ ہیں ان پر اَمْوَآتٌ عَئِیْدٌ اَکْبَامٌ کے الفاظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا اور کھڑی پتھر کی مورتیوں کے معاملہ میں بعثت بعد الموت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اس لیے مَا لَیْسَ لَکُمْ فِیْہِمْ اَنْیَاۡنٌ فِیْبَعْثُوۡنَہُمْ کے الفاظ انہیں بھی خارج از بحث کر دیتے ہیں۔ اب لامحالہ اس آیت میں الَّذِیۡنَ یُبٰدَعُوۡنَ مِنْ دِیۡنِ اللّٰہِ سے مراد وہ انبیاء، اولیاء، شہداء، صحابین اور دوسرے غیر معمولی انسان ہی ہیں جن کو غالی معتقدین و آتما، مشکل کشا، فریاد رس، غریب نواز، گنج بخش، اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے کر اپنی حاجت روائی کے لیے پکارنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ عرب میں اس نوعیت کے معبود نہیں پائے جاتے تھے تو ہم عرض کریں گے کہ یہ باہلیت عرب کی تاریخ سے اس کی ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ ۱۶۶

۴۔ عرب میں ان کو جو مرکبیت حاصل ہے وہ ختم ہو جائے گی اور ان کی آمدنی میں بھی فرق آجائے گا۔ ان سہاروں پر جو مذہبِ شرک قائم تھا وہ توحید کی دعوت کے مقابلے میں کسی وقار کے ساتھ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے قرآن نے خود مشرکین کو خطاب کر کے بتے تلقت کہا کہ تمہارے معاشرے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروں کو جن وجوہ سے بڑی حاصل ہے ان میں سے ایک اہم ترین وجہ ان کا شرک سے پاک ہونا اور خالص خدا پرستی بر قائم ہو جانا ہے۔ اس پہلو سے مسلمانوں کی بزرگی کو زبان سے ماننے کے لیے پہلے مشرکین یا زرنہوں کو بھولوں میں اس اوزن محسوس کرتے تھے ۱۶۷

## فرشتوں کے زمانہ مجسموں کی پرستش

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں قریش، بنی سلمہ، خزاعہ، بنی ملیح اور بعض دوسرے قبائل کا عقیدہ یہ تھا کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ فرشتوں کو انہوں نے دیویاں قرار دے رکھا تھا۔ ان کے ثبت عورتوں کی شکل کے بنا رکھے تھے۔ انہیں زمانہ کپڑے اور زیور پہناتے اور کہتے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں ان کی عبادت کرتے، اور انہی سے نعمتیں اور مزاویں مانگتے۔

### لقد یرکابہا نہ

ان جہالتوں پر ٹوکا جاتا تو اللہ یرکابہا نہ پیش کرتے اور کہتے کہ اگر اللہ ہمارے اس کام کو پسند نہ کرتا تو ہم کیسا انہوں کی پرستش کر سکتے تھے۔ حالانکہ اللہ کی پسند اور ناپسند معلوم ہونے کا ذمہ ان کی نما میں ہیں نہ کہ وہ کام جو دنیا میں اس کی مشیت کے تحت ہو رہے ہیں۔ مشیت کے تحت تو ایک نیت پرستی ہی نہیں، چوری، زنا، ڈاکہ قتل سب ہی کچھ ہو سکتے ہیں۔ اس دلیل سے برائے برائی کو بائز و برحق قرار دیا جا۔ گے گا جو دنیا میں ہو رہی ہے۔ مونیہ کے کسی کام کا مشیت کے تحت ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ اس کام کو اللہ کی رضا بھی حاصل ہے۔

### باپ دادا کی اندھی تقلید

پوچھا جاتا کہ اپنے اس شرک کے لیے تمہارے پاس اس غلط دلیل کے سوا کوئی اور سند بھی ہے تو جواب دیتے کہ باپ دادا سے یہ کام یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ گویا ان کے نزدیک کسی مذہب کے حق ہونے کے لیے یہ کافی دلیل تھی۔ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام جن کی اولاد ہونے پر ہی ان کے سارے فخر و امتیاز کا مدار تھا، باپ دادا کے مذہب کو لات مار کر گھر سے نکل گئے تھے اور انہوں نے اسلام کی ایسی اندھی تقلید کو رد کر دیا تھا جس کا سنا کوئی دلیل مغفول نہ دیتی ہو پھر اگر ان لوگوں کو اسلام کی تقلید ہی کرنی تھی تو اس کے لیے بھی اپنے بزرگ ترین اسلاف ابراہیم و اسمعیل علیہما السلام کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے جاہل ترین اسلاف کا انتخاب کیا!

### عیسائیوں کی گمراہی سے ثبت پرست اہل عرب کا استدلال

ان سے کہا جاتا کہ کیا کبھی کسی نبی نے اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی کتاب نے بھی یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے ساتھ دوسرے بھی عبادت کے مستحق ہیں، تو وہ عیسائیوں کے اس فعل کو دلیل میں پیش کرتے کہ انہوں نے یسعی ابن مریم کو ابن اللہ مانا اور ان کی پرستش کی۔ حالانکہ سوال یہ نہ تھا کہ کسی نبی کی امت نے شرک کیا ہے

۔۔۔ قرآن مجید میں متعدد دعوات پر ان کے اس جاہلانہ عقیدے کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو: (النساء

آیت ۱۱۰-۱۱۱، النمل آیات ۵۵، ۵۸، نبی اسرائیل آیت ۵۰، الاحزاب آیات ۶، ۷، انعام آیات ۲۱، ۲۲، ۲۴۔

یا نہیں بلکہ یہ تھا کہ کیا خود کسی نبی نے بھی شرک کی تعلیم دی ہے؟ عیسیٰ ابن مریم نے کب کہا تھا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو؟ ان کی اپنی تعلیم تو وہی تھی جو دنیا کے ہر نبی نے دی ہے کہ میرا رب بھی اللہ ہے اور تمہارا رب بھی، اسی کی تم عبادت کرو۔

### مشرکین کے خداؤں کی اقسام

دنیا بھر کے مشرکین خدا کے سوا جن ہستیوں سے دعائیں مانگتے رہے ہیں اور اہل عرب بھی جن سے دعائیں مانگتے تھے، وہ تین اقسام پر منقسم ہیں۔ ایک بے رُوح اور بے عقل مخلوقات۔ دوسرے وہ بزرگ انسان جو گزر چکے ہیں تیسرے وہ گمراہ انسان جو خود بگڑے ہوئے تھے اور دوسروں کو لگا کر دنیا سے نخصت ہوئے۔ پہلی قسم کے معبودوں کا تو اپنے عابدوں کی دعاؤں سے بے خبر رہنا ظاہر ہی ہے۔ دوسری قسم کے معبود جو اللہ کے مقرب انسان تھے، تو ان کے بے خبر رہنے کے دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے ہاں اس عالم میں ہیں جہاں انسانی آوازیں براہ راست ان تک نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ اور اس کے فرشتے بھی ان تک اطلاع نہیں پہنچاتے کہ جن لوگوں کو آپ ساری عمر اللہ سے دعا مانگنا سکھاتے رہے تھے وہ اب الٹی آپسے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اس لیے کہ اس اطلاع سے بڑھ کر ان کو حدود پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی اور اللہ اپنے ان نیک بندوں کی ارواح کو اذیت دینا ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اس کے بعد تیسری قسم کے معبودوں کے معاملہ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے بے خبر رہنے کے بھی دو وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ملذموں کی حیثیت سے اللہ کے ہاں عوالات میں بند ہیں جہاں دنیا کی کوئی آواز نہیں پہنچتی۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے بھی انہیں برا اطلاع نہیں پہنچاتے کہ تمہارا مشن دنیا میں خوب کامیاب ہو رہا ہے اور لوگ تمہارے پیچھے تمہیں محو بنائے بیٹھے ہیں، اس لیے کہ یہ خبریں ان کے لیے مسترت کی موجب ہوں گی۔ اور خدا ان ظالموں کو ہرگز سزا خوش نہیں کرنا چاہتا۔

وہ تمام فرشتے جن کو دنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پوجا گیا، اور وہ تمام جن، ارواح، اسلاف، اجداد، اجداد، اولیاء، شہداء وغیرہ جن کو خدائی صفات میں شریک ٹھہرا کر وہ حقوق انہیں ادا کیے گئے جو

لہ مورانا نے اسی بات کو دوسری جگہ ایک اور انداز سے لکھا ہے کہ مشرکانہ عبادت میں تین چیزیں الگ الگ پائی جاتی ہیں۔ ایک تو وہ اصنام، تصاویر یا علامات جو مرجع پریشانی دہندے ہیں اور جن کی نمائندگی اصنام اور تصاویر وغیرہ کی شکل میں کی جاتی ہے۔ دوسرے وہ اعتقادات جو ان مشرکانہ عبادت و اعمال کی تہ میں کاربند ہوتے ہیں۔



در اصل خدا کے حقوق تھے، وہاں اپنے پرستاروں سے صاف کہہ دیں گے کہ ہمیں تو خیر تک نہ تھی کہ تم ہماری عبادت  
بجالا رہے ہو۔ تمہاری کوئی دعا، کوئی التجا، کوئی پکار اور فریاد، کوئی نذر و نیاز، کوئی پتھر چاوسے کی پیر، کوئی تعویذ  
مدح اور چارے نام کی جاپ، اور کوئی سجدہ ریزی و آستانہ بوسی و درگاہ گردی ہم تک نہیں پہنچی۔

### عرب میں قحبہ گیری کی صورتیں

عرب میں قحبہ گیری کی دو صورتیں رائج تھیں۔ ایک خانگی کا پیشہ۔ دوسرے باقاعدہ چکلہ "خانگی" کا پیشہ کرنے  
والی زیادہ تر آزاد شدہ لونڈیاں ہوتی تھیں جن کا کوئی سرپرست نہ ہوتا، یا ایسی آزاد عورتیں ہوتی تھیں جن کی پشت  
پناہی کرنے والا کوئی خاندان یا قبیلہ نہ ہوتا، یہ کسی گھر میں بیٹھ جاتیں اور کئی کئی مردوں سے بیک وقت ان کا معاہدہ  
ہو جاتا کہ وہ ان کو مدد خرچ دیں گے اور اپنی حاجت پوری کرتے رہیں گے جب بچہ پیدا ہوتا تو عورت ان مردوں میں  
سے جس کے متعلق کہہ دیتی کہ یہ بچہ اس کا ہے اسی کا بچہ وہ تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ یہ گویا معاشرے میں ایک مسلم ادارہ تھا  
جسے اہل جاہلیت ایک قسم کا نکاح سمجھتے تھے۔ (ابوداؤد)۔ دوسری صورت یعنی کھلی قحبہ گیری تمام تر لونڈیوں  
کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔ اس کے دو طریقے تھے۔ ایک یہ کہ لوگ اپنی جوان لونڈیوں پر ایک بھاری رقم عائد کرتے  
تھے کہ ہر مہینے اتنا کم کر رہیں ویا کرو، اور وہ بے چاریاں بھکاری کر آ کر کہ یہ مطالبہ پورا کرتی تھیں۔ اس کے سوا  
کہ کسی دوسرے ذریعہ سے وہ اتنا کماسکتی تھیں، نہ مالک ہی یہ سمجھتے تھے کہ وہ کسی پاکیزہ کسب کے ذریعہ سے  
یہ رقم لایا کرتی ہیں، اور نہ جوان لونڈیوں پر عام مزدوری کی شرح سے کئی کئی گنی رقم عائد کرنے کی کوئی دوسری  
مقبول وجہ ہی ہو سکتی تھی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ لوگ اپنی جوان جوان اور خوبصورت لونڈیوں کو کوشموں پر بٹھا  
دیتے تھے اور ان کے دروازوں پر پھینڈے لگا دیتے تھے جنہیں دیکھ کر ڈور ہی سے معلوم ہو جاتا تھا کہ  
"ما جہنمہ" آدمی کہاں اپنی حاجت رفع کر سکتا ہے۔ یہ عورتیں قلیقیات کہلاتی تھیں اور ان کے گھر "مواخیر"  
کے نام سے مشہور تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں نے اس طرح کے چکلے کھول رکھے تھے۔ خود عبداللہ بن ابی زبیر  
الانصاری، وہی صاحب جنہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح آوری سے پہلے اہل مدینہ اپنا بادشاہ بنانا ملے کر  
چلے گئے، اور وہی صاحب جو حضرت عائشہؓ پر نہمت لگانے میں سب سے پیش پیش تھے، مدینے میں ان کا ایک  
باقاعدہ چکلہ موجود تھا جس میں چھ خوبصورت لونڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے ذریعہ سے وہ صرف دولت ہی  
نہیں کاتے تھے بلکہ عرب کے مختلف حصوں سے آنے والے معزز مہانوں کی تواضع بھی انہی سے فرمایا  
کرتے تھے اور ان کی ناجائز اولاد سے اپنے عزم و خشم کی فوج بھی بڑھاتے تھے۔

### بٹوں کے استھانوں پر فال گیری

نشر کیں مگر نے فال گیری (جس میں کسی دیوبی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا تھا یا غیب کی

نمبر و یاقت کی حیاتی تھی یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا تھا، کی غرض سے کعبہ کے اندر ٹیبل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استخوان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو، یا کھوئی ہوئی چیز کا پتہ پوچھنا ہو، یا خون کے معذمہ کا فیصلہ مطلوب ہو۔ غرض کوئی کام بھی ہو، اُس کے لیے ٹیبل کے پانسہ دار (صائب القدر) کے پاس پہنچ جاتے، اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ٹیبل سے ڈنسا مانتے کہ ہمارے اس معاملے کا فیصلہ کر دے پھر پانسہ دار اُن تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا اور جو تیر بھی حال میں نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ٹیبل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔ ۲۷

### نذر نیا تر کے طریقے

اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ بعض جانوروں کے متعلق یا بعض کھیتوں کی پیداوار کے متعلق منت منانے سے بچتے تھے کہ یہ فلاں انسانے یا فلاں حضرت کی نیا تر کے لیے مخصوص ہیں۔ اُس نیا تر کو ہر ایک نہ کھا سکتا تھا، بلکہ اس کے لیے ان کے ہاں ایک مفصل ضابطہ تھا جس کی رُو سے مختلف نیا تر کو مختلف قسم کے مخصوص لوگ ہی کھا سکتے تھے۔ ۲۸

اہل عرب کے ہاں بعض مخصوص متوں اور نذرانوں کے بانورا ایسے ہوتے تھے جن پر خدا کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا ممنوع تھا، کیونکہ حج کے لیے کَبِيْكَ اللّٰهُمَّ كَبِيْكَ کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت یا اُن پر سوار ہونے کی حالت میں یا اُن کو ذبح کرتے ہوئے یا ان کو کھانے کے وقت استہام کیا جاتا تھا کہ خدا کا نام زبان پر نہ آئے۔ ۲۹

اہل عرب کے ہاں نذروں اور سنتوں کے جانوروں کے متعلق جو خود ساختہ شریعت بنی ہوئی تھی اس کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو پتھر پیدا ہو اس کا گوشت صرف مرد کھا سکتے ہیں، عورتوں کے لیے ان کا کھانا جائز نہیں۔ لیکن اگر وہ بچہ مرده ہو یا مردہ ہو تو اس کا گوشت کھانے میں مرد و عورت سب شریک ہو سکتے ہیں۔ ۳۰

### جانوروں کو پین کر کے چھوڑنا

زمانہ جاہلیت میں اہل عرب مختلف طریقوں سے جانوروں کو پین کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان طریقوں سے پھوڑے ہوئے جانوروں کے انگ انک نام دیکھتے تھے۔

بجھو کا۔ اُس اونٹنی کو کہتے تھے جو پانچ دفعہ پینے بن چکی ہو اور آخری بار اس کے ہاں نہر تھپ ہو جو اُس کا کان چیر کر اسے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا پھر نہ کوئی اس پر سوار ہوتا، نہ اُس کا دودھ پیا جاتا، نہ اسے ذبح کیا جاتا، نہ اُس کا اون آرا جاتا۔ اُسے تھی تھا کہ ہر کیفیت اور جس چرما کا وہیں پابستے چوستے اور میں گھاٹ سے چاستے

پانی پیے۔

مثلاً، اُس اونٹ یا اونٹنی کو کہتے تھے جسے کسی مُنت کے پورا ہونے یا کسی بیماری سے شفا پانے یا کسی خطرے سے بچ جانے پر بطور شکرانہ پُن کروا گیا ہے۔ نیز جس اونٹنی نے دس مرتبہ نیچے دیتے ہوں اور ہر بار مادہ ہی جنی ہو اُسے بھی آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وَصِيدٌ، اگر بکری کا پہلا بچہ نہ ہوتا تو وہ خداؤں کے نام پر ذبح کر دیا جاتا۔ اور اگر وہ پہلی بار مادہ بنتی تو اسے اپنے لیے رکھ لیا جاتا تھا۔ لیکن اگر نرا اور مادہ ایک ساتھ پیدا ہوتے تو نہ ذبح کرنے کے بجائے کونہی خداؤں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس کا نام وصيد تھا۔

حام، اگر کسی اونٹ کا پورا سواری کے قابل ہو جاتا تو اُس کو بڑھے اونٹ کو آزاد چھوڑ دیا جاتا، نیز اگر کسی اونٹ کے لُطف سے دس نیچے پیدا ہو جاتے تو اسے بھی آزادی مل جاتی تھی۔  
زمانہ جاہلیت میں عربوں کا حج

مخدا ان تو ہم پرستانہ رسموں کے جو عرب میں رائج تھیں، ایک یہ بھی تھی کہ جب حج کے لیے احرام باندھ لیتے تو اپنے گھروں میں دروازے سے داخل نہ ہونے تھے بلکہ بیچے سے دیوار کو دکر یا دیوار میں گھڑکی سی بنا کر داخل ہوتے تھے، نیز سفر سے واپس آکر بھی گھروں میں بیچے سے داخل ہوا کرتے تھے۔ ۳۴۷

یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصور تھا کہ سفر حج کے دوران میں کسب معاش کے لیے کام کرنے کو وہ بُرا سمجھتے تھے۔ کیونکہ اُن کے نزدیک کسب معاش ایک دنیا دارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ ۳۴۸

اہل عرب حج سے فارغ ہو کر جیسے کرتے تھے جن میں ہر قبیلے کے لوگ اپنے باپ دادا کے کارنامے فخر کے ساتھ بیان کرتے اور اپنی بڑائی کی ڈینگیں مارتے تھے۔ ۳۴۹  
مظاہر قدرت سے شگون لینا

چاند کا گھٹنا بڑھنا ایک ایسا منظر ہے جس نے ہر زمانے میں انسان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچا ہے اور اس کے متعلق طرح طرح کے اودام و تخیلات اور رسوم دنیا کی قوموں میں رائج رہے ہیں اور اب تک رائج ہیں۔ اہل عرب میں بھی اس قسم کے اودام موجود تھے۔ چاند سے اچھے یا بُرے شگون لینا، بعض تاریخوں کو سعد اور بعض کو نحس سمجھنا، کسی تاریخ کو سفر کے لیے اور کسی کو ابتداء کے لیے اور کسی کو شادی بیاہ کے لیے منحوس یا مسخود خیال کرنا، اور یہ سمجھنا کہ چاند کے طلوع و غروب اور اس کی کمی بیشی اور اس کی حرکت اور اس کے گہن کا کوئی اثر انسانی قسمتوں پر پڑتا ہے، یہ سب باتیں دوسری جاہل قوموں کی طرح اہل عرب میں بھی پائی جاتی تھیں اور اس

سلسلے میں مختلف توہم پرستانہ رسمیں اُن میں رائج تھیں۔ ۳۸۱  
جنات کے بارے میں توہم پرستی

ابن عباس کہتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں جب عرب کسی سندان وادی میں رات گزارنے تھے تو پکار کر کہتے: ہم اس وادی کے مالک (یعنی جن) کی پناہ مانگتے ہیں۔ عہد جاہلیت کی دوسری روایات میں بھی بکثرت اس بات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً اگر کسی جگہ پانی اور چارہ ختم ہو جاتا تو خانہ بدوش بدو اپنا ایک آدمی کوئی دوسری جگہ تلاش کرنے کے لیے بھیجتے جہاں پانی اور چارہ مل سکتا ہو، پھر اُس کی نشان دہی پر جب یہ لوگ نئی جگہ پہنچتے تو وہاں اترنے سے پہلے پکار پکار کر کہتے: کہ ہم اس وادی کے رب کی پناہ مانگتے ہیں تاکہ یہاں ہم ہر آفت سے محفوظ رہیں۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر غیر آباد جگہ کسی نہ کسی جن کے قبضے میں ہے اور اس کی پناہ مانگنے بغیر وہاں کوئی ٹھہر جاتے تو وہ جن یا تو خود ستانا ہے یا دوسرے جنوں کو ستانے دیتا ہے۔ ۳۸۲

کثرت ازدواج

جاہلیت میں نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک ایک شخص دس دس بیویاں کر لیتا تھا۔ اور جب اس کثرت ازدواج سے مصارت بڑھ جاتے تھے تو مجبور ہو کر اپنے نسیم بھتیجیوں، بھانجیوں اور دوسرے بے بس غزنیوں کے حقوق پر دست درازی کرتا تھا۔ ۳۸۳

سوتیلی ماؤں تک سے نکاح کر لیتے تھے۔ ۳۸۴

حائضہ سے سلوک

اہل مدینہ چونکہ یہودیوں سے بہت متاثر تھے اس لیے ان کے ہاں یہودیوں کی طرح ایامِ ہجر میں عورت کو بائبل پھینکھا جاتا تھا۔ نہ اس کا پکا یا ٹھوکانا کھاتے نہ اس کے ہاتھ کا پانی پیتے، نہ اس کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھتے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھو جانے کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔ ان چند دنوں میں عورت خود اپنے گھر میں اچھوت بن کر رہ جاتی تھی۔ ۳۸۵

طلاق در طلاق کا رواج

ایک بہت بڑی معاشرتی خرابی عرب جاہلیت میں یہ رائج تھی کہ ایک شخص اپنی بیوی کو بے حد و حساب طلاق دینے کا مجاز تھا۔ جس عورت سے اس کا شوہر بگڑ جاتا اس کو وہ بار بار طلاق دے کر رجوع کرتا رہتا تھا۔ تاکہ نہ تو وہ غریب اس کے ساتھ ہی بس سکے اور نہ اس سے آزاد ہو کر کسی اور ہی سے نکاح کر سکے۔ ۳۸۶

تینامی پر زیادتیاں

زمانہ جاہلیت میں جو تینم بچیاں لوگوں کی سرپرستی میں جوتی تھیں ان کے مال اور ان کے حصہ و جمال کی وجہ

سے یا اس خیال سے کہ ان کا کوئی سردھرا تو ہے نہیں جس طرح ہم چاہیں گے دبا کر رکھیں گے وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان پر ظلم کیا کرتے۔ ۳۸۷

حضرت عائشہؓ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوٹی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور ہرگز نفعہ اور ایسے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر وہ بد صورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے تھے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح ہونے دیتے تھے تاکہ اس کا کوئی ایسا سردھرا پیدا نہ ہو جائے جو کل اُس کے حق کا مطالبہ کرتے والا ہو۔ ۳۸۸

یتیمی کے ساتھ عرب میں کیا سلوک ہوتا تھا؟

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب واقعہ قاضی ابوالحسن الماوردی نے اپنی کتاب اعلام النبوة میں لکھا ہے۔ ابو جہل ایک یتیم بچے کا وصی تھا۔ وہ بچہ ایک روز اس حالت میں اُس کے پاس آیا کہ اس کے بدن پر کپڑے تک نہ تھے اور اس نے التجا کی کہ اس کے باپ کے چھوڑے ہوئے مال میں سے وہ اسے کچھ دے دے۔ مگر اس ظالم نے اس کی طرف تو یہ تک نہ کی اور وہ کھڑے کھڑے آخر کار مایوس ہو کر پٹ گیا۔ قریش کے سرداروں نے ازراہ شہادت اس سے کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر شکایت کر، وہ ابو جہل سے سفارش کر کے تجھے تیرا مال دلوا دیں گے۔ بچہ بے چارہ انا واقف تھا کہ ابو جہل کا حضورؐ سے کیا تعلق ہے اور یہ بد بخت اسے کس غرض کے لیے یہ مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ سیدھا حضورؐ کے پاس پہنچا اور اپنا حال آپ سے بیان کیا۔ آپ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر اپنے بدترین دشمن ابو جہل کے ہاں تشریف لے گئے۔ آپ کو دیکھ کر اس نے آپ کا استقبال کیا اور جب آپ نے فرمایا کہ اس بچے کا حق اسے دے دو تو وہ فوراً مان گیا اور اس کا مال لاکر اسے دے دیا۔ قریش کے سردار تاکہ میں گئے ہوتے تھے کہ دیکھیں، ان دونوں کے درمیان کیا معاملہ پیش آتا ہے۔ وہ کسی فرسے دار جھڑپ کی امید کر رہے تھے مگر جب انہوں نے یہ معاملہ دیکھا تو حیران ہو کر ابو جہل کے پاس آئے اور اسے طعنہ دیا کہ تم بھی اپنا دین چھوڑ گئے۔ اس نے کہا خدا کی قسم، میں نے اپنا دین نہیں چھوڑا، مگر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دانتیں باتیں ایک ایک حربہ ہے جو میرے اندر ٹھس جائے گا اگر میں نے ذرا بھی ان کی مرضی کے خلاف حرکت کی۔ ۳۸۹

لہذا اس واقعہ سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عرب کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مغزز قبیلے تک کے

## قتلِ اولاد کی صورتیں

قتلِ اولاد کی تین صورتیں اہل عرب میں رائج تھیں:

۱۔ لڑکیوں کا قتل، اس خیال سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے یا قبائلی لڑائیوں میں وہ دشمن کے ہاتھ نہ پڑیں

یا کسی دوسرے سبب سے وہ ان کے لیے سببِ عار نہ بنیں۔

۲۔ بچوں کا قتل، اس خیال سے کہ ان کی پرورش کا بار نہ اٹھایا جاسکے گا اور ذرائع معاش کی کمی کے سبب

سے وہ ناقابلِ برداشت ہو جھین جائیں گے۔

۳۔ بچوں کو اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے بھینٹ چڑھانا۔<sup>۳۹۱</sup>

## عورتوں اور بچوں کی میراث سے محرومی

عرب میں عورتوں اور بچوں کو میراث سے محروم رکھا جاتا تھا اور لوگوں کا نظریہ اس باب میں یہ تھا کہ

میراث کا حق صرف ان مردوں کو پہنچتا ہے جو لڑنے اور کھینے کی مخالفت کرنے کے قابل ہوں۔ اس کے علاوہ

مرنے والے کے وارثوں میں جو زیادہ طاقت ور اور بااثر ہوتا تھا وہ بلا تامل ساری میراث سمیٹ لیتا تھا

اور ان سب لوگوں کا حصہ مار کھاتا تھا جو اپنا حصہ حاصل کرنے کا بل بوتانہ رکھتے ہوں۔ حق اور فرض کی کوئی

اہمیت ان کی نگاہ میں نہ تھی کہ ایمانداری کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر حق دار کو اس کا حق دیں خواہ وہ اسے حاصل

کرنے کی طاقت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔<sup>۳۹۲</sup>

## وراثت کا ایک رواج

اہل عرب میں قاعدہ تھا کہ جن لوگوں کے درمیان دوستی اور بھائی چارہ کے عہد و پیمان ہو جاتے تھے وہ ایک

دوسرے کی میراث کے خداریں جانتے تھے اسی طرح جسے بیٹا بنایا جاتا وہ بھی منہ بولے باپ کا وارث قرار پاتا تھا۔<sup>۳۹۳</sup>

## لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا

عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا یہ بے رحمانہ طریقہ قدیم زمانے میں مختلف وجوہ سے رائج ہو گیا تھا ایک

معاشی خستہ حالی جس کی وجہ سے لوگ چاہتے تھے کہ کھانے والے کم ہوں اور اولاد کو پلٹنے پوسنے کا بار ان پر نہ پڑے

۴۔ بڑے بڑے سرداروں کا تہیوں اور دوسرے بے یار و مددگار لوگوں کے ساتھ کیا سلوک تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس بلند اخلاق کے مالک تھے اور آپ کے اس اخلاق کا آپ کے بدترین دشمنوں تک پر کیا

رحم تھا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ہم اس سے پہلے تعظیم القرآن جلد سوم جہاں پر نقل کر چکے ہیں جو حضور کے اس ذہنی

اخلاقی رعب پر دلالت کرتا ہے جس کی وجہ سے کفار قریش آپ کو جاؤ گے کہتے تھے۔<sup>۳۹۴</sup>

بیٹوں کو تو اس امید پر پال لیا جاتا تھا کہ بعد میں وہ حصولِ معیشت میں باخود شایع گئے، مگر بیٹیوں کو اس لیے بلا کر دیا جاتا تھا کہ انہیں جوان ہونے تک پالنا پڑے گا اور پھر انہیں بیاہ دینا ہوگا۔ دوسرے عام بدامنی جس کی وجہ سے بیٹوں کو اس لیے پالا جاتا تھا کہ جس کے جتنے زیادہ بیٹے ہوں گے اس کے اتنے ہی حامی و مددکار ہوں گے، مگر بیٹیوں کو اس لیے بلا کر دیا جاتا تھا کہ قبائلی لڑائیوں میں اٹلی ان کی حفاظت کرنی پڑتی تھی اور دفاع میں وہ کسی کام نہ آسکتی تھیں۔ تیسرے عام بدامنی کا ایک خاصہ یہ بھی تھا کہ دشمن قبیلے جب ایک دوسرے پر اچانک چھاپے مارتے تھے تو جو لڑکیاں بھی ان کے ہاتھ لگتی تھیں انہیں لے کر وہ یا تو لوٹدیاں بنا کر رکھتے تھے یا کہیں بیچ ڈالتے تھے۔ ان وجوہ سے عرب میں بیٹوں پر توجہ دینا چلی تو زچگی کے وقت ہی عورت کے کسے ایک گڑھا کھود رکھا جاتا تھا تاکہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسی وقت اسے گڑھے میں پھینک کر مٹی ڈال دی جاسے، اور کبھی اگر ماں اس پر راضی نہ ہوتی یا اس کے خاندان واسے اس میں مانع ہوتے تو باپ باولنا خواستہ اسے کچھ مدت تک پالتا اور پھر کسی وقت صحرا میں لے جا کر زندہ دفن کر دیتا۔ اس معاملہ میں جو شقاوت بتی جاتی تھی اس کا قصہ ایک شخص نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک مرتبہ بیان کیا۔ سنن دارمی کے پہلے جی باب میں یہ حدیث منقول ہے کہ ایک شخص نے حضور سے اپنے عہدِ جاہلیت کا یہ واقعہ بیان کیا کہ میری ایک بیٹی تھی جو مجھ سے بہت مانوس تھی۔ جب میں اس کو نکارتا تو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کو بلایا اور اپنے ساتھ لے کر چل پڑا۔ راستہ میں ایک کنواں آیا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنوئیں میں دھکا دے دیا۔ آخری آواز جو اس کی میرے کانوں میں آئی وہ تھی ہائے آہا، ہائے آہا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو روئیے اور آپ کے آنسو بہنے لگے۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا اے شخص تو نے حضور کو غلگین کر دیا۔ حضور نے فرمایا اسے مت روکو، جس چیز کا اسے سخت احساس ہے، اس کے بارے میں اسے سوال کرنے دو۔ پھر آپ نے اس سے فرمایا کہ اپنا قصہ پھر بیان کرو۔ اس نے دوبارہ اسے بیان کیا اور آپ سن کر اس قدر روئے کہ آپ کی ڈارمی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جاہلیت میں جو کچھ ہو گیا اسے اللہ نے معاف کر دیا۔ اب نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرو۔

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اہل عرب اس اتہائی غیر انسانی فعل کی قباحت کا سرے سے کوئی احساس ہی نہ رکھتے تھے۔ ظاہرات ہے کہ کوئی معاشرہ خواہ کتنا ہی بڑھ چکا ہو، وہ ایسے ظالمانہ افعال کی برائی کے احساس سے بالکل نافی نہیں ہو سکتا اسی وجہ سے قرآن پاک میں اس فعل کی قباحت پر کوئی بھی چوٹی فقرہ نہیں لکھا گیا ہے۔ بلکہ روئے کھڑے کر دینے والے الفاظ میں صرف اتنی بات کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ایک وقت آئے گا جب زندہ گاڑی ہوتی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قدر اور میں ماری

عرب کی تاریخ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے لوگوں کو زمانہ جاہلیت میں اس رسم کی قیاحت کا احساس تھا۔ ظہرائی کی روایت ہے کہ قرزوق شاعر کے دادا صمصم بن ناجہ النجاشعی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ میں نے جاہلیت کے زمانے میں کچھ اچھے اعمال بھی کیے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ میں نے ۳۶ لڑکیوں کو زندہ دفن ہونے سے بچایا اور ہر ایک کی جان بچانے کے لیے دو دو اونٹ خریدے ہیں ویسے کیا مجھے اس پر اجر ملے گا؟ حضور نے فرمایا ہاں تیرے لیے اجر ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ نے تجھے اسلام کی نعمت عطا فرمائی۔

لَهُ إِذَا الْمَوْءُؤَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (التكوير: ۱۶) اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔

اس آیت کے انداز بیان میں ایسی شدید غضبناکی پائی جاتی ہے جس سے زیادہ سخت نضبناکی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹی کو زندہ گاڑنے والے ماں باپ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ایسے قابل نفرت ہوں گے کہ ان کو مخاطب کر کے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ تم نے اس معصوم کو کیوں قتل کیا، بلکہ ان سے نگاہ پھیر کر معصوم بچی سے پوچھا جائے گا کہ قیسے پڑی آخر کس قصور میں ماری گئی اور وہ اپنی داستان سنائے گی کہ ظالم ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا ظلم کیا اور کس طرح اسے زندہ دفن کر دیا۔ اس کے علاوہ اس مختصر سی آیت میں دو بہت بڑے مضمون سمیٹ دیئے گئے ہیں جو الفاظ میں بیان کیے بغیر خود بخود اس کے فحوی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اہل عرب کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جاہلیت نے ان کو اخلاقی پستی کی کس انتہا پر پہنچا دیا ہے کہ وہ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہیں، پھر بھی انہیں اصرار ہے کہ اپنی اس جاہلیت پر قائم رہیں گے اور اس اصلاح کو قبول نہ کریں گے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے بگڑے ہوئے معاشرے میں کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس میں آخرت کے فردی ہونے کی ایک صریح دلیل پیش کی گئی ہے جس لڑکی کو زندہ دفن کر دیا گیا اس کی آخرت میں تو داد دی گئی ہے چاہیے اور جن ظالموں نے یہ ظلم کیا، آخر کبھی تو وہ وقت آنا چاہیے جب ان سے اس بے دردانہ ظلم کی باز پرس کی جائے۔ دفن ہونے والی لڑکی کی فریاد دنیا میں تو کوئی سننے والا نہیں تھا۔ جاہلیت کے معاشرے میں اسے بالکل جانور رکھا گیا تھا۔ ماں باپ کو اس پر کوئی شرم آتی تھی، نہ خاندان میں کوئی ان کو ملامت کرنے والا تھا نہ معاشرے میں کوئی اس پر گرفت کرنے والا تھا۔ پھر کیا خدا کی خدائی میں یہ ظلم عظیم بالکل ہی بے داد رہ جانا چاہیے۔ ۱۹۵۶ء



## قتل کا انتقام

جاہلیت کے زمانے میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو خنبا قمتی سمجھتے تھے اتنی ہی قیمت کا خون اُس خاندان یا قبیلے یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اُسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لے لینے سے اُن کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا۔ وہ اپنے ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سینکڑوں سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا کوئی معزز آدمی اگر دوسرے گروہ کے کسی چھوٹے آدمی کے ہاتھوں مارا گیا ہوتا تو وہ اصل قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے تیسرے کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جاسے، یا اس کے کسی آدمی اُن کے مقتول پر سے صدقہ کیے جائیں۔ برعکس اس کے اگر مقتول ان کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجے کا شخص اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزت رکھنے والا شخص ہوتا تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لی جائے۔ ۳۹۶

## تصویر لباس و برہنگی

یہ لوگ (اہل عرب) لباس کو صرف زینت اور موسمی اثرات سے جسم کی حفاظت کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن اس کی سب سے پہلی بنیادی غرض یعنی جسم کے قابل شرم حصوں کی پردہ پوشی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ انہیں اپنے سترو سروں کے سامنے کھول دینے میں کوئی باک نہ تھا۔ برہنہ منظر عام پر نہایت براہ چلتے قضائے حاجت کے لیے بیٹھ جانا، ازار کھل جائے تو ستر کے لیے پردہ ہر جانے کی پروا نہ کرنا ان کے شب و روز کے معمولات تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان میں سے بکثرت لوگ حج کے موقع پر کعبہ کے گرد برہنہ طواف کرتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی عورتیں ان کے مردوں سے بھی کچھ زیادہ بے جانتی تھیں۔ ان کی نگاہ میں یہ ایک مذہبی فعل تھا اور نیک کام سمجھ کر وہ اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ ۳۹۷

## عرب میں پھیلی ہوئی عام بد امنی و طوائف الملوک

عرب میں بد امنی عام پھیلی ہوئی تھی جس سے سارا ملک تنگ آیا ہوا تھا۔ ہر طرف کشت و خون برپا تھا۔ لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور کوئی شخص بھی رات بچنے سے نہیں گزار سکتا تھا کیونکہ ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کب کوئی دشمن صبح سویرے اس کی بستی پر لوٹ پڑے۔ یہ ایسی حالت تھی جسے عرب کے سارے ہی لوگ جانتے تھے اور اس کی قباحت کو محسوس کرتے تھے۔ اگرچہ ٹھنڈے والا اس پر ماتم کرتا تھا اور ٹوٹنے والا اس پر خوش ہوتا تھا، لیکن جب کسی وقت ٹوٹنے والے کی اپنی شامت آجاتی تھی تو وہ بھی یہ محسوس کرتا تھا کہ یہ کیسی بُری حالت ہے جس میں ہم لوگ مبتلا ہیں۔ ۳۹۸

اہل عرب کا قاعدہ تھا کہ جب کسی بستی پر انہیں چھاپا مارا جاتا تو رات کے اندھیرے میں چل کر جانتے تاکہ

دشمن نہیں ہوا نہ جہود کیسے، اور صحیح سویر سے اچھا لکھ، اُس پر ٹورٹ، پورے تھکے تاکر شیعہ کی روشنی ملی ہر چیز نظر آئے گی اور وہ ان آئینا تو با دوہ روشنی بھی نہ ہو کہ دشمن دشمن اور سے ان کو آنا دیکھتے تھے اور متناظر کے لیے تیار ہو جاتے۔ پانچویں  
 عرصہ کا حال اُس ڈور میں یہ تھا کہ پورے ملک میں کوئی ایسی نہ تھی جس کے لوگ، باتوں کو صحیحی سے  
 سوکتے، بہوں، کیونکہ ہر وقت ان کو یہ کھڑا لگا رہتا تھا کہ نہ معلوم کب کوئی غارت گر گروہ اچھا لکھ، اُس پر  
 چھاپا مارے۔ کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اپنے قبیلے کے مشورے سے باہر حرم رکھنے کی ہمت کر سکے، کیونکہ آکا اور  
 آرمی کا زخوہ پہنچ کر وہ اسی آجھانا، یا اگر تھا، مچو کر ظالم بن جانے سے محفوظ رہنا گویا امر محال تھا۔ کوئی قافلہ ایسا  
 نہ تھا جو اطمینان سے سفر کر سکے، کیونکہ راستے میں جگہ جگہ اُس پیرا کہ پیرے کا خطرہ تھا، اور راستے بھرنے کا اثر  
 قبائل سرور اور ان کو نہ تو تھیں اسے کہ تھا، قافلے بھرنے گزرتے تھے۔

مومنوں کے لئے نیکو اور نیکو

ایمان

## حُفَا

دین کا تفصیلی علم چاہئے اُس جاہلیت کے زمانہ میں لوگوں کے پاس ثور یا ہمو مگر یہ بات اُس زمانے میں بھی لوگوں سے پوشیدہ نہ تھی کہ اصل دین توحید ہے اور انبیاء علیہم السلام نے کبھی بت پرستی نہیں سکھائی ہے۔ یہ حقیقت ان روایات میں بھی محفوظ تھی جو عرب کے لوگوں کو اپنی سرزمین کے انبیاء سے پہنچی تھیں اور اسے قریب کی سرزمین میں آتے ہوئے انبیاء حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی تعلیمات کے واسطے سے بھی وہ جانتے تھے۔

عرب کی روایات میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ قدیم زمانہ میں عرب کا اصل دین دینِ ابراہیمی تھا اور بت پرستی اُن کے ہاں عمر دین لُحی نامی ایک شخص نے شروع کی تھی۔ شرک و بت پرستی کے رواج عام کے باوجود عرب کے مختلف حصوں میں جگہ جگہ ایسے لوگ موجود تھے جو شرک سے انکار کرتے تھے، توحید کا اعلان کرتے تھے اور بتوں پر قربانیاں کرنے کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے بالکل قریب زمانے میں قتیب بن ساعدۃ الایادی، اُمیہ بن ابی الصلت، سوید بن عمرو المصطلق، وکیع بن سلک بن زبیر الایادی، عمرو بن عبدئب الجونی، ابو قیس خرمز بن ابی انس، زید بن عمرو بن نعیل، وراقہ بن نوفل، عثمان بن الحویزہ، عبید اللہ بن جحش، عامر بن الظرب العدوانی، علاف بن شہاب البیہمی، المنکس بن اُمیہ الیکسانی، زبیر بن ابی سلمیٰ، خالد بن بنان بن غیث، العبسی، عبد اللہ القضاہی اور ایسے ہی بہت سے لوگوں کے حالات ہمیں تاریخوں میں ملتے ہیں جنہیں حُفَا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سب لوگ علی الاعلان توحید کو اصل دین کہتے تھے اور مشرکین کے مذہب سے اپنی بے تعلقی کا صاف صاف اظہار کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں یہ تخیل انبیاء علیہم السلام کی سابقہ تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات ہی سے آیا تھا۔ اس کے علاوہ میں میں جو تھی پانچویں صدی عیسوی کے جو کتابت آثار قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں برآمد ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں وہاں ایک توحیدی مذہب موجود تھا جس کے پیرو الرکن اور رب الشاہد والارض ہی کو اللہ واحد تسلیم

کرتے تھے۔ مشرکوں کا ایک کتبہ ایک عبادت گاہ کے کھنڈر سے ملا ہے جس میں لکھا ہے کہ یہ محمد اللہ ذو  
 النہوی، یعنی اللہ اسماء یا رب العالمین کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے۔ مشرکوں کے ایک کتبے میں بنصر  
 وردا لعن بعل سمین وارضین وبنصر وبعون الالہ رب العالمین والارض کے الفاظ لکھے  
 ہیں جو عقیدہ توحید پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ اسی دور کا ایک اور کتبہ ایک قبر پر ملا ہے جس میں بخیل  
 رحمن یعنی استعین بھول الوحش کے الفاظ لکھے ہیں۔ اسی طرح شمال عرب میں دریائے فرات اور  
 قنسیرین کے درمیان زبد کے مقام پر مشرکوں کا ایک کتبہ ملا ہے جس میں بِسْمِ اللّٰهِ، لَا عِزَّ لِلّٰهِ، لَا شَرَّ  
 لِلّٰهِ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے  
 پہلے انبیاء سابقین کی تعلیمات کے آثار عرب سے بالکل مٹ نہیں گئے تھے، اور کم از کم اپنی بات یاد دلانے  
 کے لیے بہت سے ذرائع موجود تھے کہ تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے۔ لہذا

اہل عرب میں جو مشرکین پائے جاتے تھے وہ ان میں گناہوں سے پرہیز کرتے تھے جن میں اہل عرب  
 کثرت سے مبتلا تھے۔ ایک شرک باللہ۔ دوسرے قتل ناحق، تیسرے زنا۔

۱۰ اسی مضمون کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت احادیث میں بیان فرمایا ہے۔ مثلاً عبد اللہ بن مسعود کی روایت  
 ہے کہ ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا، سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔ فرمایا ان تجعل یتہ یتدا وهو خلقک، یہ کہ کسی  
 کو اللہ کا بڑا مقابل اور ہمسر ٹھہراتے، حالانکہ تجھے پیدا اللہ نے کیا ہے، پوچھا گیا اس کے بعد فرمایا ان تقتل  
 ذلک حشیتہ ان یطعمہ معک، یہ کہ تو اپنے پیچھے کو اس خون سے قتل کر ڈالے کہ وہ تیرے ساتھ کھانے  
 میں شریک ہو جائے گا۔ پوچھا گیا پھر فرمایا ان تزدانی حلیتہ جارک، یہ کہ تو اپنے ہمسائے کی بیوی سے زنا کرے۔  
 ریحاری، مسلم، ترمذی، نسائی، احمد۔ اگرچہ کبیرہ گناہ اور بھی بہت سے ہیں لیکن عرب سوسائٹی پر اس وقت سب سے زیادہ  
 تسلط نہیں نہیں گناہوں کا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کی اس خصوصیت کو نمایاں کیا گیا کہ پورے معاشرے میں چند لوگ ہیں جو  
 ان برائیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ لہذا

## صابئین

صابئی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ ایک حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیروہ جو بالائی عراق (یعنی الجزیرہ) کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے اور حضرت یحییٰ کی پیروی میں اہل طباعہ (پتھر) کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیدائے اولیٰ حضرت ادریس علیہما السلام کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر پرستیوں کی اور سیاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے۔ ان کا مرکز تحران تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں بھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ و سائنس اور فنِ طب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ سورہ الحج میں جن صابئین کا ذکر کیا گیا ہے ان سے پہلا گروہ مراد ہے۔ کیونکہ دوسرا گروہ غالباً نزولِ قرآن کے زمانے میں اس نام سے موسوم نہ تھا۔

۱۔ حاشیہ میں جانب قرین۔

اس سلسلے میں محمود شکاری آگوسی نے یہ معلومات جمع کی ہیں:

۲۔ صابئین بڑی امتوں میں سے ایک امت ہے۔ لوگوں کو ان کے دین کے متعلق جس قدر محسوسیت حاصل ہوئی ہے اسی قدر ان کے متعلق اختلافِ رائے پایا گیا ہے۔ ان کی دو قسمیں ہیں: مؤمن اور کافر۔ (اس سلسلے میں آیت ۲: ۲۲۴ کا حوالہ دیا گیا ہے)

یہ لوگ حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام کی قوم تھے۔ حضرت ابراہیم انہی کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا مسکن تحران تھا اور یہی صابئینوں کا گھر ہے۔ ان کی دو قسمیں تھیں: ایک قسم دینِ حنیف پر قائم تھی اور دوسری مشرک تھی۔ ان میں سے جو مشرک تھے وہ سات ستاروں اور بارہ برجوں کی تعظیم کیا کرتے تھے اور اپنے مندروں میں ان کی تصویریں بنا کر رکھتے تھے۔ ان ستاروں کے پیسے ان کے ہاں مخصوص مندر پائے جاتے تھے یہی ان کے بڑے

رفقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۹

عبادت خانے تھے، ایسے ہی جیسے عیسائیوں کے گریسے اور یہودیوں کے پیسے چنانچہ انہوں نے ایک ہزار مندر سورج کے پاس بنا رکھا تھا، ایک چاند کے پاس، ایک زہرہ کے پاس، ایک مشتری کے پاس، ایک عطارد کے پاس، ایک مریخ کے پاس، ایک زحل کے پاس اور ایک مندر عقیقت اولیٰ کے پاس۔ ان کے نزدیک ہر شے کے پاس مخصوص عبادت اور مخصوص دعا ہے۔ . . . مسلمانوں کی طرح ان کے پاس بھی پانچ نمازیں ہیں

ان میں سے کچھ لوگ رمضان کے مہینے میں روزے ہی رکھتے ہیں، اور کچھ کی عزت لڑخ کر کے نماز بھی پڑھتے ہیں۔ کچھ کی بھی تعظیم کرتے ہیں اور حج کے پاس ٹکے جانے کا بھی عقیدہ رکھتے ہیں۔ مردار، خون اور سور کے گوشت کو حرام قرار دیتے ہیں۔ شادی کے معاملے میں انہی رشتہ داروں کو حرام قرار دیتے ہیں جنہیں مسلمان حرام قرار دیتے ہیں۔ بغداد کے ارکان سلطنت کی ایک جماعت اسی مذہب پر کاربند تھی۔ انہی میں سے بلال بن المحسن الصابی تھے جو دیوان افشائے افسر اور مشہور رسائل کے مصنفت ہیں۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ روزے رکھا کرتے، ان کے ساتھ عبادت کیا کرتے، ان کے ساتھ زکوٰۃ ادا کرتے اور حرام چیزوں کو حرام قرار دیتے۔ . . . خیال کیا جاتا ہے کہ اس دین کی اصل یہ تھی کہ یہ لوگ دنیا کے مذاہب کی خوبیاں لے لیا کرتے تھے اور ان کی برائیوں سے بچتا اور عملاً علیحدگی اختیار کرنے تھے۔ اسی لیے انہیں صابئہ کہا گیا، یعنی خارج (۲: ۲۲۵)۔ چنانچہ یہ لوگ ہر مذہب کی جملہ اوصیاء باتوں سے نکل گئے اور صرف ان امور پر کاربند رہے جنہیں انہوں نے حق سمجھا

کتاب قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صابی کہا کرتے تھے اور آپ کے صحابہ کو صباۃ محاورے میں کہتے ہیں صبا الوحیل، جب آدمی ایک چیز سے نکل کر دوسری چیز میں چلا جاتے اور صباۃ الوحیل اُس وقت کہتے ہیں جب وہ مائل ہو جاتے۔

(اقتباسات از اردو ترجمہ بلوغ العرب، ج ۳، ص ۱۱۴، ۱۲۰)

## مُجُوس

ان دو گروہوں یعنی یہود و نصاریٰ کے علاوہ جن دوسری قوموں کے پاس کتا بہن بکھی گئی تھیں، انہوں نے چونکہ اپنی کتابوں کو باطل گم یا مسخ کر دیا اور ان کے اعتقاد و عمل میں کوئی چیز بھی تعلیمات انبیاء پر باقی نہیں رہی، اس لیے ان پر لفظ اہل کتاب کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجوسیوں کو اہل کتاب قرار نہیں دیا، حالانکہ وہ زردشت کو ملتے ہیں جس پر یہی ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ ہجر کے مجوسیوں سے جب معاملہ پیش آیا تو حضور نے فرمایا کہ سوا اللہ سنا اہل کتاب ان کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ کرو۔ یہ نہیں فرمایا کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ پھر جو نامہ مبارک آپ نے مجوس ہجر کو لکھا تھا اس میں صراحت کے ساتھ یہ تحریر فرمایا تھا کہ:

« فان اسلمتم فلکم مالنا وعلیکم ما علینا و من ابی فعلیہ الجزیۃ غیر اکل ذبا تحمہ ولا نکاح نسائہم ۛ اگر تم اسلام قبول کرو گے تو تمہارے وہی حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اور تم پر وہی واجبات ہوں گے جو ہم پر ہیں اور جو لوگ تم میں سے انکار کریں گے ان پر جزیہ عائد کر دیا جائے گا مگر نہ ان کا ذبیحہ کھایا جائے گا اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے گا۔

ایران کے آتش پرست جو روشنی اور تاریکی کے دو خدا مانتے تھے اور اپنے آپ کو زردشت کا پیروں کہتے تھے، ان کے مذہب و اخلاق کو مژدک کی گرامیوں نے بڑی طرح مسخ کر کے رکھ دیا تھا۔ حتیٰ کہ سگی بہن سے نکاح تک ان میں رواج پا گیا تھا۔

ۛ حاشیہ میں جانب مرتبین :

عرب آتش پرستوں کے متعلق محمود شکر علی آلوسی نے لکھا ہے کہ :

« ایسے لوگ عربوں میں متفرق تھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب ایرانیوں اور مجوسیوں کے ذریعے



(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق)

ان میں سراپت کر گیا تھا کہتے ہیں کہ آگ کی پریشانی دنیا میں قابل کے عہد سے چلی آرہی ہے۔۔۔  
 قابل پہلے شخص ہے جس نے آتشکدہ بنایا اور اس کی عبادت کی پھر یہ مذہب مجوسیوں میں امرت  
 کر گیا۔ اور انہوں نے آگ کے بہت سے گھر بنائے اور اس کے لیے وقف، محافظ اور دربان مقرر کیے  
 وہ اسے ایک محلہ کے لیے بھی بکھنے نہ دیتے تھے چنانچہ فریدیوں نے ایک آتشکدہ طوس میں تعمیر کرایا  
 اور ایک بنجارا میں بہمن نے سجستان میں ایک آتشکدہ تعمیر کیا۔ ابوقتاوہ نے ایک آتشکدہ بخارا کی  
 جانب تعمیر کیا۔

آتش پرستوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک فرقہ وہ ہے جو آگ میں کسی نفس کے ڈلنے اور  
 آگ سے بدن کے جلنے کو حرام قرار دیتا ہے۔۔۔ آتش پرستوں کا ایک اور فرقہ ہے جو اس کی پوجا  
 کرنے میں اس حد تک چلے گئے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو آگ پر فرمان کر دیتے ہیں۔  
 آتش پرستوں میں سے بعض لوگ زہاد اور عابد ہیں جو آگ کے گرد روزہ رکھ کر بیٹھتے اور چلنے کاٹھنے  
 ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ اچھے اخلاق مثلاً صدق، وفا، امانت داری، پارسائی، عفت اور  
 عدل کی ترغیب دیتے ہیں۔

ابن قتیبہ کتاب المعارف میں کہتا ہے: ”مجوسیت کا رواج بنی تمیم میں تھا۔ زرارہ بن عدس النہمی اداس کا  
 بیٹا حاجب بن زرارہ انہی میں سے تھا۔ اُس نے اپنی بیٹی سے شادی کر لی تھی، مگر بعد میں نام نہوا۔ انہی میں سے  
 افروخ بن عایس تھا (یہ بعد میں اسلام لائے اور صحابہ میں شمار میں)۔ کوکب بن عثمان کا دارا ابوالاسود بھی مجوسی تھا۔“  
 (اقتباسات از اردو ترجمہ بلوغ الارباب، ج ۳، ص ۲۸ تا ۲۹)

حاشیہ از مرتبین:

ہمارا خیال ہے کہ مجوسیت کے مختلف اجزاء اور مختلف شکلیں عربوں کے ہاں پہلیں۔ عربوں میں زردشتی گروہ کے دو  
 خداؤں اور عقیدہ نور و ظلمت کے پائے جانے کے منحنان محمود شکاری آٹوسی نے ایک فصل لکھی ہے جس کا عنوان ہے:  
 ”تثویب کے عقائد کا بیان“۔ اس کے اقتباسات درج ذیل ہیں:

”یہ وہ لوگ ہیں جن کا کہنا ہے کہ بنائے دانے دو ہیں: خیر کا بنائے والا نور ہے اور شر کا ظلمت۔ اور  
 یہ دونوں قدیم، انہی اور ابدی ہیں، فوری ہیں، حساس ہیں، ادواک کے مالک ہیں، مسیح ہیں اور بصیر ہیں۔  
 کچھ لوگ کہتے ہیں: خنی بھانڈہ مدت تک تنہا رہنے سے اُداس ہو گیا، لہذا اس کے دل میں برا خیال  
 آیا (العیاذ باللہ) اور یہ خیال جسمیت اختیار کر کے تاریکی بن گیا۔ پھر اس سے ابلیس پیدا ہوا۔“

## زبطیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱

صاحبِ بلوغ الاربع نے زبونی کے نام سے ایک اور ندر بھی گروہ کا ذکر الگ کیا ہے، مگر فی الحقیقت وہ بھی بقرت سے الگ کرتی چیز نہیں، اور اس کا سرشتی بھی ایران ہی تھا۔ جیسا کہ خود ذیلی کے اقتباس سے واضح ہے:

”ابن شیبہ کتاب الطبابت میں بھی جابلتہ کے نام سببِ اہل عرب سے بھٹا کرنے پر لکھا ہے:  
 زبونی نہ سببِ قریشی نہ پایا جاتا تھا۔ انہوں نے اسے بیڑہ سے لیا تھا۔ انعاموں میں ہے: الزبونیون  
 زکروہ کے ساتھ، یہ رو خداؤں کر لٹنے والوں میں سے ہیں، بارہ لوگ جو ثورا اور ظلمات کے قائل ہیں،  
 بارہ جو اثرات اور برکتیں برائیاں نہیں رکھتے، بارہ جو درپردہ کا فرسوں اور نیا سرسوں۔ بارہ نظر  
 ”ذوقِ دین“ یعنی سعادت کا دین“ سے معرکے ہے۔ دعائاً یہ قبایس سعادت کے متعلق مشہور اثر کی فلسفہ  
 کی بنا پر لکھا گیا ہے۔ اس کے صحیح ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے، جیسا کہ نکلا ہے۔ منہذا اس کتاب کا  
 نام ہے جسے نزو کہنے میں کیا تھا، اور وہ مجموعہ فقرہوں میں سے مزو کہے گئے کا نہیں تھا“

دارود ترجمہ بلوغ الاربع۔ ج ۳۹۔ ص ۱۲۹

## دہریت

### دہریت کی حقیقت

دنیا کی زندگی سلاخ میں انسانوں کو مختلف قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا کرتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ جینا اور مرنا جو کچھ ہے بس اسی دنیا میں ہے، اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں، لہذا جتنا کچھ بھی تمہیں کرنا ہے بس یہیں کر لو۔

بعض لوگ سرے سے یہی نہیں مانتے کہ ان ساری چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ محض مائوس کے ہجان کا نتیجہ ہے، یا ایک مادہ ہے جس میں کسی حکمت اور صناعتی کا کوئی دخل نہیں۔ اپنے معبودوں کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی قوم سمیت تمام مشرکین کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ بجز دہریوں کے اور کسی کو بھی دنیا میں اللہ کے خالق کائنات ہونے سے انکار نہیں رہا ہے۔ درحقیقت شرک اور دہریت اور انکارِ آخرت کے عقائد کوئی شخص بھی یقین کی بنا پر اختیار نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یقین صرف علم سے حاصل ہوتا ہے، اور کسی شخص کو بھی یہ علم حاصل نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے یا بہت سے خدا ہیں، یا خدائی کے اختیارات میں بہت سی ہستیوں کو دخل حاصل ہے، یا آخرت نہیں ہوئی چاہے پس جس نے بھی دنیا میں یہ عقائد اختیار کیے ہیں اُس نے محض قیاس و گمان پر ایک عمارت کھڑی کر لی ہے جس کی اصل بنیادِ شک کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ شک انہیں سخت گراہی کی طرف لے گیا ہے۔ انہیں خدا کے وجود میں شک ہوا۔ انہیں توحید کی صداقت میں شک ہوا۔ انہیں آخرت کے آئے میں شک ہوا۔ حتیٰ کہ اس شک کو انہوں نے یقین کی طرح دلوں میں بٹھا کر دنیا کی کوئی بات نہ مانی۔

۱۔ واضح رہے کہ قرآن میں محمد دہریوں کا اجمالی تذکرہ بھی موجود ہے اور ان کے نظریات کا ابطال بھی کیا گیا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ گروہ بھی عرب میں موجود تھا لیکن تقابلی استعدادی بنیاد پر انہیں امرودوی صاحب نے بھی اس گروہ کا مختصر تذکرہ

میں نے جہاں تک قرآن مجید کا مطالعہ کیا ہے اور جس حد تک تاریخی معلومات میرے پاس ہیں، ان دونوں سے یہ بات مجھے قریب یہ یقین معلوم ہوتی ہے کہ دنیا میں کبھی کسی قوم یا کوئی کمیونٹی اجتماعی Community

۲- کیا ہے عرب کے دہروں کے متعلق علامہ محمود شکر علی آویسی نے جو معلوماتی نوٹ لکھے ہیں، ان کے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔  
 ”عربوں میں ایک نسیم دہریوں کی تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مصنوعات کو صالح سے بالکل الگ سمجھ کر قرار دے رکھا ہے۔ ان لوگوں کا قول ہے کہ خدا تعالیٰ نے بیان کیا ہے یہ ہے (آیت اِنْ هِيَ اِلَّا ذُنُوبٌ مَّا كَانَتْ تَكْفُرًا) کہ زندگی تو صرف دنیا کی زندگی ہے، بھر مرنے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں، اور میں زمانے کے سوا کوئی چیز ملاک نہیں کرتی۔“

ان کے دو فرقوں کا ذکر کرتے ہوئے، زیادہ مقبول تصور واسے فرقے کے خیالات یوں بیان کیے گئے ہیں:  
 ”... اشیا کی قطعاً کوئی ابتدا نہیں۔ اشیا تو صرف وقت سے فعل کی طرف نکل کر آتی ہیں۔ لہذا جو چیز پہلے بالبقوہ ہو جب وہ فعل کی طرف نکل کر آجائے تو اشیا کے مرکبات اور کسبائے خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ کسی اور چیز سے نہیں پیدا ہوتے۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جہاں ازل سے ہے اور اسی طرح اب تک چلتا ہے گا۔ نہ ہی اس میں تغیر پیدا ہوگا اور نہ ہی اس کے فعل کے باوجود اسے زوال ہوگا۔ اور یہ جہاں خود ہی ان اجزاء کو جو اس کے اندر ہیں مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہے۔“

”شہرستانی کی کتاب الملل والنحل میں دہر سے بحث کی گئی ہے جس کا ماہر حاصل یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خلق کے دوبارہ زندہ کیے جانے کا اور کونائے جانے کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں طبیعت (فطرت) زندہ کرنے والی ہے۔ اور زمانہ فنا کرنے والا ہے۔۔۔۔۔ آری نے اپنی کتاب البکار الافکار میں طبیعت کے ماننے والوں کے ساتھ بہت لطیف بحث کی ہے۔“

”جو لوگ دہر کے معتقد ہیں، انہوں نے اس کے لیے صفات کمال بھی ثابت کی ہیں، مثلاً علم، قدرت وغیرہ۔“ (عربی شعر کے کلام میں ایسی باتیں مذکور ہیں جن کا علامہ نے حوالہ دیا ہے)۔  
 ”دہر کو ماننے والوں اور طبیعت پر اکتفا رکھنے والوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ اصل لوگوں نے ان میں فرق روا رکھا ہے۔“

واقفیات از اردو ترجمہ پبلشرز، لاہور، ص ۳۰۳

ایسی نہیں گزری ہے جو بحیثیت مجموعی خدا کی منکر اور دہریہ رہی ہو۔ افراد اور چھوٹے چھوٹے فلسفیانہ گروہ ایسے ضرور رہے ہیں لیکن وہ اتنے قابل لحاظ نہ تھے کہ براہ راست ان کو خطاب کرنے کے لیے کوئی نبی بھیجا جاتا یا کتاب نازل کی جاتی۔ اسی لیے قرآن مجید میں ایسے گروہوں کے متعلق کہیں کہیں مختصر اشارات تو ضرور کیے گئے ہیں لیکن دعوت کا براہ راست خطاب منکرین ہی کی طرف رہا ہے، اور عموماً توحید پر خود لامل دینے گئے ہیں وہ اس انداز سے دینے گئے ہیں کہ شرک کے ابطال کے ساتھ دہریت کا ابطال بھی انہی سے ہو جاتا ہے۔ اُس کے خلاف الگ سے دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

### شرک کے ساتھ دہریت کا ابطال

اس سلسلے میں ملاحظہ ہو سورۃ النمل کی آیت ۶۰:

”بھلا وہ کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا، پھر اس کے ذریعے سے وہ خوشابادخ اگاتے جن کے درختوں کا اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ — کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا بھی (ان کاموں میں) شریک ہے؟ (نہیں!) بلکہ یہی لوگ راہ راست سے ہٹ کر چلے جا رہے ہیں۔ (ترجمہ از تفہیم القرآن)

اس سوال اور اس کے بعد کے سوالات میں صرف مشرکین ہی کے شرک کا ابطال نہیں ہے بلکہ دہریوں کی دہریت کا ابطال بھی ہے۔ مثلاً اس پہلے سوال میں پوچھا گیا ہے کہ یہ بارش برسانے والا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی نباتات اگانے والا کون ہے؟ اب غور کیجئے، زمین میں اُس مواد کا ٹھیک سطح پر یا سطح سے متصل موجود ہونا جو بے شمار مختلف اقسام کی نباتی زندگی کے لیے درکار ہے، اور پانی کے اندر وہ اوصاف موجود ہونا جو حیوانی اور نباتی زندگی کی ضروریات کے مطابق ہیں، اور اس پانی کا پلے دپلے سمندروں سے اٹھایا جانا اور زمین کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً ایک باقاعدگی کے ساتھ برسایا جانا، اور زمین، ہوا، پانی اور درجہ حرارت وغیرہ مختلف قوتوں کے درمیان ایسا متناسب تعاون قائم کرنا کہ اس سے نباتی زندگی کو نشوونما

لے۔ اس سلسلے میں مولانا مودودی کی بعض اہم تحریریں کر رہاں اس خیال سے بھی صحیح کننا ضروری سمجھا گیا ہے کہ دہریہ عارفین دہریت نے فلسفے میں بھی اپنا راستہ بنا لیا ہے اور ریاست و اقتصادیات کے روپ میں وہ ذہنوں پر حملہ آور ہے۔ مولانا مودودی نے کائنات و حیات کے نظم و نوازی پر اپنی جامع اور مختصر بحثیں ایسے انداز میں کی ہیں کہ ایک ذی تشخص صاحب ارادہ اور حکیم و تدبیر خدا کا وجود تسلیم کیے بغیر عالم موجودات کی کوئی تعبیر ممکن نہیں۔ دوسرے لفظوں میں مولانا نے مائٹس کی دریافتوں کو وجود باری کی ناقابل تردید شہادتوں کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔

غصیب ہو اور وہ ہر طرح کی حیوانی زندگی کے لیے اس کی بے شمار ضروریات پوری کرے۔ کیا یہ سب کچھ ایک حکیم کی منصوبہ بندی اور دانشمندانہ تدبیر اور غالب قوت و ارادہ کے بغیر خود بخود اتفاقاً ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ہر اتفاقی حادثہ مسلسل ہزار ہا برس بلکہ لاکھوں کروڑوں برس تک اسی باقاعدگی سے رونما ہوتا چلا جاسے؟ صرف ایک میٹ و صخرہ آدمی ہی جو تعشب میں اندھا ہو چکا ہو اسے ایک امر اتفاقی کہہ سکتا ہے۔ کسی راستی پسند، عاقل انسان کے لیے ایسا لغو دعویٰ کرنا اور ماننا ممکن نہیں ہے۔ لکن نظم و توافق اتفاقی حادثہ نہیں

زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لیے جیسے قرار ہونا (آتش بجلی انارکھن خود آ...) بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ . . . . یہ کڑھ فضلے کے بسط میں مشق ہے، کسی چیز پر ٹکا ہوا نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب و اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا جس کے خطرناک نتائج کا ہم کبھی زلزلہ آجانے سے باسانی اندازہ لگا سکتے ہیں تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔ یہ کڑھ باقاعدگی سے سورج کے سامنے آتا اور چھپتا ہے۔ . . . . اگر اس کا ایک ہی رخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دو سر رخ ہر وقت چھپتا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی۔ . . . . اس کڑھ پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کشیت ردا چڑھا دیا گیا ہے جو شہابوں کی خوفناک بیماری سے اسے بچاتے ہوئے ہے (دور نہ روزانہ دو کروڑ شہاب ۴۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں)۔ یہی ہوا درجہ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے، یہی سمندروں سے بادل اٹھاتی اور زمین کے مختلف حصوں تک آبِ رسائی کی خدمت انجام دیتی ہے، اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوبہ گرمی فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لیے جیسے قرار نہیں گئی۔ اس کڑھ کی سطح سے بالکل متصل وہ معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزا بڑے پیمانے پر فراہم کر دیے گئے ہیں جو نباتاتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لیے مطلوب ہیں۔ . . . . اس کڑھ پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیر زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے، اور یہ پانیوں پر بھی اس کڑھ سے بڑے بڑے ذخائر کو منجھ کولے اور پھر گھلا کر بہانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ . . . . پھر اس پانی، ہوا اور تمام ان اشیاء کو جو زمین پر پانی جاتی ہیں سیٹھے رکھنے کے لیے اس کڑھ میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔ . . . . علاوہ بریں اس کڑھ سے کہ سورج سے ایک خاص خاصے پر رکھا گیا ہے جو آبادی کے لیے مناسب ترین ہے۔ . . . . یہ صرف چند وہ مناسبیتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جیسے قرار پائی ہے۔ کوئی شخص

جو عقل رکھتا ہو اور ان امور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ یہ تصور کر سکتا ہے کہ کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسب نہیں ایک حادثے کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو گئی ہیں، اور نہ یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور رد و عمل لانے میں کسی دیوبی، دیوتا یا جن یا سہی و ولی یا فرشتے کا کوئی دخل ہے۔ ۱۳

### حیات اور اس کا اعادہ

حیات کی پیدائش کے لیے جتنے عوامل درکار ہیں ان سب کا ٹھیک تناسب کے ساتھ بالکل اتفاقاً جمع ہو کر زندگی کا آپ سے آپ وجود میں آجانا دہریوں کا ایک غیر علمی مفروضہ تو ضرور ہے، لیکن اگر ریاضی کے قانون بخت و اتفاق (Law of Chance) کو اس پر منطبق کیا جائے تو اس کے وقوع کا امکان صفر سے زیادہ نہیں نکلتا۔

زندگی محض ایک مجرد صورت میں نہیں بلکہ بے شمار متنوع صورتوں میں پائی جاتی ہے اس وقت تک موشے زمین پر حیوانات کی تقریباً، لاکھ اور نباتات کی تقریباً دو لاکھ انواع کا پتہ چلا ہے۔ یہ لکھو کھا انواع اپنی ساخت اور نوعی خصوصیات میں ایک دوسرے سے ایسا واضح اور قطعی امتیاز رکھتی ہیں۔ اور قدیم ترین معلوم زمانے سے اپنی اپنی صورتِ نوعیہ کو اس طرح مسلسل برقرار رکھتی چلی آ رہی ہیں کہ ایک خدا کے تخلیقی منصوبے (Design) کے سوا زندگی کے اس عظیم تنوع کی کوئی اور معقول توجیہ کر دینا کسی ڈارون کے بس کی بات نہیں ہے۔

اب ذرا اعادۂ خلق پر غور کیجئے۔ خالق نے ہر نوع حیوانی اور نباتی کی ساخت و ترکیب میں وہ حیرت انگیز نظامِ عمل (Mechanism) رکھ دیا ہے جو اس کے بے شمار افراد میں سے بے حد و حساب نسل ٹھیک اسی کی صورتِ نوعیہ اور مزاج و خصوصیات کے ساتھ نکالتا چلا جاتا ہے، اور کبھی مجھوٹوں بھی ان کو بڑا کر دے چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں یہ بھول چوک نہیں ہوتی کہ ایک نوع کا کوئی کارخانہ نامسل کسی دوسری نوع کا ایک نوز نکال کر پھینک دے۔ جدید علمِ نامسل کے مشابہت اس معاملے میں حیرت انگیز حقائق پیش کرتے ہیں ہر پودے میں یہ صلاحیت رکھی گئی ہے کہ اپنی نوع کا سلسلہ آگے کی نسلوں تک جاری رکھنے کا ایسا مکمل انتظام کرے جس سے آنے والی نسل اس کی نوع کی تمام انبیازی خصوصیات کی حامل ہو۔ اور اس کا ہر فرد دوسری تمام انواع کے افراد سے اپنی صورتِ نوعیہ میں تمیز ہو۔ یہ قاعدے نوع اور نامسل کا سامان ہر پودے کے ایک خلیے (Cell) کے ایک خلیے میں ہوتا ہے جسے بمشکل انتہائی طاقت و زور و جوش سے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا انجینئر پوری صحت کے ساتھ پودے کے سارے نشوونما کو تھا اسی راستے پر ڈالتا ہے جو اس کی

اپنی سرشتِ نوحیہ کا راستہ ہے۔ . . . ایسا ہی معاملہ حیوانات اور انسان کا بھی ہے کہ ان میں سے کسی کی تخلیق بھی بس ایک دفعہ ہو کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ ناقابلِ تصدیق وسیع پیمانے پر سرطوتِ اعادہ تخلیق کا ایک عظیم کارخانہ چلی رہا ہے جو ہر نوع کے افراد سے پیچہ اسی نوع کے بے شمار افراد وجود میں لانا چلا جا رہا ہے۔ . . . یہ چیز نہ صرف اپنی ابتدا کے لیے ایک صالح حکیم پابندی ہے بلکہ ہر آن اپنے درست طریقہ پر چلتے رہنے کے لیے بھی ایک ناظم و مدیر اور ایک حقیقی و قیوم کی طالب ہے جو ایک لحظہ کے لیے بھی ان کارخانوں کی نگرانی اور رہنمائی سے غافل نہ ہو۔

یہ حقائق ایک دہریے کے انکار خدا کی بھی اسی طرح جڑ کاٹ دیتے ہیں جس طرح ایک مشرک کے شرک کی - ۱۳۱۳

### حقیقتِ کائنات کے دو پہلو

اولمہ تبتفکروا فی انفسہم ما خلق اللہ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا الْاِلٰہَ الْحَقِّ وَ اَخِلَّیْ مَسَکِیْنِ۔	کیا انہوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟
(الروم - آیت ۲۸)	اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مقرر قدرت ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔

اس فقرے میں آخرت کی دو مزید دلیلیں دی گئی ہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود سے باہر کے نظامِ کائنات کو بغیر غور و دیکھے تو اسے دو حقیقتیں نمایاں نظر آئیں گی:

ایک یہ کہ یہ کائنات برحق بنائی گئی ہے۔ یہ کسی بچے کا کھیل نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لیے اس نے ایک بے ٹوہنگا سا گھر بنا دیا ہو جس کی تعمیر اور نشیب و دونوں ہی بے معنی ہوں، بلکہ یہ ایک سنجیدہ نظام ہے جس کا ایک ایک ذرہ اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ اسے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے جس کی ہر چیز میں ایک قانون مقرر ہے، ہر شے کی ہر شے کا مقصد ہے۔ انسان کا سزا آمدن اور اس کی پوری معیشت اور اس کے تمام علوم و فنون خود اس بات پر گواہ ہیں کہ انسانی ہر چیز کے پیچھے کام کرنے والا ہے تو انہیں کو دریافت کر کے اور ہر شے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے اسے تلاش کر کے ہی انسان یہاں یہ سب کچھ تعمیر کر سکا ہے، ورنہ ایک بے ضابطہ اور بے مقصد کھلونے میں آکر ایک بچے کی حیثیت سے اس کو رکھ دیا گیا ہوتا تو کسی سائنس اور کسی تہذیب و تمدن کا تصور تک نہ کیا جاسکتا تھا۔ اب آخر یہ بات تمہاری عقل میں کیسے سما جاتی ہے کہ جس حکیم نے اس حکمت اور تدبیر کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے اور اس کے اندر ہم جیسی ایک مخلوق کو اعلیٰ درجہ کی ذہنی و جسمانی طاقتیں دے کر اختیارات دے کر آراستہ کیا ہے



دے کر، اشیاء کی جس دے کر اپنی دنیا کا بے شمار سرد سامان تمہارے حوالہ کیا ہے، اس نے تمہیں بے مقصد ہی پیدا کر دیا ہو گا؟ تم دنیا میں تعمیر و تخریب، اور نیکی و بدی، ظلم و عدل، اور راستی و نارا راستی کے سارے منگلمے برپا کرنے کے بعد یوں یونہی مر کر مٹی میں مل جاؤ گے اور تمہارے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ ہو گا؟ تم اپنے ایک ایک عمل سے اپنی اور اپنے جیسے ہزاروں انسانوں کی زندگی پر اور دنیا کی بے شمار اشیاء پر بہت سے مفید یا مضر اثرات ڈال کر بیٹے جاؤ گے اور تمہارے مرتے ہی یہ سارا دفتر عمل بس یونہی لپیٹ کر دیا میسج کر دیا جائے گا۔

دوسری حقیقت جو اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کسی چیز کے لیے ہمیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک عمر مقرر ہے جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے اور یہی معاملہ بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں غیبی طاقتیں کام کر رہی ہیں وہ سب محدود ہیں۔ ایک وقت تک ہی وہ کام کر رہی ہیں، اور کسی وقت پر انہیں لامحالہ خراج ہو جانا اور اس انتظام کو ختم ہو جانا جسے قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث اُن فلسفیوں اور سائنسدانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی جو دنیا کو ازلی وابدی قرار دیتے تھے۔ مگر جو وہ سائنس نے عالم کے حدوث و بقا کی اس بحیثیت میں، جو ایک مدت دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آرہی تھی، قریب قریب حتمی طور پر اپنا ورطہ خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے اب دہریوں کے لیے عقل اور حرکت کا نام لے کر یہ دعوئی کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی۔ پرانی مادہ پرستی کا سارا انحصار اس تخیل پر تھا کہ مادہ فنا نہیں ہو سکتا۔ صرف صورت بدلی جاسکتی ہے۔ مگر ہر تغیر کے بعد مادہ مادہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کمی و بیشی نہیں ہوتی۔ اس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اس عالم مادی کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ انتہا۔ لیکن اب جو ہماری توانائی Atomic Energy کے انکشاف نے اس پورے تخیل کی بساط اُلٹ کر رکھ دی ہے۔ اب یہ بات کھل گئی ہے کہ قوت مادے میں تبدیل ہوتی ہے اور مادہ پھر قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہمیونٹی۔ اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون

Second Law of Thermo

Dynamics کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ عالم مادی نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی۔ اس کو ازلی ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا چاہیے اس لیے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے اور اب ہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پر اٹھ کر قیامت کا انکار کرے گا، تاکہ



# حضرت موسیٰ سے قبل کا دور

حضرت اسحق کی اولاد، جن میں حضرت یعقوب، یوسف، موسیٰ، داؤد، سلیمان، عیسیٰ اور بہت سے دوسرے انبیاء علیہم السلام پیدا ہوئے حضرت یسوع کی نسل سے تھے ان کا نام چونکہ اسرائیل تھا اس لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دو سری قوموں نے ان کا دین قبول کیا انہوں نے یا تو اپنی نذرانہ ہی ان کے اندر گم کر دی، یا وہ نسل تو ان سے الگ رہیں مگر مذہب ان کی فتح رہیں۔ اسی شاخ میں جب یسوع متزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

اس قوم کی روایات یہ ہیں کہ ان کے مورث اعلیٰ حضرت یعقوب سے اللہ تعالیٰ نے کشتی لڑی۔ رات بھر کشتی جوتی رہی، اور صبح تک راکر بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہ بچھا کر سکا۔ پھر جب صبح ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا: اب بیٹھے جانے دے۔ تو انہوں نے کہا: میں تجھ نہ جانے دوں گا جب تک تو مجھے برکت نہ دے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا: یعقوب۔ اللہ نے فرمایا کہ: آئندہ تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔

## بنی اسرائیل کا وسیع و عظیم ماضی

ایک طرف حضرت ابراہیم، حضرت اسحق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف جیسے جلیل القدر پیغمبر

لے لے نظر ہو: یہودیوں کا جدید ترین ترجمہ کتب مقدسہ (The Holy Sepulchre) (تساخ کردہ جیوش)

پبلیکیشن سوسائٹی آف امیریکا ۱۹۵۷ء، کتاب پیدائش، باب ۳۲، آیات ۲۵، ۲۹، عیسائیوں کے نزدیک بائبل، باب ۱۱۔

مفسرین اسی طرح بیان ہوا۔ ہے یہودی ترجمہ کے حاشیہ میں اسرائیل کے معنی لکھے گئے ہیں۔ He who striveth.

یعنی "جو خدا سے زور آزمائی کرے" اور اس کا مکمل پتہ بائبل کے ۱۱ باب میں عیسائی علماء نے اسرائیل

کے معنی کی تلاش کی ہے کہ "Wrestler with God" یعنی خدا سے کشتی کرنے والا پھر بائبل کی کتاب ہوسیع باب ۱۱

آیت ۳ میں حضرت یعقوب کے تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی توانائی کے آپم میں خدا سے کشتی لڑا، پھر فرشتے سے کشتی لڑا اور غالب ہوا۔

ان کی قوم میں پیدا ہوئے۔ اور دوسری طرز حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانے میں اور ان کے بعد مصر میں ان کو بڑا اقتدار نصیب ہوا۔ مدت دراز تک یہی اس زمانے کی مقرب دنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے، اور ان ہی کا نسل مصر اور اس کے نواح میں رواں تھا۔

عموماً لوگ بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰ سے شروع کرتے ہیں لیکن قرآن اس متسام پر (المائدہ-۲۰) تصریح کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کا اصل زمانہ عروج حضرت موسیٰ سے پہلے گزر چکا تھا جسے خود حضرت موسیٰ اپنی قوم کے سامنے اس کے شاندار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے ۱۳۷

یہودیت کی ابتدا اور وجہ تسمیہ

اصل دین جو حضرت موسیٰ اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء لائے تھے وہ تو اسلام ہی تھا مان انبیاء میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا، اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوتی تھی۔ یہ مذہب اس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کو چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جب سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تو یہ خاندان اس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی، اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کر لی جو سامریہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر اسیریا نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کر دیا بلکہ ان اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام و نشان مٹا دیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔ اس کے بعد صرف یہوداہ اور اس کے ساتھ بنیامین کی نسل باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے یہودی کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ اس نسل کے اندر کاہنوں اور ریتوں اور اُجبار نے اپنے اپنے خیالات اور رجحانات کے مطابق عقائد

اور رسوم اور عیسوی ضوابط کا جو ڈھانچہ صدی برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے۔ یہ ڈھانچہ چوتھی صدی قبل مسیح سے بنا شروع ہوا اور پانچویں صدی عیسوی تک بنتا رہا۔ اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تمسور اسی مختصر اس میں شامل ہے اور اس کا غلبہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید میں اکثر مقامات پر ان کو "الَّذِينَ كَفَرُوا" کہہ کر خطاب کیا گیا ہے۔ یعنی اُسے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے جو ان میں سب کے سب اسرائیلی ہی تھے بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے جنہوں نے یہودیت قبول کر لی تھی قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے، وہاں بنی اسرائیل کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، اور جہاں مذہب یہودی کے پیروں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں "الَّذِينَ كَفَرُوا" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ۱۳۹

یہود حضرت یوسفؑ کے دور میں

موجودہ زمانے کے محققین جنہوں نے بائبل اور مصری تاریخ کا تقابل کیا ہے، عام رستے یہ رکھتے ہیں کہ

چرواہے باؤشاہوں Hyksos Kings میں سے جس قرآن روا کا نام مصری تاریخ میں اپوزیس

( Apophis ) کہتے ہیں حضرت یوسفؑ کا ہم عصر تھا

مصر کا دارالسلطنت ممفس (منہ) تھا جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں ۱۴ میل کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسفؑ ۱۸۰۱۷ سال کی عمر میں وہاں بیٹے دو تین سال عزیز مصر کے گمراہ بنے۔ آٹھ سال پہلے میں گذرے۔ ۲۰ سال کی عمر میں نکاح کیا اور وہاں رہے اور ۸ سال تک بلا شرکت غیرت تمام محنت مصر پر چکومت کرتے رہے۔ اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انہوں نے حضرت یعقوبؑ کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلایا اور اُس علاقے میں آباد کیا جو رمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس علاقے کا نام جسٹن یا گوٹن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ نے ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی۔ اور اتمال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیت کی کہ جب تم مصر سے نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے کر جانا۔ ۱۲۰

حضرت یوسفؑ جن کی بدولت مصر میں اُن کے قدم جمے، خود پیغمبر تھے۔ ان کے بعد چار پانچ صدی تک کا افسار انہی لوگوں کے ہاتھ میں رہا۔ اس دوران میں یقیناً انہوں نے مصر میں اسلام کی خوب تبلیغ کی ہوگی۔ اہل مصر میں سے جو لوگ اسلام لائے ہوئے تھے ان کا مذہب ہی نہیں، ان کا تمدن اور پورا طریق زندگی نیز مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے ہم رنگ ہو گیا ہوگا۔ مصریوں نے ان سب کو اسی طرح اجنبی ٹھہرایا ہوگا جن طرح ہندوستان میں ہندوؤں نے ہندوستانی مسلمانوں کو ٹھہرایا۔ ان کے اور بنی اسرائیل کا لفظ اسی طرح چپا کر دیا ہوگا۔ ہلن غیر عرب مسلمانوں پر محمدؐ کا لفظ آج چپا کر دیا جاتا ہے۔ اور وہ خود بھی دینی و تہذیبی رابطہ اور شادی بیاہ کے تعلقات کی وجہ سے غیر مسلم مصریوں سے الگ اور بنی اسرائیل سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہوتے ہیں۔ جب سے کہ جب مصر پر بنی اسرائیل کا ظہور ہوا تو منظر ہندو بنی اسرائیل پر ہی نہیں ہوتے بلکہ مصری مسلمان بھی ان کے ساتھ کیساں پیٹ لیے گئے۔ اور جب بنی اسرائیل نے ملک چھوڑا تو مسیحی مسلمانوں نے ان کے ساتھ نکلے اور ان سب کا شمار اسرائیلیوں ہی میں ہونے لگا۔ ۱۲۲

لذا کوئی گمان ہے کہ یہ حضرت یوسفؑ کی آمد کی خبر دارالسلطنت میں پہنچی تو حضرت یوسفؑ نے اس وقت کے بڑے بڑے آدمیوں اور صاحبِ مزار کو اس کے ان کے استقبال کے لیے نکلے اور پورے ترک و اختتام کے ساتھ ان کو شہر میں لائے وہ دن وہاں جشن کا دن تھا۔ عورت، مرد، بچے، سب اس جلوں کو دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے اور سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مکہ ہمارے اس جاس کی تائید بائبل کے متعدد اشارات سے ہوتی ہے۔ شمال کے طوبہ پر خروج میں جہاں بنی اسرائیل کے

## مصر میں قوم پرستانہ انقلاب

حضرت یوسف علیہ السلام کا دور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب ہوا۔ او قبطیوں کے ہاتھ جب دوبارہ اقتدار آیا تو نئی قوم پرست حکومت نے بنی اسرائیل کا زور توڑنے کی پوری کوشش کی۔ اس سلسلے میں یہ کہتے ہی پراکتفا نہ کیا گیا کہ اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کیا جاتا اور انہیں اتنی درجے کی خدمات کے لیے مخصوص کر لیا جاتا، جن سے آگے بڑھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹائی جاسے اور ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے تاکہ رفتہ رفتہ ان کی عورتیں قبطیوں کے اخصرت میں آتی جائیں اور ان سے اسرائیلی کے بجائے قبطی نسل پیدا ہو۔ لہذا اس کی مزید تفصیل یہ دیتی ہے کہ حضرت یوسف کی وفات پر ایک صدی سے کچھ زیادہ مدت گزر جانے کے بعد یہ انقلاب ہوا تھا۔ وہ بتاتی ہے کہ نئی قوم پرست حکومت نے پہلے تو بنی اسرائیل کو ان کی زمین زمینوں اور ان کے مکانات اور جائیدادوں سے محروم کیا پھر ان کو حکومت کے تمام مناصب سے بے دخل کیا اس کے بعد بھی جب قبطی حکمرانوں نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل اور ان کے ہم مذہب مصری کافی طاقت ور ہیں تو انہوں نے اسرائیلیوں کو ذلیل و خوار کرنا شروع کیا، اور ان سے سخت محنت کے نام قلیل معاوضوں پر ایلا معاوضہ لینے لگے۔ یہ تفسیر ہے قرآن کے اس بیان کی کہ فرعون مصر کی آبادی کے ایک گروہ کو ذلیل کرتا تھا (فَبَشِّرْهُ بِضُرٍّ مُّكْرَمٍ) اور سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کے اس ایسا کی کہ آل فرعون بنی اسرائیل کو سخت عذاب دیتے تھے۔ ۴۲۲

مصر سے نکلنے کا حال بیان ہوا ہے۔ بائبل کا مصنف کہتا ہے کہ ان کے ساتھ ایک ملی بھڑ بھی تھی (۱۲: ۳۸) پھر بتایا ان غیر اسرائیلی مسلمانوں کے۔ یہ اجنبی اور پرہیزی کی اصطلاحیں استعمال ہونے لگیں۔ چنانچہ توراہ میں حضرت موسیٰ کو جو احکام دیتے گئے ان میں ہم کو یہ تصریح ملتی ہے: "تو ہمارے لیے اور اس پرہیزی کے لیے جو تم میں رہتا ہے نسل ذلیل سدا ایک ہی آئین رہے گا۔ خداوند کے آگے پرہیزی بھی ویسے ہی ہوگی جیسے تم ہو" (۱۵: ۱۰) (مواضع: ۴۲۳)

# بعثت موسیٰ علیہ السلام

بنی اسرائیل کئی صدیوں تک مصر میں انتہائی ذلت و نچریت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا، ان کے ذریعہ سے اس قوم کو غلامی کی حالت سے نکالا۔ ہران پر کتاب نازل کی، اور اس کے فیض سے وہی دینی اور پسپہی قوم ہوتی قوم ہدایت پاکر دنیا میں ایک نامور قوم بن گئی۔

**حضرت موسیٰ کی دعوت**

حضرت موسیٰ دو چیزوں کی دعوت لے کر فرعون کے پاس گئے تھے: ایک یہ کہ وہ اللہ کی بندگی (اسلام) قبول کرے، دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل کی قوم کو جو پہلے سے مسلمان تھی، اپنے بچہ و بچہ سے رہا کر دے۔ ۴۲۶

دوسری طرف انہوں نے بنی اسرائیل کو یہ تعلیم و تربیت دی کہ:

”اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے۔ آخری کامیابی انہی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں“

**بنی اسرائیل کی دواں ہمتی**

اُس پر خطر زمانے میں حق کا ساتھ دینے اور علم و ارشاد حضرت موسیٰ کو اپنا رہنما تسلیم کرنے کی جرأت چند لوگوں اور لڑکیوں نے تو کی مگر مادی اور باپوں اور قوم کے سن رسیدہ لوگوں کو اس کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ ان پر مصلحت پرستی اور دنیوی اغراض کی بندگی اور عافیت کوشی کچھ اس طرح چھائی رہی کہ وہ ایسے حق کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ ہوئے جس کا راستہ ان کو خطرات سے پر نظر آ رہا تھا۔ بلکہ وہ اُسے ان نوجوانوں ہی کو روکتے رہے کہ موسیٰ کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم خود بھی فرعون کے غضب میں مبتلا ہو گے اور ہم پر بھی آفت لاؤ گے۔ ۴۲۷

ان کے اس طرز عمل کی وجہ یہ نہ تھی کہ انہیں حضرت موسیٰ کے صاوق اور ان کی دعوت کے حق ہونے میں کوئی شک تھا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اور خصوصاً ان کے اکابر و اشراف حضرت موسیٰ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعون کی سخت گیری کے خطر سے بچنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اگرچہ یہ لوگ نسلی اور مذہبی دونوں

بشیرتوں سے، براہیم، اسحق، یعقوب اور یوسف علیہم السلام کے امتی تھے، اور اس بنا پر ظاہر ہے کہ سب مسلمان تھے، لیکن ایک قدرت و راز کے اخلاقی انحطاط نے اور اس ہیبتہ تمہنی نے جو زبردستی سے پیدا ہوئی تھی، ان میں آخرا بل ہونا باقی نہ چھوڑا تھا کہ کفر و منکرات کی فرماں روائی کے مقابلے میں ایمان و ہدایت کا علم نے خود اٹھتے یا جو اٹھا تھا اس کا ساتھ دیتے۔ ۲۵

واضح رہے کہ ایک دور ستم وہ تھا جو حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے رومیوں ثانی کے زمانے میں جاری ہوا تھا، اور دوسرا دور یہ تھا جو فرعون منصفانہ کے دور میں، موسیٰ علیہ السلام کی ہیبت کے بعد شروع ہوا۔ دونوں ادوار میں یہ بات مشترک تھی کہ بنی اسرائیل کے لوگوں کو قتل کیا جاتا اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جاتا تھا۔ حضرت موسیٰ اور فرعون کی اس کشمکش میں عام اسرائیلیوں کا طرز عمل کیا تھا اس کا اندازہ بائبل کی اس عبارت سے ہوا سکتا ہے:

”جب وہ فرعون کے پاس سے نکلے آ رہے تھے تو ان کو موسیٰ اور ہارون ملاقات کے لیے راستے پر کھڑے تھے تب انہوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے، اونہا پر انصاف کرے، تم نے ہم کو فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھناؤنا کیا ہے کہ ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار رستہ دی ہے۔“ (خروج ۲۰:۱۷-۲۱)

تو وہیں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے کہتے تھے:

”ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھینرے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے اگر اس کو بچانے کی کوشش کی، اور دونوں کی کشمکش میں بکری کے ٹوٹے اڑ گئے پس اسی طرح تمہاری اور فرعون کی بھینرے میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔“ (۲۳)

مصر سے بنی اسرائیل کی ہجرت

اللہ تعالیٰ نے انہما پر ایک امت منفرد فرمادی جس میں تمام اسرائیلی اور غیر اسرائیلی مسلمانوں کو مصر کے ہر حصے سے ہجرت کے لیے نالی پڑنا تھا یہ سب لوگ ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر ایک نافرمانی کی صورت میں روانہ ہو گئے۔

۱۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کے سامنے کس کس طرح دعوت دی، ان پر کیا کیا الزامات لگاتے چلنے رہے، ان کے دہریہ نظریوں پر کیا کیا تمنا ہی عذاب آتے، نیز خود بنی اسرائیل کے احوال کیا تھے، ان ساری تفصیلات کو پتھر گزیم تاریخی ہیبت کا یہ واقعہ ہے۔ یہ ہے کہ چونکہ حضرت موسیٰ کی دعوت کا جواب فرعون نے مسلسل نکار اور سرکشی سے دیا، اس لیے اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو بحالت ولایت کے لیے ہجرت کی راہ پر نکل کھڑے ہوئے۔ (۲۴)



... حضرت موسیٰ نے بحر احمر کی طرف جانے والا راستہ اختیار کیا . . . لیکن ادھر سے فرعون ایک لشکر عظیم لے کر تعاقب کرتا ہوا ٹھیک اُس موقع پر آپنا چنچا جبکہ یہ قافلہ ابھی سمندر کے ساحل ہی پر تھا۔ سورۃ الشعراء میں بیان ہوا ہے کہ مہاجرین کا قافلہ لشکر فرعون اور سمندر کے درمیان بالکل ٹکر چکا تھا عین اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنا عصا سمندر پر مار چنانچہ فوراً سمندر ٹھیک گیا اور اس کا ہرگز ایک بڑے ٹپکے کی طرح کھڑا ہو گیا اور بیچ میں صرت یہی نہیں کہ قافلے کے گزرنے کے لیے راستہ نکل آیا بلکہ بیچ کا یہ حصہ خشک ہو کر سُکھی ٹرک کی طرح بن گیا۔ اس ٹرک سے مہاجرین کے گزرنے ہی فرعون اپنے لشکر سمیت سمندر کے اس درمیانی راستے میں اُتر آیا، اور سمندر نے اس کو اور اس کے لشکر کو دلوچ لیا۔ ۱۳۱

### قومِ موسیٰ کا دورِ صحرا نوردی

حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی اسرائیل کو مصر سے لے کر جزیرہ منہ تے سینا میں مارہ، ایلیم، اور رفیدیم کے راستے کو سینا کی طرف آئے، اور ایک سال سے کچھ زیادہ مدت تک اس مقام پر ٹھہرے رہے یہیں تو رات کے بیشتر احکام آپ پر نازل ہوتے۔

### فلسطین پر چڑھائی کا حکم

پھر آپ کو حکم ہوا کہ نبی اسرائیل کو لے کر فلسطین کی طرف جاؤ اور اسے فتح کر لو کہ وہ تمہاری میراث میں دیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی اسرائیل کو ایسے ٹھہرتے تبصر اور حصیرات کے راستے وشت فاران میں تشریف لاتے یہاں سے آپ نے ایک وفد فلسطین کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لیے بھیجا۔ قادس کے مقام پر اس وفد نے آکر اپنی رپورٹ عین کی حضرت یوشع اور کالب کے سوا پورے وفد کی رپورٹ حوصلہ شکن تھی جسے سن کر نبی اسرائیل حیح اُٹھے اور انہوں نے فلسطین کی مہم پر جانے سے انکار کر دیا

### دوسرا دورِ صحرا نوردی بطورِ سزا

تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب یہ چالیس برس تک اس علاقے میں بھٹکتے رہیں گے، اور ان کی موجودہ نسل یوشع اور کالب کے سوا فلسطین کی تشکیل نہ دیکھنے پائے گی اس کے بعد نبی اسرائیل وشت فاران، بیابان شحر، اور وشت میں کے درمیان مارے مارے پھرتے رہے اور عمالقہ، اموریوں، آوڈیوں، بنیانیوں اور موآب کے لوگوں سے ٹرتے بھرتے رہے۔

یہ نبی اسرائیل کے دورِ صحرا نوردی کی داستان کے بہت سے چٹوڑے اہم ہیں، اس دور میں ان پر میرا نہ صورت میں خاص انعامات ہوتے، اس دور میں ان کے اندر غلامانہ ماضی کے اثرات طرح طرح کی غلط حرکات کی صورت میں ظاہر ہوتے جس کی اصلاح کے لیے حضرت موسیٰ نے شدید محنت کی۔ اس لحاظ سے یہ زمانہ تربیت تھا۔ (تشریح)

## فلسطین کی فتح اور فوراً بعد

### فلسطین کی فتح

جب پچیس سال گزرنے کے قریب آتے تو آدم کی سرحد کے قریب کوہ ہور پر حضرت ہارون علیہ السلام نے وفات پائی پھر حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لیے ہوئے موآب کے علاقے میں داخل ہوئے اور اس پورے علاقے کو فتح کرتے ہوئے مسبون اور شیطیم تک پہنچ گئے یہاں کوہ عباریم پر حضرت موسیٰ کا انتقال ہوا اور ان کے بعد ان کے خلیفہ اول حضرت یوشع نے مشرق کی جانب سے دریائے اردن کو پار کر کے شہر ریجوراریجا کو فتح کیا۔ یہ فلسطین کا پہلا شہر تھا جو بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا۔ پھر ایک فہیل مدت ہی میں پورا فلسطین فتح ہو گیا۔ بنو اسرائیل کو بگاڑنے سے بچانے کے لیے حضرت موسیٰ کا اہلباہ اور ابراہیم آیت نمبر ۷ میں حضرت موسیٰ کی وصیت یوں مذکور ہے :

” اور یاد رکھو تمہارے رب نے خبردار کر دیا تھا کہ اگر لشکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور اگر کھڑا نہمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔“

یہ فلسطین کی فتح سے پہلے بنی اسرائیل طرح طرح کے فتنوں میں مبتلا ہوتے اور فتح پانے کے بعد پھر ان میں شر و فساد نے نفوذ شکاروں میں سر اٹھایا۔ پھر انہوں نے اس کا خمیازہ بگھڑا۔ اور مشین

۷۔ اس طرح کی دستگیریوں کی ضرورت یہ تھی کہ بنی اسرائیل انعامات الہی سے منعم ہونے کے بعد بار بار نافرمانیاں اور ناشکریاں کرنے لگے۔ حضرت موسیٰ بار بار ان کی اسلٹا کی سعی کرتے اور ان میں توبہ و انابت کا حذیبہ اُبھارتے۔ بنی اسرائیل کے بارے میں یہ اندیشہ بے باق تھا کہ جب یہ فتح فلسطین کے بعد عروج تک پہنچیں گے تو ان میں شیطان بڑی آسانی سے سرکشی پیدا کر دے گا اس لیے انہیں پہلے سے اس نانون الہی کی طرف توجیہ و اذانا ضروری تھا جو انعام یافتہ قوم کی سرکشی کی معورت ہیں تاکہ کرتا ہے (المرثیہ)





مشرکین سے پوری طرح پاک کر دینا۔ آخر کار انہیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں بسیں۔  
اس کا پہلا نمایاں ثبوت بنی اسرائیل کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قوموں کے ذریعہ سے ان کے اندر شکر گھس آیا۔ اور اس کے ساتھ تدریج دوسری اخلاقی گندگیاں بھی راہ پانے لگیں۔

باقیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ طاقت کے عہد تک صیدا، معوز، دود، مجدہ، بیت شان، جزرہ، یروشلم وغیرہ شہر شکر کے قبضے میں رہے اور ان شہروں کی مشرکانہ تہذیب کا بنی اسرائیل پر گہرا اثر پڑا رہا۔ مزید برآں اسرائیلی قبائل کی سرحدوں پر فلسطینیوں، آدومیوں، موآبیوں اور عمونیوں کی طاقت و ریاستیں بھی بدستور قائم رہیں اور انہوں نے بعد میں پے در پے حملے کر کے بہت سا علاقہ اسرائیلیوں سے چھین لیا جتنی کہ نوبت یہ آگئی کہ فلسطین سے بنی اسرائیل پر ایک جینی دوگوش نکال دیے جلتے اگر عین وقت پر اللہ تعالیٰ طاقت کی قیادت میں اسرائیلیوں کو جمع نہ کر دیتا۔

### بنی اسرائیل کا پہلا بڑا دورِ فساد

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑکھرائی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں شمالی فلسطین اور شرقی ارون میں سلطنت اسرائیل، جن کا پایہ تخت آخر کار بامریہ قرار پایا، اور جنوبی فلسطین اور ادم کے علاقے میں سلطنت یہوویہ جس کا پایہ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں تخت رقابت اور کشاکش اول روز سے شروع ہو گئی اور آخر تک رہی۔

ان میں سے اسرائیلی ریاست کے فرمانروا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ ... حضرت الیاس اور حضرت ایسع علیہما السلام نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی۔ مگر یہ قوم جس منزل کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب آشوریوں کی شکل میں دو اتنا اسرائیلی کی طرف متوجہ ہوا اور نویں صدی قبل مسیح سے فلسطین پر آشور کا ناخوشگوار مسلح حملے شروع ہو گئے۔

اس دورِ نمایاں انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انہوں نے چھوڑ دی تھیں، انہوں نے اور فلسطینیوں نے جن کا پورا علاقہ غیر مغلوب رہ گیا تھا، بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پے در پے حملے کر کے فلسطین کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا، جتنی کہ ان سے خداوند کے عہد کا سندوق و تابوت سکینہ انک چھین لیا آخر کار بنی اسرائیل کو ایک فرماں روا کے تخت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ... اس متحدہ سلطنت کے تعین فرماں روا ہونے کے حضرت طاقت، حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہما السلام فرماں رواؤں نے اس کام کو انجام دیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کے احکامات کے تحت انجام دیا تھا۔

سنہ ۲۰ قبل مسیح میں اشور کے تخت گیر فرماں روا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے دولت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔ بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی وہ بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد بہت جلدی شرک اور بد اخلاقی میں مبتلا ہو گئی۔

اگرچہ دولت اسرائیل کی طرح اس پر بھی اشوریوں نے پے در پے حملے کیے، اس کے شہروں کو تباہ کیا، اس کے پائے تخت کا محاصرہ کیا، لیکن یہ ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہو سکی۔ بلکہ صرف بائیس سو سال تک رہ گئی۔ . . . .

آخر سنہ ۵۸۷ قبل مسیح میں (بابل کے بادشاہ) بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام ٹبر سے چھوٹے بڑوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بیروٹھم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پوند خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ یہودیوں کی بہت بڑی تعداد کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تشر تشر کر دیا۔ ۲۸

خدا کی طرف سے ایک اور موقع دیا گیا

جہاں تک سامریہ اور اسرائیل کے لوگوں کا تعلق ہے وہ تو (اشوریوں کی فتح کے بعد) اخلاقی اور اعتقادی زوال کی پستیوں میں گرنے کے بعد پھر نہ اٹھے مگر یہودیہ کے باشندوں میں ایک بقیہ ایسا موجود تھا جو خیر پر قائم اور خیر کی دعوت دینے والا تھا۔ اس نے ان لوگوں میں بھی اصلاح کا کام جاری رکھا جو یہودیہ میں بچے بچے رہ گئے تھے، اور ان لوگوں کو بھی توبہ و انابت کی ترغیب دی جو بابل اور دوسرے علاقوں میں جلا وطن کر دیے گئے تھے۔ آخر کار رحمت الہی ان کی مددگار ہوئی۔ بابل کی سلطنت کو زوال ہوا۔ ۵۳۹ قبل مسیح میں ایرانی فاتح سائرس دھوڑیاں پھیرنے پھیرنے بابل کو فتح کیا اور اس کے دوسرے ہی سال اس نے فرماں جاری کر دیا کہ بنی اسرائیل کو اپنے وطن واپس جانے اور وہاں دوبارہ آباد ہونے کی عام اجازت ہے۔

سائرس نے یہودیوں کو ہیکل سلیمانی کی دوبارہ تعمیر کی اجازت بھی دی۔ مگر ایک عرصے تک ہمسایہ قومیں جو اس علاقے میں آباد ہو گئی تھیں، مزاحمت کرتی رہیں۔ آخر درایوس دوانا، اولیٰ نے سنہ ۵۲۰ قبل مسیح میں یہودیہ کے آخری بادشاہ کے پوتے زرد بابل کو یہودیہ کا گورنر مقرر کیا اور اس نے حجتی نبی، زکریا نبی اور سردار کاہن یثوع کی نگرانی میں ہیکل مقدس نئے سرے سے تعمیر کیا۔

اس زمانے میں حضرت عزرائیل نے دینِ موسیٰ کی تجدید کا بہت بڑا کام انجام دیا۔ انہوں نے یہودی قوم کے تمام اہل خیر و صلاح لوگوں کو ہر طرف سے جمع کر کے ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ بائبل کی کتب مقدسہ کو جن میں تورات تھی، مرتب کر کے شائع کیا، یہودیوں کی دینی تعلیم کا انتظام کیا، قوانین شریعت کو نافذ کر کے ان کے اعتقادی اور اخلاقی برائیوں کو دور کرنا شروع کیا۔ جو بنی اسرائیل کے اندر خیر قوموں کے اثر سے گھس آئی تھیں۔ ان تمام مشرک عورتوں کو طلاق دلائی جن سے یہودیوں نے بپاہ کر رکھے تھے۔ اور بنی اسرائیل سے ازبند

خدا کی بندگی اور اس کے آئین کی پیروی کا یثاق لیا۔

ڈیڑھ سو سال بعد بیت المقدس پھر سے آباد ہوا اور یہودی مذہب و تہذیب کا مرکز بن گیا۔

### یونانی تسلط اور مکابی تحریک

انیسویں سال سلطنت کا فرمانروا جس کا پاپیہ تختہ انطاکیہ تھا، نے سلسلہ ق م میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یہ یونانی فاتح جو نہایت شکرگاہ اور اخلاقی ابا حیت پسند تھے، یہودی مذہب و تہذیب کو سخت ناگوار محسوس کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے مقابلے میں سیاسی اور معاشی دباؤ تسلط یونانی تہذیب کو فروغ دینا شروع کیا اور خود یہودیوں میں سے ایک اچھا خاصا غنہ خزان کا آئہ کار بن گیا۔ اس غامبی مداخلت نے یہودی قوم میں تفرقہ ڈال دیا۔ ایک گروہ نے یونانی لباس، یونانی زبان، یونانی طرز معاشرت اور یونانی کھیلوں کو اپنا لیا اور دوسرا گروہ اپنی تہذیب پر سختی سے قائم رہا۔

سلسلہ ق م میں انیسویں چہارم برس کا لقب ایسی فانیسی یعنی منظر ہوا تھا، جب تخت نشین ہوا تو اس نے پوری جاہلانہ قوت سے یہودی مذہب و تہذیب کی بیخ کنی کرنی چاہی۔ لیکن یہودی اس جذبہ مغلوب نہ ہوئے اور ان کے اندر ایک زبردست تحریک اٹھی جو تاریخ میں مکابی بغاوت کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ اس کشمکش میں یونانیت زدہ یہودیوں کی ساری بہردیاں یونانیوں کے ساتھ تھیں اور انہوں نے عملاً مکابی بغاوت کو کچلنے میں ناکامی کے ظالموں کا پورا ساتھ دیا، لیکن عام یہودیوں میں حضرت عزرا کی بیٹی مروج دینداری کا اتنا زبردست اثر تھا کہ وہ سب مکابوں کے ساتھ جڑ گئے اور آخر کار انہوں نے یونانیوں کو نکال کر اپنی ایک آزادینی ریاست قائم کر لی جو سلسلہ قبل مسیح تک قائم رہی۔ اس ریاست کے حدود پھیل کر فقط فلسطین پر سے رقبے پر حاوی ہو گئے۔ یہودیہ اور اسرائیل کی ریاستوں کے زیر نگین تھے۔ جگہ فلسطین کا بھی ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں آ گیا جو حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بھی مستحضر ہوا تھا۔

### دوسرا دور فساد اور اس کا خمیازہ

مکابیوں کی تحریک جس اخلاقی و دینی رُوح کے ساتھ اٹھی تھی وہ بتدریج فنا ہوتی چلا گئی اور اس کی جگہ فلسطین دیا پرستی اور بے رُوح ظاہر داری نے لے لی۔ آخر کار ان کے درمیان پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے خود رومی فاتح پورسی کو فلسطین آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ پورسی سلطنتی ق م میں اسے فلسطین کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے

لے اس سلسلے میں ان تفصیلی احکام کا تذکرہ چھوڑ دیا گیا ہے جن کے ذریعے یہودیوں کے عام عقائد بنیاداً منہ بشمار

اور اصول معاشرت کو فحشا بنایا گیا تھا۔

بیست اٹھ برس پر قبضہ کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومی فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مغربوں  
 علاقوں پر براہ راست اپنا نظم و نسق قائم کرنے کی بہ نسبت مقامی حکمرانوں کے ذریعہ سے بالواسطہ اپنا کام  
 نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے فلسطین میں اپنے زیر سایہ ایک ایسی ریاست قائم کر دی  
 جو بالآخر سلطنتِ قسطنطنیہ میں ایک ہوشیار یہودی ہیرودن نامی کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص ہیرودا اعظم کے نام سے مشہور  
 ہے۔ . . . . اس نے ایک طرف مغربی پیشواؤں کی سرپرستی کر کے یہودیوں کو خوش رکھا، اور دوسری طرف  
 رومی تہذیب کو فروغ دے کر اور رومی سلطنت کی وفاداری کا زیادہ سے زیادہ مظاہرہ کر کے قیصر کی بھی  
 خوشنودی حاصل کی۔ اس زمانے میں یہودیوں کی دینی و اخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ  
 چکی تھی۔

سنہ ۳۷ء میں ہیرودا اعظم کے پوتے ہیرودا اگرپا کو رومیوں نے ان تمام علاقوں کا فرمان روا بنا دیا  
 جن پر ہیرودا اعظم اپنے زمانے میں حکمراں تھا۔ اس شخص نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسیح علیہ السلام کے پیروں  
 پر مظالم کی انتہا کر دی۔

اس دور میں عام یہودیوں اور ان کے مغربی پیشواؤں کی جو حالت تھی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان  
 تنقیدوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مسیح علیہ السلام نے اپنے خطبوں میں ان پر کی ہیں۔

اس قوم کی آنکھوں کے سامنے یحییٰ علیہ السلام جیسے پاکیزہ انسان کا سر فلک کیا گیا، مگر ایک آواز بھی اس ظلم  
 عظیم کے خلاف نہ اٹھی۔ اور پوری قوم کے مذہبی پیشواؤں نے مسیح علیہ السلام کے لیے سزا سے موت کا مطالبہ  
 کیا۔ . . . . حدیث ہے کہ جب یزقس پلاطس نے ان شامت زدہ لوگوں سے پوچھا کہ . . . . . تباہ و سیرج کو  
 چھڑوں یا برابر ڈاکو کو، تو ان کے پورے مجمع نے بیک آواز ہو کر کہا کہ برابر ڈاکو چھڑو دے۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کی  
 طرف سے آخری حجت تھی جو اس قوم پر قائم کی گئی۔

اس پر تھوڑا زمانہ ہی گزرا تھا کہ یہودیوں اور رومیوں کے درمیان سخت کشمکش شروع ہو گئی اور ۶۶ء اور ۶۷ء  
 درمیان یہودیوں نے کھلی بغاوت کر دی۔ . . . . آخر کار رومی سلطنت نے ایک سخت فوجی کارروائی سے اس  
 بغاوت کو کچل ڈالا اور سنہ ۶۷ء میں یروشلم نے زورِ شمشیر یروشلم کو تاراج کر لیا اس موقع پر قتل عام میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار  
 آدمی مارے گئے، ۹۰ ہزار آدمی گرفتار کر کے غلام بنا لئے گئے، ہزار ہا آدمی پکڑے پکڑے مصری کالوں میں کام کرنے  
 کے لیے بھیج دیئے گئے۔ ہزاروں آدمیوں کو پکڑ کر مختلف شہروں میں بھیجا گیا تاکہ ایسی تفسیروں اور کلموں میں ان  
 کو جنگلی جانوروں سے پھڑوئے یا شمشیر زلوں کے کھیل کا ٹخنہ مشق بننے کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ تمام دراز قامت  
 اور حسین لڑکیاں فاتحین کے لیے چن لی گئیں۔ اور یروشلم کے شہر اور سبیل کو بوندِ خاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد فلسطین



سے یہودی اثر ایسا مٹا کہ وہ ہزار برس تک اس کو پھر سہرا ٹھانے کا موقع نہ ملا۔  
تورات میں تحریر ہے

کتاب استغنا میں حضرت موسیٰ کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے اس میں وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ جو احکام میں نے تم کو پہنچائے ہیں انہیں اپنے دل پر نقش کرنا، اپنی آئندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے اور راہ چلتے، اور اٹھتے اور لیٹتے ہر وقت ان کا چرچا کرنا، اپنے گھر کی چوکتوں پر ان کو لکھ دینا۔ پھر اپنی آخری وصیت میں انہوں نے تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ کوہ عیدال پر بڑے بڑے پتھر نصب کر کے توراہ کے احکام ان پر کندہ کر دینا۔ نیز بنی لاوی کو توراہ کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عید خیام کے موقع پر قوم کے مردوں، عورتوں، بچوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پوری کتاب لفظ بلفظ ان کو سناتے رہنا۔ لیکن اس پر بھی کتاب اللہ سے بنی اسرائیل کی غفلت رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ حضرت موسیٰ کے سات بیٹوں میں سے ایک یعنی سلیمان کے سجادہ نشین اور یروشلم کے یہودی فرزند ایک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں توراہ نامی کوئی کتاب موجود ہے۔ علمائے یہود کا سب سے بڑا تصور یہ تھا کہ انہوں نے کتاب اللہ کے علم کی اشاعت کرنے کے بجائے اس کو رتیموں اور مذہبی پیشہوروں کے ایک محدود طبقے میں مقید کر رکھا تھا، اور عوام کو تو درکنار خود یہودی عوام تک کو اس کی ہوا نہ گھنے دیتے تھے پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گراہیاں پھیلیں تو علماء نے نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوشش نہ کی بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اس منسلک اور بدعت کو جس کا رواج عام ہو جاتا، اپنے قول و عمل سے، یا اپنے سکوت سے اٹھی سند جواز عطا کرنے لگے۔  
ان لوگوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلام الہی کے معنی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو، بلکہ یہ بھی کیا کہ بائبل میں اپنی تفسیروں کو اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو، اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے حقیقی تواریخ کو کلام الہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے

لہ توریث میں کلام الہی کے تھوڑے بہت اجزائے ساتھ یہودی مستبوں، غسروں، داعظوں اور فقیہوں نے جوڑے اپنی ذلت سے پڑھائے ہیں، انہی سے یہ توریث کا ڈھانچہ بنتا ہے۔ (مترجمین) ۱۷۹-۱۸۰-۱۸۱-۱۸۲-۱۸۳-۱۸۴-۱۸۵-۱۸۶-۱۸۷-۱۸۸-۱۸۹-۱۹۰-۱۹۱-۱۹۲-۱۹۳-۱۹۴-۱۹۵-۱۹۶-۱۹۷-۱۹۸-۱۹۹-۲۰۰-۲۰۱-۲۰۲-۲۰۳-۲۰۴-۲۰۵-۲۰۶-۲۰۷-۲۰۸-۲۰۹-۲۱۰-۲۱۱-۲۱۲-۲۱۳-۲۱۴-۲۱۵-۲۱۶-۲۱۷-۲۱۸-۲۱۹-۲۲۰-۲۲۱-۲۲۲-۲۲۳-۲۲۴-۲۲۵-۲۲۶-۲۲۷-۲۲۸-۲۲۹-۲۳۰-۲۳۱-۲۳۲-۲۳۳-۲۳۴-۲۳۵-۲۳۶-۲۳۷-۲۳۸-۲۳۹-۲۴۰-۲۴۱-۲۴۲-۲۴۳-۲۴۴-۲۴۵-۲۴۶-۲۴۷-۲۴۸-۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-۲۵۲-۲۵۳-۲۵۴-۲۵۵-۲۵۶-۲۵۷-۲۵۸-۲۵۹-۲۶۰-۲۶۱-۲۶۲-۲۶۳-۲۶۴-۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷-۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۱-۲۷۲-۲۷۳-۲۷۴-۲۷۵-۲۷۶-۲۷۷-۲۷۸-۲۷۹-۲۸۰-۲۸۱-۲۸۲-۲۸۳-۲۸۴-۲۸۵-۲۸۶-۲۸۷-۲۸۸-۲۸۹-۲۹۰-۲۹۱-۲۹۲-۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۷-۲۹۸-۲۹۹-۳۰۰-۳۰۱-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۴-۳۰۵-۳۰۶-۳۰۷-۳۰۸-۳۰۹-۳۱۰-۳۱۱-۳۱۲-۳۱۳-۳۱۴-۳۱۵-۳۱۶-۳۱۷-۳۱۸-۳۱۹-۳۲۰-۳۲۱-۳۲۲-۳۲۳-۳۲۴-۳۲۵-۳۲۶-۳۲۷-۳۲۸-۳۲۹-۳۳۰-۳۳۱-۳۳۲-۳۳۳-۳۳۴-۳۳۵-۳۳۶-۳۳۷-۳۳۸-۳۳۹-۳۴۰-۳۴۱-۳۴۲-۳۴۳-۳۴۴-۳۴۵-۳۴۶-۳۴۷-۳۴۸-۳۴۹-۳۵۰-۳۵۱-۳۵۲-۳۵۳-۳۵۴-۳۵۵-۳۵۶-۳۵۷-۳۵۸-۳۵۹-۳۶۰-۳۶۱-۳۶۲-۳۶۳-۳۶۴-۳۶۵-۳۶۶-۳۶۷-۳۶۸-۳۶۹-۳۷۰-۳۷۱-۳۷۲-۳۷۳-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-۳۷۷-۳۷۸-۳۷۹-۳۸۰-۳۸۱-۳۸۲-۳۸۳-۳۸۴-۳۸۵-۳۸۶-۳۸۷-۳۸۸-۳۸۹-۳۹۰-۳۹۱-۳۹۲-۳۹۳-۳۹۴-۳۹۵-۳۹۶-۳۹۷-۳۹۸-۳۹۹-۴۰۰-۴۰۱-۴۰۲-۴۰۳-۴۰۴-۴۰۵-۴۰۶-۴۰۷-۴۰۸-۴۰۹-۴۱۰-۴۱۱-۴۱۲-۴۱۳-۴۱۴-۴۱۵-۴۱۶-۴۱۷-۴۱۸-۴۱۹-۴۲۰-۴۲۱-۴۲۲-۴۲۳-۴۲۴-۴۲۵-۴۲۶-۴۲۷-۴۲۸-۴۲۹-۴۳۰-۴۳۱-۴۳۲-۴۳۳-۴۳۴-۴۳۵-۴۳۶-۴۳۷-۴۳۸-۴۳۹-۴۴۰-۴۴۱-۴۴۲-۴۴۳-۴۴۴-۴۴۵-۴۴۶-۴۴۷-۴۴۸-۴۴۹-۴۵۰-۴۵۱-۴۵۲-۴۵۳-۴۵۴-۴۵۵-۴۵۶-۴۵۷-۴۵۸-۴۵۹-۴۶۰-۴۶۱-۴۶۲-۴۶۳-۴۶۴-۴۶۵-۴۶۶-۴۶۷-۴۶۸-۴۶۹-۴۷۰-۴۷۱-۴۷۲-۴۷۳-۴۷۴-۴۷۵-۴۷۶-۴۷۷-۴۷۸-۴۷۹-۴۸۰-۴۸۱-۴۸۲-۴۸۳-۴۸۴-۴۸۵-۴۸۶-۴۸۷-۴۸۸-۴۸۹-۴۹۰-۴۹۱-۴۹۲-۴۹۳-۴۹۴-۴۹۵-۴۹۶-۴۹۷-۴۹۸-۴۹۹-۵۰۰-۵۰۱-۵۰۲-۵۰۳-۵۰۴-۵۰۵-۵۰۶-۵۰۷-۵۰۸-۵۰۹-۵۱۰-۵۱۱-۵۱۲-۵۱۳-۵۱۴-۵۱۵-۵۱۶-۵۱۷-۵۱۸-۵۱۹-۵۲۰-۵۲۱-۵۲۲-۵۲۳-۵۲۴-۵۲۵-۵۲۶-۵۲۷-۵۲۸-۵۲۹-۵۳۰-۵۳۱-۵۳۲-۵۳۳-۵۳۴-۵۳۵-۵۳۶-۵۳۷-۵۳۸-۵۳۹-۵۴۰-۵۴۱-۵۴۲-۵۴۳-۵۴۴-۵۴۵-۵۴۶-۵۴۷-۵۴۸-۵۴۹-۵۵۰-۵۵۱-۵۵۲-۵۵۳-۵۵۴-۵۵۵-۵۵۶-۵۵۷-۵۵۸-۵۵۹-۵۶۰-۵۶۱-۵۶۲-۵۶۳-۵۶۴-۵۶۵-۵۶۶-۵۶۷-۵۶۸-۵۶۹-۵۷۰-۵۷۱-۵۷۲-۵۷۳-۵۷۴-۵۷۵-۵۷۶-۵۷۷-۵۷۸-۵۷۹-۵۸۰-۵۸۱-۵۸۲-۵۸۳-۵۸۴-۵۸۵-۵۸۶-۵۸۷-۵۸۸-۵۸۹-۵۹۰-۵۹۱-۵۹۲-۵۹۳-۵۹۴-۵۹۵-۵۹۶-۵۹۷-۵۹۸-۵۹۹-۶۰۰-۶۰۱-۶۰۲-۶۰۳-۶۰۴-۶۰۵-۶۰۶-۶۰۷-۶۰۸-۶۰۹-۶۱۰-۶۱۱-۶۱۲-۶۱۳-۶۱۴-۶۱۵-۶۱۶-۶۱۷-۶۱۸-۶۱۹-۶۲۰-۶۲۱-۶۲۲-۶۲۳-۶۲۴-۶۲۵-۶۲۶-۶۲۷-۶۲۸-۶۲۹-۶۳۰-۶۳۱-۶۳۲-۶۳۳-۶۳۴-۶۳۵-۶۳۶-۶۳۷-۶۳۸-۶۳۹-۶۴۰-۶۴۱-۶۴۲-۶۴۳-۶۴۴-۶۴۵-۶۴۶-۶۴۷-۶۴۸-۶۴۹-۶۵۰-۶۵۱-۶۵۲-۶۵۳-۶۵۴-۶۵۵-۶۵۶-۶۵۷-۶۵۸-۶۵۹-۶۶۰-۶۶۱-۶۶۲-۶۶۳-۶۶۴-۶۶۵-۶۶۶-۶۶۷-۶۶۸-۶۶۹-۶۷۰-۶۷۱-۶۷۲-۶۷۳-۶۷۴-۶۷۵-۶۷۶-۶۷۷-۶۷۸-۶۷۹-۶۸۰-۶۸۱-۶۸۲-۶۸۳-۶۸۴-۶۸۵-۶۸۶-۶۸۷-۶۸۸-۶۸۹-۶۹۰-۶۹۱-۶۹۲-۶۹۳-۶۹۴-۶۹۵-۶۹۶-۶۹۷-۶۹۸-۶۹۹-۷۰۰-۷۰۱-۷۰۲-۷۰۳-۷۰۴-۷۰۵-۷۰۶-۷۰۷-۷۰۸-۷۰۹-۷۱۰-۷۱۱-۷۱۲-۷۱۳-۷۱۴-۷۱۵-۷۱۶-۷۱۷-۷۱۸-۷۱۹-۷۲۰-۷۲۱-۷۲۲-۷۲۳-۷۲۴-۷۲۵-۷۲۶-۷۲۷-۷۲۸-۷۲۹-۷۳۰-۷۳۱-۷۳۲-۷۳۳-۷۳۴-۷۳۵-۷۳۶-۷۳۷-۷۳۸-۷۳۹-۷۴۰-۷۴۱-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۴-۷۴۵-۷۴۶-۷۴۷-۷۴۸-۷۴۹-۷۵۰-۷۵۱-۷۵۲-۷۵۳-۷۵۴-۷۵۵-۷۵۶-۷۵۷-۷۵۸-۷۵۹-۷۶۰-۷۶۱-۷۶۲-۷۶۳-۷۶۴-۷۶۵-۷۶۶-۷۶۷-۷۶۸-۷۶۹-۷۷۰-۷۷۱-۷۷۲-۷۷۳-۷۷۴-۷۷۵-۷۷۶-۷۷۷-۷۷۸-۷۷۹-۷۸۰-۷۸۱-۷۸۲-۷۸۳-۷۸۴-۷۸۵-۷۸۶-۷۸۷-۷۸۸-۷۸۹-۷۹۰-۷۹۱-۷۹۲-۷۹۳-۷۹۴-۷۹۵-۷۹۶-۷۹۷-۷۹۸-۷۹۹-۸۰۰-۸۰۱-۸۰۲-۸۰۳-۸۰۴-۸۰۵-۸۰۶-۸۰۷-۸۰۸-۸۰۹-۸۱۰-۸۱۱-۸۱۲-۸۱۳-۸۱۴-۸۱۵-۸۱۶-۸۱۷-۸۱۸-۸۱۹-۸۲۰-۸۲۱-۸۲۲-۸۲۳-۸۲۴-۸۲۵-۸۲۶-۸۲۷-۸۲۸-۸۲۹-۸۳۰-۸۳۱-۸۳۲-۸۳۳-۸۳۴-۸۳۵-۸۳۶-۸۳۷-۸۳۸-۸۳۹-۸۴۰-۸۴۱-۸۴۲-۸۴۳-۸۴۴-۸۴۵-۸۴۶-۸۴۷-۸۴۸-۸۴۹-۸۵۰-۸۵۱-۸۵۲-۸۵۳-۸۵۴-۸۵۵-۸۵۶-۸۵۷-۸۵۸-۸۵۹-۸۶۰-۸۶۱-۸۶۲-۸۶۳-۸۶۴-۸۶۵-۸۶۶-۸۶۷-۸۶۸-۸۶۹-۸۷۰-۸۷۱-۸۷۲-۸۷۳-۸۷۴-۸۷۵-۸۷۶-۸۷۷-۸۷۸-۸۷۹-۸۸۰-۸۸۱-۸۸۲-۸۸۳-۸۸۴-۸۸۵-۸۸۶-۸۸۷-۸۸۸-۸۸۹-۸۹۰-۸۹۱-۸۹۲-۸۹۳-۸۹۴-۸۹۵-۸۹۶-۸۹۷-۸۹۸-۸۹۹-۹۰۰-۹۰۱-۹۰۲-۹۰۳-۹۰۴-۹۰۵-۹۰۶-۹۰۷-۹۰۸-۹۰۹-۹۱۰-۹۱۱-۹۱۲-۹۱۳-۹۱۴-۹۱۵-۹۱۶-۹۱۷-۹۱۸-۹۱۹-۹۲۰-۹۲۱-۹۲۲-۹۲۳-۹۲۴-۹۲۵-۹۲۶-۹۲۷-۹۲۸-۹۲۹-۹۳۰-۹۳۱-۹۳۲-۹۳۳-۹۳۴-۹۳۵-۹۳۶-۹۳۷-۹۳۸-۹۳۹-۹۴۰-۹۴۱-۹۴۲-۹۴۳-۹۴۴-۹۴۵-۹۴۶-۹۴۷-۹۴۸-۹۴۹-۹۵۰-۹۵۱-۹۵۲-۹۵۳-۹۵۴-۹۵۵-۹۵۶-۹۵۷-۹۵۸-۹۵۹-۹۶۰-۹۶۱-۹۶۲-۹۶۳-۹۶۴-۹۶۵-۹۶۶-۹۶۷-۹۶۸-۹۶۹-۹۷۰-۹۷۱-۹۷۲-۹۷۳-۹۷۴-۹۷۵-۹۷۶-۹۷۷-۹۷۸-۹۷۹-۹۸۰-۹۸۱-۹۸۲-۹۸۳-۹۸۴-۹۸۵-۹۸۶-۹۸۷-۹۸۸-۹۸۹-۹۹۰-۹۹۱-۹۹۲-۹۹۳-۹۹۴-۹۹۵-۹۹۶-۹۹۷-۹۹۸-۹۹۹-۱۰۰۰-۱۰۰۱-۱۰۰۲-۱۰۰۳-۱۰۰۴-۱۰۰۵-۱۰۰۶-۱۰۰۷-۱۰۰۸-۱۰۰۹-۱۰۱۰-۱۰۱۱-۱۰۱۲-۱۰۱۳-۱۰۱۴-۱۰۱۵-۱۰۱۶-۱۰۱۷-۱۰۱۸-۱۰۱۹-۱۰۲۰-۱۰۲۱-۱۰۲۲-۱۰۲۳-۱۰۲۴-۱۰۲۵-۱۰۲۶-۱۰۲۷-۱۰۲۸-۱۰۲۹-۱۰۳۰-۱۰۳۱-۱۰۳۲-۱۰۳۳-۱۰۳۴-۱۰۳۵-۱۰۳۶-۱۰۳۷-۱۰۳۸-۱۰۳۹-۱۰۴۰-۱۰۴۱-۱۰۴۲-۱۰۴۳-۱۰۴۴-۱۰۴۵-۱۰۴۶-۱۰۴۷-۱۰۴۸-۱۰۴۹-۱۰۵۰-۱۰۵۱-۱۰۵۲-۱۰۵۳-۱۰۵۴-۱۰۵۵-۱۰۵۶-۱۰۵۷-۱۰۵۸-۱۰۵۹-۱۰۶۰-۱۰۶۱-۱۰۶۲-۱۰۶۳-۱۰۶۴-۱۰۶۵-۱۰۶۶-۱۰۶۷-۱۰۶۸-۱۰۶۹-۱۰۷۰-۱۰۷۱-۱۰۷۲-۱۰۷۳-۱۰۷۴-۱۰۷۵-۱۰۷۶-۱۰۷۷-۱۰۷۸-۱۰۷۹-۱۰۸۰-۱۰۸۱-۱۰۸۲-۱۰۸۳-۱۰۸۴-۱۰۸۵-۱۰۸۶-۱۰۸۷-۱۰۸۸-۱۰۸۹-۱۰۹۰-۱۰۹۱-۱۰۹۲-۱۰۹۳-۱۰۹۴-۱۰۹۵-۱۰۹۶-۱۰۹۷-۱۰۹۸-۱۰۹۹-۱۱۰۰-۱۱۰۱-۱۱۰۲-۱۱۰۳-۱۱۰۴-۱۱۰۵-۱۱۰۶-۱۱۰۷-۱۱۰۸-۱۱۰۹-۱۱۱۰-۱۱۱۱-۱۱۱۲-۱۱۱۳-۱۱۱۴-۱۱۱۵-۱۱۱۶-۱۱۱۷-۱۱۱۸-۱۱۱۹-۱۱۲۰-۱۱۲۱-۱۱۲۲-۱۱۲۳-۱۱۲۴-۱۱۲۵-۱۱۲۶-۱۱۲۷-۱۱۲۸-۱۱۲۹-۱۱۳۰-۱۱۳۱-۱۱۳۲-۱۱۳۳-۱۱۳۴-۱۱۳۵-۱۱۳۶-۱۱۳۷-۱۱۳۸-۱۱۳۹-۱۱۴۰-۱۱۴۱-۱۱۴۲-۱۱۴۳-۱۱۴۴-۱۱۴۵-۱۱۴۶-۱۱۴۷-۱۱۴۸-۱۱۴۹-۱۱۵۰-۱۱۵۱-۱۱۵۲-۱۱۵۳-۱۱۵۴-۱۱۵۵-۱۱۵۶-۱۱۵۷-۱۱۵۸-۱۱۵۹-۱۱۶۰-۱۱۶۱-۱۱۶۲-۱۱۶۳-۱۱۶۴-۱۱۶۵-۱۱۶۶-۱۱۶۷-۱۱۶۸-۱۱۶۹-۱۱۷۰-۱۱۷۱-۱۱۷۲-۱۱۷۳-۱۱۷۴-۱۱۷۵-۱۱۷۶-۱۱۷۷-۱۱۷۸-۱۱۷۹-۱۱۸۰-۱۱۸۱-۱۱۸۲-۱۱۸۳-۱۱۸۴-۱۱۸۵-۱۱۸۶-۱۱۸۷-۱۱۸۸-۱۱۸۹-۱۱۹۰-۱۱۹۱-۱۱۹۲-۱۱۹۳-۱۱۹۴-۱۱۹۵-۱۱۹۶-۱۱۹۷-۱۱۹۸-۱۱۹۹-۱۲۰۰-۱۲۰۱-۱۲۰۲-۱۲۰۳-۱۲۰۴-۱۲۰۵-۱۲۰۶-۱۲۰۷-۱۲۰۸-۱۲۰۹-۱۲۱۰-۱۲۱۱-۱۲۱۲-۱۲۱۳-۱۲۱۴-۱۲۱۵-۱۲۱۶-۱۲۱۷-۱۲۱۸-۱۲۱۹-۱۲۲۰-۱۲۲۱-۱۲۲۲-۱۲۲۳-۱۲۲۴-۱۲۲۵-۱۲۲۶-۱۲۲۷-۱۲۲۸-۱۲۲۹-۱۲۳۰-۱۲۳۱-۱۲۳۲-۱۲۳۳-۱۲۳۴-۱۲۳۵-۱۲۳۶-۱۲۳۷-۱۲۳۸-۱۲۳۹-۱۲۴۰-۱۲۴۱-۱۲۴۲-۱۲۴۳-۱۲۴۴-۱۲۴۵-۱۲۴۶-۱۲۴۷-۱۲۴۸-۱۲۴۹-۱۲۵۰-۱۲۵۱-۱۲۵۲-۱۲۵۳-۱۲۵۴-۱۲۵۵-۱۲۵۶-۱۲۵۷-۱۲۵۸-۱۲۵۹-۱۲۶۰-۱۲۶۱-۱۲۶۲-۱۲۶۳-۱۲۶۴-۱۲۶۵-۱۲۶۶-۱۲۶۷-۱۲۶۸-۱۲۶۹-۱۲۷۰-۱۲۷۱-۱۲۷۲-۱۲۷۳-۱۲۷۴-۱۲۷۵-۱۲۷۶-۱۲۷۷-۱۲۷۸-۱۲۷۹-۱۲۸۰-۱۲۸۱-۱۲۸۲-۱۲۸۳-۱۲۸۴-۱۲۸۵-۱۲۸۶-۱۲۸۷-۱۲۸۸-۱۲۸۹-۱۲۹۰-۱۲۹۱-۱۲۹۲-۱۲۹۳-۱۲۹۴-۱۲۹۵-۱۲۹۶-۱۲۹۷-۱۲۹۸-۱۲۹۹-۱۳۰۰-۱۳۰۱-۱۳۰۲-۱۳۰۳-۱۳۰۴-۱۳۰۵-۱۳۰۶-۱۳۰۷-۱۳۰۸-۱۳۰۹-۱۳۱۰-۱۳۱۱-۱۳۱۲-۱۳۱۳-۱۳۱۴-۱۳۱۵-۱۳۱۶-۱۳۱۷-۱۳۱۸-۱۳۱۹-۱۳۲۰-۱۳۲۱-۱۳۲۲-۱۳۲۳-۱۳۲۴-۱۳۲۵-۱۳۲۶-۱۳۲۷-۱۳۲۸-۱۳۲۹-۱۳۳۰-۱۳۳۱-۱۳۳۲-۱۳۳۳-۱۳۳۴-۱۳۳۵-۱۳۳۶-۱۳۳۷-۱۳۳۸-۱۳۳۹-۱۳۴۰-۱۳۴۱-۱۳۴۲-۱۳۴۳-۱۳۴۴-۱۳۴۵-۱۳۴۶-۱۳۴۷-۱۳۴۸-۱۳۴۹-۱۳۵۰-۱۳۵۱-۱۳۵۲-۱۳۵۳-۱۳۵۴-۱۳۵۵-۱۳۵۶-۱۳۵۷-۱۳۵۸-۱۳۵۹-۱۳۶۰-۱۳۶۱-۱۳۶۲-۱۳۶۳-۱۳۶۴-۱۳۶۵-۱۳۶۶-۱۳۶۷-۱۳۶۸-۱۳۶۹-۱۳۷۰-۱۳۷۱-۱۳۷۲-۱۳۷۳-۱۳۷۴-۱۳۷۵-۱۳۷۶-۱۳۷۷-۱۳۷۸-۱۳۷۹-۱۳۸۰-۱۳۸۱-۱۳۸۲-۱۳۸۳-۱۳۸۴-۱۳۸۵-۱۳۸۶-۱۳۸۷-۱۳۸۸-۱۳۸۹-۱۳۹۰-۱۳۹۱-۱۳۹۲-۱۳۹۳-۱۳۹۴-۱۳۹۵-۱۳۹۶-۱۳۹۷-۱۳۹۸-۱۳۹۹-۱۴۰۰-۱۴۰۱-۱۴۰۲-۱۴۰۳-۱۴۰۴-۱۴۰۵-۱۴۰۶-۱۴۰۷-۱۴۰۸-۱۴۰۹-۱۴۱۰-۱۴۱۱-۱۴۱۲-۱۴۱۳-۱۴۱۴-۱۴۱۵-۱۴۱۶-۱۴۱۷-۱۴۱۸-۱۴۱۹-۱۴۲۰-۱۴۲۱-۱۴۲۲-۱۴۲۳-۱۴۲۴-۱۴۲۵-۱۴۲۶-۱۴۲۷-۱۴۲۸-۱۴۲۹-۱۴۳۰-۱۴۳۱-۱۴۳۲-۱۴۳۳-۱۴۳۴-۱۴۳۵-۱۴۳۶-۱۴۳۷-۱۴۳۸-۱۴۳۹-۱۴۴۰-۱۴۴۱-۱۴۴۲-۱۴۴۳-۱۴۴۴-۱۴۴۵-۱۴۴۶-۱۴۴۷-۱۴۴۸-۱۴۴۹-۱۴۵۰-۱۴۵۱-۱۴۵۲-۱۴۵۳-۱۴۵۴-۱۴۵۵-۱۴۵۶-۱۴۵۷-۱۴۵۸-۱۴۵۹-۱۴۶۰-۱۴۶۱-۱۴۶۲-۱۴۶۳-۱۴۶۴-۱۴۶۵-۱۴۶۶-۱۴۶۷-۱۴۶۸-۱۴۶۹-۱۴۷۰-۱۴۷۱-۱۴۷۲-۱۴۷۳-۱۴۷۴-۱۴۷۵-۱۴۷۶-۱۴۷۷-۱۴۷۸-۱۴۷۹-۱۴۸۰-۱۴۸۱-۱۴۸۲-۱۴۸۳-۱۴۸۴-۱۴۸۵-۱۴۸۶-۱۴۸۷-۱۴۸۸-۱۴۸۹-۱۴۹۰-۱۴۹۱-۱۴۹۲-۱۴۹۳-۱۴۹۴-۱۴۹۵-۱۴۹۶-۱۴۹۷-۱۴۹۸-۱۴۹۹-۱۵۰۰-۱۵۰۱-۱۵۰۲-۱۵۰۳-۱۵۰۴-۱۵۰۵-۱۵۰۶-۱۵۰۷-۱۵۰۸-۱۵۰۹-۱۵۱۰-۱۵۱۱-۱۵۱۲-۱۵۱۳-۱۵۱۴-۱۵۱۵-۱۵۱۶-۱۵۱۷-۱۵۱۸-۱۵۱۹-۱۵۲۰-۱۵۲۱-۱۵۲۲-۱۵۲۳-۱۵۲۴-۱۵۲۵-۱۵۲۶-۱۵۲۷-۱۵۲۸-۱۵۲۹-۱۵۳۰-۱۵۳۱-۱۵۳۲-۱۵۳۳-۱۵۳۴-۱۵۳۵-۱۵۳۶-۱۵۳۷-۱۵۳۸-۱۵۳۹-۱۵۴۰-۱۵۴۱-۱۵۴۲-۱۵۴۳-۱۵۴۴-۱۵۴۵-۱۵۴۶-۱۵۴۷-۱۵۴۸-۱۵۴۹-۱۵۵۰-۱۵۵۱-۱۵۵۲-۱۵۵۳-۱۵۵۴-۱۵۵۵-۱۵۵۶-۱۵۵۷-۱۵۵۸-۱۵۵۹-۱۵۶۰-۱۵۶۱-۱۵۶۲-۱۵۶۳-۱۵۶۴-۱۵۶۵-۱۵۶۶-۱۵۶۷-۱۵۶۸-۱۵۶۹-۱۵۷۰-۱۵۷۱-۱۵۷۲-۱۵۷۳-۱۵۷۴-۱۵۷۵-۱۵۷۶-۱۵۷۷-۱۵۷۸-۱۵۷۹-۱۵۸۰-۱۵۸۱-۱۵۸۲-۱۵۸۳-۱۵۸۴-۱۵۸۵-۱۵۸۶-۱۵۸۷-۱۵۸۸-۱۵۸۹-۱۵۹۰-۱۵۹۱-۱۵۹۲-۱۵۹۳-۱۵۹۴-۱۵۹۵-۱۵۹۶-۱۵۹۷-۱۵۹۸-۱۵۹۹-۱۶۰۰-۱۶۰۱-۱۶۰۲-۱۶۰۳-۱۶۰۴-۱۶۰۵-۱۶۰۶-۱۶۰۷-۱۶۰۸-۱۶۰۹-۱۶۱۰-۱۶۱۱-۱۶۱۲-۱۶۱۳-۱۶۱۴-۱۶۱۵-۱۶۱۶-۱۶۱۷-۱۶۱۸-۱۶۱۹-۱۶۲۰-۱۶۲۱-۱۶۲۲-۱۶۲۳-۱۶۲۴-۱۶۲۵-۱۶۲۶-۱۶۲۷-۱۶۲۸-۱۶۲۹-۱۶۳۰-۱۶۳۱-۱۶

سامنے اس حیثیت سے پیش کریں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی فلسفہ، ہر مفسر کی تاویل ہر منظم کا الہیاتی عقیدہ اور ہر فقہیہ کا قانونی اجتہاد، جس نے مجموعہ کتب مقدسہ راہبیل، میں جگہ پائی۔ اللہ کا قول (Word of God) بن کر رہ گیا۔ اس پر ایمان لانا فرض ہو گیا۔ اور اس سے پھرنے کے معنی دین سے پھرنے کے ہو گئے۔

ہماری تحقیق یہ ہے کہ عہد عتیق (Old Testament) کی کتب خمسہ (Pentateuch) اصل توراہ نہیں ہیں بلکہ اصل توراہ دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ اس نظریہ کی تائید خود عہد عتیق سے ہوتی ہے۔ اس سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں حضرت یسوع (یعنی یوشع) کی مدد سے توراہ کو مرتب کر کے ایک صندوق میں رکھوا دیا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد چھٹی صدی ق م میں جب بخت نصر نے بیت المقدس کو آگ لگا دی تو وہ مقدس صندوق ان تمام کتابوں سمیت جل گیا جو حضرت موسیٰ کے بعد مرتب ہوئے تھے۔ اس تباہی کے دو ڈھائی سو برس بعد حضرت عزیر نے خود راہبیل کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے کابنوں اور لویوں کے ساتھ مل کر آسمانی الہام سے اس کتاب کو از سر نو مرتب کیا۔ مگر حادثہ زمانہ نے اس نئے نسخے کو بھی اپنی اصل صورت میں باقی نہ رہنے دیا۔ سکندر اعظم کی عالمگیر فتوحات کا سیلاب جب یونانی حکومت کے ساتھ علوم و ادب کو لے کر مشرق اوسط پر پھیل گیا تو سنہ ۳۰۰ ق م میں توراہ کی تمام کتابیں یونانی زبان میں منتقل کر دی گئیں، اور رفتہ رفتہ اصل عبرانی نسخہ متروک ہو کر یونانی ترجمہ رائج ہو گیا۔ پس آج جو توراہ ہمارے سامنے ہے اس کی مندرجہ ذیل شرح حضرت موسیٰ تک نہیں پہنچی مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ تورات میں اصل توراہ کا کوئی جزو بھی شامل نہیں ہے، یا یہ سراسر جعلی ہے۔ دراصل جو کچھ ہم کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اس تورات میں اصل

مہر لفظوں سے کھلتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں (نومبر ۳۲) یعنی ظالم صرف ہی تم نہیں کرتے کہ ختم سے پہنچتے ہیں، دشمنوں سے کھلتے ہیں، ہندرانے ٹوٹتے ہیں۔ ایسے ایسے مذہبی ضابطے اور مراسم ایجاد کرنے ہیں جس کی وجہ سے لوگ اپنی نجات ان سے خریدیں، اور ان کا مذہب دنیا اور شادی و غم کچھ بھی ان کو کھلا سے بغیر ہو سکے۔ اور وہ اپنی قیمتیں بنانے اور بگاڑنے کے ٹھیکیداران کو کھلیں۔ بلکہ مزید برآں اپنی انہی اغراض کی خاطر یہ حضرات حلقہ خدا کو گراہیوں کے چکر میں گھومنا شروع رکھتے ہیں اور کبھی کوئی دعوت حق اصلاح کے لیے اٹھتی ہے تو سب سے پہلے ہی اپنی عالمانہ ذمہ داریوں اور بگاڑوں کے حربے سے لے کر اس کا راستہ روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

لے استثناء ۱۳۱، ۲۳۱، ۲۴۰ - ۲۴۰

لے ایڈیٹورس، جز دوم، باب چہارم



خروج، احوال، گفتی، استثناء، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت پر مشتمل ہیں اور اس سیرت ہی میں تاریخ نزول کی ترتیب کے مطابق تواریخ کی وہ آیات بھی حسب موقع درج کر دی گئی ہیں جو عزرا اور ان کے مددگار بزرگان کو دستیاب ہو سکیں ہیں۔ اب تواریخ ان متشتر اجزائی کا نام ہے جو سیرت موسیٰ کے اندر پھیرے ہوئے ہیں جو انہیں صحت اس علامت سے پہچان سکتے ہیں کہ اس تاریخی بیان کے دوران جہاں کہیں سیرت موسیٰ کا مصنفت کہتا ہے وہ فعلیٰ موسیٰ سے یہ فرمایا یا "موسیٰ نے کہا خداوند ہمارا اقرار کیا ہے" وہاں سے تواریخ کا ایک جز شروع ہوتا ہے اور جہاں پھر سیرت کی تصریح شروع ہوتی ہے وہاں وہ جز ختم ہو جاتا ہے۔ بیچ میں جہاں کہیں کوئی چیز تبدیل کے مصنفت نے تفسیر و تشریح کے طور پر لکھی ہے وہاں ایک عام آدمی کے لیے یہ تیز کرنا محنت مشکل ہے کہ آیا یہ اصل تواریخ کا حصہ ہے یا شرح و تفسیر! ۱۹۹۷ھ

لہذا یہی نوعیت شدت و تواریخ پر توجہ کا نا اہل بنی، مگر تواریخ اس سے ہے کہ ہمیں شک میں یہودی تواریخ کو لانتے تھے اس شکل میں بھی وہ نہ تو اس کی اثامت کے لیے کر شاں تھے اور نہ ہی انت واری سے اس کے مندرجہ احکام ہی کی تبلیغ و تفسیر کرتے تھے۔ اسی لیے تواریخ نے اعتراض کیا تھا کہ کہتم علیٰ اشیاء یوحنا فیما اشقواہ ۱۹۹۷ھ

# بعثتِ خاتم النبیین کے وقت یہود کے مذہبی معاشقہ کی حالت

عرب کے یہودیوں کی مستند تاریخ موجود نہیں

عرب کے یہودیوں کی کوئی مستند تاریخ دنیا میں موجود نہیں ہے۔ انہوں نے خود اپنی کوئی ایسی تحریر کسی کتاب یا کتبے کی شکل میں نہیں چھوڑی ہے جس سے ان کے ماضی پر کوئی روشنی پڑ سکے۔ اور عرب سے باہر کے یہودی مؤرخین و مصنفین نے ان کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جزیرۃ العرب میں اگر وہ اپنے بقعہ اپنے ملت سے بچھڑ گئے تھے۔ اور دنیا کے یہودی سب سے ان کو اپنیوں میں شمار ہی نہیں کرتے تھے، کیونکہ انہوں نے عبرانی تہذیب، زبان، حتیٰ کہ نام تک چھوڑ کر عربیت اختیار کر لی تھی۔ حجاز کے آثار قدیمہ میں جو کتابت ملے ہیں ان میں پہلی صدی عیسوی سے قبل یہودیوں کا کوئی نشان نہیں ملتا، اور ان میں بھی صرف چند یہودی نام پائے جاتے ہیں۔ اس لیے یہود عرب کی تاریخ کا بیشتر انحصار ان زبانی روایات پر ہے جو اہل عرب میں مشہور تھیں، اور ان میں اچھا خاصہ حصہ خود یہودیوں کا اپنا پھیلا یا ہوا تھا۔

حجاز کے یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ سب سے پہلے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آخری عہد میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اس کا قصہ وہ یہ بیان کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک لشکر شہرب کے علاقے سے نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ اس قوم کے کسی شخص کو زندہ نہ چھوڑیں۔ بنی اسرائیل کے اس لشکر نے یہاں آکر فرمان نبی کی تعمیل کی مگر عمالتقہ کے بادشاہ کا ایک لڑکا بڑا خوبصورت جوان تھا، اسے انہوں نے زندہ رہنے دیا اور اس کو ساتھ لیے ہوئے فلسطین واپس پہنچے۔ اس وقت حضرت موسیٰ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے جانشینوں نے اس بات پر سخت اعتراض کیا کہ ایک عملیاتی کو زندہ چھوڑ دینا نبی کے فرمان اور شہربیت موسیٰ کے احکام کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اس بنا پر انہوں نے اس لشکر کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا اور اسے مجبوراً واپس شہرب آکر رہیں جس جانا پڑا (کتاب الاغانی، ج ۱، ص ۱۹، ص ۱۹۴)۔ اس طرح یہودی گریا اس بات کے مدعی تھے کہ وہ ۱۲ سو برس قبل مسیح سے یہاں آباد ہیں لیکن درحقیقت اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ اور اغلب یہ سب کہ یہودیوں نے یہ افسانہ اس لیے

گھرا تھا کہ اہل عرب پر اپنے قدیم الاصل اور عالی العقب ہونے کی دھونس جاتیں۔

دوسری یہودی ہجرت، خود یہودیوں کی اپنی روایت کے مطابق سترہ صد قبل مسیح میں بادشاہ تخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کر کے یہودیوں کو دنیا بھر میں تشریف بٹھا کر دیا تھا۔ عرب نے یہودیوں کو اس زمانے میں ہمارے متعدد قبائل آکر وادی القریٰ، تیمار، اور شرب میں آباد ہو گئے تھے۔ مفتوح البلدان (البلدان) لیکن اس کا بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ بعد میں کہ اس سے بھی وہ اپنی قدامت ثابت کرنا چاہتے ہوئے درحقیقت جو بات ثابت ہے وہ یہ ہے کہ جب سترہ صد میں رومیوں نے فلسطین میں یہودیوں کا قتل عام کیا پھر سترہ صد میں انہیں اس سرزمین سے نکال باہر کیا۔ اُس دور میں بہت سے یہودی قبائل بھاگ کر حجاز میں پناہ گزین ہوئے تھے، کیونکہ یہ علاقہ فلسطین کے جنوب میں متصل ہی واقع تھا۔ یہاں آکر انہوں نے جہاں جہاں چلے اور سرسبز مقامات دیکھے وہاں ٹھہر گئے اور پھر رفتہ رفتہ اپنی جوڑ جوڑ اور رسوخواری کی وجہ سے ان پر قبضہ جمایا۔ ایلہ، بنتنا، تبرک، تیمار، وادی القریٰ، فذک، اور خیبر پر ان کا تسلط اسی دور میں خاتم ہوا۔ اور بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی تہمل، اور بنی قینقاع بھی اسی دور میں آکر شرب پر قابض ہوئے۔

شرب میں آباد ہونے والے قبائل میں سے بنی نضیر اور بنی قریظہ زیادہ ممتاز تھے، کیونکہ وہ کاہنوں (Priests یا Kohens) کے طبقہ میں سے تھے۔ انہیں یہودیوں میں عالی نسب مانا جاتا تھا اور ان کو اپنی ملت میں غریبی ریاست حاصل تھی۔ یہ لوگ جب مدینہ میں آکر آباد ہوئے اس وقت کچھ دوسرے عرب قبائل یہاں رہتے تھے جن کو انہوں نے دبا لیا اور عملاً اس سرسبز و شاداب مقام کے مالک بن بیٹھے۔ اس کے تقریباً تین صدی بعد سترہ صد یا سترہ صد میں بن کے اس سیلاب عظیم کا واقعہ پیش آیا جس کا ذکر سورہ سبا کے دوسرے کونچ میں آیا ہے۔ اس سیلاب کی وجہ سے قوم سبا کے مختلف قبیلے یمن سے نکل کر عرب کے اطراف میں پھیل جانے پر مجبور ہو گئے۔ ان میں سے غسانی شام میں، نخی چہرہ (عراق) میں، بنی خزاعہ حیدہ و مکہ کے درمیان اور اوس و خزرج شہر میں جا کر آباد ہوئے۔ شرب پر چونکہ یہودی چھاتے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے اول اول اوس و خزرج کی دال نہ گلنے دی اور یہ دونوں عرب قبیلے چار و ناچار بخیز مینوں پر بس گئے۔ جہاں ان کو قوت لایموت بھی مشکل سے حاصل ہوتا تھا، آخر کار ان کے سرداروں میں سے ایک شخص اپنے غسانی بھائیوں سے بددماغی کے لیے شام گیا اور وہاں سے ایک لشکر لاکر اس نے یہودیوں کا زور ٹوڑ دیا۔ اس طرح اوس و خزرج کو شرب پر اور اعلیٰ حاصل ہو گیا۔ یہودیوں کے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ شہر کے باہر جا کر بس پر مجبور ہو گئے۔ تیسرے قبیلے بنی قینقاع کی چونکہ ان دونوں یہودی قبیلوں سے ان بن تھی، اس لیے وہ شہر کے اندر ہی مقیم رہا۔ مگر یہاں رہنے کے لیے اسے قبیلہ خزرج کی خواہش پڑی۔ اور اس کے مقابلہ میں بنی نضیر و بنی قریظہ نے اوس کی پناہ لی، تاکہ اطراف شرب میں امن کے ساتھ

رہ سکیں۔

## آنحضرتؐ کی بعثت کے وقت یہودیوں کی پوزیشن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح آوری سے پہلے آغاز ہجرت تک حجاز میں عربوں اور شہر میں خصوصاً یہودیوں کی پوزیشن کے نمایاں خدوخال یہ تھے:

زبان، لباس، تہذیب و تمدن، ہر لحاظ سے انہوں نے پوری عربیت کا رنگ اختیار کر لیا تھا حتیٰ کہ ان کی غالب اکثریت کے نام تک عربی ہو گئے تھے۔ بارہ یہودی قبیلے جو حجاز میں آباد ہوئے تھے، ان میں سے بنی نضیر کے سوا کسی قبیلے کا نام عبرانی نہ تھا۔ ان کے چند گئے چٹھے علماء کے سوا کوئی عبرانی جانتا تک نہ تھا۔ زمانہ جاہلیت کے یہودی شاعروں کا جو کلام ہمیں ملتا ہے ان کی زبان، اور خیالات اور مضامین میں شعرا سے عرب سے الگ کوئی امتیازی نشان نہیں پائی جاتی جو انہیں ممتاز کرتی ہو۔ ان کے اور عربوں کے درمیان شادی بیابان کے تعلق سے قائم ہو چکے تھے۔ درحقیقت ان میں اور عام عربوں میں دین کے سوا کوئی فرق باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود وہ عربوں میں غیب بالکل نہ ہوتے تھے اور انہوں نے شدت کے ساتھ اپنی یہودی شخصیت برقرار رکھی تھی۔ یہ ظاہری عربیت انہوں نے صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ اس کے بغیر وہ عرب میں رہ نہ سکتے تھے۔

ان کی اس عربیت کی وجہ سے مغربی مستشرقین کو یہ دعو کا ہوا ہے کہ شاید یہ بنی اسرائیل نہ تھے بلکہ یہودی عربوں کے قبول کرنے والے عرب تھے یا کم از کم ان کی اکثریت عرب یہودیوں پر مشتمل تھی۔ لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا کہ یہودیوں نے حجاز میں کبھی کوئی تبلیغی سرگرمی دکھائی ہو۔ یہاں کے علماء نصرانی یا دیوبند اور مشنریوں کی طرح اہل عرب کو دین یہود کی طرف دعوت دیتے ہوں۔ اس کے برعکس ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اندر اسرائیلیت کا شدید تعصب اور نسلی فخر و غرور پایا جاتا تھا، اہل عرب کو وہ اُمتی (Priests Gentiles) کہتے تھے جس کے معنی صرف ان طرح کے نہیں بلکہ وحشی اور جاہل کے تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان اُمیوں کو وہ انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں جو اسرائیلیوں کے لیے ہیں اور ان کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے مار کھانا اسرائیلیوں کے لیے حلال اور طیب ہے۔ سردارانِ عرب کے ماسوا، عام عربوں کو وہ اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ ان کو دین یہود میں داخل کر کے برابر کا درجہ دے دیں۔ تاریخی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، نہ روایات عرب میں ایسی کوئی شہادت ملتی ہے کہ کسی عرب قبیلے یا کسی بڑے خاندان نے یہودیت قبول کی ہو۔ البتہ بعض افراد کا ذکر ضرور ملتا ہے جو یہودی ہو گئے تھے۔ ویسے بھی یہودیوں کو تبلیغ دین کے بجائے صرف اپنے کاروبار سے دلچسپی تھی۔ اسی لیے حجاز میں یہودیت ایک دین کی حیثیت سے نہیں پھیلی بلکہ محض چند اسرائیلی قبیلوں کا سرمایہ فخر و ناز ہی بنی رہی۔ البتہ یہودی علماء نے تعویذ گنڈوں اور فال گیری اور جادوگری کا کاروبار خوب چمکا رکھا تھا جس کی وجہ سے عربوں پر ان کے "علم" اور "علم" کی دھاک بھٹی جاتی تھی۔

## ان کی معاشی پوزیشن

معاشی حیثیت سے ان کی پوزیشن عرب قبائل کی نسبت زیادہ مضبوط تھی۔ چونکہ وہ فلسطین و شام کے زیادہ مستقر علاقوں سے آئے تھے اس لیے وہ بہت سے ایسے فنون جانتے تھے جو اہل عرب میں رائج نہ تھے۔ اور باہر کی دنیا سے ان کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ ان وجوہ سے شرب اور بالائی حجاز میں غلے کی درآمد اور یہاں سے پھولوں کی برآمد ان کے ہاتھ میں آگئی تھی۔ مرغ بانی اور ماہی گیری پر بھی زیادہ تر ان ہی کا قبضہ تھا۔ پارچہ بانی کا کام بھی انہی کے ہاں ہوتا تھا۔ جگہ جگہ سے غلے بھی انہوں نے قائم کر رکھے تھے جہاں شام سے شراب لاکر فروخت کی جاتی تھی۔ بنی قریظہ زیادہ تر نمنا اور لوہا اور زردت سازی کا پیشہ کرتے تھے۔ اس سارے رنج و بہا میں یہ یہودی بے تھاکا منافع خوری کرتے تھے لیکن ان کا سب سے بڑا کاروبار شہد خوراری کا تھا جس کے حال میں انہوں نے گروہ پیش کی عرب آبادیوں کو پھانس رکھا تھا، اور خاص طور پر عرب قبائل کے شیوخ اور سردار، جنہیں قرض لے لے کر ٹھاٹھ جمانے اور سبھی بھارنے کی بیماری لگی ہوتی تھی، ان کے پھندے میں پھنسنے جوتے تھے۔ یہ بھاری شرح سود پر قرض دیتے اور پھر سود و سود کا چکر چلاتے جس کی گرفت میں آجانے کے بعد شکل ہی سے کوئی نکل سکتا تھا۔ اس طرح انہوں نے عربوں کو معاشی حیثیت سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ مگر اس کا فطری نتیجہ یہ بھی تھا کہ عربوں میں بالعموم ان کے خلاف ایک گہری نفرت پائی جاتی تھی اُن کے تجارتی اور مالی معاملات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ عربوں میں سے کسی کے دوست بن کر کسی سے نہ لگاویں اور نہ ان کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لیں لیکن دوسری طرف اُن کے معاوضی کا تقاضا یہ بھی تھا کہ عربوں کو باہم متحد نہ ہونے دیں اور انہیں ایک دوسرے سے لڑانے رہیں کیوں کہ وہ اس بات کو جانتے تھے کہ جب بھی عرب قبیلے باہم متحد ہوتے، وہ انہیں اُن بڑی بڑی جماعتوں، باغات اور سرسبز زمینوں پر قابض نہ رہنے دیں گے جو انہوں نے اپنی منافع خوری اور سود خوری سے پیدا کی تھیں۔ مزید یہاں اپنی حفاظت کے لیے ان کے ہر قبیلے کو کسی نہ کسی طاقتور عرب قبیلے سے حلیفانہ تعلقات بھی قائم کرنے پڑتے تھے تاکہ کوئی دوسرا زبردست قبیلہ ان پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ اس بنا پر انہیں نہ صرف عرب قبائل کی باہمی لڑائیوں میں حصہ لینا پڑتا تھا، بلکہ ایسا وقت ایک یہودی قبیلہ اپنے حلیف عرب قبیلے کے ساتھ مل کر کسی دوسرے یہودی قبیلے کے خلاف جنگ آزما ہوجاتا تھا جس کے حلیفانہ تعلقات قریبی مخالفت کے ساتھ ہوتے تھے۔ شرب میں بنی قریظہ اور بنی نضیر اوس کے حلیف تھے۔ اور بنی قریظہ خراج کے ہجرت سے تھوڑی مدت پہلے اوس اور خراج کے درمیان جو خوریز لڑائی باعث کے مقام پر ہوتی تھی اس میں یہ اپنے حلیفوں کے ساتھ مل کر ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے تھے۔

## ندبیت کا نمائشی ڈھانچہ

یہ لوگ توحید، رسالت، وحی، آخرت اور ملائکہ کے قائل تھے، اُس عناوینہ شرعی کو تسلیم کرتے تھے جو خدا کی



طرف سے اُن کے نبی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا، اور اصولاً ان کا دین وہی اسلام تھا جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے لیکن صدیوں کے انحطاط نے اُن کو اصل دین سے بہت دُور ہٹا دیا تھا۔ ان کے عقائد میں بہت سے غیر اسلامی عناصر کی آمیزش ہو گئی تھی جن کے لیے توراہ میں کوئی سند موجود نہ تھی۔ ان کی عملی زندگی میں کثرت ایسے نجوم اور طریقے رواج پا گئے تھے جو اصل دین میں نہ تھے اور جن کے لیے توراہ میں کوئی ثبوت نہ تھا خود توراہ کو انہوں نے انسانی کلام کے اندر خلط ملط کر دیا تھا اور خدا کا کلام جس حد تک لفظاً یا معنی محفوظ تھا اس کو بھی انہوں نے اپنی من مانی تاویلوں اور تفسیروں سے مسخ کر رکھا تھا۔ دین کی حقیقی نوح ان میں سے نکل چکی تھی اور ظاہری مذہبیت کا محض ایک بے جان ڈھانچہ باقی تھا جس کو وہ سینہ سے لگاتے ہوئے تھے۔ اُن کے علماء اور مشائخ، اُن کے سردارانِ قوما اور اُن کے عوام، سب کی اعتقادی، اخلاقی اور عملی حالت بگڑ گئی تھی اور اپنے بگاڑ سے ان کو ایسی محبت تھی کہ وہ کسی اصلاح کو قبول کرنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ صدیوں سے مسلسل ایسا ہو رہا تھا کہ جب کوئی اللہ کا بندہ انہیں دین کا سیدھا راستہ بتانے آتا تو وہ اسے اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے اور ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرتے تھے کہ وہ کسی طرح اصلاح میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ لوگ حقیقت میں بگڑے ہوئے مسلمان تھے جن کے ہاں بدعتوں اور تحریفوں، موشگافیوں اور فرقہ بندیوں، استعمار گیری و مغز افگنی، خدا فراموشی و دنیا پرستی کی بدولت انحطاط اس حد کو پہنچ چکا تھا کہ وہ اپنا اصل نام ”مسلم“ تک بھٹول گئے تھے، محض ”یہودی“ بن کر رہ گئے تھے اور اللہ کے دین کو انہوں نے محض نسل اسرائیل کی آبائی وراثت بنا کر رکھ دیا تھا۔ ۱۹۴۹ء

## نذہبی اور نسلی عصبیت

یہودیوں کا خیال تھا کہ امانت اور وراثت کا لحاظ صرف یہودیوں سے معاملہ کرنے میں ہونا چاہیے غیر یہودیوں کا مال اگر مار لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ محض یہودی عوام کا جاہلانہ خیال ہی نہیں تھا۔ دراصل یہودیت کا پورا نذہبی نظام ایسا بنا دیا گیا تھا کہ وہ اخلاقی احکام میں اسرائیل اور غیر اسرائیلی کے درمیان قدم قدم پر تفریق کرتا ہے۔ ایک ہی چیز اسرائیل کے ساتھ کی جائے تو ناجائز ہے مگر اسی کا ارتکاب غیر اسرائیلی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے ایک ہی چیز اسرائیلی کے لیے حقیقی ہے مگر غیر اسرائیلی کے لیے حقیقی نہیں ہے۔ مثلاً بائبل میں حکم ہے کہ جو قرض ایک شخص نے دوسرے کو دیا ہو وہ سات سات سال گزر جانے پر ضرور معاف کر دیا جائے مگر یہودیوں سے تو اس کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ (دستخط ۱۵: ۲۳)۔ ایک اور جگہ سُود لینے سے منع کیا گیا ہے، مگر یہودیوں کو سُود پر قرض دے تو

۱۔ اس وقت حضرت موسیٰ کو گزرے ہوئے تقریباً انیس صدیاں گزر چکی تھیں۔ اسرائیلی تاریخ کے حساب سے حضرت موسیٰ

نے سنہ ۱۲۵۰ قبل مسیح میں وفات پائی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سنہ ۵۷۰ قبل مسیح میں منسوب نبوت پر سرفراز ہوئے۔ (مؤلف، محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ)

و سے باپ بھائی کو سود پر قرض نہ دینا۔ (اشعنا، ۲۳: ۲۰) ایک اور جگہ لکھا ہے: اگر کوئی شخص اپنے اسرائیلی بھائیوں میں سے کسی کو غلام بنانے یا بیچنے کی نیت سے چراتا ہوا پکڑا جائے تو وہ چور مار ڈالا جائے (اشعنا، ۲۴: ۷)۔

تو وہ میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کرے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ گری ٹری چیز مل جاتے تو اسے دیکھنا چاہیے کہ گرد و پیش کی آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیے، غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیے۔ ربی اشعایل کہتا ہے کہ اگر امی اور اسرائیلی کا مقدمہ قاضی کے پاس آئے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے مذہبی بھائی کو جتوا سکتا ہے تو اس کے مطابق جتو اسے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ اور اگر امیوں کے قانون کے مطابق جتوا سکتا ہے تو اس کے تحت جتو اسے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ اور اگر دونوں قانون ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس جیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہو کرے۔ ربی شموئیل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

### اصولوں سے انحراف، جزئیات میں انہماک

علامہ بیہود شریعت کے چھوٹے چھوٹے احکام کا تو بڑا اہتمام کرتے تھے بلکہ ان کا سارا وقت ان جزئیات کی ناپ تول ہی میں گزرتا تھا جو ان کے فقیر ہوں نے استنباط و استنباط کر کے نکالے تھے، مگر شرک ان کی نگاہ میں ایسا ہنگام تھا کہ نہ خود اس سے بچنے کی فکر کرتے تھے، نہ اپنی قوم کو مشرکانہ خیالات اور اعمال سے بچانے کی کوشش کرتے تھے، اور نہ مشرکین کی دوستی اور حمایت ہی میرا نہیں کوئی مضائقہ نظر آتا تھا۔

### اکابر کے لیے شریعت میں تحریف

یہود اپنے مذہبی احکام سے جس طرح روگردانی کیے ہوئے تھے اس کی ایک مثال وہ مقدمہ ہے جو ضبر کے یہودی فیصلہ کرانے کی غرض سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لاتے تھے۔ مقدمہ یہ تھا کہ۔ ضبر کے معتز بن ہبزی نامہ دونوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلق پایا گیا۔ تو رات کی زور سے ان کی سزا عزم تھی، یعنی ایک کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے (اشعنا، باب ۲۲ آیت ۲۳-۲۴)۔ لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہیں چاہتے تھے ان نے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بیخ بنایا جائے۔ اگر وہ ریم کے سوا کوئی اور حکم دین تو قبول کر لیا جائے اور ریم ہی حکم دین تو نہ قبول کیا جائے۔ چنانچہ مقدمہ آپ کے سامنے لایا گیا۔ آپ نے جج کا حکم دیا۔ انہوں نے اس حکم کو ماتھے سے انکار کیا۔ اس پر آپ نے پوچھا تمہارے مذہب میں اس کی کیا سزا ہے؟ انہوں نے کہا کوڑے مارنا اور منہ کالا کر کے گدھے پر سوار کرنا۔ آپ نے ان کے علماء کو قسم دے کر ان سے پوچھا کیا تو رات میں شادی شدہ زانی اور زانیہ کی یہی سزا ہے؟ انہوں نے پھر وہی ٹھٹھا جواب دیا۔ لیکن

ان میں سے ایک شخص ابن صواریا جو خود یہودیوں کے بیان کے مطابق اپنے وقت میں توراہ کا سب سے بڑا عالم تھا، خاموش رہا۔ آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ خدا کی قسم دے کر تو چھپتا ہوں جس نے تم لوگوں کو فرعون سے بچایا اور طور پر تمہیں شریعت عطا کی، کیا واقعی توراہ میں زنا کی سزا یہی لکھی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ”اگر آپ مجھے ایسی بھاری قسم نہ دیتے تو میں نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ زنا کی سزا تو رجم ہی ہے مگر ہمارے ہاں جب زنا کی کثرت ہوتی تو ہمارے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بڑے لوگ زنا کرتے تو انہیں چھوڑ دیا جاتا اور چھوٹے لوگوں سے یہی حرکت سرزد ہوتی تو انہیں گم کوڑیا جاتا۔ پھر جب اس سے عوام میں ناراضی پیدا ہونے لگی تو ہم نے توراہ کے قانون کو بدل کر یہ قاعدہ بنا لیا کہ زانی اور زانیہ کو کوڑے لگائے جائیں اور انہیں منہ کالا کر کے گدھے پر اٹے منہ سوار کیا جائے“ ۵۲

### حلت و حرمت کے شرعی احکام میں رد و بدل

اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور آپ اپنے شارع بن بیٹھے تو انہوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی موٹنگائیوں سے خود حرام کر لیا۔ ان اشیاء میں ایک تو ناخن والے جانور ہیں یعنی شتر مرغ، تاز، بنا وغیرہ۔ دوسرے گائے اور بکری کی چربی۔ باقیہ میں ان دونوں قسم کی حرمتوں کو احکام توراہ میں داخل کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ چیزیں توراہ میں حرام نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد حرام ہوئی ہیں اور تاریخ بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہودی شریعت کی تدوین دوسری صدی عیسوی کے آخر میں ربی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہوئی ہے۔ ۵۳

آنحضرت کے متعلق یہود کا نام عقول روتہ

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَمَّا جَاءَهُمْ بَيِّنَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ عَصَوْا اللَّهَ وَعَصَوْا رُسُلَهُ فَكَلَّمْنَا بَعْضَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ (البقرہ آیت ۸۹)

اور اب جو آیا۔ کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے، اس کے ساتھ ان کا کیا کرتا رہے؟ باوجودیکہ وہ اس کتاب کی تصدیق کرتے ہیں، مگر جب وہ چیز آگئی جسے وہ پہچان لیں گے تو انہوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔

نبی صل اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی بے چینی کے ساتھ اس نبی کے منتظر تھے جس کی بعثت کی پیشین گوئی یہ پیشین گوئیاں اس وجہ سے عیسائیوں کی فصل میں بیان کی گئی ہیں کہ معرفت کی بخشوں میں تورات اور انجیل کی پیشین گوئیاں باہم درگزر ہو رہی ہیں۔

ان کے انبیاء و نبی کی تھیں۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار کا قلب مٹے اور پھر ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خود اہل مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدی سے پہلے ہی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی امید پر جیا کرتے تھے اور ان کا آتے دن کا کلیہ کلام ہی تھا کہ ”اچھا، اب تو جس جس کا چاہے ہم پر ظلم کرے جب وہ نبی آئے گا تو ہم ان سب ظالموں کو دیکھیں گے۔“ اہل مدینہ یہ باتیں سننے ہوئے تھے، اسی لیے جب انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا کہیں یہ یہودی تم سے باہر نہ آئے۔ چلو پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں۔ مگر ان کے پیسے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالفت بن گئے۔

اور یہ جو فرمایا کہ وہ اس کو پہچان بھی گئے، تو اس کے متعدد وثیقت اسی زمانے میں مل گئے تھے۔ سب سے زیادہ مغنیر شہادت اتم المؤمنین حضرت سفیہ کی ہے جو خود ایک بڑے یہودی عالم کی بیٹی اور دوسرے عالم کی بھتیجی تھیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینے تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا دونوں آپ سے ملنے گئے۔ بڑی دیر تک آپ سے گفتگو کی۔ پھر جب گھر واپس آئے تو میں نے اپنے کانوں سے ان دونوں کو یہ گفتگو کرتے سنا:

چچا: کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں دی گئی ہیں؟

والد: خدا کی قسم ہاں۔

چچا: کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

والد: ہاں

چچا: پھر کیا ارادہ ہے؟

والد: جب تک جان میں جان ہے اس کی مخالفت کروں گا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔

داہن پنہام۔ جلد دوم، صفحہ ۱۶۵، طبع جدید ۱۳۵۲ھ

یہودی کی معاندانہ قلمبندی پر درازیاں

اہل عرب بالعموم ناخواندہ لوگ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں میں ویسے بھی تعلیم کا پورا پورا زیادہ تھا، اور انفرادی طور پر ان میں ایسے ایسے جلیل القدر علماء پاتے جاتے تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوتی تھی۔ اس وجہ سے یہودیوں کا عربوں پر علمی رعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علماء اور دانشمندانے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان جما کر اور اپنی جھانڈ بھونک اور تعویذ گنڈوں کا کاروبار چلا کر اس رعب کو اور بھی بڑا گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ اہل مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے، کیونکہ ان کے آس پاس بڑے

بڑے یہودی قبائل آباد تھے، رات دن کا ان سے میل جول تھا، اور اس میل جول میں وہ ان سے اسی طرح شدت کے ساتھ متاثر تھے جس طرح ایک ان پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدن اور زیادہ نمایاں مذہبی شخصیت رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ان حالات میں حبیب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی شہ و رع کی توفیق دتی بابت بھی کہ ان پڑھ عرب اہل کتاب یہودیوں سے جا کر پوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں اور ایک کتاب کو مانتے ہیں، یہ ہیں تاہم کہ یہ صاحب جو ہمارے اندر نبوت کا دعویٰ لے کر آئے ہیں ان کے متعلق اور ان کی تعلیم کے متعلق آپ کو کیا راستے ہے۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم دیتے تشریف لاتے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہودی علماء کے پاس جا جا کر یہی بات پوچھتے تھے مگر ان علماء کے لوگوں کو کبھی صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں غلط ہے، یا انبیاء اور کتب آسمانی اور ملائکہ اور آخرت کے بارے میں جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس میں کوئی غلطی ہے، یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے، لیکن وہ صاف اس حقیقت کا اعتراف بھی کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح ہے۔ وہ نہ سچائی کی کھلی کھلی تردید کر سکتے تھے نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ ہر سائل کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف، آپ کی جماعت کے خلاف اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی دوسوسہ ڈال دیتے تھے، کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے تھے، کوئی ایسا شوشرہ چھوڑ دیتے تھے جس سے لوگ تسکوک و شبہات میں پڑ جائیں اور طرح طرح کے الجھن میں ڈال دینے والے سوالات چھیڑ دیتے تھے تاکہ لوگ ان میں خود بھی الجھیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروں کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔ ان کا یہی رویہ تھا جس کی بنا پر ان سے سورہہ بقرہ آیت ۴۲ میں فرمایا گیا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو، نہ جھوٹے پروپیگنڈے اور نہ میرا نہ شبہات و اعتراضات سے حق کو دبائے اور چھپانے کی کوشش نہ کرو، اور حق و باطل کو خلط ملط کر کے دنیا کو دھوکہ نہ دو۔

یہ یہودیوں کی شرانگیزی کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ انہی کی دسیسہ کاریوں سے اسلامی جماعت میں منافقین پیدا ہوتے پھر انہوں نے حضور کے خلاف ہر اہم موقع پر کوئی نہ کوئی شرارت اٹھائی، آپ کے قتل کے لیے بار بار کوششیں کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جنگ کے فیصلہ کن لمحوں میں تباہ کن تخریبی کارروائیاں کیں۔ یہودیوں کی ان شرانگیزیوں کا تذکرہ و تعانت کے سلسلے میں مناسب مواقع پر آئے گا۔ (مزید)

# ایمان نہار کی اوریتا

## عیسائیت کا ظہور اور نشوونما

### لفظ نصاریٰ کی تشریح

بعض لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ "نصاری" کا لغتاً "ناصرہ" سے ماخوذ ہے جو صحیح علیہ السلام کا وطن تھا۔ دراصل اس کا ماخذ "نصرت" ہے اور اس کی بنا وہ قول ہے جو صحیح علیہ السلام کے سوال تَمَنُّ النَّصَارَةِ إِلَى اللَّهِ (خدا کی ماہ میں کون لوگ میرے مددگار بنیں) کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا تَحْنُ النَّصَارَةُ اللَّهُ (ہم اللہ کے کام میں مددگار ہیں)۔ عیسائی مفسرین کو بالعموم محض ظاہری مشابہت دیکھ کر یہ غلط فہمی ہوتی کہ مسیحیت کی ابتدائی تاریخ میں ناخصاً یہ Nazarenes کے نام سے جو ایک فرقہ پایا جاتا تھا اور جنہیں حقارت کے ساتھ نصاریٰ اور ایسرنی کہا جاتا تھا، انہی کے نام کو قرآن نے تمام عیسائیوں کے لیے استعمال کیا ہے لیکن قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ انہوں نے خود کہا تھا کہ ہم "نصاری" ہیں (آل عمران ۵۲) اور یہ ظاہر ہے کہ عیسائیوں نے کبھی اپنا نام نصاریٰ نہیں رکھا۔ ۴۵۶

اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروں کا نام کبھی "عیسائی" یا "مسیحی" نہیں رکھا تھا کیونکہ وہ اپنے نام سے کسی نئے مذہب کی بنا ڈالنے نہیں آئے تھے۔ ان کی دعوت اسی دین کو تازہ کرنے کی طرف تھی جسے حضرت تموی علیہ السلام اور ان سے پہلے اور بعد کے انبیاء عظیم السلام نے کر آئے تھے۔ اس لیے انہوں نے عام بنی اسرائیل اور پیروان شریعت موسوی سے الگ نہ کوئی جماعت بنائی اور نہ اس کا کوئی مستقل نام رکھا۔ ان کے ابتدائی پیروں نے خود بھی نہ اپنے آپ کو اسرائیلی ملت سے الگ سمجھتے تھے، نہ ایک مستقل گروہ بن کر رہے، اور نہ انہوں نے اپنے لیے کوئی امتیازی نام اور نشان قرار دیا۔ وہ عام یہودیوں کے ساتھ بیت المقدس ہی کے میسک میں عبارت کرنے کے لیے جاتے تھے اور اپنے آپ کو موسوی شریعت ہی پر عمل کرنے کا پابند سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو کتاب اعمال ۱۰۳-۱۰۴)۔

۱۰۴:۱۵-۱۰۴:۲۱

عیسائیوں کی عام بنی اسرائیل سے علیحدگی

آگے چل کر عیدانی کا عمل دو جانب سے شروع ہوا۔ ایک طرف حضرت عیسیٰ کے پیروں میں سے یولوس





## عیسائیت کا زمانہ ظہور

یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ یہودیت اپنے اس نام اور مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ عیسوی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور عیسائیت جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعے کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اب یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر آدمی کے برسر ہدایت ہونے کا مدار یہودیت یا عیسائیت اختیار کرنے ہی پر ہے تو حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیاء اور نیک لوگ جو ان مذہبوں کی پیدائش سے صدیوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور جن کو یہودی اور عیسائی بھی ہدایت یافتہ مانتے ہیں، وہ آخر کس چیز سے ہدایت پاتے تھے ظاہر ہے وہ یہودیت اور عیسائیت نہ تھی۔ لہذا یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ انسان کے ہدایت یافتہ ہونے کا مدار ان مذہبی خصوصیات پر نہیں ہے جن کی وجہ سے یہ یہودی اور عیسائی وغیرہ مختلف فرقے بنے ہیں بلکہ دراصل اس کا مدار اس عالمگیر صراطِ مستقیم کے اختیار کرنے پر ہے۔ جس سے ہر زمانے میں انسان ہدایت پاتے رہتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ خود یہود و نصاریٰ کی اپنی مقدس کتابیں اس بات پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیم ایک اللہ کے سوا کسی دوسرے کی پرستش، تقدیس، بندگی اور اطاعت کے قائل نہ تھے اور ان کا مشن ہی یہ تھا کہ خدا کی صفات و خصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لہذا یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہودیت اور نصرائیت دونوں اس راہِ راست سے منحرف ہو گئی ہیں جس پر حضرت ابراہیم چلتے تھے، کیونکہ ان دونوں میں شریک کی آمیزش ہو گئی ہے۔

## عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ کو خدا قرار دینا

عیسائیوں نے ابتداءً مسیح کی شخصیت کو انسانیت اور الوہیت کا مرکب قرار دے کر ایک ایسی غلطی کی تھی جس کے نتیجے میں ان کے لیے مسیح کی حقیقت ایک معما بن کر رہ گئی۔ ان کے عقائد نے لفظی اور قیاس آرائی کی مدد سے اس معنی کو حل کرنے کی جتنی کوشش کی اتنے ہی زیادہ الجھتے چلے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر اس مرکب شخصیت کے جزو انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیح کے ابن اللہ ہونے اور نین مستقل خداوں میں سے ایک ہونے پر زور دیا۔ اور بس کے ذہن پر جزو الوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیح کو اللہ کا جسمانی ظہور قرار دے کر ابن اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت ہی سے اس کی عبادت کی۔ ان کے درمیان بیچ کی راہ جنہوں نے نکالنی چاہی انہوں نے سارا زور ایسی غلطی تعبیر پر فرمایا کہ نہ پر صرف کر دیا جن سے مسیح کو انسان بھی کہا جاتا رہے اور اس کے ساتھ خدا بھی سمجھا جاسکے۔ خدا اور مسیح الگ الگ بھی ہوں اور پھر ایک بھی رہیں۔

## حضرت عیسیٰ کے کلمہ اللہ ہونے کا مفہوم

إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلَّمْنَاهُ (النسارہ آیت ۱۵۱)

”مسیح عیسیٰ ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فریاد تھا“

اصل میں فقہاء کلمہ استعمال ہوا ہے۔ مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مریم علیہا السلام کے جسم پر یہ فریاد نازل کیا کہ وہ کسی مرد کے لطف سے میرا سب ٹھوسے بغیر عمل کا استغفار قبول کر لے جیسا یسوع کے ابتداء میں علیہ السلام کی پیدائش یسے پدر کا سہی راز بتایا گیا تھا، مگر انہوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو ”کلام“ یا ”ناطق“ (Logos) کا ہم معنی سمجھ لیا پھر اس کلام و نطق سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے لطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیح کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کی اکرہیت کا عارضہ عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنا آپ کر لیا اپنی ازلی صفات میں سے نطق و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

## عقیدہ تثلیث

سورۃ نسا کی آیت ۱۷۱ میں حضرت مسیح کو روحِ مقدس و خدا کی طرف سے ایک روح کہا گیا ہے اور سورۃ البقرہ میں اس معنوں کو یوں ادا کیا گیا ہے کہ **كَمَا يَكْتُمُ اللَّهُ رُوحَ الْقُدُسِ فِيهِمْ** نے پاک روح سے مسیح کی مدد کی اور ان عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو بدی سے ناپاک تھی۔ ہر امر حقانیت اور راست بازی تھی اور از مرنا یا فضیلت اخلاق تھی یہی تدریجہ انتخاب کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی مگر انہوں نے اس میں بھی غلط کیا۔ روح من اللہ کو عین روح اللہ قرار دے لیا اور روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ کی اپنی روح مقدس تھی جو روح کے اندر شامل کر گئی تھی۔ اس طرح اللہ اور روح کے ساتھ ایک تیسرا خدا روح القدس کو بنا ڈالا گیا۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست عقوہ تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے لطف یہ ہے کہ آج بھی انجیل متنی میں یہ فقرہ موجود ہے کہ فرشتے نے اُسے راجعاً پوچھا کہ خواب میں دکھائی دے کر کہا کہ اُسے یوسف ابن داؤد، اپنی بیوی مریم کو اپنے ہاں لے آنے سے نہ ڈر، کیونکہ جو اس کے پیٹ میں ہے وہ روح القدس کی قدرت سے ہے“ (باب ۱، آیت ۲) اللہ

حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو انجیل میں ملتے ہیں ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا جس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں ہے۔ ان کے لئے تسلیم کیے بغیر عارضہ نہیں ہے کہ توحید اصل دین ہے۔

مردہ جو ایک غلط فہمی ابتدا میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلام اللہ نے مسیح کی شکل میں ظہور کیا اور روح اللہ نے اس میں حلول کیا، اس کی وجہ سے انہوں نے مسیح اور روح القدس کی اُلُوہیت کو بھی خداوندِ عالم کی اُلُوہیت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسئلہ ایک ناقابلِ حل چیلن بن گیا کہ عقیدہ توحید کے باوجود عقیدہ تثلیث کو، اور عقیدہ تثلیث کے باوجود عقیدہ توحید کو کس طرح نباہیں۔ تقریباً ۱۵ سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سرکھپا رہے ہیں۔ عیسویوں نے اسی کی مختلف تعبیرات پر بحثیں ہیں۔ اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے اسی کے بھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے ہیں۔ اسی پر ان کے سارے علم کلام کا زور صرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل خدا نے پیدا کی تھی نہ اُس کے پیچھے ہوتے مسیح نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین ہی مانے جائیں اور پھر وحدانیت ہی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف اُن کے غلو نے پیدا کیا ہے اس کا صرف یہی حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں، مسیح اور روح القدس کی اُلُوہیت کا تجل چھوڑیں، صرف اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کریں اور مسیح کو صرف اس کا بیغیر قرار دیں نہ کہ کسی طور پر شریک فی الٰہ اُلُوہیت۔ لکھ

### شرک اور اولیاء پرستی

پانچویں صدی کے وسط تک پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا۔ بزرگوں کے آستانے پڑیے جا رہے تھے۔ اور مسیح، مریم اور خوریوں کے مجسمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے نبوت سے چند ہی سال پہلے ۳۱۲ء میں پورے عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی افسس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی جس میں مسیح علیہ السلام کی اُلُوہیت اور حضرت مریم کے "مادرِ خدا" ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نشاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ "الَّذِينَ عَلِمُوا عَلَىٰ امْرِهِمْ" سے مراد وہ لوگ ہیں جو سچے پیروانِ مسیح کے مقابلے میں اُس وقت عیسائی عوام کے رہنا اور سربراہ کا رہنے ہوئے تھے۔ اور مذہبی اور سیاسی امور کی باتیں جن کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہی لوگ دراصل شرک کے علمبردار تھے۔ اور انہوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنا یا جائے ۳۱۳ء

### موجودہ عیسائیت اور سینٹ پال

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی پیرو آپ کو صرف نبی مانتے تھے، موسوی شریعت کا اتباع کرتے

تھے، عقائد اور احکام اور عبادات کے معاملہ میں اپنے آپ کو دوسرے نبی اسرائیل سے قطعاً الگ نہ سمجھتے تھے، اور یہودیوں سے ان کا اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ یہ حضرت عیسیٰ کو مسیح تسلیم کر کے ان پر ایمان لائے تھے اور وہ ان کو مسیح ماننے سے انکار کرتے تھے بعد میں جب سینٹ پال اس جماعت میں داخل ہوا تو اس نے رومیوں، یونانیوں اور دوسرے غیر یہودی اور غیر اسرائیلی لوگوں میں بھی اس دین کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی، اور اس غرض کے لیے ایک نیا دین بنا ڈالا جس کے عقائد اور اصول اور احکام اُس دین سے بالکل مختلف تھے جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا۔ اس شخص نے حضرت عیسیٰ کی کوئی صحبت نہیں پائی تھی بلکہ اُن کے زمانے میں وہ اُن کا سخت مخالف تھا اور ان کے بعد بھی کئی سال تک اُن کے پیروؤں کا دشمن بنا رہا۔ پھر جب اس جماعت میں داخل ہو کر اس نے ایک نیا دین بنا کر شروع کیا اُس وقت بھی اس نے حضرت عیسیٰ کے کسی قول کی سند نہیں پیش کی بلکہ اپنے کشف و الہام کو بنیاد بنایا۔ اس نئے دین کی تشکیل میں اُس کے پیش نظر میں یہ مقصد تھا کہ دین ایسا ہو جسے عام عیسائی یہودی (Gentile) دینا قبول کرے۔ اُس نے اعلان کر دیا کہ ایک عیسائی شریعت یہودی تمام پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس نے کھانے پینے میں حرام و حلال کی ساری قیود ختم کر دیں۔ اس نے ختنہ کے حکم کو بھی منسوخ کر دیا جو غیر یہودی دنیا کو خاص طور پر ناگوار تھا۔ حتیٰ کہ اس نے مسیح کی اوتہیت اور اُن کے ابن خدا ہونے اور صلیب پر جان سے گئے اور لاوا آدم کے پیدائشی گناہ کا کفارہ بن جانے کا عقیدہ بھی تصنیف کر ڈالا کیونکہ عام مشرکین کے فرائض سے یہ بہت مناسبت رکھتا تھا۔ مسیح کے ابتدائی پیروؤں نے ان بدعات کی فراغت کی، مگر سینٹ پال نے جو دروازہ کھولا تھا، اس سے غیر یہودی عیسائیوں کا ایک ایسا زبردست سیلاب اس مذہب میں داخل ہو گیا جس کے مقابلے میں وہ مٹھی بھر درگ کسی طرن نہ ٹھیر سکے۔ تاہم تیسری صدی عیسوی کے اختتام تک بکثرت لوگ ایسے موجود تھے جو مسیح کے اوتہیت کے عقیدے سے انکار کرتے تھے۔

یہ لوہی عقائد چھپا گئے

مگر چوتھی صدی کے آغاز (۳۲۵ء) میں نیقیہ (Nicaea) کی کونسل نے یہودی عقائد کو قطعی طور پر مسیحیت کا مستقیم مذہب قرار دے دیا۔ پھر رومی سلطنت خود عیسائی ہو گئی اور قیصر تھیوڈوسیوس کے زمانے میں یہی مذہب سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا۔ اس کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ تمام کتابیں جو اس عقیدے کے خلاف ہوں، مردود قرار دے دی جائیں اور صرف وہی کتابیں معتبر ٹھہرائی جائیں جو اس عقیدے سے مطابقت رکھتی ہوں۔ ۳۶۷ء میں پہلی مرتبہ اٹھانا سیوں (Athanasius) کے ایک خط کے ذریعے معتبر و

مستقیم کتابوں کے ایک مجموعہ کا اعلان کیا گیا۔ پھر اس کی توثیق ۳۸۱ء میں پوپ ڈیسیس (Damasus) کے زیر صدارت ایک مجلس نے کی، اور پانچویں صدی کے آخر میں پوپ گلاسیس (Gelasius)

نے اس مجبور کو مسلم قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جو غیر مسلم نہیں جانتے کہ جن پولوسی عقائد کو بنیاد بنا کر مذہبی کتابوں کے مقبر اور غیر معتبر ہونے کا یہ فیصلہ کیا گیا تھا، ان کے متعلق کبھی کوئی عیسائی عالم یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ ان میں سے کسی عقیدے کی تعلیم خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی بلکہ معتبر کتابوں کے مجموعہ میں جو انجیلیں شامل ہیں، خود ان میں بھی حضرت عیسیٰ کے اپنے کسی قول سے ان عقائد کا ثبوت نہیں ملتا۔ ۱۱۱

## ربہانیت کا ظہور اور اس کے اسباب

حضرت عیسیٰ کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا ربہانیت سے نا آشنا تھا۔ مگر ابتدا ہی سے مسیحیت (نکھریت شدہ) میں اس کے جراثیم پستے جلتے تھے اور وہ تمثیلات اس کے اندر موجود تھے جو اس چیز کو جنم دیتے تھے ترک و تجرید کو اخلاقی اٹیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور ذمیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی ربہانیت کی بنیاد ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں مسیحیت میں ابتدا سے موجود تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ تجرید کو تقدس کا ہم معنی سمجھنے کی وجہ سے کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی کہ وہ شادی کریں، بال بچوں والے ہوں اور خانہ داری کے کھیلوں میں پڑیں۔ اس چیز نے تیسری صدی تک پہنچے پہنچے ایک نکتے کی شکل اختیار کر لی، اور ربہانیت ایک و باکی طرح مسیحیت میں پھیلنی شروع ہوئی۔

### تین اسباب

تاریخی طور پر اس کے تین بڑے اسباب تھے:

ایک یہ کہ قدیم مشرک سوسائٹی میں شہوانیت، بد کرداری اور دنیا پرستی جس شدت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی اس کا ٹوڑ کرنے کے لیے عیسائی علماء نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی انہوں نے عقبت پر اتنا زور دیا کہ عورت و مرد کا تعلق بجائے خود جن قرار پا گیا خواہ وہ نکاح کی صورت ہی میں کیوں نہ ہوں۔ انہوں نے دنیا پرستی کے خلاف اتنی شدت برتی کہ آخر کار ایک دیندار آدمی کے لیے سہ سے کسی قسم کی املاک رکھنا ہی گناہ بن گیا اور اخلاق کا معیار یہ ہو گیا کہ آدمی بالکل مفلس اور سہرا خا سے تاکر دنیا

سہ آج اسی انتہا پسندی کا رد عمل یہ دوسری انتہا پسندی ہے کہ عورت و مرد کے درمیان نکاح کے دائرے کے باہر جنسی تعلق کی کھلی چھوٹ ہے، اور اب اس تعلق میں کسی انتہا رازداری کی ضرورت بھی نہیں درمیان میں،

ہو۔ اسی طرح مشرک سوسائٹی کی لذت پرستی کے جواب میں وہ اس انتہا تک جا پہنچے کہ ترک لذات، نفس کو مارنا اور خواہشات کا قلع قمع کر دینا اخلاق کا منسوخ کر دیا گیا۔ اور طرح طرح کی ریاضتوں سے جسم کو اذیتیں دینا روحانیت کا کمال اور اس کا ثبوت سمجھا جانے لگا۔

دوسرے بڑے مسیحیت جب کامیابی کے ذریعے داخل ہو کر عوام میں پھیلنے شروع ہوئی تو اپنے مذہب کی ترویج و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اس بُرائی کو اپنے دائرے میں داخل کرنا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔ اولیاء پرستی نے قدیم بتوں کی جگہ لے لی۔ ہورس (Horus) اور آتیس (Isis) کے مجسموں کی جگہ مسیح اور قدیم کے بت پوجے جانے لگے، سیٹرنیڈا (Saturnalia) کی جگہ کرسمس کا تہوار منایا جانے لگا۔ قدیم زمانے کے تعویذ گٹھے، عملیات، فال گیری، غیب گوئی اور جن بھوت بھگانے کے عمل سب عیسائی دہلیشوں نے شروع کر دیے۔

اسی طرح چونکہ عوام اس شخص کو خدا سیدہ سمجھتے تھے جو گناہ اور ننگا ہوا اور کسی بھٹ یا کھوہ میں رہے، اس لیے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصور مقبول ہو گیا اور ایسے ہی لوگوں کی گرامتوں کے قصوں سے عیسائیوں کے ہاں تذکرۃ الاولیاء قسم کی کتابیں تیار ہو گئیں۔

تیسرے یہ کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لیے کوئی مفصل شریعت اور کوئی واضح سنت موجود نہ تھی۔ شریعت موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے، اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لیے مسیحی علماء کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے متاثر ہو کر اور کچھ خود اپنے عقائد کی بنا پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے گئے۔ رہبانیت بھی انہی بدعتوں میں سے ایک تھی۔ رہبانیت کے ماخذا اور اس کے قائدین

مسیحی مذہب کے علماء اور ائمہ نے اس کا فلسفہ اور اس کا طریق کار بڑھ مست کے بھکشوں سے بہتر جوگیوں اور سفیاسیوں سے اور قدیم مصری فقراء (Anchories) سے، ایران کے مانویوں اور افلاطون اور فلاطینوس کے پیرو اشرافیوں سے اخذ کیا۔ اور اسی کو تزکیہ نفس کا طریقہ، روحانی ترقی کا ذریعہ اور تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دے لیا تھا۔

اس غلطی کے ترکیب کوئی معمولی درجہ کے لوگ نہ تھے۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی تک یعنی نزول قرآن کے زمانے تک، جو لوگ مشرق اور مغرب میں مسیحیت کے اکابر علماء، بزرگ ترین پیشواؤں امام مانے جاتے ہیں۔ سینٹ اتھانا سیوس، سینٹ باسل، سینٹ گرگوری، سینٹ نازاریانزین بہت ساری کرائی سوئم، سینٹ ایلیروز، سینٹ جیروم، سینٹ آگسٹائن، سینٹ بنیڈیکٹ، گرگوری اعظم۔

سب کے سب خود راہب اور رہبانیت کے زبردست علمبردار تھے۔ انہی کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔

## پہلا راہب اور پہلی خانقاہ

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر سے ہوا۔ اس کا بانی سینٹ انٹونی

St. Anthony تھا جو ۲۵۰ء میں پیدا ہوا اور ۳۵۰ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔

اسے پہلا عیسائی راہب قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے قیٹوم کے علاقے میں لیبیہ کے مقام پر جو اب ویرا مہین کے نام سے معروف ہے، پہلی خانقاہ قائم کی۔ اس کے بعد دوسری خانقاہ اس نے بحر احمر کے ساحل پر قائم کی جسے اب ویرا زائلونیس کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اسی کی تحریروں اور ہدایات سے ماخوذ ہیں۔

## جایجا خانقاہوں کا قیام

اس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور رہبانیت کے ایسے خانقاہیں قائم ہو گئیں جن میں بعض میں تین تین ہزار راہب رہتے تھے۔ ۳۲۵ء میں مصر ہی کے اندر ایک مسیحی ولی پائولیوس نمودار ہوا جس نے دس بڑی خانقاہیں ویرا مہین ویرا جیانت کے لیے بنائیں اس کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقہ و یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیلنا چلا گیا۔ کلیسائی نظام کو اول اول اس رہبانیت کے مسائل میں منتہا جس سے سابقہ پیش آیا کیونکہ وہ ترک دنیا اور تجرد اور غریبی و مفلسی کو روحانی زندگی کا اسٹیل تو سمجھتا تھا مگر راہبوں کی طرح شادی بیاہ اور اولاد پیدا کرنے اور ملکیت رکھنے کو گناہ بھی سمجھتا تھا۔ بلاؤ سینٹ اٹھانا سیوس روشنی ۳۴۰ء اور نیٹ ہل روشنی ۴۰۰ء سینٹ گسٹاں روشنی ۴۸۰ء اور گرگوری عظیم روشنی ۵۰۰ء سے لوگوں کے اثر سے رہبانیت کے بہت سے قواعد چرچ کے نظام میں باقاعدہ داخل ہو گئے۔

## سلسلہ رہبانیت کی خصوصیات

اس راہبانیت کی چند خصوصیات تھیں جن کو ہم اہتمام کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

۱- سخت ریاضتوں اور نئے طریقوں سے اپنے جسم کو اذیتیں دینا ان کی توہین خصوصیت تھی

۲- ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ہر وقت گندے رہتے تھے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔

تہانا یا جسم کو پانی گنانا ان کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ جسم کی صفائی کو وہ رُوح کی نجاست سمجھتے تھے۔

۲۔ اس رہبانیت نے ازدواجی زندگی کو عملاً بائبل حرام کر دیا اور نکاح کے رشتے کو کاٹ پھینکنے میں سخت بیداری سے کام لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی کی تمام تحریروں میں اس خیال سے بھری ہوئی ہیں کہ تہجد سب سے بڑی اخلاقی قدر ہے اور حقیقت کے معنی یہ ہیں کہ آدمی جنسی تعلق سے قطعاً احتراز کرے، خواہ وہ میاں اور بیوی کا تعلق ہی کیوں ہو۔ انیزہ زندگی کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنے نفس کو بائبل مار دے اور اس میں سمائی لذت کی کوئی خواہش تک باقی نہ چھوڑے۔ ان لوگوں کے نزدیک خواہش کو مار دینا اس لیے ضروری تھا کہ اُس سے حیوانیت کو نفوتیت پہنچتی ہے۔ ان کے نزدیک لذت اور گناہ ہم معنی تھے، حتیٰ کہ مسرت بھی ان کی نگاہ میں خدا فراموشی کے مترادف تھی۔ سینٹ باسل اپنے اور مسکرائے تک کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ انہی تصورات کی بنا پر عورت اور مرد کے درمیان شادی کا تعلق ان کے ہاں قطعی نہیں قرار پا گیا تھا۔ راہب کے لیے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار، عورت کی شکل تک نہ دیکھے، اور اگر شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھو کر نکل جاتے۔ مردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھانی لگی تھی کہ وہ اگر آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو عینہ کنواری رہیں، اور شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہر سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جیروم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ جو عورت مسیح کی خاطر راہب بن کر ساری عمر کنواری رہے وہ مسیح کی دلہن ہے اور اس عورت کی ماں کو خدا یعنی مسیح کی ساس (Mother in law of God) ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ایک اور مقام پر سینٹ جیروم کہتا ہے کہ "حقیقت کی کھانسی سے ازدواجی تعلق کی کٹھنی کو کاٹ پھینکنا ساکھ کا اولین کام ہے۔" ان تعلیمات کی وجہ سے مذہبی جذبہ طاری ہونے کے بعد ایک مسیحی مرد یا ایک مسیحی عورت پر اس کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کی خوشگوار زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی تھی۔

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک اپنے حدود میں ان اتہاپسندانہ تصورات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا۔ . . . رفقہ رفقہ چوتھی صدی میں یہ خیال پوری طرح زور پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو اس کے لیے شادی شدہ ہونا بڑی گستاخانی بات ہے۔ ۳۶۲ء کی گنگرا کونسل (Council of Gengra) آخری مجلس تھی جس میں اس طرح خیالات کو خلاف مذہب ٹھہرایا گیا۔ مگر اس کے پھوٹی ہی مدت بعد ۴۳۸ء کی رومن سیناڈ (Roman Synod) نے تمام پادریوں کو مشورہ دیا کہ وہ ازدواجی تعلقات سے کنارہ کش رہیں، اور دوسرے سال پوپ سائیریکس (Siricius) نے حکم دے دیا کہ جو پادری شادی کرے، یا شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنی بیوی سے تعلق رکھے اس کو مستحب سے معزول کر دیا جلتے۔

۳۔ سب سے زیادہ دردناک باب اس رہبانیت کا یہ ہے کہ اس نے ماں باپ، بھائی بہنوں اور اولاد



مک سے آدمی کا رشتہ کاٹ دیا۔ مسیحی دلیوں کی نگاہ میں بیٹے کے لیے ماں باپ کی محبت، بھائی کے لیے بھائی بہنوں کی محبت اور باپ کے لیے اولاد کی محبت بھی ایک گناہ تھی۔ ان کے نزدیک روحانی ترقی کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ آدمی ان سارے تعلقات کو توڑ دے۔ (مثالیں ترک کر دی گئیں)

مسیحی رہبانیت کا نقطہ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبت چاہتا ہو اسے انسانی محبت کی وہ ساری زنجیریں کاٹ دینی چاہئیں جو دنیا میں اس کو اپنے والدین، بھائی بہنوں اور مال بچوں کے ساتھ باہمی ہیں۔  
 ۵۔ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی، سنگدلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے اس کی وجہ سے ان کے انسانی جذبات مر جاتے تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انہیں مذہبی اختلاف ہوتا ان کے مقابلے میں یہ ظلم و ستم کی انتہا کر دیتے تھے۔ چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیت میں ۸۰، ۹۰ فرقتے پیدا ہو چکے تھے۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنے زمانے میں ۸۸ فرقتے گنائے ہیں یہ فرقتے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راسب تھے اور اس میں مخالف گروہوں کو جلا کر خاک کر دینے کی کوششوں میں بھی راسب ہی پیش پیش ہوتے تھے اسکندریہ اس فرقہ وارانہ کشمکش کا بڑا کھڑا تھا۔ (ان فرقہ وارانہ تصادموں کی دردناک مثالیں حذف کر دی گئیں)

۶۔ اس ترک و تجرید اور فقر و درویشی کے ساتھ دولت دنیا سمیٹنے میں بھی کمی نہ کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز میں یہ حالت ہو چکی تھی کہ روم کا بیشپ یا رشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھانڈے ہاتھ قبصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔ . . . . خانقاہوں اور کنوئیسوں کی طرف دولت کا بہاؤ ساتویں صدی (نزولِ قرآن کے زمانے) تک پہنچتے پہنچتے سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ . . . . خاص طور پر جو چیز اس تشریح کی موجب ہوتی وہ یہ تھی کہ راسبوں کی غیر معمولی ریاضتیں اور ان کی نفس کشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں ان کے لیے بے پناہ عقیدت پیدا ہو گئی تو بہت سے دنیا پرست لوگ لباسِ درویشی پہن کر راسبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے اور انہوں نے ترک دنیا کے بھیس میں جلیب مویا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبین دنیا ان سے مات کھا گئے۔

۷۔ سعادت کے معاملہ میں بھی فطرت سے لڑ کر رہبانیت نے بار بار شکست کھائی۔ . . . . خانقاہوں میں نفس کشی کی کچھ مشقتیں ایسی بھی تھیں جن میں راسب اور راہبات مل کر ایک جگہ ہی رہتے تھے اور اجنبی اوقات ذرا زیادہ مشق کرنے کے لیے ایک ہی بستر میں رات گزارتے تھے۔ نفس کشی کا کمال حاصل کرنے والے عورتوں کے ساتھ مل کر نہاتے اور ان کی دید، ان کے لمس اور ان کی ہم آغوشی سے بھی فطرت ان پر غلبہ نہ پاسکتی۔ . . . . انسانی فطرت ان لوگوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہتی جو اس سے جنگ کریں۔ رہبانیت اس سے لڑ کر بالآخر



# انجیلی صحائف کی تاریخی حیثیت

[ یہودیوں کی طرح عیسائیوں کے ہاں بھی الہامی کتاب ہدایت محفوظ نہیں رہ سکی۔ اسی وجہ سے دین میں تحریف کے راستے سے غلط عقاید و احکام داخل ہوئے۔ اصل انجیل اگر محفوظ ہوتی تو عیسائیت اپنی موجودہ شکل میں تلہور نہ پاسکتی۔ انجیل میں اناجیل کے متعلق مولانا سید ابوالاعلیٰ امجدادی کی تحقیق پیش کی جا رہی ہے۔ (مترجمین) ]

## ماخذ کی تحقیق

آج ہم جس مجموعہ کو انجیل کہتے ہیں وہ دراصل چار بڑے صحیفوں پر مشتمل ہے، متی، مرقس، لوقا، یوحنا۔ لیکن ان میں سے کوئی صحیفہ بھی حضرت عیسیٰ کا نہیں ہے۔ جس طرح قرآن مجید میں وہ تمام منقول من اللہ آیات اور سورتیں جمع ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں اُس طرح کسی کتاب میں وہ وجہاں ہم کہہ سکتے ہیں جو حضرت عیسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھیں۔ پھر وہ مواظف و نصحیح بھی ہم کو خود حضرت عیسیٰ کے اپنے الفاظ میں کہیں نہیں ملتے جو انہوں نے اپنی پیغمبرانہ زندگی کے زمانہ میں مختلف مواقع پر ارشاد فرمائے تھے۔ یہ صحیفے جو ہم تک پہنچے ہیں نہ خدا کا کلام ہیں نہ حضرت عیسیٰ کا، بلکہ وہ دراصل حضرت عیسیٰ کے حواریوں بلکہ حواریوں کے بھی شاگردوں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جن میں ان لوگوں نے اپنے اپنے علم و فہم کے مطابق حضرت کے حالات اور ان کی تعلیمات کو جمع کیا ہے۔

## متی سے منسوب نسخہ

لیکن یہ کتابیں خود اس قدر معمولی الاصل ہیں کہ ان پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی کتاب مسیح کے حواری متی کی طرف منسوب ہے اور یہ تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ متی کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ متی کی اصل کتاب جس کا نام لوچیا (Logia) تھا، منقول ہے۔ جو کتاب متی کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس کا مصنف کوئی گناہ شخص ہے جس نے دو سری کتابوں کے ساتھ لوچیا سے بھی استفادہ کیا تھا۔ خود متی کا ذکر اس میں اس

طرح کیا گیا ہے جیسے کسی غیر آدمی کا کیا جاتا ہے پھر اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ تر مرقس کی انجیل سے ماخوذ ہے کیونکہ اس کی ۱۰۶۸ آیات میں سے ۴۴۴ عینہ وہی ہیں جو مرقس کی انجیل میں آئی ہیں حالانکہ اگر اس کا مصنف حواری ہوتا تو اس کو ایک ایسے شخص کی کتاب سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہ تھی جو نہ حواری تھا اور نہ حضرت عیسیٰ سے کبھی ملا تھا۔ یہی علماء کا خیال ہے کہ یہ کتاب سن ۶۰ء میں یعنی مسیح سے ۴۱ برس بعد لکھی گئی ہے اور بعض کا خیال ہے کہ سن ۹۰ء کی تصنیف ہے۔

مرقس سے منسوب نسخہ

دوسری کتاب مرقس کی طرف منسوب ہے اور عموماً تسلیم کیا جاتا ہے کہ مرقس خود ہی اس کا مصنف ہے۔ لیکن یہ ثابت ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ سے کبھی نہیں ملا اور نہ ان کا مرید ہوا۔ وہ دراصل بطرس حواری (St. Peter) کا مرید تھا اور جو کچھ ان سے سنا تھا اسے یونانی زبان میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اسی سے عیسائی مصنفین اس کو عموماً بطرس کا ترجمان کہا کرتے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب سن ۷۰ء اور سن ۸۰ء کے درمیان کسی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔

لوقا سے منسوب نسخہ

تیسری کتاب لوقا کی طرف منسوب ہے اور یہ بالکل مسلم ہے کہ لوقا نے کبھی مسیح کو نہیں دیکھا اور نہ ان سے استفادہ کیا۔ وہ پولوس (St. Paul) کا مرید تھا، ہمیشہ اسی کی صحبت میں رہا اور اُس نے اپنی انجیل میں اسی کے خیالات کی ترجمانی کی چنانچہ خود پولوس اس کی انجیل کو اپنی انجیل کہتا ہے لیکن یہ ثابت ہے کہ سینٹ پال خود بھی مسیح کی صحبت سے محروم تھا اور مسیحی روایات کے مطابق واقعہ معلیّب کے ۶ برس بعد اس مذہب میں داخل ہوا۔ اس لیے لوقا اور مسیح کے درمیان سلسلہ روایت کی ایک کڑی بالکل غائب ہے۔ انجیل لوقا کی تاریخ تحریر بھی متعین نہیں ہے۔ بعض اس کو سن ۸۰ء کی تصنیف بتاتے ہیں اور بعض سن ۹۰ء کی، مگر ہارنک میکسگرفٹ اور پلومر جیسے محققین کی رائے یہ ہے کہ وہ سن ۸۰ء سے پہلے نہیں لکھی گئی۔

نتی باب ۹ آیت ۹ میں لکھا ہے،

ہے یسوع نے وہاں سے آگے بڑھ کر متی نام ایک شخص کو معمول کی چمکی پر دیکھا تھا ہرچہ کہ

مصنف خود اپنا تذکرہ اس طرح نہیں کر سکتا تھا۔

لہذا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ کو معلیّب دیکھنے کے وقت وہ تماشائی کی حیثیت سے موجود

تھا مگر اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے۔ (ڈیولف)

### یوحنا سے منسوب نسخہ

چوتھی کتاب جو یوحنا کی انجیل کہلاتی ہے جدید تحقیقات کے مطابق مشہور یوحنا حواری کی لکھی ہوئی نہیں ہے بلکہ کسی اور مجہول الاحوال شخص کی ہے جس کا نام یوحنا تھا۔ یہ کتاب مسیح سے بہت بعد سترہویں یا اس کے بھی بعد لکھی گئی ہے۔ ہانک اس مدت کو مسئلہ تک بڑھا دیتا ہے مگر اس سے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک کا سلسلہ بھی مستحکم نہیں پہنچتا اور ان کی سند پر وثوق کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ مسیح نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا۔ لیکن زیادہ عینی تحقیقات سے ان کتابوں کی دستاویزی حیثیت اور بھی زیادہ مشکوک ہو جاتی ہے۔

### اناجیل کے غیر مستند ہونے کے چھ وجوہ

اولاً چاروں انجیلوں کے بیانات میں اختلاف ہے، حتیٰ کہ پہاڑی کے وعظ کو بھی اجماعی تعلیم کا اصل الاصول ہے، متی، مرقس اور لوقا تینوں نے مختلف اور متضاد طریقوں سے بیان کیا ہے۔

ثانیاً، چاروں انجیلوں میں ان کے مصنفین کے خیالات و تاثرات صاف طور پر نمایاں ہیں۔ متی کے خطاب یہودی معلوم ہوتے ہیں اور وہ ان پر تمام محبت کرتا نظر آتا ہے۔ مرقس کے مخاطب رومی ہیں اور وہ ان کو اسرائیلیات سے روئناس کرنا چاہتا ہے۔ لوقا سینٹ پال کا وکیل ہے اور دوسرے حواریوں کے خلاف اس کے دعویٰ کی تائید کرنا چاہتا ہے۔ یوحنا ان فلسفیانہ خیالات سے متاثر نظر آتا ہے جو پہلی صدی عیسوی کے اواخر میں مسیحیوں کے درمیان پھیل گئے تھے۔ اس طرح ان چاروں انجیلوں کے درمیان معنوی اختلاف، عقلی اختلاف سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔

ثالثاً، اناجیل سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی ہیں، حالانکہ حضرت عیسیٰ اور ان کے تمام حواریوں کی زبان سریانی تھی۔ زبان کے اختلاف سے خیالات کی تعبیر میں اختلاف ہو جانا قدرتی بات ہے۔

رابعاً، اناجیل کو مذہبِ حرمی میں لاسے کی کوشش دوسری صدی عیسوی سے پہلے نہیں کی گئی۔ سزا دیکھ کر عام خیال یہ تھا کہ زبانی روایت تحریر سے زیادہ مفید ہے۔ دوسری صدی کے آخر میں لکھنے کا خیال پیدا ہوا لیکن اس زمانہ کی تحریروں کو مستند نہیں سمجھا جاتا۔ "عہدِ جدید" (New Testament) کا پہلا مستند متن قرطاجہ کی کونسل میں منظور کیا گیا جو ۳۹۷ء میں منعقد ہوئی تھی۔

خامساً، اناجیل کا قدیم ترین نسخہ جو اس وقت دنیا میں موجود ہے، چوتھی صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔ دوسرا نسخہ پانچویں صدی کا اور تیسرا ناقص نسخہ بھی جو پاپا لے کے روم کے کتب خانہ میں ہے، چوتھی صدی سے زیادہ قدیم نہیں ہے۔ پس یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلی تین صدیوں میں جو انجیلیں رائج تھیں ان سے موجودہ اناجیل کس حد تک مطابقت رکھتی ہیں۔

سوائے انابیل کو تو قرآن کی طرح مضطرب کرنے کی کبھی کو شش نہیں کی گئی۔ ان کی اٹھتھ کے کا انحصار ابتداً عروایت بالسلفی پر یا جس میں حافظہ کے انتقال اور سلاویہ کے ذاتی خیالات کا اثر آتا قدرتی امر ہے۔ بعد میں جب کتابت کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ نقل نویسوں کے رسم پر عمل نقل کرنے وقت ہر شخص کے لیے آسان تھا کہ جس چیز کو اپنے عقائد سے اختلاف دیکھے حذف کر دے اور جس کی کمی پاتے، بڑھا دے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر ہم وثائق کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انابیل اربعہ میں ہم کہ مسیح کی اصل تعلیم ملتی ہے۔

---

سے یہ لپیٹی بحث ذیل کی کتابوں سے ناخیز ہے:

Dumellow, Commentary on the Holy Bible.

F. K. Chayne, Encyclopaedia Biblica,

Millman, History of Christianity.

# حضرت عیسیٰ کی حقیقی تعلیمات

## حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کا بہترین ریکارڈ

..... حضرت عیسیٰ کے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جن کو مسیحی کلیسا نے معتبر و مستعمل انجیل ( Canonical Gospels ) قرار دے رکھا ہے۔ بلکہ اُس کا زیادہ قابل اعتماد ذریعہ انجیل برنابا ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مستحکم الصحت ( Apocryphal ) کہتا ہے اور عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے جس سے جدیدوں تک یہ دنیا سے ناپید رہی ہے۔

مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمہ کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، اور میں نے اسے لفظ بہ لفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ کتاب ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے محض

۱۶ سوٹھویں صدی میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکسٹس ( Sixtus ) کے کتب خانے میں پایا جاتا تھا، اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینز کے ہاتھ لگا۔ پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرنا ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ ۱۹۰۶ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیئرڈن پریس میں شائع ہو گیا تھا۔ مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ کتاب نو اُس مذہب کی خبر ہی کاٹے دسے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰ کے نام سے فخر کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے غائب کر دیئے گئے، اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آسکی۔ ( یہ ہے مذہب کی علمی کشادہ نظری کا حال کہ ایک کتاب کو محض تحقیق کی خاطر یا بہ حیثیت تاریخی ہیکارڈ کے بھی موجود نہیں رہنے دیا گیا۔ مرتبین )۔ دوسرا ایک نسخہ اسی اطالوی ترجمے سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارویں صدی میں پایا جاتا تھا جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا۔ اور آج اس کا بھی کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ ( مؤلف )

تصنیف اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

بائبل میں جو چاروں انجیلیں قانونی اور مقبرہ قرار دے کر شامل کر دی گئی ہیں، ان میں سے کسی کا لکھنے والا بھی حضرت عیسیٰ کا صحابی نہ تھا، اور ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا ہے کہ اُس نے آنحضرت کے صحابیوں سے حاصل کردہ معلومات اپنی انجیل میں درج کی ہیں۔ جن ذرائع سے ان لوگوں نے معلومات حاصل کی ہیں ان کا کوئی حوالہ انہوں نے نہیں دیا ہے جس سے یہ نتیجہ عمل سکے کہ راوی نے خود وہ واقعات دیکھے اور اقوال سنے ہیں جنہیں وہ بڑا کر رہا ہے یا ایک یا چند واسطوں سے یہ باتیں اسے پہنچی ہیں۔ بخلاف اس کے انجیل بڑا باس کا مصنف کہتا ہے

یہ سچی ٹریسچریں جہاں کہیں اس انجیل کا ذکر آتا ہے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے بڑا باس کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صورت اس بنا پر بول دیا گیا ہے کہ اس میں جگہ جگہ بدرصحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اول تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے، اگر یہ کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوتی، اور علامتے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صریح حال یہ ہے کہ جارج میل کے انگریزی مقدمہ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سوسے سے اس کے وجود تک کا علم نہ تھا۔ کبیری یعقوبی، مستوری، البیرونی، ابن حزم اور دوسرے مصنفین جو مسلمانوں میں مسیحی ٹریسچری پر اطلاع رکھنے والے تھے ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل بڑا باس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دینلے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں، ان کی بہترین ٹریسچریں ابن ہریم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ہیں۔ اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل بڑا باس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے ۵۰ سال پہلے تک ان کے اول کے زمانے میں جن کتابوں کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا ان میں انجیل بڑا باس بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت کونسا مسلمان تھا جس نے

( Galatius )

( Evangelium Matthei )

یہ جعلی انجیل تیار کی تھی؟ (مترجم)

علامہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق کے مترجمین مستند انجیلیوں کے مندرجات میں ۱۲۴ اختلافات اور ۱۱۰ غلطیاں برآمد کر کے پیش کی گئی ہیں۔ نیز انجیل اور متعلقہ خطوں اور نوشتوں میں سے تفسیر کی صحت یا الہامی حقیقت کا اثبات کرنے والوں میں بے شمار عیسائی اکابر اور ادارے شامل ہیں (ملاحظہ ہو: انجیل سے قرآن تک، صفحہ ۴ ترجمہ مولانا اکبر علی صاحب شرح و تحقیق از محمد تقی عثمانی صاحب)۔ (مترجم)



کہ میں مسیح سے اولین بارہ حواریوں میں سے ایک ہوں شروع سے آخر وقت تک مسیح کے ساتھ رہا ہوں اور اپنی آنکھوں دیکھے واقعات اور کانوں سے احوال اس کتاب میں درج کر رہا ہوں یہی نہیں بلکہ کتاب کے آخر میں وہ کہتا ہے کہ دنیا سے رخصت ہونے وقت حضرت مسیح نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میرے متعلق جو غلط خیال لوگوں میں پھیل گئی ہیں ان کو صاف کرنا اور صحیح حالت دنیا کے سامنے لانا تیری ذمہ داری ہے۔

### انجیل برناباس کی امتیازی خصوصیات

اس انجیل کو اگر کوئی شخص تعصب کے بغیر کھلی آنکھوں سے پڑھے اور نئے عہد نامے کی چاروں انجیلوں سے اس کا مقابلہ کرے تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ان چاروں انجیلوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں، اور اس طرح بیان ہوئے ہیں جیسے کوئی شخص نئی واقعہ وہاں سب کچھ دیکھ رہا تھا، اور ان واقعات میں خود شریک تھا چاروں انجیلوں کی بے ربط داستانوں کے مقابلے میں یہ تاریخی بیان زیادہ مربوط بھی ہے اور اس سے سلسلہ واقعات بھی زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔

### حضرت عیسیٰ کی صحیح تعلیمات اور موثر پیرائے بیان

حضرت مسیح کی تعلیمات اس میں چاروں انجیلوں کی بد نسبت زیادہ واضح اور مفصل اور موثر طریقے سے بیان ہوئی ہیں تو سید کی تعلیم، شرک کی تردید، صفات باری تعالیٰ، عبادت کی روح اور اخلاقِ فاضلہ کے

لے یہ برناباس کون تھا، بائبل کی کتاب اعمال میں بڑی کثرت سے اس نام کے ایک شخص کا ذکر آتا ہے جو قبریں کے ایک یہودی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ سچیت کی تبلیغ اور پیروان مسیح کی مدد و اعانت کے سلسلے میں اس کی خدمات کی بڑی تعریف کی گئی ہے۔ مگر کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ کب دین مسیح میں داخل ہوا۔ اور ابتدائی بارہ حواریوں کی جو فہرست نین انجیلوں میں دی گئی ہے اس میں بھی کہیں اس کا نام درج نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ اس انجیل کا مصنف وہی برناباس ہے یا کوئی اور۔ مثنیٰ اور قرس نے حواریوں (Apostles)

کی جو فہرست دی ہے، برناباس کی دی ہوئی فہرست اس سے حیرت دہانوں میں مختلف ہے۔ ایک ٹوفا جس کے بدلے برناباس خود اپنا نام لے رہا ہے۔ دوسرا شمعون قناتی، جس کی جگہ وہ یہوداہ بن یعقوب کا نام لیتا ہے۔ توتفا کی انجیل میں یہ دوسرا نام بھی موجود ہے۔ اس لیے یہ قیاس کرنا صحیح ہوگا کہ بعد میں کسی وقت برناباس کو حواریوں سے خارج کرنے کے لیے ٹوفا کا نام داخل کیا گیا ہے تاکہ اس کی انجیل سے پیچھا چھڑایا جاسکے، اور اس طرح کے تغیرات اپنی مذہبی کتابوں میں کر لینا ان حضرات کے ہاں کوئی ناجائز کام نہیں رہا ہے۔ (مؤلف)

مضامین ٹرسے ہی پُر زور اور مدلل و مفصل ہیں۔ جن سبق آموز تمثیلات کے پیرایہ میں مسیحی تھے یہ مضامین بیان کیے ہیں ان کا عشرِ عشرت بھی چاروں انجیلوں میں نہیں پایا جاتا۔ اس سے یہ بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ انجیل اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت کس حکیمانہ طریقے سے فرماتے تھے۔ حضرت عیسیٰ کی زبان، طرزِ بیان اور طبیعت و مزاج سے کوئی شخص اگر کچھ بھی آشنا ہو تو وہ اس انجیل کو پڑھ کر یہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ یہ کوئی جعلی داستان نہیں ہے جو بعد میں کسی نے گھڑ لی ہو۔ بلکہ اس میں حضرت مسیحؑ اناجیلِ اربعہ کی بہ نسبت اپنی اصل شان میں زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں، اور اس میں ان تضادات کا نام و نشان بھی نہیں ملتا جو اناجیلِ اربعہ میں انجیل کے مختلف اقوال کے درمیان پایا جاتا ہے۔

### تمام انبیاء کی تعلیمات سے ہم آہنگی

اس انجیل میں حضرت عیسیٰ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات ٹھیک ٹھیک ایک نبی کی زندگی اور تعلیمات کے مطابق نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، تمام پچھلے انبیاء اور کتابوں کی تصدیق کرتے ہیں، صاف کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کے سوا معرفتِ حق کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے، اور جو انبیاء کو چھوڑ رہے وہ دراصل خدا کو چھوڑ رہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے ٹھیک وہی عقائد پیش کرتے ہیں جن کی تعلیم تمام انبیاء نے دی ہے، نماز روزے اور زکوٰۃ کی تلقین کرتے ہیں، ان کی نمازوں کا جزو ذکرِ کثرتِ مقامات پر بننا باس نے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور تہجد کے اوقات تھے جن میں وہ نماز پڑھتے تھے اور ہمیشہ نماز سے پہلے وضو فرماتے تھے۔ انبیاء میں سے وہ حضرت داؤد اور سلیمان کو نبی قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ یہودیوں اور عیسائیوں نے ان کو انبیاء کی فہرست سے خارج کر رکھا ہے۔ حضرت اسمعیل کو وہ ذبیح قرار دیتے ہیں۔ اور ایک یہودی عالم سے اقرار کرتے ہیں کہ فی الواقع حضرت اسمعیل ہی ذبیح تھے اور نبی اسرائیل نے کبھیچ تان کر حضرت اٹھنی کو ذبیح بنا رکھا ہے۔ آخرت، قیامت اور حجت و و ذبح کے متعلق ان کی تعلیمات قریب قریب وہی ہیں جو قرآن میں بیان ہوتی ہیں۔

### مُصَنِّف کا مقصد تصنیف

اس کا مقصد (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) کتاب کے آغاز ہی میں اپنا مقصد تصنیف یہ بیان کرتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے خیالات کی اصلاح کی جاتے جو شیطان کے دھوکے میں آکر مسیوح کو ابن اللہ قرار دیتے ہیں، غصہ کو غیر ضروری ٹھہراتے ہیں، اور حرام کھانوں کو حلال کر دیتے ہیں، جن میں سے ایک دھوکہ کھانے والا پلوں بھی ہے۔

وہ بتاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جب دنیا میں موجود تھے، اُس زمانے میں ان کے معجزات کو دیکھ کر سب سے پہلے

شکر رومی سپاہیوں نے اُن کو خدا اور بعض نے خدا کا بیٹا کہنا شروع کیا۔ پھر یہ چھوٹ بنی اسرائیل کے عوام کو لگ گئی۔ اس پر حضرت عیسیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہوئے۔ انہ نے بار بار نہایت تندرست کے ساتھ اپنے متعلق اس غلط عقیدے کی تردید کی اور اُن لوگوں پر لعنت بھیجی جو اُن کے متعلق ایسی باتیں کہتے تھے پھر انہوں نے اپنے ثنا گروہوں کو پورے یہودیہ میں اس عقیدے کی تردید کے لیے بھیجا اور اُن کی دُعا سے ثنا گروہوں کے ہاتھوں بھی وہی معجزے صادر کرائے گئے، تاکہ لوگ اس غلط خیال سے باز آجائیں کہ جس شخص سے یہ معجزے صادر ہو رہے ہیں وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے۔ اس سلسلے میں وہ حضرت عیسیٰ کی مفصل تحریریں نقل کرتے ہیں جن میں انہوں نے بڑی مہنتی کے ساتھ اس غلط عقیدے کی تردید کی تھی، اور جبکہ جگہ یہ بتاتا ہے کہ آنجناب اس گمراہی کے پھیلنے پر کس درجہ پریشان تھے۔

مزید برآں وہ اس پولوسی عقیدے کی بھی صاف صاف تردید کرتا ہے کہ مسیح نے صلیب پر جان دی تھی۔ وہ اپنے چشم دید حالات یہ بیان کرتا ہے کہ جب یہود داہ اسکر یوتی یہودوں کے سردار کاہن سے رخصت لے کر حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرنے کے لیے سپاہیوں کو لے کر آیا تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار فرشتے آنجناب کو اٹھا کر لے گئے، اور خود یہود داہ اسکر یوتی کی شکل اور آواز باکل وہی کر دی گئی جو حضرت عیسیٰ کی تھی صلیب پر وہی چڑھایا گیا تھا، نہ کہ حضرت عیسیٰ۔ اس طرح یہ انجیل پولوسی مسیحیت کی جڑ کاٹ دیتی ہے اور قرآن کے بیان کی پوری توثیق کرتی ہے حالانکہ نزولِ قرآن سے ۱۱۵ سال پہلے اس کے ان بیانات ہی کی بنا پر مسیحی پادری اسے رد کر چکے تھے لیکن ابھی

## مروجہ چار انجیلوں میں تعلیماتِ عیسوی

چونکہ ہمارے زمانے کے موجودہ حالات اُن حالات سے بہت ملتے جلتے ہیں جن میں مسیح نے اہل فلسطین کو حکومتِ انہیمیہ کی دعوت دی تھی، اس لیے اُن کے طریقِ عمل میں ہم کو مفید ہدایات مل سکتی ہیں ذیل

۱۔ یہ عیسائیوں کی اپنی بدقسمتی ہے کہ اس انجیل کے ذریعے سے اپنے عقائد کی تصحیح اور مسیح کی اصل تعلیمات کو جاننے کا جرم توغ انہیں ملتا تھا، اسے محض ضد کی بنا پر انہوں نے کھو دیا (مؤلف)۔

۲۔ فاضل مؤلف نے بڑی عرق ریزی سے عیسائیوں کی اختیار کردہ چار انجیلوں میں سے وہ اجزاء ڈھونڈ نکائے ہیں جو قرآن کی روشنی میں حضرت عیسیٰ کی صحیح پیغمبرانہ تعلیمات کے آئینہ دار ہیں پھر مؤلف نے ان کے استعاراتی اور تشبیہی انداز بیان کی جس و خوبی سے گرہ کشائی کی ہے۔ نیز ان کو ایسے طریق سے ترتیب کیا ہے کہ یہ تعلیمات حکمت اور نیکی کے متفرق کلمات کی صورت میں سامنے نہیں آتیں بلکہ ایک جامع تحریر اصلاح کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

(مؤلفین)

میں ہم ان کے بعض ارشادات نقل کرتے ہیں :

### دعوتِ توحید

”فقہیوں میں سے ایک نے . . . . اُس سے پُچھا کہ سب حکموں میں سے اول حکم کون سا ہے، یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے : اے اسرائیلی سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ . . . . . فحشیت نے اس سے کہا۔ اُسے اُستاد کیا خوب ! تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں“ (مرقس۔ ۱۲: ۲۸-۳۲)

”تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اُسی کی عبادت کر“ (لوقا: ۴: ۸)

### حکومتِ الہی

”پس تم اس طرح دعا مانگو کہ اُسے ہمارے باپ اُو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جاتے ، تیری بادشاہت آتے، تیری مرضی جیسی آسمان پر پوری ہوتی ہے، زمین پر بھی ہو (متی: ۶: ۹-۱۰)“  
آخری آیت میں حضرت مسیح نے اپنے نصب العین کو واضح کر دیا ہے۔ یہ عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ خدا کی بادشاہت سے ان کی مراد روحانی بادشاہت تھی۔ یہ آیت اس کی تردید کرتی ہے۔ ان کا صاف مقصد یہ تھا کہ زمین پر خدا کا قانون اور اس کا حکم شرعی اُسی طرح جاری ہو جس طرح تمام کائنات میں اس کا قانونِ طبعی نافذ ہے۔ اسی اُتھلا کے بے وہ لوگوں کو تیار کر رہے تھے۔

### حق و باطل کی کشمکش کا پیغام

”یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں، میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور اس کی بیٹی کو اس کی ماں سے اور بیو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں۔ اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔“

راہِ حق میں آزمائش ضروری ہے

”اور جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ چلے وہ میرے لائق نہیں۔ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اُسے کھوئے گا۔ اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اُسے بچاتے گا۔“ (متی: ۱۰: ۳۹-۴۱)

لہٰذا صلیب اٹھانے سے فرار نہ کرنا، موت کے لیے تیار رہنا ہے جس طرح اُردو محلوں میں پہلے ستر تھیل پر رکھنا۔ (مترجم)

”جو کوئی میرے پیچھے آنا چاہے وہ اپنی خودی سے انکار کر دے اور اپنی صلیب اٹھائے اور میرے پیچھے ہو لے۔ (متی ۱۶: ۲۴)“

”بھائی کو بھائی قتل کر کے لے کر لے گا اور بیٹے کو باپ اور بیٹے اپنے ماں باپ کے قتل گھر سے ہو کر انہیں مروا ڈرائیں گے۔ اور میرے نام کے باعث سب لوگ تم سے عداوت کریں گے مگر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا۔“ (متی ۱۰: ۲۴-۲۱)

”دیکھو میں تمہیں بھیجتا ہوں گویا بھیڑیوں کے بیچ میں۔۔۔۔۔ آدمیوں سے خبردار رہو کیونکہ وہ تمہیں عداوتوں کے حوالے کر دیں گے اور اپنے عداوت خانوں میں تمہارے کوڑے ماریں گے اور تم میرے سبب جاگوں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے۔“ (متی ۱۶: ۱۸-۱۷)

”اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں، بھائیوں اور بہنوں اور اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تم میں ایسا کون ہے کہ جب وہ بیچ بنا چاہے تو پیٹھے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب نیوٹال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر سفینا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عداوت شروع تو کی مگر تیار نہ کر سکا۔۔۔۔۔ تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ (لوقا ۱۴: ۲۶-۲۳)

### ایک انقلابی تحریک

یہ تمام آیات صاف و سادہ دلائل کرتی ہیں کہ مسیح علیہ السلام محض ایک دھرم کا پرچار کرنے نہیں آئے تھے بلکہ پورے نظام تمدن و سیاست کو بدل دینا ان کے پیش نظر تھا جس میں رومی سلطنت، یہودی ریاست، فقہیوں اور فریسیوں کے اقتدار اور نئی الجملہ تمام بندگان نفس و ہواستے نفس سے جنگ کا خطرہ تھا۔ اسی لیے وہ لوگوں کو نکلنے انفاظ میں بتا دیتے تھے کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ نہایت خطرناک ہے۔ اور میرے ساتھ اسی کو آنا چاہیے جو ان تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔

لہذا اس سے مراد ہے خود پرستی اور اغراض ذاتی سے دست بردار ہو جانا۔ (مترجم)

علاوہ دشمنی کرنے سے مراد ان کی محبت اور ان کے مفاد کو اسلامی تحریک پر قربان کر لینا ہے۔ (مترجم)

## سلکِ صبر کی تلقین

”شہر کا مقابلہ نہ کرنا، بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دینے اور اگر کوئی تمہارے پرائس کر کے تیرا گڑنا لینا چاہے تو چوغڑ بھی اُسے لے لینے دے اور جو کوئی تمہارے ایک کوزے، بیگاریں لے جاتے اس کے ساتھ دو کوس چلا جائے۔“ (متی ۱۵: ۳۹-۴۱)

”جو بدن کو قتل کرتے ہیں اور رُوح کو قتل نہیں کرتے ان سے نہ ڈرو۔ بلکہ اس سے ڈرو جو رُوح اور بدن دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے۔“ (متی ۱۰-۲۸)

## حُبِّ دُنیا سے اجتناب اور فکرِ آخرت کی دعوت

”اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو۔ جہاں کیڑا اور زنگ نراب کرتا ہے۔ اور جہاں چوڑی قنب لگاتے اور چراتے ہیں بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو۔“ (متی ۶: ۱۹-۲۰)

”کوئی آدمی دنیا کوں کی خدمت نہیں کر سکتا۔۔۔ تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اپنی جان کی فکر نہ کرو کہ ہم کیا کھاتے ہیں یا کیا پیسے لگے۔ اور نہ بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو کہ نہ بونٹے ہیں نہ کاٹتے ہیں، نہ کوٹھیوں میں جمع کرتے ہیں، پھر بھی تمہارا آسمانی باپ ان کو کھلاتا ہے۔ کیا تم ان سے زیادہ قدر نہیں رکھتے؟ تم میں ایسا کون ہے جو فکر کر کے اپنی عمر میں ایک گھڑی بھی بڑھا سکے؟ اور پوٹاک کے لیے کیوں فکر کرتے ہو؟ جنگلی سوسن کے درختوں کو دیکھو کہ وہ کس طرح بڑھتے ہیں۔ وہ نہ محنت کرتے ہیں نہ کاٹتے ہیں۔ پھر بھی نہیں تم سے کہتا ہوں کہ سلیمان بھی باوجود اپنی شان و شوکت کے ان میں سے کسی کی مانند پوٹاک پہنے ہوئے نہ تھا۔ پس جب خدا امید ان کی لگھا س کر، جو آج بے اور کل تنور میں جھونکی جاتے گی، ایسی پوٹاک پہنا تا ہے تو اسے کم اعتقاد و اتم کو کیوں نہ پہناتے گا؟ تم پہلے اس کی بادشاہت اور اس کی راست بازی کی تلاش کرو تو یہ سب چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔“

(متی ۶: ۲۳-۲۴)

”مانگو تو تمہیں دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو تم پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمہارے واسطے کھولا جائے گا۔“

(متی ۵: ۳)

## تحلیلِ شہادت کی تعلیم کا مقصد

عام غلط فہمی ہے کہ شہادتِ مسیح نے ریپبلک اور رُف و تجرید کی تعلیم دی ہے۔ حالانکہ اس انقلابی تحریک کے آغاز میں لوگوں کو صبر، تحمل، شہادت اور تحمل علی اللہ کی تعلیم و تربیت دینے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں جوہاں ایک نظام تمدن و سیاست پوری طاقت کے ساتھ زمین پر چھپا یا پھرا ہوا اور تمام وسائل و ذرائع زندگی اس کے قبضہ اختیار میں ہوں، ایسی جگہ کوئی جماعت انقلاب کے لیے اٹھ نہیں سکتی جب تک کہ وہ جان و مال کی محبت دل سے نکال

نہ دوسرے سختیاں اٹھانے کو تیار نہ ہو جائے، اپنے بہت سے نقصانات کو گوارا کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو۔  
حاضر الوقت نظام سے لڑنا دراصل تمام آفات و مصائب کو اپنے اوپر دعوت دینا ہوتا ہے۔ یہ کام  
جنہیں کرنا ہوا نہیں ایک تھپڑ کھا کر دوسرے تھپڑ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ گرتا ہوا تھوڑے سے جاتا ہو تو چونکہ بھی چھوڑنے  
کے لیے آمادہ ہونا چاہیے۔ اور روٹی کپڑے کی فکر سے آزاد ہونا چاہیے۔ خزانہ رزق فی الوقت جن کے ہاتھ میں  
ہیں ظاہر ہے کہ ان سے لڑ کر رزق پانے کی امید نہیں کی جاسکتی۔ لہذا جو اسباب سے قلع نظر کر کے صرف خدا کے  
بھروسہ پر اس راہ میں چھلانگ لگا سکتا ہو وہی ان سے لڑ سکتا ہے۔

حکومتِ الہیہ کا جامع معنی فسٹو

”اے محنت اٹھانے والو! بوجھ سے دبے ہوئے لوگو! سب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں آرام و ٹکا

کیونکہ میرا جوا ملا تم ہے اور میرا بوجھ تم کا“ (متی ۱۱: ۲۸-۳۰)

شاید حکومتِ الہیہ کا معنی فسٹو اس سے زیادہ مختصر اور پراثر الفاظ میں مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ انسان پر انسانی  
حکومت کا جوا بڑا ہی سخت اور بڑا ہی بوجھل ہے۔ اس بوجھ سے دبے ہوئے لوگوں کو الہی حکومت کا نقیب  
جو پیغام دے سکتا ہے وہ یہی ہے کہ جس حکومت کا جوا میں تمہارے اوپر رکھنا چاہتا ہوں وہ نرم بھی ہے اور  
خفیت بھی۔

حکومتِ خدمت ہے

”غیر قوموں کے بادشاہ ان پر حکومت چلاتے ہیں۔ مگر تم ایسے نہ ہونا، بلکہ جو تم میں بڑا ہے وہ چھوٹے

کے مانند اور جو سردار ہے وہ خدمت کرنے والے کی مانند۔“ (لوقا ۲۲: ۲۵-۲۶)

حضرت مسیحؑ یہ ہدایت اپنے حواریوں یعنی صحابیوں کو فرماتے تھے۔ اس مضمون کے متعدد اقوال انجیلوں میں  
موجود ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ کہیں فرعونوں اور نمرودوں کو ٹٹا کر تم خود فرعون و نمرود نہ بن جانا۔

یہودی علماء و مشائخ پر تنقید

فقیر اور فرسختی مری کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کر دو اور مانو۔ لیکن ان

کے سے کام نہ کرو۔ کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کا اٹھانا مشکل ہے۔ بانہ

کر لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں۔ مگر آپ انہیں اپنی انگلی سے پلانا بھی چاہتے۔ وہ اپنے سب کام

لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ اپنے تعزیر ٹیرے بناتے اور اپنی پڑساک کے کنارے چوڑے

لے فرسی سے مراد حلال شریعت ہیں۔ (متی ۲۳)

رکھتے اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔“

۱۰ اسے ریاکار فقیر اور فرسیو اتھم پرافسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر نڈا کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔“

۱۱ اسے ریاکار فقیر اور فرسیو اتھم پرافسوس ہے کہ ایک شریک کرنے کے لیے تزی اور خشکی کا دودھ کرتے ہو۔ اور جب وہ مرید ہو چکا ہے تو اسے اپنے سے دو گنا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو۔“

۱۲ اسے اندھے راہ تانے والو اتھم پھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ کو بنگل جانتے ہو۔“

۱۳ اسے ریاکار فقیر اور فرسیو اتھم پرافسوس ہے۔ تم سفیدی پھری ہوتی قبروں کی مانند ہو جاؤ۔ اسے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہے مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ ایسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوتے ہو۔“ (متی ۲۳: ۲۸-۲۹)

یہ اُس وقت کے حاملانِ شریعت کا حال تھا۔ وہ علم رکھنے کے باوجود بندگیِ نفس کی وجہ سے آپ بھی گمراہ تھے اور عام لوگوں کو بھی گمراہ کر رہے تھے۔ اور اس انقلاب کے راستہ میں رومی قیصر سے بڑھ کر وہی حامل تھے۔

### حضرت عیسیٰ کے خلاف مذہبی اکابر کی سازش

۱۴ اس وقت فرسیوں نے جاگ مشورہ کیا کہ اسے کیڑے کو باتوں میں پھنساتیں۔ پس انہوں نے اپنے نساگوں کو بیرو دیوں کے ساتھ اس کے پاس بھیجا اور انہوں نے دلچسپی نساگوں نے کہا کہ اُسے استاد اہم جانتے ہیں کہ تو سچا ہے اور سچائی سے خدا کی راہ کی تعلیم دیتا ہے اور کسی کی پروا نہیں کرتا۔ ہمیں بنا کر تو کیا سمجھنا ہے قیصر کو جزیرہ دینا رو ہے یا نہیں؟ یسوع نے اُن کی شرارت جان کر کہا، اُسے ریاکارو! مجھے کیوں آڑتے ہو؟ جزیرہ کا سکہ مجھے دکھاؤ۔ وہ دینار اس کے پاس لے آئے۔ اُس نے ان سے کہا یہ صورت اور نام کس کا ہے؟ انہوں نے کہا قیصر کا۔ اس پر اُس نے کہا جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو یاد کرو۔“

(متی ۲۲: ۱۵۱-۱۶۱)

۱۵ مسیح کے زمانے میں فلسطین کے ایک حصہ میں ہندوستان کی دوسری ریاستوں کی طرح ایک یہودی ریاست قائم تھی جو سلطنتِ روم کی تابع فرماں تھی۔ اس کے بانی بیروڈ کے نام پر اس کو عموماً بیروڈی ریاست کہتے تھے۔ بیروڈیوں سے مراد اس ریاست کی پولیس یا سی آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ (مترجم)



اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وراصل یہ ایک چال تھی۔ فریسی اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے یہ چاہتے تھے کہ حضرت مسیح کا قبل از وقت حکومت سے نصادم کر دیا جائے اور تحریک کو بڑھانے سے پہلے حکومت کے زور سے اُسے کچلوا ڈالا جائے۔ اسی لیے ہیرودی ریاست کی سی آئی ڈی کے سامنے یہ سوال اٹھایا گیا کہ قیصر کو ٹیکس دیا جاتے یا نہیں؟ جواب میں حضرت مسیح نے جو ذرا معنی بات کہی اس کو دو ہزار برس سے مسیحی اور غیر مسیحی سب اس معنی میں لے رہے ہیں کہ عبادت خدا کی کنز اور اطاعت حکومت کی کرتے رہو جو تمہارے زمانہ میں موجود ہو۔ لیکن وراصل مسیح نے فرمایا کہ قیصر کو ٹیکس دینا سوا ہے، کیونکہ ایسا کہنا اُن کی دعوت کے خلاف تھا۔ اور یہ فرمایا کہ اُسے ٹیکس نہ دیا جائے، کیونکہ اُس وقت تک اُن کی تحریک اس مرحلے پر نہیں پہنچی تھی کہ ٹیکس روکنے کا حکم دیا جاتا۔ اس لیے انہوں نے یہ لطیف بات کہہ دی کہ قیصر کا نام اور اس کی صورت تو قیصری کو واپس کر دو اور سونا جو خدا نے پیدا کیا ہے وہ خدا کی راہ میں صرف کرو۔ اس سازش میں ناکام ہونے کے بعد فریسیوں نے خود مسیح کے حواریوں میں سے ایک کو شہوت دیکھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی ایسے موقع پر مسیح کو گرفتار کر لے جب کہ عام جلسے کا خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور یہود اور اسکریوتی نے مسیح کو پکڑا دیا۔

حضرت عیسیٰ کے خلاف اکابر یہود کا مقدمہ

”پھر اُن کی ساری جماعت اٹھ کر اُسے پیلاٹس درومی حاکم کے پاس لے گئی اور انہوں نے اِزیم لکھا شروع کیا کہ اے ہم نے اپنی قوم کو بے پکائے اور قیصر کو خراج دینے سے منع کرتے اور اپنے آپ کو مسیح بادشاہ کہتے پایا ہے۔۔۔ پیلاٹس نے سردار کاہنوں اور عام لوگوں سے کہا کہ میں اس شخص میں کوئی قصور نہیں پاتا۔ مگر وہ اور بھی زور دے کر کہنے لگے کہ یہ تمام یہود یہ میں بلکہ گلیل سے لے کر یہاں تک لوگوں کو سکی سکی کر اُٹھانا ہے۔۔۔۔۔ وہ چلا چلا کر سر ہوتے رہے کہ اسے صلیب دی جاتے اور ان کا چلانا کارگر ہوا۔“

دُنوفا ۲۳: ۱-۲۳

صُور کے کئی دُور دعوت سے مماثلت

اس طرح دنیا میں مسیح کا مشن اُن لوگوں کی بدولت ختم ہوا جو اپنے آپ کو حضرت مسیحی کا وارث کہتے تھے۔ تاریخی شواہد کی روش سے حضرت مسیح کی نبوت کا کُل زمانہ ڈیڑھ سال اور تین سال کے درمیان رہا ہے۔ اس مختصر مدت میں انہوں نے اتنا ہی کام کیا جتنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کئی زندگی کے ابتدائی تین سال میں کیا تھا۔ اگر کئی شخص انجیل کی مذکورہ بالا آیت کا مقابلہ قرآن مجید کی کئی سورتوں اور زمانہ قیام تک کی احادیث سے کرے گا تو دونوں میں بڑی مماثلت پائے گا۔

## عیسائیوں کی گمراہی کے حقیقی اسباب

قَدْ يَا هَذِهِ الْكِتَابِ لَا تَعْلَمُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَابِ السَّبِيلِ - (المائدہ - ۷۷)

کہو اسے اہل کتاب! اپنے دین میں ناقص غلو نہ کرو اور ان لوگوں کے تقلیدات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خرد گمراہ ہوئے اور بہنوں کو گمراہ کیا اور سوا سبیل سے ہٹ گئے۔

عیسائیوں میں غلو اور تقلیدِ اختیار کی بیماری

یہ اشارہ ہے ان گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے فلند عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے خصوصاً فلاسفہ یونان کی طرف جن کے تقلیدات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداء ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی۔ مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے ادہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی جاننا بے بنیاد یا تفسیریں شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کیا جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دور کا واسطہ بھی نہ رہا۔

”ایک عیسائی عالم کا تاقدارہ جائزہ“

اس باب میں خود ایک مسیحی عالم دنیایت (ایڈیڈ چارلس ایڈرسن اسکاٹ) کا بیان قابل ملاحظہ ہے جس کا پیڈیاٹریا نیچکا کے چودھویں ایڈیشن میں ”یسوع مسیح“ (Jesus Christ) کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے:

”پہلی تین انجیلوں (متی، مرقس، لوقا) میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جاسکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے غیبس یاب ہوا تھا اور خدا کے ساتھ ایک ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا تھا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جائے تو حق سبحانہ ہے خود متی اس کا ذکر ہر سنی کے پیشے کی حیثیت سے کرتا“

اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو "مسیح" تسلیم کرنے کے بعد "اگ ایک طرف لے جا کر اسے  
 ملامت کی" (متی ۱۶: ۲۲)۔ لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد بائبلوں  
 کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ "وہ خدا اور رباری امت کے نزدیک  
 کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا" (لوقا ۲۴: ۱۹)۔ یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اگر "مسیح" کی  
 تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لیے لفظ "خداوند" (Lord) کا استعمال عام طور پر  
 چل پڑا تھا، لیکن نہ مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں بخلاف  
 اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ یسوع کے ابتداء کا ذکر متیوں  
 انجیلیوں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کے شایان شان ہے، مگر مرقس کی "قدیم" والی عبارت  
 (مرقس ۱۰: ۴۵) اور آخری فصیح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنی  
 نہیں پہناتے گئے جو بعد میں پہناتے گئے تھے، حتیٰ کہ اس بات کی طرف کوہیں اشارہ تک نہیں کیا گیا ہے کہ یسوع  
 کی موت کا انسان کے گناہ اور اس کے کفارے سے کوئی تعلق تھا۔  
 آگے چل کر دیکھنا ہے:

یہ بات کہ یسوع خود اپنے آپ کو ایک نبی کی حیثیت سے پیش کرتا تھا، انجیل کی متعدد عبارتوں  
 سے ظاہر ہوتی ہے مثلاً یہ کہ "مجھے آج ادھر چل اور پھر اپنی راہ پر چلنا ضرور ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ  
 نبی پر ظلم سے باہر ملاک ہو" (لوقا ۱۳: ۳۳)۔ وہ اکثر اپنا ذکر "ابن آدم" کے نام سے کرتا ہے۔۔۔  
 یسوع کہیں اپنے آپ کو "ابن اللہ" نہیں کہتا۔ اس کے دوسرے ہم عصر جیسا اس کے متعلق یہ لفظ  
 استعمال کرتے ہیں تو غالباً ان کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ وہ اس کو خدا کا مسوح سمجھتے ہیں۔  
 البتہ وہ اپنے آپ کو مطلقاً "بیٹے" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔۔۔۔۔ فرید برآں وہ خدا کے ساتھ  
 اپنے تعلق کو بیان کرنے کے لیے بھی "باپ" کا لفظ اسی اطلاقی شان میں استعمال کرتا ہے،۔۔۔۔۔  
 اس تعلق کے بارے میں وہ اپنے آپ کو منفرد نہیں سمجھتا تھا، بلکہ ابتدائی دور میں دوسرے انسانوں کو  
 بھی خدا کے ساتھ اس خاص گہرے تعلق میں اپنا ساتھی سمجھتا تھا۔ البتہ بعد کے تجربے اور انسانی طبائع  
 کے عمیق مطالعہ نے اسے یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ اس معاملہ میں وہ اکیلا ہے۔  
 پھر یہی مسنت لکھتا ہے:

"عید پینٹکوسٹ کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ "ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا" یسوع کو  
 اس حیثیت میں پیش کرنے میں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے۔۔۔۔۔ انجیلوں سے  
 محکم دلائل و براہین سے مزین، متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع مسیح سے جو انی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشرو نما کے بارے سے گزرا۔ اس کو ٹھوک پیاں لگتی تھی، وہ تھکتا تھا اور سوتا تھا، اور حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافت احوال کا محتاج تھا، اُس نے دکھ اٹھایا اور مرا۔ اُس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے۔ . . . . . درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جاتے تو یہ اس پورے تھٹر کے بالکل خلاف ہو گا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دعوے کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور گشتہنی اور کھوٹ پڑی کے مقام پر جو واردات گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جاسکتی۔ تا وقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی قرار نہ دے دیا جاتے، یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا اور اس محدودیت میں اگر کوئی استثناء تھا تو وہ صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے فیضی شہود کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادر مطلق سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں اور بھی کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختار کام کرتا تھا۔ اس کے برعکس وہ بار بار دعائے مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ ”یہ چیز خدا کے سوا کسی اور ذریعہ سے نہیں مل سکتی“ اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔ فی الواقع یہ بات ان انجیلوں کے تاریخی حقیقت سے معتبر ہونے کی ایک اہم شہادت ہے کہ اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب اُس زمانہ سے پہلے مکمل نہ ہوئی تھی جبکہ مسیحی کلیسا نے مسیح کو الہ سمجھنا شروع کر دیا تھا، پھر بھی ان دستاویزوں میں ایک طرف مسیح کے فی الحقیقت انسان ہونے کی شہادت محفوظ ہے اور دوسری طرف ان کے اندر کوئی شہادت اس امر کی موجود نہیں ہے کہ مسیح اپنے آپ کو خدا سمجھتا تھا۔ اس کے بعد یہ مصنف پھر لکھتا ہے :

• وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہ رقیع کے وقت اسی فعل رقیع کے ذریعہ سے یسوع پورے اختیار کے ساتھ ابن اللہ کے مرتبہ پر غلامیہ فائز کیا گیا۔ . . . . . یہ ابن اللہ کا لفظ یقینی طور پر ذاتی اہمیت کی طرف ایک اشارہ اپنے اندر رکھتا ہے جسے پال نے دوسری جگہ یسوع کو خدا کا اپنا بیٹا کہہ کر صاف کر دیا ہے۔ اس امر کا فیصلہ اب نہیں کیا جاسکتا کہ آیا وہ ابتدائی عیسائیوں کا گروہ تھا یا پال میں نے مسیح کے لیے ”خداوند“ کا خطاب اصل مذہبی معنی میں استعمال کیا تھا یا یہ فعل مقدم الذکر گروہ ہی کا ہو لیکن بلاشبہ وہ پال تھا جس نے اس خطاب کو پورے معنی میں بولنا شروع کیا، پھر اپنے مدعا کو اس طرح اور بھی زیادہ واضح کر دیا کہ ”خداوند یسوع مسیح“ کی طرف بہت سے تلمیذات

اور اصطلاحی الفاظ منتقل کر دیئے جو قدیم کتب مقدسہ میں خداوند پریموہ (اللہ تعالیٰ) کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مسیح کو خدا کی دانش اور خدا کی عظمت کے مساوی قرار دیا اور اسے مطلق معنی میں خدا کا بیٹا ٹھہرایا۔ تاہم متعدد حیثیات اور پہلوؤں سے مسیح کو خدا کے برابر کر دینے کے باوجود یہاں اس کو قطعی طور پر اللہ کہنے سے باز رہا۔

### ایک دوسرے عیسائی تحقیق کا تجزیہ

انسٹیٹوٹ یو ایچ ایف کے ایک دوسرے مضمون "مسیحیت" (Christianity) میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس سیسی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"عقیدہ تلمیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ چار سے لے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے۔ مذہبی خیالات بائبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفے کی صورتوں میں۔"

"باپ بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی سہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود مسیح نے شاؤدناوری کبھی استعمال کی تھی، اور بال سنہ بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی ٹریچر میں یہ لفظ شخصیت کے امتیاز کرنے کے قریب ہی چکا تھا۔ یہی اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے۔ اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے پہلے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا) اور مشد خالص یونانی۔ اصل سوال جن پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی، بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا، یعنی یہ کہ ان تینوں اقاہیم (باپ بیٹے اور روح) کے درمیان تعلق کی حیثیت کیسے ہے؟ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا وہ اس عقیدے سے ہیں درج سب جو نیقیائی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔"

### تاریخ کلیسا سے ایک شہادت

اسی سلسلہ میں انسٹیٹوٹ یو ایچ ایف کے ایک اور مضمون "تاریخ کلیسا" (Church History) کی یہ عبارت بھی قابل ملاحظہ ہے:

"تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا، تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے جو تھی صدی میں اس مسئلہ پر سخت بحثیں چھڑی

ہوتی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں بن گئی تھیں۔ آخر کار ۱۹۲۹ء میں نیقیہ کی کونسل نے اورتھوڈوکس مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک جھگڑا چلتا رہا لیکن آخری فتح نیقیہ ہی کے فیصلے کی برتی جسے مشرق اور مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ مسیحی عقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے۔ بیٹے کی اورتھوڈوکس کے ساتھ رُوح کی اورتھوڈوکس بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطلاح کے کلر اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیہ میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک قرار پانگا۔

پھر اس دور کے پرکھ بیٹے کی اورتھوڈوکس مسیح کی ذات میں ختم ہوتی تھی ایک دوسرا مسئلہ بننا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی تینوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں اورتھوڈوکس اور انسانییت کے درمیان کیا تعلق ہے؟ مسئلہ میں کالیسٹن کی کونسل نے اس کا یہ تفسیر کیا کہ مسیح کی ذات میں دو مکمل طبیعتیں جمع ہیں، ایک الہی طبیعت، دوسری انسانی طبیعت، اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جدا جدا خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل جو ۴۵۱ء میں بتام قسطنطنیہ منعقد ہوئی، اس پر آٹا اضافہ اور کیا گیا کہ یہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیتیں بھی رکھتی ہیں، یعنی مسیح بیک وقت دو مشیتوں کا حامل ہے۔ . . . . . اسی دوران میں مغربی کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلہ پر بھی خاص توجہ کی اور یہ سوال تینوں تیر بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا؟ آخر کار ۱۵۲۹ء میں اورینج کی دوسری کونسل میں . . . . . یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہنریچ آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھا سکتا جب تک وہ اُس فضل خداوندی سے، جو اصطلاح میں عطا کیا جاتا ہے، نئی زندگی نہ حاصل کرے۔ اور یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد بھی اسے حالت خیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضل خداوندی دائماً اُس کا مددگار نہ رہے، اور فضل خداوندی کی یہ دائمی اعانت اُسے صرف کیجھو تک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل رہ سکتی ہے۔

### حاصل بحث

مسیحی علماء کے ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں چہرے مسیحوں کو گمراہ کیا وہ عقیدت اور محبت کا غلط تھا۔ اسی غلو کی بنا پر مسیح علیہ السلام کے لیے خداوند اور ابن اللہ کے الفاظ استعمال کیے گئے، خدائی صفات ان کی طوت منسوب کی گئیں، اور کفارہ کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ حالانکہ حضرت مسیح کی تعلیم

میں ان باتوں کے لیے قطعاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب یہ فلسفہ کی ہوا مسیحیوں کو لگی تو بھلا تھے اس کے کہ یہ لوگ اس ابتدائی گمراہی کو کبھی اس سے بچنے کی سعی کرتے، انہوں نے اپنے گزشتہ پیشواؤں کی غلطیوں کو نہایت سے نیلے اُن کی توجیہات شروع کر دیں اور مسیح کی اصل تعلیمات کی طرف رجوع کیے بغیر محض منہ پر فلسفہ کی مدد سے عقیدے پر عقیدہ ایجاد کرتے چلے گئے۔ یہی وہ ضلالت ہے جس پر قرآن نے ان آیات میں مسیحیوں کو

تنبیہ فرمایا ہے: ﴿لَقَدْ﴾

انسان کے پیدا تھی گناہ گار ہونے کا عقیدہ